بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشرواشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدرآباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپیہ   فی پرچہ:- بہتر [illegible]

الرحیم

نمبر ۱	ماہ جون ۱۹۶۷ء مطابق صفر ۱۳۸۷ھ	جلد ۵

فہرست مضامین

شذرات

ہمارے ہاں کافی تیزی سے تعلیم پھیل رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ روزانہ اخبارات کی اشاعت بھی بڑھ رہی ہے۔ ادبی رسالوں اور ادبی کتابوں میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ عام لوگوں اور بالخصوص خواتین اور لڑکیوں کا اخبارات، رسالے اور کتابیں پڑھنے کا شوق رُوبہ ترقی ہے یہ صحیح ہے کہ اس کے ساتھ مذہبی رسالے اور مذہبی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں، جو ایک حد تک قوم کے مذہبی مطالعہ کی پیاس بجھاتی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر رسالے اور مذہبی تصنیفات خاص خاص جماعتوں کی ہیں، گو ان کا موضوع اسلام ہی ہوتا ہے لیکن وہ اسلامی معلومات کو بالعموم اپنی مخصوص جماعتی اغراض کے تحت پیش کرتی ہیں۔

غرض تعلیم کے فروغ سے قوم میں پڑھنے والوں کا جو ایک بڑا طبقہ

پیدا ہو رہا ہے، اس کے لئے اس طرح کا اسلامی ادب نہ ہونے کے برابر ہے، جو مخصوص فرقوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں سے بالا تر ہو اور اسلام کے بارے میں ضروری معلومات بہم کرے۔

بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں اس طرح کے اسلامی ادب کی قومی ضرورت کو وہاں کے محکمہ ہائے اوقاف پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مصر کا محکمہ اوقاف اسلام کی جواہات الکتب ہیں انہیں شائع کرتا ہے اور اس قدر کم داموں پر خریداروں کو فراہم کرتا ہے کہ ایک عام دکاندار بھی انہیں خرید کر گھر میں اپنی ذاتی لائبریری بنا سکتا ہے۔
خوش قسمتی سے ہمارے ہاں آفسٹ کی چھپائی کا عام رواج ہو چلا ہے۔ اور اگر ایک دفعہ آفسٹ کی کتابت پر کچھ رقم خرچ کر لی جائے، تو آپ اس سے جتنی چاہیں کتابیں چھاپ سکتے ہیں۔
قاہرہ ہی میں ایک اور ادارہ مجلس اعلیٰ للشئون الاسلامیۃ ہے، وہ بھی بڑی کثرت سے اسلامی موضوعات پر رسائل چھاپتا، اور انہیں تقسیم کرتا ہے۔ آج کل تمام ترقی پذیر ملکوں میں پڑھنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے، اور لوگ کچھ نہ کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ اب اگر اُن کو پڑھنے کے لئے اچھا مواد نہیں ملے گا، تو وہ اس مواد کو پڑھیں گے جو ان تک بآسانی پہنچتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس سے وہ متاثر بھی ہوں گے۔ مصر اور بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں محکمۂ اوقاف نے اس ضرورت کو محسوس کیا، اور اب وہ کافی بڑی مقدار میں اور بہت سستا اسلامی ادب شائع کر رہے ہیں۔

بے شک محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان کی مالی اعانت سے تصوف

کی بعض نایاب کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ اور محکمہ کا یہ کام واقعی قابل تعریف ہے۔ اس کے زیر نگرانی کچھ رسائل بھی شائع ہوئے ہیں، لیکن کتابوں کی نشر و اشاعت کے اس سلسلے کو اور آگے بڑھانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر اخلاق و معاملات کے متعلق احادیث کا ایک انتخاب کر دیا جائے، اس انتخاب کا اردو اور بعض دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہو، اور اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھاپ کر کم سے کم داموں میں فروخت کیا جائے۔ یہ محکمۂ اوقاف کی ایسی خدمت ہو گی جس کے مفید اثرات نسلاً بعد نسل جائیں گے۔

اِن دنوں ریڈیو پاکستان سے صبح کی خبروں کے بعد "قرآن مجید اور ہماری زندگی" کے عنوان کے تحت ہر روز دس منٹ کی ایک تقریر ہوتی ہے ان تقریروں ہی میں سے بعض میں کچھ اور اضافہ کر کے اگر چھاپا جائے، تو وہ مُفید رہیں گی اور اصلاحِ اخلاق میں معاون ثابت ہوں گی۔

اِصلاحی، اخلاقی اور قومی تعمیر میں مدد دینے والے اسلامی ادب کی آج بڑی سخت ضرورت ہے، وہ ایسا ادب ہو، جو عوام تک پہنچے، اس لئے اُس کا عام فہم اور سستا ہونا ضروری ہے۔ یہ کام ہمارے ہاں کا محکمۂ اوقاف ہی کر سکتا ہے۔

امداد فی مآثر الاجداد

مؤلفہ:۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ

ترجمہ:۔ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے

(۲)

شیخ وجیہ الدین شیخ وجیہ الدین شجاعت و تقویٰ سے بدرجۂ کمال متصف تھے۔ حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ فرماتے تھے کہ میرے والد رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ روزانہ دن رات میں قرآن شریف کے دو پارے تلاوت کرتے تھے اور اس تلاوت کو سفر، حضر، غم اور خوشی میں ترک نہیں کرتے تھے۔ جب بوڑھے ہو گئے اور قوت بینائی کم ہو گئی تو جلی خط میں لکھا ہوا قرآن کریم اپنے پاس رکھتے تھے اور وہ سفر میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ نیز فرماتے تھے کہ وہ کسی کے کھیت میں اپنا گھوڑا نہیں ڈالتے تھے اگرچہ سارا لشکر اس کھیت میں سے گزرتا تھا اور ان کو بعض اوقات متعارف راستہ سے ہٹ کر چلنا پڑتا تھا۔

تقویٰ (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ کسی لڑائی میں اُن (شیخ وجیہ الدین) کا ساز و سامان گم[1] ہو گیا، کھانے پینے کا سامان بھی مہیا نہ ہوا ان کے ساتھی زبردستی گاؤں کے مویشی لے لیتے تھے اور کھاتے تھے۔ اور انہوں نے ایسی پرہیزگاری کی کہ دو تین فاقے ہو گئے اور قوت

---

[1] در نسخہ الف 'کم'

بالکل ساقط ہو گئی تو رزاقِ حقیقی جل شانہ کی رزاقیت نے اس صورت میں ظہور فرمایا کہ اتفاق سے وہ چابک سے زمین کو کرید رہے تھے جیسا کہ فکر کے وقت ہوتا ہے، وہاں سے ان کی خوراک کے بقدر چنے ملے چونکہ گری پڑی چیز کا کوئی مالک نہیں ہوتا ہے اس لئے ان چنوں کو دھویا، پاکیزہ کیا پھر اُبالا اور تناول کیا۔

نیز شیخ عبدالرحیم فرماتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) رحمۃ اللہ علیہ خدام، ملازمین اور گھسیاروں وغیرہ کے ساتھ ایسی شفقت اور انصاف سے پیش آتے تھے کہ اس زمانہ کے متقیوں سے کم ایسا برتاؤ دیکھا گیا ہے۔

بیعت نیز فرماتے تھے کہ ایک سفر میں میرے والد (شیخ وجیہ الدین) رحمۃ اللہ علیہ نے (کسی ولی) کی ولایت کے بعض ایسے شواہد ملاحظہ کیے کہ انہوں نے ان[1] سے بیعت کرلی اور صوفیوں کے اشغال میں مصروف ہوگئے۔ کم گوئی کی عادت ڈالی اور لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ اس زمانے کے صوفیوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کاتبِ حروف (شاہ ولی اللہ رح) کہتا ہے کہ شیخ مظفر رہتکی[2] میرے والد (شیخ عبدالرحیمؒ) اور شیخ ابوالرضا محمد (تایا) کے متعلق ان (شیخ وجیہ الدین) کے ارتباط کو بیان کرتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں (شیخ عبدالرحیم و شیخ ابوالرضا محمد) ان کی شیرینی (اشغالِ صوفیہ) سے سیراب ہوتے ہوں گے اور ان دونوں نے اس منبع زلال سے فیض حاصل کیا ہوگا۔

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ ان (شیخ وجیہ الدین) کی بہادری کی بہت سی حکایتیں بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ کی کچھ حکایتیں میں اس کتاب میں لکھتا ہوں تاکہ اس خاندان کے لوگوں کو اخلاقِ فاضلہ کے حاصل کرنے پر تنبیہ ہو اور عمل کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔

سید حسین کی ہمراہی ان حکایات میں سے ایک یہ ہے کہ (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے

---

[1] ان بزرگ کا نام نہیں لکھا۔

[2] شیخ مظفر رہتکی کا حال نہیں ملتا۔ مآثر الاجداد (تذکرہ صدیقیان رہتک) بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔

کہ میری عمر چار سال کی تھی[1] کہ وہ (شیخ وجیہ الدین) سید حسین کے ہمراہ جو زمانہ کا ایک مشہور بہادر تھا، سرزمین مالوہ میں قصبہ دھامونی وغیرہ کی طرف گئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں ایک کافر نے جو شجاعت و دلیری میں مشہور و معروف تھا، بغاوت و فساد اختیار کیا۔ بہت کوشش کے بعد وہ سید حسین کی ملاقات کے لئے آیا۔ پہرہ داروں نے چاہا کہ اس کو بغیر ہتھیاروں کے مجلس میں لائیں۔ وہ اس بات پر راضی نہ ہوا۔

جب اس سلسلہ میں زیادہ بحث و تکرار ہوئی تو اس نے سید حسین سے کہلا کر بھیجا کہ تم سپاہی ہو اور تمہارے پاس کافی جماعت ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ ایک آدمی کو بغیر ہتھیاروں کے نہیں چھوڑتے کہ تمہاری مجلس میں آسکے۔ سید حسین اس بات سے متاثر ہوئے اور حکم دیا کہ کوئی شخص اس کے ہتھیاروں سے تعرض نہ کرے۔

(شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ اس کی بشاشت کی صورت آج تک میرے خیال میں موجود ہے۔ وہ پان کھا رہا تھا اور آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے کہ شادی کی مجلس میں آرہا ہے جب میرے والد (شیخ وجیہ الدین) رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دیکھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ شخص ضرور اس مجلس میں ہاتھا پائی کرے گا انہوں نے فوراً ایک خدمتگار کو بلایا اور میری طرف اشارہ کیا کہ اس لڑکے کو کسی اونچی جگہ کھڑا کر دو۔ تاکہ اس جھگڑے میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

جب وہ نزدیک آیا تو سلام کرنے کے مقام سے آگے بڑھ گیا۔ دربان نے کہا کہ اس جگہ سے سلام کرو اور آگے مت بڑھو۔ اس نے دربان کے کہنے پر توجہ نہ دی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ سید حسین کے پاؤں کو بوسہ دوں تاکہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جب نزدیک پہنچا تو اس نے سید حسین کے اوپر تلوار چلائی۔ سید حسین بعجلت تمام ایک طرف ہو گئے اور شمشیر سید حسین کے تکیہ پر پڑی اور اس کو کاٹ دیا، اس نے دوسری مرتبہ پھر

---

[1] چار سال کے بچہ کو لڑائی میں ساتھ لے جانا سمجھ میں نہیں آیا، ممکن ہے "چہاردہ" ہو اور طباعت میں 'دہ' کا لفظ رہ گیا ہو۔

تلوار اٹھائی اور سید حسین کے مارنے کا ارادہ کیا کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) پھرتی سے اس کے پاس پہنچ گئے اور خنجر کی ایک ضرب سے اس کو واصل جہنم کیا۔

بے مثال بہادری

(ان کے بہادری کے قصوں میں سے) یہ بھی ہے کہ (شیخ عبدالرحیم) فرماتے ہیں کہ اسی علاقہ میں ایک دن سید حسین لڑائی میں شریک ہوئے۔ جب موافق و مخالف (دونوں طرف) کی صفیں آراستہ ہوگئیں تو رئیس کفار اکیلا گھوڑے پر سوار، تلوار گردن میں حمائل کئے ہوئے آگے بڑھا اور بلند آواز سے پکارا کہ میں فلاں (شخص) ہوں اس معرکے میں اکیلا کھڑا ہوں اگر چاہتے ہو کہ مجھے قتل کرو تو کر سکتے ہو۔ لیکن بہادری کی شرط یہ ہے کہ سید حسین اکیلا مجھ سے مقابلہ کرے۔ سید کی رگ ہاشمی حرکت میں آئی۔ وہ (سید حسین) اپنے گھوڑے کو صف سے باہر لائے اور اس کے مقابلہ میں مشغول ہوگئے۔ اس کافر نے عجب چابک دستی کی جلدی سے تلوار چلادی، سید حسین نے اس کو اپنی ڈھال پر لیا۔ اس تلوار نے ڈھال کی ایک کل[1] (دستہ) کو کاٹ دیا اور دوسرے دستہ میں اٹک گئی۔ جب اس راجا نے اس تلوار کو پوری قوت سے ڈھال میں سے کھینچا تو سید حسین گھوڑے سے گر گئے۔ کافر گھوڑے سے کود پڑا اور سید حسین کے سینہ پر بیٹھ گیا اور ان کو قتل کرنے کی سوچنے لگا میرے والد (شیخ وجیہ الدین) اسی وقت اس کے پاس پہنچے اور تلوار کی ایک ضرب سے اس کی زندگی کی رسّی کو کاٹ دیا۔

جب وہ اس جگہ سے اُٹھ گئے اور ہر ایک اپنے اپنے ٹھکانے پر آگیا تو ایک دوسرا سوار پہلے کے ہم شکل آگے بڑھا۔ اور بلند آواز سے پکارا کہ میں فلاں ہوں اور مقتول کا بھائی ہوں، تمہارے سامنے اکیلا کھڑا ہوں۔ جو کوئی چاہے اس سے کہو کہ وہ مجھے مارے لیکن بہادری کی شرط یہ ہے کہ میرے بھائی کا قاتل مجھ سے مقابلہ کرے۔ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) اس کی طرف متوجہ ہوئے اور چند مختلف ضربوں کے بعد اسے جہنم رسید کیا۔

ایک ساعت کے بعد اس صورت اور شباہت کا تیسرا سوار ظاہر ہوا (اس نے بھی) اسی

---

[1] در نسخہ الف 'گل'

طرح اپنا مقابل طلب کیا۔ میرے والد پھر مقابلہ کے لئے آگے بڑھے اس نے میرے والد کی دونوں کلائیوں کو پکڑلیا اور چاہا کہ زمین پر دے مارے یا اپنے گھوڑے پر ڈال لے۔ وہ مدافعت اور مزاحمت کرتے تھے۔ آخرانہوں نے دیکھا کہ کافر زیادہ قوی ہے تو پھر انہوں نے بطور حیلہ کہا کہ

'ہاں اس امیر کو اس کے پیچھے سے مت مار'

اور وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ کافر نے اپنا منہ پیچھے کی طرف پھیرا، اس وقفہ میں درحقیقت اس کے بازو کی قوت کمزور پڑگئی۔ انہوں نے اپنے کو اس سے رہائی دلائی اور خنجر سے اس کا کام تمام کردیا۔ اس مقابلہ کے بعد کفار کو شکست ہوئی اور اسلام کا لشکر مظفر ومنصور اپنے پڑاؤ پر آیا۔

تین دن کے بعد ایک بڑھیا ان کا نام پوچھتی پوچھتی ان کے خیمہ پر آئی اور کہا کہ میں ان تینوں مقتولوں کی ماں ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ دنیا میں کوئی شخص میرے بیٹوں سے زیادہ شجاع اور بہادر نہیں ہے۔ خدا کی تجھ پر رحمت ہو کہ تو سب سے بہتر ہے۔ میں نے ان کے بجائے تجھے فرزند اختیار کیا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تو مجھے اپنی ماں کہے اور کچھ دنوں گاؤں میں میرے پاس رہے تاکہ تجھے خوب دیکھوں[1] اور مقتولوں کی طرف سے تسلی پاؤں۔

انہوں (وجیہ الدین) نے اپنے خادم سے کہا کہ میرے گھوڑے پر زین کسو۔ اُن کے اعزّہ کے گروہ میں سے جو ان کے بھائی بند تھے وہ مانع ہوئے اور کہا کہ تعجّب ہے کہ تم جیسا عقل مند آدمی اس قسم کی حرکت کرے وہ اس جماعت کے منع کرنے کو کسی شمار میں نہ لائے۔ اس گروہ نے (سب کیفیت) سید حسین کو بتائی۔ سید حسین نہایت عجلت کے ساتھ ان کے خیمے میں آئے اور مؤکّد قسم دلاکر ان کو اس طرف جانے سے باز رکھا۔

جب انہوں نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو انہوں نے اس بڑھیا کو بلایا اور کہا کہ اے

---

[1] درنسخہ مجتبائی "سیر بینم" ودرنسخہ الف "پسر بینم"

ماں ! یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑتے کہ میں (تیرے ساتھ) چلوں۔ لیکن کچھ روز کے بعد تیرے گاؤں میں آوں گا۔ کچھ دنوں کے بعد جب احباب غافل ہوگئے تو وہ سوار ہوکر اس بڑھیا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بڑھیا ایسی محبت، اخلاص اور تعظیم سے پیش آئی کہ حقیقی والدہ اور اس میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) نے فرمایا کہ بارہا میں اس کے یہاں جاتا رہا۔ میں اس کو دادی کہتا تھا اور وہ محبت میں کمی نہیں کرتی تھی بلکہ میں نے اپنی دادی کو نہیں دیکھا تھا اور بچپن میں، میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس بڑھیا کے علاوہ میری دوسری دادی بھی ہے [1]

شاہ شجاع کی لڑائی میں شرکت

ان (شیخ وجیہ الدین) کا یہ بھی واقعہ ہے کہ والد صاحب نے فرمایا کہ جب عالمگیر بادشاہ ہوا تو اس کے بھائی شاہ شجاع نے بنگالہ کی طرف خروج کیا۔ عالمگیر اس سے لڑنے کے لئے متوجہ ہوا اور (شیخ وجیہ الدین) بھی عالمگیر کے لشکر میں تھے سخت لڑائی ہوئی دو لشکر تباہ ہوئے۔ آخر دو تین مست ہاتھیوں نے شاہ شجاع عالمگیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہر ہاتھی کے پیچھے زرہ پوشوں کی ایک جماعت تھی۔ جب یہ صورت ظہور پذیر ہوئی تو عالمگیر کے لشکر میں تفرقہ پڑ گیا۔ اور ہر ایک کسی (نہ کسی) طرف کو چلا گیا۔ عالمگیر کے ہاتھی کے ارد گرد بہت تھوڑے سے آدمیوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔

اس وقت میرے والد (شیخ وجیہ الدین) علیہ الرحمہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ان ہاتھیوں میں سے کسی ایک پر حملہ کردیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ جان دینے کا وقت ہے ایسے موقعہ پر استقامت ہر کسی سے ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ ہاں جو کوئی علٰحدگی چاہتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے۔ سوائے چار آدمیوں کے اکثر ساتھیوں نے علٰحدگی اختیار کرلی۔

فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے رفیقوں میں سے کوئی ہماری محبت میں شریک ہوگا، تو یہی

---

[1] اس واقعہ سے غیر مسلموں کے ساتھ ان کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

چار آدمی ہوں گے ۔ ان چار آدمیوں نے ان کے شکار بند کو مضبوطی سے پکڑا اور آپس میں طے کیا کہ جہاں کہیں وہ (شیخ وجیہ الدین) ہوں گے ہم بھی ان کے ساتھ ہوں گے ۔ اس کے بعد اس ہاتھی پر جو زیادہ سرکشی کر رہا تھا، حملہ کر دیا اور توقف کیا ۔ یہاں تک کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ کو ان کی طرف اٹھایا اور چاہا کہ ان کو گھوڑے سے اٹھا دے یا گرا دے ، اس وقت انہوں نے تلوار کے ایک حملہ سے اس کی سونڈ کو نیچے کی طرف سے کاٹ ڈالا ، ہاتھی ایک خوف ناک آواز نکال کر بھاگا اور اس کا نقصان اس کی جماعت کو ہوا ۔ یہ پہلی فتح تھی[1] عالمگیر نے اس معاملہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور فتح کے بعد چاہا کہ ان کے منصب کو زیادہ کر دے ۔ انہوں نے استغنار اختیار کیا اور قبول نہ کیا ۔

سید شہاب الدین کی سرزنش

ان کے واقعات میں یہ بھی ہے کہ (شیخ عبد الرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ سید شہاب الدین کو بادشاہ کی طرف سے محاسبہ پیش آیا وہ اس کے کفیل (ضامن) بن گئے اور جب اس نے رقم کے ادا کرنے میں تساہل کیا تو پھر ان (شیخ وجیہ الدین) سے مطالبہ کیا گیا ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس (شہاب الدین) سے گفتگو کی ، اس نے کہا کہ میرے پاس روپیہ بالکل نہیں ہے ، تلوار حاضر ہے ۔

انہوں نے یہ سن کر تبسّم کیا اور کہا کہ شمشیر پکڑنا آسان ہے مگر اس کی ذمہ داری سے بر آنا مشکل ہے ۔ اس کی غیرت حرکت میں آئی ۔ اس نے ان پر خنجر چلایا جس کو انہوں نے

---

[1] جادو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب 'ہسٹری آف اورنگ زیب' جلد دوم میں شجاع کے مقابلہ اور جنگ کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں انیسویں اور تیئیسویں باب میں بہت تفصیل بیان کی ہے اس میں اورنگ زیب کے وقار، تحمّل، تہجد گزاری اور رجوع الی اللہ کا اکثر ذکر کیا ہے حالانکہ جادو ناتھ سرکار نے موقعہ بے موقعہ اپنے تعصب کا اظہار کیا ہے مگر ان ابواب میں کہیں اس بیان کا تاثر نہیں ملتا ۔

(ہسٹری آف اورنگ زیب از جادو ناتھ سرکار جلد دوم باب انیس و تیئیس ، کلکتہ ۱۹۱۲ء)

بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور سیدھے ہاتھ سے اس کے طپانچہ مارا وہ اوندھا ہو کر زمین پر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

ایک خادم سے انہوں نے فرمایا کہ اس کو رسی سے باندھ دے۔ اور اس کے گھوڑوں اور اونٹوں کو طویلے سے لے آئے۔ ایک ساعت کے بعد اسے ہوش آیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تیرا ڈینگیں مارنا کہاں گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے کوئی کمی نہیں کی۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ سے پہلے حرکت میں آگیا۔ مجھے سخت چوٹ آئی۔ میں بے ہوش ہو گیا اس میں میری کیا تقصیر ہے فرمایا تو ٹھیک کہتا ہے خادم کو یہ اشارہ کیا کہ رسی اس سے علٰحدہ کر دے۔ اور اس کے ہاتھ میں خنجر دے دے۔ اس نے (خنجر) لے لیا اور چاہا کہ حملہ کرے۔ اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا اور وہ حملہ نہ کر سکا حضرت (شیخ عبدالرحیم) نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔

قوتِ قلب کا مظاہرہ

ان ہی کے واقعات میں سے ہے کہ حضرت (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میرے والد کے قلب کی قوت اس حد تک تھی کہ کسی لڑائی میں سخت مقاتلہ ہوا۔ دونوں طرف سے کثیر جماعت مقتول ہوئی اور آخر فتح مسلمانوں کو ہوئی جب مسلمانوں کا سردار اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو رات کے وقت اس لشکر کے سردار کی ایک جماعت نے اس کے حضور میں مقتولوں کی تعداد کے متعلق مناظرہ کیا۔ ہر ایک نے رائے ظاہر کی۔ انہوں (شیخ وجیہ الدین) نے کہا کہ میرے خیال میں آتا ہے کہ معرکہ میں دونوں طرف کے دو سو آدمی (کام آئے) ہوں گے۔ یا اس تعداد سے پانچ زیادہ یا پانچ کم ہوں گے۔ اور جو لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے ان کا حال معلوم نہیں۔

حاضرین نے تعجب کیا۔ اس جماعت کے تعجب کرنے سے ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی اور چاہا کہ حقیقت حال پر مطلع ہوں۔ وہ اس مجلس سے ایسے اٹھے جیسے کوئی قضائے حاجت کو جاتا ہے۔ اور اس اندھیری رات میں جب کہ بادل اور بجلی گرج رہی تھی میدان جنگ کی طرف چل پڑے اور بہت احتیاط کے ساتھ ان (مقتولین) کو شمار کیا۔ اسی دوران ان کا ہاتھ ایک زخمی پر پڑا کہ جس میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ اس نے چیخ ماری۔ انہوں نے اس کو تسلی دی اور اس کو اپنا نام بتایا۔

اس کے بعد ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کچھ لڑائی گاؤں کے درمیان میں بھی ہوئی تھی، اس کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ اور ان مقامات کو خوب دیکھا جہاں احتمال تھا، اسی دوران میں ان کا ہاتھ ایک بڑھیا پر پڑگیا کہ جو لڑائی کے وقت ایک گوشہ میں چھپ گئی تھی۔ اس نے بھی چیخ پکار کی۔ اس کو بھی انہوں نے تسلی دی اور اس کو بھی اپنا نام بتلایا۔

مقتولین کی تعداد ان (شیخ وجیہ الدین) کے کہنے کے مطابق نکلی۔ وہ لشکر میں واپس آئے اور اس مجلس کو اسی طرح اینٹھا ہوا پایا۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اور دیکھا تھا وہ (اس مجلس کو) بتایا۔ اس بات سے ان کو اور بھی تعجب ہوا۔ اس سردار نے تقریباً سو آدمی مشعلوں کے ساتھ مقرر کیے تاکہ وہ مقتولین کو شمار کریں اور ان دونوں آدمیوں کو لاویں۔ یہ جماعت اس وقت اور مقام کی ہیبت کی وجہ سے نہیں چاہتی تھی کہ جائے، بالآخر میدان جنگ کو روانہ ہوئی، مقتولین کو شمار کیا اور ان دونوں آدمیوں کو لائے۔ ان (شیخ وجیہ الدین) کے کہنے کے موافق ظاہر ہوا اور اُن دونوں نے (جن کو وہ ساتھ لائے تھے) ان (شیخ وجیہ الدین) کے نام سے (لوگوں کو) مطلع کیا۔ ان کے اس طرح کے نوادر اور واقعات بہت سے ہیں۔

القلیل یُنبیٔ عن الکثیر	قلیل کثیر کی خبر دیتا ہے۔
والغرفۃ یحکی عن البحر الکبیر	تھوڑا سا پانی بڑے سمندر کو بتاتا ہے۔

اولاد

شیخ رفیع الدین محمد بن قطب عالم بن شیخ عبدالعزیز کی لڑکی کے ساتھ ان (شیخ وجیہ الدین) کی شادی ہوئی تھی (جس سے) تین لڑکے پیدا ہوئے۔

(۱) مخدومی شیخ ابو الرضا محمد۔ (۲) مخدومی شیخ عبدالرحیم۔

(۳) مخدومی شیخ عبدالحکیم۔

شہادت

والد صاحب (شیخ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ایک رات تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے (ان کو) ایک سجدے میں بہت دیر ہوئی یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ ان کی روح ان کے جسم سے نکل گئی۔ جب حالت درست ہوئی تو اس بہت دیر (کے سجدے) کے بارے میں میں نے سوال کیا۔ فرمایا کہ مجھے غیبت واقع

ہوئی اور وہاں مجھے اپنے ان عزیزوں کے بارے اطلاع ملی جو شہید ہو گئے تھے۔ ان کے حالات وواقعات مجھے بہت پسند آئے اور میں نے حضرت حق سبحانہ کی جناب سے شہادت کی درخواست کی اور بہت زیادہ گڑگڑایا یہاں تک کہ مجھ پر قبولیت ظاہر ہوگئی اور دکن کی طرف کا حکم ہوا کہ شہادت کی جگہ وہاں ہے۔

اس واقعہ کے بعد از سر نو سفر کا اسباب مہیا کیا۔ حالانکہ نوکری چھوڑ چکے تھے اور اس کام سے ایک نفرت سی ہو گئی تھی گھوڑا خریدا اور اس طرف (دکن) کو چل دیئے اور ان کو یہ گمان ہوا کہ 'سیوا' سے (مقابلہ کا اشارہ) ہوگا کہ جو اس وقت کفار کا سردار تھا[۱] اور جس سے مسلمانوں کے قاضی کی نسبت بہت سخت بے حرمتی ظہور میں آئی تھی[۲]

جب وہ برہان پور پہنچے تو ان کو منکشف ہوا کہ وہ شہادت کے مقام کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اسی طرف واپس لوٹے، اثنائے راہ میں بعض تاجروں کے ساتھ انہوں نے موافقت کا عہد باندھا۔ جو (تاجر) اصلاح وتقویٰ سے آراستہ تھے اور یہ ارادہ کیا کہ قصبہ 'ہنڈیا' کے راستہ سے ہندوستان کو آئیں۔ اسی دوران میں ایک بوڑھا آدمی (ان کے) سامنے آیا کہ جو گرتا پڑتا چلا جارہا تھا۔ انہوں نے اس کے حال پر رحم کیا اور اس سے مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ دہلی جاؤں۔ انہوں (شیخ وجیہ الدین) نے فرمایا کہ میرے ملازموں سے تین پیسے یومیہ لو۔ وہ بوڑھا کافروں کا جاسوس تھا۔

جب (وہ لوگ) 'نوبریا'[۳] کی سرائے میں پہنچے کہ جو دریائے نربدہ سے دو تین منزل ہندوستان کی طرف ہے۔ جاسوس نے اپنے بھائیوں (ساتھیوں) کو خبر کردی۔ سرائے میں ڈاکوؤں کی ایک جماعت آگئی۔ اور وہ (شیخ وجیہ الدین) اس وقت قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھے۔ اس گروہ میں سے تین آدمی آگے بڑھے (اور پوچھا) کہ وجیہ الدین کون

۱؎ سیواجی کا انتقال ۴؍اپریل ۱۶۸۰ء کو ہوا لہٰذا اس سے قبل کا یہ واقعہ ہوگا۔

۲؎ اس واقعہ کی تفصیل نہیں دی۔

۳؎ درنسخہ الف توتیڑیا۔

ہے؟ جب انہوں (ڈاکوؤں) نے پہچان لیا تو کہا کہ ہمیں تم سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ مال بھی نہیں ہے۔ اور ہماری جماعت میں سے ایک آدمی پر تمہارا حق نمک (احسان) بھی ہے لیکن یہ تاجر اپنے ساتھ فلاں فلاں مال رکھتے ہیں۔ ہم ان کو نہیں چھوڑیں گے۔

چونکہ اس سفر کا اصلی سبب ان (شیخ وجیہ الدین) کو معلوم تھا۔ لہذا وہ اس رفاقت کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ اور قتل و غارت گری کو روکنے کے لئے آگے بڑھے۔ اسی دوران میں ان کو بائیس زخم آئے اور ایک زخم سے ان کا سر تن سے جدا ہوگیا۔ اس کے باوجود تکبیر کہتے ہوئے انہوں نے پچاس قدم تک کفار کا تعاقب کیا، اس کے بعد ایک عورت یہ حال دیکھ کر بہت متعجب ہوئی اسی وقت وہ گر پڑے اور وہیں وہ دفن ہوئے[1]

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ ایک دن وہ نظر آئے اور زخموں کے مقامات دکھلائے۔ میں (شیخ عبدالرحیم) نے ان کے ثواب کے لئے کوئی چیز صدقہ دے دی۔ اور (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میں چاہتا تھا کہ ان کے جسم کو منتقل کردوں کہ ایک اور مرتبہ وہ (شیخ وجیہ الدین) نظر آئے اور اس بات سے منع کیا۔ ان (شیخ وجیہ الدین) کے قتل کی خبریں حد سے زیادہ مشہور ہیں۔

---

[1] خلیفہ اول جماعت احمدیہ قادیان حکیم نورالدین (ف ۱۹۱۴ء) نے لکھا ہے:

"اسی راستہ (اگنہ چھاؤنی سے بھوپال جاتے ہوئے تھوڑے فاصلہ) میں، میں نے حضرت شاہ وجیہ الدین کے (جو شیخ المشائخ شاہ ولی اللہ صاحب کے بڑے تھے) گنج شہیداں کو دیکھنے اور عبرت حاصل کرنے میں بہت فائدہ اٹھایا۔ وہاں شاہ صاحب (وجیہ الدین) کو 'ننگی ولی' کہتے ہیں۔"

(مرقاۃ الیقین فی حیوۃ نورالدین، مرتبہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ص ۸۴ طبع لاہور، احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور)۔

سیالکوٹی عبقریت کا ایک نادر شاہکار

الدُّرَّۃُ الثمینہ

شبیر احمد غوری - علیگڑھ

(۲)

پرچہ نویس نے یہ خبر شاہجہاں کو پہنچائی، جسے ایرانیوں کے مقابلے میں ہندوستانی علم و فضل کی ہوا خیزی سے بے حد صدمہ ہوا۔ مزاج شناس وزیر (علامی سعد اللہ خاں) نے فوراً شاہی مزاج کے تکدّر و ملال کو رفع کرنے اور اس غرض سے ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کو بحال کرنے کا انتظام کیا۔ شاہجہانی عہدِ حکومت مجمع اہل کمال تھا۔ ان میں معقولات و منقولات جملہ علوم کے ماہر تھے مگر سعد اللہ خاں کی جوہر شناس نگاہوں نے امرِ خطیر کی انجام دہی کے لئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کو منتخب کیا اور انہیں لکھا:

"بکمترین مریداں حکم شد کہ باں فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند برنگارد وبرگزارد کہ آں افادت وافاضت مرتبہ را دریں مسائل مختصرے جامع وموجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکماء، وتاویلات علماء، ووجہ تکفیر اسلامیین واقوال ملیین ومباحثات ومناظرات وشکوک وشبہات وازالات وازاحات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت تحقیقات واصل کلام درہر باب واساس سخن درہر جواب وآنچہ براں ظفر یافتہ باشند وبرہان بداں فائز شدہ باشند ...... نوشتہ درحضرت خلافت درعرض دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ

بایران فرستادہ شود۔ وآن چناں باید بود کہ قابل فرستادن ولائق اضافت بآں فضائل دستگاہ بود وبروزگار ازاں بازہ گویند۔ ودر تاریخ نامہا نوشتہ آید[1]

علامی سعد اللہ خاں نے 'دس پندرہ دن' کی مہلت دی تھی مگر مولانا عبد الحکیم نے اس رسالہ کو محض ایک ہفتہ میں مرتب کیا[2]۔ اور اس طرح 'مسائل ثلثہ' کے باب میں امام غزالی کے زمانہ حکماء و متکلمین کی جو نزاع چلی آرہی تھی، ختم ہوئی۔

'الدرۃ الثمینہ' نے جس طرح 'مسائل ثلثہ' کی نزاع کا خاتمہ کیا، اسی طرح ایک نئی بحث کا آغاز بھی کیا۔ یہ 'علم باری تعالیٰ بجزئیات' کی بحث ہے جو بعد میں عربی درسگاہوں کے اندر بہت زیادہ قیل وقال کا موضوع رہی ہے۔ چنانچہ قاضی مبارک 'سلّم العلوم' کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اعلم ان مسئلۃ علم الواجب مما تحیرت فیہ الاوہام"[3]

اور اگرچہ اس بحث کے سلسلے میں مسئلہ 'علم باری تعالیٰ' کے متعلق مذاہب مختلفہ کے قائلین علامہ عبد الحکیم سے کہیں پہلے گذر چکے تھے۔ مگر منظم طور پر ایک مستقل بحث کی حیثیت میں اس کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"اعلم ان علمہ تعالیٰ اما ان یکون عین ذاتہ اوخارجا عنہ اما قائما بنفسہ اوبذاتہ او بامر خارج"

(جاننا چاہیئے کہ باری تعالیٰ کا علم یا تو عین ذات ہوگا یا اس سے خارج ہوگا (بصورت ثانی) یا تو وہ خود سے قائم ہوگا یا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوگا یا کسی امر کے ساتھ قائم ہوگا)

علامہ عبد الحکیم کے بعد سب سے پہلے اس مسئلہ کے ساتھ تعرض ہمیں 'میرزاہد ہروی'

---

[1] تذکرہ باغستان، لامام الدین الریاضی ورق ۶۸۴ الف۔ مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی۔

[2] علامہ عبد الحکیم نے اس رسالہ کو ۵ ربیع الثانی ۱۰۵۰ھ کو لکھنا شروع کیا اور اسی مہینہ کی ۱۲ تاریخ کو مکمل کرلیا۔ [3] جاننا چاہیئے کہ "مسئلہ علم واجب" ان مسائل میں سے ہے جن کے اندر عقل وفہم متحیر ہیں۔

کے بیان سے ملتا ہے اور جن الفاظ میں موخر الذکر نے اس بحث کو قلمبند کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سیالکوٹیؒ کا رسالہ 'الدرۃ الثمینہ' ان کی نظر کے سامنے تھا۔ کیونکہ انہوں نے علامہ کے ارشاد گرامی کی محض تلخیص کر دی ہے۔ ذیل میں دونوں کے افادات عالیہ نقل کئے جاتے ہیں:

الدرة الثمينة

اعلم ان مراتب العلم التفصيلي اربع:
الاولى ما يعبر عنه بالقلم والنور والعقل في الشريعة وبالعقل الكل عند الصوفية و بالعقول عند الحكماء۔ فالقلم الذي هو اول المخلوقات حاضر بذاته مع ما هو مكنون فيه عند الواجب تعالى فهو علم تفصيلي بالنسبة الى العلم الاجمالي الذي هو عين ذاته وبسيط بالقياس الى ما في المراتب۔ وثانيها ما يعبر عنه في الشريعة باللوح المحفوظ وبالنفس الكلي عند الصوفية وبالنفوس الفلكية المجردة عند الحكماء فاللوح المحفوظ حاضر بذاته مع ما ينتقش فيه من صور الكليات عند الواجب تعالى فهو علم تفصيلي بالنسبة الى الرتبتين اللتين فوقها۔ وثالثها كتاب المحو والاثبات وهو القوى الجسمانية التي ينتقش فيها صور الجزئيات المادية۔ وهي المنطبعة في الاجسام العلوية و السفلية فهذه القوى مع ما فيها من النقوش حاضرة عنده تعالى۔ ورابعها الموجودات الخارجية من الاجسام العلوية والسفلية واحوالها

میرزاهد رساله (منهیه)

اعلم ان العلم التفصيلي للواجب سبحانه عين ما اوجده في الخارج ومراتبه اربع: احدها ما يعبر عنه بالقلم و النور والعقل في الشريعة وبالعقل الكل عند الصوفية وبالعقول عند الحكماء فالقلم حاضر عنده تعالى مع ما يكون فيه۔ وثانيها ما يعبر عنه في الشريعة باللوح المحفوظ وبالنفس الكلي عند الصوفية وبالنفوس الفلكية المجردة عند الحكماء فاللوح حاضر عنده تعالى مع ما فيه من صور الكليات۔ وثالثها ما يعبر عنه بكتاب المحو والاثبات في الشريعة وهو القوى الجسمانية التي ينتقش فيها صور الجزئيات المادية وهي القوى المنطبعة في الاجسام العلوية فهذه القوى مع ما فيها من النقوش المنطبعة حاضرة عنده تعالى ورابعها سائر الموجودات الخارجية

فانہا حاضرۃ عند واجب الوجود بذاتہا فی　　　　والذہنیۃ الحاضرۃ عندہ تعالیٰ "

مرتبۃ ایجادہ "

میرزاہد ہروی کا انتقال ۱۱۰۱ھ میں ہوا۔ یعنی 'الدرۃ الثمینۃ' کی تصنیف کے چوالیس اور علامہ سیالکوٹی کی وفات کے چونتیس سال بعد۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ علامہ سیالکوٹی نے اس مسئلہ میں میرزاہد کی خوشہ چینی کی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ بحث میرے زاہد نے علامہ کے رسالہ 'الدرۃ الثمینۃ' سے اخذ کر کے 'میر زاہد رسالہ' کی "منہیہ" میں درج کی۔

لیکن علم باری تعالیٰ کے باب میں مذاہب مختلفہ کی نقل و حکایت تفصیل کے ساتھ ہمیں قاضی مبارک گوپاموی کی 'شرح سلم العلوم' میں ملتی ہے۔ بحالاتِ موجودہ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ بحث قاضی مبارک نے استیناناً چھیڑی ہے یا ماتن (ملا محب اللہ بہاری) کے ذہن میں بھی تھی، کیونکہ فاضل بہاری (ملا محب اللہ) نے تو باری تعالیٰ عز اسمہٗ کے بارے میں اتنا ہی فرمایا تھا:

"لا یحد ولا یتصور"

ہو سکتا ہے قاضی صاحب (قاضی مبارک) نے اظہار فضل و کمال کے لئے اپنے اساتذہ کی علمی روایات سے 'شرح متن' کی تحسین میں کام لیا ہو۔ کیونکہ ان کا ایک سلسلۂ تلمذ تو میرزاہد ہروی تک پہنچتا ہے۔ اور اگر میرزاہد نے 'میر زاہد رسالہ' کی 'منہیات' میں 'الدرۃ الثمینۃ' کی خوشہ چینی کی ہے تو یہ امر بھی قرین قیاس ہے کہ علم باری تعالیٰ کے باب میں مذاہب مختلفہ کے بیان کے سلسلے میں وہ ان سے متاثر ہوئے ہوں اور اگرچہ یہ تفصیل تحریری طور پر ان کی تصنیفات میں نہیں ملتی۔ لیکن باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ وہ دوران درس میں اپنے شاگردوں کے سامنے اس کی تقریر کرتے رہیں ہوں گے۔ اور یہ علمی روایت ان کے تلامذہ کے ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں منتقل ہوتی رہی ہو گی تا آنکہ قاضی مبارک تک پہنچی۔

لیکن قاضی صاحب کا دوسرا سلسلہ تلمذ یہ ہے کہ وہ شاگرد تھے ملا قطب الدین گوپاموی کے اور وہ شاگرد تھے اپنے پدر بزرگوار قاضی شہاب الدین کے۔ قاضی شہاب الدین شاگرد تھے مولوی عبدالرحیم مرادآبادی کے جو شاگرد علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے۔ اس طرح قاضی مبارک کا

سلسلۂ تلمذ براہ راست علامہ سیالکوٹی تک پہنچتا ہے۔ اس لئے یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ اساتذہ اپنی اپنی نوبت میں اپنے استاد (علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی) کی علمی و فکری کاوشوں کے امین بنتے رہے ہوں گے، اور آخر میں اس ورثہ کے وارث قاضی مبارک ہوئے۔

اور اس طرح انہوں نے اس بحث کو 'سلم العلوم' کی شرح میں 'لا یحد ولا یتصور' کی توضیح کے سلسلے میں استیناناً ودیعت فرمایا۔

بہرحال 'سلم العلوم' کے شراح میں سب سے پہلے قاضی مبارک نے اس بحث (علم باری کے باب میں مذاہب مختلفہ کے سرد و نقل) کا آغاز کیا اور بعد میں 'سلم' کے دوسرے شارحین نے اس علمی روایت کا تتبع کیا۔ چنانچہ ملاحسن نے اپنی 'شرح سلم العلوم' میں لکھا ہے:

"لا ینکشف الغطاء عن وجہ المقصود مالم یذکر مسئلۃ علم الواجب التی ھی من مھمات المسائل قد تحیرت فیہ الافہام ولم یأت احد بما یتعلق بقلب الاذکیاء"

(مقصود کے چہرے سے پردہ اس وقت تک نہیں اٹھ سکتا جب تک مسئلہ علم واجب کو بیان نہ کیا جائے جو (حکمت و منطق کے) اہم مسائل میں سے ہے۔ اور جس کے اندر (عقلاء دہر و حکماء عصر کی) عقلیں متحیر ہیں اور کسی خاص فاضل نے اس کی ایسی تحقیق نہیں کی جو دل کو لگتی ہو)

غرض جس طرح 'مسائل ثلثہ' کے باب میں 'الدرۃ الثمینہ' نے اس نزاع کا خاتمہ کیا جو امام غزالی کے زمانہ سے چلا آرہا تھا، اسی طرح اس نے اس بحث کا بھی افتتاح کیا جو بعد میں 'سلم العلوم' کے شراح اور 'میر زاہد رسالہ' کے محشیوں کے یہاں 'مسئلہ علم واجب' کے عنوان سے گرمی بحث کا موضوع بنی رہی۔

ب۔ اسلامی ہند کی علمی کاوشوں میں "الدرۃ الثمینہ" کی اہمیت

اس تاریخی تفصیل سے واضح ہو گیا ہو گا کہ 'الدرۃ الثمینہ' ہندوستانی عبقریت کا عظیم کارنامہ ہے۔ یوں بھی ہندوستان کے علماء اپنے اپنے عہد میں 'غزالی و رازی' کے ہم پلہ سمجھے جاتے رہے ہیں چنانچہ ضیاء الدین برنی عہد علاء الدین خلجی کے علماء کے بارے میں لکھتے ہیں:

"در تمامی عصر علائی در دار الملک علماء بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت

بود و در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و صفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشند و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات ..... موئے می شگافتند ..... و بعضے ازاں استاداں در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند"
(تاریخ فیروز شاہی ص۲۵۲)

اور یہ کوئی مبالغہ آمیز تبصرہ نہیں ہے چنانچہ جب تیمور نے دہلی کو فتح کیا اور فتنہ و فساد ختم ہونے کے بعد مولانا تھانیسری امیر تیمور کی محفل میں پہنچے تو وہاں شیخ الاسلام سے جو صاحب ہدایہ کے پوتے یا پڑپوتے تھے محفل میں تقدم و تاخر کی بنا پر گفتگو بڑھی تو انہوں نے صاحب ہدایہ کے اغلاط کو واضح کرانا چاہا مگر امیر تیمور نے مصلحتاً اسے ملتوی کر دیا۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے :۔

"بعد از تسکین فتنہ خلاص یافتہ بمجالست امیر تیمور رسید و میان ایشاں و شیخ الاسلام کہ نبیرہ مولانا برہان الدین مرغینانی صاحب ہدایہ بود، جہت تقدم و تاخر مجلس گفت و گوئے شد۔ امیر تیمور گفت کہ ایشاں نبیرہ صاحب ہدایہ اند۔ مخدوم گفت کہ صاحب ہدایہ پدر کلاں ایشاں در چند محل از ہدایہ خطا کردہ است، ایشاں اگر یک جا خطا کردہ باشند، چہ باک۔ شیخ الاسلام در جواب گفت آں محلہائے خطا کداہا است بہ ثبوت باید رسانید۔ مولانا اشارت بفرزندان و شاگردان خود کرد کہ ایشاں تقریر می کنند۔ امیر تیمور ملاحظۂ ناموس کردہ صحبت بمجلس دیگر انداخت" (اخبار الاخیار ص۱۵۱)

اس سے بیرون ہندوستان کے فضل و کمال پر مسلم ہندوستان کے تفوق و برتری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ "فتاوائے تاتارخانیہ" کی عظمت و اہمیت کی طرف جو اس واقعہ سے کوئی نصف صدی پیشتر مدون کیا گیا تھا، شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور فقہی کارنامہ عہد عالمگیری میں مرتب ہوا جو آج بھی "فتاوائے ہندیہ" کے نام سے دنیا جہان کے علمائے احناف کا معمول بہ ہے۔

مگر اس قسم کے شاہکار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور ان میں ایک معتدبہ تعداد

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصانیف کی ہے۔ چنانچہ "شرح مواقف" پر ترکی اور مصر میں بے شمار حواشی لکھے گئے مگر قبول عام کی سند صرف دو تین ہی کو ملی اور ان میں ایک علامہ عبدالحکیم کا "حاشیہ شرح مواقف" ہے۔ اسی طرح "قطبی" (شرح شمسیہ) پر لاتعداد حاشیے لکھے گئے مگر علمائے محققین میں چند ہی متداول ہوئے اور ان میں بھی ایک حاشیہ علامہ عبدالحکیم کا ہے۔ اور یہ دونوں حاشیے ہندوستان میں نہیں بلکہ مصر میں چھپے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی تاریخ اسلام کے دیگر عباقرۂ روزگار کے دوش بدوش نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اسی عبقریٔ اعظم کا رسالہ "الدرۃ الثمینۃ" ہے جو جابجا طور پر علم کلام کی تاریخ میں واسطۃ العقد قرار دیا جا سکتا ہے (اس کی تفصیل اوپر مذکورہ ہو چکی ہے)۔ مگر بعد میں اپنے اغلاق و غموض سے زیادہ قوم کی اسلاف فراموشی کے نتیجہ میں گوشۂ خمول میں جا پڑا اور یورپی افکار کی چمک دمک سے خیرہ ہو کر ہم نے اُسے تقویم پارینہ سمجھ لیا ہے، حالانکہ "الدرۃ الثمینۃ" کے افادات میں ایک دائمی پابندگی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے افراد کے لئے وہ عامی ہوں یا عالم "قدم عالم"، "نفی حشر اجساد" اور "انکارِ علمِ باری تعالیٰ بجزئیاتِ متغیرہ" کے بتوں کو توڑنا قیام قیامت تک فرض ہے۔ خواہ ان اصنامِ خیالی کی نمایش افلاطون وارسطو کے فلسفہ کے ذریعہ کی جائے یا کانٹ، ہیگل اور برگسان کے تفلسف کے نتیجے میں ان زندہ و پایندہ افکار کی محض تاریخی اہمیت ہی نہیں ہے، ان کی اجتماعی افادیت بھی ہے کیونکہ جب تک نظام حیات کو اسلامی تعلیمات پر استوار کیا جائے گا (اور انہیں صرف اسلامی تعلیمات ہی پر اس کی استواری ممکن ہے) اسلام کی ان بنیادی تعلیمات کی اہمیت برقرار رہے گی۔

(ج) ایرانی، ہندوستانی روابطِ علمیہ کی ترجمانی

مذکور الصدر تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ رسالہ اس عہد کے ایرانی ہندوستانی روابط علمیہ کی بھی باحسن وجوہ ترجمانی کرتا ہے۔

لیکن نزاعی "مسائل ثلثہ" کے باب میں حکماء و متکلمین کے مابین محاکمہ کی یہ ہندوستانی کاوش اپنی نوع کی تنہا مثال نہیں ہے، بلکہ ہر وہ علمی و فکری تحریک جو عراق و خراسان میں پیدا ہوئی، اُس نے قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کو بھی متاثر کیا۔ اس کی تفصیل تو ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے مگر مسئلہ کے اس پہلو کی وضاحت کے لئے دو تین واقعات کا ذکر کرنا مستحسن ہوگا۔

۱۔ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں امام رازی بامیان (جو اُس زمانہ میں ہندوستان کی سرحد پر واقع تھا) تشریف لائے جہاں کے والی بہاء الدین سام کے نام پر انہوں نے "لوامع البینات" لکھ کر معنون کی۔ اس کتاب کا موضوع "اسماء و صفات باری تعالیٰ" کی تحقیق ہے۔ اس کتاب نے دولت مملوکیہ کے زمانہ (۶۰۲ - ۶۸۸ھ) میں ہندوستانی فضلاء پر بڑا اثر ڈالا۔ چنانچہ قاضی حمید الدین ناگوری نے اسی کتاب سے متأثر ہو کر "طوالع الشموس" تصنیف فرمائی، جس کا موضوع بھی اسماء باری تعالیٰ کی بحث و تمحیص ہے، چنانچہ ایک مقام پر اس کتاب میں فرماتے ہیں:۔

"در لوامع البینات آمدہ است:۔ اعظم اسماء اللہ است لوجوہ۔۔۔"
("طوالع الشموس" مخطوطہ ذخیرہ حبیب گنج۔ مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ)

اس کتاب کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔
"قاضی حمید الدین را تصانیف بسیار است۔۔۔ طوالع الشموس از تصانیف مشہور اوست در وے شرح اسماء حسنیٰ می کند۔"
(اخبار الاخیار ص ۴۳)

آگے چل کر اس کتاب سے اقتباس نقل کرنے سے پہلے فرماتے ہیں:۔
"نقل از طوالع شموس و حقیقت آنست کہ اختصار و انتخاب از ان کتاب حقیقت مآب کہ ہر جا موج موج از اسرارِ حقیقت و فوج فوج از معانی طریقت است متعسر است۔ جمیع مواضع او در متانت و حرارت و حالت متشاکل و متشابہ واقع شدہ۔" (اخبار الاخیار ص ۴۴)

امام رازی کی تصانیف میں "لوامع البینات" کو کتنے لوگ جانتے ہیں مگر ایک ہندوستانی عالم کے نفسِ گرم کی تاثیر سے "طوالع شموس" میں جو اس سے متاثر ہو کر لکھی گئی وہ حرارت و گرمی پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر شیخ عبدالحق کو مذکور الصدر تبصرہ سپرد قلم کرنا پڑا۔

۲- چھٹی صدی ہجری ہی میں عین القضاۃ ہمدانیؒ نے "زبدۃ الحقائق" لکھی جو "تمہدات عین القضاۃ" کے نام سے مشہور ہے آٹھویں صدی ہجری میں فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ - ۷۹۰ھ) کے عہد میں اس سے متاثر ہو کر مسعود بک نے "تمہیدات" لکھی۔ چنانچہ شیخ عبدالحق دہلویؒ ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں :-

"در علم تصوف و توحید تصنیفات بسیار دارد۔ و تصنیفے دارد مسمّٰی بہ تمہیدات برطبق تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی۔ بسیارے از حقائق و دقائق در انجا مندرج" (اخبار الاخیار ص۱۷۵) -

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :-

"وے از مستان بادۂ وحدت و خم شکنان خمخانہ حقیقت است۔ سخن مستانہ می گوید۔ در سلسلۂ چشتیہ ہیچ کس ایں چنیں اسرار حقیقت را فاش نگفتہ و مستی نکردہ کہ او کردہ" (اخبار الاخیار ص۱۷۱)

۳- نویں صدی کے اندر ماوراء النہر کے صوفیائے کرام میں شیخ عزیزان نسفی اسرار و رموز حقیقت کے باب میں نمایاں اہمیت رکھتے تھے۔ اُن کے اثرات ہندوستان میں بھی آئے اور یہاں کے فضلاء میں جو بزرگ اُن سے متاثر ہوئے، اُن میں شیخ سماء الدین دہلویؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ وہ صاحبِ تصانیف صوفی تھے۔ اُن کی تصنیفات میں "لمعات شیخ فخر الدین عراقیؒ" کی شرح کے علاوہ رسالہ "مفتاح الاسرار" خاص طور سے مشہور ہے جو انھوں نے شیخ عزیزان نسفیؒ کے رسائل سے متاثر ہو کر تصنیف فرمایا تھا۔ چنانچہ شیخ محدثؒ ان کے تذکرے میں فرماتے ہیں :-

"وے بر لمعات شیخ فخر الدین عراقی حواشی نوشتہ ۔۔۔۔ و رسالۂ دیگر

دارد مسمّٰی بمفتاح الاسرار۔ اکثر آں بعینہ منقول از رسائل شیخ عزیز نسفی است"۔ (اخبار الاخیار ص ۲۱۷)

۴۔ مزید تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ اس لئے صرف ایک اور مثال دی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ شام و عراق تک کے افکار و تصورات کس طرح اندر ہی اندر غیر شعوری طور پر ہندوستانی فکر میں اثر انداز ہو رہے تھے:۔

ساتویں صدی ہجری کے آخر میں اسلام کے سیاسی اقتدار کے زوال کے بعد جب الحاد و بے راہ روی کی نشر و اشاعت پر کوئی پابندی نہ رہی تو فلسفہ نے بھی جو خود کو اسلام کا حریف سمجھتا تھا مگر علانیہ مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ کرتا تھا، پر پُرزے نکالنا شروع کر دیئے اور تصوّف و اشراق کا لبادہ اوڑھ کر شریعت پر تفوق و برتری کا دعوٰی کر ڈالا۔ اب علماء شریعت جو اس وقت تک بلند ترین مقام کے مستحق سمجھے جاتے تھے، صف نعال میں لا بٹھالے گئے اور درجہ اقصٰی ان متصوف فلسفیوں (یا متفلسف صوفیوں) کے حصہ میں آیا۔

ساتویں صدی کے آخر میں مصر و شام کے اندر اس قدر یاتی انداز کا چرچا تھا، چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ جنھوں نے ساتویں صدی کے خاتمہ کے قریب اسی علاقہ میں بیٹھ کر "الرد علی المنطقیین" لکھی تھی، ان تفلسف پسند صوفیاء (یا متصوف فلاسفہ) کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"وھم یرتبون الناس طبقات ادناھم الفقیہ، ثم المتکلم، ثم الفیلسوف، ثم الصوفی ای صوفی الفلاسفۃ، ثم المحقق۔ و یجعلون ابن سینا و امثالہ من الفلاسفۃ فی الثانیۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و یجعلون المحقق ھو الواحد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وذٰلک ان الفیلسوف یفرق بین الوجود والممکن والواجب وھٰؤلاء یقولون الوجود واحد۔ والصوفی الذی یعظمہ ھٰؤلاء ھو الصوفی الذی عظمہ ابن سینا و بعدہ المحقق" (الرد علی المنطقیین صفحہ ۵۲۲-۵۲۳)۔

[اوران لوگوں نے لوگوں (اہل علم) کو (پانچ) طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے نیچا طبقہ فقہاء کا ہے، پھر متکلمین کا، پھر فلاسفہ کا، پھر صوفیاء یعنی فلسفی صوفیاء (متفلسف صوفیاء یا فلاسفہ متصوفین) کا اور پھر (سب سے بلند تر درجہ) محقق کا۔ یہ لوگ ابن سینا اور اُس جیسے دوسرے فلاسفہ کو دوسرے درجہ میں رکھتے ہیں ..... اور محقق کو وحدت وجود کا ماننے والا سمجھتے ہیں ..... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفی تو وجود، ممکن اور واجب میں تفریق کرتے ہیں اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ وجود واحد ہے۔ نیز جس صوفی کی یہ لوگ تعظیم کرتے ہیں وہ وہی صوفی ہے جس کی ابن سینا نے تعظیم کی ہو اور محقق گنا ہو]۔

اس طرح اہل علم کے "طبقات خمسہ" ان متصوف فلاسفہ کی رائے میں حسب ذیل ہیں:-

۱- محقق ۲- صوفی ۳- فلسفی

۴- متکلم ۵- فقیہ

یہی "قدریاتی" نقشہ "آئینِ اکبری" میں ملتا ہے جسے ابوالفضل نے دسویں صدی ہجری کے آخر میں لکھا تھا۔ وہ کہتا ہے:-

"از انجا کہ گیتی خدا پیشوائے صورت ومعنیٰ و کارکیاکے باطن و ظاہر است، پنج گروہ در خور دریافت بزرگداشت نماید..... جمعے از روشن ستارگی بینائے اسرار برونی و درونی اندوازہ والافطرتی وفراوانی حوصلہ ہر دو نشأ را برکمال دارند۔ و برخے راگرچہ چشم بر نیرنگیٔ صورت کمتر اوفتد لیکن از فروغ دل فراواں شناسائی چہرہ برکشاید۔

وطائفہ از جولانگہ نظر برنگزرند

ولختے از نقلی کلام آگہی اندوزند

وجوقے نقل راغبار آمود اشتباہ برشمارند وجز برہان دست آویز نبود۔

وطبقہ از تقلید پیشگی از تنگنائے نقل پرستی بیروں شد نیارند۔"

(آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۲۳۲)

اس کے بعد اُس نے ہر طبقہ کے مشاہیر کو ذکر کیا ہے۔ یہ (اطباء کو چھوڑ کر) پانچ طبقہ ہیں:۔

۱۔ خدیو نشائتین

۲۔ خداوند باطن

۳۔ دانندۂ معقول ومنقول

۴۔ شناسائے عقلی کلام

۵۔ خوانائے نقلی مقال

اب اگر ان دونوں "قدریاتی" نظاموں کا باہم دگر مقابلہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "آئینِ اکبری" میں مذکور "دانش اندوزان جاوید دولت" کے "پنج گروہ"، "الردعلی المنطقیین" میں بیان کردہ طبقات خمسہ کے عین مانند ہیں یعنی

۱۔ محقق خدیو نشائتین ہے

۲۔ صوفی خداوند باطن ہے۔

۳۔ فلسفی دانندہ معقول ومنقول ہے

۴۔ متکلم شناسائے عقلی کلام ہے، اور

۵۔ فقیہ خوانائے نقلی مقال ہے جو بقول ابوالفضل "سفیہ" کا مصداق ہے اور جو اپنی "تقلید پیشگی" کی بنا پر "تنگنائے نقل پرستی" سے باہر نہیں آسکتا۔

غرض عراق وخراسان میں جب علمی وفکری تحریک کا آغاز ہوتا، اس کی صدائے بازگشت ہندوستان میں ضرور سُنائی دیتی۔

اور اس سلسلہ کی آخری کڑی علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا رسالہ "الدرۃ الثمینۃ" ہے۔ یوں بھی عراق وایران سے میدان بحث ونظر کا جو پہلوان ہندوستان آتا، اُس کے مقابلہ کے لئے سیالکوٹ ہی کے اس سپوت کو زحمت دی جاتی، چنانچہ جب ملا شفیق جیسے

بعد میں دربارِ شاہجہانی سے "دانشمند خاں" کا خطاب ملا، ایران سے ہندوستان آیا اور
اور کوسِ لمن الملک بجایا تو اس کے مقابلہ کے لئے منتظمینِ دربار نے علامہ سیالکوٹی ہی کو
زحمت دی اور آخر میں اُنھیں کی فتح ہوئی۔ چنانچہ امام الدین ریاضی نے "تذکرہ باغستان"
میں لکھا ہے :-

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ
ملا شفیعا کہ تازہ از ولایت آمدہ بود و خطاب دانشمند خاں یافتہ، طلبید۔
ایشاں آمدند و اجلاس علماء و فضلاء و حکماء شد۔ چوں نوبت سخن بمولوی
عبدالحکیم رسید و با دانشمند خاں مناظرہ واقع شد، بر مراد ایاک نعبد
و ایاک نستعین، گفتگو بطول کشید و بالآخر درستی قول و راستی سخن ایشاں
بر پادشاہ و سائر امراء و علمائے عالی شان انجامید"

(تذکرہ باغستان صفحہ ۶۸۴-۶۸۵)

یہ تھا سیالکوٹ کا فاضل جلیل۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیئے
اگر شاہجہان اور علامی سعد اللہ خاں کی جوہر شناس نگاہوں نے ہندوستان کے کھوئے
ہوئے علمی وقار کو بحال کرانے کے لئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا انتخاب کیا۔ اور پھر اس
فاضلِ جلیل نے بادشاہ اور وزیر دونوں کی توقعات کو باحسن وجوہ پورا کیا۔

اور یہ "الدرۃ الثمینۃ" تھا "حکمت کا گوہر گراں مایہ" جس پر آنے والی نسلوں
کو بجا طور پر فخر کرنا چاہیئے تھا مگر

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا،
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مختصر حالات، ملفوظات، غیر مطبوعہ علمی و ادبی تبرکات

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

آج میرا قلم ایک ایسی عظیم شخصیت پر کچھ لکھنے کے لئے آمادہ ہے جس کا سکہ علم و فضل چار دانگ عالم میں چل رہا ہے۔ جو سراپا مرقعِ تحقیق اور مجسم مخزنِ رموز و نکات تھا۔ جو اسلام کی حقانیت کی قدآدم روشن دلیل تھا، جس نے ایک طرف درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور دوسری طرف سلوکِ راہِ عرفان میں طالبین کی رہنمائی کی۔ جس نے ایک طرف وعظ و افتاء کے ذریعے رشد و ہدایت کے دریا بہائے تو دوسری طرف تصنیف و تالیف سے اسلام اور زمرۂ اہلِ سنت وجماعت کی حمایت و حفاظت کی۔ جس نے ایک طرف مدرسہ کو چار چاند لگائے تو دوسری طرف خانقاہ کے در و بام کو ذکر اللہ سے لبریز کر دیا۔ جس نے اپنی روحانیت کی بے پناہ قوت اور حمیت اسلامی کی بے مثال طاقت کو بروئے کار لاکر حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا روشن دل مجاہد اور غازی تیار کیا۔ جس نے ہندوستان میں اسلام و ایمان کے قیام و فروغ کے لئے ایک جاں باز جماعت کی تشکیل کی اور اسلام و ایمان کی بقا و استحکام کی خاطر مع رفقا کے شہادت سے ہم آغوش ہوکر زندگئ جاوید سے ہمکنار ہوا۔ اور جس کے ایمان افروز نعروں کی بازگشت آج بھی گنبدِ نیلگوں کے

پنچے اقصائے ہند میں سنی جارہی ہے — وہ شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی حقائق انگیز شخصیت ہے۔ جو اپنے زمانے کے محدثین و مشائخ کا مرجع تھے۔ جن کا سلسلۂ تلامذہ و مسترشدین آفاق گیر ہے، جنہوں نے باوجو مسلسل علالت و نقاہت اور باوجود سیاسی انتشار اور ناسازگار حالات کے دہلی میں بیٹھ کر خمستانِ علوم و معارفِ دینیہ سے تشنگانِ بادۂ توحید و سنت کو سرشار و سیراب کیا۔ جن کی ظاہری بینائی اگرچہ عالمِ شباب ہی میں جاچکی تھی لیکن ان کے دل کی حیرت انگیز روشنی نے ہزاروں دلوں کو روشن کر دیا۔ ہزاروں دل کے نابیناؤں کو بفضلِ ایزدی چشمِ بصیرت سے بہرہ ور کیا۔

اس عظیم شخصیت کے حالات میں کچھ رسالے لکھے گئے ہیں مگر سب نامکمل ہیں۔ حالاتِ عزیزی مؤلفہ رحیم بخش دہلوی جو کمیاب ہو گئی ہے کہیں دیکھنے کو نہ ملی تھی۔ رضا لائبریری (رامپور) میں اس کا مطالعہ کیا، بڑی مایوسی ہوئی کہ اس میں سوانح کا حق ادا نہیں کیا گیا، حالانکہ سوانح نگار کے پاس پورے پورے حالات بہم پہنچانے کے اس وقت کافی ذرائع موجود تھے۔ حیاتِ ولی کے آخر میں بھی انھیں رحیم بخش صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز کا ذکر کیا ہے۔ اس میں تھوڑے سے حالات لکھنے اور نظم و نثر کے چند نمونے دکھانے کے بعد لکھتے ہیں :-

> "اگرچہ اس وقت آپ کے خطوط کے بہت سے مسودات میرے زیرِ نظر ہیں لیکن میں نے حیاتِ ولی کے طول پکڑ جانے کے خوف سے چند رقعات کا انتخاب کر کے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ الخ"

خطوط کے جن مسودات کا ذکر رحیم بخش صاحب سرسری طور پر کر رہے ہیں کاش وہ تمام خطوط حیاتِ عزیزی یا حیاتِ ولی میں درج ہو جاتے تو آج حیاتِ عزیزی کے بہت سے گوشے ہماری نظروں کے سامنے ہوتے۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں بڑی متانت اور محدثانہ و مورخانہ بالغ نظری کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر حال لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی مرحوم نے الروض الممطور میں کر دیا ہے اور کچھ مزید حالات بھی آخر میں

لکھے ہیں۔ مگر ان دونوں کتابوں میں عمرِ عزیز کو نوّے سال بتایا ہے۔ حالانکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اسّی سال کی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہونے والا انسان ۱۲۳۹ھ میں اسّی سال کا ہوگا۔ اس قسم کی سہوِ قلم سے پیدا ہونے والی غلطیاں اگرچہ معمولی ہوتی ہیں مگر تاریخ و سوانح کے طالبِ علم کو خلجان میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

فتاوٰی شاہ عبدالعزیز رح مطبوعہ مجتبائی کے شروع میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی برائے نام سوانح عمری ہے۔ اس کے آخر میں ہے۔ "بعدِ حضرت مولانا ہر سہ برادرانِ ایشاں قائم مقام ایشاں شدند و بہ درس و تدریس مشغول گشتند الخ"۔ یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے وصال کے بعد ان کے تینوں بھائی ان کے قائم مقام ہوئے اور آپ کی جگہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ حالانکہ سب سے پہلے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی رح[1] کا انتقال ہوا، پھر ۱۲۳۰ھ میں شاہ عبدالقادر رح دنیا سے رخصت ہوئے اور ۱۲۳۳ھ میں شاہ رفیع الدین رح نے حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے سامنے ان سے تقریباً چھ سال پہلے رحلت فرمائی۔ ایسی صورت میں بھلا کس طرح یہ تینوں بھائی شاہ عبدالعزیز رح کے بعد قائم مقام ہو سکتے ہیں۔

دو۲ ماہ کے قریب ہوئے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رح اور اُن کے خاندان کے دیگر اکابر کے مزارات پر حاضری کا اتفاق ہوا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں اس قبرستان کے کتبے تک برباد ہو گئے تھے۔ بعض اہلِ خیر نے مسجد و احاطۂ درگاہ شاہ ولی اللہ رح کی مرمت کا کام بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ مزاراتِ اکابر پر دوبارہ کتبے بھی نصب کرائے گئے ہیں۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس اور تعجب ہوا کہ مزار شاہ عبدالعزیز رح پر جو کتبہ ہے اس میں سنِ وفات موٹے

---

[1] ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے اپنی کتاب تراجم علمائے حدیث میں ایک دلچسپ غلطی اور کی ہے وہ یہ کہ حضرت شاہ عبدالغنی ابن حضرت شاہ ولی اللہ رح کو وہ حضرت مولانا نانوتوی رح کا استاد بتاتے ہیں۔ انھیں شاید یہ معلوم ہی نہیں کہ شاہ ابو سعید مجددی رح کے ایک صاحبزادے کا نام بھی شاہ عبدالغنی مجددی رح تھا اور وہی استاذ قاسم العلوم رح تھے۔

قلم سے ۱۲۴۸ھ لکھا ہوا ہے — اس کو بھی معمولی غلطی کہہ دیجئے۔ مگر میرے نزدیک بہت بڑی غلطی ہے۔ ہم اپنے بزرگوں کی حیات کے ہر ہر دور اور وفات و بعد وفات سے تاریخ کے بہت سے واقعات وابستہ رکھتے ہیں اگر اس طرح بے توجہی سے کام لیا گیا اور اہل علم نے کوئی خبر نہ لی تو ہماری ہندستان کی ملی تاریخ پر غلط اثر پڑے گا۔

محقق شہیر مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی نے نزہۃ الخواطر جلد ۷ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا جامع تذکرہ کیا ہے اس سے مجھے بڑی رہنمائی ملی۔ میں اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز کے مکمل حالات لکھنے سے قاصر ہوں۔ اس کے لئے بڑی جستجو بڑا وقت اور بڑا سفر درکار ہے، ان کی تمام تصانیف پر سیر حاصل تبصرہ کرنا۔ تلامذہ کی مکمل فہرست، اُن کے اجمالی حالات کے ساتھ تیار کرنا اور ہندوستان کے شخصی و درسگاہی کتب خانوں سے حضرت شاہ صاحب کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریرات کا حاصل کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ میرا خیال تو فقط یہ تھا کہ بیاضِ مولانا رشیدالدین خاں دہلوی[1] کا تعارف کراؤں — یہ وہی مولانا رشیدالدین خاں ہیں جن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز کا ایک مقولہ مشہور

---

[1] سر سید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں :۔ "جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول یگانۂ روزگار۔۔ یکتائے زمانہ، قدوۂ دوراں مولوی محمد رشیدالدین خاں طاب ثراہ ... شاگرد رشید اور مخلص خالص العقیدہ جناب جنت مآب زبدۂ اکابر روزگار مولانا رفیع الدین رضوان اللہ علیہ کے تھے ... اگرچہ کسب کمال ان حضرت کے دونوں بھائی یعنی مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہما کی خدمت سے بھی کیا تھا۔ لیکن تکمیلِ علوم کی ان ہی کی خدمت میں انصرام کو پہنچائی۔ مدۃ العمر فرقۂ امامیہ کے علماء سے مباحثہ و مناظرہ کیا اور باہم تحریر رہی۔ اس بحث میں رسالہائے متعدد فراہم ہو گئے۔ طریق مناظرہ کا یہ دیکھا گیا کہ تقریر و تحریر میں خصم کو بجز اعتراف عجز کے چارہ نہ تھا۔ مدرسۂ دہلی میں مدرس تھے الخ مولانا مملوک علی نانوتوی ان ہی کے شاگردِ رشید تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں الصولۃ الغضنفریہ اور شوکتِ عمریہ معرکۃ الآرا کتابیں ہیں۔ ۱۲۴۹ھ میں انتقال فرمایا۔ (تذکرہ علمائے ہند و نزہۃ الخواطر جلد ۷)

ہے کہ "میری تقریر تو محمد اسمٰعیل نے لے لی اور تحریر رشید الدین نے۔"

اب سے تقریباً تیس سال پیشتر جب کہ میں دارالعلوم (دیوبند) میں تعلیم پاتا تھا یہ بیاض دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس بیاض پر جمعیۃ الانصار کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ غالباً حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رح نے اس کو کہیں سے حاصل کیا تھا، اس بیاض میں زیادہ تر حضرت شاہ عبدالعزیز رح کی ایسی نادر تحریرات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملیں۔ اس میں شاہ صاحب رح کے مکتوبات بھی ہیں، فتاویٰ بھی ہیں اور کلام نظم و نثر کے بہترین شاہکار بھی۔

اس بیاض کا کچھ حصہ میں نے نقل کر لیا تھا اور یہ اطمینان تھا کہ جب بیاضِ رشیدی کا تعارف کرانا ہوگا اس کو دوبارہ دیکھ لوں گا۔ اب پاؤ صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے پر کثیر التعداد کتابوں کے ذخیرے میں اس بیاض کا پتہ نہیں چلتا۔ خدا کرے کہ وہ کتب خانے میں محفوظ ہو۔ میں اپنے اس مقالے میں اپنے مقام پر اس بیاض ہی سے نقل کئے ہوئے علمی و ادبی نمونے پیش کروں گا۔ اسی بیاض کے تعارف کی خاطر شروع میں تھوڑے سے حالات اور ملفوظاتِ عزیزی بھی شامل کر دیئے ہیں۔

پیدائش۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔ غلام حلیم تاریخی نام ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کی زوجۂ اولیٰ سے ایک صاحبزادے شیخ محمد محدث رح تھے اور دوسری زوجہ سے چار صاحبزادے تھے جن میں سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز رح تھے۔

تعلیم۔ حفظ قرآن کے بعد آپ نے تعلیم زیادہ تر اپنے والد ماجد سے پائی اور کچھ تعلیم حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی رح اور حضرت شاہ نوراللہ بڈھانوی رح سے بھی حاصل کی۔ منجانب اللہ ذہانت، ذکاوتِ غیر معمولی اور حافظہ بے نظیر عطا ہوا تھا۔ ۱۵ سال کی عمر میں اپنے والد کے سامنے ہی تمام علوم و فنونِ مروجہ سے فارغ ہو گئے تھے اور اسی زمانے سے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

بیعت۔ اپنے والد ماجد سے تمام سلاسل میں بیعت ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں میدانِ سلوک طے کر لیا۔ ۱۶ سال کے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ حضرت

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تمام خلفاء کی موجودگی میں آپ ہی قائم مقام اور سجادہ نشین بنائے گئے — اور اپنے چھوٹے بھائیوں مولانا شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ کی تعلیم و تربیت کا کام آپ نے بحسن و خوبی انجام دیا۔

نکاح و اولاد آپ کا نکاح شاہ نور اللہ صدیقی بڈھانویؒ کی صاحبزادی سے ہوا جن سے ایک صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔ صاحبزادے کا نام احمد تھا جیسا کہ بیاض رشیدی کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی صاحبزادی حضرت شاہ رفیع الدین کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد عیسیٰؒ کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ دوسری صاحبزادی شیخ محمد افضل فاروقیؒ سے منسوب ہوئیں جن کے دو صاحبزادے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ اور شاہ محمد یعقوبؒ تھے۔ اول الذکر ۱۱۹۷ھ میں اور ثانی الذکر ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ تیسری صاحبزادی حضرت مولانا محمد عبدالحیؒ بڈھانویؒ کی زوجہ تھیں۔ مولانا عبدالحیؒ شاہ نور اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیزؒ کی زوجۂ محترمہ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ غالباً ان تیسری صاحبزادی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مولانا عبدالحیؒ کی ایک دوسری زوجہ کے بطن سے مولانا عبدالقیوم محدث بڈھانوی ثم بھوپالیؒ تھے[1]۔ مولانا عبدالقیوم محدثؒ، حضرت شاہ محمد اسحٰق محدثؒ کے داماد تھے۔ مولانا عبدالقیومؒ کی ایک صاحبزادی تھیں اور دو صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب اور میاں محمد ابراہیم صاحب تھے۔ مولانا ذوالفقار احمد صاحب بھوپالیؒ الروض الممطور میں لکھتے ہیں کہ "مولوی محمد یوسف مثل اپنے والد ماجد مرحوم کے درس حدیث میں مشغول رہتے ہیں۔ نہایت صالح و متدین ہیں۔"

---

[1] ابو یحییٰ امام خاں نوشہری نے تراجم علمائے حدیث جلد اول میں صفحہ ۱۲۲ پر مولانا عبدالقیومؒ کو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا نواسہ بتایا ہے جو غلط ہے۔ اور صفحہ ۱۲۳ پر لکھا ہے کہ وہ بھوپال میں سپردِ خاک ہوئے، یہ بھی غلط ہے۔ مولانا عبدالقیوم کی وفات اپنے وطن بڈھانہ ضلع مظفر نگر پہنچ کر ۱۲۹۹ھ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے اور یہی ان کی خواہش دلی تھی جیسا کہ الروض الممطور میں مولانا ذوالفقار احمدؒ نے لکھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ایک الہام یا آگاہی

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں بحوالۂ قول جلی (سوانح شاہ ولی اللہ مرتبۂ شاہ محمد عاشق پھلتی رح) لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا کہ "ہمیں آگاہی دی گئی ہے کہ یہ لڑکے جو ہمیں لطفِ الٰہی سے عطا ہوئے ہیں، سب سعید ہیں۔ ایک نوع کی ملکیت ان میں ظہور کرے گی ـــ تدبیرِ غیب تقاضا کرتی ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں جو مکہ و مدینہ میں سالہا احیائے علوم دین کریں اور حجاز میں وطن اختیار کریں۔ ماں کی طرف سے ان کا نسب ہم تک پہنچے گا ـــ آدمی زادہ ماں کی طرف میلانِ طبعی رکھتا ہے اس لئے اپنے ماں کے وطن کو چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو۔ یہ بات بظاہر بالطبع مشکل نظر آتی ہے مگر ہاں قسرِ قاسر سے (کسی سبب سے) ایسی صورت پیدا ہو جائے تو دوسری بات ہے"۔ ـــ اس ملفوظ کو تحریر کرنے کے بعد نواب صاحب فرماتے ہیں کہ "مصداق اس آگاہی کا وجود ہر دو نواسۂ شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہٗ کا ہے، یعنی مولانا محمد اسحٰق (م ۱۲۶۲ھ) اور مولانا محمد یعقوب (م ۱۲۸۲ھ) رحمہا اللہ تعالیٰ کہ دہلی سے (۱۲۵۸ھ میں) ہجرت کر کے ان دونوں نے مکۂ مکرمہ میں اقامت فرمائی اور سالہا اہلِ عرب و عجم میں روایتِ حدیث شریف کو زندہ کیا۔ لیکن اس وقت میں یہ خاندانِ علم و کمال بتمامہا ختم ہو گیا اور کوئی ان میں سے باقی نہ رہا۔ یفعل اللہ ما یشاءُ و یحکم ما یرید۔

(ترجمہ از اتحاف النبلاء، ص ۴۳۰ و ۴۳۱)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تلامذہ

آپ کے اجازت یافتہ تلامذہ اور خلفاء و مریدین کا حلقہ یقیناً بہت وسیع ہوگا۔ تذکرۂ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر، عمدۃ الصحائف مؤلفہ مولوی عبدالکریم حنفی قادریؒ، سراج العوارف مؤلفہ شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہرویؒ، تذکرۃ الکرام (تاریخ امروہہ)، تذکرہ مشاہیر کاکوری اور بعض دیگر تذکروں کی مدد سے حسب ذیل تلامذہ کی فہرست تیار کر سکا ہوں، یقیناً یہ بہت کم ہیں، مگر اس میں مشاہیر تلامذہ ایک حد تک سب آگئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے وہ حضرات ہیں جن کی مستقل سوانح عمریاں لکھی جانی چاہئیں۔

(۱) و (۲) و (۳) ہر سہ برادرانِ گرامی قدر (۴) و (۵) ہر دو نواسے (۶) مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ برادر زادہ (۷) مولانا مخصوص اللہؒ ابن شاہ رفیع الدین دہلوی (۸) مولانا عبدالحی بڈھانویؒ (۹) شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ (۱۰) شاہ ابوسعید مجددی رام پوری ثم دہلویؒ (۱۱) مولانا شاہ احمد سعید مجددیؒ ابن شاہ ابوسعید مجددیؒ (۱۲) مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ (۱۳) مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی ساکن رائے بریلی (۱۴) مولانا رؤف احمد رافت مجددی رامپوریؒ (۱۵) مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادیؒ (۱۶) مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنویؒ (۱۷) مولانا حیدر علی رام پوریؒ (۱۸) مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ مؤلفِ ازالۃ الغین ومنتہی الکلام (۱۹) مولانا سید احمد علی بجنوریؒ (۲۰) مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی ثم کانپوریؒ (۲۱) مولانا ستار الدین احمد بدایونی۔ (۲۲) مولانا شاہ سید آلِ رسول برکاتی مارہروی (۲۳) اخوند حافظ عبدالعزیز قادری دہلویؒ۔ (۲۴) مولانا فضل حق خیر آبادیؒ (۲۵) مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ (۲۶) مولانا کریم اللہ دہلویؒ۔ (۲۷) مولانا محبوب علی دہلویؒ (۲۸) مولانا سید محمد اسحٰق بن سید محمد عرفانؒ رائے بریلوی (حضرت سید احمد شہیدؒ کے برادر کلاں)۔ (۲۹) مولانا عبدالخالق دہلویؒ (۳۰) مولانا غلام جیلانی رفعت رامپوریؒ (۳۱) مولانا کرم اللہ[۱] محدث دہلوی (م ۱۲۵۲ھ) (۳۲) شیخ قمر الدین حسینی سونی پتیؒ (۳۳) مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۳۴) مولانا غلام محی الدین بگوئی (۳۵) حافظ غلام علی چریاکوٹی (۳۶) مولانا محمد شکور مچھلی شہری (۳۷) مولانا سید جلال الدین برہان پوریؒ (۳۸) مولانا سید آلِ حسن قنوجیؒ (نواب صدیق حسن خاں کے والد ماجد) (۳۹) شاہ رحمٰن بخش چشتی امروہیؒ ابن حضرت شاہ عبدالباری صدیقی چشتی (۴۰) مولانا سید رمضان علی امروہیؒ (۴۱) مولانا نجابت حسین ساکن محلہ قاضی ٹولہ بانس بریلی (یہ نام زبانی روایت کی بنا پر درج کیا گیا ہے) (۴۲) شیخ فضل حق عرف غلام مینا ساحر علوی کاکوروی (۴۳) مفتی صدر الدین آزردہ (۴۴) مولانا شاہ ظہور الحق قادری

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ ۱۲۵۸ھ میں ان کا انتقال ہوا اور حجاز میں انتقال ہوا حالانکہ صحیح یہ ہے کہ ۱۲۵۲ھ میں شہر سورت کے اندر انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ جیسا کہ نزہۃ الخواطر جلد ۷ اور سفرنامۂ شیفتہ سے معلوم ہوتا ہے۔

پھلوارویؒ (آپ نے مکاتبۃً حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے اجازت حدیث حاصل کی۔ کما فی نزھۃ الخواطر)۔

مولوی ببر علی دہلوی و مولوی دھومن سہارنپوری

مؤلف تذکرۂ علمائے ہند نے لکھا ہے کہ یہ دونوں حرف شناس بھی نہ تھے (اُمّی تھے) حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی صحبت میں رہتے تھے قوتِ حافظہ ایسی تھی کہ جو کچھ شاہ صاحب سے سنتے تھے لفظ بہ لفظ یاد رکھتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی زبان سے قرآن مجید کا وعظ بارہا سُن چکے تھے۔ اگر کوئی کہتا کہ کچھ فرمائیے، کہتے کہ قرآن کی کوئی آیت پڑھو۔ اگر پڑھنے والا غلط پڑھتا تو تصحیح کرتے اور اس کا ترجمہ کر کے تفصیل و تشریح کرتے تھے۔ مفتی اسداللہ الہ آبادی مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں دہلی گیا اس زمانے میں مولوی ببر علی زندہ تھے، ان کے اوصاف سُن کر اُن کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ نمازِ جمعہ شاہجہانی جامع مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد مجلس وعظ منعقد ہوئی۔ بعض لوگوں نے کہا مولوی ببر علی ہیں جو وعظ کہہ رہے ہیں۔ میں نے نہایت توجہ سے ان کا وعظ سُنا، جتنا ان کے متعلق سُنا تھا اس سے زیادہ ان کو پایا۔ وعظ سے جب فارغ ہوگئے تو میں نے سلام و مصافحہ کیا اور ایک آیت کا مطلب دریافت کیا۔ انہوں نے برجستہ اس کا مطلب بیان کیا اور میرے اشکال کو بھی دور کر دیا۔ ع صحبتِ صالح ترا صالح کند

(ملخظ از ترجمہ تذکرہ علمائے ہند۔ مرتبہ محمد ایوب قادری)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فیضِ صحبت سے خواص تو خواص عوام بھی کس قدر متاثر ہوئے تھے۔

تصانیف۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تصنیفات و تالیفات میں جو کتب شائع ہو چکی ہیں یا جو موجود اور مشہور ہیں اُن کی فہرست نزھۃ الخواطر اور حیاتِ ولی سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی نہ معلوم کتنا ذخیرۂ تالیف اور رہا ہوگا جو انقلابِ زمانہ اور غفلت سے تلف ہو گیا۔ ان کتابوں میں سے ہر ایک پر ایک مفصل تبصرہ کیا جا سکتا ہے فی الحال فہرست اور اجمالی تعارف پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) آپ کی مشہور تالیف تفسیر فتح العزیز ہے جو کہ تفسیر عزیزی بھی کہلاتی ہے۔ اس تفسیر کو ایسے زمانے میں جب کہ مرض کا شدید غلبہ تھا، املاء لکھوایا۔ یہ کئی جلدوں میں تھی۔ اس کا اکثر حصہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگیا، اول و آخر کی صرف دو جلدیں دستیاب ہوئیں جو شائع ہو چکی ہیں، اور ان کا اردو میں ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔

(۲) تحفۂ اثنا عشریہ۔ علمِ کلام میں ایک زبردست علمی شاہکار ہے۔ فرقۂ امامیہ کی پوری حقیقت اور ان کے اعتراضات کے مکمل جوابات ہیں۔ قرآن و حدیث کے مطالب اور تاریخ و سیرت کے بہت سے گوشے اس کے مطالعے سے کھلتے ہیں۔ لفظ چراغ سے اس کی تصنیف کا سال ۱۲۰۴ھ نکلتا ہے۔ مولوی اسلمی مدراسیؒ نے اس کا عربی میں بھی ترجمہ کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک مجلس میں تحفۂ اثنا عشریہ کا ذکر آنے پر فرمایا کہ ایک شخص نے اس کتاب کے بارے میں لکھا تھا۔ "ھذا کتاب لو بیاع (الوزنہ) ذھبا لکان البائع مغبونا" (یعنی یہ کتاب ایسی ہے کہ اگر اس کے برابر سونا لے کر اس کو فروخت کیا جائے تو بھی بیچنے والا خسارہ میں رہے گا)۔

(۳) بُستان المحدثین۔ اس میں کتب احادیث کی فہرست ہے اور ان کے مدونین و جامعین کے شرح و بسط کے ساتھ سوانح ہیں۔ بے نظیر کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی مدرس دارالعلوم دیوبند نے کیا تھا۔

(۴) عجالۂ نافعہ۔ فارسی زبان میں اُصولِ حدیث میں مختصر اور بڑا جامع و نافع رسالہ ہے اس کا بھی اردو میں ترجمہ ہوگیا ہے۔

(۵) میزان البلاغۃ۔ علم البلاغت میں ایک عمدہ متن ہے۔ اس کو غالباً سب سے پہلے قاضی بشیر الدین صدیقی میرٹھی مرحوم نے مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نقشبندی دیوبندیؒ کے حاشیے کے ساتھ اپنے مطبع مجتبائی میرٹھ میں شائع کیا۔

(۶) میزان الکلام۔ علمِ کلام میں ایک عمدہ متن ہے۔

(۷) سر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل۔ یہ رسالہ علیحدہ بھی شائع ہوا ہے اور فتاویٰ جلد دوم میں شامل ہو کر بھی — (۸) عزیز الاقتباس۔ خلفاء راشدین کے فضائل میں ہے۔

(۹) سرّ الشہادتین - شہادتِ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے بارے میں ایک مختصر رسالہ ہے - مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف اس کی نسبت میں بعض حضرات کو کلام ہے۔

(۱۰) رسالۃ فی الانساب (۱۱) رسالۃ فی الرؤیا -

(۱۲) حواشی جو منطق اور حکمت کی کئی کتابوں پر ہیں -

(۱۳) فتاوٰی - یہ مطبع مجتبائی میں دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں - ان کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے - فتاوٰی کے ساتھ پانچ چھ رسائل بھی شائع ہوئے ہیں جو بہت اہم ہیں۔

ان کتابوں کے ساتھ ساتھ حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادیؒ کی کتاب "اسولہ واجوبہ" کے جوابات کو بھی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تالیف قرار دینا چاہیئے - یہ کتاب جہاں تک مجھے معلوم ہے کتب خانۂ دارالعلوم ندوہ لکھنؤ - کتب خانہ مظاہر علوم سہارن پور، کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور کتب خانۂ قاضی شہر رامپور میں موجود ہے - حاجی رفیع الدین مرادآبادیؒ اس کتاب کے دیباچے میں جو تحریر فرماتے ہیں اس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے اصل عبارت دیباچہ کتب خانۂ دارالعلوم ندوہ سے نقل کی گئی تھی -

"حضرت شاہ عبدالعزیز سلمہ اللہ تعالیٰ نے ایک تفسیر تالیف کی ہے جس کا نام فتح العزیز ہے - ابھی اس کے مسودات بیاض کی منزل تک نہیں پہنچے ہیں - یوں تو اس میں تحقیقاتِ بسیار اور لطائفِ بیشمار تحریر ہوئے ہیں - مگر پانچ علوم پر خصوصیت سے بحث کی گئی ہے -

(۱) سورتوں کے عنوانات اور اجمالاً ہر سورت کا مضمون -

(۲) بعض آیات کا بعض کے ساتھ ربط -

(۳) متشابہات القرآن -

(۴) قصص و احکام قرآنی کے اسرار -

(۵) لطائف نظم قرآن -

مصنّف سلمہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں علوم کے نمونے جستہ جستہ فقیر محمد رفیع الدین مرادآبادی کو مکاتیب کی شکل میں روانہ فرمائے - ان کے بارے میں احقر نے جو سوالات کئے ان کے جوابات بھی مکاتیب میں لکھے - میں نے ان سب کو ان اوراق میں جمع کر دیا - واللہ ولی التوفیق"

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مجالسِ درسِ قرآن

مشہور مناظر و متکلم حضرت مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ازالۃ الغین کے مقالۂ تاسعہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی مجالسِ درسِ قرآن کا آنکھوں دیکھا حال تحریر فرمایا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ دہلوی (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) روز جمعہ اور سہ شنبہ کو مجلسِ وعظ اپنے مدرسے میں منعقد کرتے تھے۔ مشتاقین وہاں جمع ہوتے تھے اور یہ وعظ کافی دیر تک ہوتا تھا۔ علماءِ کرام تفسیرِ بیضاوی، تفسیرِ نیشاپوری، کشاف اور دیگر تفاسیرِ مشکلہ اپنے سامنے رکھتے تھے۔ اور سمجھ لیتے تھے کہ اس وقت فلاں اشکال کو فلاں تفسیر میں سے حل فرمایا گیا ہے۔ میں نے بارہا یہ دیکھا کہ جس شخص کے دل میں کسی قسم کا اعتراض یا شبہ آتا تھا آپ کی تقریر سے وہ شخص مطمئن ہو جاتا تھا۔ آپ کے فیضِ صحبت سے اکثر غیر مسلم مسلمان ہو جاتے اور شک و تردد والے قوتِ اعتقاد حاصل کرتے تھے۔ فقیر کا سفرِ دہلی، محض تحقیقِ مذہب کے سلسلے میں ہوا تھا، جب اس بابرکت صحبت میں التزام کے ساتھ رہا تو تمام شکوک و اوہام ختم ہو گئے۔"

آخری درسِ قرآن۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا آخری درسِ قرآن اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کی تفسیر تھا۔ یہاں سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر شروع کی اور ان کا آخری درس اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کی تفسیر تھا۔ اس سے آگے کو حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ نے سلسلہ جاری رکھا۔ (ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ۷ بحوالہ مقالات الطریقہ)۔

حُلیہ مبارکہ۔ حکیم سید عبدالحیؒ نزہۃ الخواطر میں تحریر فرماتے ہیں۔ آپ طویل القامت نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ چشم اور گھنی داڑھی والے تھے۔

مسلک۔ علامہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں لکھا ہے کہ ان کا (شاہ عبدالعزیزؒ کا) خاندان علومِ حدیث و فقہ حنفی کا ہے۔ خدمت اس علم شریف کی جیسی اس خاندان سے وجود میں آئی ویسی اس ملک میں اور کسی سے معلوم و معہود نہیں ہے (الروض الممطور بحوالہ الاتحاف)۔

مرض وفات اور وفات۔ نزہۃ الخواطر میں ہے کہ ۲۵ سال کی عمر سے آپ کو گوناگوں امراض لاحق ہو گئے تھے جس کی وجہ سے بینائی پر اثر پڑ گیا تھا۔ بنابریں مدرسہ کا کام

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے سپرد کر دیا تھا، زیادہ تر یہی دونوں بھائی طلباء کو درسِ حدیث دیتے تھے۔ خود بھی درس حدیث دیتے تھے مگر کم۔ تصنیف و تالیف، فتاویٰ و وعظ کا کام برابر جاری رہا۔ آپ کے مواعظ حقائقِ قرآن سے لبریز ہوتے تھے۔ آخری عمر میں تو آپ اس قابل بھی نہ رہے تھے کہ مجلس میں ایک ساعت بیٹھ سکیں۔ دونوں مدرسوں (قدیم و جدید) کے درمیان دو آدمیوں کے سہارے چلا کرتے تھے اور اس وقت میں چلتے چلتے بھی درس دیتے تھے اور رشد و ہدایت کی طرف رہنمائی بھی اپنے کلمات طیبات کے ذریعے فرماتے جاتے تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیانی وقت میں اس سڑک تک (دو آدمیوں کے سہارے) تشریف لے جاتے تھے جو مدرسہ اور جامع مسجد دہلی کے درمیان میں ہے۔ لوگ اس وقت آپ کے قدوم کے منتظر رہتے تھے اور اپنے سوالات اور علمی اشکالات آپ کی خدمت میں پیش کر کے حل کرتے تھے۔ بھوک اتنی کم ہوگئی تھی کہ کئی کئی دن کے بعد غذا استعمال فرماتے تھے"۔

بالآخر وہ زمانہ بھی قریب آگیا جب کہ یہ ہندوستان کا آفتابِ علم غروب ہونے والا ہے۔ مولوی سید احمد علی بجنوری رحمہ اللہ نے (یہ بجنور غالباً لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ ہے) حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات ایک خط میں لکھے ہیں۔ الروض الممطور میں یہ خط درج ہے۔ میں اس خط کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔ کہیں کہیں مفہوم باقی رکھتے ہوئے الفاظ میں تغیر کر دیا گیا ہے۔

"ماہ رجب ۱۲۳۹ھ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ چار دن کے بعد آدھ پاؤ بلکہ اس سے بھی کم غذا استعمال کرتے تھے۔ تمام رات بخار رہتا تھا اور اکثر سوداویہ چڑھتے تھے، آخر رمضان میں طبیعت پہلے سے زیادہ ناساز ہوئی، چنانچہ ۲۹ رمضان کو شام کے وقت غشی طاری ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ تمام گھر میں ایک عجیب قیامت برپا ہوگئی۔ اس کی صبح کو عید تھی اور پیر کا دن تھا، کچھ افاقہ ہوگیا موافق معمول کے، پھر دن چڑھے نماز عید ادا کی گئی کہ مسجد اکبر آبادی میں پھر غشی طاری ہوئی۔ گھر آگئے طبیعت بے مزہ رہی۔ منگل کا دن درس کا دن تھا۔ بکمال بے طاقتی منبر پر کچھ دیر آرام کر کے آیہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کی تفسیر پر اکتفا کیا، پھر کچھ دن باقی رہا تھا کہ فقیر کو طلب فرما کر وصیت نامہ لکھوایا جس میں فرش اور ذاتی کتب خاص کو مولانا محمد اسحٰقؒ کے نام ہبہ کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی امور تھے۔ فقیر کی مہر اس پر ثبت کرائی اور مولانا

رشید الدین خاں وغیرہ کو طلب کرکے ان کی مہریں بھی ثبت کرائیں۔ اس دن حال بہت متغیر تھا۔ مغرب سے پہلے پہلے اجازت نامۂ احادیث اپنی مہر خاص سے مزین فرماکر اس فقیر کو عنایت فرمایا۔ اب طعام بالکلیہ موقوف ہوا۔ بدھ کا دن آیا، اطبائ نے جمع ہوکر ایک نسخہ تجویز کیا، اس کو استعمال کیا۔ پھر دن چڑھے نماز اشراق ادا کی ۔ بعدہٗ اجابت ہوئی ۔ دوا بعینہ نکلی معلوم ہوا کہ قوتِ ماسکہ زائل ہوگئی ہے۔ بدھ کے دن شام کو بہت لوگ مرید ہوئے۔ جمعرات کے دن حالت اور متغیر ہوگئی۔ جمعہ کے دن چاہا کہ معمول کے مطابق مدرسہ میں آئیں نہ آسکے۔ درس موقوف ہوا مگر زیارت سب کو میسر ہوئی۔ شام کے وقت تفسیرِ مدارک اور تفسیرِ رحمانی سُنی بعدہٗ کچھ نقدی برادرزادوں اور ذوی الارحام حاضر وغائب پر تقسیم فرمائی قصہ مختصر یہ کہ شنبہ کے دن سکوت طاری ہوا اور نبض مختل ہوگئی، مگر نماز پنجگانہ اشارے سے پڑھتے تھے۔ دوپہر کو قرآن مجید طلب فرماکر مولانا محمد اسحٰق صاحب سے سورۂ قٓ ایک رکوع تک سُنی بعدہٗ فرمایا کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا سے ابتدا درس کی ہوگی۔ پڑھو۔ بعد مغرب غلام حسین نامی ایک صاحب مرید ہوئے۔ نماز عشاء کی پڑھی۔ چار گھڑی رات باقی رہی تھی کہ اضطراب لاحق ہوا۔ دو پنکھے دائیں اور بائیں جھلے جارہے تھے۔ آرام کسی صورت نہ تھا۔ برخلاف عادت کے سوائے تہبند کے باقی تمام کپڑے بدن سے اُتار ڈالے تھے۔ بعد نماز فجر، رشوال کو اتوار کے دن داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ تمام شہر دہلی پر ایک ایسی حالت واقع ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔"

کمالاتِ عزیزی میں بھی آپ کے وقت کے کچھ حالات نواب مبارک علی خاں میرٹھی رح نبیرۂ نواب خیر اندیش خاں مرحوم نے لکھے ہیں، اس میں ہے کہ آخری وعظ کے دن آپ نے مشہور مصرع، من نیز حاضر میشوم تصویرِ جاناں در بغل، کو تصرف کرکے یوں پڑھا ۔

مَن نیز حاضر می شوم تفسیرِ قرآں در بغل ۔

آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرا کفن اسی کپڑے کا ہو جو میں پہنتا ہوں۔ آپ کا کُرتہ ادھوتر کا اور پائجامہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ نماز جنازہ شہر کے باہر ہو۔ چنانچہ

ایسا ہی کیا گیا۔ کمالات عزیزی میں ہے کہ آپ کے جنازے کی نماز پچپن مرتبہ ہوئی۔

مزار۔ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے پہلو میں مہندیوں میں دفن ہوئے۔

تاریخہائے وفات۔ حضرت شاہ رؤف احمد رافت مجددی رامپوری رح نے حسب ذیل تاریخ کہی :۔

شاہ عبدالعزیز فخرِ جہاں — عالمِ علمِ آیتِ قرآن
صبحِ یک شنبہ ہفتمیں شوال — از بدن گشتہ رُوحِ او پرّاں
سنِ ہجری چو جستم از ہاتف — گفت اے نکتہ سنج قاعدہ داں
سالِ فوتش ز ہر عدد پیداست — از احد تا الوف زیں عنواں
خواہی از ہر عدد کہ تاریخش — اوّلاً چار چند کن پس ازاں
یک بیفزا و ضرب کن در دہ — پس بکن طرح بست بست[1] کجاں
در صد و بست و چار باقی را — ضرب فرما تو اے فہیم زماں
پس[1] بنقصانِ یک عدد دریاب — فوت آں مفخر زمین و زماں

حکیم مومن خاں مؤمن دہلوی مرحوم نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ لکھا:۔

انتخابِ نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز — بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے — آ گیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایماں میں خلل؟
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا — کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اُٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا — لوٹتا تھا خاک پر ہر قُدسیٔ گردوں محل

---

[1] یعنی ایک سے لے کر ہزار تک کسی عدد سے بھی اس طرح تاریخ نکالی جا سکتی ہے کہ لیے ہوئے عدد کو چار گنا کر دو پھر ایک کو اور شامل کر دو، پھر دس میں ضرب دو پھر بیس سے تقسیم کرو جو باقی رہے اس کو ۱۲۴ سے ضرب دو حاصل ضرب میں سے ایک کو کم کر دو ۱۲۳۹ھ برآمد ہوگا۔

کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ گیا جس وقت دفن | ڈالتا تھا خاک سر پہ ہر عزیز و مبتذل
مجلسِ دردآفرینِ تعزیت میں میں بھی تھا | جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ اگر بے بدل
دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے | فقر و دیں، فضل و ہُنر، لطف و کرم، علم و عمل

ق ی ض ن ط ر ل م
۱۰۰ ۱۰ ۸۰۰ ۵۰ ۹ ۲۰۰ ۳۰ ۴۰

سنہ ۱۲۳۹ھ

آثار الصنادید میں یہ قطعۂ تاریخ ہے۔

حجۃ اللہ، ناطق و گویا | شاہ عبدالعزیز فخرِ زمن | روز شنبہ و ہفتم شوال | درمیانِ بہشت ساخت وطن
مہر نصف النہار در عرفاں | مثلِ بدرِ منیر در ہمہ فن | از سرِ لطف و سلم تاریخش | رضی اللہ عنہ گفت حسن

ل ح
۸ + ۳۰
۳۸

۱۲۰۱
۳۸
سنہ ۱۲۳۹ھ

کتب خانۂ دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے ایک قلمی نسخے سے حسبِ ذیل تاریخ ملی (یہاں چند اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ شاعر کا پتہ نہ چل سکا)۔

جنابِ اقدسِ عبدالعزیز والا قدر | کہ بود محوِ رضائے خدائے بے ہمتا
فقیہِ بے بدل و عالمِ عدیم المثل | ولیٔ کامل و استاد و مرشدِ دانا
مدبرے کہ باقلیمِ دانش و حکمت | خِرد او بود کسے راعمل ز سرتا پا
امامِ جملہ دبیرانِ نکتہ سنج و فصیح | قوامِ جملہ ادیان و موجدِ انشا
مُعینِ اہلِ ورع مقتدائے دینداراں | ظہیرِ شرع پسندانِ صاحبِ تقویٰ
مطاع و مرشد و شاہِ جہاں و اولادش | ملاذ و مرجعِ میر و وزیر و شاہ و گدا
بجُستم از خِردِ خُردہ کار تاریخش | ہزار نالہ کشید و بسر زد و گفتا

پس از وضو و طہارت نویس ایں مصرع
نہفت زیرِ زمیں مہرِ دین و ماہِ ہدیٰ

سنہ ۱۲۳۹ھ

(بشکریہ الفرقان لکھنؤ)

(مسلسل)

علماء کرام کا سیمینار

محکمۂ اوقاف اور پاکستان اکیڈمی ترقیٔ دیہات کا ایک اِقدام

مرتب:- ضیاء

(۱۰ر اپریل سے لے کر ۱۶ر اپریل تک پاکستان اکیڈمی ترقیٔ دیہات پشاور میں علمار کا ایک اجتماع وسیمینار ہوا، جس میں خاص طور سے تحصیل پشاور کے ائمہ وخطبار حضرات مدعو تھے۔ اس اجتماع میں ملک کے بعض ممتاز علمار نے شرکت فرمائی اور مقالات پڑھے۔ اس کے علاوہ دیہات کی زندگی کو بہتر بنانے کے وسائل بھی زیر بحث آئے۔ اور ان کے متعلق ماہرین نے مضامین پڑھے۔

اس اجتماع کا انتظام محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی مدد سے پاکستان اکیڈمی ترقی دیہات پشاور نے کیا تھا۔ اس میں کوئی دو سو کے قریب علمار نے شرکت فرمائی۔ یہاں مختصراً اس اجتماع کی رُوداد دی جارہی ہے) مدیر

اجتماع کی غرض وغایت

محمد مسعود صاحب ڈائرکٹر اکیڈیمی نے اجتماعِ علمار کا افتتاح کرتے ہوئے وہ اسباب جو

اس کے محرک بنے ، ان کا خلاصہ اِن الفاظ میں پیش کیا :۔

"پچھلے سال ایوان اسمبلی میں وزیر اوقاف کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ حکومت بیرونی ممالک میں تبلیغ اسلام کے لئے مبلغین بھیجے گی ۔ اس اعلان کو پڑھ کر میں نے وزیرِ موصوف کو ایک خط لکھا جس میں یہ تجویز پیش کی کہ باہر کے ممالک میں مبلغین بھیجنے کے علاوہ اپنے ملک میں بھی اُن کی اشد ضرورت ہے ۔ حکومت کو اپنے ہاں علماء اور ائمہ کو ایسی تربیت دینی چاہیئے جس سے وہ اپنے ملک و قوم کی ترقی میں مناسب حصہ لے سکیں اور راہِ حق کے سچے مبلغین بن کر اپنے غریب مفلس اور کروڑوں ان پڑھ بھائیوں کی خدمت انجام دے سکیں "

مسعود صاحب کی یہ تجویز پسند کی گئی ۔ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے اس کی افادیت تسلیم کرتے ہوئے محکمہ کی طرف سے ضروری مدد کی اور اس طرح یہ اجتماع ہو سکا ۔ موصوف نے اپنے افتتاحی خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہماری دینی حالت کے ساتھ دنیوی حالت اچھی نہیں ہوتی ، نہ ہمارے اخلاق اچھے ہوں گے اور نہ ہم دین کو زندہ کر سکیں گے ، خود ان کے الفاظ میں :۔

" . . . . اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ قرآن مجید میں موجود ہے :۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ۔ صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی زندگی کی بہتری اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ آخرت کی زندگی ۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ اور خدا کے منشاء کے مطابق دونوں کی مجموعی حیثیت سے بہتری اسلام کی مثالی زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے ۔ کیا ہمارے علماء و ائمہ اس مسئلے کی حقیقی اہمیت کو محسوس کریں گے ؟ اور فقر و افلاس کی دلدل سے نکلیں گے اور عام مسلمانوں کو بھی غربت و فاقہ کے چنگل سے نجات دلائیں گے "

اس کے لئے ڈائرکٹر اکیڈمی نے یہ تجویز کیا کہ علماء علم دین کے ساتھ کوئی نہ کوئی فن بھی حاصل کریں اور روحانی ترقی کے ساتھ لوگوں کی دنیوی ترقی کے لئے بھی کوشش

کریں۔ اس سے نہ صرف علماء کی اپنی حالت بہتر ہو جائے گی، بلکہ عوام الناس بھی غربت کی لعنت سے نجات حاصل کرلیں گے۔

اس سلسلے میں ڈائرکٹر اکیڈمی نے بتایا کہ علماء کو بعض فنی کاموں کی ضروری تربیت دینے کا انتظام ہماری اکیڈمی میں کیا گیا ہے، جس سے علماء کو خاطر خواہ فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اُن کی وساطت سے دیہاتی عوام کی حالت بھی سُدھر سکتی ہے۔

ترقی اور اسلام

اس اجتماع میں علمائے دین نے بھی مقالات پڑھے اور مختلف فنون کے ماہرین نے بھی۔ مولانا شمس الحق افغانی شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بھاول پور کا ترقی اور اسلام پر ایک طویل مقالہ پڑھا گیا۔ مولانا نے ترقی کے تصوّر اور اس کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے آخر میں بتایا:-

"ترقی سے ہماری محرومی اور ہمارا یہ زوال ترک اسلام کا نتیجہ ہے، ورنہ اسلام اور ترقی تو لازم و ملزوم ہیں، جیسے آگ اور گرمی کا وجود وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (تم سب قوموں پر غالب رہو گے اگر کامل مومن رہو گے)۔ اسلام کی گزشتہ تاریخ قرآن کے اس فرمان کی صداقت کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی مختلف اقوام سے ٹکر ہوئی۔ اور مسلمان سامانِ حرب اور تعداد میں اُن سے کم ہونے کے باوجود ہمیشہ فتح پاتے رہے۔ اس آیت کے مطابق تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ تمام جدید آلات میں اتنی ترقی کریں کہ اگر مسیحی اقوام سے سبقت نہ لے جاسکیں تو کم از کم ان کے مساوی ضرور ہوں۔ اور عالم اسلام اس کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کرے"۔

مولانا افغانی نے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی فرضیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو "بقدر طاقت فرض نہیں کیا، لیکن سامان جنگ اور اسباب ترقی دنیا کے متعلق فرضیت کا جو حکم دیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ نے استطاعت کا لفظ استعمال فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلم قوم یا حکومت دس لاکھ ہوائی جہاز یا ایٹم بم یا دوسرا سامان بنانے کی طاقت رکھتے ہوئے اس میں کمی کریں تو حکم الٰہی کے ترک کی وجہ سے سب گناہ گار اور مجرم قرار پائیں گے"۔

اس زمانے میں صنعتیں کتنی ضروری ہیں، اور یورپ نے جو ان میں ترقی کی ہے، اس سلسلے میں مولانا افغانی نے بتایا۔ یورپ کی ایک چیز یعنی اسباب ترقی اور تیاریٔ آلات حرب تو اسلامی ہے، اور اُس کی دُوسری چیز تہذیب شیطانی ہے۔" ہم نے اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے خوبی کو چھوڑ کر بُرائی کو اختیار کیا۔ صنعت کاری (جو درحقیقت ہماری ہی چیز ہے) میں تو ان کی پیروی نہیں کی، بلکہ تہذیب اور وہ بھی شیطانی تہذیب کو ہم نے اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا۔"

رفاہی کاموں میں عُلماء کا حصّہ

اس موضوع پر مولانا محمد عبدالقدوس شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی نے اپنا مقالہ پڑھا مولانا نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مدنی دور میں مسجد ہر قسم کی سرگرمیوں کا مرکز رہی۔ مذہبی، سیاسی اور اصلاحی ہر قسم کے کام اس مرکز میں انجام پاتے رہے، اگرچہ بعد کے ارتقائی مراحل میں یہ صورت قائم نہ رہ سکی، لیکن مولانا موصوف کے الفاظ میں

"تاہم ایک پہلو ایسا تھا جو مدۃ العمر مسجد ہی کے ساتھ وابستہ رہا اور وہ تھا عوام کی خصوصی اور عمومی تعلیم کا انتظام۔ قرونِ وسطیٰ میں مدارس کا ایک بڑا جال پھیلا ہُوا تھا ہر بڑے شہر میں درسگاہوں اور مدرسوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ ان تمام درسگاہوں کی عمارت کی ترتیب یہ تھی کہ مسجد تعمیر کر کے اردگرد درس گاہیں اور طلبہ کے لئے اقامت گاہیں تعمیر کی جاتی تھیں۔ اور جن چھوٹے دیہات میں فنڈ کی کمی کی بنا پر مستقل درسگاہ یا حجرہ بنانے کا انتظام نہ ہوسکا، وہاں مسجد ہی کا کمرہ درسگاہ اور اقامت گاہ دونوں مقاصد کے لئے استعمال ہونے لگا اور ہمارے دیہات میں آج بھی یہی معمول ہے۔"

گویا مسجد ان تمام صدیوں میں عبادت گاہ بھی تھی اور مدرسہ بھی۔ اور امام مسجد امامت کے ساتھ تدریس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس لئے معاشرہ میں اس کا بڑا احترام تھا۔ مولانا عبدالقدوس نے بتایا:۔

"مسجد میں عالم نے اور خانقاہ میں صوفی نے اپنے ارشاد کی بدولت تاریخ اسلام کی ان طویل صدیوں میں اخلاق اسلامی کی نشرواشاعت کی اور عوام و خواص کو رفاہی کاموں پر آمادہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ جیسے مجدد انہی مراکز سے پیدا ہوئے اور خطۂ کشمیر میں اسلام کے اولین نقیب شاہ میر اور عبدالرحمٰن بلبل شاہ بھی انہی دو مراکز کے فارغ التحصیل تھے۔"

مولانا نے فرمایا کہ اس دور میں ہمارے علماء اور ائمہ مساجد کو اصلاحِ عوام کی یہ ذمہ داری پھر اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ "وہ دوبارہ عوام کی اصلاح کے لئے اٹھیں اور انہی طریقوں سے اصلاح کا کام شروع کریں، جن طریقوں سے ابتدائی دور میں کام ہوا تھا۔" اس کے بعد مولانا نے نئی اصلاحی تحریک کے ضمن میں اپنی چند تجاویز پیش کیں ان میں سے ایک تجویز یہ تھی ۔ "جہاں تک ہو سکے ائمہ اور علماء کسبِ معاش کے آزاد وسائل پیدا کریں تاکہ غربت اور دوسروں پر انحصار اُن کے اخلاق و نصائح کی وقعت میں کمی پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بنے۔" نیز یہ کہ "جس طرح ہمارے عروج کے دور میں مسجد ہمارا اجتماعی مرکز تھی، اُسے اسی طرح دوبارہ مرکز بنانے کی کوشش کی جائے۔"

اہلِ علم اور کسبِ معاش

مولانا محمد جعفر پھلواری نے اپنے اس مقالے میں بتایا کہ دنیا میں کوئی جائز پیشہ حقیر نہیں۔ ذلیل پیشہ دنیا میں صرف ایک ہے اور وہ ہے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا۔ موصوف نے اس مضمون کی متعدد احادیث نقل کیں، جن میں محنت سے روزی کمانے والے کی تعریف کی گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا:۔

۔ ۔ ۔ ۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ سیدنا علی مرتضیٰؓ کہیں اینٹیں تھاپتے تھے اور کہیں رہٹ چلاتے تھے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ وغیرہم تجارتی کاروبار کرتے تھے اور یہ سب عشرہ مبشرہ کے افراد ہیں۔ خود حضورؐ اور صحابہؓ کی زندگیاں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ کسبِ حلال کے پیشے صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہیں اور فقط ضروری نہیں،

بلکہ عین عبادت ہیں "

معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں علماء وائمہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مولانا پھلواری نے کہا کہ اصلاح میں دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک اخلاقی اصلاح اور دوسری معاشی اصلاح۔ اخلاقی اصلاح سے آبادی کے اندر امن چین نصیب ہوگا۔ آبادی کی معاشی اصلاح کے بغیر بہت سی اخلاقی اصلاحیں بھی نہیں ہوتیں۔ ان تمام کاموں کے لئے جن سے گاؤں والوں کی معاشی حالت بہتر ہو، ائمہ اپنا پورا اعتماد قائم کرکے ان کو مختلف کاروباری تعاون کی ترغیب دینی چاہیئے۔

دیہاتی زندگی کے ارتقاء میں علماء اور ائمہ مساجد کا کردار

اس موضوع پر مولانا محمد حنیف ندوی نے مقالہ پڑھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اور مذاہب کے برعکس اسلام روحانیت اور مادیت دونوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ "یہ دل کا مذہب بھی ہے اور ذہن و فکر کا بھی۔ اس سے ایک فرد بھی کسب ضیا کرتا ہے اور پورا معاشرہ بھی۔ یعنی یہ وہ اکسیر ہے جس میں دین و دنیا کے فوائد جمع ہیں . . . . قرآن کی اصطلاح میں نیکی یا خیر کا "اطلاق" صرف دینی نیکی ہی پر نہیں ہوتا اس کا اطلاق صرف عبادات اور رسوم و شعائر ہی کی حد تک سمٹا ہوا نہیں، بلکہ اس کی وسعتیں عمل کی ہر اس شکل کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں، جس سے انسانیت کو کوئی فائدہ یا منفعت حاصل ہو سکے "

علماء اور ائمۂ مساجد کسانوں کو ذہنی تربیت دے کر اُن سے زرعی ترقی کے سلسلے میں بہت کام لے سکتے ہیں۔ یہ ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دیہاتی آبادی سے ان کا قریب ترین تعلق ہے۔ اس کے لئے مولانا کے الفاظ میں۔

" ضروری ہے کہ ہم علماء اور ائمۂ مساجد کی اس سلسلہ میں خدمات حاصل کریں۔ ان کے لئے ایسا تربیتی کورس مقرر کریں جو اُن کو ایک طرف تو پیداوار بڑھانے کے جدید ترین ذرائع سے آگاہ کرے اور دوسری طرف ان میں یہ جذبہ پیدا کر سکے کہ توحید و

سنت کی اشاعت کے پہلو بہ پہلو انہیں اس لگن کے ساتھ اپنے ملک میں اور اپنے دیہات میں کسانوں کی معاشی حالت سنوارنے اور پیداوار کی موجودہ شرح کو بڑھانے کے لئے ان تھک محنت بھی کرنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ حضرات اگر اپنے لائحۂ عمل میں یا روزمرہ کی مفوضہ دینی خدمات کے دائرہ میں ان چیزوں کو بھی داخل کر لیں اور اسلام نے مادی و روحانی زندگی میں جو حسین امتزاج پیدا کیا ہے، اس کی روح کو حقیقتاً سمجھ لیں تو آپ یقین جانیں ہم اپنے ملک کو چند ہی سالوں میں ترقی کے بام بلند تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مولانا حنیف صاحب نے اپنا مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا:-

"(علماء اور ائمۂ مساجد) لوگوں کے دلوں پر اس حقیقت کو نقش کرنے کی کوشش کریں کہ اسلامی نقطہ نظر سے اچھا لباس، اُجلے دیہات اور اُجلی تہذیب و ثقافت نہ صرف اچھی صحت کے ضامن ہیں بلکہ یہی وہ چیزیں ہیں جو قلب وضمیر میں اچھے اور صحت مند جذبات کی تخلیق کرتی ہیں۔

مولانا نورالحق ندوی ڈین اسلامیہ کالج پشاور نے "اسلامی ممالک میں علماء کا کردار عوامی ترقی میں" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ جس میں انہوں نے سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی اُن خدمات کا ذکر کیا، جو مصر کی عام فلاح و بہبود اور اصلاحِ معاشرہ میں ان بزرگوں نے کیں۔ موصوف نے اخوان المسلمین اور الجزائر و مراکش کے علماء کی اصلاحی جدوجہد پر روشنی ڈالی اور اس طرح علمائے پاکستان کی توجہ ان امور کی طرف مبذول کرائی۔

طفیل احمد قریشی نے "دیہی ترقی کے لئے ہمارے ائمہ کیا کر سکتے ہیں" کے ضمن میں بعض بڑی مفید تجاویز پیش کیں۔ انہوں نے مساجد میں پرائمری مدرسے کھولنے اور لائبریریاں قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ نیز بتایا کہ بجائے اس کے کہ آج کل کی طرح وعظ وارشاد زیادہ تر دوسرے فرقوں کے ابطال اور ایک دوسرے کے مذہبی زعماء کی تنقیص تک محدود ہو، "ہمارے علماء جو عوام کے لئے مؤثر ترین مبلغ ہیں اگر دیہی علاقوں میں

جمعہ، عیدین اور روزمرہ کے خطبات میں فضول رسموں، معاشرتی برائیوں اور عصری مسائل پر بصیرت افروز روشنی ڈالنے کا عزم کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ میں اُن کی اعانت مثال بن جائے"۔

"علماء اور دیہی تعلیم" پر ڈاکٹر شہیر الدین علوی نے مقالہ پڑھا۔ ماضی میں مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کے بارے میں علماء کے کارناموں کو مقالہ نگار نے ان الفاظ میں بیان کیا:۔

"مسلمانوں کے دورِ حکومت میں خواندگی کے عام ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ تعلیم و تعلم کو مسلمان عملاً اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ اور یہ طریقہ مسلمانوں کے ہاں آخری دور تک رہا، بڑے بڑے عہدے دار بھی تعلیم کے مشغلہ کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے تھے حتیٰ کہ اُس زمانے کے جج، مفتی، صدر الصدور وغیرہ کے مکان یا دیوان خانے یا محلہ کی مسجدیں مستقل درس گاہوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ . . . . انگریزی حکومت کے زمانے میں بھی ان غریب مولویوں نے سلف کے اس طریقے کو حتی الوسع باقی رکھنے کی کوشش کی۔ کلکتہ کو دارالسلطنت بنا کر انگریزوں نے کاکوری سے مولانا نجم الدین کاکوری کو طلب کیا اور اُن کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ پیش کیا۔ قاضی نجم الدین مرحوم باوجود اتنے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے طلبہ کو مفت درس و تدریس دیا کرتے تھے۔ بلکہ غریب طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی اپنی جیب سے کرتے تھے۔ اس دستور کو ہمارے علماء نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ میں بھی جاری رکھا"۔

مقالہ نگار نے علماء کی ان خدماتِ تعلیمی کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔ "یہ تھا علماء کا وہ شاندار کردار جس نے مسلمانوں میں دینی تعلیم اور خواندگی کو عام کر رکھا تھا۔ ہمارے علماء کرام پھر عوام میں علم کی روشنی پھیلا سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسجد مدرسہ ہو جس میں مقامی علماء اور امام صاحبان قدیم درس و تدریس کی روایات کو پھر زندہ کریں"۔

دین و دُنیا

"دین و دنیا" کے موضوع پر ڈاکٹر تسخیر احمد پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کینٹب ماہر تحفظِ نباتات نے ایک مقالہ پڑھا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے بارے میں کہا۔ میرے والد بزرگوار منشی فاضل اور مولوی فاضل تھے۔ اور لاہور میں سنٹرل موڈل سکول اور ٹریننگ کالج میں عربی اور فارسی پڑھاتے ریٹائر ہوئے۔ میں نے زراعتی کالج لائل پور سے پنجاب یونیورسٹی کی زرعی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سائنس کی اعلیٰ تعلیم گاہ یعنی کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ سے سائنس کی شاخ علم الحشرات میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان اور پاکستان میں تقریباً ۴۰ سال کی سروس کے بعد ڈائرکٹر تحفظ نباتات کے عہدے سے دو سال ہوئے ریٹائر ہوا"۔

مقالہ نگار نے بتایا کہ مجھے اپنی سروس کے دوران بہت سے ملکوں میں جانا پڑا اور میں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور خدا کے فضل سے میں نے ہر جگہ پابندی کے ساتھ نمازیں ادا کیں۔

سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد موصوف نے جیسا کہ انہوں نے فرمایا "آستانہ عالیہ سیال شریف ضلع سرگودھا میں ایک ایسے دارالعلوم کے توسیعی پروگرام کی نظامت کی ذمہ داری اٹھائی ہے جس کا نصب العین علم دین کی تعلیم کے ساتھ طلباء کو علوم دنیوی سے پوری طرح آگاہ کرنا ہے۔ درسی نظام کے ساتھ انگریزی، جدید سائنس اور فنِ زراعت کی تدریس لازمی قرار دی گئی ہے تاکہ اس ادارے کے فارغ التحصیل طلباء دینِ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے علاوہ جدید زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی بدرجہ اتم اہلیت رکھتے ہوں۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سیال شریف کے ملحق تقریباً دو مربع اراضی میں دارالعلوم ضیا شمس الاسلام کی ایک وسیع جدید عمارت تعمیر کی جارہی ہے، جس کے تدریسی کمرے تقریباً مکمل ہوچکے ہیں لیکن ابھی دارالاقامہ اور مسجد وغیرہ کی تعمیر باقی ہے۔ اس وقت کوئی ڈیڑھ سو کے قریب طلباء مختلف درجات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جن کی رہائش اور خوراک کا انتظام دارالعلوم کے ذمے ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ سب اس لئے کیا جا رہا ہے کہ

"اس طرح علماء اور نئی روشنی کے طبقہ کے درمیان موجودہ خلا دور ہو جائے رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کے مصداق پاکستان دین اور دنیا دونوں میں ترقی کرے"

ڈاکٹر تسخیر احمد کا یہ مقالہ بڑا ہی پُر مغز اور علماء کرام کے لئے نہایت ہی معلومات افزا اور مفید تھا۔ اُس کی اس اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اُس کے چند ضروری اقتباسات یہاں دیئے جاتے ہیں۔

اس سمع خراشی سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ دین و دنیا ہر حالت میں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں بشرطیکہ دین کی محبت ایسی ہو کہ کوئی دنیاوی کام اس کے ضروری اصولوں میں مخل نہ ہو۔ آپ سب دین کے عالم ہیں اور جانتے ہیں کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں رہبانیت نہیں۔ اسلام میں دینی اور دنیوی معمولات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ دین سب معمولات پر حاوی ہے، خواہ وہ کاشت کاری ہو یا تجارت۔ صنعت کاری ہو یا حکومت چلانے کے طریقے ہوں۔ حتیٰ کہ ہمارا اٹھنا، کھانا پینا سب عین دین ہیں، اگر اسلام کے طریقوں کو مدنظر رکھ کر کئے جائیں۔

اگر یہ اصول صحیح ہے تو پھر علماء اور حاکموں کے درمیان، طالبانِ دین اور سائنس دانوں کے درمیان تصادم کیوں۔ ایک زمانہ تھا جب مذہب کا مقابلہ فلسفہ سے تھا جس کی بنیاد وہم پر تھی۔ آج مذہب اور سائنس کا مقابلہ ہے۔ حالانکہ سائنس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے اور کسی چیز کے غور و خوض اور مشاہدہ کو اللہ تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا، بلکہ قرآن مجید میں جا بجا قدرت کی چیزوں کو استعمال میں لانے کے لئے غور و خوض کرنے والوں کے لئے نشانیاں بتایا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔

میرے خیال میں ان دو مخالف سمتوں میں جانے والے گروہوں کو ہم آہنگ اور ہم خیال کرنا ہمارے ملک کا اہم ترین مسئلہ ہے اس کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

ایک طرف علماء کا مطالعہ وسیع اور سائنٹفک ہو۔ سائنس کے اصولوں اور انگریزی لٹریچر سے واقفیت ہو اور دوسری طرف حکام سائنس دانوں اور تمام دنیاداروں کو دین کے اصولوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے تاکہ سائنس اور دنیا کی مادی ترقی کو دینِ متین کی روشنی میں سمجھیں اور اسلام پر مستحکم رہیں۔

میں مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ایک عالم صاحب جمعہ کی تقریر میں حاضرین کو بتا رہے تھے کہ ایک تانبے یا پیتل کے جگ میں سے پانی باہر نہیں نکل سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ جب اسی جگ میں برف ڈال دی جائے تو پانی کے قطرے دھات سے باہر نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حاضرین میں انگریزی خواں اور سائنس داں طبقہ کے دلوں پر کیا مضحکہ خیز تاثرات گزرے ہوں گے جو جانتے تھے کہ پانی کے قطرے باہر نہیں نکلے بلکہ ٹھنڈک کی وجہ سے باہر کی ہوا سے اس کی نمی برداشت نہیں ہو سکی اور شبنم کی طرح ٹھنڈی سطح پر قطرے بننے شروع ہو گئے۔ اس طرح کے کئی اور واقعات سننے میں آتے ہوں گے جو صرف سائنس کے اصولوں کی لاعلمی سے ظہور میں آتے ہیں۔

غور کیجئے کہ خالقِ حقیقی نے بنی نوعِ انسان کو تخلیق فرما کر اور اشرف المخلوقات کے اعزاز سے نواز کر دنیا میں بھیجا اور اس کے رہنے سہنے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دنیا میں جملہ اسباب پیدا فرمائے۔ انسان کو اپنی فطرتی ضروریات کی تکمیل کے لئے مختلف راہیں تلاش کرنی پڑیں، مگر اپنی عقلِ سلیم کے باوجود وہ اچھے برے کی کماحقہٗ تمیز سے قاصر رہا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ نے اصلاحِ معاشرہ اور تہذیبِ انسانیت کی خاطر مختلف زمانوں میں انبیا اور رسول علیہم السلام مبعوث فرمائے تاکہ لوگوں کو تخلیقِ کائنات کا اصل مقصد بتائیں اور امر و نہی سے روشناس کرا کر اُن کو جزا اور سزا سے آگاہ کریں۔

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مختلف پیغمبروں کے ذریعے جتنے دین آئے وہ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات میں تو یقیناً کامیاب رہے لیکن ان میں تا اَبد فطری مذہب

ہونے کی صلاحیت نہ تھی۔ یہ صرف خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبۂ عالی تھا کہ ایک ایسے مکمل دین فطرت کے ساتھ مبعوث ہوئے جو ہر زمانہ اور ہر صورت میں مفید اور قابلِ عمل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دین و دنیا دو مختلف ناقابل اجتماع ضابطے متصور ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص دینی اُمور میں تخصیص کرتا تو دنیا کے ساتھ اس کا کوئی خاص علاقہ نہ رہتا۔ اسی طرح دنیا کے کاموں میں مشغول ہونے والوں پر دین کے دروازے بند سمجھے جاتے۔ بدیں وجہ انسانی معاشرہ دو مستقل گروہوں میں بٹ کر رہ جاتا۔ آخر حضور کریم کی وساطت سے نوعِ انسانی کو ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا گیا جس میں دین و دنیا دونوں سے بیک وقت استفادہ کی راہیں پائی جاتی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے دین دنیا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کو دارالعمل قرار دے کر اس میں زندگی گزارنے کے لئے ایسے زریں اصول بتائے گئے جن پر کاربند رہ کر نہ صرف دنیا سے ہی مناسب فائدہ حاصل ہو سکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ دینی برکتوں سے بھی بخوبی استفادہ ہو سکتا ہے۔

آج کی دنیا اپنی تمام تر مادی ترقی کے باوجود انتہائی انتشار و پریشانی کا شکار ہے۔ سائنس کے محیرالعقول ایجادات کی بدولت ظاہری اسباب آرام و آسائش کے ہوتے ہوئے بھی انسانیت جتنے خطرات سے آج دوچار ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سوسائٹی اسلام کے پیش کردہ نظام حیات سے عاری ہے اور جب دنیوی امور میں دین کے اصلاحی پہلو شامل نہ ہوں تو انسانیت اخلاقی انحطاط کی گہرائیوں میں جا گرتی ہے اور پھر اس کے دامن میں سوائے بوالہوسی اور بے اطمینانی کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

جُدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دعا مانگو تو کہو:-

"اے ہمارے رب ہمیں دین دنیا اور آخرت کی بھلائی اور عافیت عطا فرما"

. . . . اگر ہمارے علماء کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی مضامین اور سائنس کے اصولوں سے آگاہ کیا جائے تو وہ دورِ حاضر کے تقاضوں اور مادی ترقیوں کو سمجھ کر دین کے اصولوں کو سائنس دانوں اور نئی روشنی کے طبقے تک کامیابی سے پہنچائیں اور ثابت کریں کہ دین اور دنیا میں اور عالموں اور سائنس دانوں میں کوئی تصادم نہیں۔

اس وقت کے سائنسی دور میں اگر دین کو دنیا کے سامنے ایک قابلِ عمل ضابطے کی صورت میں پیش نہ کیا گیا تو ترقی پسند طبقہ مذہب سے یکسر آزاد ہو کر لامذہبی میں پڑ جائے گا اور جب مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو ہماری قوم ان تمام اخلاقی اور روحانی اقدار سے محروم ہو جائے گی۔ جو دنیا میں ہمارے لئے طرۂ امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔

دنیا میں مذہب اور مادیت کی اس کشمکش میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے محض اس لئے مذہب سے دامن چھڑا لیا ہے کہ ان کا دین بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے قاصر ہے لیکن دین اسلام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ زمانے کے ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔ کیوں کہ یہ مکمل ترین دین ہے جو ہر عہد کی ضرورتیں بدرجۂ احسن پوری کر سکتا ہے۔ اب یہ علمائے کرام کا کام ہے کہ دینی احکام کو قوم کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ یہ عصری تقاضوں کی تکمیل میں۔ بجائے مزاحم ہونے کے ممد ثابت ہوں۔

ظاہر ہے کہ عوام کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی اولین ذمہ داری علماء حضرات پر عائد ہوتی ہے کیونکہ ان صاحبان کو ہمارے معاشرے میں جو اعلیٰ مقام حاصل ہے اس کی بدولت اس کام کو اوروں سے کہیں زیادہ خوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں۔

آپ حضرات کو ایسے اسلامی معاشرے کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے اور ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں مادی ترقی بھی ہو سکے اور روحانی اور اخلاقی اقدار بھی فروغ پائیں۔

عیسائی علماء اور سماجی ترقی

ایک اور بڑا اچھا مقالہ جو اس سیمینار میں ایک خاتون مس تسنیم قادر میاں نے پڑھا "عیسائی علماء اور سماجی ترقی" کے موضوع پر تھا، جس میں موصوفہ نے بتایا کہ کس طرح سرزمین پاک وہند میں

عیسائی مشنریوں نے تکلیفیں اٹھا کر سماجی فلاح و بہبود کی کوششوں کے ذریعہ اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ انہوں نے کئی ایک مشنریوں کا ذکر کیا اور ان کے بڑے سبق آموز حالات و کوائف بتائے۔

پادری فورمین جس کے نام سے اب بھی لاہور میں ایک مشہور کالج ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے موصوفہ نے بتایا وہ جنوری ۱۸۴۸ء میں کلکتہ آیا، وہاں سے لدھیانہ پہنچا۔ اس نے پنجاب میں مختلف مقامات پر اسکول قائم کئے جن کے ذریعہ وہ عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا۔ ایک بار فورمین نے لاہور کے قریب گاؤں میں ایک پرانی مسجد اور اس کے قریب کی زمینیں خرید لیں اور ایک عرصے تک اس مسجد میں مقیم رہا۔ ۱۸۶۴ء میں فورمین کے پاس ایک بہت بڑا اسکول تھا جس کی بیس۲۰ شاخیں تھیں اور جس میں اٹھارہ سو طالب علم تھے۔ اس نے فورمین کالج بنایا۔

ایک اور پادری کے حالات مس تسنیم نے یوں بیان کئے:۔

ڈاکٹر تھیوڈر لائٹن پینل ایم۔ ڈی ایک مشہور ڈاکٹر تھا، جس نے مشنری خدمات سرانجام دیں۔ وہ ۱۸۹۲ء میں کراچی پہنچا۔ وہاں سے وہ ڈیرہ اسمٰعیل خان گیا۔ جہاں وہ عام لوگوں کے ساتھ رہتا، ان کی زبان سیکھتا اور ان کا علاج کرتا۔ وہ ہمیشہ پٹھانوں کے لباس میں رہتا۔ اس نے مسعود اور وزیری قبائل میں بڑا کام کیا۔ ۱۸۹۳ء میں وہ اردو و پشتو کا ماہر ہو گیا، اور گاؤں گاؤں پھرنے لگا۔ اس نے ڈیرہ اسمٰعیل خان و بنوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔ اور ۱۸۹۳ء میں پشتو کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ بنوں کے ایک عیسائی جہان خان کے ساتھ اپنی دواؤں کے بکسوں کو ایک گدھے کی پیٹھ پر لاد کر پیدل چلتا۔ وہ دوا و علاج کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا۔ اور راتوں کو گاؤں میں پھرتا۔

۱۸۹۷ء میں پینل لاہور آیا۔ جہاں اس نے ایک پریس خریدا۔ جس سے اس نے بنوں میں ایک اخبار تحفۂ سرحد شروع کیا۔ اس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ پگڑی اور کلہ پہنتا، اور موقع کے مطابق افغانی، وزیری، پشاوری، خان اور ملا کے لباس

پہن لیتا۔ اور وضع قطع سے افغان نظر آتا۔

ایک دفعہ جب اس پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش شروع ہوگئی، تو وہ بڑی مشکل سے بچ سکا۔ اور اس کو ایسے موقعے بہت پیش آئے، لیکن وہ ہمیشہ صبر کرتا اور لوگوں کی خدمت سے باز نہ آتا۔

۱۹۰۴ء میں پینل نے سادھوؤں کے لباس میں پنجاب اور ہندوستان کا سفر بھی کیا۔ جہاں وہ دن بہت فقر و فاقے سے گزارتا رہا۔ جہاں سے وہ گجرات، جلال پور جٹاں اور وزیر آباد گیا۔ وزیر آباد سے وہ ڈسکہ اور پسرور گیا۔ اور اس طریقے سے پنجاب کے تمام علاقوں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا۔ وہ نارووال، بٹالہ اور قادیان بھی گیا۔ لیکن مرزا غلام احمد کی بیماری کی وجہ سے ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ پنجاب سے پینل لدھیانہ کی طرف سے سہارنپور گیا۔ اور وہاں سے دہلی اور مظفر نگر کی راہ رڑکی پہنچا۔ جہاں اس نے ایک مسجد میں قیام کیا۔ وہاں سے وہ ڈیرہ دون، مراد آباد، متھرا ہوتا ہوا آگرہ گیا۔۔۔۔۔"

یہ تو وہ مقالات تھے، جن کا تعلق علماء کرام کے خصوصی مسائل سے تھا۔ سیمینار میں ایسے مقالات بھی پڑھے گئے جن کی نوعیت دیہات کے ترقیاتی کاموں سے تھی۔ ان مقالوں کے عنوانات یہ تھے:۔ ہماری زراعت، انسانی زندگی میں جانوروں کا کردار۔ ماہی پروری۔ امداد باہمی کی تحریک۔ پاکستان میں صنعتی ترقی۔ بیماری کا تاریخی پس منظر مکئی کے تنے کی سنڈی۔ مگس بانی۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام اور دیہی ترقی۔

سیمینار ڈائرکٹر اکیڈمی برائے ترقیٔ دیہات محمد مسعود صاحب کے اس اختتامی خطبہ پر ختم ہوا۔ اس خطبے کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

موصوف نے علماء کرام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مقام مسرت ہے کہ آپ کا سات روزہ ٹریننگ پروگرام آج نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ ان سات دنوں میں آپ نے لاہور، کراچی اور راولپنڈی سے آئے ہوئے مشہور علماء کی تقریریں سنیں اور حکومت کے فنی ماہرین کی تقریریں بھی سنیں اور عملی تربیت بھی حاصل کی۔

علماء نے آپ کے سامنے ایک نئے رنگ میں دین و دنیا کا رشتہ بیان کیا ہے۔ تقریباً ہر مقرر نے اس بات پر زور دیا ہے اور دنیا کی بہتری کے ساتھ دین کی ترقی ممکن ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ روحانی بیداری کی خاطر لوگوں کی مادی حالت کو ٹھیک کرنا ازبسکہ لازمی ہے۔ اور اس سلسلے میں علماء کرام پر پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"

اس کے بعد فنی ماہرین کی تقریروں کا ذکر کرتے ہوئے مسعود صاحب نے کہا:۔ ان فنی ماہرین نے آپ کو بتایا کہ بیماریاں کیسے پیدا ہوتی ہیں، خدا کی زمین میں رزق پیدا کرنے کی کس قدر طاقت ہے اور یہ کہ کم پیداوار کی وجہ ہماری غفلت ہے۔ ماہرین نے یہ بھی بتایا کہ مرغیوں اور مویشیوں سے زیادہ سے زیادہ کیسے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آپ کو بعض اور مفید چیزوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئیں، مثلاً یہ بتایا گیا کہ اگر شہد کی مکھیاں پالی جائیں تو ہر ماہ اچھی خاصی آمدنی ہو سکتی ہے۔ نیز سبزیاں کاشت کرنے کے فوائد بتائے گئے۔ فرسٹ ایڈ یعنی معمولی مرہم پٹی کا طریقہ، چیچک کا ٹیکہ لگانے کا طریقہ بتایا گیا۔ یہ ٹریننگ آپ کے لئے بہت مفید ہوگی اور آپ اس طرح اردگرد کے لوگوں کی خدمت کر سکیں گے۔

آخر میں مسعود صاحب نے اپنا خطبہ علماء کرام سے اس پرخلوص اپیل کے ساتھ ختم کیا۔

"حضرات! ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے متعلق بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہے۔ جس وقت میں اس اجتماع کے انتظامات میں مصروف تھا، کئی ایک لوگوں نے مجھ سے کہا کہ علماء اور مولویوں کو بلا کر تم مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اور تم پر بھی یہ مولوی ایسے کفر کے فتوے لگائیں گے کہ تمہارا جینا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ مجھے علماء دین پر کامل اعتماد ہے، میں ان کا خادم ہوں مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا کر وہ کبھی خوش نہیں ہو سکتے۔ اور انشاءاللہ یہی علماء اب کفر کے فتوے دوسروں پر بھی نہیں لگائیں گے۔ عقیدوں کی بنا پہ ایک دوسرے کو کافر نہیں کہیں گے، بلکہ اب عمل کی بنا پر لوگوں پر کفر کے فتوے صادر کریں گے۔ دیہات میں بیماری

پھیلانے والے لوگوں پر، خدا کی زمین پر محنت نہ کرنے والے لوگوں پر، قرضہ لے کر ادا نہ کرنے والوں پر، بے ایمانوں پر اور غداروں پر کفر کے فتوے لگائیں گے اور یہی علماء اب ترقی اور خوشی کے علمبردار ہوں گے۔"

"میں ائمہ سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں۔ اپنی غربت کا خیال کریں، کیونکہ آپ کی غربت اور افلاس دیکھ کر ہر مسلمان کو اپنے دین پر شرم آتی ہے۔ جس دین کے علمبردار اور جس نبی کے وارثان اتنی خستہ حالت میں ہوں، اس دین کی اور اس نبی کی عزت لوگوں کے دلوں میں کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی پوری کوشش اس کام پر صرف کریں جس سے جلد از جلد آپ کی اور عوام کی غربت اور جہالت کا قلع قمع ہو سکے۔ جیسے ہی اس میدان میں کامیابی ہوگی، ویسے ہی روحانی اور دینی اُمور میں بھی کامیابی ہوگی۔"

"اس وقت آپ کے اسلامی دارالعلوم بُری حالت میں ہیں۔ کوئی سات سو دارالعلوم جن میں تقریباً ۲۵ ہزار طالب علم تعلیم پا رہے ہیں، آپ کی ذاتی کوششوں سے چل تو رہے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں اُن کی حالت کتنی خستہ ہے اور ان طالب علموں کو کس قدر مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ دیہاتی لوگوں کی ترقی کے لئے کوشش شروع کر دیں اور اُن کی خوش حالی کا باعث بن جائیں تو یقین جانیں کہ آپ کے انہی دارالعلوموں میں نہ صرف دس بیس گنا اضافہ ہوگا، بلکہ ان میں پچیس ہزار کے بجائے پچیس لاکھ طلبا نظر آئیں گے۔ اور انہی دارالعلوموں میں صنعت و حرفت، کھیتی باڑی، صحت، طب اور دیگر علوم و فنون کا دور دورہ ہوگا اور یہی دارالعلوم صحیح معنوں میں علم کے مرکز بن جائیں گے، اور آپ کا مقام ایسا ہی بلند و ارفع ہو جائے گا جیسا کہ اسلامی عروج کے وقت تھا۔ پھر آپ کی شان ہوگی۔ پھر آپ کی عزت ہوگی پھر آپ کا رُعب ہوگا۔ پھر آپ خوش حال ہوں گے، فارغ البال ہوں گے اور آپ کے دین کا بول بالا ہوگا۔"

پشاور یونیورسٹی سے ملحق یونیورسٹی ٹاؤن میں پاکستان اکیڈمی ترقی دیہات کی وسیع، خوبصورت اور مصفا عمارت ہے، جو بڑے ہی خوش منظر اور دلکش ماحول میں واقع ہے، علماء کا یہ اجتماع اسی عمارت میں ہوا۔ عام طور سے دوپہر تک مقالات کا پروگرام رہتا۔ کھانے اور نماز ظہر کے بعد تربیتی کورس ہوتے۔ حضرات شرکاء کو پشاور یونیورسٹی کے مختلف سائنسی شعبوں میں بھی لے جایا گیا، جہاں انہوں نے سائنس کے طریقۂ تعلیم کا ملاحظہ کیا۔

قدیم تعلیم اور جدید تعلیم والوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے، ائمہ وخطباء مساجد کو نئی زندگی اور اُس کے تقاضوں سے متعارف کرانے اور دیہاتی زندگی کو بہتر بنانے میں اُن کو شریک کرنے کے سلسلے میں یہ پہلی کوشش تھی جو کی گئی۔ امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور محکمۂ اوقاف اور پاکستان اکیڈمی اس کو اور آگے بڑھائے گی۔

مسئلہ وحدۃ الوجود میں راہِ اعتدال

مولانا عبدالحمید سواتی

ہست رب الناس را با جان ناس
اتصالے بے تکلیف بے قیاس

بود نقش نگار سا ہے کچھ صورت اک اعتبار سا ہے کچھ
یہ جو مہلت جسے کہے ہیں عمر دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ (میر)

اس مسئلہ پر کچھ لکھنے سے بہت ڈر لگتا ہے کیوں کہ بہت دقیق مشکل بلکہ اصعب المسائل ہے۔ لیکن جب صدیوں سے یہ مسئلہ بھی اہل نظر و فکر کے سامنے زیر بحث رہا ہے تو ہمیں بھی با دلِ نخواستہ بعض باتوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس مسئلے میں کافی افراط و تفریط واقع ہوئی ہے، ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس میں راہِ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

تمام کائنات مخلوق ہے یہ تو یقینی بات ہے لیکن یہ معلوم کیا جائے کہ اس کائنات کا اپنے خالق اور اللہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اور یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی۔ اس لئے اس مسئلے کے سمجھنے سے بھی چارہ کار نہیں، اور مسئلہ کی اصل حقیقت کو بھی

بقدر استطاعت جاننا لازمی ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدین کا ارشاد

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی نے اس بارہ میں خوب کلام کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

"میں کہتا ہوں جیسا کہ ایک بے عقلوں کی جماعت اس مسئلہ (وحدۃ الوجود) کی فضیلت بیان کرنے میں راہ صواب سے ہٹ گئی ہے اور اس مسئلہ کی معرفت میں انہوں نے شریعت و ہدایت کے کمال کو منحصر سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح کچھ دوسرے بے سمجھ لوگوں کی جماعت اس مسئلہ کے انکار کرنے میں راہ صواب سے اس قدر دور جا پڑی ہے کہ اس مسئلہ کا انکشاف اور اس کے راز کا مشاہدہ ان کے نزدیک ایسے خیالات کی قسم سے ہے جو واقع کے مطابق نہیں، اور اس مسئلہ کے قائلین کو وہ اس بات کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ان کے مزاج میں سودا کا غلبہ ہے۔ اسی طرح کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ اس حال کو زندقہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور ایک گروہ اس کو راہِ صواب سے قصور اور انحراف سمجھتا ہے۔ اور بعض اس کو خطائے اجتہادی کے قبیل سے خیال کرتے ہیں۔ الغرض کہ یہ لوگ طرح طرح کے اوہامِ باطلہ کا شکار ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ حقیقت بین کی نگاہ میں توحیدِ ایمانی ہے۔ اس مسئلہ کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ پہلے سے موجود ہے۔

طائفہ مرجئہ اس اصل ایمان کو کامیابی کے تمام مراتب میں کافی خیال کرتا ہے اور عذاب سے خلاص کلی کا باعث یا مکمل رہائی اسی کو سمجھتا ہے، اور مرجئہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت نقصان نہیں دیتی جیسا کہ کفر کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ اور خارجیوں کے گروہ نے اس کو اپنے اصل مقام سے بالکل ایسا ہی نیچے گرا دیا ہے کہ اس سے نجات مل سکے یا نارِ مؤبد سے رہائی ممکن ہو۔ بلکہ انہوں نے ارتکاب صغیرہ و کبیرہ کو کفر صریح شمار کیا ہے۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور بہت سی دوسری مخلوق کو راہِ راست سے گمراہ کیا۔ حق بات یہ ہے کہ جس طرح توحیدِ ایمانی نجات کے مراتب میں اصل ہے لیکن اس کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی امداد ضروری ہے اسی طرح توحیدِ عرفانی مراتبِ عرفان میں اصل ہے لیکن اس کے ساتھ عمدہ احوال کا تلبس بھی ضروری ہے اور ظاہر

ہے کہ یہ احوال اعمالِ صالحہ کا ثمرہ ہیں اور اس بات کو اصل نجات میں دخل نہیں۔ اعمالِ صالحہ بھی عذاب سے رہائی اور جنت کے درجات کی ترقی کا باعث ہیں اور توحیدِ وجودی کا حق کمال اتباع کے بغیر میسر نہیں ہو سکتا جیسا کہ بزرگانِ دین کی کتب میں مصرح ہے۔ یہ افراط و تفریط صرف اس مسئلہ وحدۃ الوجود کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام عقائد دینیہ، اعمال شرعیہ، اخلاق محمودہ تین درجے رکھتے ہیں۔ افراط، تفریط توسط۔ اور بحکم "خیر الامور اوساطها" کہ بہتر کام اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ توسط (اعتدال و میانہ روی) ہر معاملہ میں پسندیدہ ہے خواہ اعتقاد ہو، عمل ہو یا اخلاق اور افراط و تفریط مذموم ہے۔

امام بیضاوی رح نے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ کی تفسیر میں فرمایا ہے "یامر بالعدل بالتوسطِ فی الامورِ اعتقاداً کالتوحید المتوسطِ بین التعطیل و التشریك والقول بالکسب المتوسطِ بین الجبر والقدرِ۔ وعملاً کالتقید باداء الواجبات والمندوبات الماثورة المتوسط بین البطالة والترهب۔ وخلقاً کالجود المتوسط بین البخل والتبذیر" ("یعنی اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل یعنی توسط اور میانہ روی اختیار کرنے کا تمام امور میں۔ مثلاً اعتقاد ہے تو اس میں توحید کو اختیار کرنا جو متوسط ہے تعطیل (یعنی خدا کو معطل خیال کرنے) اور شرک کے درمیان، اور بندہ کے لئے کسب کا قول کرنا کہ بندہ کاسب ہے اور خدا خالق ہے یہ متوسط ہے جبر اور قدر کے درمیان۔ اور عمل میں جیسا کہ واجبات اور مندوبات کی پابندی یہ متوسط ہے بالکل بے کار محض رہنے اور غایت درجہ کے زہد میں۔ اور اخلاق میں مثلاً سخاوت متوسط ہے بخل اور فضول خرچی کے درمیان")۔

جب افراط و تفریط کی راہ طے کرنا تمام اصول و فروع میں نامناسب ہے تو اس مسئلہ وحدۃ الوجود میں جو معارف کی اصل ہے اور مطالب میں ادق ہے اس میں افراط و تفریط اختیار کرنا تو بہت زیادہ ہی نامناسب ہو گا۔ پس اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو غارت کرے جنہوں نے اہل اللہ کے کلام کو غیر محل پر محمول کیا اور غیر محل میں اتارا۔ الحاد و زندقہ

اختیار کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو کر اور بے گانگی اختیار کرتے ہوئے۔ محض شیطانی مزخرفات کا اتباع کیا اور سرکشوں کی تعمیل کی۔"

(دمغ الباطل مخطوطہ ص ۴۵ و ۴۶)

حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کی تحقیق

وحدۃ الوجود کی صوفیہ کرام کی اصطلاح میں عام طور پر یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ تمام موجودات کو ایک وجود حق خیال کرنا اور ماسوا کے وجود کو محض از قسم اعتبارات سمجھنا مثلاً، موج، حباب، گرداب، قطرہ، ژالہ وغیرہ سب کو ایک ہی پانی سمجھتے ہیں، لیکن یہ تعبیر تو بہت ہی سادہ ہے اس سے یقیناً اس مسئلہ کی حقیقت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ اصل بات یہ ہے جیسا کہ حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی فرماتے ہیں جو چیز حواس خمسہ ظاہرہ (باصرہ۔ سامعہ۔ شامہ۔ ذائقہ۔ لامسہ) اور حواس باطنہ (حس مشترک۔ خیال۔ وہم۔ حافظہ۔ متصرفہ) کی مدد سے مدرک ہوتی ہے وہ اگر واقع کے مطابق ہے تو یہ حق ہے اور اگر وہ واقع کے مطابق نہیں تو وہ باطل ہے اور یہ بات قائلین وحدۃ الوجود کے نزدیک محقق اور ثابت ہے کہ حق جس طرح اللہ تعالیٰ کے بعض مظاہر سے ہے اسی طرح باطل بھی اس کے بعض مظاہر سے ہے۔ حضرت شیخ ابومدین مغربی جو کہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے شیخ ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ؎

لا تنکر الباطل فی طورہ   فانہ بعض ظھوراتہ

باطل کو اوپرا مت سمجھو اس کے طور میں یعنی عیب کی طرف مت منسوب کرو کیونکہ وہ بھی اس کے ظہور کا کرشمہ ہے اس لئے کہ وجود ہر شئ کا اس کے وجود کا پرتو ہے اس لئے اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا حق ادا کرو، تاکہ تم بھی مرتبہ کمال تک پہنچ سکو۔ اور وہ مرتبہ وحدۃ الوجود ہے یعنی ہر چیز کے وجود میں وجودِ حق دکھائی دے (لیکن مبتدی شخص کو اس میں مشغول نہ ہونا چاہئے کیونکہ وہ اپنے لازمی اور ضروری معاملات سے رہ جائے گا اور سمجھ نہ آنے پر گمراہی کا خطرہ ہے)۔

شیخ مؤیدالدین الجندی رحؒ نے اس پر ایک شعر اور اضافہ کیا ہے ؎

فالحق قد یظھر فی صورتہ وینکرہ الجاھل فی ذاتہ

شیخ مؤیدالدین الجندی رحؒ فرماتے ہیں کہ حق کا ظہور بھی اس کی صورت سے ہوتا ہے اور جاہل اس کی ذات (اصل) سے ہی انکار کر دیتا ہے۔

پس جو کچھ نفس کے اندر مدرک ہوتا ہے۔ کلیات ہوں یا جزئیات۔ اس کے مطالعہ میں وجود مطلق ایک خاص شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، اور یہ رستہ تمام رستوں میں اقرب اور اوثق ہے جس سے خطرات بند ہو جاتے ہیں اور شک نہیں کہ اس حالت میں کیفیت غیبیہ اور حالتِ ذوقیہ پیدا ہوتی ہے۔ اور مراتب کیانی (شہنشاہی والہی) ادراک کے احاطہ میں آتے ہیں۔ اور درست بات یہ ہے کہ مطالعہ کی نفی کر دو اور اس غیبی کیفیت کو پکڑ لو اور اپنے نفس کو چھوڑ دو۔ اور اچھی طرح بے ہوشی کے دامن کو سمیٹ لو، کہ غیب سے باہر آنا ناشکرگزاری ہے اس طریق کے محققین کے نزدیک اگرچہ اس سے باہر آنا توجہ و تفکر حقائق اور تدبر دقائق علمی و عملی سے ملا ہوا ہے۔ کیونکہ غیبت و بےخودی۔ وادی حیرت کی ابتدا اور وہ ان مقامات کا آخر ہے۔

(کشکول کلیمی ص ۲۷ و ۲۸)

سالک بچشم دل اپنی حقیقت جو کہ حقیقت جامعہ ہے کی طرف دیکھتا ہے اور اپنی حقیقت کو اپنی چشمِ دل سے مشہود رکھتا ہے، اپنے تمام احوال و افعال میں، اس کے بعد نظر کرتا ہے کہ اس کی حقیقتِ جامعہ تمام موجوداتِ حسنہ و قبیحہ، لطیفہ ... .. ، و کثیفہ، محسوسہ، و غیر محسوسہ میں جاری و ساری ہے۔ یہاں تک وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ جمیع عوالم اس کے ساتھ قائم ہیں اور یہ سرایت، اس کے تمام موجودات کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔ پس جو محسوس و معقول ہے (حس و عقل میں جو چیز آتی ہے) وہ آئینہ ہوتا ہے کہ سالک اس میں اپنی حقیقت جامعہ کو دیکھتا ہے۔ گویا تمام عالم بمنزلہ جسم کے بن جاتا ہے اور سالک بمنزلہ اس جسم کی روح کے، اور مرتبہ کو مرتبہ جمع الجمع (یا شہود خلق قائم بحق) کہتے ہیں۔ جب سالک میں یہ مراقبہ خوب قوت پکڑ لیتا ہے

اور جو کچھ عوالم میں گزرتا ہے سالک اس سے متاثر ہوتا ہے، غم ہو یا خوشی۔ اس لئے کہ جسم پر اگر راحت یا تکلیف وارد ہو تو روح کا ادراک لازمی ہے (کشکول کلیمی ص ۲۸ و ۲۹)۔

بعض اس (وجود) مطلق کو دریائے نور غیر متناہی سے تعبیر کرتے ہیں اور خود اپنے آپ کو ایک قطرۂ نور جو اس دریائے نور میں مستہلک (نیست ہونے والا) دیکھتے ہیں۔ اور بعض اس کو ظلمت غیر متناہی قرار دیتے ہیں اور خود اپنے آپ کو اپنا ظل خیال کرتے ہیں جو شب دیجور میں مستہلک تھا اور بعض اس کو اس خلاء کے ساتھ جو آسمان و زمین کے درمیان ہے یا ہر چیز کے درمیان ہے تمثیل دیتے ہیں۔ اور یہ محض تمثیل ہے جو معقول و محسوس کے ساتھ کمزور اور ضعیف عقول والے لوگوں کی تفہیم کی خاطر دی گئی ہے۔ ورنہ ذات برحق ان تمام تشبیہات و تمثیلات سے بہت بلند ہے ع

وللناس فیما یعشقون مذاھب

مطلوب اس سے موہوم ہستی کا فنا کرنا ہے جو کہ دیدہ سالک پر وجود مطلق جو کہ حقیقت ہے کہ مشاہدہ سے پردہ ڈالے ہوئے ہے حاصل یہ ہے کہ سالک اپنے نفس ناطقہ میں ایک نسبت دریافت کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس نسبت کی طرف ثانی کسی کے ساتھ مربوط ہے اور سالک اس کو جس میں بھی بند کرتا ہے تو لامحالہ اس کے لئے ایک تعین پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بارگاہِ مطلوب اور دربار مقصود قطعی طور پر اس تعین سے ماورا رہے۔ اور یہ جس مرتبہ میں ٹھہرتا ہے، وہ دربار مطلوب اس سے ماوراء ہے۔ جو کچھ سالک کے حیطۂ تصور میں متعین ہوتا ہے۔ وہ لامحالہ ذہن سالک کے تعین سے ہی متعین ہوتا ہے، اور ہر متعین جو کسی بھی قید و تشخص سے متعین ہو۔ وہ مطلوب نہیں۔ اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مطلق (ذات) کی کنہہ (حقیقت) تک کسی نبی اور ولی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں" (کشکول کلیمی ص ۴۴)

میرزاہدؒ کی تحقیق

حضرت مولانا محمد زاہد ہرویؒ استاذ شاہ عبدالرحیمؒ والد امام شاہ ولی اللہؒ وجود کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

تحقیق یہ ہے کہ وجود مصدری معنی سے (مصدری معنی وجود کا ہونا ہے) ایک امر اعتباری ہے، جو نفس الامر میں متحقق و ثابت ہے۔ اور وجود بمعنی مابہ الموجودیہ (جس کے ساتھ ہستی کا قیام ہوتا ہے) خود بنفسہ موجود ہے۔ بلکہ واجب لذاتہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ کسی چیز کے اعتباری ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ نفس الامر میں متحقق ہو بایں معنیٰ کہ اس کا موصوف ایسا ہو کہ اس چیز کا انتزاع اس سے ہو سکے۔ یہاں تین چیزیں ہیں۔ ایک منتزع عنہ (جس سے کوئی چیز انتزاع کی جا سکتی ہو) اور یہ ماہیت ہے من حیث ہی کے درجہ میں اور دوسرا منتزع ہے اور وہ وجود ہے معنی مصدری کے اعتبار سے اور تیسرا منشأ انتزاع ہے۔ اور وہ وجود بمعنی مابہ الموجودیۃ ہے، جو قائم بنفسہ ہے۔ اور واجب لذاتہ ہے کیونکہ یہ ماہیت کے ساتھ قائم نہیں، نہ انضمام کے طریقہ پر ورنہ اس کا تاخر موصوف کے وجود سے لازم آئے گا۔ اور نہ اس کا قیام ماہیت کے ساتھ انتزاع کے طریق پر ہے۔ ورنہ وجود بالمعنی المصدری کے انتزاع کے وقت ایک اور انتزاع لازم آئے گا۔ بلکہ انتزاعات کا ایک غیر متناہی سلسلہ قائم ہو جائے گا"۔

اسی طرح حضرت میر زاہدؒ واجب الوجود کے علم کی بحث میں فرماتے ہیں کہ خوب جان لو واجب تعالےٰ کے لئے ایک علم اجمالی ہے اور ایک علم تفصیلی۔

علم اجمالی علم تفصیلی کا مبدأ ہے۔ اور یہ صفت کمال ہے، اور عین الذات ہے اور اس کی تحقیق جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کی سمجھ عطا فرمائی ہے یہ ہے کہ ممکن کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت وجود اور فعلیت ہے۔ اور دوسری جہت عدم اور لافعلیت ہے۔ ممکن دوسری جہت کے اعتبار سے اس کے قابل نہیں کہ علم کا اس کے ساتھ تعلق ہو۔ کیونکہ اس جہت سے تو وہ معدوم محض ہے۔ اور جس جہت کے اعتبار سے اس کے ساتھ علم کا تعلق ہے وہ پہلی جہت ہے۔ اور یہ جہت بھی اسی کی طرف راجع ہے۔ اس لئے کہ ممکن کا وجود بعینہ وجود واجب ہے جیسا کہ محققین اس طرف گئے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا علم ممکنات کے ساتھ، مشتمل اس کے علم کے ساتھ جو اپنی ذات کے ساتھ ہے اس طرح کہ اس سے کوئی چیز بھی غائب نہیں،

اور اس کے فہم پر اوصاف انتزاعیہ کی حالت جو اُن کے موصوفات کے ساتھ ہوتی ہے اس سے امداد حاصل کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان اوصاف انتزاعیہ کے لئے ایک قسم کا وجود ہوتا ہے۔ جو خارجی وجود کے قائم مقام ہوتا ہے آثار کے ترتب ہیں۔ اور یہ منشأ اتصاف بھی ہوتا ہے اور اسی کے باعث ان کے درمیان اور ان کے موصوفات کے درمیان امتیاز کی لکیر کھینچی جاسکتی ہے۔ اور علم تفصیلی تو وہ علمِ حضوری ہے موجوداتِ خارجیہ اور صور ذہنیہ علویہ اور سفلیہ کے ساتھ"۔ (حیات ولی ص ۲۱۳، ۲۱۴ بحوالہ تعلیقات جدید)۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ارشاد

حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے ایک مکتوب میں جو مولانا عبدالقادر جونپوری کے مکتوب کے جواب میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں "آپ کا مکتوب شریف ملا جو بلند مقصد پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں ایک ایسے مسئلے سے تعرض کیا گیا ہے جس میں افکار حیران ہیں، اور نظریں اس تک پہنچنے سے ہچکچاتی ہیں۔ میرے لئے کیسے ممکن ہے کہ ایک ورق میں اس کا جواب لکھ دوں۔ یا ایک کلمہ میں اس کا حل پیش کر دوں، اچھا میں ایک نکتہ ذکر کرتا ہوں آپ کی تقریر میں جو تیسرا معنیٰ توحید کا ذکر کیا گیا ہے کہ "ممکنات کی ذوات بتمامہا اور مجعولات کے ذرّات سب چھوٹے بڑے فنا ہیں اپنے جواہر کے اشباح میں اور بے حقیقت ہیں اپنی ذات میں۔ پس اگر واجب کا فیض نہ ہو تو یہاں نہ کوئی ذات ہو اور نہ ماہیت سمجھ میں آئے۔

ان ماہیات و ذوات کا تقرر اور صدور اور ان پر حکم لگانے کی صلاحیت صرف اس ذات عالی کی طرف نظر کرتے ہوئے ہے۔ جس کے فیض کا سایہ بہت پھیلا ہوٗا اور دراز ہے"۔ یہ جو آپ نے کہا ہے یہ بعینہٖ وحدۃ الوجود ہے۔ محققین کے نزدیک جو اہلِ معرفت اور اہل شہود ہیں، لیکن ان کی زبانیں اور طرز بیان اس بارہ میں مختلف ہیں۔ بعض نے مجاز اور مسامحت کی زبان میں گفتگو کی ہے، اور بعض نے تحقیقی طور پر حقیقت کو کھول کر بیان کرنے کا طریق اختیار کیا ہے ؎

عبارا تنا شتّٰی وحسنک واحد　　　وکل الی ذاک الجمال یشیر

پس یہ فیض بالذات وحدانی ہے اور باعتبار قوابل کے متکثر ہے۔ اس فیض کو فیض اقدس سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ماہیات کے صدور کی جہت سے اور اس کو فیضِ مقدس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فعلیات اور لوازم وجود خارجی کی صدور کی جہت سے۔ باقی ان کا یہ کہنا کہ وہی وجود مطلق ہے۔ تو اس مطلق سے ان کی مراد امر انتزاعی نہیں ہوا کرتا، جو افراد سے انتزاع کیا جاتا ہے جیسا کہ متکلم کلیات میں اس کی تقریر کرتا ہے اور نہ اس سے مراد موجود فی ضمن الافراد ہوتا ہے جو بالاستقلال موجود نہیں ہوتا جیسا کہ حکیم کا زعم ہے بلکہ اس سے مراد ایک ایسا امر ہے جو فی نفسہ متحقق ہے اور متعین بذاتہ ہے جس کی طرف تمام ممکنات کی نسبت یکساں ہے۔" (مکتوب شاہ ولی اللہؒ مندرجہ حیات ولی صفحہ ۵۴)۔

اعیان ثابتہ

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں "کشف کی بصیرت فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لئے نقائض ہیں، جو علم کے مرتبہ میں بالکل متمائز ہیں، یعنی ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ پس علم کی نقیض جہل ہے اور قدرت کی نقیض عجز ہے اور بصر کی نقیض عمیٰ (نابینائی اور اندھا پن) ہے اور اسی طرح یہ نقائض اعدام اصلیہ ہیں - (یعنی اپنے اصل مرتبہ میں معدوم ہیں) اور علم کے مرتبہ میں مستقر یعنی ثابت ہیں، لیکن اپنے نقائض کی طرف اضافت سے، یعنی جب ان کو ان کے نقائض کی طرف مضاف کیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صنع اور کمال قدرت سے یہ اعدام اس مرتبہ میں اپنے نقائض کے رنگ سے رنگین ہو جاتے ہیں، اور وہ نقائض صفات کمال ہیں۔ اور جب یہ مرتبہ علم میں آپس میں باہم مخلوط ہوتے ہیں تو ان کو اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے۔ اور ان کا اس مرتبہ میں وجود کے رنگ سے رنگین ہونا ہی کون اول ہے۔ اور سبب ہے خارج میں موجود ہونے کا۔ پس اعیان ثابتہ ظلال ہیں صفات کے، اور ممکنات ظلال ہیں خارج ظلی میں ان اعیان ثابتہ کے۔ اور ممکنات کے ظلال ہونے کا معنی یہ ہے کہ وجود اور اس کے توابع کا فیضان اور افاضہ مبدء فیاض سے ممکنات پر جو موجود فی الخارج ہیں۔ ان اعیان ثابتہ کے توسط کے بغیر

نہیں ہو سکتا، جیسا کہ قندیل کی روشنی اشیاء پر زجاجہ (شیشہ) کے توسط سے ہوتی ہے۔
پھر یہ بات بھی ہے کہ اعیانِ ثابتہ کا توسط صفات اور ممکنات کے درمیان صرف اس
دارِ دُنیا میں ہے۔ رہا آخرت تو وہاں وجود اور اس کے توابع کا افاضہ صفات سے بغیر
اعیانِ ثابتہ کے توسط سے ہو گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ممکنات پر فنا کا طاری ہونا دنیا میں
ہے آخرت میں نہیں۔" (تفسیر مظہری ص ۱۹ جلد ۱۰)۔

شیخ ابوالرضاء کی تحقیق (حضرت امام ولی اللہؒ کے عم بزرگوار حضرت شیخ ابوالرضاء محمد
صاحب جو حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے استاد بھی ہیں) فرماتے ہیں کہ" وجودِ عالم مستلزم ہے
عدمِ واجب کو، کیونکہ بر تقدیرِ وجودِ عالم، واجب یا تو خارج از عالم ہو گا تو محدود ہو گا، اور
محدود واجب نہیں ہو سکتا یا داخل عالم ہو گا۔ پس حلول لازم آیا۔ حالانکہ حق تعالےٰ
حلول سے منزہ ہے اور اس طرح عدم ممکنات من جمیع الوجوہ بھی ضروری البطلان ہے لہٰذا
یہ بات متعین ہو گئی کہ عالم عبارت ہے۔ حقیقتِ وجود کے تعینات اعتباریہ سے یا بالفاظ
دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ عالم بذات خود معدوم ہے اور موجود بالغیر ہے۔ اور وہ غیر
اس کا قیوم ہے۔" (انفاس العارفین ص ۱۰۱)۔

اسی طرح شیخ ابوالرضاءؒ نے فرمایا کہ" ایک مرتبہ علماء اور عرفاء کی ایک بڑی
مجلس میں میں نے مسئلہ وحدۃ الوجود ثابت کیا اور متکلمین کی عبارات سے تمسک کیا
عقلی و نقلی دلائل پیش کئے لیکن لفظ وحدۃ الوجود کا ذکر نہ کیا، سب نے اس کو قبول
کیا۔ دیکھو اہل رسوم کا تعصب الفاظ سے کس طرح زیادہ ہوتا ہے۔" (انفاس ص ۱۰۲)۔

اسی طرح آپ نے ایک دفعہ یوں فرمایا کہ" وجودِ عالم وہم کے مرتبہ میں ہے۔
اور حق تعالیٰ وجودِ خالص ہے۔ ایک عارف نے کہا ہے کہ وجود کل میں ساری ہے
اور تعینات امورِ اعتباریہ میں سے ہیں۔ پس عالم، حق تعالیٰ سے ابعد ترین اشیاء
میں سے ہے، کیونکہ موجودِ حقیقی اور موہوم میں باہم تضاد ہے۔ اور ان کے درمیان
جامع نہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سراب دریا سے بعید ترین اشیاء میں سے
ہے۔" (انفاس العارفین ص ۱۰۲)۔

شاہ رفیع الدینؒ کی تحقیق

رسالہ شرح رباعیات میں شاہ رفیع الدینؒ نے ایک رباعی درج کی ہے ؎

در یادِ تو حالتے عجیب داشتہ ام در عشقِ تو تخمِ نادرے کاشتہ ام
نہ خود توام و نہ جز تو چیزے دگرم حیرت زدہ ام چہ وہم پنداشتہ ام

تیری یاد میں میری عجیب حالت ہے، اور تیرے عشق میں میں نے عجیب نادر تخم بویا ہے۔ میں نہ تو خود تیری ذات میں ہوں اور نہ تیرے سوا کوئی اور چیز، میں بڑا حیران ہوں کہ میں نے کیا وہم اپنے لئے پیدا کر لیا ہے۔

شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ وجودِ مطلقِ حقیقی کے لئے ایک ذات مستقل ثابت ہے اور وہ مجرد ہے قیود سے، اور مغائر ہے مقید سے باعتبار ذات کے اور نیز باعتبار طرف حصول کے اس طرح کہ مقیدات کی ذوات کے لئے اس موطن میں وقوع اور اس ذات کے ساتھ اتحاد متصور نہیں ہو سکتا اور اس بارگاہِ جلال میں ان خاکروبانِ خسیس کا نام و نشان بھی نہیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔ کان اللہ ولم یکن معہ شیءٌ وھو الآن علیٰ ما علیہ کان۔ "اللہ کی ذات تھی اور اس کے ساتھ اور کوئی چیز نہیں تھی اور اب بھی اس کی ذات اس طرح ہے جیسے کہ پہلے تھی"۔

اور مقید کے لئے بجز ذات موہوم کے جس کی کنہ (حقیقت) وہی ذات مطلق ہے، مع قیود عدمیہ کے اپنے مواطن ظلیہ میں اس کے علاوہ کوئی جوہر اور ذات نہیں ہے۔ پس مطلق کے لئے باعتبار ذات کے غیریت ثابت ہے۔

اور نیز مراتب ظہور میں اتحاد بھی حاصل ہے اور مقید کے لئے بھی ایک امر ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہی اس کے لئے مطلق سے مغایرت اور استقلال کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ورنہ دارِ وجود میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

اس مسئلہ کو جاننے اور سمجھنے کے سلسلہ میں تباہی اور خرابی کا منشاء ہوتا ہے کہ عدمی قیود کو اس حیثیت سے کہ وہ عدمی ہیں ذات مقید میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس سے خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ذات مقید تو کوئی جدا نہیں اس ذات مطلق سے اور

ذات مطلق کا بلند و برتر ہونا ثبوت کی تقیید سے اور اطلاقِ حقیقی کی حیثیت سے ان قیود کا اس سے انتفار کرنا بھی مسلم، اور اس معنی کی حقیقت پر آگاہ ہونا "کمال یاد داشت" ہے اور اس کمون کے حصول کا موجب لفظ محبت ذاتیہ ہے۔ اس ذات کی حقیقت کے آثار کے لحاظ سے۔

اسی طرح شاہ رفیع الدین رسالہ تحقیق آذان میں فرماتے ہیں "اللہ اکبر، یعنی وہ اپنی ذات میں بلند ہے اس حیثیت سے کہ طبقات وجود میں سب سے اعلیٰ و اکمل طبقہ میں ہے۔ اللہ اکبر، یعنی اس کے ظہور کا احاطہ ناممکن ہے اس کے کمالات کے سریان کے اعتبار سے ظاہر میں خواہ معقولہ ہوں یا مشہودہ، اور اس کا خلاصہ معرفت ہے۔ حجابات کے منتفی ہونے کی اور کثرت کی ظلمات کے محو کرنے کی ذات قدیم سے، قیومیت کے انکشاف کی راہ سے لا الہ الا اللہ، یعنی مواطن خارج میں حقیقۃً کوئی چیز بھی متحقق نہیں۔ اور نہ بالاصالۃ جمیع کمالات کے ساتھ ظاہر ہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے جو محیط ہے تمام مراتب اور تمام کمالات کا۔"

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

حضرت سید نصیر الدینؒ اور ان کی اولاد

وفا راشدی ایم اے

۱۳۰۳ء[1] میں حضرت شاہ جلال یمنی سلہٹی المجرد اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے سرزمین بنگال میں تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ چھ سو بزرگانِ دین تھے، جو آپ کے مرید اور عقیدت مند تھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اللہ کے احکامات اور رسولؐ کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے مختلف جماعتوں میں تقسیم کر کے متعدد علاقوں میں بھیج دیا تھا۔ یہ جماعتیں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، دورہ کرتیں اور دین حق کا چراغ روشن کرتیں۔ ان جماعتوں میں ایک جماعت بارہ اولیائے کرام پر مشتمل تھی، جس کے 'امیر' حضرت سید نصیر الدینؒ تھے۔ اراکین جماعت حسب ذیل حضرات تھے:

(۱) شاہ عارفین (۲) شاہ بدر (۳) شاہ علی امین (۴) شاہ غازی، (۵) شاہ شہید (۶) شاہ محمود (۷) شاہ سلطان (۸) تاج الدین قریشی (۹) رکن الدین انصاری (۱۰) سعید احمد گیسو دراز (۱۱) حاجی خلیل۔

بارہ صوفیائے کرام کی اس جماعت نے جس علاقے کو تجلیاتِ الٰہی اور انوارِ محمدیؐ سے روشن کیا وہ علاقہ 'بارہ اولیاء کا دیس' کے نام سے موسوم ہوا۔

امیر جماعت حضرت سید نصیر الدین صرف صوفی منش ہی نہ تھے بلکہ فن سپہ گری سے بھی واقف تھے۔ فدایانِ حق کو ہمیشہ پرستاران باطل کا قلع قمع کرنے کے لئے وقت

---

[1] کئی مورخوں نے بنگال میں حضرت شاہ جلال کی آمد کے سال میں اختلاف ظاہر کیا ہے۔ لیکن تحقیق کی روشنی میں ۱۳۰۳ء کا سال زیادہ صادق ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، 'سنہرا دیس'، از وفا راشدی۔ مطبوعہ ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان۔ کراچی

ضرورت شمشیر کے جوہر بھی دکھانے پڑے ہیں۔ حضرت سید نصیر الدینؒ کی حیثیت ایک سپہ سالار سے کم نہ تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ "اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی"۔

جب اشاعتِ اسلام کی راہ میں راجہ اچک نرائن حائل ہوا تو حضرت نصیر الدینؒ کو بھی شمشیر کا جواب شمشیر سے دینا پڑا۔ آپ کے گیارہ ساتھیوں 'راجہ اچک نرائن' کا دلیوانہ وار مقابلہ کیا اور اسے شکستِ فاش دی۔ راجہ نے اسلام قبول کیا۔ اس کے ساتھیوں میں کچھ کام آگئے اور کچھ فرار ہو گئے۔

چشتیہ، نقشبندیہ، اور سہروردیہ سلسلوں کی طرح ایک اور طریقہ بنگال میں رائج ہوا جو "طریقۂ طرف[1]" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت سید نصیر الدین نے بنگال میں "طریقۂ طرف" کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ طریقہ آپ کی اولاد اور خوشہ چینوں میں پشت در پشت چلتا رہا۔ حضرت سید نصیر الدین کی اولاد میں کئی نامور بزرگ گزرے ہیں۔ اس کی ایک جھلک اس شجرے[2] میں دیکھی جا سکتی ہے۔
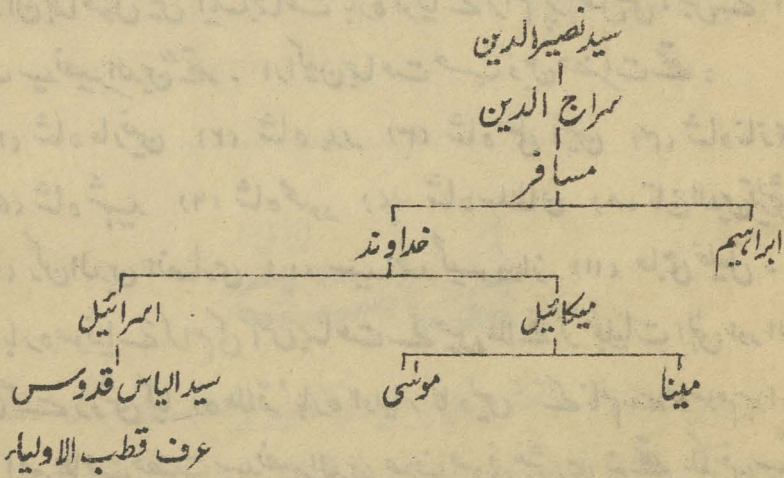
حضرت سید الیاس قدوسؒ، قطب الاولیاء کے لقب سے معروف ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت اسرائیلؒ اپنے وقت کے ایک بلند پایہ عالم تھے۔ انہیں علم و فضل کی خدمات کے صلے میں "ملک العلماء" کا خطاب تفویض ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۵۳۲ء مطابق

---

[1] طرف، ایرا ای تی ہاس (بنگلہ نسخہ) سید عبدالاکبر۔ [2] ماہِ نو (بنگلہ)۔

سنہ ۹۴۱ھ میں 'مدان القداعہ' اور دوسری فارسی کتابیں پڑھیں۔ ان کے معلم فارسی کے مستند استاذ قاضی امداد الحق تھے۔ حضرت سید اسرائیل کے چچا حضرت سید ابراہیم بھی عربی و فارسی علوم کے ماہر تھے۔ جس کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ دلّی کے بادشاہ نے انہیں بھی 'ملک العلماء' کے خطاب سے نوازا تھا۔ عیسیٰ خان کے والد کالی داس خاں غزنوی نے انہیں کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور سلیمان خان نام پایا۔ حاکم بنگالا سلطان غیاث الدین (۶۲-۱۵۶۰ء) جلال، سید ابراہیمؒ کی علمی خدمات اور دینی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی دختر نیک اختر کی شادی ان سے کردی۔

قطب الاولیاء سید الیاس قدس شروع میں بڑے دنیادار آدمی تھے۔ ان کی دنیاداری کی کہانی بھی عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کے ایک ملازم نے ان سے طنز آمیز لہجہ میں کہا "دین ہاتھ سے گیا"! ان الفاظ نے سید الیاس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ دل میں کہا "یہ صحیح ہے کہ دین ہاتھ سے چلا گیا۔ دنیا میں رہنے سے کیا فائدہ جب عاقبت ہی نہ رہی"! اس خیال نے انہیں اس قدر بے چین کیا کہ انہوں نے دنیاوی وجاہت، شان و شوکت اور گھر سنسار کو خیرباد کہہ کر جنگل کی راہ لی۔ اور وہاں اللہ کی عبادت اور ریاضت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ایک عرصے تک علوم دین اور فقہ و حدیث کا غایت مطالعہ کیا جب دل و دماغ سے کشش دنیا کی تاریکی چھٹ گئی اور قلب مشعل دین سے منور ہوا تو چندروچور نامی گاؤں میں دینی درس و تدریس سے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی روح پھونک دی اور عوام میں اس قدر مقبول ہوئے کہ لوگ انہیں 'قطب الاولیاء' کہنے لگے۔

کھوائی ندی کے کنارے قطب الاولیاء کا آستانہ ہے۔ آپ کھڑ گاؤں نامی ایک پرفضا دیہات میں پیدا ہوئے یہ دیہات آج بھی 'پیر پر گھور' یعنی 'آستانۂ پیر' کہلاتا ہے۔ یہاں اب تک تین بڑی بڑی چٹانیں نظر آتی ہیں آپ ایک چٹان پر بیٹھ کر وضو فرماتے، دوسری پر نماز ادا کرتے اور تیسری پر استراحت فرماتے تھے۔

آپ کے متعلق عربی، فارسی، ہندی اور بنگلا زبانوں میں متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بعض نظموں میں فارسی، ہندی اور بنگلا کے مشترک الفاظ بھی ملتے ہیں۔ رام شری کے کے رہنے والے سید ساجد الرحمٰن مرحوم نے "سلہٹ میں روحانی فیضان" (بنگلا) نامی مجموعے میں اس قسم کی نظمیں شامل کی ہیں۔ ذیل میں ایک نظم کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

میری خطا معاف کر

میں خطاکار ہوں، میرے مولا!
تجھے دیکھنے کے لئے بے دل بے تاب ہے۔

میرا تن من دیوانہ ہے
جس طرح مجنوں لیلیٰ کے لئے دیوانہ تھا
اسی طرح میں تیرا دیوانہ ہوں
میرے محبوب!
نہ دن میں چین ہے نہ رات میں نیند
تیری جستجو میں میرا دل بے قرار ہے
ایک نامعلوم ہوک سی اٹھتی ہے
نامعلوم آواز سی آتی ہے
دل کی گہرائیوں سے
"کیا میں تیرا معبود نہیں ہوں؟"
"بے شک! تو ہی میرا معبود ہے"
دل کے ایک گوشے سے جواب ملتا ہے
تجھے غیب کی خبر ہے تو بڑا رحیم و کریم ہے
تیرا کچھ پتہ نہیں
تو ہر جگہ موجود ہے لیکن میری رسائی نہیں ہوتی
"اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو،

اس کی رحمتیں بے کراں ہیں":

یہ بات اپنے دل کی گرہ سے باندھ لو
بیشک تو غفور رحیم ہے
میری خطا معاف کر،
میں خطا کار ہوں، میرے مولا!

بزرگان سلہٹ میں ایک اور قطب الاولیاء کا ذکر ملتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر کے جس صوفی منش کا ذکر پایا جاتا ہے وہ یہ بزرگ نہیں بلکہ وہ پربو پر تیر پاڑا' کے رہنے والے تھے اور وہ بھی قطب الاولیاء ہی مشہور تھے۔

حضرت سید نصیر الدینؒ کی اولاد میں اور کئی روحانی بزرگ پیدا ہوئے۔ ان میں حضرت سید موسیٰ کو علم وعرفان میں بڑا کمال حاصل تھا وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں دور دور تک جایا کرتے تھے، ان کے مرید اور ارادت مند اراکان تک میں موجود تھے خصوصاً اراکان کا راجہ ان کا بڑا معتقد تھا۔ ان کے تعلقات اراکان کے راجہ سے اتنے خوشگوار اور خاص تھے کہ ان کے بعد بھی ان کی اولاد کو راجہ کی طرف سے جاگیریں ملتی رہیں۔ ان کے بھائی بینا کو بھی اسی راجہ نے جاگیر عطا کی تھی حضرت سید موسیٰ نے تیس سال یادِ الٰہی اور اتباع رسول میں گزار دیئے۔ او نے "سیف الملوک اور بدیع الجمال" میں حضرت سید موسیٰ کا بھی جابجا ذکر کیا ہے۔

حضرت سید میناؒ کے خاندان میں حضرت سید گدا حسنؒ بھی بڑے صاحب دین بزرگ گزرے ہیں۔ گدا حسن پرگنہ انہیں کے نام سے ہے۔ گدا حسن نے اس پرگنہ اور ترپرا کو شمشیر غازی کو بطور تحفہ عطا کر دیا تھا۔ شمشیر غازی نے اسے اللہ کی دین جان کر خدمت خلق کے لئے مخصوص کر دیا۔ اور اس کی آمدنی سے غریبوں اور محتاجوں کے لئے مدرسہ، ہسپتال اور خانقاہیں قائم کیں۔

سید صاحب نے دینی و علمی خدمات کے علاوہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ انہیں کی بدولت لشکر پور، نور پوتی، سلطان

شی، داؤد نگر وغیرہ جیسے کفرستانوں میں اسلام کا بول بالا ہوا۔ سید صاحب کی تعلیمات کے زیرِ اثر جن لوگوں نے اہل کشف اور اہل تصوف ہونے کا رتبہ پایا ان میں سید شاہ نوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے فرزندِ ارجمند حضرت پیر بادشاہ صاحبِ علم بزرگ تھے۔ علم وفضل، دینداری اور زہد وتقویٰ کا شوق انہیں میں ملا تھا۔ علومِ باطنی کے علاوہ علوم دنیوی پر بھی دسترس تھی۔ فارسی وعربی کی کئی تصانیف آپ کی یادگار رہی ہیں۔ ان کی ایک فارسی کتاب کا اصل نسخہ سلہٹ کی مرکزی لائبریری میں موجود ہے۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بنگلا کے قدیم نامور شاعر ' شاہ ایمان الدین ' اسی خاندانِ سادات کے چشم وچراغ تھے۔ ایمان الدین بنگلا کے علاوہ فارسی میں بھی نظمیں کہتے تھے۔ انہیں شاہِ وقت دلّی کے دربار میں شرف باریابی حاصل تھا۔ قصیدے تو ان کے مشہور ہیں لیکن بنگال کے متعلق بھی مسلسل 'نظم' نظم کرتے، جس میں بنگال کا موسم اور حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی۔ دلّی کے بادشاہ نے انہیں "بلبلِ بنگالا" کا خطاب عطا کیا تھا۔ دو اور درویش شاہ داؤد اور شاہ غیاث انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ داؤد نگر اور غیاث نگر کے نام کے دو پرگنے انہیں کے نام سے موسوم ہیں۔

حضرت سید نصیر الدین اور قطب الاولیاء کی درگاہ کھوائی ندی کے بائیں جانب واقع ہے۔ اس مقام کو ٹرار بند کی درگاہ کہتے ہیں یہ ایک وسیع احاطہ ہے جس میں حضرت نصیر الدین کی اولاد میں سے کئی بزرگوں کے مقبرے ہیں۔ "سلہٹ میں روحانی فیضان" میں اس درگاہ کا نقشہ موجود ہے۔ یہاں ہر سال بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔ زائرین دور دور سے جوق درجوق زیارت کو یہاں آتے ہیں۔ اور 'طریقۂ طرف' کے صوفیائے کرام کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لیئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لیئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2543

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ـــــــ الامام ولی اللہ الدھلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۴۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے شاہ صاحب نے المسوّٰی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰٫۰۰ روپے

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

بیادگار الحاج سیّد عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلّہ

ماھنامہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

غلام مصطفےٰ قاسمی،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے		فی پرچہ:- پچھتر پیسے

الرحیم

جلد ۵ | ماہ جولائی ۱۹۶۷ء مطابق ربیع الاول ۱۳۸۷ھ | نمبر ۲

فہرست مضامین

شذرات

بیت المقدس جسے سلطان صلاح الدین نے یورپ سے آنے والے صلیبی حملہ آوروں سے جو اس پر کوئی نوے سال سے قابض تھے سنہ ۵۸۳ھ میں آزاد کرایا تھا، اس ماہ جون میں صیہونی حملہ آور جو اپنے پیش رو صلیبیوں کی طرح یورپ سے آئے ہیں، اس پر دوبارہ قابض ہو گئے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے صیہونیوں یعنی یہودیوں کے لئے فلسطین کے دروازے کھولے۔ اور وہ یورپ و امریکہ سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونے شروع ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں ان کی فلسطین میں اسرائیل ریاست بن گئی۔ اور اب جون سنہ ۱۹۶۷ء میں وہ بیت المقدس کے اس حصے پر بھی قابض ہو گئے ہیں جہاں مسجد اقصیٰ ہے جو روئے زمین کے مسلمانوں کا قبلہ اول ہے اور جس کے بارے میں قرآن میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ مسجد اقصیٰ اور اس کے ارد گرد کے مقامات جنہیں اللہ تعالیٰ نے بابرکت بنایا تھا آج ان پر یہودی قابض ہیں۔ یہ دنیائے اسلام کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے، اور آج دنیا کے مسلمان اس سانحہ پر ماتم کناں ہیں۔

گیارھویں صدی کے بالکل اواخر میں جب یورپ کے صلیبی حملہ آوروں نے فلسطین کا رخ کیا تھا، اور وہ آسانی سے اس کے اس خطے پر قابض ہو گئے تھے جس پر آج یہودیوں کا قبضہ ہے تو اس وقت مصر و شام اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں ویسے ہی چھوٹے چھوٹے حکمراں تھے، جیسے آج ہیں۔ فلسطین پر صلیبی حملہ آوروں کی پشت پر پورا یورپ تھا۔ برطانیہ فرانس اور جرمنی کے حکمران تھے۔ اور ادھر مسلمان آپس میں بٹے ہوئے تھے اور ان کی ایک جمعیت نہ تھی۔ بعد میں جب سلطان صلاح الدین نے مصر و شام اور اس کے گرد و پیش کے علاقوں کو متحد کیا۔ اور اس طرح مسلمانوں نے مل کر صلیبیوں کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ انہیں یورپ سے برابر مدد ملتی رہی، اور وہاں سے برابر لشکر آتے رہے لیکن وہ مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اور سلطان صلاح الدین کے بعد یہ سرزمین جو مسلمانوں کی تھی مسلمانوں ہی کے پاس رہی۔

ماہ جون کے یہ المناک حوادث مسلمانوں کے لئے بالعموم اور عربوں کے لئے بالخصوص خون کے آنسو رلانے والے ہیں۔ یہودی طیاروں نے بیت المقدس اور اردن، نیز شام اور جزیرہ نما سینا پر جس طرح آگ برسائی ہے اور یہودی فوجوں نے شہری آبادی کا جس بے دردی سے خون بہایا ہے، اور ان کی اس سفاکی سے نہ بچے اور عورتیں بچیں اور نہ بوڑھے اور بیمار۔ اس نے صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جب صلیبی درندے بیت المقدس میں قتل و غارت کر رہے تھے، خاص مسجد اقصیٰ میں اس طرح خون بہہ رہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹانگیں اس سے تر ہو رہی تھیں۔ اندازہ ہے کہ

کوئی ستر ہزار مسلمان صرف اس شہر میں شہید ہوئے۔ یہ ۱۰۹۹ء کا واقعہ ہے ــــ اس کے برعکس ۱۱۸۷ء میں جب صلاح الدین نے بیت المقدس کو فتح کیا تو اس بابرکت سرزمین کو اس نے انسانی خون سے ملوث کرنا پسند نہ فرمایا اور محاصرہ کے بعد صلیبیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی جان سلامت لے کر اس شہر سے جا سکتے ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسرائیل نے بعض بڑے ملکوں کی شہ پاکر یک بارگی مصر، اردن اور شام پر ہلہ بول دیا، اور اس طرح پہل کر کے اس نے ان ملکوں کی فضائی طاقت کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان ملکوں کے لئے ہوائی جہازوں کی مدد کے بغیر یہودیوں کے بکتربند فوجوں کا روکنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ ایک طرف یہودی دریائے اردن کے مغربی کنارے تک پہنچ گئے، دوسری طرف ان کی فوجیں نہر سویز کے مشرقی کنارے پر ہیں، اور شام کا تھوڑا سا حصہ بھی اُن کے قبضے میں ہے۔ گو جنگ بند ہوگئی ہے لیکن یہودیوں کا اصرار ہے کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے نہیں نکلیں گے اس کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کی یہ فوجی چھاؤنی جس کا دوسرا نام اسرائیل ہے عرب دنیا کے بیچوں بیچ قائم ہوگئی ہے، جس کی یلغاروں سے نہ مصر محفوظ رہے گا نہ شام و عراق اور نہ حجاز ہی۔ بعض اسرائیلی ایک عرصے سے یہ کہہ رہے ہیں کہ سلطنتِ اسرائیل کی حدیں ایک طرف دریائے فرات سے دریائے نیل تک ہوں گی اور دوسری طرف بحیرہ روم سے حجاز مقدس تک۔ یہودیوں کا یہ چیلنج ایک حقیقت واقعی بنتا نظر آرہا ہے۔ کیا مسلمان اس خطرے کو محسوس کریں گے اور اس کا مقابلہ متحد ہو کر کرنے کا سوچیں گے۔

یہ چیلنج صرف عربوں کے لئے نہیں۔ یاد رہے سلطان صلاح الدین کُرد تھا، عرب نہیں تھا۔ اور اس کی بہادر فوجوں کا بڑا حصہ ترکمانوں پر مشتمل تھا لیکن عربوں، کردوں اور ترکمانوں نے بحیثیت اُمت مسلمہ کے اس خطرے کا مقابلہ کیا۔ اور آخر اس میں وہ کامیاب رہے۔ صلیبی حملہ آوروں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ایک دفعہ وہ مصر کے اندر پہنچ گئے تھے، اور بحیرۂ روم پر واقع دمیاط کی بندرگاہ کو فتح کر کے اسے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ ان کے مقابلے میں مملوک ترک آئے جو نسلاً ترک اور وطناً مصری تھے۔ اور اسلام نے سب کو ایک امت بنا دیا تھا۔

اسرائیل کا عرب دنیا کے قلب پر اس طرح قابض ہو جانا اور مصر، شام اور اردن کے علاقوں کو آناً فاناً لے لینا اگر اس سے بھی عربوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ متحد نہ ہو سکے تو پھر ان کے لئے اسرائیل کو اس کے عزائم سے روکنا ناممکن ہو جائے گا اور ہمیں اس دن کا انتظار کرنا چاہئے، جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے دریائے فرات سے لے کر دریائے نیل تک اس کی فرمانروائی ہوگی۔ عربوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے لئے بھی اسرائیل کی یہ توسیع پسندی بہت بڑا خطرہ ہے۔ مشرق قریب میں امریکہ، برطانیہ اور بعض دوسری یورپی طاقتوں کی براہ راست فوجی، مالی اور سیاسی مدد سے اسرائیل کی ایک مضبوط، طاقتور اور جارحیت پسند مملکت کا اس طرح مستحکم ہونا ایران اور ترکی کے لئے بھی خطرہ ہے اور پاکستان کے لئے بھی

اور افریقہ کی چھوٹی چھوٹی اور حکومتوں کے لئے بھی۔ اسرائیل کا قیام عرب اور اسلام دشمنی پر ہوا ہے، اور جتنی یہ ریاست مضبوط ہوگی اسی قدر عرب اور اسلام پر اس کی زد پڑے گی ۔ اسرائیل کی جارحیت کی مخالفت اور عربوں کی حمایت میں پاکستان نے اس دفعہ اپنا فرض پوری طرح ادا کیا ہے اور خوش قسمتی سے ہر عرب ملک نے اس کا اعتراف کیا ہے، خدا کرے اس دردناک سانحہ کے نتائج سے عربوں کو عبرت ہو، مسلمانوں کو عبرت ہو۔ وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں اور سب مل کر مسجد اقصیٰ کو یہودی تسلّط سے آزاد کرائیں۔

گو اسرائیل کی ریاست یہودیوں کی ہے لیکن اسرائیل کی مخالفت یہودی مذہب کے تمام ماننے والوں کی مخالفت نہیں۔ اسرائیل امریکہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے آنے والے یہودیوں کی ریاست ہے۔ اور انہیں اس لئے یہاں آنے دیا گیا کہ وہ عرب دنیا کے قلب میں امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے مفادات کی حفاظت کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ فوجی چھاؤنی ہے ان ملکوں کی دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخیرے اور بین الاقوامی شاہ راہ کے لئے، جو ان عرب ملکوں میں ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ اور بعض دوسرے یورپی چاہتے ہیں کہ انہیں عرب ملکوں کا تیل سستے داموں ملتا رہے اور اس پر ان کی اجارہ داری قائم رہے، اسی لئے اسرائیل کو وجود میں لایا گیا، اور اسے مضبوط بنایا گیا۔

بے شک اسرائیل کو اس جارحیت میں امریکہ، برطانیہ اور مغربی جرمنی سے بڑی مدد ملی، اور ان ملکوں نے اسے دل کھول کر اسلحہ دیئے، اور جب ۵ جون کو اسرائیل نے عرب ملکوں پر حملہ کیا، تو امریکی اور برطانوی طیارے اور بحری جہاز بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ صحیح، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اسرائیلی عربوں سے زیادہ منظم تھے۔ اور وہ جدید طریق جنگ میں اپنے حریفوں سے آگے تھے۔ اب اگر اسرائیل سے سرزمین مقدس کو پاک کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ایک تو عربوں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو، اور ان کا موجودہ تفرقہ اور انتشار ختم ہو۔ اور دوسرے ہم فوجی لحاظ سے بھی مضبوط ہوں۔ سلطان صلاح الدین صلیبیوں کے مقابلے میں اس لئے کامیاب ہوئے تھے کہ وہ ان کے مقابلے میں بہتر جنگی مہارت کا مظاہرہ کر سکے۔

عالم اسلام بیدار ہو رہا ہے، صدیوں کے جمود کے بعد اب اس میں نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے، لیکن اُس کی ترقی کی رفتار کو اور تیز ہونا چاہیئے، ورنہ ڈر یہ ہے کہ اسرائیل جیسی ریاستیں عالم اسلامی کی راہ میں حائل ہو کر اُسے آگے بڑھنے سے روک دیں گی۔ استعماری طاقتیں جو صدیوں سے اسلامی ممالک کو لوٹتی کھسوٹتی رہی ہیں، اس کوشش میں ہیں کہ یہ ملک صحیح معنوں میں بیدار نہ ہوں، اور ترقی نہ کریں، اس لئے انہوں نے اسرائیل جیسے ملکوں کو اسلامی دنیا کے اندر لا کھڑا کیا ہے۔

عرب اس وقت ایک بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اسرائیل کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں اور اس کے پاس ہلاکت خیز اسلحہ کی کمی نہیں، وہ دندنا رہا ہے۔ اور عربوں کو الٹی میٹم پر الٹی میٹم دیتا ہے، خدا ہی ہے جو اس امتحان میں عربوں کو مضبوط رکھے اور دشمنوں کے مقابلے میں انہیں فتح دے۔

آئندہ کے چند ماہ نہ صرف عرب دنیا، بلکہ پوری اسلامی دنیا کے لئے بڑے کٹھن ہیں۔ اور ان میں اس کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا کہ وہ خود اپنے علاقوں میں کس حیثیت سے رہ سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصّہ اول

مصنف:۔ ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ

مترجم:۔ سید محمد سعید

باب ۴

الرسم (رواج)

معاشرتی رواج کا ضابطہ

ہر چار مرحلوں میں، ہر ارتفاق یا معاشرتی ارتقار کی لازمی خصوصیات، بعض امور کی انجام دہی اور عملی نمونوں کے کردار کی مخصوص شکلوں میں واقع ہوتی ہیں۔ عمل کی شکلیں بتدریج معاشرہ کے ارکان کی کلّی منظوری یا حمایت حاصل کرتی ہیں جو متفقہ طور پر بطورِ نمونہ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ اُن کے مقاصد کے حصول اور ضروریات کی تسکین میں امداد و معاونت کرتے ہیں اور اسی لئے یہ شکلیں عطا کی جاتی ہیں۔

معاشرہ کی کلّی حمایت کے تحت، کردار کی ایسی شکلیں، مفید معاشرتی رسم و رواج، 'الرسوم الصالحہ'، یا کلّی روایات و سنن السائرہ میں فروغ پاتی ہیں تب وہ لوگوں کے معاشرتی ضابطہ میں شامل ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے معاشرتی روایت بن جاتی ہیں، لوگ معاشرتی روایات سے وابستہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ انہیں سہولت بخشش اور مفید طریقے (ارتفاقات) عطا کرتی ہیں جو مقاصد یا معاشرتی سیرت کی ضروریات، معاشرتی ارتقار کے عمل کے دوران ترقی

وفروغ پاتی ہیں کے حصول میں مدد دیتی ہے جب کہ ان کے بے قاعدہ اسباب، معاشرہ اور اس کے ترقی پذیر مقاصد کے لئے مضرت رساں اور خطرہ ثابت ہوتے ہیں۔

رسوم و روایات کس طرح وجود میں آتی ہیں؟

کوئی معاشرتی ضابطہ کسی فردِ واحد کی جد وجہد کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی یہ معاشرہ کی نسل واحد کی سرگرمیوں کا حاصل ہوتا ہے۔ معاشرتی ضابطہ یا روایت ارتقاء کے ایک بتدریج عمل سے وجود میں آتا ہے یہ لوگوں کی عقل کے پیدائشی رجحانات کے زیر ہدایت فروغ پاتا ہے اور یہ ضابطہ اُن کے ان کے مشاہدے و تجربے کے دوران آزمائش اور غلطیوں سے تشکل پاتا ہے اور دوسری رسم و روایات کی جگہ لے لیتا ہے اسی لئے کردار کی معاشرتی شکلوں کا ایک ترقی یافتہ ضابطہ، ترقی کے ایک طویل عرصہ کے دوران تعمیر ہوتا ہے اور بہترین شکلوں اور نمونوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ان ضروریات کی تکمیل کرتا ہے جن کے لئے معاشرتی ادارے وجود میں لائے جاتے ہیں۔

عناصر جو معاشرتی روایات ورسوم کو کسی برادری کے لوگوں کی کلّی حمایت حاصل کرنے اور اُن کو بقا عطا کرنے کے لائق بناتے ہیں وہ ان کے مقاصد کی افادیت وکارآمدیت میں ہوتی ہے اور لوگوں کی ایک نسل کی یہ نااہلیت ہوتی ہے جو اسے اپنے لئے ایک ضابطہ کی تشکیل میں پیش آتی ہے۔ بالخصوص یہ لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جو اتنی عقل وصلاحیت نہیں رکھتی کہ اپنا ضابطۂ معاشرت خود تشکیل دے سکے۔ اسی لئے یہ ذی عقل اور زیرک و دانا افراد کا کام ہوتا ہے کہ وہ ان روایات کی تشکیل کے لئے نمونے اور شکلیں فراہم کریں۔

باقی ماندہ لوگ جو خود اپنا راستہ تلاش نہیں کر سکتے، محض ان نمونوں پر عمل کرتے ہیں اور اُن کے وفاداری وخلوص کے ساتھ پابند رہتے ہیں کیونکہ انہیں ایسا کرنے سے فائدہ پہنچتا ہے اور اُن پر عمل نہ کرنے سے انہیں نقصان ہوتا ہے۔ سیرت و کردار کے معاشرتی ضابطے اور نمونے معاشرہ کی ترقی کے ساتھ ابھرتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ قدیم اور ترقی یافتہ دونوں قسم کے معاشروں میں

رسم و رواج کے نمونے اور شکلیں کس طرح وجود میں آتی ہیں، اور اس تفصیل کا جائزہ ان کی کتابوں سے لیا جا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ معاشروں میں رسوم و روایات کی خصوصیات

ترقی یافتہ معاشروں میں رسوم و روایات، (الف) فطری طور پر خوب ترقی یافتہ ہوتی ہیں، جس کی وجہ سابقہ مشاہدہ کے اثرات ہیں۔ اور (ب) شائستہ ہوتی ہیں 'رائے کلی' کی طرف گامزن ہوتی ہیں۔ اور یہ جمالیاتی صفات 'ظرافت' کے ایک مستحکم تر احساس سے شکل پاتی ہیں مثلاً شائستگی و عمدگی، جو بلند معیار زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہے وہ رسوم و روایات (ج) ان رُجحانات اور مستحکم طبائع کے محرکات، جو سات اخلاقِ فاضلہ کے حامل ہوتے ہیں، کی تسکین کرتی ہیں اور (د) یہ ان طبائع کی مزید و اعلیٰ ترقی و فروغ سے تعلق رکھتی ہیں۔ (ھ) تاکہ معاشرتی بہبود کی ترقی و توسیع ہو سکے۔

ان خصوصیات کی بنیاد پر بہت سی رسوم و روایات کا خاص مقصد، ترقی یافتہ معاشروں میں بالعموم سہ طرفہ ہوتا ہے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

۱۔ پست ضروریات کی تہذیب و ارتفاع:۔

حیوانی پہلو کی ضروریات کی سرفرازی و بلندی، اس وقت ہوتی ہے کہ جب اعلیٰ و لطیف نقطہ ہائے نظر سے ان کی تسکین کی مخصوص شکلیں عمل میں لائی جائیں تاکہ اُن ضروریات کی تکمیل کی جا سکے جو اب غیر مہذب اور غیر شائستہ نہیں رہی ہیں۔ البتہ حیوانات میں غیر مہذب و غیر شائستہ ہی نہیں لیکن ان کو رسم و رواج کی مختلف اشکال اور نظریات کے تنوع کے سائے میں چھپا دیا جاتا ہے اس لئے 'رواج' حیوانی ضروریات کی تکمیل کے لئے حیوانی پہلو کے مقاصد کی اہمیت کے بغیر طریقے فراہم کر دیتے ہیں اور انسانوں کو حیوانی سطح سے بلند کرنے کے لئے خدمت انجام دیتے ہیں۔

۲۔ معاشرہ کا ڈھانچہ مضبوط کرنے اور اس کے اتحاد کو سہارا دینے کے لئے سیمنٹ کا کام کرنا، جو کہ عمارت کے مختلف حصوں کو برقرار رکھتی ہے، یہ دوسرا مقصد ہے جو رسوم

و روایات کی بدولت پورا ہوتا ہے۔ یہ ان ہی رسوم و روایات کا کمال ہے کہ معاشرہ کے ارکان کے درمیان خیرسگالی دوستی وغیرہ کے ذریعہ رابطہ قائم رہتا ہے۔

۳۔ تیسرا مقصد، متذکرہ خصوصیات اور مقاصد کا ذخیرہ محفوظ رکھتا ہے جو معاشرہ میں تیز تر تبدیلیوں کی بدولت، برباد اور منتشر ہو جاتے ہیں۔

یہ نکات شاہ ولی اللہؒ نے شادی کی تقاریب، رسوم و رواج سے مثالیں دے کر واضح کئے ہیں ان میں شادی کی دعوتیں اور دوسری خاندانی روایات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

رسوم و روایات کی اقسام

اب تک بیان کئے ہوئے نکات سے، راست باز کردار اور صحیح رواج کے نمونے سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ معاشرہ کے ارتقاء ترقی پاتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اُن کے فطری ارتقاء کی راہ میں کوئی غیر لطیف سبب یا حجاب واقع نہ ہو۔ کردار کی تشکیل کا لازمی مخرج، معاشرہ کے پاکباز و اعلیٰ ارکان کی ذات میں ہوتا ہے جیسے دانش ور اور پیغمبر ہوتے ہیں جو اعلیٰ ترین سیرت کے حامل ہوتے ہیں جس میں سات اخلاقِ فاضلہ اور دوسری اعلیٰ ترین صفات شامل ہوتی ہیں اور یہ عظیم انسان، معاشرہ کے حقیقی رہبر و رہنما ہوتے ہیں۔ "باقی ماندہ لوگ فطرتاً ان کی تقلید کرنے پر مجبور ہوتے ہیں"۔

اکثر اوقات گمراہ مزاج کے حامل افراد، شرارتی نوعیت کے رسم و رواج رائج کرتے ہیں ان کے پیدائشی رجحانات کی وجہ سے جو نیکی کی روایات کے برعکس ہوتے ہیں معاشرہ کی بہبودی کو لازمی طور پر نقصان پہنچتا ہے شاہ ولی اللہ ان کو الرسوم الفاسدہ یا الرسوم الباطلہ یعنی خراب رسوم قرار دیتے ہیں۔ صحیح رسم و رواج کی نمایاں خصوصیات کا بیان کرنا کارآمد ہوگا تاکہ ان کو ان اقسام رسوم سے ممتاز کیا جاسکے جو ان کے برعکس ہوتی ہیں۔

صحیح روایت یا سنّت الراشدہ یا سنّت الصّالحۃ

صحیح روایت یہ ہے کہ جس میں رواج کا سہ طرفہ مقصد ہوتا ہے

جیساکہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ ترقی پذیر معاشرہ ادارہ کے اظہار کی ایک شکل بناتا ہے اور انسانی فطری طرزِ عمل کا تحفظ پیدا کرتا ہے جن کی باوصف طبائع کے فطری رجحانات سے مطابقت ہوتی ہے اور یہ فرد کے مزاج میں ہر پیدائشی باوصف صلاحیت کی ترقی کے لئے مکمل وسعت پیدا کرتا ہے۔ کوئی روایت یا رواج جو اس معیار سے آجاتا ہے، اس حدتک صحیح روایت یا رواج نہیں ہوتا ہے۔ جہاں تک کہ وہ معیار سے گرجاتا ہے۔

غلط روایت یا تخریبی رواج (سنت الفاسدہ)

ہر صحیح روایت، معاشرہ اور افراد کے طبائع پر اچھے، اصلاحی اور ترقی پذیر اثرات قائم کرتی ہے۔ لیکن یہ محض اس قسم کی صحیح روایت کی خصوصیت ہے جس پر صحیح قسم کے لوگ ہی صحیح موقع ومحل پر عمل کرتے ہیں۔ یہی رسوم اس وقت نقصان دہ اور تباہ کن ثابت ہوسکتے ہیں جب ان پر بے محل وبے موقع عمل کیا جائے۔ اسی طرح بے موقع اور مردہ رسوم، ایسے رسوم کے عنوانات کے تحت جاتی ہیں جو واقعتاً نقصان دہ اور شر بالعرض، ثابت ہوجاتی ہیں حالانکہ بنیادی طور پر وہ مفید ہوتی ہیں۔

نقصان دہ رسوم کے اسی نظام میں بعض صحیح رسوم میں انتہاپسندی غلو اور مبالغہ اس حدتک ہوتا ہے کہ اُن میں اعتدالیت کی کمی اور غیر ضروری وابستگی، بعض دوسری اہم رسوم یا فرائض کو نظر انداز کرنے پر مجبور کردیتی ہے اور اس طرح سے صحیح رسم اپنے اثرات میں مضرت رساں بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، طرزِ عمل کے بعض نمونوں اور شکلوں یا کسبِ معاش کی بعض رسوم کا مشاہدہ لازمی اور درست ہوتا ہے لیکن کسبِ معاش میں انتہاپسندی وتعمق وانہماک فی المعاش، اور اس میں اس قدر مصروفیت مضرت رساں ہے کیونکہ اس سے ایک شخص کی صحیح توجہ، ذہنی ترقی اور روحانی بہبود سے ہٹ جاتی ہے افراد کا ایک ایسا معاشرہ جس میں روحانی قدریں تلف ہوجاتی ہیں یقیناً تباہ ہوکر رہتا ہے۔

اسی طرح متخالف تصورات کو اپنانا بھی معاشرہ کے لئے تباہ کن ہوگا کیونکہ اُس میں لوگ اپنے کام اور کسبِ معاش سے گھبرانے لگیں گے، اس کی ایک وجہ تو یہ

ہوتی ہے کہ وہ کھیل کود اور دوسری تفریحات مثلاً شراب نوشی، موسیقی کی محفلوں وغیرہ میں اس حد تک مگن رہتے ہیں کہ اُن کے کام پڑے رہتے ہیں یا پھر وہ دنیا کو چھوڑ کر روحانی ریاضتوں میں بہت زیادہ مصروف ہوجاتے ہیں۔

قطعی مضر رسم اس قسم کی روایت صحیح رسم و رواج کے بالکل برعکس ہوتی ہے جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے صحیح رسم و رواج کے برخلاف قطعی مضرت رساں رسم، ایک گمراہ مزاج کے غیر فطری رجحانات کی تسکین کرتی ہے اور اس کے گمراہ کن محرکات یا خرابیوں کی تسکین کی شکلوں کو ڈھالتی ہے اسی لئے یہ رسوم انفرادی ارکان کے مزاج اور معاشرہ کی بہبودی و اتحاد پر براہِ راست خطرناک اور مضر اثرات ڈالتی ہے۔

یہ رسوم، غالب حیوانی پہلو رکھنے والے گمراہ طبائع کے انسانوں کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں جن کے فرشتہ صفت پہلو، ان کے انفرادی مقاصد سے مغلوب ہوجاتے ہیں اور وہ اعلیٰ تر مقاصد یا رائے کلی مثلاً معاشرہ کی بہبودی وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اُن کے رسم و رواج میں (الف) اعمال سباعیہ، (قتل و غارت گری کی سرگرمیاں) کے نمونے مثلاً لوٹ مار، قتل و غارت گری وغیرہ۔ (ب) "اعمالِ شہویہ" جنسی جذبات اور دوسری حیاتیاتی ضروریات کی تسکین کی ناجائز شکلیں) مثلاً زنا بالجبر، اغلام بازی، زناں بازاری، یا (ج) "اکساب خدع" (ایسے کام جو بہبودی معاشرہ کے لئے مضرت رساں ہوتے ہیں) مثلاً اشیاء و سامان کے لین دین میں دھوکہ دہی، سود وغیرہ۔

اگر ایسی مضرت رساں سرگرمیوں کو کچھ عرصہ تک جاری رکھا جائے، تو یہ حقیقتاً نمایاں رسوم و رواج کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور لوگ ان کو اختیار کرلیتے ہیں بالخصوص اگر گمراہ لوگوں کی معاشرہ میں بالادستی قائم ہوجاتی ہے تو کمزور طبائع کے لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں اور اُن کی حمایت کرتے ہیں ایسے لوگ نیک و بد دونوں قسم کے اثرات بآسانی قبول کرلیتے ہیں۔

بہترین رسم

رسم کے بارے میں سابقہ بحث، اور شاہ ولی اللہ، اس کے بارے میں اپنی کتاب "البدور" میں جو کچھ کہتے ہیں کے پیش نظر، کردار کی بہترین شکلیں اور بہترین روایات وہ ہیں جو (الف) افراد کی پیدائشی صفاتی صلاحیتو کی ترقی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے معاشرتی پہلوؤں کی مختلف شکلوں کی ترقی سے تعلق رکھتی ہیں۔ (ب) وہ اپنے نفاذ میں وسیع تر ہوں اور تنگ نہ ہوں۔ (ج) وہ اتنے سخت نہ ہوں کہ ایک عمیق تفصیل کے دوران معمولی سی بے احتیاطی سے، ایک بہتر مقصد کے لئے بھی، ناقابلِ برداشت عام نامنظوری کی طرف رہنمائی کریں اور وہ فرد کے لئے بڑے نقصان کے موجب ہو جو ایک ایسی آزادی استعمال کرنا چاہتا ہو۔ انہیں اعتدال پسندی کے ساتھ، ایک طرزِ زندگی اپنانا چاہیئے یہ ایک ایسا معیار ہے جو پاکیزگی کے دونوں سروں، ایک آرام دہ طرزِ زندگی کے لطف اور رہبانیت کی خشک وشکل زندگی کے درمیان ایک بالکل منصفانہ درمیانی راستہ ہے۔

رسوم کی شکلوں میں اختلاف

صحیح روایت اسی وقت تک ایک موزوں اور کارآمد رسم "الرسم الصالح" رہتی ہے جب تک کہ وہ متذکرہ بالا مقصد کی تکمیل کرتی ہے لیکن کبھی کبھی حالات اور دوسرے اجزاء میں تبدیلی کی وجہ سے، یہ اپنے بنیادی مقصد کی تکمیل روک دیتی ہے یا افراد یا بحیثیت مجموعی معاشرہ کی بہبودی میں مداخلت کرتی ہے۔ تب یہی رسم، مضرت رساں "الرسم الطالح" بن جاتی ہے۔ یہ ایسی رسم میں اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسم کی مختلف شکلیں ایک ہی معاشرہ کی تاریخ میں ظاہر ہوتی ہیں جو ان اجزاء اور حالات میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہیں جو رسم کی بنیاد کی تشکیل کرتی ہیں۔ یہی اصول ایک ہی وقت اور ایک ہی مقام پر آباد مختلف معاشروں کی مختلف رسوم کی شکلوں کے اختلاف کے معاملہ میں واقع ہوتا ہے کیونکہ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف حالات کے تحت، مختلف معاشرے آباد ہیں اور یہی حالات ایک ہی رسم کو ایک ہی شکل میں نافذ نہیں ہونے دیتے۔

واقعہ یہ ہے کہ تمام انسانیت 'الانسان الکبیر' کی یکساں ضروریات ہوتی ہیں لیکن وہ ضروریات مختلف معاشروں میں تسکین کی مختلف شکلیں رکھتی ہیں جس کی وجہ ان کے مختلف طرزِ زندگی، حالات اور ارتقار کے مرحلے ہیں۔ لہٰذا بالعموم یہی صورت حال ہوتی ہے کہ مختلف معاشروں کی صحیح رسوم کی مختلف شکلوں کے ذریعہ ایک اور یکساں مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ اس حقیقت کی دلالت بھی ہے کہ کرۂ ارضی کے مختلف خطوں کے لوگ، زبان، لباس، واقعات کی تقریب وغیرہ میں اپنی مخصوص روایات کے حامل ہوتے ہیں اس طرح سے مختلف مملکتوں اور بعض خاندانوں کی مخصوص روایات و رسوم وجود میں آتی ہیں۔

رسوم و روایات کے اختلاف میں حصہ ادا کرنے والے اجزاء

شاہ ولی اللہؒ کے بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ذیل کے اجزاء رسوم کے تنوع اور روایات کے اختلاف میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں:-

(۱) **زمانہ اور وقت** — ہر زمانے کی اپنی خصوصیات اور حالات ہوتے ہیں جو لوگوں کی تمام سابقہ تاریخ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ بحیثیت مجموعی انسانیت کی تاریخ اور اُس کے معاشروں کا مقابلہ، ایک انفرادی انسانی وجود سے کرتے ہیں جیساکہ ایک فرد زندگی کے مختلف مرحلوں (مثلاً بچپن، نوجوانی، بڑھاپے) سے گزرتا ہے اور ہر مرحلہ میں کردار کے مختلف اصول اس پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اسی طرح سے وقت کی تبدیلی کے ساتھ مختلف معاشروں پر حکمرانی کرنے والے اصول بھی تبدیل ہوجاتے ہیں۔" فی الواقعہ کارآمد رسوم کی شکلیں وقت اور لوگوں کے عام طرزِ عمل کے ساتھ مختلف و متنوع ہوجاتی ہیں۔

(۲) **مخصوص جغرافیائی حیثیت** — یہ بھی لوگوں کی عادات و رسوم پر اثر انداز ہوتی ہے جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک ملک کی آب و ہوا اور دوسرے حالات، لوگوں کے طرزِ زندگی، اُن کا عام طرزِ عمل اور رسوم کو مخصوص انداز میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان

کے علاوہ (۳) قوم، قبیلہ اور خاندان کی خصوصیات، رسوم وروایات کے اختلاف میں اپنا حصہ ادا کرتی ہیں جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔

متذکرہ بالا اجزاء میں، ایک نہایت اہم جزو کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جو کہ لوگوں کے رسوم کی شکلوں کو ڈھالنے میں ایک متحرک قوت کا کام کرتا ہے۔

(۴) لوگوں کا تصوّرِ حیات اور عقائد۔ وقتاً فوقتاً لوگوں کے خاص تصورِ حیات بدلتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ لوگوں کی عام رسوم اور عادات بھی تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ لوگوں کی رسوم وعادات پر تصورِ حیات کا اثر مختلف مذاہب یا مذہبی اداروں کی مثالوں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ستارہ پرستی کا مذہب، 'ملت النجامیئین'، جن کا تمام نظامِ حیات اس تصوّر وعقیدہ پر قائم تھا کہ ستارے کرۂ ارض پر آباد انسانوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے 'ملت سبائیہ' (مذہب سحری) کا تصوّرِ حیات اور عقائد، عقول کی خصوصیات اور زندگی پر ان کے اثرات کے بارے میں ان کے مخصوص طرزِ زندگی میں جھلکتے ہیں۔ اور اسی طرح سے جو توحید کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اخلاص (خالص و پاکیزہ) کے حامل افراد ہیں، وہ خدا تک اپنی رسائی میں حسنِ نظر اور احسان کی صفات رکھتے ہیں اور وہ اپنے تصوّرِ حیات اور عقائد کے مطابق اپنے طرزِ زندگی کو ڈھلتے ہیں جس میں بے غرضی اور اللہ تعالیٰ کی محبت ہر شے پر غالب رہتی ہے۔

کوئی انسانی معاشرہ، رسوم، معاشرتی اداروں یا ایک ضابطہ رواج، جو اُن کے طرزِ زندگی پر حکمرانی کرتا ہے، کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

یہ مفروضہ شاہ ولی اللہ کے اس دعوے پر قائم ہے کہ انسانی معاشرہ، اپنا ضابطہ اور معاشرتی ادارے اپنی ضروریات، حالات اور دوسرے عام اجزاء کے مطابق لازمی طور پر فروغ دیتا ہے۔ ان کے طرزِ عمل کی اشکال اور تفصیل کی خصوصیات، جو ان معاشرتی اداروں وغیرہ کی تعمیر کرتی ہیں، انسانی معاشرہ سے فروغ پاتی ہیں اور اکثر اوقات پیغمبروں

کے الہام یا اعلیٰ تر وجدان کے ذریعہ، شعوری طور پر ان کو معاونت بھی حاصل ہوتی ہے حالانکہ حیوانات اور پرندے، اپنی جبلت کے طور پر اپنے طرزِ زندگی کے لئے راستہ پاتے ہیں۔

اس حقیقت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ادارے کی شکلوں کی تفصیل میں بھی انسانیت کی رہبری کی جاتی ہے اور یہ کہ ان کی رہبری کا مخرج، اُن کے پیدائشی مخصوص طبائع میں ہوتا ہے اور جیسے شاہ ولی اللہ کے مطابق اس حقیقت میں پایا جاسکتا ہے کہ کسی مستثنیٰ کے بغیر کوئی انسانی برادری کسی بھی ایسے معاشرتی اداروں کو فروغ دینے میں ناکام نہیں ہوئی جن کو عوام الناس کی حمایت و منظوری حاصل ہو۔

یہ صورت حال محض مہذب اقوام کے ساتھ نہیں ہے یہاں تک کہ انتہائی وحشی اقوام بھی کوہستانوں اور صحراؤں میں رہتے ہوئے، ادارہ کی ترقی یافتہ اشکال کو مقرر کئے بغیر، بعض رسوم رکھتی تھیں جو اُن کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی تھیں اور وہ بنیادی اداروں کی بعض شکلیں اور باوصف سیرت کی بعض صفات رکھتی تھیں جو اُن کے طرزِ عمل میں ظاہر ہوتی تھیں اگرچہ وہ کاملیت و استحکام کی حامل نہیں ہوتیں جو کہ مہذب معاشروں کی رسوم و روایات کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

معاشرتی اداروں کی طلب اور معاشرہ کی تشکیل و فروغ کی خواہش انسانی مزاج میں پیدائشی صفات ہیں وہ تمام انسانوں میں ہوتی ہیں خواہ وہ مہذب ہوں یا وحشی۔

اس بنیاد پر شاہ ولی اللہؒ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک انسانی نر فرد کو تہذیب سے بہت دور تن تنہا صحرا میں چھوڑ دیا جائے تو جب ایک عورت سے اس کا واسطہ پڑتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنی پیدائشی طبائع کی خواہشات کی تکمیل کی خاطر ایک خاندان ہی کو پیدا کریں گے اور خاندان فی الواقعہ ان ہی اصولوں کی بنیاد پر ایک معاشرہ میں فروغ پاکر رہے گا جس پر تمام انسانیت کی ترقی ہوئی ہے۔

رسوم سے غفلت کون برتتا ہے؟ رسم و رواج حالانکہ اہم ہوتے ہیں لیکن صرف

دو اقسام کے افراد ان سے غفلت برتتے ہیں :۔

قسم اوّل :۔ جو خراب طبائع کے حامل ہوتے ہیں اور گمراہ ذہنوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر انہیں صحیح عادات و اطوار کے طرزِ عمل کے لئے تربیت نہ دی جائے یا اُن کی گرفت نہ کی جائے تو ایسے لوگ بلا وجہ فطری طور پر اپنی گمراہ تحریکوں کی تسکین کے لئے سرگرم رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہیں کہ رسوم کو توڑنا نقصان دہ ہے اور اس سے معاشرہ کے ارکان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اسی قسم میں مشکوک اور جاہل لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو رسوم کے کارآمد ہونے سے انکار کر دیتے ہیں اور ان سے تعلق بھی ختم کر دیتے ہیں۔ ان کا قطع تعلق زبانی ہوتا ہے کیونکہ اپنی زبان سے رسم سے قطع تعلق کرنے کے باوجود وہ اپنی بہتری و بہبودی کے لئے کسی رسم اور معاشرتی ضابطے پر عمل کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں" رسم کی پابندی سے اُن کا انکار اور قطع تعلق اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو نظر، سماعت اور ادراک کی صلاحیتوں کے وجود سے انکار کر دے حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ خود ان صفات کا حامل ہوتا ہے اور اُن کا استعمال کر کے اُن کی خصوصیات کا اظہار کرتا ہے"

قسم دوم :۔ یہ حقیقی عقل و دانش اور قیادت کے لوگ ہوتے ہیں جو عقل میں مستحکم ہوتے ہیں اور فرشتہ خصلت پہلو رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک تسلیم شدہ معاشرتی رسم "الرسم المعاشی" سے دوسری رسم کی خاطر نفرت کا اظہار کرتے ہیں جو اُن کی رائے کے مطابق زیادہ موزوں اور بہتر ہوتی ہے اور وہ مروجہ رسم سے زیادہ رواج پانے کی اہلیت رکھتی ہے ایسی نئی رسم کی قدر و قیمت اور خوبی کا اندازہ درحقیقت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اُن کو جلد یا بدیر عمل میں لاتے ہیں۔ اہلِ دانش اور باوصف لوگوں کا کسی رسم سے منکر ہونا معاشرہ کی بہتری کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس گمراہ، جاہل اور مشکوک تصورات، معاشرہ میں نقصان اور بگاڑ ہی پیدا کرتے ہیں۔

تنظیم اور تربیت کی ضرورت جیسا کہ باب اول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ

بنی نوع انسان کی اکثریت کمزور اور خوابیدہ طبائع کی حامل ہے۔ اُن کی پیدائشی صلاحیتیں اُن کی پست تر یا حیوانی پہلو کی تحریکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ اس لئے یہ لازمی ہے کہ ان طبائع کو اچھی طرح منظم ہونا چاہیئے اور ان کو ایسے طرزِ عمل سے بچنا چاہیئے جو معاشرہ کی بہتری و اتحاد کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

اِس کے علاوہ ایسے لوگ، اپنے خود کے مستحکم رُجحانات و میلانات کے بغیر، طرزِ عمل کی اُن شکلوں، رسموں اور نمونوں کو اپنانے کی طرف میلان ظاہر کرتے ہیں جو اُن کو پرکشش معلوم ہوتے ہیں اور اُن کو تسکین دیتے ہیں۔ اِسی لئے اگر گمراہ طبائع کے لوگ غالب حیثیت میں ہوں تو وہ اپنے گمراہ محرکات کے مطابق خراب رسوم و روایات کو بروئے عمل لاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ جو خوابیدہ طبائع کے حامل ہوتے ہیں اور اُن میں قوت امتیاز یا خود اعتمادی کا فقدان ہوتا ہے اِن رسوم کو اپنا لیتے ہیں جو اُن کی اور معاشرہ کی لازمی مکمل تباہی لاتے ہیں۔ اِسی لئے یہ لازمی ہے کہ حکومت کے سربراہوں کو گمراہ طبائع کے لوگوں کی سرگرمیوں کو کچلنا چاہیئے کہ "الرسم الصالح" کی بجائے کوئی "الرسم الطالح" (بُری رسم) نے جگہ تو نہیں لے لی ہے اور عام لوگوں کو صالح رسوم کی تربیت بھی دینا چاہیئے۔

(مسلسل)

خانوادہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے متعلق دو روایتوں کی تحقیق و تنقید

جناب محمد عضد الدین خاں صاحب ایم اے ایل، ایل، بی۔ ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

تاریخ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے کسی خاص نقطۂ نظر یا کسی انوکھی بات کو ثابت کرنے کے لئے چند فرضی واقعات وضع کر لیتے ہیں اور ان کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں پھر بعد کے لکھنے والے ان داستانوں کو صحیح سمجھ کر انہیں بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح سے تاریخ کا ایک نیا ہی رخ ہو جاتا ہے مگر جب ان کا تاریخی حقائق کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دلائل کی اصل بنیاد فرضیات اور غیر تاریخی واقعات ہی تھے۔ اس طرح کے واقعات ہر دور اور ہر ملک کی تاریخ میں ملتے ہیں مگر ہمارے اسلاف اور بزرگان دین کے سلسلے میں اس طرح کا طریقہ زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ کسی نے اپنے ایک گروہ یا کسی خاص فرد کی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے کوئی قصہ گڑھ ڈالا تو کبھی کسی کو نیچا دکھانے کے لئے کوئی داستان مرتب کی گئی اور کہیں کسی اختلاف کو اور زیادہ اہمیت دینے کے لئے کوئی نئی بات تراشی گئی۔ ہمارے ان بزرگوں اور مشائخ کے سلسلے میں ان غلط روایات کو پرکھنے اور ان پر تنقید کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ واقعات یا تو کسی بڑے بزرگ کی زبانی یا ان کے قلم سے منسوب ہوتے ہیں یا

ان سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی طرف اس طرح کی منسوب روایات کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر کسنا سوء ادبی تصور کیا جاتا ہے۔ چاہے بھلے ہی ان واقعات کی وجہ سے ان کی شخصیت مجروح ہوتی ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگ خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تک فرضی واقعات گڑھنے والوں کی مہربانیوں سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متعلق یہ کہا گیا کہ شیعہ حضرات ان سے اس قدر خفا تھے کہ نواب نجف خاں (ف ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) نے جو راوی کے مطابق بہت ہی متعصب اور ظالم شیعہ تھا۔

(۱) "شاہ ولی اللہ صاحب کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کر سکیں[1]۔"

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ اسی نجف خاں نے:

(۲) "شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کو اپنی قلمرو سے نکال دیا تھا اور ہر دو صاحبان مع زنانوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے[1]۔"

(۳) "اس کے بعد مولانا فخرالدین صاحب کی سعی سے زنانوں کو تو سواری مل گئی تھی اور وہ پھلت روانہ ہو گئے تھے مگر شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو سواری بھی نہ ملی تھی[1]۔"

(۴) "اور شاہ رفیع الدین تو پیدل لکھنؤ چلے گئے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ پیدل جونپور چلے گئے تھے۔ کیونکہ نہ ان دونوں کو سوار ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا[1]۔"

(۵) "اور دو دفعہ روافض نے شاہ صاحب کو زہر دیا تھا اور ایک مرتبہ چھپکلی کا ابٹن پلوا دیا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص اور جذام ہو گیا تھا۔"

(۶) "اور جونپور کے سفر میں شاہ صاحب کو لو بھی لگی تھی جس سے مزاج میں سخت حدت پیدا ہو گئی تھی جس سے جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی تھی۔ اور ہمیشہ سخت بے چین

---

[1] امیر الروایات صفحہ ۳۳

رہتے تھے[1]"

مندرجہ بالا تمام فرضی واقعات کی تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ ان کا تاریخی تجزیہ پوری شرح وبسط کے ساتھ پہلے ہی کر چکا ہوں[2]۔ یہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحؒ سے متعلق دو اور روایات کا تاریخی جائزہ لینا مقصود ہے۔

(۱) پہلی روایت مناقب فریدی کے مصنف احمد اختر مرزا کی ہے حضرت شاہ فخرالدین صاحب کے حالات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"دہلی میں مشہور ہے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اور سٹین صاحب رزیڈنٹ سے حضرت ہی نے صفائی کرائی[3]"

(۲) دوسری روایت کا تعلق مناقبِ فخریہ کے مؤلف غازی الدین خان نظام[4] کے مندرجہ ذیل بیان سے ہے۔

"فرزندانِ شاہ ولی اللہ مغفور را درآنچہ متصدیان سلطانی از حویلی علٰحدہ ساختہ وحویلی را بہ ضبط آوردہ بودند۔ آں حضرت بہ حویلی مبارک جا دادند وغم خواری فرمودند وحویلی مذکور را از جناب سلطان بہ ایشاں دہانید"

---

[1] امیر الروایات ص ۳۳۔ [2] برہان نومبر ۱۹۶۴ء۔ [3] مناقب فریدی مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۴ھ ص ۳۶۔

[4] مناقب فخریہ کے مصنف کا نام تاریخ مشائخ چشت میں نظام الملک مذکور ہے لیکن اصل مصنف نظام الملک کے پوتے غازی الدین خاں نظام ہیں، جیسا کہ خود مناقب فخریہ میں ہی متعدد جگہ لکھا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں بھی مصنف نے شاہ فخر صاحب کے والد صاحب کے حالات کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"جدّ مرحوم عفی اللہ عنہ نواب نظام الملک آصف جاہ نیز شرف بیعت در خدمت آں ظل الٰہی داشت" (مناقب فخریہ ص ۴)۔ یہ کتاب اسی اصل مصنف غازی الدین خاں نظام کے نام سے دہلی سے ۱۳۱۵ھ میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کتاب کے دو قلمی نسخے بھی اسی اصل مصنف کے نام سے موجود ہیں۔

وبا عزاز و اکرام در آں جا رسانیدند"[1]

مناقب فریدی کی مذکورہ بالا روایت ہی کی اساس پر پروفیسر خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت میں رقمطراز ہیں :-

"حضرت شاہ فخر صاحب کا دہلی میں بڑا اثر و اقتدار تھا۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ALEXANDER SETON[2] ریزیڈنٹ دہلی سے شاہ عبدالعزیز صاحب کا جھگڑا ہو گیا حضرت شاہ فخر صاحب نے درمیان میں صفائی کرائی"[3]

اس روایت کی ثقاہت کا اندازہ لگانے کے لئے دہلی کے ریزیڈنٹ سٹین اور حضرت شاہ فخر صاحب کے حالات اور ان کی تاریخوں کا جاننا ضروری ہے۔

دہلی پر ستمبر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک LORD LAKE نے قبضہ کر لیا[4] اور اس تاریخ ہی سے وہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا باقاعدہ تسلط ہو جاتا ہے۔ اسی سال سے دہلی کے علاقہ کی دیکھ بھال کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ریزیڈنٹ رہنے لگتا ہے۔ انگریزوں نے سب سے پہلا جو ریزیڈنٹ مقرر کیا وہ تھا سر ڈیوڈ آکٹر لونی SIR DAVID OCHTERLONY یہ پہلا ریزیڈنٹ دہلی میں پہلی بار ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۶ء تک ریزیڈنٹ رہتا ہے[5]۔ اس کے بعد اس کی جگہ دوسرا ریزیڈنٹ سٹین ہوتا ہے جو اس عہدے پر ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۱ء تک رہتا ہے[6]۔ دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ اور ایجنٹ کا یہ سلسلہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء تک جاری رہا

---

[1] مناقب فخریہ از غازی الدین خاں نظام ص۱۶ مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۵ھ

[2] سٹین کا نام پروفیسر پی اسپیر نے اپنی کتاب TWILIGHT OF THE MUGHALS میں چارلس سٹین (CHARLS SETON) دیا ہے (ص۲۶۹)۔ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول کے ص۶۹۲ پر مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے اس کا نام آرچی بولڈ سٹین دیا ہے۔

[3] تاریخ مشائخ چشت (دہلی ۱۹۵۳ء) ص۹۳م۔

[4] TWILIGHT OF THE MUGHLS و دہلی ریزیڈنسی اینڈ ایجنسی ص۱۔

[5]، [6] دہلی ریزیڈنسی اینڈ ایجنسی ص۱ و علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) ص۳۵۰۔

جب کہ آخری ایجنٹ سائمن فریزر غدر کے دوران قتل ہوجاتا ہے[1]۔

جیساکہ ابھی ہم نے دیکھا انگریزوں کا باقاعدہ تسلط دہلی پر ۱۸۰۳ء میں ہوا۔ جبھی سے ریزیڈنسی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس سلسلے کا دوسرا ریزیڈنٹ سیٹن تھا جو ۱۸۰۶ء میں اپنے اس عہدے پر فائز ہوا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت شاہ فخر صاحب سیٹن کے ریزیڈنٹ ہونے سے تقریباً اکیس سال پہلے ۲۷ رجادی الثانی ۱۱۹۹ھ[2] بمطابق مئی ۱۷۸۵ء میں انتقال فرماجاتے ہیں۔ اس لئے حضرت شاہ فخر صاحب کی وساطت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

سطور بالا سے تو یہ ثابت ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز اور سیٹن کے مابین حضرت شاہ فخر صاحب کے بیچ بچاؤ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ شاہ صاحب اور سیٹن میں کبھی کوئی نزاع ہوا بھی تھا یا نہیں ؟

تاریخ میں ہم کو صرف مناقب فریدی کے مصنّف ہی کا حوالہ ملتا ہے جس میں انہوں نے اس جھگڑے کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب یا ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں یا شاہ صاحب کے تلامذہ کی تصانیف میں کہیں بھی اس جھگڑے کا ذکر موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود مناقب فریدی سے قبل کے لئے شاہ فخر صاحب کے بھی کسی تذکرے میں اس واقعہ کا کوئی حوالہ نہیں۔ اس کے برخلاف خود شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں متعدد ایسی روایات ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شاہ صاحب کا سٹین سے جھگڑے کا سوال ہی نہیں ہوتا، بلکہ سٹین شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاصا معتقد تھا اور ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔

ملفوظات شاہ عبدالعزیز میں سیٹن کے سلسلے میں یوں ذکر ہے :-

"سٹین ہم دو سہ بار آمد لیکن جاہل پر تملق چنانچہ روزے برائے

---

[1]، [2] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۵۱۳ -

دیدن مولد در شہر کہنہ رفت و قصد کرد بجائے مولدم بنائے طیار کند چنانچہ بنا کردہ مگر درست نشدہ چنانچہ حسب ذکر پرسیدہ بود[1]۔"

ترجمہ:۔ "سیٹن دو تین بار میرے پاس آیا ہے لیکن وہ جاہل اور خوشامدی ہے۔ چنانچہ ایک دن میری جائے پیدائش کو پرانے شہر (دہلی) میں دیکھنے گیا تھا اور وہاں ایک عمارت (بطور یادگار) بنوانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا چنانچہ ایک عمارت بنوائی تھی مگر وہ درست نہ تھی، جیسا کہ حسب ذکر دریافت کیا گیا تھا۔"

اسی صفحہ پر ایک اور عبارت سیٹن سے متعلق اس طرح ہے:۔

"ارشاد شد کہ سیٹن انگریز سوال کرد کہ باعث ایں چیست کہ آب چاہ شہر کہنہ بعض بعض شیریں شدہ است گفتم از دو جہت[2]۔۔۔"

ترجمہ:۔ ارشاد فرمایا کہ سیٹن انگریز نے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ پرانے شہر کے کنوؤں کا پانی کہیں کہیں میٹھا ہو گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ دو وجہ سے ہے۔۔۔"

ایک اور جگہ ملفوظات میں سیٹن کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:۔

"باز فرمود کہ سیٹن صاحب کہ قابل دوست بود و بندہ را ہم طلبیدہ بود و می خواست کہ بہ بیاید[3]۔"

ترجمہ:۔ پھر فرمایا کہ سیٹن صاحب جو ایک قابل دوست تھے انھوں نے مجھے اپنے مکان پر بلایا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں (کبھی کبھی) ان کے پاس جایا کروں۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیٹن بھی دیگر امراء و رؤساء کی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب سے عقیدت مندانہ طور پر ملتا تھا۔ چونکہ ملفوظات ۱۲۳۳ھ

---

[1]، [2]، [3] ملفوظات شاہ عبدالعزیز۔ مطبع مجتبائی ۱۳۱۴ھ ص ۱۱۷۔

یعنی شاہ صاحب کی وفات سے تقریباً چھ سال قبل سے مرتب ہونا شروع ہوا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب اور سیٹن میں اگر کبھی جھگڑا ہوا بھی ہوتا تو شاہ صاحب یا خود ملفوظات کے جامع اس کا ذکر کرتے۔ اس وقت سیٹن ریزیڈنٹ بھی نہ تھا۔ اس لئے اس جھگڑے کا ذکر یا کم از کم سیٹن کا ذکر کسی دوسرے انداز میں کرنے میں انھیں کوئی قباحت نہیں تھی۔

علاوہ ازیں یہی دھلی کا ریزیڈنٹ سیٹن شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی ضبط شدہ جائداد کے واگزاشت کرنے کی سفارش کرتا ہے۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا نہ تو سیٹن سے کبھی اس طرح کا جھگڑا ہوا اور اگر ہوا بھی ہوتا تو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ جیسے عالم اور صوفی کو اس سے دوبارہ تعلقات استوار کرنے کی پروانہ تھی کہ کسی کی سفارش یا وساطت کی ضرورت پڑتی اور اگر پڑی بھی تھی تو حضرت شاہ فخر صاحبؒ اس وقت کہاں موجود تھے وہ تو اس کے ریزیڈنٹ ہونے سے اکیس سال پہلے ہی وصال فرما گئے تھے۔

اب آیئے ہم مناقب فخریہ کے مؤلف غازی الدین خاں نظام کی روایت کا تاریخی جائزہ لیں۔ مناقب فخریہ کے دوسرے باب میں شاہ فخر صاحب کے عادات واطوار کے ذیل میں یہ عبارت لکھتے ہیں:۔

"فرزندان شاہ ولی اللہ مغفور را در آنچہ متصدیان سلطانی از حویلی علیحدہ ساختہ و حویلی را بہ ضبط آوردہ بودند۔ آں حضرت بہ حویلی مبارک جا دادند و غم خواری فرمودند و حویلی مذکور را از جناب سلطان بہ ایشاں دہانیدند و باعزاز واکرام درآں جا رسانیدند"[1]

ترجمہ:۔ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادوں کو بادشاہ کے ملازمین نے

---

[1] مناقب فخریہ از غازی الدین خاں نظام مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۵ھ ص ۱۶۔

جب حویلی سے الگ کر دیا اور اس حویلی کو ضبط کر لیا گیا (تو) آں حضرت (یعنی شاہ فخر صاحب) نے اپنی حویلی میں جگہ دی اور بہت غم خواری فرمائی اور ان کی حویلی بادشاہ سے واپس دلوادی اور عزت اور احترام سے وہاں پہنچایا۔"

مناقب فخریہ کی اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور ان کے بھائیوں کی حویلی کی ضبطی ظاہر ہے شاہ فخر صاحب کے زمانہ حیات یعنی ۱۷۸۵ء سے پہلے ہی ہوئی ہوگی۔ پھر ظاہر ہے کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوگا تو شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے بعد ہی ہوا ہوگا اور شاہ ولی اللہ صاحب کا انتقال ۱۷۶۲ء میں ہوا۔ پھر نواب نجف خاں (جسے عام طور پر اس طرح کے واقعات کا ہیرو قرار دیا جاتا ہے) کا انتقال ۱۷۸۲ء میں ہو جاتا ہے۔ نواب نجف خاں کے مرنے کے بعد اس طرح کے کسی بھی واقعہ کا کچھ دنوں کے لئے احتمال یوں نہیں ہوتا کہ دہلی سے ایک طرح سے شیعوں کا اقتدار کچھ دنوں کے لئے ختم ہو جاتا ہے اور غلام قادر خاں روہیلہ کچھ دنوں کے لئے برسر اقتدار آجاتا ہے۔ اب مناقب فخریہ کے مؤلف کے مطابق شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے بھائیوں کے سلسلے میں اس طرح کا واقعہ اسی ۱۷۶۲ء اور ۱۷۸۲ء کے درمیان ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے صاحبزادوں کی حویلی کس جرم کی پاداش میں ضبط ہو سکتی ہے؟ یہ حضرات مغلیہ سلطنت کے کسی طرح دشمن نہ تھے۔ بلکہ امراء و سلاطین ان بزرگوں کی زیارت اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ اکثر ان بزرگوں سے دعائیں کرواتے رہتے۔ خود شہزادگان اور شہنشاہِ وقت متعدد بار شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ تو ممکن نہیں کہ بادشاہ ان بزرگوں سے ناراض ہو گیا ہو اور یہ ناراضگی ان کی حویلی کی ضبطی کا باعث بنی ہو۔ اس کے علاوہ یہ حضرات عالم اور صوفی تھے نہ کہ سیاستدان کہ ان کا سیاسی اثر و اقتدار کچھ امراء کو شاق گزرا ہو اور انھوں نے یہ حرکتِ نازیبا کی ہو۔

اب رہ گئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی زندگی کے دو اہم کارنامے جو اس زمانے کے ایک طبقے کے لئے باعث خفگی ہو سکتے ہیں وہ ہیں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا اور دوسرا فتویٰ دارالحرب۔

ہندوستان میں شیعیت کا رد اور اس کی مخالفت جس شدت کے ساتھ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے کی ہے اہل علم پر مخفی نہیں۔ مگر جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں (یعنی ۱۷۶۲ء سے ۱۷۸۲ء کے درمیان کا زمانہ) اس میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور ان کے برادران شیعیت کی مخالفت میں اس قدر متشدد نہ تھے۔ بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تو سر الشہادتین جیسی کتاب بھی اسی زمانے میں لکھی تھی[1] جس کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی شاہ عبدالعزیز ہیں جو چند سال کے بعد تحفہ اثنا عشریہ کے مصنف ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز ہی اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ شیعیت کی تردید میں پیش پیش رہے مگر ان کی یہ شدت تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر شیعیت کی مخالفت کے جرم میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی حویلی ضبط ہوئی ہوگی تو وہ تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس تصنیف سے پہلے شاہ عبدالعزیز صاحب کی کوئی تصنیف باقاعدہ شیعیت کی رد میں نہیں تھی۔ اور تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف حضرت شاہ فخرؒ صاحب کے انتقال کے پانچ سال بعد ۱۲۰۴ھ میں ہوتی ہے اس لئے حضرت شاہ فخرؒ صاحب کی غمخواری اور ان کی سفارشات کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا دوسرا بڑا کام جو حکام زمانہ کو ناپسند اور ان کی خفگی کا باعث ہو سکتا تھا وہ تھا ان کا فتویٰ دارالحرب اور انگریزوں کی ملازمت کی مخالفت۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اپنی بصیرت سے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کیا اور پھر تاریخ میں پہلی بار انگریزی حلقہ اقتدار کو دارالحرب قرار دیا اور نتیجے کے طور پر انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ٹھہرایا ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ ایسا تھا جس سے انگریز شاہ صاحب سے ناراض ہو

---

[1] یہ کتاب شاہ صاحب کی تالیف نہیں ہے۔ مدیر

سکتے تھے اور بہت ممکن ہے ہوئے ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس فتوے سے نتیجے کے طور پر انگریزوں کی خفگی سے شاہ فخر سے صاحب کا کیا تعلق؟ یہ فتویٰ یقیناً کرنل لیک کے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کر لینے کے بعد ہی دیا گیا تھا اور شاہ فخر صاحب کا انتقال انگریزوں کے دہلی پر قبضہ سے اٹھارہ سال پہلے ہی ۱۷۸۵ء میں ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا شاہ عبدالعزیز صاحب کی پوری زندگی میں صرف دو ایسے بڑے کارنامے تھے جن سے ان کے زمانے کا ایک بڑا طبقہ ناخوش ہو سکتا تھا اور ان کے درپے آزار ہو سکتا تھا۔ وہ کارنامے تھے تحفۂ اثنا عشریہ کی تصنیف اور فتویٰ دار الحرب اور اس سے متعلق چیزیں۔ مگر یہ دونوں کام شاہ فخر صاحب کی وفات کے بعد ہوئے ہیں۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی مان لیا جائے کہ ان کی معرکۃ الآراء تصنیف تفسیر فتح العزیز بھی ایک طبقہ کی خفگی کا باعث ہوئی تھی جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ[۱] ولی اللہ صاحب کا ترجمہ قرآن مجید بزبان فارسی بھی ان کی خفگی کا باعث ہوا تھا اور یہ خفگی اس قدر تھی کہ وہ لوگ شاہ ولی اللہ صاحب کو شہید کرنے کے لئے فتحپوری مسجد تک پہنچ گئے تھے۔ مگر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی یہ تصنیف بھی حضرت شاہ فخر صاحب کے وصال کے نو سال بعد ۱۲۰۸ھ میں شروع ہوئی۔ اس لئے اس کا بھی سوال نہیں ہوتا۔

اب اور کوئی ایسی صورت بظاہر نہیں نظر آتی جس میں "متصدیان سلطانی" ان کے اس قدر خلاف ہو گئے ہوں کہ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کو ان کی اس عالیشان عمارت[۲] سے جسے خود مغلیہ بادشاہ محمد شاہ ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء نے شاہ ولی اللہ صاحب کو دیا تھا۔ علیحدہ کر دیں۔ پھر اگر ایسا بالفرض ہوا بھی تھا تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا آبائی مکان مہندیوں میں موجود تھا آپ وہاں جا سکتے تھے۔ آپ کے بہت سے قریبی رشتہ دار

۱ے حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی ص ۲۶-۲۷-۲۸ CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE از ڈاکٹر زبید احمد۔

۲ے واقعات دار الحکومت دہلی جلد ۲ صفحہ ۲۸۶۔

اور شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ جیسے مولانا محمد عاشق پھلتی، خواجہ محمد امین کشمیری اور ان کے خسر مولانا نور اللہ بڈھانوی جن تینوں نے ۱۷۷۳-۷۴ء میں وفات پائی اس واقعہ کے زمانہ میں یا تو زندہ تھے یا کم از کم ان کے مکانات تو موجود تھے ہی، آپ کو بدرجہ اولیٰ وہاں تشریف لے جانا چاہیئے تھا۔ پھر شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور ان کے بھائیوں کے اجل تلامذہ بھی دہلی میں تھے، آپ وہاں جا سکتے تھے۔ شاہ فخر صاحب کے یہاں جانے کا تو ان سب کے بعد سوال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شاہ عبد العزیز اور ان کے بھائی شاہ عبد القادر و شاہ رفیع الدین کی دہلی میں الگ الگ اس قدر عزت تھی کہ اس زمانے میں شاید ہی چند علماء ان کے مقابل کے ہوں۔ پھر شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبد الحی صاحب وغیرہ بھی ساتھ رہے ہوں گے۔ یہ تمام علماء اور مشائخ اس قدر بے کس و بے یار و مددگار سمجھ لئے گئے کہ ان کو بادشاہ کے چند ملازموں نے ہی خود ان کی اپنی حویلی سے نکال دیا، کسی نے کچھ تعرض تک نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خود فرزندانِ شاہ ولی اللہ یا ان کے تلامذہ یا معتقدین نے ان کی زندگی کے اس اہم سانحے کو مارے ڈر کے کبھی اور کہیں ذکر بھی نہیں کیا۔ اور تو اور خود مولانا فخر صاحب کے کسی اور مرید یا تذکرہ نگار نے حضرت مولانا کے اس ہمدردانہ فعل اور شاہ عبد العزیز صاحب کے ساتھ اس حادثے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہ بات بالکل قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جائداد کی ضبطی کا واقعہ شاہ عبد العزیز صاحب کی زندگی کے کسی بھی حصے میں پیش بھی آیا تھا یا یہ سرے سے ہی فرضی ہے۔ اس سوال کا جواب ذرا کافی مشکل ہے۔ اس لئے کہ اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی بہت ہی معتبر اور صحیح روایت موجود نہیں ہے۔ اور ہندوستان میں خصوصاً اس زمانے کی تاریخ کو اس قدر توڑ مروڑ ڈالا گیا ہے کہ اصل حقیقت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ گزشتہ سال ایک کتاب پاکستان سے فضائلِ صحابہ و اہلِ بیت کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کے مقدمے میں محمد ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں :-

"ضبطیٔ جائداد کا واقعہ صحیح ہے۔ کیونکہ جائداد کے متعلق تحریری

حوالہ ملتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی ؒ نے ۳۰ جون ۱۸۰۶ء کو ایک درخواست ریزیڈنٹ دہلی کے توسط سے سکریٹری پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کو دی تھی کہ دہلی میں ان کی جو جائداد ضبط ہو چکی ہے وہ واگزاشت کی جائے اس درخواست کو قابل اعتنا سمجھا گیا چنانچہ کیفیت کے خانے میں درج ہے

The Resident, Delhi forwards copy and letter from the Superintendent of the assigned territory, and recommends that the land in Havely palam formerly owned by Maulvi Shah Abdul Aziz be restored to him.

"شاہ عبدالعزیز کی یہ درخواست منظور ہو گئی اور دس جولائی ۱۸۰۶ء کو سکریٹری پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ریزیڈنٹ کو اطلاع دی گئی کہ گورنمنٹ شاہ عبدالعزیز کی جائداد واگزاشت ہونے کی تجویز منظور کرتی ہے[1]"۔

پھر حاشیے میں ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے:-

"جائداد اور اس کے واگزاشت ہونے کے متعلق ملاحظہ ہو" پریس لسٹ آف اولڈ ریکارڈس ان دی پنجاب سکریٹریٹ ج اول (دہلی ریزیڈنسی اینڈ ایجنسی ۱۸۰۶ء)"۔

محمد ایوب قادری صاحب نے جو عبارت نقل کی ہے وہ نامکمل سی ہے، پوری عبارت سامنے ہوتی تو نتیجہ نکالنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ پھر یہ اقتباس ان کو کہاں اور کس کیفیت کے خانے سے ملا؟ اور درخواست دینے کی تاریخ ان کو کہاں سے حاصل ہوئی؟ اگر یہ اسی انگریزی عبارت کا ایک حصہ ہے تو پھر اسے بھی عبارت کے ساتھ ہی نقل کر دیا ہوتا۔ پھر سکریٹری پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کا اصل جواب بھی نہیں نقل کیا، جہاں سے یہ اقتباس لیا ہے اس کا صفحہ نمبر وغیرہ بھی نہیں دیا۔ جس کتاب کا اس میں حوالہ دیا گیا ہے

---

[1] فضائل صحابہؓ و اہل بیت (مقدمہ) پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۵ء صفحہ ۵۵-۵۶۔

اس نام کی کتاب تو مجھے نہ مل سکی۔ ایک دوسری کتاب زیر نظر ہے جس کا نام ہے، ریکارڈس آف دی دہلی ریزیڈنسی اینڈ ایجنسی (۱۸۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) مطبوعہ لاہور ۱۹۱۱ء ہے اور غالباً ایوب قادری صاحب کا مطلب اسی کتاب سے ہے مگر مجھے اس کتاب میں یہ عبارت نہ مل سکی۔

ممکن ہے یہ عبارت صحیح ہو اور اس میں جن مولوی شاہ عبدالعزیز کا ذکر ہے وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہی ہوں۔ اور اگر یہ سچ ہے تو ممکن ہے ان کے فتویٔ دارالحرب کے نتیجے کے طور پر ان کی یہ جائداد ضبط ہوئی ہو۔ بہر حال اس عبارت سے بھی مناقب فریدی اور مناقب فخریہ دونوں کی روایات کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ یہ درخواست ۳۰ جون ۱۸۰۷ء کو دی گئی ہے اور دس جولائی ۱۸۰۷ء کو (یعنی کل دس دن کے اندر) منظور ہو جاتی ہے اور اس کی سفارش کرنے والا اس زمانے کا دہلی کا ریزیڈنٹ تھا۔ اور اس زمانے میں دہلی کا ریزیڈنٹ سیٹن ہی تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص شاہ عبدالعزیز صاحب سے اتنے اچھے تعلقات رکھتا ہو اور جو ان کی جائداد کی واپسی کی سفارش کرتا ہو اُس نے شاہ عبدالعزیز صاحب رح سے کیونکر جھگڑا کیا ہوگا۔

پھر دوسری روایت کی تردید یوں ہو جاتی ہے کہ شاہ عبدالعزیز رح کی جائداد ۱۸۰۷ء میں واگزاشت ہوتی ہے اور حضرت شاہ فخر صاحب کا وصال اس سے بائیس سال پہلے ہی ۱۷۸۵ء میں ہو جاتا ہے۔

مناقب فخریہ ۱۳۰۱ھ میں لکھی گئی۔ ظاہر ہے اس وقت یہ عبارت مناقب فخریہ کے مؤلف نے نہیں لکھی ہوگی۔ غالباً بعد میں کسی نے اس عبارت کو شامل کر دیا ہے جیسا کہ اس کے فوراً بعد کی عبارت سے اوپر کی عبارت کے بے محل ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی عبارات ہر زمانے کے تذکروں میں شامل کی گئی ہیں اور اسی وجہ سے خصوصاً علماء کے تذکروں کا لٹریچر کافی گڈمڈ سا ہو گیا ہے۔ ان کی تحقیق اور پھر سچ و جھوٹ کو الگ الگ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ (بشکریہ بُرھان)

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

ملفوظات

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(۲)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ ۱۳۱۴ھ میں قاضی بشیرالدین صاحب صدیقی میرٹھی مرحوم نے مطبع مجتبائی میرٹھ سے طبع کرایا تھا۔ اس کا پہلا ترجمہ مولوی عظمت الٰہی میرٹھی نے کیا جو مطبع ہاشمی میں طبع ہوا۔ اس ترجمہ کے مطالعہ کا موقع مجھے نہیں ملا۔ قاضی صاحب نے ملفوظات کے شروع میں بطور پیش لفظ اس نسخے کے متعلق جو کچھ فارسی زبان میں ارقام فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

کمترین بشیرالدین صدیقی ناظرین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ مجھ کو طالب علمی کے زمانے سے حصول ملفوظاتِ اولیاءِ کرام کا شوق تھا۔ خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور دیگران اکابرِ ملت کی تصانیف جمع کرنے اور پڑھنے کا ذوق تھا جن سے اس قلیل البضاعت کو اور اس کے بزرگوں کو ارادت و تلمذ کا تعلق ہے۔ میں اسی جستجو میں رہتا تھا کہ جس طرح ہوسکے ان تصانیف کو حاصل کروں، جہاں کہیں پتہ چلتا تھا بسعیِ کثیر اور بصرفِ زرِ خطیر ان بے بہا موتیوں کو دستیاب کرتا تھا۔ اس طرح میں نے اس سلسلے کی بہت سی کتابیں اور رسائل جمع کرلئے جن کو حسب ضرورت وقتاً فوقتاً

شائع کرنے کا قصد ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مدتِ مدید سے دل کی یہ آرزو بھی تھی کہ اگر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے کسی مرید یا شاگرد نے ملفوظات جمع کیے ہوں تو وہ بھی حاصل ہو جائیں۔ الحمد للہ کہ جوینده یابنده کے بموجب آرزوئے دل برآئی۔ یعنی نسخہ ملفوظات طیبات بہم پہنچ گیا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ کتاب کی بوسیدگی اور کرم خوردگی کے باعث جامعِ ملفوظات کا نام دریافت نہ ہوسکا۔ البتہ بعد مطالعہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ان ملفوظات کا جامع، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی بہت ہی خاص مرید ہے۔ اپنی طبیعت کے تقاضے اور بعض اخوان و احبّا کے اصرار کی بنا پر میں نے اس گوہر بے بہا کو مخفی رکھنا مناسب نہ سمجھا اور اس کو طبع کرانے کے لئے کمرِ ہمت باندھ لی۔ مجھے اس کتاب کی طباعت میں کافی محنت کرنا پڑی ہے۔ دریدگی اور بوسیدگی کی وجہ سے اصل کتاب میں جو کلمات پڑھے نہ جاسکے اور جن میں اپنی سمجھ اور رائے سے جوڑ لگانا نامناسب تھا، ان مقامات کو مجبوراً اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، علاوہ بریں کچھ اغلاط کارکنان مطبع کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں ان کو آخر کتاب میں غلط نامہ کے عنوان سے لگا دیا گیا ہے [۱]"

میں نے اب سے تقریباً تیس سال پہلے قاضی صاحب مرحوم سے میرٹھ جا کر معلوم کیا تھا کہ ان کو اصل نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا؟ یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ متھرا سے مجھے یہ نسخہ ملا تھا۔ معلوم نہیں کہ ان کے صاحبزادے مکرمی قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے پاس اب بھی وہ اصل نسخہ محفوظ ہے یا نہیں؟

جواہر میوزیم اٹاوہ میں (جو ڈاکٹر بشیر الدین احمد مرحوم کا جمع کردہ ذخیرۂ کتب ہے اور اب کچھ عرصے سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں شامل ہوگیا ہے) ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ مولانا ابرار حسین فاروقی گوپاموی ایم اے علیگ نے اس نسخے پر تبصرہ کرتے ہوئے جواہر زواہر میں تحریر کیا ہے۔

"یہ ملفوظات سوال و جواب کی شکل میں ہیں جن میں مسائلِ تصوف و سلوک

---

[۱] احقر کے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے اس کے آخر میں غلط نامہ نہیں ہے ۱۲

مسائلِ فقہ، تفسیر و حدیث اور بعض واقعاتِ تاریخی کا پُر از معلومات درس ہے
کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔ کتابت بخطِ معمولی نستعلیق ہے۔ لیکن کاتب کا نہ صرف خطِ نسخ
بہت معمولی ہے جس سے عربی عبارتیں غلط ہوگئی ہیں بلکہ ..... کافی خراب ہے۔ جس
کی وجہ سے بعض الفاظ مشکل سے پڑھے جاتے ہیں۔" ص ۹۶

مجھے علی گڑھ میں اس نسخے کو مطالعہ کرنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ ۲۹ جمادی الثانیہ
۱۲۹۴ھ میں بدست محمد عطا علی یہ مخطوطہ تیار ہوا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ مطبوعہ نسخے کا
اس قلمی نسخے سے مقابلہ بھی کیا۔ دو تین دن کئی گھنٹے صرف کر کے چوتھائی کتاب کا مقابلہ
کر چکا ہوں، اتنے ہی حصے میں درجنوں غلطیاں مطبوعہ نسخے میں نکلیں۔ بعض جگہ مطبوعہ
نسخے میں الفاظ صحیح ہیں مخطوطہ میں غلط ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ قاضی بشیر الدین صدیقی
میرٹھی مرحوم کا نسخہ اس نسخے کی نقل نہیں ہے۔

ملفوظات کا دوسرا ترجمہ ڈاکٹر معین الحق ایم اے پی ایچ ڈی کی تحریک سے کراچی
میں شائع ہوا۔ دو فاضل مترجموں نے اس کام کو انجام دیا، ڈاکٹر صاحب نے اس کا پیش لفظ
لکھا، جس میں میرٹھ والے ترجمے کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ اس میں ترجمے کی بے شمار
غلطیاں ہیں اور اکثر عبارتیں ترجمے سے چھوٹ گئی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ دوسرا ترجمہ کتابت، طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے دیدہ زیب
ہے۔ مقدمہ بھی مبسوط و مفصل لکھا گیا ہے۔ مگر اس میں بھی ترجمے کے اغلاط کثرت سے
موجود ہیں۔ میرے سامنے اگر پہلا ترجمہ بھی ہوتا تو مجھے اس امر کا پتہ چلانا آسان ہوتا کہ دوسرے
ترجمے میں کن کن غلطیوں کا ازالہ اور کن کن غلطیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ کراچی والے ترجمے
میں بہت سی ایسی اغلاط ہیں کہ بے اختیار ہنسی آنے لگتی ہے۔ مطبوعہ فارسی نسخے میں یقیناً
بہت سی غلطیاں ہیں، لیکن جو عبارت پڑھی جا سکتی ہے اور غور کرنے سے جس کا مطلب
نکل سکتا ہے اس کا سرسری طور پر بغیر سوچے سمجھے ایک گول مول ژولیدگی آمیز ترجمہ کر دینا
شانِ ترجمانی کے مناسب نہیں۔ نسخہ ملفوظات اور اس کے ترجمے پر مستقل طور پر ایک
مضمون لکھنے کا ارادہ ہے۔ فی الحال دو نمونے مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں:-

ملفوظات مطبوعہ میں ہے ــــ خسر بندہ کہ شاگرد و خلیفۂ والدم بودند الخ۔ اس عبارت کا ترجمہ سیدھا سادہ یہ ہے کہ بندے کے یعنی میرے خسر جو کہ میرے والد کے شاگرد و خلیفہ تھے الخ۔

اب ذرا کراچی والے ترجمے کو ملاحظہ فرمائیے، ایک شخص خیز ندہ ؟ (سوالیہ علامت ترجمے میں لگی ہوئی ہے) کہ میرے والد کا خلیفہ اور شاگرد تھا الخ۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ترجمہ ہے۔

ملفوظات میں ہے ــــ ارشاد شد کہ مثل والد صاحب حافظہ ندیدہ ام مگر شنیدہ (ام) چنانچہ شعبیؒ کہ ذکر او در بخاری جابجا آمدہ ــــ ظاہر ہے کہ اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ ــ میں نے والد صاحب کی مثل کسی کا حافظہ نہیں دیکھا، مگر ہاں سنا ہے چنانچہ شعبیؒ کا حافظہ جن کا ذکر بخاری میں جابجا آتا ہے الخ۔

اب کراچی کے ترجمے کو پڑھئے ــــ میں نے اپنے والد ماجد کے برابر کسی کا حافظہ نہیں دیکھا مگر ایک شیعہ کا حالؑ سنا ہے۔ بخاری میں اس کا ذکر جابجا مذکور ہے۔

کتنا مزیدار ترجمہ ہے، دھوکا کہاں سے لگا؟ شعبیؒ کو شیعی پڑھنے اور سمجھنے سے۔ اتفاق سے مطبوعہ نسخے میں اس لفظ پر شوشے اور نقطے بھی اس انداز سے لگ گئے ہیں کہ سرسری ترجمہ کرنے والے کا امتحان ہو جائے ــــ میں کہتا ہوں کہ یہ کیا ضرور تھا کہ تمام ملفوظات کا ترجمہ کر دیا جائے۔ ملفوظات کی تلخیص کر کے سمجھ میں آنے والی عبارات کا ترجمہ کر دیا جاتا۔ کافی تھا۔

اصل ملفوظات کے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ اس کے جامع نے جن کا نام

ع ــ قاضی بشیر الدین میرٹھی مرحوم نے حالات شاہ عبد العزیزؒ میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ملفوظات کا بھی کچھ حصہ شامل کیا گیا ہے، اس ملفوظ کا یہاں بھی یہی ترجمہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ والے ترجمہ سے منتقل ہو کر یہ غلطی کراچی پہنچی اور وہاں کے فاضل مترجموں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی۔

اور جن کی علمی حیثیت معلوم نہیں چند ایسی باتیں بھی ملفوظات کے مجموعے میں شامل کر دی ہیں جن کو شاہ صاحبؒ نے اپنے بے تکلف احباب کے سامنے بعض مجالس میں بیان فرمایا تھا، ان کو جامع صاحب شامل مجموعہ نہ کرتے تو اچھا تھا، یہ کیا ضروری ہے کہ ایک بزرگ کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو نقل کر دیا جائے۔ بزرگوں کے بعض ملفوظات میں تفرد کی شان بھی ہوتی ہے۔ اس نسخے میں بھی بعض ملفوظات تفرد کی شان لئے ہوئے ہیں۔ بعض ارشادات محققانہ ہیں مگر ہر ایک کے سمجھنے کے نہیں۔ کم علمی اور کم فہمی کی بنا پر بعض اشخاص اس سے الجھن میں پڑ سکتے ہیں — بعض باتیں ایسی ہیں کہ جن کی حیثیت فتوے کی نہیں ہے بر سبیلِ تذکرہ یوں ہی بیان فرمادی گئی ہیں، پھر زمانے اور ماحول کے محرکات و موثرات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جذبۂ اصلاح کے باوجود بعض بزرگ خود بھی غیر محسوس طریقے پر کچھ نہ کچھ ان محرکات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ بعض باتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ جامع صاحب خود نہیں سمجھے۔ یا بعد کو ملفوظ لکھا ہے پوری بات یاد نہیں رہی یا پوری بات یاد ہے لیکن فی الحال اپنے مسودے میں اشارہ کر دیا ہے اور ارادہ یہ ہے کہ اس بات کو بعد میں وضاحت سے لکھوں گا۔ بعض جگہ پڑھنے والے کو شبہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بات اس طرح شک کے ساتھ فرمائی ہوگی، مگر وہ شک جامع کا ہے شاہ صاحب کا نہیں، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تاریخِ وفات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ۲۹ر محرم الحرام بیان فرمائی۔ جامع صاحب نے اس تاریخ کو بعد میں لکھا اور ۲۹ر محرم لکھنے کے بعد یہ بھی لکھ دیا کہ یا ۱۲ر محرم کو — یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات ۲۹ر کو ہوئی یا ۱۲ر کو — ظاہر ہے کہ اپنے والد ماجد کی تاریخِ وفات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا حافظہ کیسے فراموش کر دیتا۔ یہ ایک عظیم جاں گداز سانحہ تھا اس کی تاریخ اس طرح شک کے ساتھ شاہ صاحبؒ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ لامحالہ جامع صاحب کو شک ہوا کہ یہ تاریخ فرمائی تھی یا یہ، اور بعد کو معلوم نہیں کیا۔ غرض کہ کچھ جامع نے کچھ کاتب نے کچھ مترجمین نے مل ملا کر ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ بعض اہل علم حضرات کو ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ کے کُل یا جُز کے الحاقی یا مصنوعی ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ میں نے ان ملفوظات پر کافی غور کیا ہے، میں اس کے تمام

مندرجات کو صحیح سمجھتا ہوں بس بات یہی ہے کہ جامع سے لے کر مترجم تک کے تصرفات سے بعض ملفوظات کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے جس سے ایک ذہین و ذکی ناظر سخت الجھن محسوس کرتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ ملفوظات بہت دلچسپ اور بہت سی معلومات کے حامل ہیں۔ جامع نے اپنا نام اگرچہ نہیں بتایا لیکن کچھ محنت کرنے کے بعد ان کے دیباچے کی روشنی میں اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس جگہ کے یا کم از کم کس علاقے اور خاندان کے شخص تھے۔

جامعِ ملفوظات نے شروع میں لکھا ہے کہ میں بتاریخ ۱۳ رجب ۱۲۳۳ھ بروز شنبہ دوسری مرتبہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ احباب و اعزار کا سلام پہنچایا۔ حضرتؒ نے "بعد استفسار خیر و عافیت جسمانی و روحانی و اہلی و مالی" میرے مشاغل کو معلوم فرمایا۔ اسی دن میں نے ملفوظات لکھنے کی اجازت حاصل کی، پھر عارضی سکونت کے لئے ایک مکان (غالباً کرائے پر) بہم پہنچایا ۔ بعدہٗ ۱۷ رجب ۱۲۳۳ھ (یوم الجمعہ) سے ملفوظات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

داخلی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شوال ۱۲۳۳ھ تک یہ کام جاری رہا اور تقریباً تین ماہ کے ملفوظات جمع کر لئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ ۶ شوال ۱۲۳۳ھ کو حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ کا وصال ہوا ہے۔ اس مجموعۂ ملفوظات کے آخر میں ان کے مرض اور وفات سے متعلق بھی چند واقعات ہیں، اور پھر چند ورق کے بعد ملفوظات ختم ہو جاتے ہیں۔

ان ملفوظات میں علاوہ مجلس خاص کے چہل قدمی کے وقت کی گفتگو بھی کہیں کہیں قلم بند ہوئی ہے۔ ان میں حدیث و تفسیر کے کچھ پہلو، مسائل فقہ، رموزِ طریقت، ادبی نکات، اپنی اور اپنے والد ماجد نیز دیگر بعض مشاہیر کی غزلیں، موقع و محل کی ابیات اور معلوماتِ عامہ کا ذخیرہ اپنے حافظہ کی مدد سے پیش فرمایا گیا ہے۔ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ایسی ظرافت بھی جھلکتی ہے کہ گلستانِ سعدی کے باب پنجم

وشتم کا مزہ آجائے۔ ان ملفوظات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ۷۴-۷۵ سال کی عمر میں جب کہ گوناگوں امراض لاحق ہیں، بصارت کبھی کی جاچکی ہے، ضعف بڑھ رہا ہے لیکن حافظہ شباب پر ہے، طبیعت جوان ہے اور دل زندہ ہے۔ وہ شاہ عبدالعزیزؒ جن کا دل مدت سے مسلمانوں کے انتشار، مسلم حکومت کے زوال، نیز غلط طاقتوں کے غلبہ واقتدار کی وجہ سے غمگین ہے اور جو عالم شباب میں اپنے چچا کو خطوط تحریر فرماتے تھے تو صفحۂ قرطاس پر ان کا سوزِ دروں نمایاں ہو جاتا تھا، عالم پیری میں ان کا ضبطِ غم کمال کو پہنچ گیا ہے اور وہ اپنی مجلس کے اندر "خندہ برلب" اور "آتش پارۂ دل" نظر آتے ہیں۔ بہرحال اب میں ملفوظات کی تلخیص پیش کرتا ہوں۔

فرمایا — کہ باعتبار سورۃ، آخری سورۃ اذا جاءَ ہے جس کو سورۂ نصر اور سورۂ فتح بھی کہتے ہیں۔ اس سورۃ میں معناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر ہے۔ یعنی جب ہر طرح کی نصرت ہماری طرف سے آپ کو پہنچ گئی اور مقصدِ بعثت انجام پاگیا تو اب ہمارے پاس آجائیے۔

فرمایا — کہ مقصدِ چشتیاں، قوتِ عشق کا بروئے کار لانا اور اُبھارنا ہے، اس کے لئے جو اُمور، ممد ومعاون ہوں اُن کو اختیار کرتے ہیں جیسے ذکر جہر وغیرہ۔ اور اس کے لئے جو چیزیں مضر ہیں اُن سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب عشق حاصل ہو گا تو "حضور و انکسار" وغیرہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا — مقصود نقشبندیاں — احضارِ نقشِ دلدار اور تصحیح خیال ہے، لہٰذا جو چیزیں اس کے لئے معاون ہیں اُن کو اختیار کرتے ہیں اور جو مُضر ہیں اُن سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "استقرارِ حضور" سے فنا وبقا اور عشق سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ مقصود قادریاں — تصقیل (صیقل کرنا) اور انکسارِ نفس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب دل صاف ہو گیا تو اُس کے مقابل میں جو کچھ ہے وہ جلوہ گر ہو جائے گا۔

سید احمد (شہید رائے بریلوی) جو کہ بزرگ زادۂ ساداتِ قطبی ہیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے مرید وخلیفہ ہیں، جن کے بارے میں حضرت والا فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت سید آدم بنوریؒ

کی نسبت "باستقرار تام"۔ اللہ تعالےٰ نے۔ ان کو عطا فرمائی ہے اور بہت سے لوگ دہلی میں ان کی روحانیت سے مستفیض ہوئے ہیں۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے دریافت کیا کہ لفظ اللہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ جواباً ارشاد فرمایا کہ منگل کے دن میں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ کی تفسیر میں کہا تھا کہ اللہ ایسی ذات کا نام ہے جو جامع جمیع صفاتِ کمالیہ ہے اور وہ حضرت حق جل مجدہ کی ذات ہے ـــ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ سے منقول ہے کہ یہی اسم اعظم ہے۔ بشرطیکہ اس نام کے پڑھنے والے کے دل میں ماسوا کا دخل نہ ہو۔ پھر انہوں نے (سید احمد قطبی شہید نے) عرض کیا کہ مجھے تمام اسماءِ الٰہی میں اسی اسم (اللہ) سے اطمینان و سکون زیادہ حاصل ہوتا ہے ـــ ارشاد فرمایا کہ شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ جو کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے چچا اور پیر و مرشد ہیں ـــ ان کا معمول تھا کہ جب کوئی مُرید شغلِ باطن کی درخواست کرتا تھا تو اس کو اپنے سامنے بٹھا کر اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام تلاوت کرتے تھے۔ معانی کے ساتھ اور اُن معانی کی تشریح کے ساتھ۔ ـــ اور جس نام سے مرید زیادہ لذت یاب اور مانوس محسوس ہوتا تھا اس کو وہی نام تلقین کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ اسم اللہ تک پہنچاتے تھے ورنہ فرما دیتے تھے کہ (علاوہ فرائض کے) تم تسبیح و تلاوت، نفل اور خدمتِ فقرا میں مشغول رہو۔

پھر فرمایا کہ تمام اسماء اسی اسم میں داخل ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ باش کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پذیر ہوتے ہیں)۔

ایک مرید نے عرض کیا حضرت، اطمینان کے کیا معنیٰ ہیں ـــ فرمایا دل کا چین اور خطراتِ پریشان سے دل کا یکسو ہو جانا، یعنی خاطر جمعی۔

ایک مرید مشی (چہل قدمی) کے وقت آپ کے راستے سے اینٹ پتھر کے ٹکڑے (جن سے ٹھوکر لگنے کا خوف تھا) دور کرتا جاتا تھا، فرمایا میاں تکلیف نہ اٹھاؤ۔ پھر فرمایا حدیث میں اس عمل کو شعبۂ ایمان اور موجبِ ثواب فرمایا گیا ہے۔

رات کے وقت چہل قدمی فرما رہے تھے۔ ایک جوان اس وقت ملاقی ہوا شفقت کے ساتھ اس کی طرف ملتفت ہوئے اور چند لطائف بیان فرمائے، منجملہ ان کے ایک یہ

لطیفہ بیان فرمایا کہ عبد اللہ نامی ایک (سنّی) امیر نواب شجاع الدولہ کا رفیق و مصاحب تھا۔ ایک دن نواب صاحب نواحِ جون پور میں شکار کھیلنے گئے، ایک خرگوش کے پیچھے ایک شکاری کتّا چھوڑ دیا گیا، کتّے نے خرگوش کو پکڑ لیا اور چونکہ وہ کتا سکھایا ہوا تھا، اس لئے اس نے خرگوش کو خود نہیں کھایا فقط سونگھا۔ نواب شجاع الدولہ نے (خرگوش کے بارے میں اپنے مسلک یعنی حرمت کو پیش نظر رکھ کر بطور طعن) کہا عبد اللہ! دیکھو خرگوش کو کتا بھی نہیں کھاتا، عبد اللہ نے برجستہ جواب دیا، جی ہاں میں نے دیکھ لیا بیشک خرگوش کو کتا نہیں کھاتا۔

فرمایا۔ اولیاء چار قسم کے پائے جاتے ہیں۔

(۱) مستغرق۔ جیسے شیخ عبد الحق ردولویؒ اور شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ۔

(۲) اہلِ خدمات جیسے اقطاب۔

(۳) اہلِ تجرید و تفرید۔

(۴) عُرفاء جو کہ ہر مظہر میں حق کا مشاہدہ اور تحقیقِ اشیاء کرتے ہیں۔ جیسے شیخ اکبرؒ اور حضرت مجددؒ۔

ایک مُرید نے عرض کیا کہ بعض اعمال برائے رفعِ حاجات دینی و دنیوی جو احادیث میں آئے ہیں۔ مثلاً نماز (حاجت) یا دُعائیں وہ اعمال اس زمانے میں (فوراً) اپنی تاثیر کیوں نہیں دکھاتے۔ ارشاد فرمایا کہ علماء نے اس کا جواب تین طریقے سے دیا ہے۔

(۱) شرائط قبولیت مفقود ہیں۔ جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔

(۲) ان احادیث میں یہ آیا ہے کہ اس دُعا کا یہ خاصہ ہے یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ایسا ہی ہو جائے گا (کبھی کبھی مصلحت کے ماتحت اس دُعا کو قبول نہیں بھی فرماتے) اگر (سائل کی مرضی کے مطابق) ہر دُعا قبول کر لی جائے ایک محذورِ عظیم لازم آئے گا۔ مثلاً ایک شخص دُعا کر کے آب و بارش چاہتا ہے دوسرا اپنی کسی وقتی مصلحت کی وجہ سے بارش نہ ہونا چاہتا ہے۔ اسی پر اور باتوں کو قیاس کر لو۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے اور یہی تحقیقی جواب ہے کہ کثرت ظلماتِ گناہ کے سبب سے نورانیتِ دُعا اپنا کھلا ہُوا نتیجہ اور فائدہ برآمد نہیں کر رہی ہے۔

دیکھو موسم برسات میں اگر اندر خشک جگہ میں بھی سامان رکھا ہو تو اس میں (کچھ نہ کچھ) نمی اور تری کا اثر آجاتا ہے، یبوست، چنداں اپنا کام نہیں کرتی اور موسم گرما میں اس کے برعکس ہے۔ اسی طرح جب فضا ظلماتِ معاصی سے پُر ہوتی ہے تو استجابتِ دُعا کم ہوتی ہے، یا ہوتی ہے مگر مفہوم نہیں ہوتی یا کبھی اللہ تعالیٰ قدرے دعا قبول کر لیتا ہے۔

میر احمد علی شاہ نے عرض کیا کہ حضرتِ والا نے بعد ختمِ قرآن متصلاً پھر قرآن شروع فرمایا اس کی اصل کیا ہے؟ ارشاد فرمایا حدیث میں آیا ہے۔ بہترین عمل (منزل پر) اُترنا اور پھر سفر کے لئے کمر کس لینا ہے، یعنی جب قرآن شریف ختم کرے تو پھر شروع کر دے۔ (اذکار نووی میں یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس حدیث کے آخر میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سوال کیا کہ اُترنے اور سفر کرنے سے کیا مُراد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قرآن کا ختم کرنا اور پھر شروع کرنا)۔ اسی دوران میں فرمایا کہ مجھ کو قرآن مجید کے اندر جو معنی ہائے عجیب وغریب بہم پہنچتے ہیں اور اُن کی جس قدر آمد ہوتی ہے حدیث میں اتنے معانی کی آمد نہیں ہوتی۔ حدیث شریف کا مطلب و مفہوم (زیادہ تر) موافقِ کتب (شارحینِ حدیث) بیان کرتا ہوں۔

ایک مرید نے عرض کیا تین دن ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے خواب کے اندر آپ کی شکل میں دیکھا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر توجہ مبذول فرما رہے ہیں۔ میں بہت ہی لذت یاب اور مسرور ہُوا اور قلب اس وقت سے سبک اور ہلکا ہو گیا ہے۔ (ابھی اس خواب کے متعلق حضرت شاہ صاحب کچھ فرمانے نہ پائے تھے کہ) ایک دوسرے مرید نے خواب ہی کے بارے میں ایک اور بات دریافت کر لی۔ حضرتؒ نے اس کا جواب دیا۔ پھر پہلے شخص نے جس نے اپنی خواب بیان کی تھی، عرض کیا۔ میرے خواب کی تعبیر کیا ہوئی۔ فرمایا، بھائی میں

توسگِ کوئے آنحضرتؐ ہوں (یعنی فی نفسہٖ تمہاری خواب صحیح ہے، لیکن میری شکل میں جو تم نے زیارت کی میں اس قابل کہاں تھا۔ یہ تمہارے اُس حسنِ ظن کی بات ہے جو میرے ساتھ رکھتے ہو اور خواب کا اتنا حصہ حُسنِ ظن کا اثر ہے)۔

مجلس میں ایک شخص نے سوال کیا۔ عقیقہ فرض ہے؟ ارشاد فرمایا، نزد ابو حنیفہؒ و شافعیؒ و مالکؒ سنت ہے اور نزد احمدؒ فرض ہے۔

فرمایا۔ کچھ عرصہ ہؤا ایک شیعی درگاہِ سلطان المشائخ میں وارد ہؤا، شہر کے فضلار، علمار، فقرار اور عوام و خواص درگاہ میں حاضر ہوتے ہی ہیں، اس نے شہر کے بعض فضلار سے سوال کیا کہ ایک نومسلم ہے وہ بعد قبولِ اسلام آخر کس مذہب و مسلک کو اختیار کرے اور وہ کیسے جانے کہ کون سا مذہب حق ہے؟ اگر طلبِ علم کرے تو ایک مدت درکار ہے اور انجام کے لحاظ سے خطرات ہیں۔ بعض نے اس کا جواب کچھ دیا، بعض نے کچھ۔ ایک جواب یہ دیا گیا کہ فریقین کی متفق علیہ اور مختار باتوں کو اختیار کر کے تحصیل علم کرتا رہے اور تحصیلِ علم کے بعد جس کے راستے کو اچھا جانے اس پر چلے۔ آخر یہ مسئلہ بندے کے سپرد کیا گیا۔ جب لوگ میرے پاس آئے تو اس (نو وارد) شخص کو بھی اپنے ہمراہ لائے۔ میں نے کہا کہ وہ نومسلم چھ باتوں سے جان لے کہ (مسلمانوں میں) مذہب حق کون سا ہے۔ اوّل یہ دیکھے کہ مکہ جہاں خانۂ خدا ہے وہاں کون سا طریقہ جاری ہے اور کون سا طریقہ ناپید ہے، دوسرے مدینہ میں کون سا مسلک و مذہب ہے؟ تیسرے قرآن کس کو محفوظ ہوتا ہے اور کس کو نہیں۔ چوتھے بعد نبوت، ولایت کس فرقے میں جاری ہے۔ پانچویں عید و جمعہ (کا اہتمام) کہاں ہے۔ چھٹے ہندوستان میں جہاد فی سبیل اللہ کس نے رائج کیا اور یہ سلطان محمود غزنویؒ اور شہاب الدین غوری کون تھے؟

ارشاد فرمایا کہ غازی الدین خاں جو اچھے شاعر تھے کہا کرتے تھے کہ جس شعر میں معنیٰ نہ ہوں (مہمل ہو) اس کو (خواہ مخواہ کھینچ تان کر کے) تصوّف میں لے جاؤ معنیٰ پیدا کر لے گا۔

ایک مُرید نے عرض کیا کہ بعد عصر سورۂ عم یتساءلون کی تلاوت کو بزرگوں نے

مورث وموجب محبتِ الٰہی بتایا ہے، کیا حدیث میں بھی یہ بات آئی ہے یا فقط بزرگوں کا تجربہ ہے؟ فرمایا کہ یہ بات حدیث میں نہیں ہے۔

سید احمد (شہیدؒ) کے بارے میں جو کہ حضرت کے بڑے خلفاء میں سے ہیں اور جن کا ذکرِ خیر اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ بعض حاضرینِ مجلس نے عرض کیا کہ ان کو جو حضرت والا کے ساتھ فنائیت وعشق ہے اس کی وجہ سے ہم کو بھی ان سے بہت محبت پیدا ہوگئی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ ہاں وہ بندے سے خالص محبت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔ یہ خالص محبت ہونا اختیاری بات نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

یا دل بکہ باید داد، یا دل زکہ باید بُرد

دل دادن و دل بردن ایں امر خداداد است

(یعنی کس کو دل دینا چاہیئے اور کس سے دل لے لینا چاہیئے، یہ دونوں باتیں خداداد ہیں بندے کے اختیار میں نہیں ہے)۔

ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو علم کی دولت یا کوئی اور نعمت عطا فرمائے تو اس کو چاہیئے کہ اس نعمت کی ترویج واشاعت کا اہتمام کرکے اس نعمت کو مزید کرلے۔

مولوی امام الدین[عہ] جو کہ روساء کٹرہ مانک پور سے تھے اپنے بھائی مولوی نظام الدین کی تلاش میں آئے تھے۔ انھوں نے فراقِ پسر میں اپنی والدہ کی بے قراری کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ جب حضرت یوسف علیہ السّلام اپنے والدِ ماجد حضرت یعقوب علیہ السّلام سے جدا ہوئے تو صرف اس جدائی کا قلق اتنی کشش نہیں رکھتا تھا کہ بیٹے کو کھینچ لیتے اور پا لیتے، پھر جب دوسرے بیٹے کی جدائی کا قلق بھی شامل حال ہوگیا تو پھر اتنی قوت پیدا ہوگئی کہ دونوں سے ملاقات ہوگئی۔ (مطلب یہ کہ تمہارے فراق کا اثر بھی تمہاری والدہ پر ہوا ہوگا اس سے امید ہے کہ نظام الدین تمہارے ہمراہ والدہ کے پاس پہنچ جائیں)۔

عہ ترجمۂ کراچی میں اس نام پر فٹ نوٹ دے کر ظاہر کیا ہے کہ یہ مولانا قاری امام الدین نخشبی امروہی ہیں۔ کہاں کٹرہ مانک پور کہاں امروہہ کوئی تُک بھی ہو۔

فرمایا کہ — مثل والد صاحب (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کے میں نے کسی کا حافظہ نہیں دیکھا، ہاں سُنا ضرور ہے، چنانچہ شعبی کے حافظے کے واقعات، جن کی روایت بخاری میں جا بجا آئی — عبد الملک بن مروان حاکم وقت نے ایک مرتبہ ان کے حافظے کا امتحان اس طرح لیا کہ ان کو اپنے پاس بلوایا اور ملکِ عراق کے چار صوبوں کے دیہات و پرگنات کا حساب جمع و خرچ کاغذ سے ان کے سامنے پڑھا اور چند دن کے بعد ان کو طلب کر کے اس جمع و خرچ کی تفصیل زبانی دریافت کی۔ مطابق رجسٹر کے ان کے حافظے میں تفصیل موجود تھی، سب سُنا دی — اس کے بعد امام ترمذیؒ کے حافظے کا واقعہ سُنایا۔ اسی ضمن میں کسی نے مولوی راشد بنگالی کا ذکر کیا کہ وہ اس قدر ملکہ رکھتے تھے کہ سبق بھی پڑھاتے جاتے ہیں اور مسودہ بھی لکھتے جاتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بات کثرتِ مزاولت اور مشق سے تعلق رکھتی ہے، اگرچہ حافظہ اور ذہن بھی شرط ہے۔ پھر اسی ضمن میں ایک حیرت انگیز واقعہ اپنے بچپن کا سنایا۔ پھر فرمایا کہ شاہ محمد عاشق (پھلتی) جو کہ والد ماجد کے شاگرد اور خلیفۂ اعظم تھے اور سبیل الرشاد وغیرہ کتب کے مصنّف بھی تھے، ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک شاگرد کو بڑی محنت سے پڑھا رہے ہیں اور عین مشغولیتِ درس میں ان کی نسبتِ باطنی انتہائی جوش پر ہے۔ (مسلسل)

لمحات
(عربی)

شاہ ولی اللہؒ کے فلسفۂ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پُرانا قلمی نسخہ ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب اُمور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت :- دو روپے

آج کے الجزائر کی ایک جھلک

(یہ مضمون کویت کے ماہنامہ العربی کے ایک مقالے کا ترجمہ ہے
یہ مقالہ العربی کے فروری ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ مدیر)

نحن جُندٌ فی سبیل الحق ثرنا   والی استقلالنا بالحرب قمنا
لم یکن یصغی لنا لما نطقنا   فاتخذنا رنة البارود وزنا
وعزفنا نغمة الرشاش لحنا   وعقدنا العزم ان تحیا الجزائر
فاشهدوا . . . فاشهدوا . . . فاشهدوا

(ہم سپاہی حق کی راہ میں اُٹھے ہیں اور اپنی آزادی کے لئے ہم نے جنگ کی ہے۔ جب ہم بولتے تھے کوئی ہماری طرف دھیان نہیں دیتا تھا پس ہم نے بارود کی آواز سے اہمیت بنائی اور مشین گن کے نغمے میں ہم گائے اور ہم نے یہ عزم کیا کہ الجزائر زندہ ہو گا۔ پس اس کے گواہ رہنا۔ پس اس کے گواہ رہنا۔ پس اس کے گواہ رہنا۔)

تم الجزائر میں جہاں بھی جاؤ گے، اور جس طرف کا بھی رُخ کرو گے، یہی نغمہ سنو گے۔ آج یہ نغمہ نوجوان، ادھیڑ عمر والے اور بچے سب گاتے ہیں جب کہ وہ اپنے انقلاب

کے دوسرے مرحلے، یعنی استحکام اور تعمیر کے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔

ان شہیدوں کے ناموں کو زندہ رکھنے کے لئے جنہوں نے الجزائر کی آزادی کے لئے جانیں دیں، سب سے پہلے یہ کیا گیا کہ سڑکوں، بازاروں، میدانوں اور دوسرے مقامات کے فرانسیسی نام ختم کر کے اُن سب کو شہیدوں کے ناموں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

الجزائر کو یورپ سے بحیرۂ روم جدا کرتا ہے اور افریقہ کے وسط اور جنوب سے اُسے وسیع و عریض، خشک اور جلتے ہوئے صحرائے اعظم نے الگ کر رکھا ہے، جس طرح اُس کو سمندر کے پانیوں اور صحرا کے ریگ زاروں نے گھیر رکھا ہے۔ اسی طرح اُسے اپنی تاریخ سے سختی، جبر و تشدد اور خشکی ورثے میں ملی ہے۔ الجزائر کی تاریخ کوئی ۲۸۲۳ سال پیچھے کو جاتی ہے، جس کی مختصراً تفصیل یہ ہے کارتھیجین (قرطاجنہ) یہاں ۸۶۰ قبل مسیح میں آئے اور ۱۴۷ سال تک ان کا دور دورہ رہا۔ رومی ۱۴۵ قبل مسیح میں یہاں پہنچے اور ۵۸۴ برس تک اُن کی حکومت رہی۔ یورپ کے وحشی قبائل ونڈالی نے ۴۳۹ء میں اِدھر کا رُخ کیا اور ۱۰۰ برس یہاں رہے۔ اس کے بعد ان کے جانشین بازنطینی بنے جو ۵۳۸ء میں آئے اور ۱۱۲ سال تک وہ یہاں کے حاکم رہے۔ عرب ۶۵۰ء میں آئے جن کی وجہ سے الجزائر نے عربیت کو اپنا لیا، اور وہ عربی بن گیا۔ ۱۵۱۵ء میں عثمانی ترکوں کو یہاں اقتدار حاصل ہوا، جن سے فرانسیسیوں نے سنہ ۱۸۳۰ء میں حکومت لی۔ اور ان سے ۱۹ مارچ ۱۹۶۲ء کو ۱۳۲ سال کے بعد یہ ملک آزاد ہوا۔

فرانسیسی عہد میں اسّی فی صد فرانسیسی اور دوسرے غیر ملکی الجزائر کے شہروں میں رہتے تھے۔ صرف الجزائر شہر کی کل آبادی میں سے جو ۹۹۱۷۸۳ تھی، فرانسیسی اور غیر ملکی ۳۳۷۵۵۹ تھے۔ اور یہ سب الجزائر شہر کے نئے حصے میں رہتے تھے، جہاں شاندار عمارتیں، کشادہ سڑکیں اور خوبصورت باغ تھے۔ الجزائری شہر کے پرانے حصے میں جسے "قصبہ" کہتے ہیں، اور جس کی گلیاں تنگ اور مکان ایک دوسرے سے

ملے ہوئے ہیں، رہتے تھے۔

الجزائر میں گزشتہ آٹھ سال تک فرانسیسی فوجوں نے جو تباہ کُن لڑائی جاری رکھی، اس نے جزائریوں کے ذہن اور ان کے روزمرہ کے اعمال پر بڑے واضح اثرات چھوڑے ہیں۔ چنانچہ اب بھی جب ایک جزائری گھر سے نکلتا ہے تو وہ گھر والوں کو اس طرح الوداع کہتا ہے کہ شاید وہ زندہ واپس آجائے یا کہیں راستے میں مارا جائے۔ اور اگر وہ وقت مقررہ پہ واپس نہ آئے، تو گھر والوں کو اس کی سلامتی کے متعلق تردد ہونے لگتا ہے۔ مسلسل آٹھ سال تک اس ملک میں موت اور زندگی اس طرح ایک دوسرے سے متصل رہی ہیں کہ لوگوں کو دونوں ایک سی لگتی ہیں۔

آزادی کے بعد جب فرانسیسی الجزائر سے نکلے، تو جو کچھ ان کے ہاتھ لگا، وُہ یہاں سے لے گئے، وہ تمام مال و دولت لے گئے، تمام یہاں کے قیمتی آثار لے گئے۔ دفتروں کے فائل لے گئے، یہاں تک کہ وہ زرعی آلات لے گئے، لیکن جو چیز وہ نہ لے جاسکے، وہ الجزائر کی زمین ہے۔ گزشتہ نومبر تک یہ حالت تھی کہ بہت سی دکانیں بند تھیں۔ وہ فرانسیسی جو جزائریوں کے خلاف خفیہ تنظیموں میں حصہ لیتے تھے، وہ اس ڈر سے کہ جزائری اُن سے بدلہ لیں گے، اپنے مکان، اپنی دکانیں اور قہوہ خانے اُسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے، جس حالت میں کہ وہ تھے۔ ہم نے میدان بادیس میں ایک قہوہ خانہ دیکھا جس میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر چائے کے برتن پڑے تھے، اور اس میں کوئی آدمی نہ تھا۔

آزادی کے بعد حکومت الجزائر نے ایک قانون بنایا ہے، جس کی رُو سے اگر کوئی فرانسیسی، ۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء تک واپس نہ آئے، تو اُس کی جائداد بحق حکومت ضبط کرلی جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد بعض فرانسیسی تو واپس آگئے، لیکن بعض نے واپس آنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کے ہاتھ جزائریوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

الجزائر کے دارالسلطنت الجزائر شہر کے تقریباً ہر میدان میں سنگ مرمر یا

دوسرے پتھر کے پائے نظر آئیں گے۔ جن کے اوپر سے مجسمے غائب ہیں، فرانسیسی جاتے وقت یہ سب مجسمے لے گئے ہیں۔ جب جزائری مجاہد فرانس کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، تو فرانسیسی دہشت پسندوں نے الجزائر یونیورسٹی میں آگ لگا دی تھی۔ یہ آگ سات دن تک رہی۔ اس میں یونیورسٹی کی عمارتیں اور لیبارٹریاں جل کر خاک سیاہ ہو گئیں، اور سب سے بڑا نقصان یونیورسٹی کی لائبریری کو پہنچا۔ اس میں کوئی چھ لاکھ کتابیں تھیں، جن میں بعض نادر مخطوطات تھے۔ صرف لائبریری کے نقصان کا اندازہ ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کا لگایا گیا ہے۔ یہ آگ فرانسیسی دہشت پسندوں نے ۷، جنوری ۱۹۶۲ء کو لگائی تھی۔

فرانسیسیوں نے الجزائر کو زبان، تہذیب اور آبادی کے لحاظ سے فرانسیسی بنانے کی کوشش کی تھی۔ جزائری رہنما محمد خیضر نے ہمیں بتایا کہ ہزار میں صرف ایک جزائری اچھی طرح عربی پڑھ سکتا اور لکھ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک بھی عربی کا روزنامہ نہ تھا۔ ہماری عورتیں تک فرانسیسی اور اسپینی بولتی تھی۔ دراصل فرانس ہماری عربی روح کچل دینا چاہتا تھا، اور اسی کے خلاف ہم نے بغاوت کی۔ ۱۹۵۹ء میں ثانوی مدارس میں غیر ملکی طالب علموں کے مقابلے میں جزائری طالب علموں کی تعداد ایک چوتھائی سے بھی کم تھی۔

جدوجہد آزادی میں مردوں کے پہلو بہ پہلو جزائری عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ بہت سی مجاہدہ عورتوں کو فرانسیسیوں نے بغیر ان پر مقدمہ چلائے مار ڈالا تھا۔ ایک خاتون جمیلہ جسے فرانسیسیوں نے بڑی اذیتیں دی تھی، اخبار نویسوں سے اکثر کہتی ہے کہ میں اکیلی نہیں ہوں، جس نے فرانسیسیوں کی سختیاں سہیں، میری طرح اور بہت سی خواتین تھیں جو اس میں پیش پیش تھیں ایک خاتون اور یدا امداد تھی، جسے سخت عذاب دینے کے بعد چھٹی منزل سے گرا کر مار دیا تھا۔ ایک لڑکی یمینہ عبید تھی، جو بم لے کر جا رہی تھی، وہ بم اُس کے بیگ میں پھٹ گیا جس سے اس کے دونوں پاؤں اور ہاتھ اُڑ گئے، وہ زندہ ہے اور نیویارک میں اس کا علاج ہو رہا ہے۔ ہم الجزائر میں چار ایسی خواتین سے ملے

جنہیں موت کی سزا کا حکم سنایا گیا، لیکن بعد میں عالمی رائے عامہ کی وجہ سے یہ سزا نہ دی جا سکی۔

الجزائر میں کوئی تین لاکھ یتیم بچے ہیں۔ وہ ان شہیدوں کی اولاد ہیں، جو فرانسیسیوں کے مظالم کا نشانہ بنے، الجزائری خواتین کی بعض انجمنیں ان بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

الجزائر کا رقبہ فرانس سے چار گنا ہے، لیکن اس کی آبادی صرف ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ شمال میں بحیرہ روم سے جو متصل علاقہ ہے اس میں رہتا ہے جس کا رقبہ دو لاکھ دس ہزار مربع کیلومیٹر سے زیادہ نہیں۔ اور کوئی آٹھ لاکھ پچیس ہزار افراد جنوب کے صحرائی خطے میں رہتے ہیں، جس کا رقبہ اکیس لاکھ اکہتر ہزار مربع کیلومیٹر ہے۔ الجزائر کی آبادی بڑی سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ ہر سال آبادی میں دو لاکھ نفوس کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح ۱۹۸۰ء تک الجزائر کی آبادی دو کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اب مشکل یہ ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے زرعی زمین نہیں۔ اور بجائے اس کے کہ قابل کاشت زمین میں اضافہ ہو، وہ خشکی کی وجہ سے کم ہو رہی ہے۔

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں الجزائر میں آباد یورپیوں کی تعداد دس لاکھ بیالیس ہزار پانچ سو تھی۔ ان میں فرانسیسیوں کے علاوہ اسپینی اور اطالوی بھی تھے۔ اور اسی طرح دوسرے یورپی ملکوں کے آبادکار بھی تھے۔ کیونکہ فرانس نے یورپی مہاجروں کے لئے الجزائر کے دروازے چوپٹ کھول رکھے تھے۔ اب اکثر یورپی واپس چلے گئے ہیں، اور اس وقت الجزائر میں صرف دو لاکھ یورپی ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو الجزائر کی کل آبادی چالیس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔

فرانسیسیوں نے الجزائر میں بڑی کثرت سے انگور کے باغ لگائے تھے، جس سے شراب بنتی تھی۔ اب بھی الجزائر کی بڑی اہم برآمد شراب ہے۔ الجزائر شہر کی بندرگاہ میں ایک بہت وسیع کمرہ ہے جس میں ایک الجزائری مستری جس نے فرانسیسی کی جگہ

لی ہے ایک کل ہلاتا ہے، اور روشنی اسے بتاتی ہے کہ پلاسٹک پائپوں کے ذریعہ گوداموں سے جہازوں میں شراب جا رہی ہے شراب کے یہ جہاز ایسے ہی ہیں جیسے پٹرول کے جہاز (ٹینکر) ہوتے ہیں۔ کمرے میں جو مشین لگی ہوئی ہے وہ ایک وقت میں چار جہازوں کو شراب پہنچاتی ہے۔ اس سے ایک گھنٹے میں ایک لاکھ لٹر (لٹر چار انچ کا مکعب وزن) شراب بھری جاتی ہے۔

الجزائر میں بڑا اچھا لوہا نکلتا ہے۔ وہ فرانس کو برآمد ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئلہ اور پٹرول بھی دساور کو جاتا ہے۔ الجزائر میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر ہیں، امید ہے ان کی مدد سے الجزائر میں صنعتیں لگ سکیں گی۔

الجزائر میں ایک جامع مسجد تھی جو ایک سو بتیس سال تک گرجا رہی، اب اُسے پھر مسجد میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے :۔ ترکوں نے سترھویں صدی عیسوی میں یہ مسجد بنائی، دوسری مساجد کی طرح یہ بھی ایک مسجد تھی۔ جب ۱۸۳۰ء میں فرانسیسیوں نے الجزائر پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس مسجد کو گرجا میں بدل دیا۔ ۱۳۲ سال تک یہ مسجد گرجا کے طور پر استعمال ہوتی رہی، لیکن جب الجزائر آزاد ہوا اور فرانسیسی اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا، تو اس گرجے کو دوبارہ مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس میں پہلی نماز ۲ رنومبر ۱۹۶۲ء کو جمعہ کے دن صبح کو ادا کی گئی۔ اس موقع پر ایک شاندار تقریب ہوئی جس میں کثیر التعداد لوگ شریک ہوئے، اور اُن میں پیش پیش صدر جمہوریہ بن بیلا تھے۔ اس کے علاوہ تمام عرب ملکوں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ حکومت الجزائر کے وزیر اوقاف سید توفیق المدنی نے اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

یا ارواح الشهداء اليكم تقدم الجمهورية الجزائرية هذا المسجد وذكراكم باقية فى قلوبنا۔ ان الدماء الحرة قد اثمرت جزائر حُرة مستقلة۔

(اے شہیدوں کی روحو! جمہوریہ الجزائر اس مسجد کو تمہارے حضور میں پیش کرتی

ہے اور تمہاری یاد ہمارے دلوں میں باقی ہے۔ آزاد خونوں نے آزاد الجزائر کو جنم دیا ہے)۔

اس گرجا کو جو اصل میں مسجد تھی، اور بعد میں فرانسیسی تسلط کے زمانے میں اسے گرجا بنا دیا گیا تھا مسیحی کلیسا کے ارباب اقتدار کی اجازت سے دوبارہ مسجد میں منتقل کیا گیا ہے۔ گرجے کو ایک دوسری عمارت میں جو نئے طرز کی ہے، اور خاص طور سے گرجے کے لئے تعمیر کی گئی ہے منتقل کر دیا گیا ہے۔

الجزائر شہر میں ایک بہت بڑی جامع مسجد ہے، جو اس شہر کی قدیم ترین جامع مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس جامع مسجد کا بانی کون تھا، یہ معلوم نہیں۔ ظن غالب یہ ہے کہ اس کی تعمیر ۴۰۷ھ — ۴۷۵ھ کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ اس جامع مسجد کی مرمت ۷۲۳ھ میں کی گئی۔ مسجد کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہیں ؎

قابلنی بدر السماء وقال لی — علیك سلامی ایها القمر الثانی

فلا منظر یسبی النفوس کمنظری — الا فانظروا حسنی و بهجة تیجانی

فزاد الٰهی رفعة لمعمر — کما زاد فی شانی وفی رفع ارکانی

ترجمہ: "بدرِ فلک مجھ سے ملاقی ہوا اور اس نے مجھ سے کہا اے قمرِ ثانی! تمہیں سلام ہو۔ کوئی ایسا منظر نہیں۔ جو میری طرح نفوس کو گرویدہ کرے۔ پس میرا حُسن دیکھو اور میرے تاجوں کی رونق دیکھو۔ اے میرے اللہ معمر کی رفعت زیادہ کر، جیسے اس نے میری شان اور میرے ارکان کی رفعت زیادہ کی ہے)۔

جدوجہد آزادی کے دوران فرانسیسی دہشت پسندوں نے جب دیکھا کہ اب فرانس کو الجزائر سے نکلنا ہی پڑے گا تو انہوں نے ملک کے ہر فلاحی ادارہ کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ الجزائر شہر کی یونیورسٹی کو جلانے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۲ء کو ان دہشت پسندوں نے الجزائر شہر کے سب سے بڑے ہسپتال "مستشفی مصطفیٰ" کو آگ لگا دی۔ جب یہ آگ ہسپتال کے زچہ بچہ وارڈ

تک پہنچی تو بڑی ہڑبونگ مچ گئی۔ اور لوگوں نے بچوں کو اُن کے "بیڈوں" سے اٹھا اٹھا کر بھاگنا شروع کیا۔ اس افراتفری میں بچے آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اور بعد میں والدین کے لئے یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ ان کے کون سے بچے ہیں۔ اب تک دس بچے ایسے ہیں جن کے ایک سے زیادہ دعوے دار ہیں۔

الجزائر کے تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں پر فرانسیسی اہل کار قابض تھے۔ انہوں نے جہاں اہل جزائر کو تعلیم سے محروم رکھا وہاں یہ کوشش بھی کی کہ اہلِ جزائر حکومت کا نظم و نسق چلانے کا کوئی تجربہ حاصل نہ کریں تاکہ جب فرانس کا عمل دخل ختم ہو تو الجزائر کا سارا نظام ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ مثال کے طور پر الجزائر کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں تین سو فرانسیسی اہل کار تھے۔ جب الجزائری حکومت نے ان دونوں اسٹیشنوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو سب فرانسیسی اہل کاروں نے استعفیٰ دے دیا، اور کام پر نہیں آئے۔ حُسنِ اتفاق سے ساٹھ الجزائری ایسے تھے جو مجاہدین کے ساتھ پہاڑوں میں آزاد ریڈیو کا کام کرتے تھے، وہ فوراً پہنچ گئے، اور ان ساٹھ نے تین سو کی جگہ لے لی، اور اس طرح الجزائر کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن بند نہ ہوا۔

الجزائر میں بغاوت کا شعلہ یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو بلند ہوا تھا۔ اس دن الجزائر کے مختلف حصوں میں اور خاص کر اس کے صوبہ قسطنطینہ اور اوراس میں بندوقوں کے پہلے فائر ہوئے جو اس بات کی علامت تھے کہ الجزائر میں فرانسیسی حکومت کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔ اور یہ کہ الجزائری اپنی آزادی کا حق لے کر رہیں گے۔ گو اس وقت مجاہدین کی بندوقیں معمولی شکار کی بندوقیں تھیں، لیکن اُن کا زیادہ بھروسہ بموں اور ڈائنامیٹوں پر تھا۔

پورے آٹھ سال کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۲ء کی صبح کو خود مختار آزاد مملکت الجزائر کی پہلی فوجی پریڈ ہوئی۔ اس پریڈ میں سب سے آگے آگے شروع کے مجاہدین تھے یہ عام لباس پہنے ہوئے تھے، اور اپنے گدھوں اور اونٹوں کے ساتھ مارچ کرتے

نظر آئے - اس کے بعد الجزائری فوج کے جدید دستے آئے، اور ان کی تنظیم اور مستعدی نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا - اس موقع پر الجزائر شہر کی بندرگاہ سے دو سرنگیں صاف کرنے والے سمندری جہازوں کی توپوں نے سلامی دی - یہ دو جہاز اور چھ بم بار طیارے متحدہ عرب جمہوریہ نے جمہوریہ الجزائر کو تحفے میں دیئے تھے تاکہ یہ خود الجزائری بحریہ اور ہوائی فوج کی بنیاد بن سکیں -

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ان دونوں بحری جہازوں کا ایک تہائی عملہ الجزائری تھا، جسے اسکندریہ کے بحری کالج میں تربیت دی گئی تھی -

---

تیسری صدی کے حافظ الحدیث

عبد بن حمید بن نصر الکسی السندی

مولانا حافظ محمد اسمٰعیل کھڈوی

آپ تیسری صدی کے مشہور محدثین میں سے ہیں، اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ 'کس' جس کی طرف آپ منسوب ہیں وہ سمرقند کے قریب ایک شہر ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں جیسا کہ علامہ یاقوتی حموی نے اپنی کتاب 'معجم البلدان' میں تصریح کی ہے کہ 'کس' (کچھ) سرزمین سندھ کا ایک مشہور شہر ہے۔ جس کا ذکر مغازی میں بھی آیا ہے۔ اور جو حضرات اس کی طرف منسوب ہیں ان میں سے عبد بن حمید بن نصر الکسی صاحب المسند بھی ہیں[1]۔ بیسویں صدی کے مشہور محقق و مورخ علامہ خیرالدین الزرکلی نے بھی اپنی کتاب 'الاعلام' میں عبد بن حمید کے تذکرہ میں غلطی سے لکھا کہ آپ کس کی طرف منسوب ہیں جو کہ سمرقند کے قریب ایک شہر ہے[2]۔ پھر انہیں جب اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے 'الاعلام' کی دسویں جلد میں اس کی اصلاح کر دی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "مدینہ کس (کچھ) کے بارے (جس کی طرف آپ منسوب ہیں) تصحیح کرلی جائے کہ وہ بلادِ سندھ سے ہے اور یہ وہ شہر نہیں ہے جو سمرقند کے قریب ہے[3]" انہوں نے

---

[1] جلد ۷ صفحہ ۲۵۷ [2] جلد ۴ صفحہ ۴۱ [3] جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۶۔

بھی معجم البلدان کے حوالے سے یہ تصیح کی ہے۔ جس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ آپ سندھی الاصل تھے۔

آپ کا پورا نام عبدالحمید بن حمید ہے مگر عرف عام میں انہیں عبد بن حمید کہا جانے لگا۔ اور محدثین و مؤرخین کے یہاں آپ اسی نام سے مشہور ہوئے[۱]

آپ کا بچپن کیسے گزرا اور ابتدائی تعلیم کس سے پائی اس کا ہمیں کوئی علم نہیں ہوسکا۔ بستان المحدثین سے معلوم ہوا کہ ۲۰۰ھ کے ابتدار میں آپ اپنے وطن سے عازم سفر ہوئے۔ انہیں علم حدیث کے حصول کا شوق ابتدائے جوانی میں ہی پیدا ہوگیا تھا[۲] چنانچہ انہوں نے اس وقت کے محدثین سے اکتساب علم کیا جو دنیائے اسلام کے چوٹی کے شیوخ تسلیم کئے جاتے تھے جن میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

یزید بن ہارون، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن بشر العبدی، ابو داؤد الطیالسی، ابوالولید الطیالسی، ابوالنضر، ابوالنعمان محمد بن الفضل عارم السدوسی، یعقوب بن ابراہیم بن سعد الزہری، ابو عاصم النبیل، جعفر ابن عون، ابو عامر عبدالملک بن عمرو العقدی، ابونعیم، علی بن عاصم، ابن ابی فدیک، حسین بن علی الجعفی، ابواسامۃ، یونس بن محمد المؤدب، سعید بن عامر، احمد بن اسحاق الحضرمی، عمر بن یونس الیمامی، الحسن بن موسیٰ، یحییٰ بن آدم، زکریا ابن عدی، محمد بن بکر البُرسانی، عبیداللہ بن موسیٰ، مسلم بن ابراہیم ہاشم بن القاسم، عبداللہ بن یزید المقرئ، القعنبی، ابو داؤد الحضری، حبان بن ہلال، روح بن عبادۃ، عثمان بن عمر، عبداللہ بن بکر السہمی، عبدالصمد بن عبدالوارث، مصعب بن المقدام، یعلی بن عبید۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار اساتذہ سے انہوں نے تحصیل علم کے سلسلہ میں استفادہ کیا۔

امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں فرماتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے حافظ الحدیث تھے۔ اور قابل اعتماد ائمہ میں سے تھے[۳]

---

۱ بستان المحدثین ص ۱۳۱ ۲ ص ۱۳۱ ۳ ج ۲ ص ۱۱۴ ۔

بڑے بڑے محدثین نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ جن میں امام مسلم بن الحجاج اور امام ابوعیسی الترمذی پیش پیش ہیں۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ۲۶۸ مقامات پر آپ سے روایت کی ہے۔ امام ترمذی نے اپنی جامع میں ۱۵۴ مقامات پر آپ سے روایت کی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں بعض نامور اور شہرۂ آفاق محدثین کے نام یہ ہیں:

امام مسلم بن الحجاج، امام ابوعیسیٰ الترمذی، اور آپ کے صاحبزادے محمد بن عبد، نیز سہل بن شاذویہ، ابومعاذ العباس بن ادریس خرک، بکر بن المرزبان، سلیمان بن اسرائیل الخجندی، شاہ بن جعفر، عمر بن محمد بن عبد بن عامر، ابراہیم بن خریم الشاشی، ابو خزیمہ داؤد بن سلیمان البخاری، ان کے علاوہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ان سے تعلیقاً روایت کی ہے۔

غنجار نے تاریخ بخاری میں لکھا ہے کہ یحیی بن عبدالغفار بیمار تھے تو عبد بن حمید ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور کہا کہ تمہارے بعد اللہ مجھے بھی باقی نہ رکھے، یہ ایک عجیب اتفاق ہوا کہ یحیی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد دوسرے دن ہی اچانک عبد بن حمید بھی فوت ہوگئے۔ اور دونوں کے جنازے اکٹھے اٹھے[۱]

آپ کی وفات ۲۴۹ھ مطابق ۸۶۳ء میں ہوئی۔ صاحب بستان المحدثین نے ۲۴۳ھ لکھی ہے[۲] لیکن اول الذکر تاریخ ہی صحیح ہے۔

آپ کی تالیفات میں دو مسند ہیں، ایک بڑی اور ایک چھوٹی (جو کہ منتخب ہے) اور اس کا سماع ابراہیم بن خریم الشاشی کو حاصل ہے۔ یہ ایک جلد میں ہے مگر بہت سے صحابہ کی مسانید اس میں نہیں ہیں اور یہ متداول اور مشہور ہے[۳] دونوں مسانید کے مختلف نسخے مندرجۂ ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱؎ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۴۵۷ ۲؎ ص ۱۳۱۔

۳؎ الرسالۃ المستطرفۃ ص ۵۷۔

(۱) مسند کا ایک نسخہ (بڑی موٹی جلدیں) خزانہ جامع القرویین میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ اول اور آخر سے پھٹا ہوا ہے[۱]

(۲) دوسرا نسخہ خزانۂ ایا صوفیا (استنبول) میں ہے۔ اس کا نمبر ۸۹۴ ہے[۲]

(۳) ایک اور نسخہ بانکی پور کے کتب خانے میں ہے اس کا نمبر ۶۱۸ ہے اور ۱۵۷ صفحات میں ہے۔ غالباً یہ منتخب کا نسخہ ہے کیونکہ اسی طرح کا منتخب کا ایک نسخہ خزانۂ آصفیہ دکن میں بھی موجود ہے۔ جس کی ابتداء مسند ابی بکر سے ہے اور انتہاء مسند ام ایمن پر ہے۔ اس کے صفحات ۲۵۳ ہیں[۳]

(۴) المنتخب کا ایک اور نسخہ برلن کے کتب خانے میں موجود ہے اس کا نمبر ۲۶۵ ہے[۴]

(۵) المنتخب کا ایک اور نسخہ کوپریلو کے کتب خانے میں ہے۔ اس کا نمبر ۲۵۶ ہے[۵]

(۶) مسند کا ایک اور نسخہ المکتبۃ السندیۃ میں ہے۔ (یہ کتب خانہ شاہ احسان اللہ سندھی کا ہے)[۶]

دوسری تالیف تفسیر ہے جو کہ دیارِ عرب میں مشہور اور متداول ہے[۷] اس کی روایت آپ سے ابراہیم بن خریم نے کی ہے[۸]

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ میں نے تفسیر عبد بن حمید کے ایک جزء کی پشت پر محمد بن مزاحم کے قلم سے لکھا ہوا دیکھا کہ انہوں نے کہا کہ ہم سے بیان کیا عبدالحمید بن حمید نے پھر اسے ذکر کیا ہے[۹]

حافظ ابن حجر کے مندرجۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر عبد بن حمید ان کے زمانے میں موجود تھی لیکن اب ہمیں اس کے بارے میں فی الحال کوئی علم نہیں کہ اس کا کوئی نسخہ کسی لائبریری میں موجود ہے یا نہیں۔ غالباً دنیا کے کسی نہ کسی کتب خانہ میں اس

---

[۱] مجلہ معہد المخطوطات جلد ۵ صہ ۱۵ [۲] تذکرۃ النوادر صہ ۳۷ [۳،۴،۵،۶] تذکرۃ النوادر صہ ۳۸ [۷] بستان المحدثین صہ ۳۱

[۸] تہذیب التہذیب جلد ۶ صہ ۴۵۶ [۹] ایضاً صہ ۴۵۷

کا کوئی نسخہ موجود ہو گا۔ چونکہ ابھی تک ہمیں دنیا کی سب کی سب لائبریریوں کی کتابوں کے بارے میں پورا علم نہیں اور مستقبل میں جب کہ دنیا کی تمام لائبریریوں کی فہرستیں شائع ہو جائیں گی اس وقت اس کے بارے میں صحیح علم ہو سکے گا۔ ان دو تصانیف کے علاوہ آپ کی دیگر تصنیفات بھی ہیں[1] لیکن ان کے نام کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھے۔

حوالہ کے لئے دیکھئے،

(۱) صحیح مسلم، (۲) جامع ترمذی (۳) صحیح بخاری۔ باب دلائل النبوۃ۔
(۴) فتح الباری شرح صحیح البخاری لابن حجر جلد ۶ ص۴۷
(۵) عمدہ القاری شرح صحیح البخاری للعینی جلد ۷ ص۵۴۲
(۶) معجم البلدان۔ یاقوت الحموی الطبعۃ الاولیٰ جلد ۷ ص ۲۵۱
(۷) تذکرۃ الحفاظ۔ للذہبی۔ جلد ۲ ص۱۱۴، ۱۱۵
(۸) الرسالۃ المستطرفۃ للکتانی ص۵۶، ۵۷
(۹) مجلہ معہد المخطوطات العربیۃ (القاہرۃ) جلد ۵ ص۱۵
(۱۰) الجمع بین رجال الصحیحین۔ للقیسرانی جلد ۱ ص۳۳۷، ۳۳۸
(۱۱) تہذیب التہذیب لابن حجر۔ جلد ۶ ص۴۵۵، ۴۵۷
(۱۲) الاعلام۔ خیرالدین الزرکلی۔ الطبعۃ الثانیۃ جلد ۴ ص۴۲ جلد ۱۰ ص۱۱۶
(۱۳) تذکرۃ النوادر من المخطوطات العربیۃ۔ طبعۃ دکن۔ ص۳۷، ۳۸
(۱۴) بستان المحدثین۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی۔

---

[1] بستان المحدثین ص۳۱۔

اسلام کا سماجی نظام

سید رشید احمد ارشد ایم اے
لیکچرر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی

انسان فطری طور پر جماعتی زندگی کا محتاج ہے۔ پیدا ہوتے ہی وہ اپنی بقا و زلیست کے لئے اپنے والدین اور دیگر افرادِ خاندان کا محتاج ہوتا ہے۔ نیز دیگر ضروریات زندگی کے لیے اپنے دیگر رشتہ داروں اور ساتھیوں سے مدد حاصل کرنی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں زندگی کی ضروریات صرف ایک شخص کے ذریعے فراہم نہیں ہوتی ہیں بلکہ انہیں متعدد اشخاص کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان فطری طور پر مدنی الطبع ہے۔ اور اس تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ہر ایک فرد دوسرے فرد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اس کے اثرات بھی قبول کرتا ہے۔ مثلاً اگر اسی جماعت کا ایک فرد بُرا ہو تو اس کے بُرے اثرات تمام جماعت تک پہنچتے ہیں۔ اور اگر کوئی فرد صالح و نیک ہو تو اس کے اثرات سے بھی دیگر افراد متاثر ہوتے ہیں۔ یہ مثل مشہور ہے "ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"۔ اس لئے معاشرہ اور سماج کی جس قدر اہمیت ہے اسی قدر اس کے افراد کی بھی ہے۔ سماج اور معاشرہ ایک جسم کے مانند ہے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ اگر جسم کا کوئی عضو خراب ہو تو اس کی وجہ سے سارے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ معاشرہ کے افراد کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے اور ہر قسم کے جماعتی نظام کے حقوق و فرائض کا تعین کیا جائے تاکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کریں اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ یہ کام صرف وہی مذہب کر سکتا ہے جس کے پاس خدا کے احکام و ہدایات کے مطابق مکمل معاشرتی نظام ہو۔ یہ خصوصیت صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس کا مکمل معاشرتی نظام ہے۔

اسلامی معاشرت

اسلام میں افراد کو جداگانہ حقوق حاصل ہیں۔ اور ہر شخص کی ایک مستقل شخصیت ہے۔ افراد نظام اجتماعی میں بے جان پرزہ یا ماحول کا عارضی پرتو نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے نزدیک ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اور خدا کے سامنے جواب دہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے فائدے کے لئے کیا اور جس کسی نے برا کام کیا تو اس کا (نقصان) اس پر ہے۔

یہ تو اس کی انفرادی ذمہ داری کا حال بیان کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ ہر فرد پر اجتماعی ذمہ داری کا بوجھ بھی ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِہٖ

(تم میں سے ہر ایک گلہ بان (ذمہ دار اور نگران) ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت (نگرانی و ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگی)

علم کی اہمیت

اس اجتماعی اور انفرادی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان خدائی قوانین اور اس کی ہدایات سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو تاکہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے سکے لہٰذا اس مقصد کے لئے علم دین کے ضروری مسائل سے واقفیت حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

صرف ضروری علم حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دعا سکھائی گئی۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا　(پ ۱۶ سورۂ طٰہٰ ۱۱۴)

(اے پیغمبر) کہہ دیجئے کہ اے پروردگار! تو میرے علم میں اضافہ فرما۔)

نظام عبادت

اسلام نے فرد کی اصلاح و تربیت کے لئے ایک مستقل نظام مقرر فرمایا ہے تاکہ افراد کی اصلاح سے صحیح معاشرے کا نظام قائم ہوسکے۔ وہ مستقل نظام اسی کا "نظام عبادات" ہے۔ عبادت کے نظام میں اسلام نے اعتدال کو مدنظر رکھا ہے۔ اسلام نے عبادت کا مقصد ترک دنیا نہیں رکھا ہے اس نے نہ صرف راہب بننے کی مخالفت کی ہے بلکہ مختلف قسم کی اسلامی عبادات کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو دنیا پرستی کی برائیوں سے بچایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی کی تلقین کی ہے۔

جذبۂ عمل

اسلام معاشرہ کے افراد کے جذبۂ عمل کو بیدار کرتا ہے اور جدوجہد کی زندگی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی　(پ ۲۷ سورۂ النجم)

انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

جو کوئی جدوجہد کرتا ہے اسے اپنی جدوجہد کا ثمرہ ملے گا
اور ہر جدوجہد کرنے والے کو کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے۔

اسلام میں عمل کی اہمیت اس قدر ہے کہ اسے ایمان کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ہے۔"

آپ نے دوسری حدیث میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔

"اللہ ایمان کو عمل کے بغیر قبول نہیں کرتا ہے اور عمل کو ایمان

کے بغیر قبول نہیں کرتا ہے"۔

بہتر معاشرہ کا قیام

اسلام فرد اور معاشرہ کا جذبۂ عمل بیدار کرنے کے بعد اسے صرف کمانے کے لئے محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ نصب العین مقرر کرتا ہے۔ اسلام مسلمانوں کے معاشرہ کا یہ مقصد قرار دیتا ہے کہ وہ اطرافِ عالم میں بہتر اور صالح معاشرہ قائم کرنے کے لئے جدوجہد کریں جسے شرعی اصطلاح میں "اقامتِ دین" اور "اعلاء کلمۃ الحق" کہا جاتا ہے کیونکہ اسلامی نظام قائم کرنا ہی دنیا میں امن وامان کے قیام اور بہتر نظام زندگی کی ضمانت ہے۔

اسلام ایسا سماجی نظام قائم کرنا چاہتا ہے جو رنگ، نسل، زبان اور وطن وقومیت کی جغرافیائی حدبندیوں سے آزاد ہو اور اس کی بنیاد عالمگیر اخوت ومساوات اور سماجی عدل وانصاف پر قائم ہو۔ اور اس معاشرہ میں کسی قسم کے مصنوعی اختلافات اور تعصبات نہ ہوں۔

مساوات واخوت

اسلامی معاشرہ کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ دنیا کے سب انسانوں کو مساوی اور ایک نسل قرار دیتا ہے۔ کیونکہ تمام انسان اولادِ آدم ہیں۔ اس کے نزدیک رنگ ونسل اور قومی تقسیم کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ تقسیم صرف تعارف کے لئے ہے نسلی اختلافات تحقیر وبرتری کے لئے نہیں ہیں اور انہیں کسی صورت میں معیار فضیلت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ مذکور ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

(پ ۲۶ سورۃ الحجرات)

اے لوگو! بیشک ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ بیشک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آخری زمانے میں حجۃ الوداع کے عظیم الشان اجتماع میں ملتِ اسلامیہ کو جو آخری ہدایت فرمائی تھیں ان میں یہ ہدایت بھی شامل ہے:

"اے لوگو! درحقیقت تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ ایک

ہے۔ دیکھو! عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت، بجز تقوٰی کے، حاصل نہیں ہے۔ تم سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو۔ اور (حضرت) آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔"

اسلام کا اہم اور بنیادی عقیدہ توحید بھی عالمگیر اتحاد اور وحدت انسانی کے نظریے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیز اسلامی اخوت بھی اسلامی معاشرہ کی اہم بنیاد ہے۔

چونکہ اسلامی معاشرہ کی بنیاد وحدت انسانی اور عالمگیر اسلامی اخوت پر قائم ہے، اس لئے یہ نظام اس تنگ نظر معاشرتی نظام سے بہت مختلف ہے۔ جس کی بنیاد قومیت اور وطنیت کے جغرافیائی حدود پر قائم ہے۔ لہذا موجودہ دور میں اسلامی معاشرہ، ان تمام خرابیوں اور مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ جن کی بدولت عہد حاضر کے انسانوں کو عظیم جنگوں اور دیگر معاشرتی اور بہت سی پریشانیوں کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔

مرد و زن کا تعاون

اسلامی معاشرہ میں مرد و زن دونوں کو مساویانہ حقوق دیئے گئے ہیں اور دونوں اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں مساوی حیثیت سے شریک ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے۔ البتہ ہر ایک کا دائرہ عمل جداگانہ ہے۔ مرد کے ذمّے ذرائع معاش تلاش کرنا اور باقی وسائل فراہم کرنا ہے اور عورت کے ذمّے گھر اور خانہ داری کے تمام کام ہیں۔ نیز وہ تربیت اولاد کی ذمہ دار بھی ہے، بلکہ اپنے خاندان کی فلاح و بہبود اور اس کی اسلامی روایات کو قائم رکھنے میں خواتینِ اسلام، زبردست حصّہ لیتی ہیں۔ اور ان کا تعاون اور اشتراک عمل ضروری سمجھا جاتا ہے۔

تعاون

اسلامی معاشرہ میں نیک کاموں میں تعاون اور اشتراک عمل پر بہت زور دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (پ۶ سورہ مائدہ)

(بھلائی اور تقوٰی کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون نہ کرو)

اسلامی معاشرہ کے آداب

اسلامی معاشرہ میں تعاون اور محبت کی فضا کو ہموار رکھنے کے لئے اسلام نے چند آداب و اخلاق مقرر

کئے ہیں جن پر عمل کرنے سے معاشرہ میں ناخوشگواری کی فضا پیدا نہیں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کی چند ہدایات مندرجہ ذیل ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ

(سورۃ الحجرات - ۱۱)

اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور عورتیں عورتوں کی ہنسی نہ اڑائیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں۔ اور تم اپنے (مؤمن) بھائی پر عیب نہ لگاؤ اور نہ برے القاب سے ایک دوسرے کو پکارو۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ

(پ ۲۶ سورۃ الحجرات ۔ ۱۲)

اے ایمان والو! تم بہت (بد) گمانوں سے بچتے رہو کیونکہ بعض خیالات گناہ پر مبنی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے (عیب اور بھید) نہ ٹٹولو۔ اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تم اسے ناپسند کروگے۔

اجتماعی ذمہ داری

اسلام نے تبلیغ کو ضروری قرار دے کر ہر ایک مسلمان پر معاشرتی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا ہے۔ اسی لئے اسلامی معاشرہ میں ایسے فرد کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے جو دنیا کو چھوڑ کر الگ تھلگ زندگی بسر کرے۔ وہ خود اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرے۔ مگر اپنے متعلقین کی فلاح و بہبودی کا خیال نہ کرے۔ ایسے افراد کے ان اعمال کی اسلام نے حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی۔ امام (مسلمانوں کا) حاکم ہے اور اس سے اس کی رعایا کے

بارے میں بازپرس کی جائے گی۔ ہر مرد اپنے اہل و عیال کا نگراں ہے اور اس
سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں
ہے اور اس سے (بھی) اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ غلام اپنے
مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے (بھی) اس کے متعلق بازپرس ہوگی ؛

حقوق و فرائض

اسلامی معاشرے کے بارے میں اسلام صرف عام اصول ہی نہیں مقرر کئے بلکہ اس نے ہر قسم کے جماعتی اداروں کے حقوق و فرائض بھی مقرر کئے ہیں۔ مثلاً اس نے رشتہ داروں، اہل خانہ، اہل محلہ، غیر مسلموں اور عام مسلمانوں کے لئے الگ الگ حقوق مقرر کئے ہیں۔ یہاں تک کہ جانوروں، درختوں اور نباتات کے بارے میں بھی اس کے واضح احکام ہیں۔ ان مستقل جماعتی اداروں میں سے چند اہم اداروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(الف) خاندان

یہ انسانی سماج کا پہلا اور بنیادی ادارہ ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کے باہمی میل ملاپ کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ یہ میل ملاپ اسلام کے بتائے ہوئے معاہدۂ نکاح کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بدترین گناہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ معاہدۂ نکاح کے ذریعہ مرد و عورت ساری عمر کے لئے اپنے اوپر بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ہیں اور ہمیشہ ان ذمہ داریوں کے پابند رہتے ہیں اس طرح جو خاندان وجود میں آتا ہے اس کا ناظم اعلیٰ مرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے لئے کماتا ہے اور ان کے لئے مالی وسائل پیدا کرتا ہے۔ بیوی اس کے زیرِ ہدایت گھر کا انتظام کرتی ہے، اور اولاد کی پرورش کرتی ہے۔ اور تمام گھریلو فرائض نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

خاندان عام معاشرہ کا ابتدائی مرحلہ ہے یہیں سے ایک نئی نسل نمودار ہوتی ہے اس لئے اسلام نے اہلِ خاندان کی تعمیر سیرت اور ان کی تربیت پر خاص توجہ مبذول کی ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ کی بنیاد صحیح طریقے سے قائم ہوسکے۔

(ب) قرابت

خاندان کے بعد دیگر رشتہ داروں کے حقوق بھی اسلام نے متعین کئے ہیں قرآنِ کریم میں صلۂ رحمی یعنی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی بہت تاکید آئی ہے۔ اسلام

نے ان کے لئے میراث قائم کر کے رشتہ داروں کے تعلقات کو مستحکم کر دیا ہے۔

(ج) محلہ رشتہ داری کے بعد اہل محلہ اور پڑوسیوں کے حقوق کو بھی اسلام نے بہت اہمیت دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر تاکید کی گئی تھی کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا تھا کہ شاید (اللہ تعالیٰ) اسے بھی میراث میں حصہ دار بنا دے گا"

آپ ؐ نے دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:- "وہ شخص مؤمن نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے"

(د) مسجد ہر محلہ کی مسجد وہاں کا سماجی ادارہ ہے۔ جو ہر محلہ کے سماجی بھلائی کے کاموں کا مرکز بن سکتی ہے۔ اور مساجد کی تنظیم اسلامی معاشرہ کی صحیح روح کو قائم رکھ سکتی ہے۔

(ہ) حدود و تعزیرات اسلامی معاشرہ کی اصلاح کے لئے اسلام نے عبادات اور اخلاقی احکام سے کام لیا ہے اور حتی الامکان تشدد اور سختی سے گریز کیا ہے لیکن سخت قسم کے اخلاقی مجرموں سے معاشرہ کو محفوظ کرنے کے لئے اس نے شرعی حدود اور تعزیرات کا ایک مکمل نظام بھی قائم کیا ہے۔ وہ لوگ جو تعلیم و تربیت اور اخلاقی ذرائع سے اصلاح قبول نہ کریں ان کے لئے سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ مگر وہ اسی وقت نافذ ہوتی ہیں جبکہ مجرموں کے سماجی جرائم یقینی طور پر ثابت ہو جائیں اور سزا کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ ایسے موقع پر عبرتناک سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو جرم کرنے کی ہمت نہ ہو اور ملک کا امن و امان خطرے میں نہ پڑ جائے۔ مثلاً چوری کا ارتکاب کرنے کی صورت میں جب چور کا جرم یقینی طور پر ثابت ہو جائے تو چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ تاکہ چوری کا مکمل انسداد ہو جائے۔ اسی طرح بدکاروں کے لئے کوڑوں اور سنگساری کی سزا مقرر ہے۔ قتل کی صورت میں خون کا بدلہ خون ہے، تاکہ سماج سے بدکاری اور خون ریزی کا خاتمہ ہو جائے۔

(و) سزا میں مساوات اسلامی قوانین اور ان کی سزائیں ہر غریب اور امیر کے لئے یکساں ہیں۔ یہاں تک کہ حکام اور امیر المؤمنین بھی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اسلام کی نظر میں کوئی شخصیت قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی جرم کی سزا تحقیق کرنے کے لئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا:- "اگر محمد ؐ کی بیٹی فاطمہ رضؓ بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا"۔ (بخاری شریف)

برِ صغیر کی مُسلمان حکومتیں

حافظ عباد اللہ فاروقی۔ ایڈوکیٹ لاہور

آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں نے سندھ کے علاقہ پر حملہ کیا، اور اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ان کی حکومت مقامی حیثیت رکھتی تھی، اور وہ برصغیر پاک و ہند میں کوئی خاص اثر پیدا نہ کر سکی۔ یہ فخر تُرکوں کو نصیب ہوا کہ وہ سارے شمالی ہند پر تسلط جمائیں۔ ان حملہ آوروں کو یہاں بجائے کسی متحدہ قوت کے انفرادی طور پر راجاؤں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا شمالی ہند قلیل عرصہ میں اُن کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

اِس دور میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام اگرچہ اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہو سکا کیونکہ اس کے لئے حالات شروع میں ناساز گار تھے۔ تاہم مسلمانوں نے اس ضمن میں کوشش ضرور کی، لیکن اُن کی یہ کوشش دور رس نتائج پیدا نہ کر سکی۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ ہندو قوم باہمی رقابت اور شدید خانہ جنگی میں مبتلا تھی اور اُسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ مذہبی امور کی طرف متوجہ ہوتی، چنانچہ وہ اسلام کی خوبیوں کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ہندو مسلمانوں سے اس لئے نفرت کرنے لگے تھے کہ اُن کی تہذیب مسلمانوں سے مختلف تھی۔ مسلمان ایک جنگ جو قوم تھے جو اللہ کی راہ میں جان دینا اپنے لئے عین ثواب

اور نجاتِ اُخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن ہندومت میں بدھ دھرم کے متعدد اصول و عقائد شامل ہو گئے تھے، بالخصوص "اہنسا" کا عقیدہ، اور ہندوؤں نے عام طور پر اسے تسلیم کر لیا تھا۔ جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری ان کے ہاں ممنوع تھی۔ اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ وہ جنگ وجدل سے بیزاری کا اظہار کرتے۔ ان حالات میں فاتحینِ اسلام کے لئے ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کرنا آسان ہو گیا۔

برصغیر میں اسلامی حکومت کا قیام سلطان قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ہوا۔ اور وہ پہلا مسلمان تاجدار تھا جس نے شرعی احکام کی پوری پیروی کی۔ اسلامی حکومت کے قیام کے وقت اگر یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں سے نفرت تھی تو اس بنا پر کہ وہ محکوم بنائے گئے اور ان پر ایسی قوم مسلّط ہو گئی جس کی تہذیب و تمدّن کو وہ قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے محض مذہب کے اختلاف کی بنا پر نفرت کی ہو۔ اگر مذہبی تعصّب ان میں تھا بھی تو اُن کی باہمی جنگ وجدل کی وجہ سے دب چکا تھا۔ پھر بھی ابتدا میں ان دو قوموں کے درمیان جس خصومت کا اظہار ہوتا ہے وہ بالکل قدرتی ہے کیونکہ فاتح قوم اپنا اقتدار تسلیم کروانے پر مُصر ہوتی ہے اور مفتوح قوم قدرتاً اپنے فاتح سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ اپنی محکومی اور ذلّت کا احساس اسے مخالفت پر آمادہ کرتا ہے جس کا نتیجہ عام طور سے مختلف بغاوتوں کی صُورت میں رونما ہوا کرتا ہے۔

شہاب الدین غوری کے بعد جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے اور تُرکوں کو یہاں سلطنت قائم کرنے کا خیال ہُوا تو قدرتاً محکوم ہندوؤں کے مسلمان حاکموں سے روابط پیدا ہونا شروع ہوئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ترکوں اور افغانوں کا عہد ان دو متضاد اور مخالف قوموں کے باہمی تصادم اور ملاپ کا عہد ہے۔ انہی اسباب سے اس عہد کی عمرانی و مذہبی تاریخ نہایت اہم ہے۔ یوں تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا آغاز آٹھویں صدی یعنی سندھ پر عربوں کے قبضے سے ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں اسلامی حکومت ہندوستان میں اس وقت قائم ہوئی جب کہ

پرتھوی راج کی شکست کے بعد شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا نائب مقرر کیا۔ سندھ پر عربوں کی حکومت کی حیثیت بالکل صُوبہ داری کی سی تھی۔ اس کا ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ شروع میں پنجاب پر محمود غزنوی کے حملے کسی مستقل حکومت کے خیال کے لئے نہ تھے۔ اس لئے ان حملوں اور فتوحات کا برصغیر کی سیاست پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہ پڑا اور نہ یہاں اسلامی حکومت پُورے طور پر قائم ہونے پائی۔ بحیثیت مجموعی عربوں اور محمود غزنوی کے حملوں اور فتوحات کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے بعد کے اسلامی فاتحین کے لئے رہبری کا کام کیا۔ اور ایشیا کی دیگر قوموں اور اسلامی سلطنتوں کو ہندوستانی سیاست سے واقف کر دیا۔

قطب الدین ایبک کی صُوبہ داری سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش شروع ہوئی۔ جس کی تکمیل علاؤ الدین خلجی کے عہد میں ہوئی اور مسلمانوں میں پنجاب اور وسطِ ہند زیر کرنے کے بعد پورے ہندوستان کو زیر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ تیرھویں صدی کی ابتدا سے چودھویں صدی کی ابتدا تک پُورے ایک سو سال میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم اور مستحکم ہو گئی، اور تمام شمالی ہند پر تُرکوں کا تسلط ہوا۔ اس ایک صدی کے دوران ابتدائی چالیس برس ہندوستان کی مختلف ہندو سلطنتوں کو زیر اور ان کا الحاق کرنے میں صرف ہوئے اور جب سلطنت کافی وسیع ہو گئی تو اس کے استحکام کی کوشش کی گئی۔

قطب الدین ایبک کے متعلق صاحب تاج المآثر لکھتے ہیں کہ اس کے انصاف کے باعث بھیڑ اور بھیڑیا ایک ہی تالاب پر پانی پی سکتے تھے۔ سلطان نے شرعی قوانین کو مُلک میں نافذ کرنے کی پوری کوشش کی اور غیر شرعی رسوم اور قوانین کو باطل قرار دیا۔

قطب الدین ایبک کا ایک اعلان جو اُس نے لاہور میں کیا، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ صفحہ ۳۳ میں مرقوم ہے۔ اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کس قدر

شرعی قوانین کا دلدادہ تھا۔ اعلان کے الفاظ حسب ذیل ہیں :۔

" املاکِ مسلمانان را بر مالکان مقرر دارند و خراجے کہ از املاک بیرون شرع و فرمانِ خدائے ستدند و آں خُمس بود برانداخت و چنانکہ شریعت فرمودہ است جائے عشر و جائے نصف عشر معین فرمود و فرمان دادتا توقیع نوشتند . . . . و محاصلے بزرگ در شرع جائز نبود برانداخت "

"(مسلمانوں کی زمینیں ان ہی کے پاس رہنے دیں اور وہ خراج جو خلاف شرع لیا جاتا تھا، اور جو کل پیداوار کا پانچواں حصہ تھا، بند کر دیا گیا۔ اور جس طرح شریعت کا حکم ہے کہیں سے عُشر اور کہیں سے نصف عشر مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ توقیع لکھیں اور جو ٹیکس شرعًا ناجائز تھے وہ ختم کر دیئے)"

۶۰۷ھ میں جب قطب الدین ایبک کے لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر انتقال کی خبر اجمیر کے گرد و نواح میں پہنچی تو ہندو جاگیرداروں نے جو بظاہر محکوم ہو گئے تھے لیکن دل میں مذہبی تعصب و بغض رکھتے تھے تاراگڑھ پر شب خون مارا۔ اس وقت مسلمان فوجی ہتھیار کھولے نہایت چین سے بستروں پر سو رہے تھے کہ یکایک تلواریں چمکیں۔ نیزے اور بھالے بلند ہوئے اور گرزوں کی دل ہلا دینے والی صدا نے سب کو جگا دیا۔ مسلمان بے خبر تھے، اس لئے دشمنوں نے رات بھر میں سب کو شہید کر دیا۔ میراں سید حسین خنگ سوار بھی اسی تاراگڑھ کی لڑائی میں شہید ہوئے۔

ہندوؤں کے اس مذہبی تعصب کے باوجود قطب الدین کے عہد میں شمالی ہند کا بہت سا حصہ فتح ہو گیا۔ اجمیر، دہلی، بنارس اور شمالی ہند کی دیگر راجپوت سلطنتیں بغیر کسی قابلِ ذکر جد و جہد کے اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آ گئیں۔ ان فتوحات کی تفصیل ہمعصر تاریخوں یعنی طبقاتِ ناصری اور تاج المآثر میں ملتی ہیں۔

۱۱۹۹ء میں شہر انہلواڑہ اور سلطنتِ گجرات پر دہلی کا قبضہ ہوگیا لیکن یہ علاقہ کامل طور پر فتح نہ ہوسکا۔ جو ایک صدی بعد علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں سلطنت دہلی سے ملحق ہوا۔

اسلامی حکومت کے قیام سے آہستہ آہستہ پورا ہندوستان ایک مرکز کے تحت آگیا۔ ملک کی از سرِ نو شیرازہ بندی سے اندرونِ ملک امن قائم ہوا، اور انتشاری کیفیت رفع ہوگئی۔ تین۳ صدیوں کی لامرکزیت کے بعد ایک آزاد ہمہ گیر قوّت تقریباً تمام ہندوستان پر حاوی ہوگئی۔ سلطنت دہلی کے علاوہ دیگر علاقے یا تو اِس سے ملحق کرلئے گئے یا ان سلطنتوں نے دہلی کی اطاعت و برتری کو تسلیم کر لیا۔ انہی اسباب سے اسلامی حکومت کا قیام دراصل ایک طاقتور مرکزیت کے علاوہ برصغیر کی ایک آزاد منفرد حکومت کا قیام بھی تھا۔ قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد سلطنت دہلی دیگر اسلامی ممالک سے بالکل آزاد ہوچکی تھی اور ترک حکمرانوں کا تمام تر دار و مدار ہندوستان پر رہ گیا تھا۔ اسلامی ممالک سے سیاسی تعلقات منقطع ہوچکے تھے، اور کوئی ایسی کشش باقی نہ تھی جو ہندوستان کے ان ترک حکمرانوں کو اسلامی ممالک سے تعلقات قائم رکھنے پر مجبور کرتی۔ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا ان کو دیگر اسلامی ممالک بالخصوص خلافت سے ہمدردی ضرور تھی لیکن اس ہمدردی کا اثر ہندوستان کی سیاست پر کچھ زیادہ نہ تھا۔

علاؤ الدین خلجی کی تمام تر کوشش یہ رہی کہ تُرکوں کے مقابلہ میں ہندی مسلمانوں کو ترجیح دی جائے۔ اسی بنا پر اُس حکمران کے اکثر عہدہ دار و سپہ سالار ہندی نژاد مسلمان تھے، علاؤ الدین کے چار مشہور سپہ سالار (۱) ظفر خاں (۲) نصرت خاں (۳) الپ خاں (۴) اُلغ خاں ہندی نژاد تھے۔ جن کی مدد سے اس نے تُرکی اُمرار کی قوت کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب رہا۔ بے شک اس عہد کی حکومتوں میں علماء کے اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان علماءِ دین کا وقتاً فوقتاً حکمرانوں کو شرع کی پابندی و قرآنی احکام کی تعمیل کی طرف توجہ دلانا

حکومت میں اس طبقہ کے اثر اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ لیکن غیاث الدین بلبن کے عہد سے جو خیال مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا پیدا ہوا تھا ۔ وہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں پورے طور پر ظاہر ہوا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین بلبن ، علاؤالدین خلجی اور بعد میں محمد بن تغلق کا جو تخیل مملکت رہا وہ خالص اسلامی مملکت کا تخیل نہ تھا بلکہ ایک دنیوی SECULAR اور قومی NATIONAL مملکت کے تصوّر کے قریب تھا ۔ علاؤالدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو سے علاؤالدین خلجی کے تخیّل و تصوّر مملکت پر روشنی پڑتی ہے ۔ علاؤالدین قاضی کو ایک موقع پر کہتا ہے کہ :-

" اگرچہ من علمے و کتابے نہ خواندہ ام ۔ امّا ازیں چند پشت مسلمان و مسلمان زادہ ام بہر چیزے کہ در آں صلاح ملک و صلاحِ ایشاں (عوام) باشد بر خلق امر می کنم و مردمان بے التفاقی می کنند و بجائے نمی آرند ۔ مرا ضرورت می شود کہ چیزہا درشت درباب ایشاں حکم کنیم کہ ایشاں براں فرمانبرداری کنند و نمی دانم کہ آں حُکم مشروع است یا نامشروع و من در ہر چہ صلاح ملکِ خود می بینم و مصلحتِ وقت مرا در آں مشاہدہ می شود حکم می کُنم و نمی دانم کہ خدا تعالیٰ فردا قیامت بر من چہ خواہد کرد[1] "۔

(اگرچہ میں نے کوئی علم اور کتاب نہیں پڑھی ، لیکن میں چند پشت سے مسلمان ہوں ۔ جس چیز میں ملک اور لوگوں کا فائدہ دیکھتا ہوں ، اس کا میں لوگوں کو حکم دیتا ہوں ۔ اور جب لوگ اس سے بے التفاتی کرتے ہیں اور اسے بجا نہیں لاتے تو مجھے ضرورت ہوتی ہے کہ میں اس بارے میں ان پر سختی کروں ، اور اُن سے فرماں برداری کراؤں ۔ اور میں نہیں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی ۔

جانتا کہ یہ حکم شریعت کے مطابق ہے یا شریعت کے مطابق نہیں۔ میں
جس میں اپنے ملک کا فائدہ اور مصلحت وقت دیکھتا ہوں اُسی
کا حکم دیتا ہوں۔ اور نہیں جانتا کہ کل کو قیامت کے دن خدا تعالےٰ مجھ
سے کیا کرے گا)۔

اس قسم کے خیالات کی بنا پر علمار دین علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کی سیاسی
حکمت عملی سے ناراض تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان بادشاہوں کا مقصد بلا تفریق
مذہب استحکام سلطنت، قیام امن وامان اور فلاحِ ملک تھا۔ لیکن ان کی حکومت
خالص اسلامی حکومت نہ تھی۔ ان کے ہاں اسلامی حکومت ایک "قومی اسلامی حکومت"
بن چکی تھی۔ اس عہد میں شرعی احکام کی پوری پابندی نہیں ہوتی تھی۔

بلبن کے متعلق برنی لکھتا ہے کہ

"از شدتِ دوستیٔ ملکِ چند روزہ در خاطر اُو نگذشتے بہر وجہ کہ مسلمانان
رابکشند خواہ بہ تیغ وخواہ بہ زہر وخواہ بخفیہ خواہ بدلت وچوب وخواہ بہ عذر وخواہ
بے نانی وبے آبی وخواہ از بلندی فرو انداختن، وخواہ در آب غرق کردن وبا آتش
سوختن کہ جوابِ خونِ او فردائے قیامت خواہند طلبید"۔ (تاریخ فیروز شاہی ص۹۷)۔

(ملک کی چند روزہ محبت میں اس کا یہ حال ہوگیا تھا کہ اس کے دل میں یہ
بات نہ آتی تھی کہ خواہ کسی طرح سے مسلمانوں کو مارے گا، چاہے تلوار سے یا زہر دے
کر یا پوشیدہ طریقہ سے یا لت وچوب سے یا بھوکا پیاسا رکھ کر یا بلندی سے پھینک
کر یا پانی میں غرق کرکے یا آگ میں جلا کر۔ اس سے قیامت کے دن اس خونریزی
کا مواخذہ کیا جائے گا)۔

علاؤالدین خلجی کے عہد میں باغی کے پورے خاندان کو سزا دی جاتی تھی۔ اس
غیر شرعی نظام تعزیر کو ختم کرنے کی ایک کوشش فیروز شاہ نے کی تھی۔ خود لکھتا ہے

"در عہودِ ماضیہ بسے خونِ مسلمانان ریختہ شد و انواع تعذیب از بریدن دست
وپا وگوش وبینی وکشیدنِ چشم وریختن ارزیز گداختہ در حلق خلق وشکستنِ

استخوانہائے دست وپا میخکوب وسوختن اندام بہ آتش وزدن میخہا بر دست وپا وسینہ وکشیدن پوست وزدن دُرہ ہا بامیخہائے آہنی وبریدن پے دو نیم کردن آدمی بہ آرہ وبسیار انواع مثلہ کردن واقع می شد۔" (فتوحات فیروزشاہی ص۲)

(گزشتہ زمانہ میں مسلمانوں کا خون ناحق بُری طرح بہایا جاتا تھا اور ان کو مختلف قسم کی اذیتیں دی جاتی تھیں، مثلاً ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹنا آنکھیں نکال لینا۔ لوگوں کے گلے میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا۔ ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کو ہتھوڑے سے توڑنا۔ بدن کو آگ سے جلانا۔ ہاتھ پاؤں اور سینہ میں لوہے کی کیلیں ٹھوکنا۔ کھال کھینچ لینا۔ لوہے کی میخوں والے دُرے لگانا۔ لنگڑا کر دینا۔ آرے سے انسان کو چیر کر دو کر دینا۔ غرض اس طرح اعضا تراشی کے بہت سے طریقے رائج تھے)۔

غرض قطب الدین ایبک کے بعد جب برصغیر میں اسلامی حکومت، شخصی، قومی اور غیر اسلامی یعنی دنیوی سلطنت میں تبدیل ہوگئی تو اس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہوگئیں جن کی اسلام بیخ کنی کرتا ہے۔ ان حالات میں اشاعتِ اسلام کو وہ ضعف پہنچا جو محتاجِ بیان نہیں۔

کتابیات

(۱) تاریخ فیروز شاہی

(۲) فتوحات فیروز شاہی

(۳) طبقاتِ ناصری

(۴) تاج المآثر

(۵) ہسٹری آف انڈیا مصنفہ سرکار

(۶) سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات تالیف خلیق احمد نظامی (دہلی)

تنقید و تبصرہ

آثار الصنادید

سرسید علیہ الرحمۃ نے اپنی یہ مشہور کتاب پہلی دفعہ ۱۸۴۷ء میں شائع کی۔ دوسری دفعہ مرحوم و مغفور نے خود ہی اسے قدرے مختصر کر کے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسان دی تاسی نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں (۱) شہر (شاہجہان آباد) کے باہر کی عمارتوں کا حال ہے۔ (۲) قلعہ معلی (لال قلعہ) کے حالات اور اس کی عمارات کا حال ہے۔ (۳) خاص شہر شاہجہان آباد کا حال ہے۔ (۴) دلّی اور دلّی والوں کا بیان ہے۔ (۵) مشائخینِ کبار، علمائے کرام اور علمائے دین کا ذکر ہے۔ (۶) ذکر قرّاء و حفاظ۔ (۷) بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہجہان آباد کا ذکر۔ (۸) خوشنویسوں، مصوّروں اور ارباب موسیقی کا بیان ہے۔

یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے بڑا اچھا کیا کہ اُسے شائع کر کے اہلِ علم کے لئے اس سے استفادہ کرنا ممکن

بنا دیا ہے۔

مرتب اور مُحشّی ڈاکٹر سید معین الحق نے اصل کتاب میں جہاں بھی ضرورت سمجھی ہے حاشیوں کا اضافہ کیا ہے جو کافی معلومات افزا ہیں۔ اور آخر میں مولوی ظفر حسن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ آثارِ قدیمہ ہند کی دہلی کی عمارات اور آثارِ قدیمہ سے متعلق مرتبہ کتاب سے ۸۴ صفحات پر مشتمل کتبات نقل کئے گئے ہیں۔

سرسید نے جب یہ کتاب لکھی تو نام کو تو مغل بادشاہ فرمانروا تھا، لیکن حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا، اور اس کے مقرر کردہ انگریز افسر دہلی کے حاکم تھے۔

اس کتاب کا انتساب جو "سرطامس تیا فلس مٹکف بارونٹ بہادر صاحب کلاں بہادر دارالخلافہ شاہجہان آباد دام اقبالہٗ" کے نام ہے، اس کی تمہید ملاحظہ ہو:-

"جب یہ نسخہ مرتب ہو چکا اور اس کا حُسن شاہدان خلخ و نوشاد سے زیادہ نظر آیا۔ اپنے اندیشۂ معنی پرست میں یہ گزرا کہ اس کو کسی نام اور بلند مرتبہ کے نام نامی اور اسم گرامی سے پیرایہ دیا جاوے اور اس کو کسی جسیم اقتدار گردون وقار کے محامد پسندیدہ سے مزین کیا جاوے۔ اسی اثنا میں عالم بالا سے ندا آئی اور عالم علوی سے نوید پہنچی کہ زیور اس شاہد حجلۂ غیب کا اسم سامی اس عالی منزلت گردوں بارگاہ کا ہو سکتا ہے کہ جس کا خیمہ جاہ فلکِ نہم سے بالاتر ہے۔ اور اس کے ادنیٰ خادم کا مرتبہ سکندر و دارا سے والاتر دولت اقبال کا طراز اور فضل مقام حقیقی اس کا کارساز دارا کو اگر اس کی اعانت پہنچتی سکندر سے شکست نہ کھاتا اور افراسیاب کو اگر اس کی توجہ کرتی تو رستم سے الزام نہ پاتا۔

نظم

سکندر شکوہے کہ در جملہ ساز — شکوہے سکندر بدو گشت باز
طرف دار پنجم بمردانگی — قدر خان مشرق بفرزانگی

والی جہاں دارا دربان صاحب دولت واقبال خداوندِ جاہ وجلال مسند آرائے کشور فرماندہی وکشورستانی حاکم محاکم عدل سنجی وجہانبانی مؤید بتائید آسمانی بانی جنانی عدل نوشیروانی نصرت را دولت پیرا جہاں کشا حاجت روا کامروائے خلائق وپسندیدۂ حضرت خالق عدل پرور انصاف گستر آسمان پایۂ رفعت سرمایہ معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خاں فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی سرطامس ... دام اقبالہ''

اس کے بعد سرسید نے اپنے اس ممدوح سرمٹکاف کی مزید تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے، جس میں اُسے ''مہبطِ رحمتِ الٰہی'' بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ تاج ور جو تاجدار ہیں 'بر درگہ اُو جبیں گزارند'۔ اور اس کی عدل گستری کی یہ حالت ہے کہ جب آسمان پر اُس کے عدل نے آواز دی تو آسمان نے 'صد توبہ زیک جفا ادا کرد'۔

اور اس انتساب کا اختتام یوں ہوتا ہے :۔

''۔۔۔۔ ہر چند یہ کتاب نظر تماشائیانِ دقیقہ یاب میں رشکِ گلزار اور غیرتِ بہار ہے، لیکن حقیقت میں بہار جب ہے کہ اس دریا دل کے سحابِ الطاف سے سرمایہ خرمی واصل کرے اور گلزار جب ہے، کہ اس بحرِ کف کے ابرِ غیا سے سرسبزی پاوے ۔۔۔۔''

قطب صاحب کی لاٹ کے پاس پُرانے وقتوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی جسے اسی سرمٹکاف نے مرمت کرایا تھا، اس کا ذکر سرسید یوں کرتے ہیں صہ ۸۳ :۔

"۔۔۔۔ لیکن جب کہ اس کے نصیب کھلے اور اس عمارت کے دن اچھے آئے، اُسے صاحبِ والامناقب عالی مناصب نے جن کے عدل وانصاف کے آگے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتا ہے اور ظلم وستم دنیا سے نیست ونابود ہوگیا ہے آوازہ بلند ہمتی اور والا فطرتی کا آویزۂ گوشِ فلک ہے اور غلغلہ ان کی شوکت و حشمت کا زمین سے آسمان تک پہنچا ہے یعنی دریا نوال خدایگان ابر کف حاتم دررائے فرزند ارجمند بجان پیوند سلطان معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خواہی طامس نیا فلس متکف صاحب بہادر فیروز جنگ بہادر شاہجہان آباد دام اقبالہ نے اس مقام پر کوٹھی بنانے کا ارادہ کیا۔۔۔"

قلعہ معلی کی عمارات کے حال میں مصنف نے "ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، وسلطانہ، وافاض علی العالمین برہ واحسانہ،" کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"الحمد للہ کہ یہ قلعہ معلی ۔۔۔۔ اسے شاہنشاہ عالم پناہ کے وجود باجود سے رونق پذیر ہے کہ نوشیرواں کو اس کے ایوانِ عدالت میں مرتبہ ادنیٰ چاکر کا اور سکندر کو اس کی بارگاہ میں کمترین رتبہ نوکر کا ہے۔ خزاں ان کے عہدِ دولت میں برنگ بہار اور خار اُن کے زمانۂ سلطنت میں غیرتِ گلزار ۔۔۔۔"

کتاب آثار الصنادید صرف دہلی کے آثارِ قدیمہ، سرسید کے زمانے کی عمارات اور ان کے اہلِ علم و کمال کے حالات کا مرقع نہیں، بلکہ اُس دور کی ان بوالعجبیوں کو بھی پیش کرتی ہے کہ ایک طرف مغل شاہنشاہ کا وجود باجود رونق پذیر تھا، اور اور دوسری طرف سر متکف صاحب بہادر عملاً حکمرانی کرتے تھے اور سرسید اور غالب جیسے بے شمار اہلِ قلم کو ان دونوں بارگاہوں کو خراجِ عقیدت

پیش کرنا پڑتا تھا۔

سرسید نے آثارِ قدیمہ کا کھوج لگانے اور ان کے بارے میں جملہ معلومات فراہم کرنے میں حد درجہ محنت اور مشقت کی تھی۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ وہ قطب لاٹ کے کتبے پڑھنے کے لئے لاٹ کے ساتھ رسی اور ٹوکری باندھ کر لٹک جاتے تھے اور اس طرح انہوں نے لاٹ کے کتبے پڑھے، اور اُن کا اپنی کتاب میں اندراج کیا۔

اس ضمن میں سرسید لکھتے ہیں :-

"اس تمام لاٹ میں آیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔ اُن کے بیان کرنے کی تو کچھ حاجت نہیں مگر چہ کتبے اس لاٹ کے قابل بیان کرنے کے ہیں کہ ان میں اس لاٹ کے بنانے والے اور مرمت کرنے والوں کے نام لکھے ہیں۔ اور ایک میں معمار کا نام بھی۔ چنانچہ وہ سب کتبے بعینہ اسی خط اور اسی طور سے نقشہ میں ہر ہر درجہ کے مقابل موجود ہیں۔ . . . ان کتبوں میں بعضے حرف اور طرح سے خلاف رواج لکھے ہیں اور بعضے پڑھنے میں نہیں آتے۔ غلطی ناقل کی اس میں نہ سمجھی جائے۔ اصل لاٹ پر بھی اسی طرح ہیں۔"

لاٹ کی اونچائی مصنف نے جس طرح ناپی، اس کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے لکھتے ہیں :-

"میں نے اس لاٹ کی بلندی کو اسطرلاب سے بعمل اصابع اور اقدام کے پیمائش کیا اور پھر ہر ہر درجہ کو ڈور سے بھی پرتالا . . ."

دہلی سے قریب او کھلا کے نواح میں کالکا مندر ہے۔ مصنف نے اُس کا بھی حال لکھا ہے، فرماتے ہیں :-

"جب میں اس مندر کا نقشہ کھینچنے گیا ہوں تو مجھ کو بھی وہاں کے پانڈوں نے بتاسے اور کشمش اور بادام ملا کر پرشاد دیا تھا۔ اور

میں نے لاچار اس خیال سے کہ مبادا وہاں کے پانڈے مجھ کو مندر کے اندر نہ جانے دیں اور مندر کا نقشہ نہ کھینچنے دیں، اس پرشاد کو لے لیا اور ہر طرح سے پانڈوں کی خاطر داری کی۔ شعر

"بہ تقلید کافر شدم روز چند   برہمن شدم در مقالات زند"

آثارِ قدیمہ اور عماراتِ تاریخی کا بیان تو اپنی جگہ مفید اور اہم ہے ہی لیکن کتاب کا وہ حصہ جس میں سرسید نے اپنے معاصر مشائخ، اہل علم، علماء دین اور شعراء اور اربابِ فنون کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اس کی افادیت اور اہمیت ہمیشہ رہے گی۔

اُس دور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ غلام علی سے سرسید کے خاندان کو بیعت تھی اور ان کے والد سرسید کو حضرت شاہ صاحب کے پاس لے جایا کرتے تھے۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے حضرت کے حالات لکھے ہیں، لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو حضرت دادا کہتا تھا۔"

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:۔

آپ کی ذات فیضِ آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا۔ اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے اُن کے بیعت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی۔ اور خدمتِ خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے۔"

مصنف نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائیوں حضرت شاہ رفیع الدین حضرت شاہ عبدالقادر اور اُن کے بھتیجے حضرت شاہ اسمٰعیل اور حضرت سید احمد شہید

کا بھی ذکر کیا ہے - شاہ عبدالعزیزؒ کے بارے میں لکھا ہے :-

"باوجود اس کے کہ سنین عمر شریف قریب اسّی کے پہنچ گئے تھے اور کثرت امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ باقی نہ رہی تھی، خصوصاً قلتِ غذا سے - لیکن برکاتِ فیضِ باطنی اور حدّتِ قوائے روحانی سے حسب تفصیل مسائل دینی اور تبیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے ذخار موج زن ہوتا تھا اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی..."

شاہ رفیع الدین کے تبحر علمی اور فیض باطنی کا ذکر یوں کرتے ہیں :-

"ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے . . . باوجود ان کمالات کے افاضۂ فیضِ باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری اگر اُن کے وقت میں ہوتے تو بے شک وریب اس فن میں اپنے تئیں کمترین مستفیداں تصوّر کرتے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں :- از بسکہ ترک حضرت کے مزاج میں بہت تھا - تمام عمر اکبری مسجد کے ایک حجرے میں بسر کی - نیز باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ اِدھر بیٹھ یا اُدھر، لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دلوں میں آپ کا ایسا رُعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بسبب ادب کے دور دور بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں۔"

سرسید نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذیل میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی کے بارے میں ایک دو ایسی باتیں لکھی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں - صفحہ ۲۳ میں لکھتے ہیں :- "مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی کو اجازت ہوئی کہ اطراف ہندوستان

میں وعظ کہو اور بیشتر جہاد اور فضیلتِ شہادت بیان کرو۔ ہر چند یہ اس کا منشا نہ جانتے تھے اور پے نہ لے گئے (؟) کہ اس ارشاد کا سبب کیا ہے لیکن چونکہ مرید با اخلاص تھے، سرِ مو تجاوز نہ کیا اور فرمان بجالائے۔"

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے :- "... بعد مدت کے ان بزرگوں کو حضرت نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہ تو جاں نثار تھے بمجرد حکم کے مشتاقینِ وعظ کو نیم جان چھوڑ کر خدمت بابرکت میں راہی ہوئے اور حضرت اُن کو ہمراہ لے کر کوہستان کو چلے گئے اور یہ ہنوز اس کی منشا سے واقف نہیں..."

مطلب یہ کہ شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی بغیر جانے بوجھے محض مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں پہلے جہاد کی دعوت دیتے رہے اور پھر خود عملاً جہاد میں شریک ہوئے، یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

بے شک پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے آثار الصنادید شائع کر کے ایک قابلِ قدر خدمت کی ہے، لیکن اُس کی یہ خدمت اور بھی قابلِ قدر ہوتی اگر یہ کتاب ذرا اور اہتمام سے چھاپی جاتی۔ بہتر یہ تھا کہ ایسی اہم کتاب بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپتی۔ کتاب میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، اور کئی فرموں کی طباعت بھی ناقص ہے۔

کتاب میں عربی نظم و نثر کے کئی کئی صفحات ہیں اور انہیں بجائے نسخ کے نستعلیق میں لکھا گیا ہے، ذرا سی توجہ سے یہ عربی عبارتیں نسخ میں کتابت کرائی جا سکتی تھی جس سے پڑھنے والوں کو بڑی آسانی رہتی۔

مجموعی طور پر آثار الصنادید کی اشاعت پر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی مبارکباد کی مستحق ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ بڑے سائز کے ۴۶۴ صفحات، قیمت اٹھارہ روپیہ۔ ناشر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۵۔

(ا ۔ س)

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2543

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

محمد سرور پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

ماہنامہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مخدوم امیر احمد،

مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے   فی پرچہ :- پچھتر پیسے

| جلد ۵ | ماہ اگست ۱۹۶۷ء مطابق ربیع الآخر ۱۳۸۷ھ | نمبر ۳ |

فہرست مضامین

شذرات

اسرائیلی فوجیں اب تک متحدہ عرب جمہوریہ، اردن اور شام کے ان علاقوں پر قابض ہیں۔ جہاں تک وہ جنگ بندی کے وقت پہنچ چکی تھیں اور وہ ان علاقوں کو خالی کرنے کیلئے تیار نہیں، جب تک عرب حکومتیں اُن کی شرطیں نہ مانیں۔ اس سلسلہ میں سب سے المناک واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت نے بیت المقدس کے اس حصہ کو جو اردن میں تھا اور جس میں مسجد اقصیٰ، صخرہ اور دوسرے متبرک مقامات ہیں، اپنی مملکت میں شامل کر لیا ہے، اور یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اسے خواہ کچھ بھی ہو جائے خالی نہیں کرے گی۔

انہی دنوں اخبارات میں ایک تصویر چھپی ہے، اس کے پس منظر میں تو مسجد اقصیٰ کی عمارت ہے اور اس کی سیڑھیوں پر اسرائیلی سپاہی دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اور اُن میں سے بعض کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں ہیں۔ مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا قبضہ، اس کے دروازہ پر اسرائیلی سپاہیوں کا اس طرح ہنگامہ برپا کرنا اور اپنی فتح کی خوشی میں نعرے لگانا اور خوش فعلیاں کرنا۔ اس تصویر کو دیکھ کر کس مسلمان کا دل خون کے آنسو نہ رویا ہوگا، اور اس کے چشم تصور کے سامنے صلیبی جنگوں کے وہ واقعات جو وہ تاریخ میں پڑھتا آیا ہے ایک بار پھر پھر گئے ہوں گے گزشتہ جون کے واقعات بہت بڑا سانحہ ہے، جس کے اثرات معلوم نہیں کب تک رہیں۔

اس سانحہ پر پاکستان میں جو غیر معمولی درد والم کا اظہار کیا گیا ہے وہ بالکل فطری ہے۔ عرب مسلمانوں پر اسرائیل کی جارحیت کے ہاتھوں جو قیامت ٹوٹی، بحیثیت مسلمان کے ہمارا اس سے متاثر ہونا قدرتی ہے۔ اس کے علاوہ بیت المقدس پر یہودیوں کا تسلط فی نفسہٖ مسلمانوں کے مذہب پر ایک حملہ ہے کیونکہ بیت المقدس اسی طرح ہمارا ایک مقدس و متبرک شہر ہے جیسے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہیں۔ اور اس بابرکت شہر کو تو ہمارا قبلہ اوّل ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ، اردن اور شام کی تو اسرائیل سے فوجی اور ملکی لڑائی ہوگی، لیکن ہمارے لئے یہودیوں کا مسجد اقصیٰ اور صخرہ پر قابض ہونا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے جب ہم اس لڑائی کو اسلام اور یہودیت کی جنگ قرار دیتے ہیں، تو یہ بالکل صحیح ہے۔ دنیائے اسلام اس لڑائی کو اس نظر سے دیکھ رہی ہے۔ اور اگر اسرائیل بیت المقدس پر اسی طرح قابض رہے تو اسلامی دنیا میں یہودیت اور اس کے حامی ملکوں کے خلاف اتنا شدید ردّ عمل ہوگا کہ مسلمانوں کے فکر و نظر میں ایک بڑا انقلاب آجائے گا۔

ہمارے ہاں کے تمام مذہبی حلقوں میں اور اکثر و بیشتر سیاسی حلقوں میں بھی اس بات پر افسوس ظاہر کیا جارہا ہے کہ اگر عرب ملکوں میں عربیت اور عرب قومیت پر اتنا زور نہ دیا جاتا اور عرب قیادتیں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں اور کثیر التعداد غیر عرب مسلمان ملکوں کے ساتھ بحیثیت مسلمان ہونے کے، عربوں کے جو اسلامی روابط ہیں، ان کو بھی تقویت دیتی اور فلسطین کے مسئلہ کو عربی کے ساتھ اسلامی بھی بناتیں تو آج پوری دنیائے اسلام ان کی پشت پر ہوتی اور اسرائیل اور اس کے حامی ملک عربوں کو یوں ذلیل کرنے کی جرأت نہ کرسکتے۔

بدقسمتی سے عرب قومیت تمام عربوں کو متحد نہ کرسکی کہ وہ ایک ہوکر اسرائیل کے مقابلہ میں آتے اور اس سے نقصان یہ ہوا کہ اس عرب قومیت کی وجہ سے عرب مسلمانوں اور غیر عرب مسلمانوں میں جذباتی مغائرت پیدا ہوگئی اور فلسطین کے معاملہ میں پوری دنیا کی اسلامی رائے عامہ منظم نہ کی جاسکی، اور یہ مسئلہ صرف عربی بن کر رہ گیا۔

اسلامی دنیائے اسلام متحد ہو اور وہ متحد ہوکر اس پر جو جارحیت ہو اس کا مقابلہ کرے، اس سے بہتر اور کیا تدبیر ہوسکتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں اس تدبیر کو بروئے کار لانے کی کوششیں ہوئیں لیکن وہ ناکام رہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سید جمال الدین افغانی اس پیغام کو لیکر اُٹھے، اور انہوں نے یورپ کی یلغار کے خلاف اتحاد اسلام کے حصار کو مضبوط کرنے کی دعوت دی۔ وہ ایک ایک اسلامی ملک میں گئے لیکن کسی نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا، اور دل شکستہ ہوکر راہی عدم ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے ترکوں نے عثمانی خلافت کی زیر قیادت مسلمانوں کو متحد کرنا چاہا۔ اور اس برصغیر میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہم نے اس سلسلہ میں ایک زبردست اور ملک گیر تحریک چلائی۔ لیکن اس سے بھی کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ اور جب برطانیہ نے عراق، شام، فلسطین اور خود حجاز پر پیش قدمی کی۔ اور خود مسلمان اس کی فوجوں میں شامل تھے اور وہ اس کی طرف سے ترکوں کے خلاف لڑے۔ سید جمال الدین افغانی کے بعد اتحاد اسلام کی کوششوں کی یہ دوسری ناکامی تھی۔

ہمارے بزرگ مرحوم و مغفور مولانا عبیداللہ سندھی اتحاد اسلام کے پروگرام کے تحت پہلی جنگ عظیم کے دوران ترک وطن کرکے افغانستان پہنچے تھے تاکہ وہ افغانوں کو ترکوں کی حمایت پر آمادہ کرکے اُن سے ہندوستان پر حملہ کرائیں، لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور

خلافت عثمانیہ جو متحدہ اسلام کا آخری سہارا تھی ختم ہوگئی۔ مولانا سندھی کابل سے جب ترکی گئے تو وہاں انہوں نے اتحاد اسلام کے اس مرکز میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم سوچی اور اس سلسلہ میں وہ ترکی کی ایک مشہور پارٹی کے لیڈر رؤف بے سے ملے۔ مولانا مرحوم کے ساتھی جناب ظفر حسین صاحب اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "رؤف بے نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر ایسی تجویز انہوں نے اپنے پارٹی پروگرام میں داخل کی تو جمہوریت خلق پارٹی (اتاترک کی پارٹی) جو ان کی پارٹی پر پہلے ہی قدامت پسندی کا الزام لگا رہی ہے، ان پر اتحاد اسلام اور پرانی روایتوں کو پھر زندہ کرنے کی تہمت لگائے گی اور اس طرح ان کی پارٹی کو ترقی تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ سے گرا دے گی۔

ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا کو رؤف بے کے اس جواب سے اتنی مایوسی ہوئی کہ جن سے عمر بھر کبھی اُن کو اتنا نا امید نہ دیکھا تھا۔ ان کی مسلمانوں کو پھر ایک سلسلہ میں منسلک کرنے کی امیدوں پر پانی پھر گیا تھا اس لئے ان کی بے چینی کی انتہا نہ رہی تھی۔

ترکی قومیت، ایرانی قومیت اور عرب قومیت کی یہ تحریکیں اتحاد اسلام کی ان تحریکوں کی پیہم ناکامیوں کا ردّ عمل ہیں۔ اور جب ہم ان قومیتوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے سامنے وہ تاریخی پس منظر بھی رہے جو ان قومیتوں کو فروغ دینے کا باعث اور محرک تھا۔

بے شک انما المؤمنون اخوۃ کے ارشاد کے مطابق روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں پرونا ضروری ہے، لیکن یہ کہ مختلف مسلمان ملکوں اور قوموں کی الگ الگ قومیتیں نہ رہیں، اس کا امکان آج کسی نظر نہیں آتا۔ اور جو لوگ اس کی دعوت دیتے ہیں وہ دراصل مسلمانوں سے ریت میں ہل جوتنا اور ان کی کوششوں کو ضائع کرنا چاہتے ہیں۔

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ

ملفوظات

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(۳)

ارشاد فرمایا کہ میں جس زمانے میں دہلی کہنہ میں رہتا تھا۔ کوچۂ انبیاء میں ایک سیّد کے گھر ایک پوربی باندی رہتی تھی جو بالکل جاہلہ تھی اور نماز کی بھی پابند نہ تھی۔ چونکہ وہ عمر رسیدہ ہوگئی تھی اور گھر کے تمام صاحبزادوں پر اپنا حق رکھتی تھی اس لئے وہ لوگ اس کی بڑی خدمت اور دیکھ بھال کرتے تھے۔ جب اس کا آخری وقت ہوا تو وہ ایک آواز پوربی لہجے میں بلند کرتی تھی جس کا مطلب و مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حکماء و صلحاء کو بلاکر دریافت کیا گیا کچھ نہ معلوم ہوا۔ آخر میرے چچا شاہ اہل اللہؒ کے بلانے کی نوبت آئی وہ تشریف لے گئے۔ انہوں نے معلوم کرلیا کہ اس کی زبان سے لا تخافی، لاتحزنی (اے عورت مت خوف کر مت غمگین ہو) نکل رہا ہے۔ چچا صاحب نے اس کے تیمارداروں سے فرمایا کہ اس سے دریافت کرو کہ یہ الفاظ کس وجہ سے کہہ رہی ہے۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے جواب دیا کہ ایک جماعت (فرشتوں کی) آئی ہوئی ہے اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں (جو میری زبان پر آگئے) پھر آپ نے دریافت کرایا کہ کیا تو ان الفاظ کا مطلب سمجھ رہی ہے؟ اس نے کہا مجھے تو بس اتنا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جماعت مجھے تسلّی دے رہی ہے۔ پھر چچا صاحب نے فرمایا کہ اس سے دریافت کرو۔ کس عمل کی وجہ سے یہ تسلّی دی جارہی ہے؟ اس نے کچھ دیر کے

بعد کہا کہ یہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ تیرے پاس اور اعمالِ خیر تو نہیں ہیں البتہ تو ایک دن موسم سرما میں گھی لینے کیلئے بازار گئی تھی - جب تو نے گھی لا کر گھر میں جوش دیا تو اس میں سے ایک روپیہ نکلا اول تو نے چاہا کہ اس روپے کو چپکے سے اپنے پاس رکھ لے اور اپنے کام میں لائے اس لئے کہ کسی کو اس راز کی خبر نہ تھی پھر یہ خیال کرکے کہ حق تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے تو نے وہ روپیہ دوکاندار کو لوٹا دیا تیرا یہ عمل اللہ کے یہاں پسند ہوا اسی کی وجہ سے ہم تجھ کو بشارت دے رہے ہیں۔

ارشاد فرمایا کہ اسی زمانے اور اسی محلے کی بات ہے کہ وہاں ایک بزرگ تھے جب ان کے انتقال کا وقت قریب آیا اور نزع کا عالم ہوا تو میں اپنے چچا صاحب کے ساتھ وہاں گیا۔ وہ بزرگ تسبیح گردانی کے طور پر انگلیوں کو حرکت دے رہے تھے اور سو دانوں کے شمار کے بعد جس طرح شمارے کو ایک خاص انداز میں کھینچا جاتا ہے وہ اتنی دیر کے بعد انگلیوں کو ایک خاص حرکت دیتے تھے۔ جب چچا صاحب نے (تسبیح ہاتھ میں لے کر) غور کیا تو ٹھیک سو دانوں کے شمار کے بعد انگلیوں کی وہ خاص حرکت ہو رہی تھی (حالانکہ اس وقت نہ تو ان بزرگ کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور نہ شمار کا ہوش تھا) اس وقت چچا صاحب نے فرمایا کہ اچھے کام کا محاورہ بھی کام آتا ہے (یعنی اچھے کام کی عادت ڈال لینا بھی اچھی بات ہے) مشق ہو جانے کے بعد فعل، بلا ارادہ بھی وقوع میں آجاتا ہے۔

ایک مرید نے عرض کیا کہ اگرچہ حضرت والا کو گوناگوں امراض گھیرے ہوئے ہیں اور مجلس میں گفتگو بھی فرماتے رہتے ہیں اس کے باوجود اکثر اوقات حضرت کے برکاتِ قلبیہ ہم کو محسوس ہوتے ہیں بعد انکسار فرمایا کہ توجہ چار قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) انعکاسی — یہ تمام طرق میں ہے — جب ایک قلب دوسرے قلب کے مقابل ہو تو اس کا اثر ہوتا ہی ہے - جیسا کہ آئینہ جب کسی چیز کے مقابل ہو تو وہ چیز بے ارادہ اس میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اسی توجہ انعکاسی کے لئے فقط مرید کی صفائی قلب درکار ہے۔

(۲) القائی — جیسے ایک شیشے کی چیز دوسرے شیشے میں انڈیلیں۔ اس میں قصد و ارادہ شرط ہے۔

(۳) جذبی — اس میں قلبِ طالب کو کھینچ کر اپنے قلب کے نیچے رکھتے ہیں وہ اس ترکیب تدبیر سے متاثر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک خشک کپڑا ایک تر کپڑے کے نیچے آجائے تو ضرور تر ہو جاتا

ہے۔

(۴) اتحادی ـــ کہ مرشد کے اوصاف بھی مرید میں سرایت کر جاتے ہیں، حتیٰ کہ یہ توجہ مرید کی صورت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے (یعنی مرید صورتاً بہت کچھ پیر و مرشد کے مشابہ ہو جاتا ہے)

فرمایا کہ بزرگ چار قسم کے ہیں۔

(۱) سالک مجذوب ـــ کہ اول سلوک اختیار کیا بعد ازاں جذب کی نوبت آئی، یہ بہترین قسم ہے۔

(۲) مجذوب سالک ـــ کہ پہلے ایک قسم کے جذب سے سرفراز ہوئے بعد ازاں سلوک اختیار کیا۔

(۳) سالک محض ـــ جو جذب سے مشرف نہیں ہوتے۔

(۴) مجذوب محض ـــ جن کی عقل، غلبۂ تجلی حق کی بنار پر سلب ہو جاتی ہے۔

ایک مرید نے عرض کیا کہ سلوک و جذب کے کیا معنی ہیں؟

فرمایا ـــ سلوک تو اجتہاداتِ کسب (کوشش و جد و جہد) کا نام ہے اور جذب، عنایتِ خداوندی ہے جو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

تاکہ از جانب معشوق نباشد کششے   کوشش عاشق بیچارہ بجائے نرسد

(یعنی جب تک محبوب حقیقی کی طرف سے کشش نہ ہو بے چارے عاشق کی کوشش ناکام رہتی ہے)

ایک مرید نے دریافت کیا، تمام افعال خلافِ شرع، راہ سلوک کو بند کرتے ہیں یا بعضے، ارشاد فرمایا کہ تکدّر تو خلافِ شرع، تمام اعمال سے پیدا ہو جاتا ہے لیکن بعض، اعمال ایسے ہیں کہ نسبت مع اللہ کا بیج بھی نہیں چھوڑتے۔

جیسے مکر، فریب، نخوت، تکبر، خود نمائی، طلبِ دنیا، طلبِ جاہ وغیرہ ـــ اور بعض کبائر ایسے ہیں کہ اگر وہ بطور، ندرت کے کبھی کبھی سرزد ہو جائیں تو (بعد توبہ) نسبت کو ختم نہیں کرتے بعض وہ اعمال ہیں جن سے نسبت کی نورانیت، قدرے ظلمت میں تبدیل ہو جاتی ہے جیسا کہ صغائر بے قصد و ارادہ ـــ

ارشاد فرمایا کہ نیت کا بہت زیادہ اعتبار ہے۔ نیّت کا دخل ہر عمل میں ہے اور سلوک

میں تو خاص طور پر نیت کو دخل ہے ۔

ارشاد فرمایا کہ ۔ ایک بزرگ تھے ان کا نام عبدالقادر تھا وہ بہت کم کھاتے پیتے تھے (ان کی خصوصیت تھی کہ) وہ جس کسی کو دیکھتے زبردستی اصرار کے ساتھ اپنا مرید کرتے تھے بلکہ ایک ایک دن میں ایک شخص کو دو دو مرتبہ مرید کرتے تھے لوگ ان سے تنگ آگئے اور ان کو دیکھ کر بھاگنے لگے ۔ کسی نے ان سے شوق بیعت کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہء خیبر کے موقعہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے فرمایا تھا کہ " اے علیؓ! تمہارے ذریعے سے اگر ایک شخص بھی ہدایت پاجائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے " (اسی وجہ سے میں لوگوں کو مرید کرتا ہوں کہ کسی راہِ راست پر آجانے سے مجھے اجر مل جائے)۔

فرمایا کہ — برہان الدین ابوالخیر بلخیؒ بچپن کے زمانے میں اپنے باپ کے ساتھ کہیں جارہے تھے، راستے میں برہان الدین مرغینانیؒ صاحبِ 'ھدایہ' کا گزر ہوا ۔ صاحبِ ہدایہ نے برہان الدین بلخیؒ کو خوب غور سے دیکھا اور فرمایا کہ میرا خدا مجھ سے کہلوا رہا ہے کہ یہ بچہ (بڑا ہوکر اپنے کمالات کے باعث) مرجعِ خلائق ہوگا ۔ باپ نے جو ساتھ تھے آمین کہی (چنانچہ ایسا ہی ہوا) یہی برہان الدین بلخیؒ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

گر کرمت عام شد، رفت ز برہاں عذاب

در بعمل کار شد وہ کہ چہا دید نیست

(یعنی اے اللہ! اگر تیرا لطف و کرم شامل ہوگیا تو مجھ برہان الدین سے عذاب دور ہوجائے گا اور اگر میرے اعمال کے مطابق کاروائی ہوئی تو نہ معلوم مجھے کیا کیا مصیبتیں دیکھنی اور جھیلنی پڑ جائیں)

فرمایا کہ ہر دین و مذہب میں احوالِ خمسہ کی حفاظت و رعایت ضروری سمجھی گئی ہے —
حفظِ عقل، حفظِ نفس، حفظِ دین، حفظِ نسب، حفظِ مال ۔

ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ اگر کوئی خواب میں ڈرتا ہے تو اس کو یَاشَدِیْدُ — بہت زیادہ پڑھنا چاہیئے ۔

فرمایا کہ 'خانقاہ' خان گاہ کا معرّب ہے یعنی بادشاہوں کی جگہ ۔

ایک شخص کے سوال کرنے پر فرمایا — ہر بھوکے محتاج کو کھانا کھلانا چاہیئے خواہ وہ مسلم

ہو یا غیر مسلم —

فرمایا کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے عہد میں تین "ضیاء" تھے — ایک ضیاء الدین سنامیؒ جو حضرتؒ کے منکر و مخالف تھے۔ دوسرے ضیاء الدین نخشبی بدایونیؒ جو نہ معتقد تھے اور نہ منکر تھے تیسرے ضیاء الدین برنیؒ (بلندشہری) صاحب تاریخ ہند، یہ حضرت کے مرید تھے۔

ارشاد فرمایا کہ عزیز و اقارب اکثر معتقد نہیں ہوتے ہیں۔ اور بعض ہمعصر لوگ بھی خواہ مخواہ نفرت و عداوت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے رلواں ملواں اعمال اپنی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں اور ان سے ہر قسم کا معاملہ پڑتا رہتا ہے۔ بس وہ اسی بناء پر ناخوش ہو جایا کرتے ہیں — کہا گیا ہے المعاصرۃُ اصلُ المنافرۃ یعنی ہمعصری منافرت کی جڑ ہے۔

ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک ایک حافظ اگر دو چار جگہ تراویح پڑھے تو سب جگہ ادائیگی سنت ہو جائے گی — چنانچہ میرا بچہ (نواسہ) میاں محمد یعقوب ایسا ہی کرتا ہے وہ ہر رات ایک پارہ مدرسے میں تراویح کے اندر سناتا ہے پھر گھر جا کر وہی ایک پارہ جماعت سے پڑھتا ہے اس طرح وہ رمضان میں دو قرآن ایک دو دن کے فرق سے ختم کر لیتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ میں نے بارہ گھنٹے سے کچھ کھایا نہیں، درد سر وغیرہ لاحق ہے اور ضعف بہت ہے (یہ تو میرا حال ہے اور) بہت سی عورتیں (گھر میں) آئی ہوئی بیٹھی ہیں۔ اب وہ مجھ سے ذکر سے متعلق نیز فقہی مسائل کی بابت بہت سے سوالات کریں گی —

حاضرین مجلس میں سے ایک نے عرض کیا کہ حضرت! عورتیں بہت خوش عقیدہ اور با اخلاص ہوتی ہیں۔ فرمایا ہاں — اسی بناء پر تو حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے علیکم بدین العجائز — (تم بوڑھی عورتوں کے طریقے کو لازم پکڑو) یعنی جس طرح وہ اپنے معاملات میں پختہ ہوتی ہیں تم بھی اپنے اندر اسی طرح دینی پختگی پیدا کرو —

ایک مرید نے عرض کیا کہ یہ جو ہوتا ہے کہ کبھی کسی سے طریقہ چشتیہ میں مثلاً بیعت ہوتے ہیں۔ پھر اسی بزرگ سے یا کسی دوسرے بزرگ سے قادریہ نقشبندیہ میں بیعت ہو جاتے ہیں جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا کہ اول جس طریقے میں بیعت ہو اس کا سلوک طے کرے چاہے اس میں کمی رہ جائے اور مکمل نہ ہو سکے — پھر بعد کو دوسری جگہ دوسرے طریقے میں اخذ فیض کرے تو مضائقہ نہیں ہے۔

طریقۂ اول کا سلوک طے کئے بغیر دوسری جگہ بیعت جائز تو ہے لیکن بیعت کو بازیچۂ اطفال نہ بنائے۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ میں ملکِ دکن سے اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی زبان مبارک سے رہنمائی حاصل کروں اور مستفید ہوں۔

ارشاد فرمایا کہ بعد نمازِ صبح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ پڑھا کرو، ظاہر و باطن کا فائدہ محسوس کرو گے۔

فرمایا۔ تمام سلسلے اچھے ہیں اور ہر ایک سلسلے والا اپنے سلسلے پر ناز کرتا ہے اور سب نے ہی آداب و قواعد سلوک بیان کیے ہیں لیکن بزرگانِ نقشبند نے قواعدِ سلوکیہ کو خوب درست کیا ہے۔ (تشبیہ کے طور پر) یوں سمجھو جیسے انگریزوں کی جنگ کہ وہ پوری تیاری اور بندوبست کے ساتھ میدانِ جنگ میں آتے ہیں۔ مولانا جامیؒ نے نقشبندیہ' سلسلے کے ابتدائی دور میں جب کہ اس سلسلے پر اعتراضات ہوتے تھے۔ ایک غزل کہی ہے (اس کا ایک شعر یہ ہے) ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار زند　　　　که برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

(ایک لطیفہ) ارشاد فرمایا کہ۔ ایک شخص جو نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے، سماع سنتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ تم تو نقشبندی ہو یہ وجد و سماع کہاں سے آگیا۔ انہوں نے جواب دیا میری سسرال والے چشتی ہیں' وجد و سماع جہیز میں آیا ہے

فرمایا کہ فنِ طبابت بھی ہمارے خاندان کا معمول تھا۔ دادا صاحب (شاہ عبدالرحیمؒ) اور چچا صاحب (شاہ اہل اللہؒ) مطب کرتے تھے۔ والد ماجد (شاہ ولی اللہؒ) نے اس مشغلے کو موقوف کردیا۔ مگر میں کتب طب کو پڑھتا ہوں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ شرح دادا انطاکی وغیرہ بعض کتب میں شہر دہلی کے اطبار کو اشکال پیدا ہوتا تھا تو وہ مجھ سے تحقیق کر لیا کرتے تھے، اب تو کتاب (دانی) موقوف ہو گئی (اس لئے کوئی تحقیق کرنے نہیں آتا) اب اس امر سے بھی نجات مل گئی، (کہ کتب طب کے مشکل مقامات حل کروں)۔

فرمایا کہ۔ ہندو سیکڑوں کی تعداد میں بندے کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں۔

ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا ان قصبات و قریات کے (جاہل) لوگوں کا یعنی نام کے مسلمانوں کا جن کا کلمہ و کلام بھی درست نہیں ہے۔ ذبیحہ جائز و درست ہے؟ فرمایا کہ اگر وہ ضروریاتِ دین کا

انکار نہیں کرتے تو ان کا ذبیحہ جائز ہوگا ۔

فرمایا ۔ پسر[1] محمد علی خان (فاروقی) ارکاٹی نے ترجمہ تحفۂ اثناعشریہ عربی زبان میں مولوی اسلمی[2] (مدراسی) سے کراکر ملک عرب میں بھیجا ہے میرے پاس بھی ایک نسخہ بھیجنے کا قصد تھا مگر وہ نہ بھیج سکے ۔

فرمایا کہ تحفۂ اثناعشریہ[3] کی تاریخ تصنیف ایک شخص نے یوں کہی ہے ؎

تحفہ را یک فنہ مداں کہ درو	سوئے ہر معرفت سراغ آمد
سوئے لفظ و معانیش بنگر	ہست دریا کہ در ایاغ آمد
بسکہ نورِ ہدایت است و یقین	سالِ تصنیف او 'چراغ' آمد ۱۲۰۴ھ

برسبیلِ تذکرہ فرمایا کہ ایک شاعر نے (بندے کے متعلق) یوں کہا ہے ؎

جامع علم و عمل 'شیخ الوریٰ عبدالعزیز'	آنکہ او اندر جوانی کار پیراں می کند
بسکہ استمداد ، دارد از سحابِ معنوی	بحرِ مواج است چوں تفسیرِ قرآں می کند

[1] گوپاموٗ ضلع ہردوئی کے فاروقی خاندان نے مدراس میں اپنی حکومت قائم کی تھی ۔ محمد علی خاں غالباً اس حکومت کے بانی ہیں ۔ مولانا محمد ابرار حسین فاروقی گوپاموی ایم ۔ اے علیگ "جواہر زواہر" میں تحریر فرماتے ہیں "تحفۂ اثناعشریہ نے کافی شہرت حاصل کی جس کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا تھا ۔ جس کو نواب والاجاہ اول والئ مدراس کے صاحبزادے اور جانشین نواب عمدۃ الامراء والاجاہ ثانی نے عرب ممالک کے لئے کرایا تھا یہ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ ترجمہ طبع ہوا یا نہیں (ص ۹۶)

[2] مولوی اسلمی مدراسی کا نام محمد سعید ہے ، نہایت فاضل تھے ۔ ملک العلماء مدراس کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ۔ ۱۲۷۲ھ میں انتقال ہوا (ترجمہ تذکرۂ علمائے ہند مطبوعہ کراچی ص ۱۱۱)

[3] ان تینوں شعروں کا مفہوم و مطلب یہ ہے ـــ تحفۂ اثناعشریہ کو صرف ایک فن کی کتاب نہ سمجھو اس میں ہر علم و معرفت کی رہنمائی موجود ہے ـــ اس کے الفاظ و معانی پہ نگاہ کرو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوزے میں دریا کو بند کر دیا گیا ہے ـــ چونکہ یہ کتاب نور ہدایت و یقین ہے اس لئے اس کی تاریخ تصنیف لفظ 'چراغ' سے نکلتی ہے ۔

(ترجمہ۔ جامع علم وعمل شاہ عبدالعزیز وہ ہیں جو جوانی کے اندر عمر رسیدہ علماء کا کام انجام دے رہے ہیں چونکہ وہ سحابِ معنوی سے استمداد کرتے ہیں اس لئے تفسیر قرآن کرتے وقت ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر معلوم ہوتے ہیں (اس قطعہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے تفسیر "فتح العزیز" جوانی کے زمانے میں لکھی تھی)

ایک شخص نے سوال کیا کہ قدم شریف کی اصل احادیث میں آئی ہے؟

جواباً ارشاد فرمایا کہ سوائے جلال الدین سیوطیؒ کے تمام محدثین اس کو صحیح نہیں جانتے. میں نے بھی اس کی سند ہر چند تلاش کی نہیں پائی۔

فرمایا کہ زیارتِ قبور کے بارے میں بہت سی ایسی بدعات رائج ہوگئی ہیں جن کو فقہاء منع کرتے ہیں۔

فرمایا کہ ہر جانور کا بچہ جلد دوڑنے لگتا ہے اور آدمی کا بچہؔ بعد دو سال کے چلتا ہے اور وہ بھی ضعف اور آہستگی کے ساتھ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آدمی کا سر اس کے قد کے تناسب سے بڑا ہوتا ہے۔ برخلاف دوسرے حیوانات کے کہ ان کے قد وقامت کے لحاظ سے چھوٹا ہے۔ آدمی کو یہ بڑا سر اس لئے دیا گیا ہے کہ اس میں قوتِ فکریہ زیادہ چاہیئے۔ تاکہ جمیع امورات کو انجام دے سکے۔

(اسی بات کے ساتھ یہ بھی فرمایا) ایک بات یہ بھی غور کرنے کی ہے کہ اگر کوئی چیز داہنے ہاتھ پر رکھی جائے تو بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ برخلاف بائیں ہاتھ کے کہ اسی وزن کی چیز اس پر ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ داہنا ہاتھ بہت سے کام انجام دیتا اس پر ایک چیز رکھ کر اس کو گویا مقید کر دیا گیا۔ بایاں ہاتھ زیادہ تر بیکار و معطل رہتا ہے اسی وجہ سے وہ چیز اس کو گراں نہیں معلوم ہوتی۔

ارشاد فرمایا کہ بعض امور تجربے کے بعد معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مطالعۂ کتب (عربیہ) وہ شخص اچھی طرح کرسکتا ہے جس کو علمِ نحو خوب یاد ہو۔ اور مناظرے میں وہ غالب رہتا ہے جو اصول خوب یاد رکھتا ہے۔ اور گھر میں تنہا بیٹھ کر فکر وہ اچھی کرسکتا ہے جو منطق میں ماہر ہو ــــ

فرمایا کہ ــ پختہ عالم وہ ہے جس کی چار چیزیں پختہ ہوں ــ مطالعہ، درس، تحریر و تقریر و مناظرہ۔

ارشاد فرمایا کہ ہر علم کے درس کا طریقہ ہمارے یہاں جداگانہ ہے۔ اس کو تفصیل سے بیان کرکے فرمایا کہ درسِ تصوف میں میرا طریقہ یہ ہے کہ اول لوائح جامی بجائے میزان الصرف کے بعدہٗ لمعات اور شرحِ لمعات اس کے بعد درّۂ فاخرہ، تصنیف صدرالدین قونوی شاگرد محی الدین ابنِ عربی بعدہ فصوص پھر فتوح الغیب ــــ

ارشاد فرمایا کہ ــــ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں چار بری عادتیں اپنے اندر رکھتا ہوں اگر آپ فرمائیں تو ان میں سے ایک کو چھوڑ دوں، چاروں کا چھوڑنا مشکل ہے۔ دریافت فرمایا وہ کون کون سی بری عادتیں ہیں۔ عرض کیا۔ چوری، زنا، دروغ گوئی اور شراب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کی (چوری وغیرہ کی) سزاؤں کا حال تجھ کو معلوم ہے اس نے عرض کیا جی ہاں معلوم ہے فرمایا کہ بس جھوٹ چھوڑ دے۔ اس نے قبول کیا۔ پھر جب کسی حرکت کا ارادہ کرتا تھا وہ جھوٹ نہ بولنے کا اقرار اور فعلِ بد کی سزا یاد کرتا تھا اور باز رہتا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر چہار طرف سے مقید کردیا۔

ایک مرید نے عرض کیا کہ کیا رسمی طور پر مرید ہونا بھی خالی از فائدہ نہیں ہے؟ ارشاد فرمایا کہ ہاں تجربہ ہے کہ مرید رسمی بھی پیرانِ طریقت کی توجہات کے ساتھ مخصوص ہوجاتا ہے ــــ ایک بزرگ سمرقند کی جانب سفر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ان سے فرمایا کہ سفر میں یاحفیظ نوسو اٹھانوے بار اور سورہ لایلاف بے تعیین کثرت سے پڑھتے رہنا۔

ایک مرید نے عرض کیا کہ انزالِ کتب اور ارسالِ انبیاء سے مقصود بالذات و بالاصل وصول اللہ ہے یا احکام ظاہری کا بجالانا؟ ارشاد فرمایا کہ تم نے میرے درس میں سُنا ہوگا کہ اسلام، ایمان اور احسان کی حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرمائی ہے ــ اس کے پیشِ نظر مقصودِ اصلی یقیناً احسان ہے۔ جس طرح اسلام بے ایمان معتبر نہیں، نزد امام غزالیؒ، ایمان بے احسان معتبر نہیں ہے مگر ہاں نجات فقط ایمان سے بھی ہوجائے گی ــــ پھر فرمایا کہ اسلام ایمان اور احسان ان تینوں میں سے ہر ایک کا ایک خاصہ و نتیجہ ہے جو اسلام لایا یعنی انقیادِ ظاہر رکھتا ہے، اس کا مال اور اس کی حرمت سلطان اور طاعن سے محفوظ ہوگئی۔ اور جو ایمان سے ملا ہوا اسلام رکھتا ہے نجات اس کے حصے میں آگئی۔ اور جو مرتبۂ احسان پر پہنچ گیا، قربِ الٰہی اس کو حاصل ہوگیا گویا کہ احسان کمال مرتبۂ ایمان ہے ــــ

ایک مرید نے عرض کیا کہ نوشتۂ غزالیؒ حسب صحیح درست ہے؟ فرمایا ہاں ــــ

ابوجعفر نصیر الدین طوسی

محمد جواد مغنیہ
ترجمہ: رضیا

ابوجعفر طوسی کا اصل نام محمد بن محمد الحسن الجہرودی تھا۔ جہرود ایران کے علاقہ قم میں ایک شہر تھا۔ لیکن موصوف مشہور ابوجعفر طوسی کے نام سے ہوئے۔ کیونکہ وہ ایران کے علاقہ خراسان میں واقع طوس شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی۔ طوس میں عباسیوں کے مشہور خلیفہ ہارون الرشید کی قبر ہے۔ ابوجعفر طوسی کا سن پیدائش ۱۱ جمادی الاولیٰ ۵۹۷ھ ہے۔ آپ کا لقب خواجہ نصیر الدین تھا۔

ابوجعفر نے لغت و ادب اور فقہ و حدیث اپنے والد سے، حکمت و فلسفہ اپنے ماموں سے اور ریاضیات کمال الدین یوسف الموصلی اور معین الدین المصری سے پڑھی۔ اس کے بعد وہ نیشاپور گئے اور وہاں سراج الدین القمری، قطب الدین سرخسی اور بعض دوسرے علماء کی مجالس درس و تدریس میں بیٹھے۔ اور فرید الدین داماد اور بہت سے دوسرے علماء و فضلاء سے ملے۔ نیشاپور ہی میں ان کی ذہانت اور تفوق کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور ان کی شہرت دور دور پھیلی۔

فوات الوفیات کے مصنف محمد بن شاکر بن احمد الکتبی المتوفی ۷۶۴ھ لکھتے ہیں کہ نصیر الدین طوسی پہلوں کے علوم بالخصوص علم رصد و مجسطی میں فائق تھے اور وہ ان میں بڑے بڑوں سے بازی لے

گئے ۔ موصوف خوش شکل، بڑے فیاض، بردبار اور صاحب اخلاق حسنہ تھے۔ علوم سائنس کا مشہور مورخ سارٹن لکھتا ہے کہ ٗطوسیٗ عظیم ترین علمائے اسلام اور ان کے سب سے بڑے ریاضی دانوں میں سے تھے ۔ مستشرق ٗبروکلمانٗ لکھتا ہے کہ وہ ساتویں صدی ہجری کے سب سے مشہور عالم ہیں اور ان کی کتابیں سب سے زیادہ مشہور ہیں ۔ خواجہ نصیرالدین طوسی کے نامور ترین شاگرد علامہ حلی یوسف بن علی المطہر فقہ اور علم کلام کی مشہور کتابوں کے مصنف، اور قطب الدین محمود شیرازی، شرف الاشراف، اور ٗالکلیاتٗ، کتابوں کے مصنف تھے ۔

خواجہ نصیرالدین طوسی کی زندگی میں تاتاریوں نے چنگیز خان کی زیر قیادت خراسان پر حملہ کیا ۔ جہاں کا فرماں روا اس وقت سلطان محمد خوارزم شاہ تھا ۔ سلطان کو تاتاریوں کے مقابلے میں شکست ہوئی ۔ اور خراسان میں انتشار و خلفشار پھیل گیا، لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ گئے ۔ اور خواجہ طوسی کو بھی اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ روپوش ہو گئے ۔

تاتاریوں کے پہلے حملے کے سامنے اسماعیلیوں کے قلعوں میں ٗقلعہ الموتٗ اور ٗقہستانٗ کے سوا اور کوئی نہ ٹھہر سکا ۔ اور ان دونوں قلعوں کے علاوہ خراسان کے باقی سب شہروں نے چنگیز خان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ۔ ان قلعوں کا حاکم فرقۂ اسماعیلیہ کا زعیم علاؤالدین محمد تھا ۔ اور اس کی طرف سے ٗقہستانٗ کا والی المحتشم ناصرالدین تھا ۔ جب آخرالذکر کو خواجہ نصیرالدین طوسی کا حال معلوم ہوا اور اسے پتہ چلا کہ موصوف جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں تو ان کے پیچھے اپنے آدمی بھیجے اور انہیں ٗقہستانٗ آنے کی دعوت دی ۔ خواجہ طوسی کی اس دعوت سے جان میں جان آئی اور انہوں نے بڑی خوشی سے اسے منظور کیا ۔ المحتشم ناصرالدین نے خواجہ طوسی کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے بلند مقام کو پہچانا ۔ قہستان کے زمانۂ قیام میں خواجہ نصیرالدین طوسی نے ابو علی مسکویہ الرازی کی کتاب ٗالطہارۃٗ کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ اور اس کا نام اپنے میزبان قہستان کے والی ناصرالدین کے نام پر ٗاخلاق ناصریٗ رکھا ۔ نیز ٗالمعینہٗ کے نام سے علم الھیئہ پر ایک رسالہ لکھا ۔ اور اسے معین الدین بن ناصرالدین کی طرف منسوب کیا ۔ اسی طرح اس زمانے میں انہوں نے اور بھی کتابیں لکھیں ۔

لیکن قہستان میں خواجہ طوسی کی زندگی ویسی نہ گزری جیسے وہ چاہتے تھے ۔ کیونکہ المحتشم

ناصر الدین کے بعض حاشیہ نشینوں نے خواجہ طوسی کے خلاف اسے بھڑکا دیا اور اُن پر حسد کرتے ہوئے اُن کے خلاف اس سے چغلیاں کیں اور حاکموں کے جو مقرب ہوتے ہیں وہ جب کسی کو اپنے سے بہتر اور افضل دیکھتے ہیں تو وہ یہی کیا کرتے ہیں۔ قہستان کے والی المحتشم نے خواجہ طوسی کو قید کر دیا اور اپنے قلعوں میں سے ایک قلعہ میں انہیں قید کر دیا۔ اس قید کے زمانہ میں انہوں نے اپنی ریاضی کی اکثر تالیفات مکمل کیں، جنہوں نے طوسی کو بقائے دوام بخشا اور انہیں مشہور ترین عالم بنایا۔ وہ اس وقت تک المحتشم کی قید میں رہے جب ہلاکو کی زیر قیادت تاتاریوں کا دوسرا حملہ ہوا اور ان کے سامنے اسماعیلیوں کے قلعوں سمیت ایران کے سب شہروں نے ہتھیار ڈال دیئے اور خواجہ نصیر الدین طوسی ہلاکو کے قبضہ میں آ گئے۔

طوسی کو ہلاکو کا تقرب حاصل ہو گیا اور وہ ان کے مشورہ پر چلنے لگ گیا۔ اُس نے انہیں اپنا وزیر بنا لیا اور اپنی مملکت کے سارے اوقاف کا انتظام ان کو دیا۔ یہاں نصیر الدین طوسی کی لیاقت، ان کے اخلاص اور علم سے ان کی محبت کا عملی اظہار ہوتا ہے۔ ان کو ہلاکو کے ہاں جو اثر و رسوخ حاصل تھا اُسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے علمی ورثہ کو بچا کر علماء کی عزت و احترام کر کے مدارس اور رصدگاہیں بنا کر، مصیبت زدوں کی مدد اور انکی ضرورتیں پوری کر کے اور مظلوموں کی دادرسی کر کے اور ان کے حقوق انہیں واپس دلا کر انسانیت کی بڑی خدمت کی۔ وہ اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کرتے تھے۔

اس ضمن میں "فوات الوفیات" کے مصنف محمد بن شاکر بن احمد نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہلاکو اپنے صاحب دیوان (دفتر کے افسر اعلیٰ) علاؤ الدین جوینی پر سخت ناراض ہو گیا اور اُس کے قتل کا اس نے حکم دیدیا۔ اور ہلاکو جب کوئی حکم دیتا تھا، تو پھر اسے رد کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ جب خواجہ نصیر الدین طوسی کو اس کا علم ہوا تو وہ ہلاکو کے پاس ایسے وقت میں پہنچے کہ اس وقت کوئی اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا طوسی ہلاکو کو دیکھتے ہی سجدہ میں پڑ گئے اور دیر تک سجدہ میں رہے۔ ہلاکو خاں نے انہیں

مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ خان (ہلاکو خاں، چنگیز خان اور دوسرے خان سے ملقب تھے) کا طالع بتاتا ہے کہ اس پر ایک بہت بڑی مصیبت آنیوالی ہے۔ میں نے رد بلا کے لئے اللہ تعالیٰ سے وہ دعائیں کی ہیں جو میں جانتا تھا۔ اب خان یہ کرے کہ اس وقت اپنی سلطنت کے تمام حصوں میں یہ حکم بھیجے کہ تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں اور ان کے گناہ معاف ہوں۔ اس طرح امید ہے اللہ تعالیٰ خان کے سر سے وہ آنے والی سخت مصیبت دور کر دے۔ ہلاکو نے طوسی کی بات پر عمل کیا اور یوں علاؤالدین جوینی کی جان بچ گئی، اگرچہ طوسی نے اس کا نام نہ لیا تھا اور دوسروں کے ساتھ ساتھ وہ بھی عفو عام میں شامل ہو گیا۔ فوات الوفیات کے مصنف لکھتے ہیں "اپنے مقصد تک پہنچنے اور لوگوں سے مصیبت دور کرنے کے لئے یہ ایک بڑا حیلہ تھا"

"روضات الجنۃ" کے مصنف نے الکشکول کے مصنف سے روایت کی ہے کہ خواجہ نصیر الدین طوسی ۶۵۵ھ میں ہلاکو کے ساتھ بغداد آئے تھے اور اُن کے ساتھ اُن کے شاگردوں اور ساتھیوں کی ایک تعداد تھی۔ بغداد سے حلّہ گئے اور وہاں مشہور محقق عالم جعفر بن سعید الحلّی سے ان کی بحثیں ہوئیں اور یہ بزرگ فرقہ شیعہ کے اُس دور میں سربراہ اور مرجع تھے۔

جب ہلاکو خاں نے خواجہ نصیر الدین طوسی کے سپرد اوقاف کئے تو انہوں نے انہیں نظم وضبط میں لانے، ان کی حفاظت کرنے اور انہیں ترقی دینے کی کوشش کی۔ طوسی نے ہر شہر میں اپنے نائب مقرر کئے جو اوقاف کی آمدنی جمع کرتے اور اُسے اُن تک پہنچاتے تھے اور وہ اس آمدنی کو علماء، اصحاب فلسفہ وحکمت اور علمی اداروں کے قیام پر صرف کرتے تھے، چنانچہ خواجہ طوسی نے ایک ایسا کتب خانہ قائم کیا جس میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں۔ اور اُس زمانہ میں وہ دنیا میں اپنی قسم کا پہلا کتب خانہ تھا۔

خواجہ طوسی نے ایک جمعیت کی تشکیل کی جن میں اصحاب علم وفضل کے ساتھ ساتھ طالبانِ علم بھی تھے۔ انہوں نے ہر فلسفی کے لئے تین درہم، ہر طبیب کے لئے دو درہم، ہر فقیہ کے لئے ایک درہم اور ہر محدّث کے لئے نصف درہم روزانہ وظیفہ مقرر کیا۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ فقہ و حدیث کے بجائے فلسفہ و طب کے مطالعہ کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے حالانکہ دوسری جگہوں میں فلسفہ چوری چھپے اور خفیہ پڑھایا جاتا تھا۔

خواجہ نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خاں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک عظیم الشان رصدگاہ قائم کرے جس سے کہ اُسے شہرت دوام حاصل ہو، چنانچہ ہلاکو نے اس رصدگاہ کو بنانے کی ذمہ داری طوسی ہی کے سپرد کردی۔ اور اس کے لئے جس قدر رقم کی ضرورت تھی اسی کے تصرف میں دیدی۔ انہوں نے اس رصدگاہ کو بنانے کے لئے ہر طرف سے مشہور اہل علم اور ارباب فکر و عقل کو جمع کیا، جن میں بعض یہ تھے :۔ دمشق کے المؤید العرفی، موصل کے الفخر المراغی، تفلیس کے الفخر الخلاطی، حلب کے محی الدین المغزلی اور النجم دمران القزوینی وغیرہم۔

اس رصدگاہ میں کثیر التعداد آلات تھے اور بعض ان میں سے ایسے تھے کہ علمار فلکیات تک ان سے واقف نہ تھے۔ شمس الدین الحریری حسن بن احمد الحکیم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:۔

"میں مراغہ گیا اور وہاں کی رصدگاہ دیکھی جس کے منتظم خواجہ نصیر الدین طوسی ہیں۔ یہ نوجوان علم نجوم اور فارسی شاعری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ میں نے رصدگاہ میں بہت سی عجیب چیزیں دیکھیں، ان میں سے ایک ذات الحلق ہے اور یہ پیتل کے پانچ دائرے ہیں۔ ایک دائرہ نصف النہار کا ہے جو زمین پر مرکوز ہے، ایک دائرہ معدل النہار کا ہے، ایک منطقہ بروج کا، ایک دائرہ عرض کا ایک دائرۃ المیل۔ اور میں نے دائرہ شمسیہ دیکھا جس سے کواکب کی سمت معلوم کی جاتی ہے۔"

اس سے پہلے کواکب کی پیمائش تیس ۳۰ برس سے کم عرصہ میں نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس مدت میں سات کواکب اپنا دورہ پورا کرتے تھے۔ ہلاکو نے خواجہ نصیر الدین طوسی سے کہا کہ یہ کام بارہ سال میں ہونا چاہیئے۔ خواجہ نے جواب دیا کہ میں اس کی کوشش کرتا ہوں۔ مستشرق اوندلس نے لکھا ہے کہ یہ کام بارہ سال میں ہوگیا۔ خواجہ طوسی نے پہلے زائچوں

کے حساب میں شروع سال کا جو سورج کا مقام معین کیا گیا تھا اُس میں چالیس دقیقوں کی غلطی نکالی۔

خواجہ نصیر الدین طوسی نے مراغہ کی اس رصدگاہ کو اہل علم و حکمت کی ایک کثیر تعداد کو جمع کرنے، اُن کی حمایت کرنے اور کتابوں کو تباہ ہونے سے بچانے کا ذریعہ بنایا۔ اور اس طرح وہ اہل علم و حکمت کی ایک بڑی تعداد کو بچانے اور بہت سی کتابوں کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہوئے۔

"اعیان الشیعہ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے ایک سو چوراسی[۱۸۴] کے قریب کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد مصنف مذکور نے ان میں سے تراسی[۸۳] کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ "فوات الوفیات" کے مصنف نے پچاسی[۸۵] کتابوں کے نام گنے ہیں۔

جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیہ" میں لکھا ہے:۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کی فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضیات، طبیعیات، نجوم، طب و سحر وغیرہ میں تصنیفات ہیں، جن میں چند اہم یہ ہیں:۔

(۱) جواہر الفرائض فی الفقہ۔ اس کا ایک نسخہ برلن میں ہے۔ مصنف نے یہ کتاب مذہب امامیہ کی فقہ پر لکھی ہے۔

(۲) تجرید العقائد۔ اس کتاب کے نسخے برلن اور پسک میں ہیں۔ اس کی متعدد شرحیں اور مختصرات ہیں جن میں سے بعض چھپ چکے ہیں (یہ علم الکلام پر ہے۔ اس میں مصنف نے مذہب امامیہ کی تائید کی ہے۔ بہت سے علمائے اہل سنت و شیعہ نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب عرصہ دراز سے نجف اور قم کی درسگاہوں میں اس کی شرح مؤلفہ علامہ حلّی کے ساتھ داخل نصاب ہے۔ یہ ایران اور لبنان کے شہر صیدا میں چھپی ہے۔)

(۳) قواعد العقائد۔ اس کا ایک نسخہ برلن میں ہے۔ اس کی ایک شرح رازی کی ہے (یہ چھپ چکی ہے اور اُن کے شاگرد علامہ حلّی کی شرح کے ساتھ عام ملتی ہے)

(۴) اثبات الجوہر المفارق۔ اس کا نسخہ برلن میں ہے۔

(۵) کتاب اوقلیدس۔ اس کے نسخے برلن اور منشن وغیرہ میں ہیں۔

(۶) المقالات الست - یہ کتاب ۱۸۲۴ء میں چھپی تھی۔

(۷) مختصر کرات ارخمیدس لثابت بن قرہ - اس کا نسخہ برلن میں ہے۔

(۸) انعکاس الشعاعات - اس کا نسخہ برلن میں ہے۔

(۹) تحریر المجسطی - اس کے نسخے برلن اور برٹش میوزم میں ہیں۔

(۱۰) التذکرۃ النصیریہ - یہ علم النجوم پر ہے - اس کی متعدد شرحیں ہیں - اس کے نسخے یورپ کے کتب خانوں اور استانبول میں ہیں۔

(۱۱) التحصیل فی النجوم - اس کا نسخہ آکسفورڈ میں ہے۔

(۱۲) البارع - اس کے نسخے برلن وغیرہ میں ہیں۔

اس کے بعد جرجی زیدان لکھتا ہے :- ان کتابوں کے علاوہ خواجہ نصیر الدین طوسی کی فارسی میں کتابیں ہیں، جن کا عربی اور ترکی میں ترجمہ ہوا - اور اُن کی بعض کتابوں کے ترجمے لاطینی میں بھی ہوئے - یہ کتابیں تقویم اور جغرافیہ کے متعلق ہیں - ان میں سے بعض ۱۶۴۸ء میں لندن میں طبع ہوئیں اور بعض ۱۶۵۲ء میں لندن میں چھپیں - بروکلمان نے اپنی کتاب کی دوسری جلد صفحہ ۵۰۸ - صفحہ ۵۱۲ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الخالدون فی العرب کے مصنف لکھتے ہیں :- خواجہ طوسی کی علم الہیئت پر جو کتابیں ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس علم میں بہت سی اہم چیزوں کا اضافہ کیا ہے - وہ الاعتدالین کو ایجاد کرنے میں کامیاب ہوئے اور علم الافلاک کے بعض مشکل مسائل کے بارے میں انہوں نے نئی دلیلیں دیں - طوسی نے کون کے متعلق ایک نیا نظام وضع کیا جو اُس نظام سے جو بطلیموس نے وضع کیا تھا، زیادہ مبسوط تھا۔

سارتن لکھتا ہے کہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے اقوال نے اُن اصلاحات کیلئے زمین ہموار کی جو بعد میں کوپرنیکس نے کی - کاراوی فو نے طوسی کی کتابوں کی بعض فصلوں کے ترجمے فرانسیسی میں کئے - اسی طرح نارنری و درابر نے خواجہ طوسی کے بارہ میں اُن کرۂ سماوی اور نظام کواکب کے بارہ میں انہوں نے جو بحثیں کی ہیں ان پر لکھا ہے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی کی کتاب "شکل القطاع" پہلی کتاب ہے جو علم الفلک سے علم المثلثات کو امر نمایاں کرکے پیش کرتی ہے اور اسے ایک مستقل علم کی حیثیت دیتی ہے خواجہ طوسی کی یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے زاویہ قائمہ کی مثلث کری کے لئے چھ حالات (حالات الست) استعمال کئے۔ جو بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے گا وہ یہ جانے گا کہ طوسی کے بعد اس کتاب کے نظریات اور دعاوی پر اہل علم نے کسی اہم چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ اہل یورپ نے اس کتاب کے لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ترجمے کئے ہیں۔ یہ کتاب کئی صدیوں تک یورپ کے اہل علم کا مرجع رہی ہے جس سے وہ معلومات حاصل کرتے تھے۔ ریجیولونتانوس نے اپنی کتاب علم المثلثات کی تدوین میں طوسی کی اس کتاب پر اعتماد کیا ہے۔

(ترجمہ ماہنامہ "العربی"۔ کویت)

ارضِ فلسطین کی اہمیت

حافظ عباد اللہ فاروقی ایڈوکیٹ

فلسطین ایک چھوٹا سا خطۂ ارض ہے لیکن محل وقوع کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہے یہ مشرق وسطیٰ کے عین قلب میں واقع ہے۔ ۱۹۳۶ء میں برطانوی وزیر مسٹر امیری نے دار العوام یعنی House of Commons میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"فلسطین ہمارے لئے ویسا ہی اہم ہے جیسے لندن میں کلیفم جنکشن، رسل و رسائل، تیل کے پائپ ہوائی مستقر اور دنیا کے مختلف حصوں سے ربط قائم رکھنے کے لئے یہ مقام بے حد اہم اور ہماری زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے، ہم اس کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ حیفہ کی بندرگاہ کو اگر اعلیٰ پیمانے پر ترقی دی جائے تو اور زیادہ مفید نتائج برآمد ہوں گے۔"

مسٹر امیری کی اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک کے تیل کے وسیع ذرائع ان کی آزادی اور حفاظت کے مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ نے بحرین سے سعودی عرب کے علاقوں تک تیل کا لمبا چوڑا جال بچھا رکھا ہے اور کوشاں ہے کہ یہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھے۔ روس کو بھی مشرق وسطیٰ سے خاصی دلچسپی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقامات روس کے خلاف جنگی کارروائیوں میں استعمال کئے جائیں گے ان حالات میں یہ تین بڑی طاقتیں یعنی برطانیہ، روس اور امریکہ کسی نہ کسی صورت میں مشرقِ وسطیٰ پر بالخصوص فلسطین پر اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ جب سے برطانیہ کا تسلط نہر سویز سے اُٹھ گیا ہے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ فلسطین پر ان کا تسلط قائم رہے۔ حصولِ مقصد کے لئے انہوں نے اسرائیلیوں کو آلہ کار بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعہ سے عرب اقوام پر ظلم و تشدد کئے جا رہے ہیں۔ نہر سویز وہ اہم مقام ہے جہاں سے بیک وقت برّاعظم افریقہ یورپ اور برّاعظم ہند و پاکستان پر یکساں نگرانی رکھی جا سکتی ہے۔ برطانیہ کا یہاں سے اقتدار

اُٹھ جانے کے بعد برطانیہ اس کا بدل سرزمین فلسطین ہی کو خیال کرتے ہیں۔

برطانیہ کا بحیرہ روم پر قبضہ تو ملکہ الزبتھ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے جب کہ انہوں نے سپین کا آرمیڈا تباہ کر کے جبرالٹر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد نپولین کو واٹرلو کے مقام پر شکست دیکر جزیرہ مالٹا لے لیا جو بحیرہ روم کے مرکز میں ہے۔ اس کے بعد جزیرہ سائپرس پر قبضہ کر کے مشرق وسطیٰ پر اپنا پورا اقتدار قائم کر لیا تاکہ فلسطین کے ہوائی اڈوں اور موصل و دیگر مقامات پر تیل کے پائپ وغیرہ کو بھی اپنے قابو میں لا سکیں۔ حصول مقصد کے لئے انہوں نے فلسطین کے قلب میں یہودی قوم کو بسا کر عرب علاقوں کو بتدریج ہڑپ کرنا شروع کر دیا ہے۔ استعمار پسندوں نے یہودی قوم کو ہر طرح کی جنگی و مالی مدد دے رکھی ہے جسکا ثبوت حالیہ جنگ میں مل چکا ہے۔ غرض اس وقت بڑی طاقتوں کی حریصانہ نگاہیں فلسطین کے تیل پر لگی ہوئی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح عرب ممالک ہڑپ کر لیا جائے۔

کنگسلے نارٹن مشہور جریدہ نگار لکھتا ہے "عجب اتفاق ہے کہ جہاں مسلمان پائے جاتے ہیں وہاں تیل کے چشمے بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جہاں تیل کے چشمے پائے جاتے ہیں وہاں مسلمانوں کی سرزمینیں ہیں"۔

فلسطین کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ محل وقوع کے اعتبار سے وہ بحر مردار کے قریب ہے، جس میں قدرت کے جمع کردہ خزائن کا انبار پڑا ہے۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس اور عثمانی عہد میں ترکی بھی اس کوشش میں رہے کہ بحر مردار کے خزائن پر اپنا اپنا تسلط قائم کریں۔

اس سیاسی و جغرافیائی اہمیت کے علاوہ فلسطین کی اہمیت جو مذہبی نقطہ نگاہ سے ہے وہ مسلمانانِ عالم کبھی بھول نہیں سکتے۔ فلسطین کی سابقہ مذہبی اہمیت کسی پر مخفی نہیں لیکن یہ اہمیت واقعہ معراج سے اور بھی بڑھ گئی ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس جانا اور موریہ کی پہاڑی کی چوٹی سے جہاں اب Helerens کا گرجا گھر واقع ہے عرش بریں تک جانا نیز آپ کے براق ایک خاص مقام (جواب "دیوار گریہ" کہلاتا ہے) پر ٹھیرنا فلسطین کی اہمیت کو بڑھانے اور قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔

بیشتر اس کے فلسطین کے مقاماتِ مقدسہ کا ذکر کیا جائے اس کی مختصر سی تاریخ بیان کر دینی ضروری ہے۔

۶۳۶ء میں سب سے پہلے خلیفہ دوئم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد ۹۶۹ء میں اہل مصر نے فتح کیا، اور ۱۰۸۷ء میں سلجوقی ترکوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۱۰۹۶ء میں صلیبی جنگ چھڑی اور ۱۰۹۹ء میں فلسطین پر مغربی حملہ آوروں یعنی عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا اور بیت المقدس میں لاطینی حکومت قائم ہوگئی۔ صلیبی جنگوں کا سلسلہ ۱۱۸۷ء تک جاری رہا۔ آخر کار مسلمانوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں رچرڈ لائن (Richard the Lion) کی عیسائی فوج کو "حطین" کے مقام پر زبردست شکست دی۔ ۱۱۸۷ء میں جب سلطان کو عیسائیوں کے مقابلہ میں نمایاں اور تاریخی فتح حاصل ہوئی تو اس نے بیت المقدس واپس لینے کی کوشش کی تاآنکہ ۲ر اکتوبر ۱۱۸۷ء کو جب کہ شب قدر تھی سلطان نے عیسائیوں سے ہتھیار رکھوا کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے ۱۹۱۷ء تک فلسطین پر برابر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد لارڈ ایلن بری (Allen berry) کی عیارانہ کوششوں سے ۱۹۱۷ء میں فلسطین پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ جنگ کے خاتمہ پر جنرل اے لن بری کے نام مسٹر چرچل نے کابینہ کی طرف سے فلسطین کی فتح پر مبارکبادی کا تار بھیجا تو اس میں لکھا تھا

"صلیبی جنگ آج ختم ہوگئی"

۱۲۱۲ء میں بیت المقدس کو خوارزم ترکوں نے تاراج کیا۔ اس کے بعد ۱۲۶۹ء میں مصر کے "شاہان ممالک" کا اس پر تسلط ہوا۔ ۱۵۱۶ء میں عثمانی خلیفہ سلطان سلیم اوّل اس پر قابض ہوگیا جسکے جانشین سلیمان اعظم نے بیت المقدس کی دیواروں کو تعمیر کرایا۔ قریب قریب ہر مسلمان بادشاہ نے فلسطین کے مقامات مقدسہ کی تعمیر و توسیع کی۔ اس طرح فلسطین کی سرزمین مسلمانانِ عالم کے لئے نہایت مقدس اور اہم ہے۔ بالخصوص بیت المقدس کے مقاماتِ مقدسہ جن کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

(۱) **مسجدِ اقصیٰ** | مسجد اقصیٰ (جسے مسجد عمرؓ بھی کہتے ہیں) کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے

(سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ) یہ مسجد پرانا قلعہ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی آرزو کی تھی ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ یہ خانہ خدا ایک مدت تک اسرائیلیوں کے قبضہ میں رہا۔ آخر یہ بخت نصر کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے اسیری بابل سے واپس آکر از سر نو تعمیر کیا۔ اور پھر قدیم شریعت اور توحید الٰہی کا چرچا زور شور سے شروع ہوا لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک رومی سپہ سالار طیطوس نامی نے پھر اسے منہدم کر دیا۔ ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بُت پرست رومی مذہب کے پیرو ہوگئے اور یہ مقام مزید تباہی سے بچ گیا۔

جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے مسجد اقصیٰ کی از سر نو تعمیر کرائی اس وجہ سے مسجد اقصیٰ کو مسجد عمر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد عبدالملک نے اس کی تعمیر شروع کرائی جو ولید کے زمانہ میں مکمل ہوئی۔

علامہ ابن عساکر نے چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں بیت المقدس کی زیارت کی تھی۔ فرماتے ہیں کہ اس مسجد کے پچاس دروازے تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

(۱) باب القرطبی (۲) باب داؤد (۳) باب سلیمان (۴) باب محمد (۵) باب التوبہ
(۶) باب الرحمۃ (۷) باب التوحید (۸) باب الہاشمی (۹) باب الاسباط
(۱۰) باب السکینہ (۱۱) باب الخضر تھے۔

اس کے علاوہ اس مسجد میں چھ سو سنگ مرمر کے ستون تھے اور سات محرابیں تھیں۔ پانچ ہزار قندیلیں تھیں۔ صخرہ کے گنبد کے علاوہ مسجد میں پندرہ گنبد تھے۔ مسجد کی چھت پر سیسہ کے سات ہزار سات سو بترے چڑھے ہوئے تھے جن کا مجموعی وزن ۷۰ رطل تھا۔ مسجد کے اندر چوبیس بڑے حوض تھے اور چار مینار تھے۔ یہ تمام چیزیں عبدالملک بن مروان کے عہد میں بنائی گئی تھیں۔ ابن عساکر کا بیان ہے کہ مسجد اقصیٰ کا طول ۵۵۵ ہاتھ اور عرض ۴۶۵ ہاتھ تھا۔ اس پیمائش سے مسجد کا وہ حصہ مراد ہے

جو حرم کے اندر داخل ہے۔

قبۃ الصخرہ کے اندر بخط کوفی یہ عبارت مندرج تھی:۔

"بسم اللہ، کلمہ طیب، کلمہ شہادت کے بعد اس طرح عبارت مندرج تھی۔

خادم خدا عبداللہ المامون امیر المومنین نے اس قبہ کو ۷۲ ہجری میں تعمیر کیا تھا۔ خدا اس کے ہاتھ سے اسے قبول کرے اور اس سے راضی ہو۔ آمین تعمیر مکمل ہو گئی، لہٰذا خدا کی حمد کرنی چاہئے۔"

اس کے بعد قرآنی آیات کا سلسلہ چلا گیا ہے جس میں مکرر سہ بار بسم اللہ اور کلمہ توحید کا اعادہ ہے۔ اس میں یہ عبارت بھی ہے کہ "مسیح بن مریم علیہ السلام خدا کے پیغمبر اور اس کا کلمہ تھے جسے اُس نے مریم میں ڈال دیا تھا اور اس کی رُوح تھے لہٰذا خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ خدا ایک ہے اور اس کی شان سے بعید ہے کہ اس کا بیٹا ہو۔ مسیح کو خدا کا خادم ہونے میں کچھ عذر نہیں" اور آخر میں لکھا ہے کہ خدا کے نزدیک اسلام ہی دین برحق ہے۔ اس کی حمد کرو جو نہ کسی کو اپنا بیٹا بناتا ہے اور نہ شریک" (دلگداز۔ لکھنؤ مئی ۱۹۱۲ء)

ولید کے بعد خلیفہ منصور اور خلیفہ مہدی کے زمانہ میں مسجد اقصیٰ کی مرمت کی گئی۔ اس کے بعد مامون الرشید نے اس کی تعمیر کرائی لیکن مامون کے معماروں نے کہتے ہیں عبدالملک کا نام محو کر کے مامون کا نام لکھ دیا تھا لیکن اتفاق سے وہ مسجد کا سن تعمیر جو ۷۲ھ ہے محو نہ کر سکے۔

مسجد اقصیٰ میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بھی ۱۱۸۷ء میں نمایاں اضافے کئے تھے یعنی محرابیں اور قبے بنوائے خوبصورت پتھر لگوائے اور مسجد سے صلیبیوں کے اثرات مٹائے تھے۔ اب یہود کے عزائم یہ ہیں کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ "ہیکل سلیمان" تعمیر کریں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور استعمار پسندوں کی مدد سے اس پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ ادھر عرب مجاہدین ان سے نبرد آزما ہیں۔ دیکھیں کیا ظہور میں آتا ہے۔

(۲) **مسجد صخرہ** | صخرہ وہ جگہ ہے جہاں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج تشریف لے جاتے وقت قدم مبارک رکھا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صخرہ بیت المقدس جنت کے پتھروں میں سے ہے۔"

اس مسجد کو بھی مشہور اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے سات سال تک مصر کا خراج جمع کیا گیا۔ مسجد کی تعمیر کا کام محدث رجا بن حیوۃ اور یزید بن سلام کی نگرانی میں شروع ہوا۔ معماروں نے ۶۸۵ء میں اسے تعمیر کرنا شروع کیا اور ۷۲ھ مطابق ۶۹۱ء میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ اوّل اوّل صخرہ کے مشرق میں نمونے کے طور پر ایک قبہ بنایا گیا پھر مکمل مسجد کی تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد اپنے زمانہ کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ آج بھی اسکا شمار دنیا کی خوبصورت ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر میں عربی ذوق اور ایرانی و رومی صنعتیں پورے طور پر نمایاں ہیں اس لئے کہ اس کی تعمیر میں عربوں کے علاوہ رومی اور ایرانی سبھی کاریگروں نے حصہ لیا ہے۔

سیٹرلوٹس کا قول ہے "بلا شبہ مسجد صخرہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارتوں ہی میں سے نہیں بلکہ وہ تمام تاریخی عمارتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ عیسائیوں نے لندن کا "The Temple church" اور کئی گرجے اسی نمونے پر بنوائے تھے ــــ انکے علاوہ مندرجہ ذیل متبرک مقامات مقدسہ قابل ذکر ہیں۔

(۳) براق شریف جس میں "دیوار گریہ" شامل ہے۔ (۴) مزار شریف حضرت داؤد علیہ السلام۔

(۵) ضلع بیت المقدس، زیتون کی پہاڑی (Mount of Olives) جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی۔ (۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزار۔ (۷) مزار رخیل۔

(۸) حرم شریف سیدنا ابراہیم علیہ السلام۔ (۹) مقام علی رضؓ (۱۰) مسجد سیدنا علی رضؓ۔

(۱۱) مزار شریف یوسف علیہ السلام ــــ ان مقامات مقدسہ کے علاوہ بیشمار پیغمبروں کے مزار یہاں موجود ہیں جہاں مسلمانان عالم آتے جاتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کو بھی انکی وصیت کے مطابق اسی جگہ دفن کیا گیا۔ ان کا مزار اب تک موجود ہے اور مرجع انام ہے۔

قیصر فقیر نظامانی
اور
تیمور شاہ والی کابل

حاجی شیر محمد نظامانی
مترجم طفیل احمد قریشی

سردار قیصر خاں نظامانیوں کی سات شاخوں میں الودانی شاخ کے ایک بہادر بلوچ سردار اور امیر تھے[1] وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔

یہ وہی قیصر خاں ہیں جن کا ذکر مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کے پوتے مخدوم ابراہیم اپنی تصنیف القسطاس المستقیم میں اس طرح کرتے ہیں :-

ولقد افتی للامیر فتح علی خاں تالپر خاصۃ بعض العلماء بجواز	میر فتح علی خاں کے لئے چند علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے

---

[1] نظامانیوں کی سات شاخیں یہ ہیں :-

(i) الودانی جس کے سردار ٹنڈو قیصر کے احمد خاں نظامانی ہیں۔

(ii) لشکرانی جس کے سردار احمد خاں لشکرانی جاتری ساکن کم گوٹھ ہیں۔

(iii) اسماعیلانی جن کے سردار باقر اور راجہ گوٹھ کے اللہ داد خاں ہیں۔

(iv) کرمانی جن کے سردار گوٹھ کرم نظامانی کے ولی محمد بن علی بخش ہیں۔

(v) ٹھٹوانی جس کے سردار غلام علی خاں ماتلی والے ہیں۔

(vi) میارکانی کے سردار تاہو خاں کریہ گھنور کے۔

(vii) بھلیلانی جس کے سردار علی بخش خاں ہیں دیکن انکے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ نظام کی اولاد میں نہیں ہیں۔

الفطر فی رمضان واداء الفدایة عوضا لعلة تیسر العسل الة والانصاف۔

وایضا افتوا الواحد من امرائه اسمه قیصر خان نظامانی انه اذا اتی رمضان فی موسم حار یجوز تاخیر الصیام الی ایام البرد الی اقصر الایام

کے لئے (جب میر صاحب مصروف ہوں اور ماہ رمضان آجائے تو) اگر وہ چاہیں تو رمضان کے روزوں کے بدلے فدیہ دے دیا کریں۔

اسی طرح ان علماء نے ان کے ایک امیر قیصر خاں نظامانی کے بارہ میں بھی یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر رمضان گرمی کے ایام میں آجائے تو بیشک وہ روزہ قصر کر کے سردی کے دنوں میں اس کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔

قیصر خاں کی تاریخ ولادت کے بارہ میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ گمان غالب یہ ہے کہ آپ کی ولادت سنہ ۱۱۳۰ھ سنہ ۱۱۳۵ھ کے درمیان کسی سال ہوئی۔

قیصر خاں نظامانی کی عمر کا بیشتر حصہ انقلابوں، جنگوں اور مختلف قسم کے سفروں میں گذرا۔ کبھی تو وہ تاجدار دہلی شاہ عالم ثانی سے ملاقاتوں کے لئے رختِ سفر باندھتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی وہ کابل میں تیمور شاہ سے بلوچی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں گفت وشنید کرتے نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ قیصر خاں نظامانی ایک طرف تو فارسی اور عربی کے بہترین عالم ہیں، تو دوسری طرف ایک کامیاب سیاسی مُدبر۔ یہاں اُن کی ان خداداد صلاحیتوں کے ضمن میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب عبدالنبی کلہوڑہ سندھ میں بلوچوں سے شکست کھا کر تیمور شاہ کے پاس کابل پہنچا تاکہ وہاں سے اُسے کچھ مدد ملے اور وہ پھر ایک دفعہ طالع آزمائی کرے۔ چنانچہ فاتح فتح علی کے دربار میں دیوان گدومل نے یہ تجویز پیش کی کہ بلوچوں کی طرف سے بھی تیمور شاہ کے پاس ایک وفد جانا چاہیئے۔ تجویز تو معقول تھی لیکن خود میر فتح علی اس لئے کابل جانے کے لئے تیار نہ تھا کہ کہیں تیمور شاہ اسے ..... قید نہ کرلے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی میر غلام علی خاں کو اپنا نمائندہ بنا کر قیصر خاں نظامانی آغا ابراہیم شاہ اور مرزا محمد علی پر مشتمل ایک وفد کابل بھیجا۔ میر غلام علی کی عمر اُس وقت زیادہ سے زیادہ پندرہ یا سولہ سال تھی۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ تیمور شاہ کو سندھ کی صحیح صورتِ حال

سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ عظیم ٹھٹوی اپنے فتح نامہ سندھ میں اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

پس از چند ایام آمد خبر	ز معروضہ مردم معتبر
کہ یک چند عبدالنبی بے ثبات	ہمی بود اوراره دیره جات
رواں شد ازانجا کنوں دادخواه	بار دوئی سلطان تیمورشاه
چوں دیواں گدومل آں ہوشیار	شنید ایں خبر پے بہ پی بار بار
رسانید در عرض عالی حضور	کہ شد در تقابل جوابش ضرور
وکیلاں فرزانہ وہوشمند	بار دوئی شاہی روانہ شوند
غلام علی میر دانش بلند	بفرمود تدبیر دیوان پسند
شدند آخر اندر حضور انتخاب	یکی میر ممتاز آصف جناب
دعاگوئی دولت براہیم شاه	دگر خان فرزانہ دانش پناه
بہمت جواں و بہ تدبیر پیر	خرد مند دیرینہ قیصر فقیر
کہ مردانہ در پیش گاه جلال	عدو را بہ حجت دہند انفعال
غلام علی میرزا ہوشیار	رواں گشت ہمراه شان دستیار
با عزاز و اکرام راہے شدند	روانہ باردوئی شاہی شدند

یہ وفد جب کابل پہنچا تو تیمور شاہ نے اسے باریابی کی اجازت تک نہ دی کیونکہ وہ میر فتح علی سے سخت ناراض تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ امین الملک اور قاضی القضاۃ کے ہاں کلہوڑوں کی اچھی خاصی رسائی تھی۔ یہاں تک کہ شیخ قمر الدین کا باپ شیخ محمد محفوظ عبدالنبی کلہوڑہ کی طرف سے سفیر کی حیثیت سے کابل میں رہتا تھا۔ وہ درباریوں کو خوش رکھتا تھا ان حالات میں اس وفد کو بادشاہ کے دربار میں باریابی کا موقع نہ ملنا کوئی عجیب بات نہ تھی اس موقع پر قیصر خاں نے ایک حکمت عملی سے کام لیا۔ اس نے تیمور شاہ کے پیر خواجہ صفی اللہ سرہندی کو ملا لیا[1]۔ خواجہ سرہندی صاحب مخدوم ابراہیم ٹھٹھوی کے بھی مرشد تھے۔

---

[1] قیصر خاں نے پیر خواجہ صفی اللہ سرہندی صاحب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب وہ حج کیلئے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اور گاہے بگاہے سندھ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ وفد کو خواجہ سرہندی صاحب کی معرفت دربار میں باریابی کا موقع مل گیا۔ وفد نے بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ عبدالنبی نے اپنے کئی بے گناہ عزیزوں اور دوسرے بلوچوں کو قتل کرادیا ہے اور اگر وہ چاہے تو خود عبدالنبی کو بلواکر وفد کے سامنے اس کی تصدیق کراسکتا ہے۔ اور یہ کہ اب سندھ کی صحیح صورت حال یہی ہے۔ عظیم ٹھٹھوی نے اس گفتگو کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وکیلاں دانا بفرزانگی — نمودند ملزم بہ عبدالنبی
بہر جا کہ سر شد جواب وسوال — کشید از غلطہائے خود انفعال
بفرمود آں خسرو ذوالعقول — کہ کوتہ تواں کرد ایں عرض وطول

اس گفتگو کے بعد تیمورشاہ نے مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ رئیس میاں بخش علی خاں کہا کرتے تھے کہ قیصر خاں فارسی کے جید عالم تھے۔ چنانچہ جونہی انہیں تیمورشاہ کے دربار میں باریابی کا موقع ملا، انہوں نے اپنے عالمانہ اور ادیبانہ انداز گفتگو سے بادشاہ کو اتنا متاثر کیا کہ جبتک اُن کا قیام کابل میں رہا وہ تیمورشاہ کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے ساتھ کھانا تناول کرتا اور ان کے بغیر بادشاہ اکیلا کھانا نہ کھاتا تھا۔ اس وفد کی واپسی پر جب تیمورشاہ نے وفد کو سندھ کی حکومت کی سند عطا کی تو اُس نے قیصر خاں سے پوچھا کہ کیا آپ کا نام بھی اس میں لکھدیا جائے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پوری بلوچ قوم نے میر فتح علی کو اپنا سردار منتخب کیا ہے اس لئے سند میں صرف اسی کا نام لکھا جائے۔ چنانچہ یہ وفد اپنے مشن میں کامیاب ہوا اور خلعت وسند حکومت لے کر وطن واپس لوٹا۔ ان حالات کو عظیم ٹھٹھوی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تشریف لے جائیں گے تو ان کا پورا خرچ ہم برداشت کریں گے۔ پیر صاحب ۱۲۱۲ھ میں سندھ آئے اور حج کا ارادہ ظاہر کیا لیکن میر فتح علی نے اس وعدہ پر غور نہیں کیا، اس پر قیصر خاں نے صرافہ بازار میں اپنی ملکیت کے زیورات بیچ کر سات ہزار روپیہ اکٹھا کرکے انہیں دیا۔ وہ پیر صاحب سے بہت ناراض ہوگئے مگر اسی سال حدیدہ تک ہی پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا اور حج بھی ادا نہ کرسکے۔

دریں عرصہ شد شاہ والا سریر | بسے مہرباں بر وکیلانِ میر
شدہ مرحمت خلعت ملک زود | باعزاز میر مبارک وجود
رقم در خصوص نظامت عطا | شد از روئے الطاف بے منتہا
مخلع شدند آن وکیلان میر | باعزاز و با احترام کثیر
وکیلان فرزانہ و ہوش مند | چو با صد نوازش مرخص شدند
نسیمی ز درگاہ گیتی پناہ | بیامد کہ شانزادہ رو براہ
وکیلاں بیاوردہ با آب رو | باردوئی میر ظفر یاب رو

عظیم ٹھٹھوی نے ان اشعار میں جہاں بھی قیصر خاں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہاں اُن کے لئے فرزانہ اور دانش پناہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ عظیم ٹھٹھوی آگے لکھتے ہیں ؎

بشوکت وکیلان سرکار میر | رسیدند خوشدل بہ دربار میر
ہم آن خلعت سرفرازی بہ میر | رساندند از شاہ غازی بہ میر
بطغرائی دولت مبارک رقم | رساندند از پیش گاہ کرم
ہم آں بادپایاں تازی نژاد | کہ بر وند گوئی بہ سبقت ز باد
گذارش نمودند اندر حضور | بصد خورمی و ہزاراں سُرور
چو آن خلعت ملک پوشید میر | زالطاف شاہ معلا سریر
دو بالا شد اقبالش اندر جہاں | مبارک مبارک بگفت آسماں
بسالش چو شد سرز "ا" عدا جدا | زدل "خلعت ملکی" آمد ندا
۱۲۰۰ھ | ۱۱۹۹ھ

مندرجہ بالا اشعار میں جس طغرائی دولت یعنی سند حکومت کا ذکر ہے اس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ یہ سند قیصر خاں کا وفد اپنے ساتھ لایا۔ اس سند سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں میر فتح علی کا صرف نام ہی نہیں لکھا گیا بلکہ اسے عالیجاہ، رفیع جائگاہ، عمدۃ الخوانین، امیر الامراء العظام، اخلاص کیش آستان معدلت نشان جیسے شاندار القاب سے نوازا گیا ہے۔ دوسری طرف اس سند سے کابل کے دربار کے انشاء پردازوں کی قابلیت کے جواہر کی جھلک

نمایاں نظر آتی ہے۔

پروانۂ ریاست سندھ بنام میر فتح علی خاں

چونکہ غیب وشہود کے ملکوں کے رفیع الشان ناظم، جہانِ ہستی وبود میں احکامات نافذ فرمانے والے نے وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ (یعنی وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے) کے فرمان کے مطابق اپنی مملکت بے پنہاں کے مختلف ملکوں کے شہروں اور قلعوں کو ہمارے تابع فرمان کیا ہے اور اس نے اپنی دی ہوئی اس ہماری شہرت واقتدار، بزرگی وصلہ رحمی اور عنایتوں کی آواز کو ان ملکوں کے طول وعرض میں انسانوں کے کانوں تک پہنچا دیا ہے۔ اور لوگوں کے بڑے بڑے اور اہم امور کی لگامیں اس خدائے بزرگ وبرتر نے ہماری حمایت وکفایت میں دیدی ہیں۔ اس مالکِ حقیقی نے سرداروں کی سرداری اور بزرگی وامارت کا علم اپنی قدرت سے ہمارے نام پر بلند کیا ہے۔ اس نے میدان کارزار اور میدانِ استقلال میں ہمارے غلبہ کا جھنڈا اپنی قدرتِ کاملہ سے ایسے لوگوں کو شکست دینے اور عبرت سکھانے کو بلند کیا ہے جنکے اعمال خراب ہیں، جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہیوں پر چلاتے ہیں چنانچہ خلافت کی طرح اس حکومت کی بے پناہ عنایات سے متاثر ہو کر سرکش ترین لوگ بھی اب اسکے فرمانبردار ہو گئے ہیں اسلئے قادر یکتا کی ان مہربانیوں کا شکر بہ ادا کرنے والوں کے لئے ضروری خیال کرتے ہوئے ہم نے یہ حکم دیا ہے کہ اس حکومت کے خیر اندیش وارادت کیش ہیں جن کے اخلاص و صداقت کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھا جا چکا ہے انہیں درباری ہونے کا شرف حاصل ہے اور ساتھ ہی بادشاہ یا اس کی جگہ مسند نشیں ہونے والے سے عقیدت کا افتخار بھی ملا ہے۔ اپنے ہمعصر امراء میں بادشاہ کی عنایتوں کا نزول ان پر زیادہ ہے۔ یہ سرداروں میں بہترین سردار اور اخلاص وعقیدت کا مجسمہ ہے۔ امیر فتح علی خاں تالپور کے ان اوصاف نے یقین وصداقت کی راہوں پر گامزن ہوتے ہوئے انہیں اس

قدیم حکومت (افغانستان) سے منسلک کر دیا ہے اور مضبوط رسی کی طرح اپنا تعلق (اس حکومت سے) قائم کر لیا ہے۔ اس لئے شاہی نوازشات و احسان کے چمکتے ہوئے سورج کی جو ایک کرن ان (تالپور امیر) پر پڑی ہے اس نے ان کی امیدوں کے چمن زار کو منور کر دیا ہے۔ لہٰذا اس سال کے ابتدا سے انہیں حشمت و شوکت دستگاہ، امیرالاحرار العظام اخلاص کیش آستان معدلت نشان خیر اندیش خاندان عالی شان، معتمد الدولہ اور معین الملک کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی پہلے ناظم کو معزول کر کے صوبہ سندھ اور ٹھٹھ کی نظامت و صوبیداری کے اختیارات سے انہیں سرفراز کیا جاتا ہے۔ اپنے ہمعصر عہدہ داروں میں ممتاز کرتے ہوئے انہیں درجہ تخصیص سے نوازا جاتا ہے تاکہ انتظامی امور میں وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائیں۔ لوگوں کو متحد کریں اور ان کے مسائل کو پیش نظر رکھیں اور ان علاقوں کے باشندوں میں جو مظلوم اور کمزور ہیں ان کی غم خواری اور دادرسی کریں اور ناپسندیدہ و مفسد عناصر کی بیخ کنی کریں۔ ڈاکوؤں، چوروں، اوباشوں اور حکومت کے مخالفین کو پہلے سمجھائیں اور بار بار تنبیہ کریں (پھر بھی اگر وہ باز نہ آئیں تو مناسب اقدام کریں) اپنے سے قریب اور دور ہر قسم کے لوگوں کے احوال و کردار پر نظر رکھیں۔ شہروں، دیہاتوں اور کھیتوں کی پوری پوری حفاظت کریں اور ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ غلہ اُگانے کی کوشش کرتے رہیں۔ سرکاری مالیانہ کی وصولی اور عوام کے حقوق کی ادائیگی میں پورے نظم و ضبط سے کام لیں حسب سابق جن لوگوں کے پاس جائداد ہے اسے برقرار رکھتے ہوئے اس کی نگہداشت کریں دیوانی احکامات اور سرکاری حکم ناموں کو روبہ عمل لانے کے لئے کسی قسم کی دیر نہ کریں اور نہ اس سلسلے میں کسی قسم کی چشم پوشی سے کام لیں بلکہ اپنی حکمت عملی اور تجربے سے ان معاملات پر نظر رکھیں اور جب وہاں (سندھ) کے لوگ اپنے مقدمات پیش کریں تو سرکاری قوانین اور علاقائی رواج کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاملے کی گہرائی میں جا کر حق کو ثابت کریں۔ ان معاملات میں جن کا تعلق شریعت مطہرہ سے ہو، ان میں احکام شرعیہ سے رجوع کریں اور کتاب اللہ کے احکام اور اس کی روح کے مطابق ان کا فیصلہ کریں۔ اور یہ بات پیش نظر رہے کہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے

مالیات کے سلسلے میں اس بات کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھیں کہ پہلی حکومت نے جو مالیانہ مقرر کر رکھا ہے جس کی رقم کا ثبوت ہمارے سرکاری اندراجات میں اس کے وکیل کی مہر سے موجود ہے، سال بہ سال پوری رقم کی وصولی کر کے حکومت عالیہ کے اعلیٰ خزانچی کو بھیجیں اور اس کا حساب وقت پر سال بہ سال بلا تاخیر روانہ کریں۔ ایک سال کے مالیانہ کو دوسرے سال میں ادائیگی کے لئے بالکل مؤخر نہ کریں۔ اس معاملے میں اسے تاکیدی احکامات خیال کرتے ہوئے پابندی سے عمل کریں اور حکم عدولی سے بچیں (یہاں پر ان کا ترجمہ ختم ہوتا ہے)

جب قیصر خاں اور ان کے وفد کے دیگر ارکان واپس سندھ پہنچے تو جشن کامرانی منایا گیا۔ فتح علی خاں تالپور اس پروانہ حکومت عالیہ پر عمل پیرا ہوتے ہوتے سندھ کی ترقی کے مختلف مسائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹھٹھہ کی نوابی قیصر خاں کے صاحبزادے غلام علیخاں نظامانی کو ملی۔ سماج دشمن عناصر اور چوروں، بدمعاشوں اور باغیوں کے قلع قمع کیلئے زبردست مہم شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ بندھانی رہزن قوم پر نواب غلام علی خاں نے فوج کشی کر کے عوام کو سُکھ کی زندگی گذارنے کا موقع دیا۔ عظیم ٹھٹھوی نے فتحنامہ میں ان حالات کو اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

ازاں بعد آں نخل باغ نظام — کہ در صوبہ ٹھٹھہ شدہ نیکنام
غلام علی ابن قیصر فقیر — دگر حاجی احمد غلام امیر
بہ تخریب آنبہانی سگاں — بہ لکرالہ بردند فوج شہاں
نمودند در مدبراں قتل عام — جدا کرد با قاتلاں انتقام

چنانچہ تخریب پسندوں اور سماج دشمن لوگوں کی سرکوبی کے بعد عوام میں جن لوگوں نے حکومت سے پورا پورا تعاون کرتے ہوئے کارہائے نمایاں انجام دیئے یا لڑائی میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے، انہیں انعام واکرام سے نوازا گیا۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ میر فتح علی خاں کسی وجہ سے اپنے ایک نواب سے ناراض ہو گیا۔ نواب صاحب کو جب اس ناراضگی کی اطلاع ملی تو فوراً ایک معافی نامہ اشعار کی صورت میں لکھ بھیجا۔ ایک دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شاہا بہ عاصیاں زرہ لطف شاد باش | برجرم عاصیں برہ عدل و داد باش
من بندۂ قدیم توام ای خدیو دہر | کیخسر بمعدلت کیقباد باش
چوں آفتاب تاب میفگن بزرۂ | بابیکساں چو صبحدم با مداد باش
بخت سکندری ست فروزانت ازجبیں | پیوستہ کامگار بہ تخت و مہاد باش
عمر ترا بقا بود از خضر بیشتر | افزوں ترا فزونی و درازدیاد باش
باطالباں زفیض خود اے شاہ اولیا | شاہانہ رہنمائی طریق رشاد باش
فتح علی بہ تست ہم آغوش ہم قریں | درحضرت علی برہ انقیاد باش
بیچارہ "ولی" زدل وجان غلام تست | بادی زفرط فضل وکرم خوش نہاد باش

میر فتح علی نے نواب صاحب کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ انہیں معاف کر دیا بلکہ دربیلہ پرگنہ کا والی بنا دیا .... اس کا ثبوت ایک خط سے بھی ملتا ہے جس میں میر فتح علی خاں تالپور نے دربیلہ پرگنہ کے والی نواب ولی محمد لغاری کو یہ لکھا ہے کہ ہم نے دربیلہ پرگنہ میں دیہہ تالپور فقیر نوخانی کو انعام کے طور پر ۱۲۳۰ھ کی فصل خریف کی ابتدا سے دے دی ہے، لہٰذا انہیں اس کا قبضہ دیدیا جائے۔ اس خط کا متن یہ ہے۔

"اخوت پناہ ولی محمد لغاری..... پرگنہ دربیلہ مسرور باشد دریں وقت از روئے شفقت و رحمت دیرہ داری دیہہ تالپر عملہ پرگنہ دربیلہ من ابتدائے فصل خریف ۱۲۳۰ھ بنام اخوی اعوی شہک فقیر نوحانی مقرر فرمودہ شد لہٰذا قلمی یافت کہ دیرہ داری دیہہ مذکور.. فصل مذکور باسم اخوی رافع مقرر دیمال دانستہ ابواب فروعی وغیر وجوہ دیرہ داری بتصرف مومی الیہ واگذارند کہ براں قابض بودہ درتقدیم خدمات سرکاری ساعی باشد۔ نہم شوال المعظم ۱۲۰۷ھ"

قیصر خاں نظامانی ۱۲۲۳ھ میں فوت ہوئے

توحیدِ وجودی

اختر ایم۔اے

توحیدِ وجودی کا مطلب یہ ہے کہ ازل میں ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کوئی شے موجود نہ تھی۔ خدائے لم یزل اپنی صفت تفرد ذاتی سے ازل سے موصوف تھا اور ابد میں بھی موصوف ہوگا۔ کیونکہ اس کی ذات میں تغیرّ و تبدل محال ہے۔

فھو الآن کما کان و کما کان الآن

لہذا کوئی شے ماسوی اللہ موجود بوجودِ حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ ان کا موجود ہونا بہ وجودِ اعتباری ہے۔ مرتبۂ صفات میں یہ ذات واجب الوجود کی تجلیات مختلفہ کے مظاہر ہیں۔ جیساکہ عارف جامیؒ فرماتے ہیں ؎

نوریست محض کردہ باوصاف خود ظہور
نام تنوعات ظہورش بود جہاں
ہر چند در نہاں وعیاں نیست غیر اُو
نے حد ذاتہ نہ نہاں است ونے عیاں

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت کا مزاج ہی ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ سے

مائل بہ ظہور ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ حقائق معطل کہلانے لگیں۔ اور تعطیل کسی حقیقت کی صفت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسلمہ طور پر حقائق کبھی معطل نہیں رہ سکتے بلکہ ہمیشہ بروئے کار آتے رہتے ہیں۔ موجودات میں باہمی غیریت حکمی اور اعتباری ہے، حقیقی نہیں۔ اس لئے موجودات وجودِ حقیقی کے مختلف اعتبارات اور تعینات ہیں۔ ان تعینات کے باہمی اختلاف اور تضاد کو جو کائنات میں جاری و ساری ہے، جنگ و پیکار کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سحابی فرماتے ہیں؎

عالم بخروشِ 'لا الٰہ الا ہو' است
غافل بگماں کہ دشمن است این یا دوست
دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد،
خس پندارد کہ این کشاکش با اوست

غرض تعینات کا باہم مختلف و متضاد ہونا صفاتِ وجود کی گوناگونی پر دلالت کرتا ہے اور صفات کی گوناگونی سے وجود کی جامعیت، کلیت اور کاملیت ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے موجودات عالم موجودِ حقیقی کی صفات کمال کے مظاہر ہیں۔ چونکہ وہ صفات لامتناہی ہیں اور کوئی حقیقت معطل نہیں۔ یعنی ہر صفت عالم خلق میں بروئے کار ہے اس لئے کائنات میں ذات کے چہرے پر لامتناہی صفات کے نقاب عارض ہیں۔ تاہم تجلیات کا ظہور جیسا کہ سحابی فرماتے ہیں، ذاتِ واجب الوجود کے تفرّد ذاتی کے منافی نہیں ہے۔

مولٰنا جامیؒ بھی اسی نکتہ کی صراحت ذیل کی رباعی میں فرماتے ہیں؎

مجموعہ کون را بقانونِ سبق　　کردیم تصفح ورقاً بعد ورق
حقا کہ نہ دیدم و نخواندیم درو　　جز ذاتِ حق و شئونِ ذاتِ مطلق

کثرت کی حقیقت حقیقۃً وہی وحدت ہے۔ اور تمام افرادِ کائنات تجلیاتِ حق ہیں۔ صوفیہ فرماتے ہیں: سُبحانَ الذی خَلَقَ الاشیاءَ وھو عینُھا اس طرح حیات و کائنات کی کثرت مجازی اور اعتباری ہے۔ اس کے برعکس وحدتِ مطلق ہی حقیقت ہے۔ کثرت حقیقت نہیں ورنہ ثنویت لازم آئے گی جو محال ہے۔

اور یوں تو کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ترجمہ یہ ہے کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ تبارک

وتعالیٰ کی ذات پاک۔ لیکن صوفیائے کرام اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ نہیں کوئی موجود یا مقصود اور باقی رہنے والی ذات مگر اللہ تبارک وتعالیٰ۔ اور اس نفی اثبات کا ذکر صوفیہ کے ہاں ہر طالب اور مبتدی کو کرایا جاتا ہے۔

غرض صوفیہ کے نزدیک بجز اللہ کے نہ کوئی معبود ہے نہ مقصود اور نہ موجود۔

(ان لا الٰہ) ای لا معبود اولا مقصود اولا موجود فی نظر ارباب الشہود الا اللہ (مرقات شرح مشکوٰۃ ملا علی قاری)

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ سب سے سچی بات عرب شاعر 'لبید' کی یہ بات ہے کہ "اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے"۔

'لبید' کا شعر ملاحظہ ہو ؎

الا کل شیء ماخلا اللہ باطل
وکل نعیم لامحالۃ زائل

کشف المحجوب میں حضرت علی ہجویری رح نے حضرت شبلی رح کا یہ قول نقل کرکے اس عقیدہ کی مزید توثیق فرمائی ہے۔

التصوّف شرکٌ لانہ صیانۃ القلب عن رؤیۃ الغیر ولا غیر۔

یعنی تصوف شرک ہے کیونکہ تصوف نام ہے دل کو مشاہدۂ غیر سے محفوظ رکھنے کا، حالانکہ غیر حق موجود ہی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں آیۂ شریفہ الا انہٗ بکل شیء محیطٌ مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دلیل روشن ہے۔ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ذات واجب الوجود اپنے ماسوا کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کہنے میں تو مُحیط اور مُحاط دو چیزیں ہیں لیکن فی الواقع محیط ہی بوجود حقیقی موجود ہے۔ اور مُحاط یعنی ماسوی اللہ وجودِ حقیقی سے محروم ہے۔ ہاں موجود بوجودِ اعتباری ہے۔ اس موقعہ پر یہ صراحت بے موقع نہ ہوگی کہ واجب وہ ذات ہے جو اپنی ذات سے قدیم اور ازلی ہو۔ اور اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہ ہو اور کسی طرح معدوم نہ ہوسکے۔ اس کے برعکس ممکن وہ ہے جو اپنی ذات سے حادث ہو۔ یعنی قدیم اور ازلی نہ ہو۔ اور اس کا وجود

غیر کا محتاج ہو۔

دوسری آیۂ کریمہ میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ کل شیءٍ ھالکٌ الا وجہہ یعنی اللہ پاک کی ذات کے سوا ہر شے فی حد ذاتہ معدوم ہے اور جو شے موجود نظر آتی ہے یہ موجود حقیقی نہیں ہے بلکہ اس کا وجود وہمی اور اعتباری ہے۔ اور اس محیط یعنی موجود بوجودِ حقیقی کا عکس اور مظہر ہے ؎

ہر نقش کہ بر تختۂ ہستی پیدا است — آں صورت آں کس ست کاں نقش آراست
دریائے کہن چو بر زند موجے چند — موجش خوانند در حقیقت دریاست

یہاں معترض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس احاطہ سے جو آیۂ شریفہ الا انہٗ بکل شیءٍ محیط میں مذکور ہے، احاطۂ علمی اور احاطۂ قدرت مراد ہے نہ کہ احاطۂ ذاتی؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علم اور قدرت ذاتِ حق کی صفاتِ حقیقیہ سے ہیں۔ یہ صفاتِ حقیقیہ اگر عینِ ذات نہیں تو غیرِ ذات بھی نہیں ہیں۔ صفات کو ذات سے مغایرت ہے۔ تو باعتبارِ مفہوم ہے اور باعتبار وقوع اور مصداق کے وہ عینِ ذات ہیں۔ اسی طرح علم اور قدرت کے احاطہ کرنے سے ذات کا احاطہ کرنا لازم آتا ہے۔ پس ماسوی اللہ اس ذات مستجمع الصفات کا مظہر ہے اور اس کا وجود اعتباری حیثیت رکھتا ہے گویا یہ مظاہر شیشے ہیں جن میں وجود حقیقی کا جلوہ نظر آرہا ہے یا عکوس ہیں جن میں آفتابِ وحدت چمک رہا ہے ؎

آفتابے در ہزاراں آبگینہ تافتہ — پس برنگ ہر یکے تاب عیاں انداختہ
اختلافے نیست ہرگز لیکن رنگہائے مختلف — اختلافے در میان ایں و آں انداختہ

صوفیائے کرام کے نزدیک عالم محسوس اور موجود ہے لیکن اس کا وجود اعتباری ہے حقیقی نہیں۔ ان میں اور سوفسطائیہ کے مذہب میں یہ فرق ہے کہ سوفسطائیہ مذہب میں عالم محسوس فی الواقع کچھ نہیں۔ اس کے برعکس حضراتِ صوفیائے کرام یہ کہتے ہیں کہ تمام عالم وجودِ حقیقی کے عکوس اور مظاہر ہیں۔

اس کی مثال یوں ہے کہ انسان کسی رنگین شیش محل میں ہو جہاں دھوپ پڑ رہی ہو دھوپ کہ خود بے رنگ ہے، رنگین شیشوں میں سے متعدد رنگوں میں دکھائی دے گی حالانکہ

وہ دھوپ اپنی صرافتِ ذاتی پر قائم ہے ۔ یہ نمائش متعدد رنگوں کے انصباغ اور تلبس سے ہے ۔ اور متعدد رنگ دھوپ میں حلول کئے ہوئے نہیں ہیں کہ اتحاد پیدا ہو۔ ایسا ہی خورشید وجودِ حقیقی اعیانِ ثابتِ عالم کے شیئون میں ان کے احکام اور آثار سے مصبغ اور متلبس ہونے سے رنگ برنگ معلوم ہوتا ہے اور باوجود اس کے پھر صرافتِ ذاتی پر قائم ہے جیسا کہ مولٰنا جامیؒ فرماتے ہیں ؂

اعیانِ ہمہ شیشہائے گوناگوں بود — کافتاد دراں پرتوِ خورشیدِ وجود

ہر شیشہ کہ بود سُرخ یا زرد و کبود — خورشید دراں ہم بہماں رنگ نمود

سطورِ بالا سے یہ واضح ہو چکا کہ ماسوی اللہ پر عدمِ محض کا اطلاق بمقابلہ وجودِ حقیقی ہے نفس الامر میں جملہ اشیاء ماسوی اللہ وجودِ حقیقی سے محروم ہیں اور موجود بہ وجودِ حقیقی واجب الوجود ہی ہے ۔ مگر ماسوی اللہ کو ذاتِ واجب الوجود کے عکوس وظلال ہونے کی وجہ سے اعتباری وجود حاصل ہو گیا ہے ۔ اس طرح تمام عالم فی ذاتہٖ نفس الامر میں تو معدوم ہے مگر باعتبارِ وجودِ حقیقی کے عکس اور ظل ہونے کے وجودِ اعتباری سے موصوف ہو گیا ہے ، یہ تناقض نہیں ۔ کیونکہ معدوم ہونے اور موجود ہونے میں بہت فرق ہے ۔ مثلاً دریا میں موج وحباب کا وجود یہ وجودِ حسّی ہے جن کے نام و آثار مختلف ہیں مگر فی الواقع اعدام ہیں اور موجود صرف دریا ہے ۔ یہ سب اس کے مظاہر ہیں لیکن مظاہر کا اختلاف وتضاد یعنی خیر وشر ، نیک وبد ، نور وظلمت اور عدل وظلم وغیرہ واجب الوجود کے خیرِ محض ہونے سے متصادم نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد اور تخالف اشیاءؔ (یا مظاہر) واجب الوجود کے خیرِ محض ہونے سے متصادم نہیں ہے ۔ کیونکہ مظاہر کی دوؔ حیثیتیں ہیں ۔ ایک حیثیت سے تو یہ مظاہر عکوسِ واجب الوجود ہیں ۔ اور آفتاب وجودِ حقیقی کے پرتو پڑنے سے موجود کہلانے لگے ہیں ۔ ملس دوسری حیثیت سے ان کو عدمِ محض سے بھی تعلق ہے ۔ یعنی وہ پہلے بھی معدوم تھے اور آئندہ بھی معدوم ہی ہو جائیں گے ۔ پہلی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو یہ مظاہر اوصافِ ذمیمہ ناپاکی شر اور ظلمت وغیرہ سے موصوف نہیں ہو سکتے ۔ البتہ دوسری حیثیت سے چونکہ ان کا تعلق عدم سے ہے ، وہ اوصافِ ذمیمہ سے متصف ہو سکتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

وجود خیر محض اور عدم شر محض ہے۔ مولینا جامی رح فرماتے ہیں ؎

ہر لعنت کہ از قبیل خیر است و کمال | باشد ز لغوت ذات پاک مقال
ہر وصف کہ در حساب شر است و وبال | دارد بقصور قابلیات مآل

ہر جا کہ وجود سیر کردہ است اے دل | میداں یقیں کہ محض خیر است اے دل
ہر شر ز عدم بود عدم غیر وجود | پس شر مقتضاء غیر است اے دل

آیۂ کریمہ ھو الاوّل والآخر والظاھر والباطن وھو بکلّ شیءٍ علیم بھی وحدت الوجود کی مثبت ہے۔ یعنی وہی ذات اللہ جل شانہ اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔ ہاں مظاہر اس کے متعدد اور مختلف ہیں۔ اس کی ذات کی وحدت میں کثرتِ ظہور سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ دریا کا بہتا ہوا پانی بے رنگ ہے جم جانے پر یہ برف کہلائے گا۔ لیکن یہ اختلاف اعتباری ہے ورنہ فی الواقع وہی دریا کا بے رنگ پانی مختلف مظاہر میں نظر آرہا ہے ؎

دریاست وجود صرف ذات وہاب | ارواح و نفوس ہمچو نقش اندر آب
بحریست کہ موج مے زند اندر خود | گہہ قطرہ گہست موج گاہست حباب

دلائل مرقومہ و نصوص محکمہ سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ماسوی اللہ کا وجود اعتباری و انتزاعی ہے۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ وجود سب میں مشترک ہے۔ عارف کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیر و شر کے پیچھے وجود کی ایک بڑی طاقت کار فرما ہے۔ ظالم جو اللہ کا مظہر غضب ہے اور عابد جو اللہ کا مظہر رضا ہے، اللہ کے وصف جمالی اور وصفِ قہری سے آراستہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حقیقی وجود اللہ کا ہے ماسوی اللہ کا وجود کالعدم ہے۔ ہر انسانی وجود خدا نہیں ہوسکتا۔ ایسا تصور کرنا شرک ہے۔

بقول مولنا روم رح ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردہ
زندہ معشوق است و عاشق مردہ

لیکن وہ عاشق جس نے حجاب تن دور کرلیا ہو وہ کبھی مر نہیں سکتا بلکہ وہ زندہ جاوید ہے عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما
میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ ازمیاں برخیز
حجاب چہرہ جاں می شود غبار تنم
خوشا دلے کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے شعر ذیل میں تمام مضمون ہی حل کردیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گفت بیزارم زغیر ذات تو
غیر او نبود آنکہ او شد ذات تو

فرمایا۔ بیزار ہوں میں تیری ذات کے بغیر سب سے۔ لیکن جو فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا مرتبہ حاصل کرچکے ہیں وہ غیر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں۔

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

حضرت شاہ جلال رح کے چند ساتھی

وفا راشدی ایم اے

قارئین کرام ماہنامہ الرحیم کے شمارہ مارچ ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون بعنوان 'بنگالا کے تین بزرگ' میں حضرت شاہ جلال یمنی سلہٹی المجرد رح کا حال ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں حضرت جلال کے چند ساتھیوں کا ذکر کیا جائے گا۔ حضرت شاہ جلال کے ہمراہ جو بزرگان دین تبلیغ اسلام کی خاطر سرزمین عرب سے مشرقی پاکستان آئے تھے ان کی تعداد تین سو ساٹھ ۳۶۰ [۱] تھی۔ مورخوں اور محققوں نے تقریباً سب کے حالات معلوم کئے ہیں۔ لیکن اکثر اولیائے کرام کے سوانح حیات، رشد و ہدایت، کشف و کرامات اور روحانی کمالات کی تفصیلات نہیں ملتیں

---

[۱] الرحیم بابت جون ۶۷ء میں راقم الحروف کا جو مضمون 'حضرت سید نصیر الدین اور ان کی اولاد' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کے شروع میں یہ سطر ہے:

'آپ کے ساتھ (یعنی حضرت شاہ جلال رح کے ساتھ) چھ سو بزرگانِ دین تھے۔'

یہ سہواً چھپ گیا ہے۔ اصل تعداد چھ سو نہیں بلکہ تین سو ساٹھ ہے۔

ناظرین تصحیح فرمالیں۔ (و، ر)

میں کوئی شک نہیں ڈاکٹر شہید اللہ، ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر غلام ثقلین، مولانا محمد عبید الحق اور مولانا روح الامین وغیرہ جیسے قابلِ قدر اہل تحقیق کے تذکرے مستند ہیں لیکن بعض حالات ایسے ہیں کہ ان کے تاریخی شواہد نہیں ملتے۔ میرے نزدیک تحقیق کی روشنی میں جن مشائخ دین کے حالات مستند ہیں میں نے صرف انہیں کا ذکر کیا ہے۔

ذیل میں پہلے دو ایسے بزرگانِ دین کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ جن کا حال حضرت شاہ جلالؒ اور ان کے مریدوں کے تذکروں میں شامل نہیں ہے۔ حال ہی میں سہ ماہی رسالہ "الاصلاح" (بنگلا) کے جلال نمبر میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں ان دو حضرات کے بارے میں بہت کچھ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس مقالے کے علاوہ قدیم نسخے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

ضلع سلہٹ کے نرشگندی اسٹیشن کے قریب توارا نامی گاؤں میں ایک اللہ والے کی شاندار درگاہ توحید و عرفان کا مظہر ہے۔ یہاں اس صوفی منش کا مزار مبارک ہے جو حضرت جلال کے ساتھ یمن سے تشریف لائے تھے۔ آپ نہ صرف تبلیغ دین کے لئے حضرت جلالؒ کے ہمراہ دور دور گئے۔ بلکہ سلہٹ کے راجہ گوڑ گوبند جس نے سلہٹ برہان الدین نام کے ایک مسلمان کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اور صرف اس وجہ سے کہ اس اللہ کے واحد نام لیوا نے اپنے بچے کی ولادت کی خوشی میں ایک گائے بطور صدقہ ذبح کی تھی، باپ کی آنکھوں کے سامنے بچے کو ذبح کر دیا تھا اور برہان الدین کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ حضرت جلالؒ گوڑ گوبند کے کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے کی غرض سے گوڑ گوبند سے برسرپیکار ہوئے اور اللہ کے حکم سے اللہ والوں کی فتح ہوئی۔ گوڑ گوبند تخت و تاج چھوڑ کر فرار ہوگیا اور سلہٹ میں اسلام کا بول بالا ہوا اس تاریخی معرکے میں حضرت جلالؒ کی قیادت میں جو صوفیائے کرام شامل تھے ان میں اللہ کے وہ نیک بندے بھی شامل تھے جن کے مزار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، نرشگندی کی گلیوں میں آج بھی آپ کی ہدایات و کرامات کا چرچا ہے۔ اس علاقے میں آپ نے شمع ہدایت کی جو لَو لگائی تھی اس سے بیشتر شمعیں روشن ہوئیں۔

آپ حضرت جلالؒ کے حکم سے ڈھاکا اور نواح ڈھاکا بھی تشریف لے گئے۔ اور جہاں

جہاں بھی گئے، وہاں وہاں توحید و تصوف کے چراغ چلتے گئے۔ جب آپ نے ڈھاکہ میں اپنا مشن پورا کرلیا تو اپنی قیام گاہ 'توارا' لوٹ آئے۔ اور آخری وقت تک درس و تدریس سے لوگوں کے ذہن کو بیدار اور قلب کو روشن کرتے رہے۔ آپ کے اسوۂ حسنہ سے کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی متاثر تھے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب بنگال کی عنانِ حکومت سلطان شمس الدین کے ہاتھوں میں تھی۔ اور شہنشاہِ ہند علاؤ الدین خلجی 'دہلی' کے تخت پر رونق افروز تھا۔ آج جب کہ اللہ کے یہ خاص بندے اللہ کے پیارے ہوگئے ان کے بے شمار عقیدت مند پائے جاتے ہیں۔ ایک کمیٹی کے زیر انتظام ان کی درگاہ کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اور ہر سال بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا ہے لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ جس بزرگ کے دم سے بنگال کے بعض علاقوں میں کفر و الحاد کی تاریکی دور ہوئی آج ان کے مزار پر چراغ جلانے والے تو بہت ہیں لیکن ان کے نام سے کوئی واقف نہیں۔

نرشگندی سے کوئی پندرہ میل دور منوہر تھانہ کے قریب ایک قدیم مزار ہے۔ جو حضرت شاہ ایرانیؒ کے مزار کے نام سے مشہور ہے۔ مقامی لوگ اسے شاہ ایرانی کی درگاہ بھی کہتے ہیں۔ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کے مزار سے متصل ایک مسجد بنوائی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر کرنے والوں میں اکثریت غریب کسانوں کی تھی۔ جب لوگ اللہ کے گھر عبادت کے لئے آتے ہیں تو حضرت شاہ ایرانی کے مزار مقدس پر فاتحہ پڑھ کر ایصالِ ثواب پہنچاتے ہیں۔ اس طرح اللہ کے نام کو زندہ کرنے والے کا نام ہر کس و ناکس زبان کی پر رہتا ہے مبارک ہیں وہ ہستیاں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی ہستیوں کو فنا کردیا لیکن وہ کبھی فنا نہ ہوئے ان کا نام رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ رہے گا۔

حضرت شاہ ایرانی کی درگاہ مبارک سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں 'چنڈی پاڑا' ہے۔ یہ گاؤں اڑالی ندی کے کنارے آباد ہے، اس گاؤں پر راجہ چنڈی حکومت کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس علاقے میں کوئی اللہ کا نام لیوا نہ تھا، ہر طرف بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ہر سو کفر و الحاد کی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ راجہ چنڈی راجہ گوڑ گوبند کے زیر اثر تھا۔ جب حضرت جلالؒ نے راجہ گوڑ گوبند کا خاتمہ کردیا تو آپ نے حضرت

ایرانیؒ کو چند ساتھیوں کے ساتھ راجہ چنڈی کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجا۔ راجہ چنڈی بھاری فوج لے کر حضرت شاہ ایرانیؒ کے مقابلے کو آیا۔ لیکن حق کی فتح ہوئی اور باطل کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ راجہ چنڈی کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ راجہ چنڈی اور اس کے کئی سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا لیکن حضرت شاہ ایرانیؒ نے سب کو معاف کر دیا۔ دشمن کے ساتھ آپ کی خوش خلقی کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف راجہ چنڈی بلکہ اس کے تمام ساتھیوں نے

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کے نورِ توحید اور تجلیات محمدی سے اپنے قلوب کو منور کیا۔ اور اس طرح چنڈی پاڑا اور آس پاس کی ساری بستیاں 'اللہ اکبر' کی آواز سے گونج اٹھیں۔

متذکرہ بالا اولیائے کبار کے علاوہ حضرت جلالؒ کے حلقہ بگوشوں میں اور کئی طالبانِ حق، حضرت حاجی شیخ شمس الدینؒ، حضرت سید یوسفؒ، حضرت شاہ صدر الدینؒ اور خواجہ برہان الدین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان مشائخ عالی مقام نے سلوک کے راستوں کو طے کیا اور اپنے اپنے زاویۂ فکر کے مطابق بنگال کے علاقوں میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کئے۔

حضرت شیخ شمس الدینؒ، حضرت شاہ جلال یمنی سلہٹیؒ کے مرید تھے۔ حضرت شاہ جلالؒ کی ہدایت پر جن حضرات نے سلہٹ کے مغربی حصے میں اسلام کی اشاعت کی ان میں حضرت شیخ شمس الدین کی خدمات نمایاں ہیں۔ پستو ندی اور جمائی کاٹی کے جنوبی کنارے آٹھ گھر نامی گاؤں میں آپ کا آستانہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کا رہنا تو کیا گزرنا محال تھا، ہندو جان کے دشمن ہو جاتے تھے۔ لیکن ان نامساعد حالات میں آپ نے ہمت سے کام لیا اور اللہ کے بھروسے سکونت اختیار کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اخلاق حسنہ اور حسن سلوک سے آس پاس کے ہندو بڑے گرویدہ ہو گئے۔ اور ان کے اردگرد جمع ہو کر قرآن کریم کی آیتیں اور اللہ کی باتیں بڑے غور سے سنتے۔ آپ کی زبان میں ایسی تاثیر اور الفاظ میں ایسا جادو تھا کہ بیشتر ہندوؤں نے بت پرستی چھوڑ کر توحید پرستی کو شعار بنایا۔ بعض نے آپ بیعت کی اور اشاعتِ حق میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک شخص آپ کے اسوۂ حسنہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ نہ صرف خاندان سمیت مشرف بہ اسلام ہوا بلکہ اس نے اپنی ہمشیرہ کی شادی حضرت شمس الدینؒ سے کر دی۔

آپ نے باقاعدہ درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس طرح "آٹھ گھر" نامی گاؤں جو کبھی بت کدہ تھا، علم وعرفان کا گہوارہ بن گیا ۔

حضرت سید یوسفؒ حامل عرفان اور محرم اسرار و رموز تھے۔ چھانک تھانہ شیلانگ چاپڑ سید گاؤں میں آپ کی سکونت تھی اس علاقے میں آپ ہی کے دم سے توحید کا چراغ روشن ہوا اس مقام پر آپ کا مزار مبارک آپ کی رشد وہدایت کی نشان دہی کرتا ہے ۔

حضرت شاہ صدرالدینؒ قریشی بھی حضرت جلالؒ کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے۔ حضرت جلالؒ نے آپ کو تبلیغ کے لئے بازار اور سونام گنج کے علاقوں میں بھیجا تھا۔ آپ نے اس علاقے کی ظلمت کو تجلیاتِ الٰہیہ اور انوارِ محمدیؐ سے بدل دیا۔ عوام کو قرآن شریف کے ذریعے معبود حقیقی کی حقیقت سے آشنا کیا اور اللہ کے راستے میں رجوع کیا ۔

حضرت خواجہ برہان الدینؒ متبعینِ شریعت وطریقت میں سے تھے۔ آپ پہلے چاٹگام میں قیام پذیر تھے پھر بعد میں سلہٹ کو اپنا مسکن بنایا۔ حضرت شاہ جلالؒ کی ہدایت پر بارہ اولیائے کرام کی ایک جماعت گاؤں گاؤں، قریہ قریہ کا دورہ کرتی اور حقیقت ومعرفت کا درس دیتی۔ حضرت خواجہ برہان الدینؒ بھی اس جماعت کے ایک رکن خاص تھے۔ حضرت جلالؒ کے مریدوں میں آپ کا مقام بلند ہے۔ آپ کی کشف وکرامات کی کہانیاں کتابوں میں ملتی ہیں اور سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں۔ آپ کا آستانہ ہر وقت علم وعرفان کا مرکز بنا رہتا تھا۔ دور دور سے لوگ آپ کی مجلس میں کسبِ فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ آپ کی درگاہ آج بھی زیارت گاہِ عالم ہے ۔

ترجمہ

تأوِیلُ الاحادِیثُ

حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام ان دونوں نبیوں کے ذاتی احوال، دونوں کی قوم کا کفر اور فسق میں رہنے کا حال، ان پر ملأ اعلیٰ کا غضبناک ہونا، ان کی ہلاکت کا فیصلہ کرنا، اور انسانِ الٰہی کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ عنایت کہ وہ ان کو عذاب سے ڈرائے اور ان میں سے ایمان والوں کی نجات اور خلاصی کے لئے کوئی حیلہ کرے (ان تمام باتوں میں) حضرت نوح علیہ السلام کے قصے سے ملتا جلتا ہے۔

یہ دونوں انبیاء (خدا کی طرف سے) ڈرانے والے تھے، اور دونوں کے دل میں مومنین کی نجات کا حیلہ الہام کیا گیا تھا اور دونوں کو عبادت کے ایسے طریقے دیئے گئے تھے جو طبیعت کے (جوش کے) لئے کاسر تھے۔

قوم عاد کا مسکن ریت کے ٹیلے اور ریتلا ملک تھا اور ان کے ملک کی ہوا خشکی اور گرمی کی طرف مائل تھی، ان کے حق میں عذاب کی جملہ قسموں میں سے ہوائی طوفان بہت قریب تھا۔ ایک زمانے تک ان سے برسات رک گئی اور ان کے چارپائے ہلاک ہو گئے تب انہوں نے اللہ کے حضور میں عاجزی کی اور ان کی قوتِ ملکیہ کو تنبہ ہوا، اس لئے وہ

اپنے برے اعمال کی وجہ سے پکڑے گئے، اور اگر وہ بہائم کی طرح (بے سمجھ) ہو جاتے تو ان پر (اتنا) جلدی عذاب نہ آتا کیوں کہ (ان کے لئے) عنایتِ ملکیہ کا ظہور ہوا تھا، اور انہوں نے ملکی عنایت کے احکام کو توڑ ڈالا اس لئے وہ (ملأ اعلیٰ کی نظر میں) ملعون بن گئے (اب صرف عذاب کی دیر تھی) جب انہوں نے ابر کو یعنی مادہ مجتمع کو اوپر دیکھا تو اس کو برسنے والا بادل خیال کیا۔ حالانکہ وہ اللہ کا عذاب تھا جس کی وہ جلدی کرتے تھے، پھر اس نے ایک تند و تیز ہوائی طوفان کی شکل اختیار کی۔

قوم ثمود کے رہنے کی جگہ پہاڑ اور ان کے غار تھے۔ ان کے حق میں عذاب کی بہت قریب وجہ زلزلے اور سخت آواز تھی۔ پھر حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے ہلاک ہونے کی دعا کی حالانکہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت نہیں آیا تھا۔ تب اس کے نفس نے بھی ہلاکت کی ہیئت حاصل کی اور اللہ تعالیٰ کی نظر بھی اس کی حاصل کی ہوئی ہیئت کے ساتھ مل گئی (اور موافقت کی)۔ تب اس پر موت اور نیند کے درمیان کی حالت طاری ہوئی جس طرح اصحاب کہف پر طاری ہوئی تھی، پھر اس کو اٹھایا گیا۔

جاننا چاہیئے کہ عالمِ ملکوت میں جو بھی شر ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی حیوان کی صورت کے ساتھ متمثل ہوتا ہے۔ کیونکہ شرور کو حیوانات کے ساتھ جبلی مناسبت ہوتی ہے۔ سب سے آخری شر انسان کی صورت اختیار کرے گا (جسے دجّال کہا جاتا ہے) اور (اس کے بعد دنیا کی) عام ہلاکت اور بربادی قریب آجائے گی۔

آخر اس قوم کا شر حضرت صالح علیہ السلام کی بددعا سے ایک اونٹنی کی شکل میں نمودار ہوا[1]۔ جب انہوں نے اس اونٹنی کو قتل کیا تو شر چلا گیا اور طوفان آگیا۔

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اونٹنی جو کہ حضرت صالحؑ کے معجزے سے قوم ثمود کے لئے ظاہر ہوئی تھی اس کا مادہ اس قوم کی برائیاں تھیں جنہوں نے ان کی مانگ سے اونٹنی کی شکل اختیار کی تھی، جب انہوں نے اس کو قتل کیا تو جسم کی وجہ سے اس میں جو تقید اور تشخص پایا جاتا تھا وہ ختم ہو گیا اور اب اس کو عموم مل گیا اور فساد عام ہو گیا۔ یہ حاشیہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاص تلمیذ مولانا محمد عاشق کے حاشیہ الخیر الکثیر سے لیا گیا ہے۔ قاسمی

اسی طرح جب دجال کو قتل کیا جائے گا تو شر چلا جائے گا اور قیامت کبریٰ قائم ہوجائے گی۔ طوفان سے ایک قوم کی بربادی ہوئی اور قیامت سے عام تباہی ہوگی۔

لہ جاننا چاہیئے کہ دجال کے وجود کا مادہ اور اس کے جسم کے اصلی عناصر قوم نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب اور دوسرے انبیاء کے اقوام کی برائیاں ہیں جو کہ عام صحیفے میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے مخصوص صحیفے میں جو عذاب مقدر تھا وہ اگرچہ قوموں کی عذاب کی صورت میں (اس دنیا کے اندر) نمودار ہوا لیکن وہ برائی جو بذات خود شدید ہے وہ اپنے ظہور کے بعد دنیا میں بھی باقی رہے گی، اس لئے وہ آخرت میں بھی عذاب کا باعث بنے گی۔ خاص طور پر اس حالت میں کہ مخصوص صحیفے میں راسخ ہونے کے بعد صحیفۂ عالم میں بھی اگر وہ (برائی) راسخ ہوگئی ہو۔

بنی اسرائیل کی برائیاں بہت ہوگئیں اور وہ ان سے لاحق ہوئیں لیکن ان برائیوں کا (عذاب کی شکل میں) کوئی اثر ظاہر نہ ہوا کیونکہ بنی اسرائیل کے اندر ایسے انبیاء موجود تھے جو کہ اللہ کے مطلق اسم کے مظہر تھے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ موجود تھے، اس لئے ان کی برکت کی وجہ سے برائیاں عذاب کی صورت میں نمودار نہ ہوئیں، اور ان میں جو برائیاں جمع ہوتی رہتی تھیں وہ پورے طور پر ایک وحدت بن گئیں، تب ان شرور اور برائیوں پر خدا کی طرف سے انسانی ہیئت اور صورت کا فیضان ہوا کیونکہ جو بھی چیز کثرت سے وحدت اختیار کرتی ہے تو اپنے یگانگت اور توحد کی وجہ سے مفیض جواد کی طرف اس کو راستہ مل جاتا ہے۔ عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ ہر مادہ جب کسی محدود وزن تک پہنچتا ہے تو وہ لینے لئے (جواد مطلق سے) ہیئت اور شکل کی طلب اور تقاضا کرتا ہے۔ شرور پر شکل اور ہیئت کے افاضے اور عطا کی مثال ایسی ہے جیسے کیڑوں کی صورت کا افاضہ نجاست اور پلیتیوں پر ہوتا ہے جب وہ پلیدی کے سبب سے آخری درجے پر پہنچ جاتی ہیں۔

انسانی برائیوں کا انسانی شکل میں متمثل ہونے کا راز یہ ہے کہ اس صورت کو اس دنیا میں اس شے کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے جو کلیت اور اطلاق کا رتبہ رکھتی ہو (باقی آئندہ صفحہ پر)

تاویل احادیث ابراہیم علیہ السّلام

حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ فطرت کی طرف شدت کے طور پر نکلے ہوئے تھے (یعنی قوی الفطرت تھے) اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی اخلاق کے ظہور میں انسانی افراد مختلف ہوتے ہیں۔

(۱) ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جن میں شجاعت اور بہادری بالکل مفقود ہوتی ہے۔

(۲) بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن میں ضعیف سی شجاعت ہوتی ہے جو بہت بڑی ریاضت سے نہایت تھوڑی اور نہ ہونے کے برابر ظاہر ہوتی ہے۔

(۳) کچھ لوگ اوسط درجے کی شجاعت رکھتے ہیں جو وہ تب ظاہر ہوتی ہے جب بہادری کی طرف اس کو بلایا جائے، اور یہ شجاعت تب قوت پکڑتی ہے جب افعال میں ممارست (اور ریاضت) کی مناسب اقوال سے ترغیب دی جائے اور اس کے ساتھ بہادری کے مواقع سے اس کا واسطہ پڑے۔

(۴) کچھ لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں، اگر ان کو بہادری کے کام سے روکا جائے جیسے مہالک میں آگے بڑھنا یا غیرت کے موقع پر ان کو غیرت سے روکا جائے تو بڑی کوشش کے بعد ہی رُکتے ہیں۔ اور یہ روکنا ان پر نہایت گراں گزرتا ہے اور اس کے ساتھ وہ بہادری

(بقیہ حاشیہ) اسی کی طرف پیغمبر علیہ السلام کے اس قول میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا کیا۔ اور اس صورت میں بھی ایک قسم کا عموم ہے، اسی لئے انسان کو قوی متین سے غفلت اور انسلاخ بھی لاحق ہوتا ہے جیسا کہ اس کا بیان (خیر کثیر کے) نویں خزانے میں آئے گا، اور وہ شر جب ایک قوی انسان کی شکل اختیار کرے گا تو اس کے بعد بھی برائیاں اس کو لاحق ہو جائیں گی، جس طرح جزئی، کلی کو لاحق ہوتی ہے یا غذا مغتذی کو، پھر جب وہ شخص مرے گا اور جسمانی تشخص سے آزاد ہو کر روح بنے گا تو سارے عالم کی تباہی ہوگی اور یہی قیامت ہے۔ (مولانا محمد عاشق قدس اللہ سرہ (تلمیذ شاہ ولی اللہ رح) کی خیر کثیر پر تقریر سے یہ حاشیہ منقول ہے)۔

کے خیالات سے خالی نہیں ہوتے اور وہ جس وقت بہادری کا موقع پاتے ہیں یا اس کی طرف ان کو بلایا جاتا ہے (تو پہنچنے میں دیر نہیں کرتے) جیسے گندھک کو آگ لگ جائے اور اس کے جلانے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔

(۵) کچھ لوگ ایسے اعلیٰ درجے کے بہادر ہوتے ہیں جن کو بہادری کے مواقع سے روکنا ناممکن ہے بلکہ وہ ایسے مواقع کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں، اگر اس کے خلاف کی طرف اس کو کوئی بلائے بھی تو اس کی بات نہیں سنتے، بزدلی کی بات کا اس کے دل میں گزرنا ہی نہیں ہوتا۔ اس آخری قسم کے بہادر انسان کو امام شجاعت (بہادری کا پیشوا) کہا جاتا ہے۔ یہ کسی دوسرے امام کی طرف محتاج نہیں ہوتا، بلکہ جو لوگ اس سے کم درجے کے ہیں ان پر واجب ہے کہ اس کے طریقے کو مضبوطی سے تھام لیں، اس کے رسوم کو مضبوط پکڑ لیں اور اس کے واقعات کو یاد رکھیں تاکہ یہ ان کے لئے بہادری میں ایک دستور کا کام دے، اگر وہ اس کی پیروی نہ کریں گے تو بہادری کی راہ سے بھٹک جائیں گے اور ان کے حسب استعداد بہادری کا جذبہ بھی ان میں کم ہوتا جائے گا۔

اس قسم کے اعلیٰ بہادر کے طریقے کو جو لوگ اختیار کرنے والے ہیں ان کے بہت سے گروہ ہیں:۔

ان میں سے ایک سابق ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے پیشوا کا قول اس کے دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اس کے راوی سے اس کو زیادہ یاد رکھنے والا ہو۔

ایک قسم مقتصد یعنی درمیانہ چلنے والا ہو، اور ان میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہو۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح انسانی افراد شجاعت اور بہادری میں مختلف ہوتے ہیں اسی طرح وہ فطرت میں (بھی) مختلف ہیں۔

(۱) ایک وہ جو فطرت کا امام ہوتا ہے، وہ عبادت جیسے کاموں کی طرف اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے کہ اس کو اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے سے کوئی رسم و رواج یا دوسری کوئی روکنے والی چیز نہیں روک سکتی۔ کسی کی تقلید یا کسی سے روایت کیے بغیر عبادات کو بجا لانا

اور اس کے احوال کو قبول کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

اس کی (واضح) مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اس وصف میں آپؑ اتم اور اکمل تھے۔ آپؑ سے پہلے یا بعد میں کوئی بھی آپؑ کی طرح اس خُلق کی طرف نہیں گیا، اس خُلق کے موافق آپؑ پر علومِ الٰہیہ کا ترشح ہوتا تھا۔ آپ کا قلب اس خلق کا مطیع تھا اس لئے ملأ اعلیٰ میں داخل ہو کر ان سے پرتوِ نور حاصل کر کے آپؑ کے لئے رحمت کی طرف توجہ کرنا آسان تھا، اسی لئے آپؑ کو امام بنایا گیا، اور (بعد کے آنے والے) جملہ انبیاء علیہم السّلام کو آپؑ کے ملت کی پیروی کرنے کا حکم ہوا۔

(۲) کچھ لوگ قوی فطرت ہوتے ہیں۔ اجمالی طور فطرت کی طرف اس طرح مائل ہوتے ہیں کہ اگر ان کو فطرت کی طرف رہنمائی کرنے والا امام نہ ملے تب بھی فطرت کی مخالفت کے لئے تیار نہیں ہوتے، لیکن ان کے دل میں ایک گونہ اضطراب ہوتا ہے، اور اگر اس کو فطرت کا پیشوا مل جائے تو اس امام کی بات اس کے دل میں بیٹھ جائے گی اور وہ اپنے امام کے قول کا مطلب سمجھ لے گا اور وہ مجبور ہو گا کہ اپنے پیشوا کے قوانین کو ضبط کرے، اس کے مجمل کی شرح کرے، اور اس کے مذہب کی اشاعت کرے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے بعد کے آنے والے انبیاء علیہم السلام نے حضرت ابراہیم کے ملّت کی پیروی کی اور اس کو واضح کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا۔

(۳) تیسرا گروہ وہ ہے کہ اگر وہ فطرت کے امام کو نہ پائیں تو راہِ راست پر نہ آئیں اور جب ایسے پیشوا کو پائیں تو اس سے خوب نفع اٹھائیں، جیسے پہلے کی امتیں تھیں۔

(۴) کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ فطرت کی طرف لگاتار دعوت اور بلانے کے سوا اس کی طرف خود نہیں جاتے، ایسے لوگ (دعوت و تبلیغ سے) تھوڑا سا نفع پا لیتے ہیں۔

(۵) بعض لوگ (فطرت کے) شدید منکر اور مخالف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دل اور کانوں پر اللہ مُہر لگا دیتا اور اُن کے آگے اور پیچھے دیوار کھینچ دیتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام اپنی قوت (اور جوانی) کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے

ان کو حکمت عطا کی، اور ان پر ان کی جبلت منکشف ہوئی[1] - پس جب اس نے ستارہ، چاند اور سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا تو اس سے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ جس پروردگار نے اس کو پیدا کیا ہے وہی اس کی تربیت کرتا ہے اور (حق کی) راہ دکھاتا ہے اور وہ جسمانی احکام سے مبرا اور انسانی (عوارض) سے بلند ہے۔ (اس تنبہ کے بعد) آپؑ پر ایک عظیم حالت طاری ہوئی اور آپؑ پر حق منکشف ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام غیر اللہ کی عبادت پر بڑے غیرت والے تھے، اس لئے بتوں کو توڑ ڈالا اور (اس پر) آپؑ کو آگ میں ڈالا گیا، لیکن آپؑ (اللہ تعالےٰ کے) پسندیدہ بندہ تھے۔ اللہ خلق میں آپؑ کی بقا چاہتا تھا، تب اللہ پاک نے آگ کے مادے پر ایک دم ہوا کے ذریعے ایک ٹھنڈی ہیئت ڈال دی۔ اور یہ سرد ہوا ٹھنڈے طبقے سے آئی کہ جس نے شدید برودت کو اٹھا رکھا تھا، اس نے آگ کو بدل دیا۔ اور ان دونوں کے تصادم اور ٹکر سے ایک اچھی ہوا پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد آپؑ، فاجر اور اللہ کے دین میں جھگڑنے والے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے سخت تنگ آ گئے تو آپؑ نے اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کی، یعنی ایسی زمین کی طرف ہجرت کر گئے جہاں پروردگار کی عبادت ممکن ہو سکے۔ راستے میں ایک جبار اور سرکش آپؑ کو آڑے آیا جو آپ کی بی بی پر ظلم کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے بڑی ہمت اور سعی سے اللہ کے حضور میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو وحی کی کہ بدن میں ہوا کے پھیلنے کی جگہ سے اس جبار اور ظالم کے بدن میں داخل ہو جائیں (اور اس کو روک دیں آخر ایسا ہی ہوا) اور اس (جابر) کے ہاتھ اینٹھ گئے۔ جب اس جابر حاکم نے یہ دیکھ لیا تو حضرت ابراہیمؑ کی عورت کو چھوڑ دیا اور حضرت ہاجرہ کو اس کی خادمہ بنا دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی، دونوں کی عمر بڑھ گئی تھی اور دونوں کی کوئی اولاد نہ تھی، اللہ نے ان پر رحمت کی اور دو فرزند عنایت کیے۔ حضرت ابراہیم

---

[1] سورۃ انعام کی آیت نمبر ۷۵ سے ۸۱ تک میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص عنایت تھی، کیوں کہ وہ خدا کے محبوب بندے تھے اور دونوں کو جذب الٰہی نے گھیر لیا اور لوگ فطرت کے پیشوا کے خلفاء کی طرف محتاج تھے۔ تمام لوگوں میں سے امامت کی طرف زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جس کی جبلت (اور فطرت) کو جذب الٰہی کے راز نے گھیر لیا ہو (یہ وصف حضرت ابراہیمؑ میں بطور اتم موجود تھی) اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی اولاد میں توحید کی طرف دعوت دینے کو ایک دائمی مشغلہ کی حیثیت عطا فرمائی۔

آپؑ کے دو فرزندوں میں سے ایک کے حق میں حق تعالیٰ کی یہ منشأ اور مراد تھی کہ اس کو اپنے حرم کا خادم بنائے اور اس کے وسیلے سے (اپنی تجلی کے ذریعے) خلق سے قریب ہو اور ایک ایسا شعار ظاہر فرمائے جس کے ساتھ لوگ اللہ کا تقرب حاصل کریں اور اس کو ایسی اولاد عطا فرمائے جس میں امت مسلمہ بننے کی صلاحیت ہو۔ اب اس کو وجود میں لانے کے لئے بہت قریب وجہ یہ تھی کی بی بی سارہ حضرت ابراہیم کو، ہاجرہ ہبہ کر دے، اور ان میں سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حرم تک پہنچنے کی بہت قریب وجہ یہ تھی کہ بی بی سارہ کو ہاجرہ پر رشک آیا اور اس نے ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو اپنے گھر سے نکال دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو ایک ویران جگہ میں بسایا (جہاں نہ کوئی پانی تھا نہ گھاس)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا چشمہ نکالا اور لوگوں کے دلوں میں وہاں سکونت اختیار کرنے کا الہام کیا، اس سے حرم کا انتظام بن گیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ الہام فرمایا کہ بیت اللہ کو بنائے اور وہاں رہائش اختیار کرنے کا بھی ان کو الہام کیا گیا جس کی یہ صورت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں ایک سمجھ اور فراست پیدا کی پھر اس میں برکت دی اور ان کو حج کے احکام اور اس گھر میں عبادت کی کیفیت کی تعلیم دی کہ ان کے دیانت کے خُلق میں اضافہ فرمایا اور یہ ان کے سینے میں ایک وحی موجب بن گئی جس کو انہوں نے اپنے سینے کے آئینے میں مشاہدہ کیا (اسی طرح) اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کے کام کا انتظام فرمایا اور ان کو اپنے گھر کا خادم بنایا اور لوگوں میں حج کا شوق پیدا کیا اور

حضرت اسماعیلؑ کو نیک کام کرنے کی وصیت کی اور ان کو اپنی قوم کے لئے نیکی کا حکم کرنے والا بنایا۔

اور دوسرے فرزند کا قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے توسط سے ابراہیم علیہ السلام کو اس (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری سنائی اور اس سبب سے بی بی سارہ کی جوانی نے جوش مارا اور پھر ان کے حیض کے ایام لوٹ آئے اور اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔

جان لیجئے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اپنی فطرت اور جبلت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف خالص طور پر متوجہ ہوئے تو ان کا مقرب ملکوں میں شمار ہونے لگا اور ملأ اعلیٰ کے توسط سے ان کو انسانِ الٰہی[1] کے روشن دان سے ارادے اور اختیار کی زبان سے آواز دی گئی۔ اسی لئے انہوں نے نجومیت، مجوسیت اور شرک کے باطل ہونے کا واضح اعلان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے (حضرت ابراہیمؑ کو) اس تعلیم دینے سے ایک تقریب کا ارادہ فرمایا تھا جو یہ تھی کہ (قدیم) ملتیں باہم مختلف ہوگئی تھیں، مجوسیت میں تحقیق ختم ہوگئی تھی، اور نجوم سے شرک بڑھ گیا تھا۔ اب اس باطل کے سر کو توڑنے والا حق صرف یہ رہ گیا تھا کہ فطرت (پر چلنے) کا حکم دیا جائے اور ارادہ (الٰہی) کی زبان کا اتباع کیا جائے۔ اس دور کے اول میں (دنیا کے) حوادث (اور واقعات) آسمانوں کی قوتوں اور عناصر سے براہِ راست صادر ہوتے تھے، اسی لئے ادریس علیہ السلام اُس دور کے مناسب علوم سے گویا ہوئے۔ (دور اول کی خرابیوں کو دیکھ کر) حظیرۃ القدس کے مقدس ملائکہ ملأ اعلیٰ میں ایک گونہ جوش پیدا ہؤا (کیونکہ) ان میں سے ہر ایک (خدا تعالیٰ کے لئے) ایک طلسم اور تجلّی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کچھ آسمانی قوتیں بھی ودیعت کے طور پر رکھی گئی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو ملأ اعلیٰ میں (حسبِ مراد) بسط اور قبض فرماتا ہے

---

[1] انسان الٰہی، نام ہے انسانی افراد کی اجتماعی شکل کا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں اس کا دوسرا نام "امام نوع الانسان" بھی ہے۔ فلسفہ یونان میں اس کو نوعِ انسانی کا رب کہا جاتا ہے۔

اور اسی طرح اپنی مراد کو پورا کرتا ہے۔ اب آسمانوں کے لئے کوئی واضح حکم باقی نہ رہا تھا، اس لئے ابراہیم علیہ السلام نجوم کو مٹانے والے، توحید کی بات کرنے والے اور لوگوں کو اس تجلی کی طرف داعی ہوئے جو کہ حظیرۃ القدس میں قائم تھی۔

جاننا چاہیئے کہ وہ علوم جو کہ ملأ اعلیٰ کے ہاں ہیں سب سے قریب ان انسانی نفوس (کے دل) پر ٹپکتے ہیں جن کی ملائکہ کے ساتھ (قوی) مناسبت ہوتی ہے، لوگوں کی ہدایت کا ارادہ، (حق کے مخالف لوگوں سے نفرت اور) ان پر لعنت کرنا، اور انسانوں کے لئے شرائع کو مقرر کرنا ان سب کا ملأ اعلیٰ میں فیصلہ ہوتا ہے، اس لئے منشأ الٰہی کو بروئے کار لانے کے لئے) ملأ اعلیٰ کے توسط سے انبیاء علیہم السلام پر ہی علوم اترتے ہیں اور یہ علوم ان کی زبان میں ہوتے ہیں اور ان کے عقول اور سمجھ کے مناسب ہوتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ (لوگوں کی تعلیم کے لئے) اللہ تعالیٰ کی مختلف زبانیں ہیں، (اسی بنا پر) جب اس نے ابراہیم علیہ السلام کو قربانی کے ذبح کے ذریعے اللہ کے تقرب کی تعلیم کا ارادہ فرمایا تو اس کے ساتھ دو زبانوں میں کلام فرمایا تاکہ اللہ کے ساتھ اس کے اخلاص اور اس کی فرمانبرداری کو واضح کرنے کے لئے ایک بڑا واقعہ وجود میں آئے اور بیٹے کے ذبح کرنے والی قربانی اُس زبان کے لحاظ سے ایک نعمتِ مشکورہ بن جائے۔

اس کا راستہ یہ تھا کہ حیوانات کی روحیں انسان کی طرح عام عالم کو متضمن ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ حیوان میں انسان کی بنسبت شدید اجمال پایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ پر یہ راز کھل گیا اور ان کو اپنے خواب میں یہ دکھائی دیا کہ وہ اپنے اس بیٹے کو ذبح کر رہا ہے جو کہ انسانیت میں نہایت ہی کمال کے مالک ہیں۔ اس کی مثال، ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پچاس نمازیں فرض ہونے کی مانند ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض ٹھہرائیں اور خدا نے آپؐ کو بتایا کہ اللہ کا قول بدلتا نہیں یہ حقیقت میں تو پانچ ہیں لیکن یہ (ثواب کے لحاظ سے) پچاس ہیں کیوں کہ ہر نیکی کا ثواب دس گنا اس سے زائد ہوتا ہے، اب ان کو پچاس کہنا مجاز کے طرز تکلم پر اللہ کا کلام ہوگا

تاکہ نعمت کو کامل فرما دے اور فرمانبرداری کو دیکھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ، اللہ تعالےٰ کا مکالمہ بھی اسی طرح دو زبانوں سے ہوُا! ایک تو حجاز کی زبان تھی کہ "تم اپنے بیٹے کو ذبح کرو یعنی ایسے قوی مینڈھے کو ذبح کرو جو جیسے بیٹا باپ کو پیارا لگتا ہے وہ جانور بھی اپنے مالک کی سب سے پسندیدہ شئے ہو۔ ابراہیم علیہ السّلام نے جب اس (حکم اور) زبان کی پیروی کی تو ان کو ایک عظیم واقعہ پیش آیا جس سے آپؑ کی عبادت اور انقیاد کی پوری ترجمانی ہوتی تھی اور آپؑ کے صحیفے میں یہ لکھا گیا کہ انہوں نے اللہ کے لئے اپنے بیٹے کو ذبح کیا، پھر اللہ نے اس کا فدیہ اتمامِ نعمت کے طور ذبحِ عظیم سے تعبیر فرمایا۔

دوسری زبان حقیقت کی تھی (جس میں) اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب فرمایا "کہ تو نے خواب کو سچا کر کے دکھایا" یعنی تم نے خواب کی تعبیر اور اس کی مراد کو پورا کیا اور اس سے اللہ کا مقصد دنبے کے ذبح کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے انسانِ الٰہی (امام نوعِ انسانی) سے ارتفاقات (باہمی معیشت کے اصول) اور نیکی و گناہ کے علوم کو لیا تھا، اسی لئے آپؑ نے مہمانی، مسافر کا حق، فطرت کی خصلتیں اور حیوان کے ذبح سے تقرب حاصل کرنے کی بنیاد رکھی، ارکانِ اسلام کو مشروع فرمایا اور شرک سے ہر طرح دور رہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

چند مشاہدات

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے
مرسلہ۔ مولانا عزیز احمد

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ان کے علم و فضل اور مجاہدانہ کارناموں کا ذکر لوگ بڑے جوش و خروش سے کرتے تھے اور ان کو سن سن کر دل میں جذبہ اور ولولہ اٹھتا تھا کہ اے کاش مولانا اس زندگی میں کہیں مل جائیں اور آنکھیں ان کے دیدار سے شادکام ہوں۔ آخر خدا نے دل کی یہ مراد پوری کی اور ۳۹ء میں اچانک سنا کہ مولانا تیس ۳۰ برس کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان تشریف لا رہے ہیں اور جہاز سے کراچی اتر کر سیدھے دلی تشریف لائیں گے۔ اب ایک ایک گھڑی گننی شروع کردی اور مولانا کی آمد کا سخت بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی آگیا ہم سب لوگ مولانا کے استقبال کے لئے دلی اسٹیشن پر پہنچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس طرح رہتے تھے اس کے پیش نظر میں نے اس وقت مولانا کی نسبت جو تخیل قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ سر پر عمامہ ہوگا، جبہ زیب تن ہوگا، فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ہمراہ ضرور ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیس ایک بھاری بیڈنگ، دو تین تھرماس کی بوتلیں تین چار بھاری ناشتہ دان ساتھ ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام تخیلات اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھورتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا ایک صاحب ننگے سر، صرف کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہنے

اور ایک سفید کھدر کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے ایک دم میں تھرڈ کلاس سے پھدک کر پلیٹ فارم پر آ کھڑے ہوئے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مولانا عبید اللہ سندھی ہیں۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سپید تھے۔ عمر ۶۵ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی مگر جسم مضبوط اور گٹھا ہوا۔۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک، پیشانی پر مجاہدانہ عزم و ہمت کے کس بل، آواز میں طنطنہ اور چہرہ پر بزرگانہ معصومیت کے ساتھ ایک ایسا جلال کہ گویا ایک سپاہی ایک میدان جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف آ گیا اور اس نے ایک دوسرا اور نیا مورچہ سنبھال لیا ہے لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اتاریں مگر وہاں سامان کہاں تھا جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا بس وہی ان کا سامان تھا اور باقی خدا کا نام۔ میں نے دنیا میں علماء بھی دیکھے ہیں اور درویش بھی، تارکین دنیا بھی دیکھے ہیں اور کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی۔ لیکن دنیا اور اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی بے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔

دلی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداءً قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا تھا۔ یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی، اس لئے مغرب کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا کچھ دیر ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت ہوا تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے اور سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بڑی موٹر کار ہمارے پاس آکر رکی۔ موٹر کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے جس کے لئے آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا 'کب'؟ سیٹھ صاحب نے کہا، 'بس ابھی'! سیٹھ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فوراً لپک کر ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ روانہ ہوگئے۔ نہ کمرہ میں واپس گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرہ کا دروازہ بند کیا۔ میں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا اگر کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا؟ وہاں ان کا سامان تھا ہی کیا؟ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن رکھے ہوئے تھے تو وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے مولانا کا کچھ نہ تھا۔

قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند قیام فرمانے کے بعد مولانا جامعہ نگر اوکھلا میں منتقل ہوگئے۔ اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پابندی کے ساتھ اوکھلے سے آکر دلی کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے مغرب جنوب میں حکیم نابینا مرحوم کا مشہور مطب تھا۔ اور اس مطب سے بالکل متصل ہمارے ایک دوست مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان تھا جس کے ایک وسیع کمرہ میں ادارۂ شرقیہ کے نام سے مولانا موصوف نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کررکھا تھا۔ اس ادارۂ شرقیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد سے لے کر عصر تک احباب کا اچھا خاصا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر سیدھے یہیں تشریف لاتے تھے اور عصر تک رہتے تھے۔ چند روز کے بعد ہم لوگوں کی درخواست پر مولانا نے اس مجلس میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کردیا درس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کتاب کی کوئی اہم بحث نکال لی اور اور اس پر تقریر شروع کردی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ سوالات کرتے تھے اور مولانا ان کے جوابات دیتے تھے۔ اس مجلس میں دیوبند کے فضلاء، کی جو دلی میں مقیم تھے وہ اور ان کے علاوہ جامعہ ملیہ کے کچھ اساتذہ اور چند اور ارباب علم شریک ہوتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا؟ مولانا سندھی حسب معمول اوکھلے سے دلی آئے۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور پھر ادارۂ شرقیہ میں تشریف لاکر حسب معمول حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا، اس وقت چہرے پر نہ تکان کا کچھ اثر تھا اور آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف۔ کمال بشاشت اور توانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر حواسی کے ساتھ حصّہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہوگیا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہوگئے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی ضرورت سے میں چتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بھٹیارہ کی دکان پر بیٹھے کھانا کھارہے ہیں کھانا بھی بہت معمولی یعنی دو آنہ کا سالن اور ایک آنہ کی روٹی۔ میں نے کہا حضرت یہ بے وقت کھانا کیسا؟۔ فرمایا "اوکھلے میں کھانا تیار نہ تھا اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اس لئے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا"

یہ تو خیر ہوا ہی، اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس واقعہ کا میں نے

اوپر ذکر کیا ہے یہ گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا اور چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد و رفت کا بس کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہ تھے اس لئے اس روز مولانا سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے سے دلی آٹھ میل پا پیادہ آئے اور اسی طرح پا پیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے نہ از خود ہم سے کچھ کہا اور نہ چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ سکا بلکہ جامعہ نگر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے مولانا کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا ان سے جب مجھ کو یہ معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت کیا اور مولانا نے اس کی تصدیق کی۔ تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ چونکہ اس روز مولانا کو پیدل آنا تھا اس لئے اوکھلے سے ان کو بہت پہلے روانہ ہونا تھا اور اس وقت تک چونکہ کھانا تیار نہیں ہوا تھا اس لئے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کے لئے کافی نہیں ہوسکتے تھے اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔

ایک مرتبہ میری موجودگی میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے مولانا سے پوچھا کہ "حضرت! آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نوکر بھی رکھا ہے؟" حسب عادت بپھر کر بولے "مفتی جی! آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کبھی انسان کا نوکر ہوسکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے۔ میری خدمت بھی میرے دوست احباب کرتے تھے اور میں ان کی خدمت کرتا تھا۔" اسی نشست میں مفتی صاحب نے پوچھا "حضرت! تیس برس کی جلاوطنی کے زمانہ میں آپ پر عیش و مسرت کے بھی کچھ دن آئے ہیں؟ فرمایا" مفتی صاحب یقین کیجئے اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے جس میں میں چین و آرام سے سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر تیس برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں۔

مولانا ہمیشہ ننگے سر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا "مولانا آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کرکے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ کے ساتھ فرمایا" میری ٹوپی تو اس دن سر سے اتر گئی جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں۔"

مولانا کافی عمر رسیدہ تھے۔ عمر کا بڑا حصّہ جلا وطنی کی تکالیف اور مصائب میں بسر کیا تھا، اور بے زر و سرمایہ تھے۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کی روشنی میں انہوں نے اس پر مسلسل غور و فکر کیا تھا کہ اسلام کو دنیا کے موجودہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر طاقت بنایا جائے جس کا کہ وہ دین فطرت ہونے کے باعث بجا طور پر مستحق ہے اور جو اس کا طبعی حق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اسلام کے اجتماعی، اقتصادی اور سماجی نظام کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اور دوسری جانب انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا میں جو عظیم الشان صنعتی انقلاب ہوا اور اس انقلاب کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل اور عام معاشرہ پر پڑ رہے ہیں ان سب کا دیدہ وری اور عمیق بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ایک نتیجہ پر پہنچ کر اپنا ایک مستقل فکر قائم کیا تھا۔ مولانا کا یہ فکر بڑا مستحکم اور غیر متزلزل تھا اور اس پر ان کو کامل درجہ کا وثوق اور اعتماد تھا۔ جلا وطنی سے واپسی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کے اس فکر کو سمجھیں اور اس کی بنیاد پر سوسائٹی کی از سر نو تشکیل و تعمیر کریں۔ چنانچہ انہوں وطن آنے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں جو مضامین و مقالات لکھے اور جو رسالے تالیف کئے ان کے عمق اور ضخامت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی فکر کو عام کرنے اور اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی کیسی دھن تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کو اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی —— اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا جتنے بڑے مفکر اور مخلص تھے، اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ اتنے بڑے انشاء پرداز۔ بات بہت گہری اور پتہ کی کہتے تھے مگر انداز بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ بعض اچھے اچھے اہل علم اور مفکرین بھی ان سے بدظن ہو جاتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ درشت اور غیر مصالحانہ ہو جاتا تھا۔ مولانا خود بھی کبھی کبھی اس کا اعتراف کرتے اور اس پر افسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ میں کسی طرح ان سے سبقاً سبقاً 'حجۃ اللہ البالغہ' پڑھ لوں اور پھر ان کے ارشادات کی روشنی میں 'حجۃ اللہ البالغہ' کی شرح' اپنے الفاظ میں لکھ ڈالوں۔ اس اہم کام کے لئے مجھ ایسے ہیچمدان کا مولانا کی نظر میں انتخاب میری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی اس بناء پر میرے لئے کیا عذر ہو سکتا تھا۔

میں فوراً اس کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اور قرارداد یہ ہوئی کہ مولانا روزانہ مغرب کے بعد اوکھلے سے دلّی
آئیں گے اور مسجد فتحپوری کے ایک حجرہ میں شب بھر قیام کریں گے۔ ادھر میں عشاء کی نماز سے فارغ
ہوکر اپنے مکان قرول باغ سے مسجد فتحپوری آجاؤں گا اور وہاں مولانا مجھ کو دو تین گھنٹے درس
دیں گے۔ دوسرے دن میں مولانا کی تقریر درس کو اپنے الفاظ میں قلمبند کرکے ان کو دکھا
دوں گا۔ یہ قرارداد ہوچکی تھی اور ابھی اس پر عمل شروع نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو پنجاب کا سفر
پیش آگیا۔ فرمایا کہ ایک ضروری کام سے جارہا ہوں جلد واپس آجاؤں گا اور آتے ہی یہ پروگرام
شروع ہوجائے گا۔ لیکن "آہ" کسے خبر تھی کہ مولانا کا دِلّی سے یہ سفر آخری سفر تھا جس سے واپس
آنا مقدر نہیں تھا۔ پنجاب اپنی صاحبزادی کے پاس گئے تھے جو خانپور میں تھیں وہاں پہنچنے کے
چند روز بعد ہی بیمار ہوئے اور اس قدر شدید کہ جانبری ممکن نہ ہوئی اور واصل بحق ہوگئے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہر حال جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ مشیت ایزدی میں کسی کو کیا مجال دم زدن ہے۔ آج مولانا
دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنی تحریروں کا جو گراں بہا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں وہ اس لائق
ہے کہ اسلامیات کا ہر طالب علم اس کا غور وفکر سے مطالعہ کرے اس سے فکر کی نئی راہیں
سامنے آئیں گی اور تنازع للبقاء کے موجودہ دور میں ایک ایسی روشنی ملے گی جو ہمت اور عزم
پیدا کرے گی۔

پروفیسر مولانا نورالحق

محمد ایوب قادری ایم اے

پروفیسر مولانا نورالحق مرحوم کی زندگی علم وفضل سے عبارت رہی۔ انہوں نے اپنی تمام عمر درس وتدریس میں گزار دی۔ اورینٹیل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اور اسی جگہ سے وہ سبکدوش ہوئے کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

ستمبر ۱۹۶۶ء میں راقم الحروف کو لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز مشہور تاجر کتب نادرہ، مولوی شمس الدین صاحب کے دولت کدے پر ان کے ذاتی ذخیرۂ کتب دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مختصر سا ذخیرہ تھا مگر منتخب اور بہت قابل قدر تھا۔ کچھ مخطوطات بھی تھے۔ انہی میں مجھے مولانا نورالحق مرحوم کی خود تحریر کردہ ایک درخواست نظر پڑی جو انہوں نے ہیڈ مولوی کی اسامی کے لئے دی تھی۔ اور اس میں انہوں نے اپنے متعلق ضروری باتیں لکھی تھیں۔ اب یہ درخواست ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم نے اپنے دوست چودھری بشیر احمد خان صاحب سے اس درخواست کی نقل حاصل کی جن کو مولوی شمس الدین صاحب کی کتابوں پر پوری دسترس حاصل ہے۔ اس درخواست کے مندرجات سے مولانا نورالحق مرحوم کے حالات زندگی کا اجمالی خاکہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نورالحق مرحوم ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی محمد قاسم مرحوم

پٹواری تھے۔ محمد قاسم مرحوم کی آمدنی کم تھی مگر وہ دیانت دار اور روزے، نماز کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ ان کے تین فرزند پروفیسر مولانا نورالحق، ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور پروفیسر غلام ربانی علمی دنیا میں بڑی شہرت وعزت کے مالک ہوئے۔ منشی محمد قاسم، پرانی وضع کے سیدھے سادھے آدمی تھے، طبیعت کفایت شعار تھی۔ انہوں نے ضلع جہلم کے قصبہ بسال میں سکونت اختیار کرلی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے وقت چودہ ۱۴ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ 'منیرہ شریف' ضلع اٹک کے مشہور بزرگ خواجہ احمد (ف ۱۹۲۰ء) کے مرید تھے۔ مولانا نورالحق مرحوم کا ماحول اور معاشرہ سمجھنے کے لئے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی آپ بیتی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو[1]

"ضلع اٹک میں منیرہ شریف ایک مشہور گدی ہے جس پر بڑے بڑے باکمال لوگ متمکن رہے ان میں سے ایک خواجہ احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا انتقال ۱۹۲۰ء کے قریب ہوا۔ 'جانی' (ڈاکٹر غلام جیلانی برق) کے والد ان کے مرید تھے۔ اپریل ۱۹۰۷ء کی شام کو یہ خبر اڑی کہ حضرت صاحب بسال تشریف لا رہے ہیں، اس خبر سے 'جانی' کے گھر میں بڑی ہماہمی شروع ہوگئی۔ مٹھائیاں بن رہی ہیں، جوڑے سل رہے ہیں، نیاز نذر کے لئے نقدی، قرآن اور باقی لوازمات کا انتظام ہو رہا ہے اور 'جانی' بہت خوش' کہ وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مرشد کی خدمت میں جائے گا، نذرانہ پیش کرے گا وہ سر و پشت پر ہاتھ پھیریں گے اور دعائیں گے۔ آخر وہ صبح آ ہی گئی۔ پیر صاحب کے خیمے گاؤں سے باہر ایک نالے کے کنارے نصب تھے 'جانی' اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر غلام ربانی عزیز (آج کل پرنسپل اسلامیہ کالج، قصور) کے ہمراہ ایک خیمے میں داخل ہوا۔ اندر مریدوں کے دائرے میں حضرت صاحب تشریف فرما تھے۔ سر پر سفید ٹوپی، سفید کرتہ، نیلا تہبند، سفید نورانی چہرہ، سفید ڈاڑھی، شخصیت میں بلا کی کشش اور آنکھیں گویا دو جلتی ہوئی قندیلیں۔ 'جانی' والد صاحب کے ساتھ ان کے گھٹنوں پر جھک پڑا، چاندی کا

---

[1] "نقوش" لاہور۔ (آپ بیتی نمبر) ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۲۷

ایک روپیہ نذر کیا۔ انہوں نے سر اور منہ پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی۔ بعد میں والد صاحب سے پوچھا:

لالو! یہ دونوں بچے کہاں پڑھتے ہیں؟

حضور، انگریزی اسکولوں میں!

لالو، بہت برا، بہت برا۔ انہیں آج ہی وہاں سے اٹھا کر علم دین پڑھاؤ۔

لالو! یہ آج ہی کرو۔

والد نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا اور گھر آکر پہلا کام یہ کیا کہ بچوں کو اسکول سے اٹھایا اور گھر میں سب سے بڑے بھائی پروفیسر نور الحق کی شاگردی میں دیدیا۔ جو دیوبند سے تازہ تازہ فارغ ہو کر آئے تھے۔

بھائی صاحب (مولانا نور الحق) گاؤں کی مسجد میں درس دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں درجن بھر طلبہ جمع ہو گئے جن میں سے ہر ایک کا سبق دوسرے سے الگ تھا۔ جب جانی اور اس کا بھائی مانی، کریما، نام حق، پند نامہ عطار کے بعد بوستان تک پہنچے تو بھائی صاحب دوبارہ دیوبند چلے گئے اور 'جانی' کو پڑھائی کے عذاب سے نجات مل گئی۔"

مولانا نور الحق نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ یہ زمانہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی صدر مدرسی کا تھا۔ مولانا نور الحق نے ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے درجہ اول میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا، تمغہ اور بہاولپور اسکالرشپ حاصل کیا اور ۱۹۱۹ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

مولانا نور الحق نے کچھ دنوں اپنے وطن قصبہ بسال میں پڑھایا جیسا کہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے لکھا ہے۔ پھر ایک سال تک مدرسہ عربیہ رمضانیہ کلکتہ میں مدرس رہے ایک سال کے لئے دارالعلوم دیوبند میں بھی درس دیا۔ اس کے بعد مدرسہ عربیہ ڈریالہ ضلع جہلم میں مدرس رہے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک مدرسہ عربیہ دار الرشاد پیر جھنڈا (سندھ) میں صدر مدرس کے فرائض

انجام دیئے۔ سندھ کا یہ مدرسہ بڑی مشہور درسگاہ ہے اس درسگاہ کے ساتھ ایک بہت اعلیٰ کتب خانہ ہے۔ مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث اور مولانا ابوتراب صاحب العلم الرابع اس خانوادے کے نامی گرامی اکابر گزرے ہیں۔ آخرالذکر نے سندھ میں تحریک خلافت کو خاص طور سے پروان چڑھایا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی شاگردی اور مدرسہ پیر جھنڈا کی بنا پر مولانا نورالحق کے تعلقات قائد انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی سے بھی ہوئے اور وہ مولانا سندھی مرحوم کے خیالات و افکار سے متاثر ہوئے اور انہوں مولانا کے خیالات و افکار کی شرح و ترجمانی بھی کی ہے۔

اس کے بعد، کچھ دنوں کے بعد مولانا نورالحق نے مدرسہ عربیہ فاضلہ بٹالہ میں درس دیا اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں مولانا عبدالعزیز میمن کی سبکدوشی پر اورینٹیل کالج (پنجاب یونیورسٹی) میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا[1]۔ ۱۹۳۵ء میں جب مولوی نجم الدین صاحب، ہیڈ مولوی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اس اسامی کے لئے مولانا نورالحق نے درخواست دی مگر اس جگہ پر ان کا تقرر نہ ہوا بلکہ مولانا رسول خاں صاحب متقرر ہوئے[2]

مولانا نورالحق ۱۹۴۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے[3] اور ان کی جگہ مولوی عبدالصمد صارم شعبۂ عربی میں ایڈیشنل مولوی مقرر ہوئے۔

---

[1] غلام حسین، ڈاکٹر، تاریخ یونیورسٹی اورینٹیل کالج لاہور، صفحہ ۶۷ (طبع اول) لاہور ۱۹۶۲ء

[2] عربی زبان و ادبیات کے فاضل محمد رسول خاں موضع ٹکری، (یاغستان) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و تربیت یاغستان میں ہوئی، تحریک خلافت کے زمانے میں مولوی رسول خاں دیوبند پہنچے اور وہاں سے فراغ حاصل کیا اور وہیں مدرس مقرر ہو گئے۔ ۲۹ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کا تقرر اورینٹیل کالج میں بحیثیت ہیڈ مولوی عربی ہوا بعد میں لکچرار بنا دیا گیا۔ بیس سال کے بعد ستمبر ۱۹۵۶ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ آج کل جامعہ اشرفیہ (لاہور) میں شیخ التفسیر ہیں (غلام حسین ڈاکٹر صفحہ ۱۸۹-۱۸۸)

[3] غلام حسین ڈاکٹر، صفحہ ۶۷، مگر صفحہ ۲۱۲ پر مولانا نورالحق کی مدت ملازمت دسمبر ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۲ء تک دکھائی ہے۔

مولانا نورالحق کی تصانیف میں (۱) عذب المناہل (شرح الکامل للمبرد) (۲) منثور حکم (خلاصہ دبیر عجم) (۳) تفسیر سورۂ علق (۴) تفسیر سورۂ مزمل (۵) تفسیر سورۂ مدثر، طبع و شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے شمط الدرر کی شرح اللآلی الغرر، مؤطا امام مالک کی شرح منار السالک، فتوح البلدان کی شرح شوارق الرحمان کی نام سے لکھیں۔ جیساکہ ان کی درخواست سے معلوم ہوتا ہے اور بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق، مولانا نورالحق مرحوم

"عربی ادب، تاریخ، حدیث اور تفسیر کے ممتاز عالم، المبرد الکامل (نحو کی کتاب) کے شارح عربی زبان پر بے پناہ دست رس، بیس برس اورینٹیل کالج میں پروفیسر رہے۔"[۱]

مولانا نورالحق تاجپورہ (لاہور) میں رہتے تھے ان کے پاس ایک اعلیٰ کتب خانہ تھا جو ان کے انتقال کے بعد خورد برد ہو گیا۔

یکم جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو ان کا انتقال ہوا اور قبرستان پیر رونق عقب شاہ باغ میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے ہماری درخواست پر مولانا نورالحق مرحوم کے لوح مزار کا کتبہ نقل کرکے بھیجا ہے۔ جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ حکیم صاحب کا پورا مکتوب گرامی نقل کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں مولانا نورالحق سے متعلق بعض دوسری معلومات بھی درج ہیں ——

۷۸۶

۶۶/۱۰/۱۵

...... قادری صاحب ...... سلام ورحمۃ

مولانا نورالحق مرحوم ومغفور کے لوح مزار کی عبارت درج ذیل ہے:

مرقد
مولانا نورالحق پروفیسر
تاج پورہ
المتوفی یکم جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۵۱ء
انا للہ وانا الیہ راجعون

---

[۱] "نقوش" آپ بیتی نمبر ص ۱۲۷

"مولانا کی قبر گورستان پیر رونق عقب شاہ باغ میں بابا ٹھوکر والے کے روضہ سے متصل ہے۔ مولانا تاج پورہ میں رہتے تھے، ان کا ذاتی کتب خانہ بے مثال تھا، جو ان کی وفات کے بعد بک گیا بہت سی کتابیں ربوہ والے لے گئے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، مولانا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مولانا کے علمی کارناموں میں سے ایک یہ بھی قابل ذکر ہے۔ "الفرقان"[1] بریلی میں آپ کا طویل مضمون "صوفیہ صافیہ" کئی قسطوں میں شائع ہوا ہے جو لاجواب و بے مثال مضمون ہے۔

مولوی شمس الدین صاحب تاجر کتب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مرحوم نے بڑی محنت سے کشف المحجوب پر کام کیا تھا، سالہا سال کی محنت سے متن کو درست کیا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن اب یہ نہیں معلوم کہ مرحوم کے اخلاف نے یہ نادر چیز ضائع کر دی ہے یا محفوظ رکھی ہے۔ خدا کرے کہ یہ چیز ضائع ہونے سے بچ گئی ہو۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ تاریخ اورینٹیل کالج میں فہرست اساتذہ میں ان کا نام ضرور ہوگا"!

والسلام محمد موسیٰ عفی عنہ

آخر میں ہم مولانا نور الحق مرحوم کی اس درخواست کو درج کرتے ہیں کہ جو انہوں نے ہیڈ مولوی کی جگہ کے لئے ۱۹۳۵ء میں دی تھی۔ یہ درخواست خود نوشت حالات کی حیثیت رکھتی ہے۔

بخدمت جناب پرنسپل صاحب، اورینٹیل کالج لاہور

جناب عالی!

بذریعہ اخبارات معلوم ہوا کہ اورینٹیل کالج لاہور میں ہیڈ مولوی کی اسامی کے لئے ایک تجربہ کار عالم کی ضرورت ہے میں اپنی خدمات اس اسامی کے لئے پیش کرتا ہوں اور جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے اس خدمت کے لئے نام زد کیا گیا، تو باحسن طریقہ اس کو انجام دوں گا۔

---

[1] مولانا محمد منظور نعمانی کا مشہور دینی رسالہ جو بریلی (روہیل کھنڈ) سے نکلنا شروع ہوا تھا اور اب لکھنؤ سے نکلتا ہے۔

میری علمی قابلیت

۱۹۱۱ء میں میں نے دارالعلوم دیوبند میں علوم نقلیہ وعقلیہ کی تکمیل کی اور آخری امتحان میں دوم نمبر رہا۔ جیسے کہ دارالعلوم کی روئداد ۱۹۲۷ء اس کی شاہد ہے۔ اس کے بعد مختلف مدارس عربیہ میں تمام علوم عربیہ کی بتواتر تعلیم دیتا رہا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) سب سے پہلے مدرسہ عربیہ رمضانیہ، کلکتہ میں ایک سال تک کتب عربیہ (دینیات و عقلیات) کی تدریس کی۔

(۲) پھر ایک سال تک دارالعلوم دیوبند میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی۔

(۳) بعد ازاں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک مدرسہ عربیہ ڈریالہ جالب، ضلع جہلم میں، مولوی فاضل، منشی فاضل کا نصاب پڑھاتا رہا۔ مدرسہ مذکور کے طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے سالانہ امتحان میں شریک ہو کر اچھے نمبروں پر کامیاب ہوئے۔

(۴) ۱۹۱۸ء میں خود بھی مولوی فاضل کے امتحان میں شریک ہوا اور فرسٹ ڈویژن میں فسٹ رہ کر، پنجاب یونیورسٹی سے تمغہ اور بہاول پور اسکالرشپ حاصل کیا۔

(۵) ۱۹۱۹ء میں منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہو کر سیکنڈ ڈویژن میں سیکنڈ رہا۔

(اسانید مصدقہ، درخواست ھذا کے ساتھ منسلک ھیں)

(۶) ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک مدرسہ عربیہ دارالرشاد پیر جھنڈا۔ ضلع حیدرآباد (سندھ) میں صدر مدرس کی اسامی پر کام کرتا رہا ——— اسی اثناء میں پیر جھنڈا کی بے نظیر لائبریری میں شب وروز مستفید ہو کر معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

(۷) تقریباً دو سال تک مدرسہ عربیہ فاضلیہ۔ بٹالہ۔ ضلع گورداس پور میں مولوی فاضل ومنشی فاضل کا نصاب پڑھاتا رہا۔ چنانچہ وہاں کے طلبہ نے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں شریک ہو کر یونیورسٹی سے ڈگریاں حاصل کیں۔

(۸) ۱۹۲۶ء سے اورینٹیل کالج لاہور میں "ایڈیشنل مولوی" کی اسامی پر نامزد ہو کر مولوی فاضل، منشی فاضل، مولوی عالم، کلاسز کو اب تک کامیاب طور پر تعلیم دے رہا ہوں۔

تصنیف و تالیف

اثنائے تعلیم میں سلسلۂ تصنیف و تالیف کو بھی جاری رکھا۔ میری تالیفات میں سے بعض طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں، جن کی ایک ایک کاپی درخواست ہذا کے ساتھ منسلک ہے اور بعض کے مکمل مواد میرے پاس محفوظ ہیں جو بشرط طلب پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مطبوعات | (الف) عذب المناہل شرح الکامل للمبرّد۔ (داخل نصاب مولوی فاضل) یہ کتاب کامل مبرّد کی مبسوط شرح ہے۔ تراجم، انساب، امکنہ، ایام عرب، لغت، تاریخ غرض تمام ضروری ادبی مواد اس خوبی سے فراہم کیا گیا ہے کہ ادیب کو "کامل" کے حل کرنے کے لئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

(ب) منشورِ حِکَم، خلاصہ دبیرِ عجم (منظور شدہ نصاب منشی فاضل) کتاب مقبول عام اور طلبہ کے لئے ازحد مفید ثابت ہوئی ہے۔

(ج) میں نے قرآن حکیم کی اردو تفسیر بطرزِ دلکش، مکمل طور پر لکھی ہے۔ تفسیر مذکور کے حسب ذیل حصے شائع ہو چکے ہیں (۱) نور الحق تفسیر سورۂ علق (۲) بارقۃ الحق ضمیمہ نور الحق۔ (۳) الناموس المفصل تفسیر سورۃ المزمّل (۴) فتح المقتدر تفسیر سورۃ المدثر۔

مسودات | (۱) اللآلی الغرر شرح شمط الدرر (داخل نصاب منشی فاضل، مولوی عالم اور بی۔ اے) کتاب مکمل ہے۔ طباعت کے سلسلے میں اس کی کاپی بھی لکھائی جا چکی ہے اور کاپی تاحال میرے پاس محفوظ ہے مگر پنجاب یونیورسٹی نے اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔

(۲) منار السالک شرح موطا امام مالک (داخل نصاب مولوی فاضل) کتاب بزبان اردو ہے بطرز جدید۔ اس کتاب میں علاوہ محدثانہ اور فقہی مباحث کے احکام شرعیہ کے حکم و اسرار کا بھی التزام کیا گیا ہے۔

(۳) شوارق الرحمٰن، شرح فتوح البلدان للبلاذری (منظور شدہ نصاب مولوی فاضل) یہ کتاب فتوح البلدان بلاذری کا بامحاورہ اردو ترجمہ اور وسیط شرح ہے۔ اس کے ساتھ تراجم، انساب اور دوسرے تاریخی ضروری مواد کا اضافہ کر دیا ہے جس کے ہوتے ہوئے اس موضوع میں طلبہ کو کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ان تمام اُمور کے علاوہ عربی اور فارسی زبان میں تقریر وتحریر کی کافی دستگاہ حاصل ہے - عذب المناھل کا خطبہ عربی طرز تحریر کا زندہ ثبوت موجود ہے -

بنا بریں وجوہ میں اس امر کے اظہار میں حق بجانب ہوں کہ میں اس خدمت کو اپنے سابقہ تجربہ اور وسعت معلومات کی بنا پر اس خوش اسلوبی سے انجام دوں گا کہ کوئی دوسرا شخص اس انداز سے عہدہ برآ نہیں ہوسکے گا۔

علوم دینیہ، فلسفہ، علوم تاریخیہ، ادبیہ، میرے خصوصی فن اور شب و روز کا محبوب مشغلہ ہیں - میں ھموارہ انہیں فنون کے مطالعہ اور تدریس میں منہمک رہتا ہوں۔

امید ہے کہ میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا جائے گا۔ فقط

(نورالحق)

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم - اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ وتحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پوری تعلیم کا احصار کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

قیمت :- ۵۰-۷ روپے

تنقید و تبصرہ

مودودی اور جمہوریت

از حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی

ناشر ادارہ معارف اسلامیہ - مبارکپورہ سیالکوٹ

یہ ستر صفحے کا ایک رسالہ ہے جس میں مولانا مودودی صاحب کے مقالات میں سے وہ اقتباسات دیئے گئے ہیں جن میں مولانا نے جمہوریت اور ڈیموکریسی کی سخت مخالفت کی ہے۔ مولانا سالہا سال تک جمہوریت اور ڈیموکریسی کو بمنزلہ کفر قرار دیتے رہے ہیں لیکن اب اس رسالہ کے مرتب کے الفاظ میں مولانا ہی ہیں جو جمہوریت کے بڑے زبردست داعی ہیں اور اُن کے نزدیک جمہوریت کا قیام ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

جب اس برصغیر میں برطانوی امپیریل ایزم کو ختم کرنے کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں مصروف پیکار تھیں، تو جہاں مولانا مودودی نے کانگریس کی مخالفت کی، وہاں

مسلم لیگ کی حصول پاکستان کی جدوجہد کو بھی مردود قرار دیا، اور اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا:۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لاولد کا ہم معنی ہوگا فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے، اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لئے ہے کہ امپیریلزم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بُت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی بھی فرق نہیں ہوتا ہے۔ لات گیا۔ منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی زندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے"۔

غرض مولانا کے نزدیک امپیریلزم لات ہے۔ اور اسے ہٹا کر ڈیموکریسی قائم کرنا منات کو لانا ہے۔ اس کے عمدہ معنے یہ ہوئے کہ امپیریلزم قائم رہے، کیونکہ اس کی جگہ تو ڈیموکریسی ہی لینے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ مولانا قیام پاکستان تک اور اس کے قیام کے بعد تک ڈیموکریسی کی اسی طرح مخالفت کرتے رہے۔ اور یہ مخالفت کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر نہیں بلکہ بزعم مولانا خدا اور اس کے رسول صلعم کی تعلیمات کے مطابق تھی لیکن اب مولانا جمہوریت کے زبردست حامی ہیں۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا دعویٰ ہے کہ وہ پاکستان کے مخالف نہ تھے بلکہ آج کل وہ مسلم لیگ کے لیڈروں سے زیادہ تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان کے حامی بنتے ہیں لیکن تحریک پاکستان کے دوران کی مولانا مودودی کی ایک تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان کے جس حصہ میں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت

قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے مقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے
اس پاکستان میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت SOVEREIGNTY
پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر۔ اگر پہلی
صورت ہے تو یقیناً یہ پاکستان ہوگا، ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان"
ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت
کریں گے، بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض
وملعون ہوگا کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے
جو غیر مسلم کرتے ہیں۔"

ا۔ مولانا اسی پاکستان میں مغربی جمہوریت کے قیام میں کوشاں ہیں، اور انہیں
بالکل یاد نہیں رہا کہ وہ برسوں تک اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودی میں اس قدر تضاد کیوں ہے
اور کیوں وہ ایک وقت میں ایک بات کہتے ہیں اور پھر اسی بات کی وہ بعد میں مخالفت
کرتے ہیں۔ دراصل اس کی وجہ ان کا کسی نہ کسی طرح اقتدار میں آنے کا جذبہ ہے
مولانا کے برسوں کے ساتھی اور جماعت اسلامی کے ایک سابق ممتاز رہنما مولانا امین احسن
اصلاحی نے ان کی اس ہوس اقتدار سے پیدا ہونے والی اس تبدیلی کو یوں بیان کیا ہے:

"اس تبدیلی نے ان کو فکری اور عملی دونوں اعتبارات سے اس قدر بدل دیا
کہ بالآخر آہستہ آہستہ وہ ہر اس سوراخ میں خود گھُسے جس سے دوسروں
کو نکالنے کے لئے انہوں نے خدائی فوجدار بن کر قلم کا ڈنڈا چلایا تھا۔ جن
چیزوں کو انہوں نے پورے زور اور قوت کے ساتھ حرام کہا تھا ان کو
حلال کہا۔ جن چیزوں کے لئے انہوں نے دوسروں کو مطعون کیا تھا
اُن کے مرتکب خود ہوئے۔ جن اصولوں کو مذہب قرار دیا تھا ان کو خود
توڑا۔ جن باتوں کی بنا پر وہ دوسروں پر پھبتیاں چست کرتے تھے اور
ان کا مذاق اڑاتے تھے اب اپنے لئے خود اُن باتوں کا بڑی کوشش

سے اہتمام کرنے لگے۔"

مرتب نے زیر نظر کتابچہ کے آخر میں "جمہوریت اسلام کی نظر میں" کے عنوان سے خود اپنے قلم سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جس میں موصوف نے مولانا مودودی سے بڑھ کر جمہوریت کی مخالفت کی ہے اور جمہوریت کے اصول معیاری سے اپنی بے علمی کا مظاہرہ کیا ہے ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"لہذا معلوم ہوا کہ جمہوریت نہ تو دینی لحاظ سے جائز ہے اور نہ ہی سیاسی اور ملکی لحاظ سے پاکستان اور مسلمانوں کے مزاج کو یہ راس آتی ہے۔ اور اس کا مطالبہ پاکستان میں اسلام اور اقامت دین کا مطالبہ نہیں بلکہ کفر کی قدروں کو رائج کرنے کا مطالبہ ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ جناب مرتب جمہوریت کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ بہر حال جہاں تک مولانا مودودی کے تضادات کا تعلق ہے انہوں نے اس رسالہ میں انہیں جمع کر دیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ۔ طباعت وکتابت اوسط درجے کی ہے۔

مخطوطات تاریخی

نوشتہ حکیم سید شمس الدین قادری

ناشر:۔ راجہ بک ڈپو۔ جونا مارکیٹ۔ کراچی ۲

آج سے کوئی تیس سال پہلے مصنف نے نواب حیدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان کا کتب خانہ دیکھا تھا جو بعض نادر کتابوں پر مشتمل ہے۔ موصوف نے اس پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کتابچہ کا پہلا مضمون جو ۲۸ صفحات پر ہے اس کتب خانے کے بارے میں ہے جس میں اس کی بعض نادر کتابوں کا ذکر ہے۔ دوسرا مضمون

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی لٹن لائبریری پر ہے اور باقی کے تین مضامین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی لائبریری، بمبئی کی ملّا فیروز لائبریری اور حیدرآباد دکن کے ذخیرہ آقائے داعی الاسلام کے بارے میں ہیں۔ ان سب مضامین کو ناشر نے بغیر کسی تمہید کے شائع کر دیا ہے۔ ضخامت کل ۴۸ صفحے۔ اور قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے رکھی ہے۔

درج الدرر فی اصول حدیث خیر البشر

اصل رسالہ المسمی "اصول حدیث" عربی میں ہے جس کے مصنف شارح صحیح البخاری حضرت سید شاہ محمد غوث قادری لاہوری ثم پشاوری ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ حافظ علی احمد صاحب پشاوری نے کیا ہے۔ یہ رسالہ سید محمد امیر شاہ قادری سجادہ نشین نے شائع کیا ہے اور مکتبۃ الحسن یک توت پشاور سے مل سکتا ہے۔ ھدیہ ایک روپیہ پچاس پیسے ہے

شرح میں حدیث سے متعلق جو اصطلاحات ہیں ان کی وضاحت کی گئی ہے مثلاً اسناد کیا ہے۔ متن الحدیث سے کیا مراد ہے۔ صحابی، تابعی، تبع تابعی کن کو کہتے ہیں۔ پھر اقسام حدیث کا باب ہے۔ اس میں حدیث کی تمام اقسام کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک باب کا عنوان ہے اسماء الابحاث الاصطلاحیۃ فی علم الحدیث المصطفویہ۔ اس کے تحت جامع، مسانید، معجم، اجزا، اربعین کی تشریح ہے ضبط اسماء الرجال۔ باب میں باہم مشابہ ناموں والے راویوں میں جو التباس ہوتا ہے ہے اسے رفع کرنے کے متعلق ضروری ہدایات ہیں مثلاً لکھا ہے "حکیم سب جگہ بروزن فعیل ہے، صرف دو نام حکیم بن عبداللہ اور زریق بن حکیم تصغیر کے صیغے ہیں"

رسالہ کے حصہ ثانی میں چند ائمہ حدیث کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ حضرت شاہ محمد غوث نے اپنے رسالہ کی آخری فصل میں ان کا ذکر کیا تھا۔ مترجم نے ان کا

ذکر قدرے تفصیل سے کر دیا ہے اور ان کے حالات جمع کر دیئے ہیں۔

زیر نظر رسالہ میں علم حدیث کے متعلق جملہ ضروری معلومات مجملاً آگئی ہیں اور اس لحاظ سے یہ رسالہ اس علم سے شغف رکھنے والوں اور طالبان علم حدیث کے لئے بڑا مفید رہے گا۔ مترجم اس رسالہ کی ترتیب پر اور زیادہ توجہ دیتے تو بڑا اچھا تھا۔ رسالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ مصنف کی اصل عبارت کا ترجمہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور اس میں مصنف کا ایزاد کس قدر ہے۔

حضرت سید شاہ محمد غوث جن کا مزار لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر مرجع خلائق ہے اپنے زمانہ کے بہت بڑے صوفی بزرگ تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مشہور محدث بھی تھے۔ ان کا زمانہ ۱۰۸۴ھ۔ ۱۱۵۲ھ کا ہے۔ حضرت جہاں طلبہ کو حدیث وفقہ و تفسیر کا درس دیتے تھے وہاں تزکیہ نفس کے طالب بھی ان کی خانقاہ کا رُخ کرتے تھے شاہ محمد غوث صاحب نے ترمذی شریف کی فارسی میں شرح رقم فرمائی تھی اور رسالہ اصولِ حدیث اس کی ایک فصل ہے۔

اگر مترجم رسالہ کے شروع میں حضرت شاہ محمد غوث کے حالات اور تفصیل سے دیدیتے تو بڑا اچھا ہوتا۔

امید ہے کہ رسالہ کی اشاعت دوم میں ہماری ان معروضات کا خیال رکھا جائیگا۔

(ا۔ س)

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2543

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ـــــــ الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت : ۲۰.۰۰ روپے

تصوّف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوّف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے　　فی پرچہ:- پچھتر پیسے

نمبر ۴	ماہ ستمبر ۱۹۶۷ء مطابق جمادی الاول ۱۳۸۷ھ	جلد ۵

فہرست مضامین

شذرات

حضرت شاہ ولی اللہؒ سے متعلق علمی تحقیقات اور بالخصوص تصوف اور صوفیائے کرام سے دلچسپی رکھنے والوں کے ہاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا نام کافی مشہور ہے۔ موصوف نے ابھی حال میں ایک سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا، جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی و تجدیدی کا ذکر کیا، اس ضمن میں انہوں نے کہا۔ شاہ ولی اللہؒ کے افکار میں کئی انقلابی و اصلاحی پہلو ایسے تھے، جن سے مسلمانوں کے دینی نظامِ فکر کا ایسا ڈھانچہ تیار ہو سکتا تھا، جو عہدِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرتا، مگر اس طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ نظامی صاحب کی رائے میں شاہ ولی اللہؒ نے اُس دور میں تغیر و انقلاب کی علامتیں دیکھ لی تھیں اور اُنھوں نے اپنے ہم عصروں کو اس ضرب سے آگاہ کر دیا تھا۔ جو اُن کے قدیم نظامِ فکر اور زندگی کے پُرانے ڈھنگ پر پڑنے والی تھی۔

پروفیسر نظامی صاحب کے اس مقالے پر بحث کے دوران یہ اُمور منتج ہوئے۔ شاہ ولی اللہؒ کا مطالعہ دو زاویہ نگاہ سے کرنا چاہیئے۔ ایک تو ان کے وہ خیالات ہیں جو عارضی صورتِ حال اور واقعات کا ردِّ عمل کہے جا سکتے ہیں۔ اس ردِّ عمل کا اظہار انہوں نے عام طور پر عہدِ وسطیٰ کی علمی و ادبی اصطلاحوں میں کیا۔ دوسرا یہ کہ اُن کے افکار کا ایک جامع ہیولیٰ ہے، ان کی بنیاد اُن کا گہرا دینی شعور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا شدید احساس اور ہندوستان میں اسلام کے تاریخی پس منظر کا واضح تصور تھا اس پس منظر میں انھوں نے اسرارِ شریعت کے جو نکات بتائے اور جو خیالات پیش کئے، وہ بنیادی طور پر اصلاحی تھے۔ اور بعد میں جو مختلف تحریکیں اُٹھیں، ان کے پیچھے ولی اللّٰہی خیالات صاف طور پر کارفرما دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور نے بھی اپنی کتابوں میں تعلیمات ولی اللّٰہی کی اس دوگانہ حیثیت پر بار بار زور دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ گو شاہ ولی اللہؒ دہلی کی زبان میں بات کرتے ہیں، لیکن ان کے مخاطب دہلی کے اعلیٰ طبقہ کی توسط سے ایک طرف یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کی عربی و عجمی قومیں ہیں تو دوسری طرف یونان، ایران اور ہند کی آرین قومیں بھی مساوی درجہ پر خطاب میں شریک ہیں۔

مولانا مرحوم نے دوسری جگہ اس کی تشریح یوں کی ہے:۔ امام ولی اللہ کی تصانیف میں جس قدر قواعد کلیہ

مذکور ہیں وہ دراصل ان کے فلسفہ کے اساسی اصول ہیں اور انسانیت عامہ کو اسی کی دعوت دی گئی ہے اور اس ضمن میں جس قدر شریعت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں، وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں۔ ان عمومی قواعد کو ان مخصوص مثالوں میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیئے۔

اب ہوا یہ کہ شاہ ولی اللہؒ کی وہ تعلیمات جنہیں" عارضی صورتحال اور واقعات کا ردّ عمل" کہنا چاہیئے ان پر تو شاہ صاحب کے بعد آنے والوں نے بہت زور دیا، لیکن شاہ صاحب کی تعلیمات کا اساسی فکر جو بڑا جامع اور آفاقی تھا، اور جس سے انسانیتِ عامہ اکتساب فیض کر سکتی تھی، اس کی طرف توجہ نہ کی گئی مولانا عبید اللہ سندھی نے اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے، ہمارے اہلِ علم شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو ایک مدرسہ اور ایک مسجد کا مجدد یا امام وغیرہ وغیرہ تو سب کچھ مانتے ہیں لیکن یہ کہ وہ تمام انسانیت کی اصلاح کے داعی تھے، یہ بات اُن پر شاق گزرتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اس وقت جتنی بھی مسلمانوں کی دینی اصلاحی تحریکیں ہیں۔ وہ کسی نہ کسی حد تک حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور فرزند و جانشین شاہ عبدالعزیز سے متاثر ہیں بلکہ علامہ اقبال اور مولانا شبلی تک نے بھی ان بزرگوں کے افکار سے استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے سرسید احمد خاں کو بھی اُن مصلحین میں شمار کیا ہے جو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے، اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سرسید احمد خان نے شاہ ولی اللہ کے نظریہ اجتہاد کو اپنی تحریک کا بنیادی اصول قرار دیا۔ اور ایک لحاظ سے انہوں نے شاہ ولی اللہؒ کے مشن اور کام کو پورا کیا۔ سرسید نے عہد وسطیٰ کے ازکار رفتہ تصورات کے خلاف اعلان جنگ کیا اور ہندوستانی اسلام میں جدیدیت کی بنیاد رکھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی سرسید کے علمی مکتب کو فکر ولی اللٰہی کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ شاہ صاحب کی عقلیت کا سرسید کے ہاں ایک طرح کا بروز ہوتا ہے۔ بے شک دین اور عقلیت کی تطبیق میں سرسید سے غلطیاں ہوئیں، لیکن سرسید کا یہ اقدام کہ دین کو اپنے دور کی مسلّمہ عقلیت کے مطابق کر کے اہل علم کے سامنے پیش کیا جائے، ہر لحاظ سے مستحسن تھا۔ اس سے جمود ٹوٹا اور ذہن کے دریچے کھلے۔ ایک زمانے میں مولانا سندھی کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد بھی سرسید کے افکار سے متاثر ہوئے۔ اور اسی سے ان دونوں بزرگوں کے ہاں فکر نو کے سوتے پھوٹے۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے لئے مستقبل کا جو پروگرام بنایا تھا، اس میں خاص طور پر اس بات پر زور دیا تھا کہ کالج پارٹی جس سے اُن کی مراد علی گڑھ مدرسۂ فکر تھا۔ اور علی گڑھ مدرسۂ فکر سے

وہ عام طور پر جدید مغربی تعلیم پائے ہوئے طبقے مراد لیتے تھے، دیوبند پارٹی سے، جس سے مولانا مرحوم کا مطلب قدیم دینی مدارس کے فارغ التحصیل تھے مل کر کام کرے۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں:۔ ہمارا یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا انگریزی پڑھا طبقہ جسے ہم کالج پارٹی کا نام دیتے ہیں، آگے چل کر لامحالہ ترکوں کے کمالی پروگرام کو قبول کرے گا۔ چونکہ ترکی میں کمالی پروگرام کے ساتھ لادینیت بھی آگئی ہے اور لادینیت کے معاملے میں ہم سکوت نہیں کر سکتے، اس لئے اس کو روکنے کے لئے ہم امام ولی اللہ کی فلاسفی کو اپنے پروگرام کا ضروری اساس بتاتے ہیں۔

کالج پارٹی اور دیوبند پارٹی کو ایک تاریخی رشتے میں پرونے کے لئے مولانا سندھی تو یہاں تک فرماتے تھے کہ دہلی کا وہ مدرسۂ فکر جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم نے رکھی تھی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحٰق کے ذریعہ کسی نہ کسی شکل میں ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد اس مدرسے کا ایک حصہ دیوبند منتقل ہوا، اور دوسرا علی گڑھ۔ اس لحاظ سے مولانا محمد قاسم کی طرح سرسید احمد خاں بھی مدرسہ ولی اللّٰہی سے منسلک ہیں۔ مولانا کی اس سے مراد استاد اور شاگرد کے رشتے کی نہیں، بلکہ ایک مجموعی فکر سے ہے، جسے اصطلاحاً "مدرسہ" کہا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے فکر میں وہ عمومیت بھی ہے، جو اساس بن سکتی ہے انسانیتِ عامہ کی تشکیل و تنظیم کی۔ اور اس میں ملّیت کی وہ خصوصیت بھی ہے جس کی بنیاد پر مسلمان اپنی اجتماعی زندگی استوار کر سکتے ہیں۔ اس لئے بھارت کے مسلمان آج جن حالات سے در پیش ہیں، ان میں اپنی اسلامیت کو زندہ و توانا رکھنے کے لئے اس فکر سے بہت کچھ لے سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں مسلمان اسلامی معاشرہ، اسلامی اجتماع، اسلامی معیشت و سیاست کی تکوین میں جو کوشاں ہیں، اس میں اُن کو فکرِ ولی اللّٰہی سے نہ صرف روشنی بلکہ کافی علمی مواد مل سکتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کے مسلمانوں کے فہمیدہ طبقے شاہ ولی اللہ اور اُن کے مدرسۂ فکر کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ طرز قدیم کے دینی مدرسوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبہائے اسلامیات میں شاہ ولی اللہ کی کتابیں داخل نصاب ہوں۔ اور مدرسۂ ولی اللّٰہی کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے۔ کوئی بھی فکر ایک جگہ رُک کر زندہ نہیں رہ سکتا، اس میں عملِ ارتقا برابر جاری رہنا چاہیئے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں اسلامی اجتماعیت کی تشکیل کی یہی راہ ہے، اس پر چلنا آسان بھی ہے، اور یہ بہت حد تک ہمیں منزلِ مقصود تک لے بھی جا سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصّہ اول

مصنّف:- ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ

مترجم:- سید محمد سعید

باب ۵

اخلاقی کردار کے عام اصول

تمہید مسرت 'سعادہ' شاہ ولی اللہ کے نزدیک، بنی نوع انسان کی طبارٔ کی وہ حالت ہے، جو مخصوص انسانی فطرت کی فطری ترقی کے خطوط کے متوازی اپنی ترقی کے دوران ابھرتی ہے اور کسی بھی حجاب کے بغیر ترقی کرتی ہے۔ یہ حجابات، مغلوبیت، بگاڑ یا گمراہی ہوتے ہیں جو خارجی، طبعی یا پیدائشی یا نفسیاتی اجزا کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

جو کردار، انسانی مسرت کے لئے موزوں اور مربوط ہے اُسے اخلاقی کردار کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ کردار جو رنج وغم اور مصائب و آلام سے تعلق رکھتا ہے اسے غیر اخلاقی کردار کہا جا سکتا ہے لیکن انسانی مسرت، محض طبعی آرام، نفسیاتی اور ذہنی تسکین اور معاشرتی بہبود کا اظہار نہیں کرتی ہے جس سے کہ شاہ ولی اللہ کے اخلاقیات، کا بہت کم حصہ وابستہ ہے، بلکہ وہ

اعلیٰ تر روحانی لطائف اور احسان اور اُن کی ترقی و کاملیت میں ایک اعلیٰ سطح کے حصول کا نام ہے اس لئے شاہ ولی اللہؒ کا علمِ اخلاقیات عام اصطلاحِ اخلاق سے بہت وسیع تر مفہوم و وسعت رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے نظامِ اخلاق کی وضاحت سے قبل، بعض عام اصولوں کی صراحت ضروری ہے جو نہ صرف اُن کے علمِ اخلاقیات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں بلکہ ان کے تصوّرات مستقل پس منظر بھی ہیں۔ اس پس منظر کے بغیر، شاہ صاحب کے تصوراتی نظام کی تفصیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکے گا۔

سب سے اوّل تصوّر یہ کہ اُن کے نزدیک علمِ انسانیت ایک عضویاتی کُل ہے جسے وہ 'الانسان الکبیر' (عظیم انسان) قرار دیتے ہیں وہ اپنے اس تصوّر پر بہت زور دیتے ہیں اور کبھی بھی اسے نظرانداز نہیں کرتے۔ اگر وہ 'انسانِ عظیم' پر ہی ٹھہر جائے، تب ایک شخص یہ خیال کرسکتا تھا کہ وہ ہمیں ایک نظامِ اخلاقیات دے رہے ہیں اور انہیں انسانیت پسند، اور (عام مفہوم میں) اخلاقیات کے عالمی علمبردار کہلائے جاسکتے ہیں جو اُسی وقت ممکن ہے جب ایک شخص انسانیت کا شعور حاصل کرلے۔ وہ اِس عضویاتی کُل کو ایک وسیع تر اتحاد کا ایک لازمی حصہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ ہم اسے اپنی زبان میں کائنات قرار دے سکتے ہیں لیکن وہ اسے 'شخص الکبیر' عظیم ترین انسان قرار دیتے ہیں۔ اِس سے اُن کی مراد نہ صرف طبعی کائنات ہوتی ہے بلکہ تمام دیدہ اور نادیدہ کائناتیں ہوتی ہیں اس سے اُن کے نظام کی وسعت کا ایک اندازہ ضرور ہوجاتا ہے جو اعلیٰ شہریت کے کردار کے لئے اصول دینے سے کبھی نہیں تھکتا بلکہ اُس کے مقاصد، اُس سے بھی وسیع تر ہوتے ہیں۔ اُن کے نظام کے مطابق، موزوں کردار کا مقصد نہ صرف یہ ہے کہ ایک فرد اپنے معاشرہ میں موزوں ہوجائے بلکہ وہ اور اس کا معاشرہ، دونوں بحیثیت کُل یا بنی نوع کے دوسرے معاشرے جو کثیر التعداد انسانوں پر مشتمل ہیں، کائنات کے اچھے اور کارآمد جزو بن جائیں، اس کے علاوہ ایک فرد کو (اپنی انفرادیت یا حیوانی پہلو کو تبدیل کرتے ہوئے) ایسی کاملیت وکلیت حاصل کرنی چاہیئے کہ وہ اعلیٰ تر کائناتوں میں بھی مدارج حاصل کرسکے شاہ ولی اللہؒ اِن مدارج

کو 'ملأالاعلیٰ'، اعلیٰ تر افراد کے اجتماع سے موسوم کرتے ہیں جو کہ انسانیت کی منزلیں متعین کرتے ہیں۔

دوم، ایک قاری کو اپنے ذہن میں یہ رکھنا چاہیئے کہ شاہ ولی اللہؒ ہمہ وقت تمام کائناتوں کے مسلسل ارتقاء سے آگاہ رہتے ہیں اور اسی لئے متعدد مدارج اور متنوع منزلوں کے وجود ہوتے ہیں، جن سے ہر شے اپنے عمل یا طریق کے دائرہ سے گزرتی ہے اور شاہ صاحب اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ آفاقی قانون، اخلاقیات پر بھی اتنا ہی عمل درآمد رکھتا ہے جتنا کہ وہ کسی اور شاخ پر اپنا اثر و رسوخ رکھتا ہے، فرد اور اس کا معاشرہ، انسانیت اپنے وسیع تر دائرہ ہیں، اور انسانی ادارے اور رسوم ابھرتے ہیں اور ترقی کے مخصوص قانون کے تحت فروغ پاتے ہیں۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ کا علمِ اخلاقیات نہ صرف مخصوص زمانوں میں یا مخصوص حالات میں مخصوص افراد سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کا ارتقاء کے ہر مرحلہ پر انسانیت سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ ان کے نظام کے مطابق، اس مفہوم کے تحت اخلاقیات اضافی ہیں کہ ہر زمانے اور مرحلے میں تمام انسانیت کے لئے کوئی کامل اور قطعی شکل مرتب نہیں کی جاسکتی اور اسی لئے اخلاقی کردار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ کو تباہی سے محفوظ رکھتا ہے اور یہ اخلاقی کردار اُن کی بقا سے تعلق رکھتا ہے اور ان کی مزید ترقی و فروغ یا ارتقاء کے لئے ممکن حیثیت رکھتا ہے۔

سوم، اخلاقی یا موزوں کردار شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک 'فطرہ' (فطرت) سے شناخت کیا جاسکتا ہے جسے بنی نوع انسان اپنی مخصوص فطرت کے مطابق تقاضوں کے تحت بروئے عمل لاتا ہے اور موزوں کردار، تسکین کے فطری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے یہ انسانوں کی 'عام اور مستحکم طبائع' کے ساتھ عمل میں آتا ہے، جو کسی تحریک کے بغیر، فطری طور پر پائی جاتی ہیں ان کے نظامِ اخلاق کا دائرہ اس منفی حالت اور مدافعت میں مثبت ہے یا محض ان حالات میں عارضی طور پر ضرب لگتی ہے کہ جن کی طبائع ماتحت ہوتی ہیں۔ یا صحیح طور پر فروغ (مثلاً کمزور، بدشکل یا گمراہ طبائع) نہیں پاتی ہیں یا خراب و مضرت رساں رسم و رواج کی صورت میں ہوتی ہیں جن کو اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے

یا اُن کو مسترد کرکے اُن کی جگہ ایک 'صحیح رسم' بر سرِ عمل لائی جائے۔

مسرت اور فطری ضروریات کی تسکین کے تصورات، شاہ ولی اللہ کے نظامِ اخلاقیات کو افادہ پرستی اور فلسفۂ لذتیت سے مشابہت عطا کرتے ہیں۔ لیکن افادہ پرستی اور لذتیت کا حلقۂ اثر، شاہ ولی اللہؒ کے نظامِ اخلاقیات کے مقابلہ میں بہت محدود ہے جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ صاحب کا نظامِ اخلاقیات طبعی نفسیاتی اور معاشرتی ظواہر کی حدوں سے بہت آگے واقع ہوئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ، انسانی زندگی، عالمِ اسباب اور حقیقی کائناتوں کے حلقوں میں فطری کردار اور جبلتی فعلیت کے تصوّرات کے علمبردار ہیں۔ غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ 'حقیقتِ کبریٰ' یعنی اللہ کے وجود سے نہ تو منکر ہیں نہ ہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کی ہستی کے بارے میں کچھ علم نہ تو ہمیں ہے اور نہ غالباً کبھی ہوگا۔ اور یہ کہ مافوق الفطرت کائناتیں، اپنے وجود اور حقیقت میں ذہن اور مادہ کے طبعی اور نفسیاتی مظاہرات سے بلند تر ہیں۔

وہ ایک جبری اور مثبت موحّد ہیں اور اُن کے تصوّرات اُن سے بہت ملتے جلتے ہیں جو محض خدا کی ذات میں یقین رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک تمام کائنات 'الشخص الکبیر' حقیقتِ واحد کی ذات کا مظاہرہ ہے۔ تمام کائنات 'الشخص الکبر' المصلحۃ الکلیہ' یا آفاقی قانون، جسے اللہ کی ابدی مرضی اور علم نے وجود میں لانے سے پہلے مقرر کیا تھا، کے تحت چل رہی ہے۔ ہر کائناتِ اصغر، کائنات کے ایک مخصوص قانون کے تحت چل رہی ہے۔ جو اپنی جگہ آفاقی قانون کا ایک جزو بھی ہے پس عالمِ مظاہرات مخصوص قوانین کے تحت چل رہی ہے جو کائنات کے آفاقی منصوبے کا جزو بھی ہیں۔ جس میں انسانی کردار کے قوانین، آزادئ ارادہ، قانونِ ارتقار، انسانی معاشروں کی ترقی و فروغ کا قانون شامل ہوتے ہیں ان میں پیغمبروں کے مشن اور دوسرے ادارے جو اس سلسلہ میں اپنا حصّہ ادا کرتے ہیں ان سے مستثنیٰ نہیں ہیں یہ کہ کائنات میں ہر عمل اللہ نے پہلے ہی سے مقرر کیا تھا، ایک حقیقت ہے، جو اس وقت آشکار ہوتی ہے جب دیدہ و نادیدہ تمام کائنات 'الشخص الکبیر' پر ایک

ساتھ نظر ڈالی جائے۔ اگر طبعی کائنات کا دوسری کائناتوں سے علیحدہ جائزہ لیا جائے تو اس میں جاری وساری قوانین، خود مختار اور خودکار نظر آتے ہیں جیساکہ ان کو فلسفۂ مادیت میں تصور کیا جاتا ہے۔ انسانیت کے فطری کردار کے حقیقی عمل اور بنی نوعِ انسان کے اخلاقی کردار کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کے تصورات اپنے مفہوم میں اخلاقیاتِ فطرت پسندی، انسانیت پسندی اور ارتقائیت اور افادہ پرستی سے زیادہ مختلف نہیں ہیں، حالانکہ ان کے تصورات ان فلسفوں کے مبادیات سے اخلاقیات کی وسعت اور ما بعد الطبعیاتی اور مافوق الفطرتی پس منظر میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں۔

ان کے نظامِ اخلاقیات کی نوعیت کے پس منظر اور وسیع خطوط کی اس طرح وضاحت کے بعد یہ ضروری ہے کہ ان کے اخلاقی کردار کے مبادیات کی بعض نمایاں خصوصیات کی تشریح کر دی جائے۔ ایک قاری ان میں سے بہت سے اصول، تعارفی بحث اور سابقہ ابواب سے بآسانی اخذ کر سکتا ہے۔

اخلاقی کردار کے اصول

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک اخلاقیات کے اصول وہ آفاقی و کلّی اصول ہیں جن پر ساری دنیا کی اقوام کا اخلاقی کردار قائم ہے یا وسیع تر مفہوم میں انسانیت "الانسان الکبیر" کے اخلاقی کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان آفاقی اصولوں کو کردار کی مخصوص شکلوں کے ذریعہ شناخت کیا جاتا ہے جیساکہ کرۂ ارض پر زندگی کے دوران بنی نوع انسان کے لئے ایک قسم کا کردار ضروری ہے اور کردار کی صرف موزوں شکلیں 'صحیح رسوم' کی تعمیر و تشکیل کرتی ہیں اور وہ آفاقی کلیات کے مطابق بھی ہوتی ہیں۔

اخلاقی ضابطہ

ایک معاشرہ کا اخلاقی ضابطہ، 'صحیح رسوم' پر مشتمل ہوتا ہے جو اُس کے لوگوں کی زندگی کے کردار پر حکمرانی کرتا ہے۔ گزشتہ باب میں ہم نے اس حقیقت سے آگاہی حاصل کر لی ہے۔ صحیح رسوم کی شکلیں مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہیں اور وہ ایک ہی معاشرہ کی تاریخ کے دوران مختلف تبدیلیوں سے گزرتی ہیں۔ ان تصورات کی بنیاد پر ایک شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ مختلف لوگوں کے اخلاقی ضابطہ

تنوعات پائے جاتے ہیں جو نہ صرف مختلف معاشروں کے مختلف اخلاقی ضابطوں کو فروغ دیتے ہیں۔ جن سے اس کے افراد اپنی تاریخ کے مختلف مرحلوں کے دوران گزرتے ہیں۔

ضابطۂ اخلاقیات کے بارے میں یہ شاہ ولی اللہ کے تصورات ہیں جو واضح یا اشاراتی طور پر ان کی کتابوں کے مختلف مباحث میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ ارتقاء کے تصورات اور الانسان الکبیر، انسانیت کا کردار اپنے وسیع ترمعنوں میں ان تصورات کے پس منظر میں نظر آتے ہیں اسی لئے ہم شاہ ولی اللہ کو نہ صرف دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان ایک ہی وقت میں عمل کئے جانے والے متعدد اخلاقی ضابطوں کے ممکنات اور وجود کا تصور قائم کرتے ہوئے پاتے ہیں بلکہ معاشرہ کے ارتقاء اور فروغ کے لئے اخلاقی ضابطہ کے ارتقاء اور ترقی کے تصور کی حمایت بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

ضروریات کی تسکین اور مقاصد کا حصول

کردار کی مختلف شکلوں سے ترتیب پانے والے متعدد اخلاقی ضابطے شاہ ولی اللہ کے نزدیک مخصوص ارکان (بنیادیں) ہوتے ہیں جو ان ضابطوں میں عام ہوتے ہیں اور ان ہی کے مطابق کردار کے نمونے اور ضابطے اُبھرتے ہیں۔

یہ ارکان (بنیادیں) معاشرہ اور افراد کی بعض مخصوص حاجات (ضروریات) ہیں جو اُن کی بقا اور مزید ترقی کے لئے ہوتی ہیں۔ بقا کی ضروریات، معاشرہ کے ارتقاء کے ساتھ اُبھرتی ہیں اور فروغ پاتی ہیں ترقی کے ہر مرحلہ پر ضروریات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جن کی تسکین و تکمیل پر معاشرہ اور اس کے افراد کی بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں ایک معاشرہ اپنی بقا کے لئے مخصوص ضروریات رکھتا ہے، اس کے برعکس ایک معاشرہ اپنے ترقی یافتہ مرحلہ میں اپنی ترقی و فروغ کے مطابق متعدد و مختلف ضروریات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مرحلہ پر اس کی بقا ان کی تسکین و تکمیل میں ہوتی ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ رح کے اندازِ فکر سے واضح ہے کہ یہ مختلف ارتقائی مرحلوں میں مختلف اقسام کی ضروریات سے گزرتا ہے اور ان کے لئے یکساں ضروریات رکھتا ہے جن سے دوسرے معاشرے اپنے معاشرتی ارتقاء اور فروغ کے مرحلہ میں دوچار ہوتے ہیں۔ یہ ضروریات معاشروں کے

فروغ کی یکساں سطح پر عام بنیادوں کے طور پر کام کرتی ہیں۔ کردار کے نمونے، عام بنیادوں کے مطابق ڈھالے جاتے ہیں تاکہ مقصد کا احساس یعنی حاجات کی تسکین ہو۔

اس سے قبل کہ ضروریات کی اُس نوعیت پر بحث کی جائے جو فروغ کی مختلف سطوح پر معاشروں کے کردار کی عام بنیادیں بناتی ہیں یہ بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ اُن ضروریات کی تسکین پر منحصر ہے جو معاشرہ ترقی کی سطح برقرار رکھنے کے لئے ابھارتا ہے اور اسی پر اس کی مزید ترقی و فروغ کا دارو مدار ہوتا ہے۔ ان ضروریات کی تسکین کا اندازہ کردار کے مخصوص عمل سے ہوتا ہے جو مخصوص شکلوں اور نمونوں سے تعمیر ہوتا ہے لیکن وہ مخصوص شکلیں اور نمونے اور مخصوص کردار محض اسی ایک مقصد کے لئے احساس و تعین کا واحد ذریعہ نہیں ہوتے۔ یکساں مقصد اور یکساں عام بنیادیں، کردار کی متعدد شکلوں، طرزوں اور نمونوں کے ذریعہ متعین کی جاسکتی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک آزادی کے ساتھ اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ یہ ہمیں شاہ ولی اللہؒ کے تصور سے قریب تر کردیتا ہے جس کے تحت کردار کی شکلیں اور نمونے بجائے خود انسانی معاشرہ کے کردار میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ مقصد کا مقصد یا حصول ہے جو کردار کو یہ بتاتا ہے کہ یہ اہم ہے۔ ان شکلوں اور نمونوں کی اہمیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں مؤثر ذرائع ثابت ہوں۔ کردار کی کوئی شکل یا نمونہ اس مقصد کی تکمیل نہیں کرتا، فضول اور بے وقعت ہے۔

ضروریات کی نوعیت اور ان کی اقسام

شاہ ولی اللہؒ کے بیان کردہ دلائل کا ایک عام جائزہ لینے سے ضروریات کی نوعیت کے بارے میں اُن کے تصورات کو حسب ذیل انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے ان ضروریات کی تسکین و تکمیل، فروغ کے مختلف مرحلوں پر معاشروں کے کردار کی بنیادیں تعمیر کرتی ہے۔

کردار کی بنیادیں اور تعمیر و تشکیل کرنے والی بنیادیں معاشرہ کے ارتقاء کے ساتھ اُبھرتی اور فروغ پاتی ہیں۔ ابتداء میں انسانی ضروریات سادہ ہوتی ہیں لیکن معاشرہ کے

فروغ و ترقی کے ساتھ، وہ پیچیدہ اور کثیر التعداد ہو جاتی ہیں حالانکہ یہ پیچیدگی اور کثرت تعداد بنیادی سادہ ضروریات کے فروغ سے وجود میں آتی ہے۔

ایک فرد اور معاشرہ کی بقار، جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے اور پھر تباہی سے بچنے کے لئے دونوں کا تحفّظ اور ان کی مزید ترقی و فروغ کے لئے ان کی ترقی، مختصر یہ کہ معاشرہ اور اس کے افراد کی عام بہبودی، ان ضروریات کے تعین پر منحصر ہوتی ہے جن کو موزوں کردار کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لئے ان ضروریات کی تسکین کا مقصد، معاشرہ اور فرد دونوں کی ترقی، تحفّظ یا بقا کے لئے ہوتا ہے اور اسی طرح ایک معاشرہ اور فرد کے کردار کا لازمی و بدیہی، مقصد بھی ہوتا ہے۔ اس مفہوم کے تحت، شاہ ولی اللہ کے اصول اخلاقیات افادہ پسند نظر آتے ہیں۔

ابتدائی دور میں، طبعی بقار، اور طبعی وجود کا تحفظ، ابتدائی دور کے انسان کے کردار کے فوری مقاصد دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن معاشرہ کے فروغ کے ساتھ انسانی زندگی کے معاشرتی و تمدنی پہلوؤں کی اہمیت بھی بتدریج متعین کی جاتی ہے اور معاشرتی و تمدنی پہلوؤں کی بقار اور تحفظ کو اتنا ہی اہم تصوّر کیا جاتا ہے، جتنا کہ طبعی بقار کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

لہذا ترقی یافتہ معاشروں کا کردار، بحیثیت مجموعی، طبعی، معاشرتی اور تمدنی پہلوؤں کی بقار، اور تحفظ کا پیچیدہ مقصد قائم کرتا ہے حالانکہ، اپنی مہذب زندگی کی تاریخ کے مختلف مرحلوں کے عام حالات و واقعات کی روشنی میں، ان کو مختلف درجوں کی اہمیت دیتا ہے۔ اس پیچیدہ مقصد کے تعین کا عمل، ثانوی پیچیدہ قریب ترین مقاصد میں کثرت پیدا کرتا ہے جو ضروریات کے مختلف سلسلوں کی تسکین کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروریات، معاشی زندگی کے چار شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کا، آگے چل کر ہم جائزہ لیں گے۔

ثانوی پیچیدہ ضروریات کی نوعیّت کا ایک مختصر تصوّر پیش کرنے کے لئے، یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ایک ترقی یافتہ و اعلیٰ سطح پر تحفظ و بقا کے لئے ایک فرد کی شخصی زندگی کے کردار کو، ان ضروریات کی تشکیل و تکمیل کرنی پڑتی ہے جو ان اقسام کے زیر تحت آتی ہیں جن کو ہم طبعی، حیاتیاتی اور نفسیاتی ضروریات کہتے ہیں۔ ایک فرد کی نفسیاتی ضروریات میں، اس کی

ذہنی یا مزاجی ضروریات بھی شامل کی جاسکتی ہیں جو اس میں اوصاف یا اخلاقی صلاحیتیں برقرار رکھنے اور ان کو فروغ دینے کے لئے ہوتی ہیں اور یہی صلاحیتیں، فرد کے تمدنی پہلو کی تعمیر و تشکیل کرتی ہیں۔ معاشرہ کی بقار، اور تحفظ (طبعی اور نفسیاتی وجودوں سے، جن کو ایک فرد سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے) کے لئے معاشرتی اور سیاستی ضروریات کی اقسام موجود ہیں۔ معاشرتی ضروریات میں گھریلو زندگی کی ضروریات ایک اعلیٰ معیار زندگی کی ضروریات بھی شامل ہوتی ہیں جو معاشی ضروریات کو وجود میں لاتی ہیں۔ اعلیٰ معیار زندگی کا تحفظ جو معاشرتی و معاشی ضروریات کی تسکین کے ذریعہ ہوتا ہے، سیاسی ضروریات کی قسم کو فروغ دیتا ہے، جن کی تکمیل و تشکیل میں، بلندی و ترقی کی اعلیٰ سطح پر، معاشرہ اور اس کے افراد کی بقا، و بہبودی کے لازمی مقصد کا حصول ہوتا ہے۔

رُوحانی ضرورِیات

ضروریات کی اس فہرست میں، ضروریات کی ان اقسام کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جن کی تسکین و تکمیل بیداری، اعلیٰ تر یا برتر اخلاق یا صلاحیتوں کی بقار، وفروغ کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، یہ انسانی زندگی کے اعلیٰ تر روحانی پہلو ' اللطائف البارزة والکامنه ' کو نمایاں کرتی ہے۔ ان ضروریات کی تسکین و تکمیل کے تعین کے لئے ایک مطلوبہ کردار کا بیان، زیر نظر تحقیقی مقالہ کے مقصد و وسعت سے باہر ہے اور یہ 'اعلیٰ تر اخلاقیات' کے زیر عنوان آتا ہے جس کے لئے ایک علحدہ مطالعے اور جائزے کی ضرورت ہے۔

اخلاقی کردار

ضروریات، جو فروغ معاشرہ کے مختلف مرحلوں میں کردار کی عام بنیادیں تعمیر کرتی ہیں، کی نوعیت اور عام بنیادوں کے بیان کے بعد، اخلاقی کردار کی بعض تعریفیں بیان کرنا آسان ہوگا۔

اخلاقی کردار اس کردار کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، جسے شاہ ولی اللہ نے راست اور موزوں کردار' ھدی صالحون ' سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ ان کے ایسے کردار کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ ان ضروریات کی تسکین کا ایک موزوں ذریعہ فراہم کرتا ہے، جو عام بنیادوں' (ارکان) کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے اور جن کی تسکین، تہذیب کے مرحلوں میں،

سطح معاشرہ کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے یا معاشرتی ارتقاء، اور اس کے معیارات، جو اس نے حاصل کئے ہیں، کو برقرار رکھنے کے لئے اہم ہے، اسی لئے اس کے برعکس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کردار، جو ان ضروریات کی مناسب طور پر تسکین کرنے میں ناکام رہتا ہے، اور معاشرہ کی اعلیٰ سطح اور معیار کو برقرار رکھنے میں بھی ناکام رہتا ہے، (کردار) غیر موزوں اور غیر اخلاقی، تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں، جسے ہم اخلاقی کردار کہتے ہیں، وہ کردار ہوتا ہے جو شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک، معاشرہ اور اس کے ارکان کی بقاء، تحفظ اور بہبودی کے لئے موثر ذرائع فراہم کرتا ہے اور یہ کردار، اس ترقی پذیر زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے بنی نوع انسان کو پیدا کیا گیا تھا، کوئی کردار جو اس مقصد کی تسکین کی راہ میں ایک موثر ذریعہ ثابت ہونے میں ناکام رہتا ہے۔ اسے اس کی خرابی کی حد تک، غیر اخلاقی تصوّر کرنا چاہئے۔ جیسا کہ یہ ان ضروریات کی تسکین کرتا ہے جو انسانی طبائع کی فطری ضروریات ہوتی ہیں اور بنی نوع انسان ان کی تسکین کرنے کے لئے فطری طور پر مجبور ہیں جو اس کے فطری اور مقررہ اعلیٰ مقصد کے طرز پر انجام پاتی ہے اور ایسی نقطۂ نگاہ سے، ایک اخلاقی کردار، فطری کردار کہلا سکتا ہے۔ یہ اسی نقطۂ نگاہ سے، غیر اخلاقی کردار، کی اصلاح، اس غیر فطری کردار یا کردار کی اہمیت ظاہر کرتی ہے جو انسانی طبائع کے رجحانات اور ضروریات اور انسان کی مخصوص فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا، فطری کردار کا تصوّر، شاہ ولی اللہ کی کتابوں میں متعدد مقامات پر ملتا ہے۔

وہ شکلیں اور نمونے، جو اخلاقی کردار کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں، صحیح رسم، کو ستھرا اور عمدہ بنانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ صحیح رسم کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے تصورات، کہ یہ کس طرح ترقی پاتی ہے اور اس کی ترقی میں کون سے عناصر کام کرتے ہیں، کا علم، ہمیں گذشتہ باب 'الرسم'، کی بحث سے ہوتا ہے۔ بہرحال یہاں اس کا اعادہ کیا جا سکتا ہے یہ کہ صحیح رسم کی شکلیں یا اخلاقی کردار کے نمونے، مسلسل تجربہ ماضی کی لغزشوں اور آزمائشوں تصورات اور نظریۂ حیات، معاشرہ کی ترقی کے ساتھ ترقی یافتہ محرکات و رجحانات، ایک

اعلیٰ معیار زندگی اور بہتر معاشی حالات کی جستجو اور مخصوص انسانی مزاج، اس کی عقل، اس کی 'رائے کلی'، اس کی جمالیاتی صفت، اس کے سات اخلاق فاضلہ وغیرہ کا حاصل ہیں. صحیح رسم کی ایسی شکلیں یا اخلاقی کردار کے نمونے، وقت کے ساتھ، اپنے افادہ سے محروم ہوجاتے ہیں اور اس وقت ایک نیا نظام فطرت یا تجدید یا اصلاح لازمی ہوجاتی ہے

اخلاقی کردار کا معیار

اخلاقی کردار کی عام بحث سے، ایک شخص ایسے معیار اخذ کرسکتا ہے جن کی روشنی میں اخلاقی کردار کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اخلاقی کردار کو بآسانی شناخت کرنے کی خاطر، یہ بات واضح کی جاسکتی ہے کہ شاہ ولی اللہ کے ہاں ایسے دوسرے معیار بھی ہیں جن کو ایک عام ذہن ایک نازک معیار کے مقابلہ میں بآسانی فہم کی گرفت میں لاسکتا ہے۔

ان معیاروں میں سے ایک، اخلاقی کردار کے مقصد کے تعین سے تعلق رکھتا ہے، جسے ہم ایک فرد اور اس کے معاشرہ کی بقاء اور بہبودی کے نام سے جانتے ہیں لیکن اسے عملی زندگی میں ثانوی یا قریب ترین مقاصد کے ذریعہ محفوظ کیا جاسکتا ہے جو کہ ایک عام ذہن کے لئے حقیقی ہوتے ہیں اور وہ ان کو جلد ہی فہم کی گرفت میں لے لیتا ہے. اس لئے ان مقاصد کا تعین، ایک اخلاقی کردار کا قابل فہم معیار ہوتا ہے جس کے ذریعہ ایک کردار کی نوعیت، کو بالعموم پرکھا جاسکتا ہے۔

کردار کا ایک مفروضہ نمونہ، شاہ ولی اللہ کے نزدیک، اسی وقت اخلاقی ہوتا ہے کہ جب اس کے ذریعہ، ذیل کے مقاصد کی تکمیل ہوسکے اور ان میں سے ہر ایک مقصد کی تکمیل کو ایک معیار تصوّر کیا جاسکے:-

(۱) نمایاں طبعی اور حیاتیاتی ضرورت کی تکمیل۔

(۲) نفسیاتی ضرورت کی تسکین جو ایک فرد، اپنے اعلیٰ اخلاق (مثلاً سماحت ز فیاضی واعلیٰ ظرفی) عظمت خود اعتمادی، انفرادیت وغیرہ) کے ذریعہ کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انفرادی شخصیت کو فروغ دیتا ہے۔

(۳) معاشرہ کے ارکان کے درمیان دوستی اور خیرسگالی کا فروغ، اور (۴) بدلا دے

بے چینی اور نقصان یا تخریب کے دوسرے اسباب' کے ممکن مواقع گھٹانا، جن سے ایک گھریلو نظام زندگی، معاشرتی نظام اور مملکت کی حکومت کا ڈھانچہ بگڑنے کا اندیشہ ہو اور جو بنیادی طور سے معاشرہ کی بہبودی کو نقصان پہنچاتے ہوں۔

(۵) درجۂ اعتدال کے مطابق، عائلی، معاشی، شہری اور سیاسی کردار کے لئے، بہبودئ عامہ کے بہتر طور پر سوچے ہوئے منصوبوں کے مقصد کا تعین کرنا اور (۶) ناگزیر خطروں کے خلاف، فرد اور معاشرہ کا تحفّظ کرنا، جو ان کے طبعی وجود اور بہبودئ عامّہ کے لئے ضروری ہے۔

شاہ ولی اللہ کے یہاں، اخلاقی کردار کا ایک اور معیار، لوگوں کا وہ طرزِ عمل بھی ہے جو مستحکم صحتمند اور طبائع عمومی 'الطبیعۃ السلیمۃ' کے حامل ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق ایسے لوگ معاشرہ میں اپنے طرزِ عمل کے دوران، مسلسل طور پر ایک صحیح اور اخلاقی کردار نافذ کرتے ہیں۔ مستحکم اور صحت مند مذاق — 'الذوق السلیم' ایک دوسرا معیار ہے۔ اخلاقی کردار اور صحیح رُسوم کی پرورش کی جاتی ہے اور خراب رسم اور بُرے کردار ان لوگوں کے لئے ناقابلِ قبول ہوتے ہیں جو صحتمند مذاق کے حامل ہوتے ہیں۔ کردار کی ایک مخصوص شکل پر 'بنی نوع انسان کا اتّفاق' بھی ایک معیار ہے جو اس کے لئے اخلاقی کردار کا ایک نمونہ ہو سکتا ہے۔ یہ چند اور اہم فوری معیار ہیں جن پر شاہ ولی اللہ نے اخلاقی کردار کی تصدیق کی بنیاد رکھی ہے۔

اخلاقی کردار کی تین اور خصوصیات ہیں جو اخلاقی کردار کو غیر اخلاقی کردار سے ممتاز کرنے کے معیار کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ خصوصیات (۱) اعتدال پسندی، (۲) ایک اعلیٰ معیار زندگی (۳) ترقی و فروغ، سے علی الترتیب تعلق رکھتی ہیں' جو کردار ان تینوں خصوصیات سے تعلق نہیں رکھتا اور معاشرہ اور اس کے افراد کی بہبودی کے لئے نقصان کا موجب ہوتا ہے، شاہ ولی اللہ کے نزدیک غیر موزوں اور غیر اخلاقی ہے۔

آخر میں، اس امر پر زور دیا جا سکتا ہے کہ معاشرتی زندگی کے اخلاقی کردار کا

نمایاں معیار یہ ہے کہ ایسے معاشرہ کے ارکان کے درمیان دوستی اور خیرسگالی کے تعلقات اور اتحاد پیدا کرنے کے اہم مقصد سے مطابقت رکھنا چاہیئے۔ بالعموم صورت حال یہ ہوتی ہے کہ وہ دوستانہ تعلقات، عملی اسباب پر پیدا ہوتے ہیں جو عام لوگوں کے ذہنوں میں دوسروں سے خوشگوار تعلقات رکھنے اور اُن کے ساتھ اتحاد سے رہنے کے مقاصد پیدا کرتے ہیں۔ وہ عملی اسباب باہمی معاونت اور تعاون پر مشتمل ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضروریات کی تسکین کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ محبت، انسیت اور خیرسگالی کے احساسات جو معاشرہ کے ارکان کے درمیان باہمی دوستی کے وجود کی بنیادوں میں ہوتے ہیں بالعموم ذاتی مفاد اور باہمی مفادات کے مقاصد کے محرکات میں ملوث ہوتے ہیں۔

کردار کے چار شعبے

ان اصولوں کو متعارف کرانے کے بعد جو بالعموم اخلاقی کردار پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اخلاقی کردار کے مبادیات کا بیان کرنا مفید ہوگا جن میں سے ہر ایک زندگی کے چار شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جو یہ ہیں:۔ شخصی زندگی کے کردار کا شعبہ، معاشی زندگی کے کردار کا شعبہ، اور سیاسی زندگی کے کردار کا شعبہ۔

سلسلۂ مجددیہ کا ایک نادر مخطوطہ

(ڈاکٹر) غلام مصطفٰے خان[1]

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ (م ۱۰۳۴ھ) کے کمالات سے متعلق بقول صاحب روضۃ القیومیہ (رکن سوم ۳/۵) قریب ساڑھے تین سو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن دستبرد زمانہ سے اب ان میں سے اکثر ناپید ہیں۔ خوش قسمتی سے حضرت مولانا حافظ محمد ہاشم جان صاحب مجددی مدظلہ (ٹنڈو سائیں داد۔ سندھ) کے کتب خانے میں ایک مجموعہ نظر سے گزرا جس کا نام اور جس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا لیکن اس کے ورق نمبر ۲ ب میں اتنی بات ملتی ہے کہ :- ومن الشواهد العظيمة انه صلى الله عليه وسلم اخبر بوجوده ثم المشائخ الكرام فى الازمنة الماضية كما فصلته فى الرسالة المسماة فى الجنات الثمانية۔ یعنی آپ کی مجددیت کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے پیدا ہونے کی بشارت دی، نیز قرون ماضیہ کے مشائخ نے بھی آپ کی ولادت کی خبر دی جس کی تفصیل میں نے رسالہ الجنات الثمانیہ میں دے دی ہے۔

---

[1] صدر شعبہ اردو جامعہ سندھ۔

اس عبارت سے اتنی بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس رسالے کے مصنّف نے رسالہ الجنّات الثمانیہ بھی لکھا ہو گا۔ چنانچہ اس مؤخر الذکر رسالے میں سے مجدّدیت کے متعلق مضمون کو اس مخطوطے کے جامع نے بطور ضمیمہ آخر میں درج کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں زبدۃ المقامات کے مصنّف یعنی حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ حضرت محمد ہاشم کشمی علیہ الرحمۃ کا حوالہ بھی آتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس رسالے کا مصنّف یقیناً حضرت ہاشم کشمی رح کے بعد ہوا ہو گا۔

ہمارے اس مخطوطے میں پہلے تو حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہٗ کی مجدّدیت کے لئے شواہد ہیں، پھر اُن کے سلسلے کے تمام اسباق بھی درج ہیں جن سے خود سیّد الطائفہ یعنی حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرّہ کے کمالات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ مجدّدیت اور "قیّومیت" سے متعلق یہ نادر مخطوطہ بہت اہم ہے، اسی لئے وہ اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد، فقد قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم انّ اللہ تعالیٰ یبعث بھٰذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا رواہ ابو داؤد

الحمد للہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد:۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اللہ تعالیٰ یبعث بھذہ الأمۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس امت کی ہدایت کے لئے ہر صدی کی ابتدا میں ایسے عارف باللہ شخص کو مبعوث فرمائے گا جو اُمّت کے دین کی تجدید کرے گا۔ یہ حدیث ابوداؤد،

الحاکم والبیهقی عن ابی هریرة رضی الله عنہ۔ بدانکہ علمائے امت اختلاف نمودند در معنے این حدیث نفیس بعض برآنند کہ مَن عبارت از جماعت علماء و فقہا و محدثین است کہ بہ نشرِ علوم دینی و احکام یقینی توفیق یافتہ اند و برجانب اعلام دینِ متین بآن ارتفاع گرفتہ و این قول بغایت ضعیف است زیرا کہ این معنے در ہر زمان موجود است تخصیص بمائۃ ظاہر نمی شود۔ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام "لا یزال من امتی اُمة قائمة بامر الله لا یضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتی یاتی امرُ الله وهم علیٰ ذٰلک (متفق علیہ)۔

حاکم اور بیہقی نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ اس حدیث کے معنیٰ میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ بعض علماء کے نزدیک حدیث مذکور میں لفظ "مَن" سے مراد علماء فقہاء اور محدثین کی جماعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہی علماء کو علوم دینیہ اور احکام خداوندی کی تبلیغ و اشاعت کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور ان کی مساعی خیر کے صلہ میں اللہ تعالیٰ انہیں درجات عالیہ اور مراتب راقیہ پر فائز فرمائے گا۔ مگر اس حدیث میں "مَن" سے علماء فقہا اور محدثین مراد لینا ضعیف خیال ہے کیونکہ ایسے برگزیدہ علماء تو ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہیں گے ان کے لئے ایک صدی کی تخصیص نہیں ہے اور حدیث مذکور میں ایک صدی کی تخصیص موجود ہے چنانچہ اسی طرح دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امّت میں قیامت تک ایسے برگزیدہ علماء ربانیّین پیدا ہوتے رہیں گے جو احکام خداوندی کی اشاعت کریں گے کہ نہ انہیں کسی کے عدم تعاون سے کوئی نقصان پہنچے گا اور نہ انہیں مخالفین کی مخالفت سے کوئی ضرر پہنچے گا بلکہ وہ اپنا تبلیغی کام کرتے رہیں گے

وقول جمہور علماء سلف وخلف آنست کہ مراد از "مَن" ذاتے است معین کہ جامع باشد ہر کمالات ظاہر وباطن را وممتاز باشد در عہد خود بوراثت ونیابت صاحبِ شریعت ومتصف بود بترویج احکام سنت وتخریب اعلام بدعت متحقق بود بترویج احکام بہ تہذیب اخلاق باطنہ وتنویر مکارم معنویہ ویکون غالباً ذا خوارقِ عظیمۃ ومتعارف بسنۃ وھو الاصح بل الصحیح الذی لا یسعی العدول عنہ۔

واعلم ان العلماء قد عینوا المجددین علیٰ ما اقتضیٰ آرائھم من دین النبی الکریم علیہ السلام الیٰ یومنا ھٰذا فان أردت الاطلاع علیٰ تفصیل الامر فعلیک برسائل الحافظ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ وشرح المحقق المناوی علی الجامع الصغیر والعلقمی۔

ثم اعلم ان علیٰ رأس

یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

جمہور علماء سلف وخلف کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ حدیث مذکور میں لفظ "مَن" سے ایسی ستودہ صفات ذات مراد ہے جو کمالات ظاہری اور باطنی کی جامع ہو اور جو اپنے زمانہ میں وارث اور نائب رسول ہونے کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو جس میں احکام سنّت کو رواج دینے اور آثارِ بدعت کو مٹانے کے اوصاف حمیدہ موجود ہوں وہ انسان کے باطنی اخلاق کو استوار کرے نیز انسان کی معنوی اور روحانی خوبیوں کو اجاگر کردے، اس سے خوارق عادات اور کرامات کا ظہور ہو، وہ عامل بالسُّنّۃ ہونے میں مشہور ہو اور وہ اپنے ہر قول وفعل میں سنتِ رسول علیہ السلام کا پابند ہو۔

علماء ربّانیین نے اپنی اپنی رائے کے مطابق ان مجددین کے اعداد شمار بیان فرمائے ہیں جنہوں نے آج تک شریعت محمدیہ کی تجدید فرمائی ہے ان اولیائے کرام کی تفصیل حافظ جلال الدین سیوطیؒ کے رسائل میں اور محقق مناوی کی شرح جامع الصغیر اور علقمی میں موجود ہے۔

جاننا چاہیئے کہ گیارھویں صدی ہجری کے

المائة الحادی عشر اظهر
الله تعالی سبحانه نورًا عظیمًا
و قمرًا منیرًا اعنی کامل
المکمل شیخ احمد السرهندی
وضع علیه خلعة القیومیة
والفردیة وجمع مناصب الولایة
ثم شرف بکمالات الوراثة من
الفحول صلّی الله علیه وسلّم
مایتحیر فیه عقول الفحول و
جعل مجددا لذٰلك المائة
واعطی شواهد التجدید
مالا یشك فیها الا الجهول
والعنید وانی ارید ان
اذکر شیئًا قلیلًا
منها للقیاس علیه
کثیرها۔ فمن شواهد
التجدید نشر انواع
العلوم الدینیة و
الاحکام الیقینیة فی
الأفاق و نشر لألی
الاسرار شرقًا و
غربًا منه رضی الله
عنه۔ و من

اوائل میں اللہ تعالیٰ نے ایک نور عظیم اور
قمر منیر ظاہر فرمایا، یعنی شیخ کامل حضرت
احمد سرہندی رضی اللہ عنہ۔ اللہ تعالےٰ نے
آپ کو قیومیت کے مخصوص خلعت سے
سرفراز فرمایا اور آپ کو ولایت عالیہ کے
مراتب اعلیٰ عطا فرمائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے
آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات
ظاہری و باطنی کا ایسا شرف بخشا جسے دیکھ کر
عارفین اور کاملین پر حیرت طاری ہوگئی۔
پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس صدی کا مجدد
منتخب فرمایا اور آپ کی مجددیت پر ایسے
دلائل اور براہین قائم کر دیئے جن کے متعلق
صرف جاہل اور ہٹ دھرم مخالفین ہی شک
کر سکتے ہیں۔ میں یہاں چند ایسے دلائل و
شواہد کا ذکر کروں گا جن کی روشنی میں حضرت
مجدد صاحبؒ کی کرامات اور خصوصیات کا
یقین ہوتا ہے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ
اللہ علیہ کے مجدد ہونے کا ایک ثبوت یہ
ہے کہ آپ نے دنیا میں علوم دینیہ اور احکام
ربانی کی اشاعت بڑے وسیع پیمانہ پر فرمائی
اور مشرق و مغرب کے طالبانِ حق کے دلوں
پر اسرار و غوامض منکشف فرمائے اور ان
دلوں کو نور معرفت سے بھر دیا۔ آپ کے

الشواهد ظهور الخوارق والكرامات على يديه اكثر من ان تحصى يشهد على ذٰلك مقاماته المدونة - ومن الشواهد اعتراف فحول علماء زمانه بكونه المجدد كالفاضل المحقق مولانا عبد الحكيم السيالكوتي حيث ذكره في كتاب له بهٰذا اللقب - و من الشواهد شرح مقامات الطريقة حيث لم يسبقه بذٰلك التفصيل احد من هٰذه الطائفة العلية - ومن الشواهد ان الله سبحانه اختار له اصحابًا عرفاء علماء اكثر من الف الف فامتلأ البر والبحر بنورهم وصار اخبار كراماتهم وكمالاتهم وترويجهم الطريقة و تائيد الشريعة مما لا ترتاب فيه

خوارق عادات اور کرامتیں بے شمار ہیں جن کی تفصیل ان کتابوں میں موجود ہے جن میں آپ کے مراتب عالیہ بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کے مجدد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے زمانہ کے اکابر علماء نے آپ کے مجدد ہونے کا اعتراف کیا ہے جیسے فاضل محقق مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی رح چنانچہ مولانا موصوف نے اپنی کتاب "المجدد" میں آپ کا مجدد ہونا ثابت کیا ہے - ایک ثبوت یہ ہے کہ آپ نے معرفت وطریقت کے مقامات کو اس قدر بسط و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اربابِ طریقت میں سے کسی بزرگ نے اتنی وضاحت نہیں فرمائی - ایک ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں ایسے اربابِ طریقت اور علمائے شریعت کو آپ کے سلسلہ عالیہ میں داخل فرمایا جنہوں نے اپنے فیوض و برکات کے نور سے سارے عالم کو منور کر دیا وہ سب مشائخ ایسے صاحبِ کرامت اور اربابِ کمال تھے جنہوں نے نمایاں طور پر سلوک طریقت کو فروغ دیا اور شریعتِ اسلامی کی اشاعت میں اپنی مساعی جمیلہ کو صرف کیا۔ مشائخ کے یہ عظیم الشان کارنامے اس قدر بدیہی ہیں جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، بالکل

كنار على علم.

ومن الشواهد انه سبحانه عززه بفهم المقطعات الفرقانية وحصول اسرار المتشابهات القرآنية كما يشهد به كلامه فی غير موضع. ومن الشواهد تحمل الجفاء من سلطان زمانه فی ذات الله جفاءً عظيماً. وانه قدس سره لم يزل فی اعلاء كلمة الحق طول بقائه وفيه تضرر من المخالفين بذلك اقساماً - وذلك مشهور فی الآفاق.

ومن الشواهد ان الله سبحانه فتح عليه ابواب العلم الباطن حيث لم يرو من غيره من هذه الطائفة سلفاً ولا خلفاً الا ماشاء الله - فمن ذلك انه قال كشف الله تعالیٰ لی قبور انبياء الهند وكوشف لی اسمائهم و اسماء من تبعهم بل كوشف

اس طرح جیسے آگ کے موجود ہونے کا علم بدیہی ہوتا ہے۔ آپ کے مجدّد ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے آپ کو مقطعات قرآنی کا فہم و ادراک عطا فرمایا اور آپ پر آیاتِ متشابہات کے اسرار و غوامض منکشف فرمائے جس کا ثبوت آپ کی تصانیف میں مختلف مقامات پر ملتا ہے۔ ایک ثبوت یہ ہے کہ آپ نے خالصاً لوجہ اللہ اپنے زمانہ کے بادشاہ کے جبر و استبداد کی سختیاں جھیلیں اور قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں۔ بادشاہِ وقت کے جور و ستم کے باوجود آپ ساری عمر اعلاءِ کلمۃ اللہ فرماتے رہے خصوصاً ایسی حالت میں جب آپ کے مخالفین آپ کو سخت ترین اذیتیں پہنچاتے تھے۔ آپ پر جو ستم و استبداد ہوئے وہ دل خراش واقعات تاریخ میں مشہور ہیں۔

آپ کے مجدّد ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے آپ پر علم باطن کی ایسی مستقیم راہیں کھول دیں جو سالکین سلف و خلف میں سے شاذ و نادر ہی کسی کے لئے کھلی ہوں گی۔ ایک جگہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قبور انبیاءِ ہند کا کشف عطا فرمایا ہے، یہاں تک کہ مجھ پر ان اصحابِ قبور کے اسماء اور ان کے متبعین کے اسماء نیز ان کے

لی مقاماتھم ودرجاتھم
ارٰی علیٰ قبورھم انوار
متلألیة - ومن ذٰلك انه قال
انی لأعرف باعلام سبحانه
جمیع من یدخل فی طریقة
السلوك علیٰ یدی وعلیٰ ید اصحابی
واصحاب اصحابی الیٰ یوم القیامة و
اعلم اسمائھم وانسابھم ومساکنھم۔
ومن الشواھد انه اسلم علیٰ
یدیه جم غفیر من
الکافرین ، وتاب الوف من
المسلمین ، وانابوا و
اخذوا الطریقة وصاروا
من ارباب الولایة وامتلأت
الارض منھم شرقاً وغرباً عرباً
وعجماً بحراً وبراً - ومن
الشواھد العظیمة انه
صلی اللہ علیه وسلم اخبر بوجوده
ثم المشائخ الکرام فی الازمنة
الماضیة کما فصّلتهٗ فی الرسالة
المسماة "فی الجنات الثمانیة"۔
ومن الشواھد انه رضی
اللہ عنه باعلام اللہ سبحانه

درجات ومراتب تک منکشف کر دیئے چنانچہ میں ان کے مزارات پر انوارِ الٰہیہ کی روشنی دیکھتا ہوں۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ جو لوگ میرے ہاتھ پر یا میرے خلفائے کے ہاتھ پر یا میرے خلفائے کے خلفاء کے ہاتھ پر بیعت کر کے میرے سلسلہ میں داخل ہوں گے نیز قیامت تک جو لوگ میرے سلسلہ میں داخل ہوں گے مجھے ان کے ناموں نسبوں اور ان کی رہائش گاہوں تک کا علم ہے۔

آپ کی مجددیت کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ آپ کے دست مبارک پر کافروں کا جمِ غفیر مشرف باسلام ہوا۔ اور آپ کی رشد و ہدایت سے ہزاروں مسلمان گناہوں سے توبہ کر کے آپ کے سلسلہ میں داخل ہوئے اور ولایت کے درجہ پر پہنچے اور ان مشائخ کے فیوض باطنی سے مشرق و مغرب میں، بحر و بر میں بے شمار عرب و عجم مستفیض ہوئے۔ آپ کی مجددیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ نیز قرونِ ماضیہ کے مشائخ نے بھی آپ کے پیدا ہونے کی خبر دی جس کی تفصیل میں نے رسالہ الجنّات الثمانیہ میں دی ہے۔

ایک ثبوت آپ کے مجدد ہونے کا یہ ہے کہ آپ کو حق تعالیٰ سبحانہٗ نے ایسا علم

مراتب الولایة والنبوة
والرسالة والکرامات
اولی العزم ومقامات
الخلة والمحبة وما
اختص به سید الانبیاء
علیه وعلیهم الصلوٰة و
التسلیمات فیثبت بکرم الله انه
مجدد للمائة الحادی عشر۔

فصل:۔ مسکین بے تمکین خواستہ
کہ ذکر مقامات طریقہ را ووصول معارج
حقیقت را کہ آنجناب بآں ممتاز
اولین وآخرین گشتہ بطریق
اجمال من الابتداء الی الانتہاء
درسلک تحریر آرد و
اہل سلوک را برآں اطلاع
بخشد۔

وچوں ظہور حقائق درعالم مثال
بصورۃ دائرہ متمثل میشود، واکثر در
کلام کرام تعبیر ازمقامات بآں
رفتہ احقر نیز شرح
مقامات ولایت ونبوت وغیرہا
بدوائر نمودہ۔ فعلی ماحررت
من کلام رضی الله عنه

عطا فرمایا جس کی روشنی میں آپ نے ولایت
ونبوت اور رسالت کے مراتب عالیہ بیان
فرمائے اور بڑے بڑے معجزات اور کرامات
کا ذکر فرمایا۔ نیز آپ نے مقاماتِ خُلّت ومحبت
بیان فرمائے اور اس مقام محبت کی تشریح کی
جو سید المرسلین وخاتم النبیین کے ساتھ مخصوص
ہے۔ مذکورہ بالا دلائل وشواہد سے ثابت ہوتا
ہے کہ آپ گیارھویں صدی کے مجدد تھے۔

اس کے بعد فقیر مسکین چاہتا ہے کہ
سلوک کے مقاماتِ عالیہ سے گزرنے کے بعد
معارج حقیقت تک پہنچنے کی رفعتوں کو ازابتدا
تا انتہا اختصار کے ساتھ بیان کرے جس پر پہنچ
کر حضرت مجدد صاحبؒ سالکین اولین وآخرین
میں ممتاز نظر آتے ہیں تاکہ اربابِ طریقت بھی
اس بلندی سے واقف ہوجائیں جہاں تک
آپ کی رسائی ہوئی۔

چونکہ عالم مثال میں حقائق کا اظہار دائرہ
کی شکل میں کیا جاتا ہے، چنانچہ سالکانِ راہ طریقت
نے بھی اپنے کلام میں حقائق ومعارف ظاہر
کرنے کا یہی طریقہ اختیار کیا ہے اس لئے خاکسار
بھی مقامات ولایت ونبوت کو دائروں کی
شکل میں بیان کرے گا۔ حضرت مجدد صاحبؒ
اور آپ کے خلفائے کرام کے فرمودات کے

واخرجت من کلام خلیفته المکرمین خازن الرحمة والعروة الوثقی بسبعة عشر دوائر واعلم انی ترکت بعض الدوائر العالیة لکونها علی طرق من الطریق المسلوك وقلما یقع سیر السالکین فیها کدائرة السیف القاطع عند دائرة الولایة الکبریٰ ودائرة الحب ودائرة المحبة البحت من غیر قید المحبوبیة والمحبة المنسوبة الی ثلثة من اولی العزم آدم ونوح وابراهیم علیهم السلام۔ ودائرة حقیقة الصوم وغیرها وسأشیر الی بعضها عند التفصیل :-

مطابق جو خازن رحمت اور عروۃ الوثقیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں میں ان مقامات کی وضاحت سترہ ۱۷ دائروں کی شکل میں کروں گا۔ میں نے بعض دائروں کو اس لئے ترک کر دیا ہے کہ ان مدارج تک سالکانِ راہِ طریقت کی سیر بہت کم ہوتی ہے، جیسے دائرہ سیف قاطع جو دائرہ ولایت کبریٰ کے پاس ہے۔ اور دائرہ حب اور دائرۂ محبتِ محض جس میں نہ تو محبوبیت کی پابندی ہوتی ہے نہ محبت کی۔ یہ تینوں دائرے تین اولوالعزم پیغمبران علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں یعنی حضرت آدم علیہ السّلام حضرت نوح علیہ السّلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ اسی طرح دائرہ حقیقت الصوم وغیرہ کو بھی میں نے ترک کر دیا ہے۔ پیش نظر دائروں کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

هذه دائرة الامکان نصفها الخلق ونصفها الامر

الدائرة الاولیٰ پہلا دائرہ

وھی کنایۃ عن مرتبۃ الامکان
بدانکہ برآدمی محبت دنیا و علائق حظوظ
غالب آمدہ بحدیکہ بالکلیہ تابع نفس
و عناصر گشتہ بلکہ لطائف خمسہ از عالم امر
درعناصر و نفس گم گشتہ بریک عالم
خلق گردید آنرا اصلا و قطعا ازاں عالم
خبر ندارد۔ و اگر توفیق یاری
دہد بمرتبہ کمال کاملاں رسد
و مرشد تلقین ذکر لطائف میفرمایند
بتوجہ مرشد آں از دریائے غفلت
سر برآوردہ بخود شناسے رجوع
کنند بعد از چند گاہ باصلِ
خود رجوع کند بعدہ باصل
الاصل و ھلم جرا حتیٰ یصلوا
الی الذات الواجب المقصود
المعبود و آں زمان ایں ذکر
لطائف کہ بمنزلہ ابجد بود
برائے توطیہ لفظ سرزد و شروع
کارِ سلوک فراموش می شود و
بسیر دوائر مشغول میشود یکے بعد
دیگرے حتی الوصول الی المقصود
سماع از مرشد۔ فھذہ
دائرۃ الامکان نصفھا

یہ دائرہ مرتبہ امکان ہے اس مرتبہ میں سالک
پر حب دنیا اور خواہشاتِ نفسانی کا غلبہ ہوتا
ہے اس حد تک کہ وہ پورے طور پر نفس اور
ہوائے نفسانی کا تابع ہو کر رہ جاتا ہے جس
کے نتیجہ میں عالم امر در عناصر اور نفس کے لطائف
اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور
سالک عالم خلق کے عجائبات میں اس قدر
محو ہو جاتا ہے کہ اسے عالم بالا کی کچھ خبر نہیں
رہتی۔ ایسی صورت میں اگر سالک کو توفیقِ
الٰہی سے کوئی ایسا کامل مرشد مل جائے جو اسے
ذکرِ لطائف کی تلقین کرے، اسے غفلت سے
نکال کر اس میں معرفت نفس پیدا کرے اور
وہ اپنی حقیقت کی طرف رجوع ہو جائے،
پھر اسی طرح بتدریج منازل ارتقاء طے کرتا
جائے تو وہ روحانی طور پر ذات واجب الوجود
تک پہنچ جاتا ہے جو مقصود و معبود حقیقی ہے۔
دراصل ذکر لطائف تمہید سیر کی ابجد ہے مگر
بعض سالکینِ راہ سلوک دائرہ امکان کی سیر
میں اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ وہ اعلیٰ
منازلِ سلوک کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سلوک کے اعلیٰ
منازل سے گزر کر مقصودِ حقیقی تک نہیں پہنچ
سکتے۔ دائرہ امکان کا نصف عالمِ خلق سے

الخلق ونصفها الامر۔

بدانکہ ہر دائرہ با دائرہ فوقانی ہماں قدر نسبت است کہ نسبت فرش با عرش وقطرہ را با قلزم بریں قیاس واصلانی ایں مقامات تیز باہم چنیں تفاوت دارند الا بعروض عارض وحدوث امر قوی یغلب علیٰ شان ذٰلك المقام ارتفاعا وانحطاطا کثیرۃ فی دائرۃ کمالات النبوۃ التی قدر النقطۃ منہا اکبر من سائر الولایات۔

والترقی هناك لیس علیٰ ترتیب اللطائف الخمس بل علیٰ امر اخر والترقی فی الولایۃ انما هو علیٰ ترتیب اللطائف۔ دیگر باید دانست کہ نورِ قلب زرد است ونورِ روح سرخ ونورِ سر سفید ونورِ خفی سیاہ ونورِ أخفی سبز است ونورِ نفس بعد از تزکیہ انگارم کہ نور بے کیف باشد۔ دیگر بداں کہ ہر لطیفہ ازاں لطائفِ پنجگانہ زیر قدم نبی است از انبیاء کرام علیہم السلام قلب زیر قدم حضرت آدم علیہ السلام است وروح زیر قدم حضرت ابراہیم علیہ السلام است وسر زیر قدم حضرت موسیٰ علیہ السلام است وخفی زیر قدم حضرت عیسیٰ علیہ السلام است واخفی زیر قدم خاتم المرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام است۔

تعلق رکھتا ہے اور نصف عالمِ امر سے۔

جاننا چاہیئے کہ راہِ سلوک کے ہر دائرہ کو اپنے مافوق دائرے سے وہی نسبت ہے جو زمین کو عرش سے یا قطرہ کو سمندر سے ہے۔ چنانچہ ان مقامات سے گزرنے والے سالکین میں بھی اسی حساب سے فرق ہے بشرطیکہ کوئی عارض راہ میں حائل نہ ہو۔ دائرہ کمالاتِ نبوت کے مقاماتِ ارتقاء والخطاط کے اعتبار سے اس قدر بلند ہیں کہ ان کا ایک نقطہ بھی ولایت کے تمام مقامات سے اعلیٰ وارفع ہے۔

جاننا چاہیئے کہ مدارجِ نبوت کا ارتقاء لطائفِ خمسہ کی ترتیب پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق کسی اور چیز سے ہے لیکن لطائفِ خمسہ کا ارتقاء ان کی ترتیب کے مطابق ہوتا ہے۔ نورِ قلب زرد ہے۔ نورِ روح سُرخ ہے۔ نورِ سر سفید ہے۔ نورِ خفی سیاہ ہے۔ نورِ اخفی سبز ہے اور نورِ نفس، تزکیہ نفسی کے بعد نورِ بے کیف ہے۔ لطائفِ خمسہ کا ہر لطیفہ انبیاء علیہم السلام کے زیرِ قدم ہے۔ چنانچہ لطیفۂ قلب حضرت آدم علیہ السلام کے زیرِ قدم ہے۔ لطیفۂ روح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیرِ قدم ہے۔ لطیفۂ سر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیرِ قدم ہے۔ لطیفۂ خفی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیرِ قدم ہے اور لطیفۂ اخفی خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیرِ قدم ہے۔

بدانکہ بعد از قطع اصول لطائف پنجگانہ عالم امر سیر در اصول لطائف پنجگانہ عالم خلق واقع خواہد شد وھی النفس والعناصر الأربعۃ ، واصل ہر لطیفہ عالم خلق اصل لطیفہ از لطائف عالم امر است اصل نفس اصل قلب است و اصل باد اصل روح است و اصل آب اصل سر است و اصل نار اصل خفی است و اصل خاک اصل اخفی است۔ باید دانست کہ قطع اصول عالم خلق حقیقت در ولایت علیا است اما پیش از وصول بآں مقام در ضمن قطع اصول لطائف عالم امر بطریق تبعیۃ فی الجملہ تصفیہ حاصل میشود واللہ اعلم بحقیقۃ الامر۔

جاننا چاہئے کہ سالک عالم امر کے لطائف خمسہ سے گزرنے کے بعد عالم خلق کے لطائف خمسہ کی سیر کرتا ہے۔ عالم خلق کے لطائفِ خمسہ نفس اور عناصر اربعہ ہیں، اور عالم خلق کے ہر لطیفہ کی اصل عالم امر کے لطیفہ میں ہے چنانچہ نفس کی اصل قلب ہے، باد کی اصل روح ہے آب کی اصل سر ہے، نار کی اصل خفی ہے اور خاک کی اصل اخفی ہے۔ عالم خلق کے اصول سے گزرنا ولایت علیہ ہے لیکن اس مقام پر پہنچنے سے پہلے سالک عالم امر کے لطائف کے اصول کے تابع رہ کر ان لطائف کو طے کرتا ہے اور ولایت علیہ کے مقام تک پہنچنے سے پہلے سالک کو فی الجملہ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

الدائرۃ الثانیۃ

دوسرا دائرہ

ولایت صغری این دائرہ
اسماء واجبی است کہ در اصل اصول الاصول
لطائف خمسہ اند و ہمیں دائرہ مسمی بولایت صغرای
است وخصائص ہذہ الولایہ ظہور دوائر ذوالتوحید
علی السالک احیانا ولیس لہ فوق ہذہ مجال وکذا الوجد
والرقص والسماع واین ظلال مبادی تعینات
سائر المؤمنین است۔

وھی کنایۃ عن الولایۃ الصغرای وفی ہٰذہ الدائرۃ وما سبق علیہا یجب

یہ دائرہ ولایت صغرای کا مقام ہے، اس دائرہ میں اور پہلے دائرہ میں سالک کے لئے

على السالك دوام الذكر الخفي الماخوذ من الشيخ وكثرة المراقبة و الاكتفاء على الفرائض و السنن الموكدة الاباغراض صحيحة- وهذه الدائرة مقام القطب والغوث والافراد والاوتاد وسائر فرق الاولياء عن اهل المناصب بالاصالة و اما الترقي من ههنا فبالوراثة والتبعية .

ضروری ہے کہ اپنے شیخ کا بتایا ہوا ذکر خفی ہمیشہ کرتا رہے اور مراقبہ بکثرت کرے ، فرائض اور سنن مؤکدہ کو پابندی کے ساتھ بخلوص دل ادا کرے ۔ یہ دائرہ قطب ، غوث ، افراد ، اوتاد نیز اولیاء اللہ کے ان تمام فرقوں کا مقام ہے جو دراصل اہل مراتب ہیں ۔ اس دائرۃ تک سالک کا ارتقاء یا تو متوارث ہوتا ہے اور یا شیخِ کامل کی رشد و ہدایت سے ہوتا ہے ۔

الدائرة الثالثة

تیسرا دائرہ

قوس

اصل الاصل
اصل السماء
اسماء
ایں متضمن براسمائے زایدہ است
مشتمل بر شیون و اعتبارات وازیں
دائرہ معاملہ بالنفس است
تا قوس۔

نصف اسفل
ونصف اعلیٰ
ذاتیہ است

وهي كناية من الولاية الكبرىٰ وهي ولاية الانبياء عليهم السلام ۔ حضرت فرمودند کہ قطب الاقطاب مجدّد الف ثانیؒ در بعضے کتب ایں دائرہ بیان فرمودند وقوس را بمقدار حصول دائرہ نوشتہ ونصف باقی را ۳ دائرہ نوشتہ اند و آں قوس کہ

یہ دائرہ ولایت کبرٰی کا مقام ہے یعنی انبیاء علیہم السلام کی ولایت کا درجہ ہے ہمارے شیخ نے فرمایا کہ قطب الاقطاب حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ نے اپنے مکتوبات میں اس دائرہ کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور اس دائرہ میں قوس کو ایک مستقل دائرہ تحریر فرمایا ہے اور باقی حصّہ کو تین دائرے قرار دیا ہے ۔ قوس

نصف دائرہ است معلوم گردیدہ
نصف قوس دیگر تتمہ
دائرہ معلوم نشدہ ۔ واللہ
اعلم ۔

وایں دائرہ اسماء واجبی است کہ
ولایت کبریٰ عبارت از آں است
وآں متضمن سہ دائرہ و قوس تفصیل
اسم ظاہر است و فی ھٰذہ
الولایۃ حصول الفناء الأتم والبقاء
الاکمل وزوال العین والأثر وشرح
الصدر والاسلام الحقیقی والاطمئنان
النفسی وسیر الاقربیۃ والارتفاع علیٰ
مقام الرضاء وفی ھٰذہ الولایۃ
ترقی السالک منوط بتکرار
الکلمۃ الطیبۃ لسانا
اوجنانا، و ایں اسماء
مبادی تعینات انبیاء کرام علیہم
السلام اند ۔

بدانکہ حق تعالیٰ را بعالم
وعالمیان غنائی ذاتی است
لیکن بایں غنائے مطلق
اوراصفاتِ کاملہ ثابت است کہ
بواسطہ آنہا فیوض بکائنات

جو نصف دائرہ ہے وہ تو معلوم ہے لیکن
نصف دائرہ کی دوسری قوس جس سے
دائرہ مکمل ہوتا ہے وہ معلوم نہیں ۔
واللہ اعلم ۔

یہ دائرہ اسماء واجبی ہے اور یہ عبارت
ہے ولایت کبریٰ سے یہ دائرہ تین دائروں
اور ایک قوس پر مشتمل ہے یہ دائرے
اور قوس اسم ظاہر کی تشریح ہے اس مقام
ولایت میں سالک کو فنائے تام، بقائے
کامل واکمل، نفی ذات وصفات، شرحِ
صدر، اسلام حقیقی، طمانیتِ نفس، قربِ
الٰہی کی سیر اور مقام رضا تک ارتفاع
حاصل ہوتا ہے ۔ اس مقام ولایت میں
سالک کی روحانی ترقی کا دار و مدار اس
بات پر ہے کہ وہ اپنی زبان اور قلب سے
کلمہ طیبہ کا ورد جاری رکھے کیونکہ کلمہ طیبہ
کے الفاظ تعینات انبیاء علیہم السلام کے
اصول و مبادی ہیں ۔

جاننا چاہیئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کی
ذات عالم اور موجوداتِ عالم سے بالکل
مستغنی ہے لیکن اس غناءِ ذاتی کے باوجود
اس کی صفاتِ کاملہ کے ذریعہ کائنات
اور موجودات عالم تک فیوض و برکات

میرسد۔ فلولاها لعدم الکائنات باسرها الآن الفیض کل لمحة ولحظة ینزل علیها فبها یبقی فلولم یفض ذلك لانتفت وقامت بلا قیوم وهو المحال۔

ولیعلم ان کل شیٔ من الاشیاء مظهر اسم من الاسماء الواجبة والصفات المقدسة المتعالیة وبذلك الاسم یصل الفیض الیه من الذات البحت تعالیٰ۔ ثم لیعلم ان کل اسم من الاسماء الواجبة کالکلی والظلال الناشئة منة کالجزئیات والکلی منها مربی نبی من الانبیاء وکل جزئی فیارب فرد من الافراد الانسانیة وتسمی تلك الاسماء الکلیة مبادی تعینات الانبیاء والجزئیات تسمی مبادی تعینات الخلائق والوجه ظاهر وبهذا یظهر معنی محمدی المشرب وموسی المشرب وعیسی المشرب لان کل انسان من الامم یجب ان یکون مظهر ظل

پہنچتے ہیں۔ چنانچہ اگر صفات باری تعالیٰ کا ظہور نہ ہوتا تو کائنات بھی عالم وجود میں نہ آتی کیونکہ کائنات پر باری تعالیٰ کا فیضان ہر لمحہ ہوتا ہے اگر اس کا فیضان نہ ہو تو ساری کائنات معدوم ہو جائے اس لئے کہ کائنات کا خالق کے بغیر وجود میں آنا محال ہے۔

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اسماء ذات وصفات میں سے کسی کا مظہر ہے اور اسی اسم کے وسیلہ سے اس چیز کو خاص ذات باری تعالیٰ سے فیض پہنچتا ہے۔ باری تعالیٰ کا ہر نام کلی ہے اور اس کے ظلال یا عکس جزئیات ہیں ہر اسم کلی انبیاء علیہم السلام کی مربی اور تربیت دینے والی ہے اور اس کی ہر جزئی نوع انسانی کی تربیت کرتی ہے اسماء کلیہ مبادی تعینات انبیاء علیہم السلام ہیں اور ان کے جزئیات مبادی تعینات خلائق ہیں اس کی وجہ ظاہر ہے اسی تقسیم سے مشرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مشرب موسیٰ علیہ السلام اور مشرب عیسیٰ علیہ السلام کے معنی واضح ہوتے ہیں کیونکہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ باری تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم

اسم من الاسماء و المشرب عبارة عن ذٰلك ولا بد ان يكون ذٰلك الاسم الظلى ناشى من اسم كلى الذى هو المظهر و مبدأ تعين النبى من الانبياء ينسب كل جزى الى كلية فاذا كان مربى المرء جزئ اسم كلى هو رب محمّد صلى الله عليه وسلم مثلا يحكم عليه انه محمدى المشرب وهو على قدم محمّد صلى الله عليه وسلم واذا كان الاسم الجزى للمرئ اسم كلى هو مربى موسٰى عليه السلام يحكم على انه على قدم موسٰى عليه السلام وهو موسوى المشرب بهٰذه العلاقة، وطريقته و حصوله الى الذات من حيث الولاية هو طريق ذٰلك النبى الا بقسر من القاسر. وهٰذا المقام يقتضى التفصيل ولا يليق هٰذه البطاقة، والله سبحانه اعلم بحقائق الامور كلها.

کے ظل کا مظہر ہو اور مشرب سے یہی چیز مراد ہے یہ ضروری ہے کہ یہ ظلی اسم، اسم کلی سے پیدا ہو جو تعینات انبیاء علیہم السلام کا سرچشمہ ہے چونکہ ہر جزئی کسی کلی کی طرف منسوب ہوتی ہے لہذا اگر کسی شخص کو تربیت دینے والی اس اسم کلی کی جزئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مربی ہے تو اس شخص کو اس تعلق سے محمدی المشرب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے والا کہیں گے اور اگر کسی شخص کو تربیت دینے والی اس اسم کلی کی جزئی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی مربی ہے تو اس شخص کو اس مناسبت سے موسوی المشرب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والا کہیں گے اور پیغمبر کا امتی درجہ ولایت کے ذریعے ذات احد تک اپنے پیغمبر کے طریقے سے ہی پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ کوئی مجبور کرنے والا نہ ہو۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے جو یہاں مناسب نہیں اللہ تعالیٰ ہی حقائق کو بہتر جانتا ہے۔

الدائرۃ الرابعۃ:- چوتھا دائرہ:-

وھی کنایۃ من الولایۃ العلیا والذی یحصل فی ھٰذہ الدائرۃ احری بالاستار فانہ من الاسرار ویحصل فیہ المناسبۃ بالملائکۃ المقربین والترقی ھٰھنا منوط بتکرار الکلمۃ الطیبۃ وکثرۃ صلوٰۃ التطوع۔

دائرہ اسمار واجبی کہ تفصیل اسم الباطن است کہ یک درجہ از اسم الظاہر بحضرت ذات اقرب اند وایں اسمار مبادی تعینات ملائکہ عظام علیہم السلام اند درایں دائرہ معاملہ با جزار ثلاثہ است یعنی آتش، آب وہوا۔

یہ ولایت علیا کا مقام ہے، جو اسرار اس دائرے میں ہیں انہیں مخفی رکھا جائے کیونکہ یہ اسرار الٰہیہ ہیں اس مقام پر پہنچ کر سالک کا تعلق ملائکہ مقربین سے ہو جاتا ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سالک کلمۂ طیبہ کا ورد رکھے اور نوافل بکثرت پڑھے۔

الدائرۃ الخامسۃ:- پانچواں دائرہ:-

وھی کنایۃ عن مقام کمالات النبوۃ علیٰ اربابھا الصلوٰۃ والسلام وفی ھٰذہ الدائرۃ ومابعدہ الترقی منوط بتلاوۃ القرآن وکثرۃ التطوع وطول القنوت۔ ودریں دائرہ معاملہ باجزار ارضی است، و یحصل فی ھٰذہ الدائرۃ حقیقۃ الدنو والتدلی وینکشف

کمالات نبوت
فیھا الوصل الی الذات المقدسۃ وفیھا تنکشف المقطعات القرآنیۃ و المتشابھات الفرقانیۃ۔

یہ کمالاتِ نبوت کا مقام ہے اس مقام تک اور اس سے اوپر کے مقام تک ترقی کرنے کے لئے سالک کو چاہئے کہ تلاوتِ قرآن کی کثرت رکھے نوافل زیادہ سے زیادہ پڑھے اور دعائے قنوت وردِ زبان کرے اس دائرہ میں سالک کو اجزائے ارضی سے واسطہ ہوتا ہے اس دائرہ تک ترقی کرنے سے سالک کو قربِ الٰہی کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اور اس مقام میں سالک پر

فیھا سرّ قاب قوسین او أدنی۔

'قاب قوسین او ادنیٰ' کے اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔

الدائرة السادسة:۔

چھٹا دائرہ:۔

کمالات رسالت

وھی کنایة عن مقام کمالات الرسالة علی اربابھا الصّلوٰة والسّلام دریں دائرہ وبعد ذٰلك فی الجانبین معاملة ماھیة وجدانی است وفی ھٰذہ الدائرة الترقّی بمحض التفضیل لابالعمل کمافی الحقائق الثلثة ای حقیقة الکعبة وحقیقة القران وحقیقة الصلوٰة۔ ولیعلم ان التفاوة الواقع ھٰھنا بین السالکین الواصلین الی ھٰذہ المقامات علی قدر التفاوة الواقع ھٰھنا الاان یکون صاحب السفل ذوشان وجساعة لم یحصل لصاحب العلو مثل ذٰلك وھٰذا الامر نادر کماوقع بین نوح وابراھیم علیھما السلام فان نوحا فوق ابراھیم من حیث المقام لکن براھیم ھٰھنا شان لیس لنوح۔

یہ کمالات رسالت کا مقام ہے، اس دائرہ میں اور اس کے بعد میں سالک کو دونوں طرف سے کیفیت وجدانی حاصل ہوتی ہے۔ اس دائرہ تک ارتقاء کا دار و مدار اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر ہے سالک کے عمل پر نہیں۔ اسی طرح کمالاتِ رسالت کی حقیقت تین چیزیں ہیں حقیقت کعبہ، حقیقت قرآن اور حقیقت صلوٰۃ۔ ان مقامات پر پہنچنے والے سالکین کے مراتب میں بھی اتنا ہی فرق ہے جتنا ان مقامات میں ہے مگر اس مقام پر پہنچنے کے بعد جو رفعت وعظمت کم درجہ کے سالک کو حاصل ہوتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کے سالک کو حاصل نہیں مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے جس طرح کہ درجہ کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فوقیت حاصل ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی شان اتنی اعلیٰ وارفع ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو حاصل نہیں ہے۔

و فضل ابراهیم علیه السلام بذلك الشان، و كذلك الامر فی الاولیاء، و الله اعلم بحقیقة الامر۔

اسی اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت نوح علیہ السلام پر فضیلت ہے اسی قسم کا اضافی اور اعتباری فرق اولیاء کرام میں موجود ہے باقی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔

الدائرة السابعة

کمالات اولی العزم علیہم السلام

ساتواں دائرہ:۔

و هی كناية عن مقام كمالات اولی العزم۔

یہ مقام اولوالعزم پیغمبران علیہم السلام کے کمالات کا ہے۔

الدائرة الثامنة

قیومیت

آٹھواں دائرہ:۔

و هی كناية عن مقام القیومیة۔ هذه الدائرة وما فوقها وان كانت ناشئة عن دائرة اولی العزم لكن لعلو شانها عدت خارجة عنها كانها ليست منها كما قيل فی قوله تعالیٰ تنزل الملائكة والروح۔ وليعلم ان منصب القيومية فی هذه الدائرة وما يوجد قبل ذلك فهو ظل و عكس حظ من ذلك المقام

یہ مقام قیومیت ہے۔ یہ دائرہ اور اس سے بعد کا دائرہ اگرچہ دونوں دائرہ اولوالعزم سے پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ دونوں اپنی رفعت شان کی وجہ سے اس دائرہ سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قول "تنزل الملائکۃ والروح" یعنی فرشتوں اور روح الامین کا نزول ہوتا ہے۔ اس آیت پاک میں مقام قیومیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس دائرہ میں مقام قیومیت ہے اور اس سے بعد کے دائروں کے مقامات مقام قیومیت کا عکس ہیں، کسی دائرہ میں قیومیت کا عکس

قل او کثر وکذا الحال فی الخلة والمحبة والمحبوبیة الواقعة بعد هٰذہ الدائرة فلا مساغ فیها لاحد الابوراثة وکمال متابعة علیه السّلام والصّلوٰة۔

زیادہ ہے، اور کسی میں کم ہے۔ یہی حال دائرہ خلت، دائرہ محبت اور دائرہ محبوبیت کا ہے۔ دائرہ قیومیت کی سیر سالک اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کا شیخ کامل اس میں اس کی اہلیت پیدا کر دے اس مقام میں سالک کو لازم ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی مکمل پیروی کرے۔

خلت

الدائرة التاسعة:-

وهی کنایة عن مقام الخلة۔ وفی هٰذہ الدائرة یعنی دائرة الخلة تنشعب دائرة النفی وهٰهنا یتسر حقیقته وفی هٰذہ الدائرة التاسعة دائرة عاشرة وفی العاشرة الحادی عشر وفی الحادی عشر الثانیة عشر، ولکن نحن کتبناها علیحدة تنبیها علی مامضی فی القیومیة۔

نواں دائرہ:-

یہ مقام خلّت ہے۔ دائرہ خلت سے دائرہ نفی پیدا ہوتا ہے اس دائرہ میں سالک حقیقت کی سیر کرتا ہے۔ نویں دائرے سے دسواں دائرہ اور دسویں سے گیارہواں دائرہ اور گیارہویں سے بارہواں دائرہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے سب دائروں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے جیسا کہ ہم نے دائرہ قیومیت میں کیا ہے۔

محبت صرفہ

الدائرة العاشرة:-

وهی کنایة عن الولایة الموسویة علی صاحبها السّلام وفی

دسواں دائرہ:-

یہ ولایت موسویہ علیہ السلام کا مقام ہے اس دائرہ میں اور اس کے

هذه الدائرة ومابعدها الترقی فی محبة النبی صلّی الله علیه وسلم وهی فوق التفضل۔

بعد کے دائروں میں محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ترقی ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مقام محبت کی کتنی فضیلت ہے۔

محبوبیت ممتزجة

الدائرة الحادی عشر:۔

وهی کنایة عن ولایة محمدیة علی صاحبها السّلام ومن هذه الدائرة تنشعب دائرة الاثبات ویتم معاملتها فی الدائرة الآتیة بالکلیة۔

گیارہواں دائرہ:۔

یہ ولایت محمدیہ علیہ السلام کا مقام ہے اور اسی دائرہ سے دائرہ اثبات پیدا ہوتا ہے ان دونوں دائروں کی تکمیل آئندہ آنے والے دائرہ سے ہوتی ہے۔

محبوبیت خالصة

الدائرة الثانیة عشر:۔

وهی کنایة عن الولایة الاحمدیة علی صاحبها الصلوٰة والسلام۔

بارہواں دائرہ:۔

یہ ولایت احمدیہ علیہ السلام کا مقام ہے۔

لاتعین

الدائرة الثالثة عشر:۔

وهی کنایة عن مقام الخاص له علیه الصلوٰة والسّلام المعبر بفوق حقیقة الحقائق ولاتعین۔

تیرہواں دائرہ:۔

یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاص مقام ہے اسی لئے اس دائرہ کو 'فوق حقیقۃ الحقائق' یا 'لاتعین' کا دائرہ کہا جاتا ہے۔

حقیقة کعبة

الدائرة الرابعة عشر:۔

وهی کنایة عن حقیقة الکعبة الحسناء هذا انماهو باعتبار

چودہواں دائرہ:۔

یہ ذکر کے اعتبار سے ہے ورنہ یہ مقام 'مقام خاص' پر فوقیت نہیں رکھتا

الذكر لان كونها فوق المقام الخاص المذكور غير معقول وههنا كلام طويل وتحقيق وتدقيق ان وفقنى الله تعالى عليه اذكره۔

اس مقام میں بڑی دقیق بحثیں ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے انہیں بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

الدائرة الخامسة عشر:۔

حقیقت قرآنی

پندرہواں دائرہ:۔

وهى كناية عن الحقيقة القرآنية وهى كناية المبدا ءوسعة الذات المتعالى۔

یہ حقیقت قرآنیہ کا مقام ہے، اور اس سے باری تعالیٰ کی وسعت مراد ہے۔

الدائرة السادسة عشر:۔

حقیقة الصلوٰة

سولہواں دائرہ:۔

وهى كناية عن حقيقة الصلوٰة وهذا نهاية المقامات العابدية۔

یہ حقیقت صلوٰۃ کا مقام ہے یہاں عابد کے مقامات ختم ہو جاتے ہیں۔

الدائرة السابعة عشر:۔

معبودیت صرفہ

سترہواں دائرہ:۔

وهى كناية عن مقام المعبودية الصرفة ولاسبيل اليه الاللقيوم ومن فى ضمنه۔

یہ معبودیت محضہ کا مقام ہے اس مقام پر قیوم کے سوا اور کسی کو رسائی نہیں ہو سکتی۔

الخاتمة اعلم انه لما ثبت انه رضى الله عنه مجدد المائة وجب عليك ان لا تنكر على مقاماته و تومن بجميع مكشوفاته ان الله سبحانه

جاننا چاہیئے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مجدد صاحب رضی اللہ عنہ اپنی صدی کے مجدد ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کے مقامات عالیہ سے انکار نہ کیا جائے بلکہ آپ کے مکشوفات اور مقامات عالیہ کا اعتراف کیا جائے۔ آپ کے مکشوفات میں سے ایک یہ ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ

جعله مجدداً لالف الثانی ، و الهمه بان الفیض من جناب القدس انما هو بتوسطه الیٰ یوم القیامة - فلما اورد علیه النقض بوجود عیسیٰ علیه السلام والمهدی الموعود انار الیه برهانه اجاب بانهما اصلان من طریق النبوة لا یسع فیه التوسط وکلامنا فی امر الولایة التی معاملتها ینوط بالوسائط - ویزیدك مزید الطمانیة خاتمة الجلد

نے آپ کو مجدد الف ثانی کا خلعت عطا فرمایا اور آپ کو الہام کیا کہ بارگاہ ایزدی تک آپ کے وسیلہ سے رسائی ہوگی۔ اور قیامت تک کوئی سالک آپ کے وسیلہ کے بغیر تقرب الی اللہ حاصل نہ کرسکے گا یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قیامت سے پہلے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام دُنیا میں تشریف لائیں گے تو کیا حضرت مجدد صاحب رضی اللہ عنہ ان دونوں کے لئے بھی تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنیں گے ؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر حضرت مجدد صاحب رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ قیامت تک لوگوں کو میرے وسیلہ سے تقرب الی اللہ حاصل ہوگا تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام تو بطریق نبوت خود اصل ہیں۔ ہماری گفتگو تو ولایت کے متعلق ہے اور اولیائے کرام کو تقرب الی اللہ حاصل کرنے کے لئے وسیلہ ضروری ہے نبیوں کے لئے نہیں - مزید اطمینانِ قلب کے لئے 'مکانۃ العلیا' کی

الثالث من[1] مکانته العلیا فعلیك بها۔

جلد ثالث ملاحظہ کریں۔

ثم انه لما تم امر التجدید وصار الدین قوی الارکان بعد ما اندرس کثیر من معاملتها و تجددت الملة البیضاء وحیث یضرب به الامثال فی البلاد ویسیر الیه الرجال من الاقطار وبلغ ثمرة عمرہ عمر مورثه النبی علیه السلام اجاب الداعی بالله تعالیٰ علیٰ راس الف واربع وثلثین سنة حسن الخاتمة۔

جب حضرت مجدد صاحب رضی اللہ عنہ مجددیت کے فرائض انجام دے چکے اور آپ کی تبلیغ و ہدایت سے اسلام قوی ہوگیا بعد اس کے کہ اسلام میں بہت سے رخنے پیدا ہو گئے تھے۔ آپ نے ملت اسلامیہ کی تجدید کی یہاں تک کہ آپ کی مثال پیش کی جانے لگی اور طالبین حق دنیا کے گوشہ گوشہ سے اکتسابِ فیوض کی خاطر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور آپ کی عمر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے برابر ہوگئی یعنی تریسٹھ ۶۳ سال کی ہوگئی تو آپ نے ۱۰۳۴ھ میں وصال فرمایا۔

قال المولف غفر الله تعالیٰ له قال المجدد قدس سرہ عند ارتحاله عرج بی الآن الی مقام عظیم لم ار مثل ذلك قط۔

مؤلف کتاب غفر اللہ لہ کا قول ہے کہ حضرت مجدد صاحب قدس سرہ نے وصال کے وقت فرمایا کہ اب اللہ تعالیٰ مجھے ایسے عظیم الشان مقام کی طرف لے جا رہا ہے کہ اس سے پہلے میں نے ایسا اعلیٰ وارفع مقام کبھی نہیں دیکھا تھا۔

---

[1] یعنی مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ۔ دفتر سوم۔ مکتوب نمبر ۱۱۴۔

والهمت ان هذه اخر ظهورات الصفات الثمانية ليس فوقها الا الذات البحت ثم شرفت بوصوله تلك المرتبة المقدسة وصولا بلا كيف وقال لخليفتيه المكرمين و انتما معى هناك كما كنتما فى جميع المقامات السابقة ۔ و قال رضى الله عنه الهمت ان جميع ما كان ممكنا من الكمال فى نوع البشر قد تيسر لك غير انه لانبوة بعد ختمها على خاتمها الصلوٰة والسلام۔

پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے الہام کیا گیا ہے کہ یہ مقام ظہورات الصفات الثمانیہ کا آخری مقام ہے اس سے اوپر صرف حق سبحانہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس اعلیٰ وارفع مقام پر اس طرح پہنچایا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ حضرت مجدد صاحب رضی اللہ عنہ نے اپنے دو خلفاء سے فرمایا کہ جس طرح تم دونوں تمام مقامات میں میرے ساتھ رہے ہو اسی طرح اس اعلیٰ مقام میں بھی تم دونوں میرے ساتھ رہو گے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے الہام کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ تمام کمالات عطا فرما دیئے جو بنی نوع انسانی کے لئے ممکن ہیں سوائے نبوت کے کہ وہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

والحمد للہ رب العٰلمین

(مسلسل)

افاداتِ مولانا عُبیدُ اللہ سِندھی

تمہید کتاب سطعات (امام ولی اللہ رح)

مولانا عزیز احمد عُبید اللّٰہی

عام طور پر وجود کو واجب اور ممکن اور پھر ممکن کو حادث اور قدیم میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ حقائق پر پوری بحث ختم کرنے کے بعد جن معانی میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ صحیح نہیں ثابت ہوتے کیونکہ ہر موجود کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی علت کی تاثیر سے واجب ہو جب کہ وجود کے ساتھ وجوب ضروری ہوگیا تو یہ بحث کہ یہ وجوب بالذات ہے یا وجوب بالغیر دوسرے درجے پر رہ جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وجوب بالغیر جہاں ہوگا وہ وجوب بالذات سے دوسرے درجے پر مانا جائے گا اس لئے وجود کے مراتب کی صحیح مثال انسان کی ذہنی معلومات میں عقلی، خیالی اور حسّی علوم میں ملتی ہے۔ انسانی ذہن تینوں مراتب کے لئے قیومیت کا درجہ رکھتا ہے مگر عقلیت ذہن سے بلا واسطہ تعلق رکھتی ہے اور خیالیت عقلیت کے بعد اور ایسے ہی احساس خیال کے بعد مگر نفس انسانی تینوں چیزوں کا براہِ راست قیوم ہے۔ اشراقی حکماء کی تحقیق میں وجود ایک قیوم کے ساتھ قائم ہے پھر اس میں مراتب ضرور مختلف ہیں۔ یہ بحثیں عبقات اور شاہ ولی اللہ صاحب کی مفصل کتابوں میں پڑھنی چاہئیں۔

اس وقت کوئی سی اصطلاح سامنے رکھی جائے عقل مندوں کی تمام جماعتیں وجود کے تین مراتب ماننے پر متفق ہیں۔ پہلا[1] مرتبہ واجب بالذات یا قیوم حقیقی یا ذات بحت۔ دوسرا[2] مرتبہ صادر اول یا ممکن واجب بالغیر قدیم یا صفات الٰہیہ یا مرتبہ عقل، یہ سب اسی دوسرے درجے کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اس کے بعد تیسرا[3] درجہ جسے عالم یا کائنات یا قیوم حقیقی سے بالواسطہ تعلق رکھنے والا وجود یا شخص اکبر۔ ان تین مراتب پر عقلمند متفق ہیں یعنی انسانی عقل ان مراتب کا انکار نہیں کر سکتی۔

اس کے اندر راز یہ ہے کہ انسان اُسی چیز کو سمجھ سکتا ہے جو اس کی ذات میں ہو یا پھر کسی چیز کو اس پر قیاس کر لیتا ہے اس لئے سب سے پہلے اس مسئلہ میں یقین پیدا کرنا چاہیئے کہ انسان کیا ہے۔ ہم اپنی معلومات دو حصوں میں تقسیم کر کے بیان کریں گے پہلا حصہ فرضیات (تھیوری)، دوسرا حصہ خواص اور لوازم پھر عقلی اور خیالی دلیلوں سے یا مشاہدہ اور تجربہ سے بحث کرنے کے بعد اس تھیوری کو واقعی ماننا یہ دوسرا حصہ[1] ہمارا سائنس اور حقائق سے تعبیر کیا جائے گا۔ انسان کی ذات کے متعلق ہماری تھیوری یہ ہے۔ سب سے پہلے بدن انسانی ہے جو موت کے بعد دفن کر دیا جاتا ہے یا جلا دیا جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک جزء وہ ہے جسے نسمہ یا جسمانی روح یا طبی روح کہا جاتا ہے وہ نباتات میں حیوانات میں انسانوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ نباتی روح یقیناً ایک جسم لطیف ہے جب وہ جدا ہو جائے تو باقی جسم نشو ونما سے معطل ہو جاتا ہے اسی طرح کی روح ہر حیوان میں ملتی ہے جس کے علیحدہ ہونے سے اس حیوان کی موت طاری ہوتی ہے وہ حیوان حس و حرکت سے معطل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی روح انسانی بدن میں پھیلی ہوئی ہے جب یہ روح علیحدہ ہو جائے تو انسانی نشو ونما اور حس و حرکت اور سوچ بچار سب ختم ہو جاتی ہیں۔ اس حیوانی روح کے ساتھ تیسرا جزو ہم نفس ناطقہ مانتے ہیں۔ اس کی تشریح سے پہلے ہمیں کلی اور جزئی کی نسبت سمجھنا ضروری ہے۔ ہم وجود کے مواطن مختلف مانتے ہیں ایک موطن میں کلی

---

[1] اگر عقلی ہے تو فلسفہ کہلائے گا اور اگر مشاہدہ اور سائنس سے ثابت کیا جائے تو حقائق کہلائے گا۔

بشکل جزئی موجود فی الخارج ہوتی ہے۔ اس سے نازل موطن میں اس کلی کے عکوس مختلف مرایا میں مرتسم ہوتے ہیں۔ اس سے جزئیات پیدا ہوتی ہیں گویا ہمارے نزدیک کلی اور اس کی ایک جزئی میں سوائے اختلافِ موطن کے اور کوئی فرق نہیں اسی اختلافِ موطن کا یہ اثر ضرور ہے کہ کلی اپنے موطن میں ایک ہی ہو سکتی ہے اور جزئی موطن میں تعدد کا امکان ہے جس قدر آئینے زیادہ ہوں اسی قدر جزئیات پیدا ہو سکتی ہیں مگر ایک ایک جزئی کو جب کلی کے مقابلے میں دیکھا جائے گا وہ دو مختلف موطن کو دو جزئیں ہوں گی۔ اس مسئلہ پر جیسے کہ فلاطون کی رائے تھی ہمارے ائمہ شاہ ولی اللہؒ سے لے کر مولانا محمد قاسمؒ تک سب ایک ہی خیال پر متفق ہیں۔ منطق کی جتنی کتابیں درس میں داخل ہیں ان میں اس قول کی تردید مختلف پہلوؤں سے پڑھائی جاتی ہے۔ استاد جب تک خود محقق نہ ہو طالب العلم کو ہمارے عقیدے پر تشفی نہیں دلا سکتا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا سبب ہے جس سے طلبا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابیں سمجھنے سے عاجز آجاتے ہیں۔ جملہ معترضہ ختم ہوا۔

اس اختلاف موطن کو سطعات کے پہلے سطعہ میں اس طرح واضح کر دیا گیا ہے:۔

برخاتم لفظ زید نقش کردیم بعد ازیں موم یا گل آوردیم و خاتم را بروے زدیم نقش خاص بالفعل حال در موم یا گل پیدا شود۔

اب یہاں زید کے لفظ کا ایک موطن وہ تھا جب خاتم پر نقش کیا گیا دوسرا موطن یہ ہے کہ اس کا عکس موم یا مٹی میں پیدا ہوتا ہے۔ پہلے موطن میں زید کو کلی کہا جاتا ہے دوسرے موطن میں زید کو جزئی کہا جائے گا اس پر یہ لفظ دال ہیں " آں کلی است وایں جزئی "۔ پہلا اشارہ زید کی طرف ہے جو خاتم پر منقوش ہے اور دوسرا اشارہ اس زید کی طرف ہے جو مٹی پر نقش ہوا۔ جیسے اختلافِ مواطن سے کلی اور جزئی کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اسی طرح ایک دوسرا لفظ ہے اس کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیئے جزئی کو شہادی کہا جاتا ہے اور کلی کو اس کا مرتبہ عقل مانا جاتا ہے یا جزئی کو موجود مانا جاتا ہے اور اس کی کلی کو عین ثابت کہا جاتا ہے۔ یہ دوسری اصطلاح عبقات کی ہے۔ یہاں پر یہ تمہیدی جملہ ختم ہوا۔

انسان کلی اپنے موطن میں ایک جزئی کی شکل میں موجود ہے، اسے امام النوع کہا جاتا ہے اس کا عکس اس کے متصل نورانی آئینوں میں جس کا نام عالم مثال ہے پڑتا ہے یعنی مثال کے کاغذ پر امام نوع کی جو تصویر آئے گی وہ اس کی ایک جزئی ہوگی یہ جزئی ایک انسان کے لئے اس کا نفس ناطقہ بنے گی اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اس موطن میں جس قدر جزئیات امام نوع کی منعکس ہوئیں، اتنے ہی انسان پیدا کرنا حق کو منظور ہوں گے یہ نفس ناطقہ نسمہ کے ساتھ منطبق ہو جاتا ہے اور نسمے کو اپنی شکل پر ڈھال لیتا ہے اور اس کے واسطے سے بدن میں تاثیر کرتا ہے اور بدن کو امام نوع کی صورت پر لے آتا ہے یہ تیسرا جزو ہے انسانیت کا ہمارے نظریات میں۔

اس نفس ناطقہ میں ایک نقطہ ایسا نورانی ہے کہ وہ واجب الوجود کا جتنا تصور بلکہ اس کی جیسے مثال نفس ناطقہ میں آسکتی تھی وہ اس کی مکمل شکل ہے۔ اس نقطہ کو ہم حجر بحت کہتے ہیں، یہ نورانی شعلہ ملکیت کے لطیف کاغذ پر قائم رہتا ہے، اس طرح ہم نفس ناطقہ سے اوپر روح ملکوتی مانتے ہیں جو حجر بحت کے لئے آئینہ اور کاغذ بن سکتا ہے۔ یہ چوتھا جزو ہوگا انسانیت کا۔ اس کے بعد حجر بحت ہی ایک نورانی ٹکڑا انسانیت میں باقی رہتا ہے جسے ہم پانچواں جزو انسانیت کا مانیں گے۔ ہمارے اس نظریے کی پوری تفصیل الطاف القدس میں ملے گی۔

اب ہم اس مسئلہ کی طرف آتے ہیں جسے انسان کامل اپنے اندر حجر بحت کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کے گرد ملکوتی کاغذ کو لپٹا ہوا دیکھتا ہے اسی طرح واجب الوجود کو حجر بحت کے درجے پر اور اس کی صفات لازمہ کو روح ملکوتی کی شکل میں خیال بناتا ہے۔ اب حجر بحت کے درجے پر جو درجہ وجود کا مستقل انسان کے ذہن میں آئے گا اسے ذات بحت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جو درجہ روح ملکوتی کی طرح پر ہوگا، اسے حکماء مرتبۂ عقل کہتے ہیں اور ملی لوگ مرتبہ صفات سے تعبیر کرتے ہیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو صفات ذات کے بعد مانے جاتے ہیں وہ ممکن بالذات واجب بالغیر اور قدیم ازلی ابدی سمجھے جاتے ہیں یہ اوصاف جیسے ملی لوگوں کے نزدیک صفات الٰہیہ کے لئے ضروری ہیں اسی طرح حکماء

کے نزدیک بھی صفات مرتبۂ عقل کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح عقل کو ماننا یا صفات زائد مع الذات ماننا نزاع لفظی کے قریب ہو جاتا ہے۔

اب انسان اپنے نفسِ ناطقہ کو انانیت کا مصداق مانتا ہے جس وقت میں کہتا ہے تو اس وقت اس کی مراد نفس ناطقہ ہوتی ہے۔ تمام کائنات کو جو مرتبہ ذات بحت و عقل کے بعد ہے انسان ایک بڑے انسان کی شکل میں سوچتا ہے اسے شخص اکبر کہا جاتا ہے اس کا نفس ناطقہ جو ہوگا اسے نفس کلیہ کہا جاتا ہے اس کا حجر بحت جو ہوگا اسے تجلی اعظم کہا جاتا ہے۔ چونکہ انسان اس چیز کو سمجھ سکتا ہے جو اس کے اندر ہو یا جو اس کی نظیر ہو ہم نے جب اپنے نظریئے میں انسان کے اجزاء معین کر دیئے تو اس قاعدے سے ہم تمام وجود کو تین حصّوں میں تقسیم کریں گے۔ ذات بحت[1]، مرتبہ عقل[2] اور شخص اکبر[3]۔ یہاں پر یہ بحث ختم ہو گئی کہ ہم کیوں وجود کو ان تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں تمام انسانیت کے عقلمندوں نے کیوں وجود کے یہ تین حصے تسلیم کئے:۔

تتمہ:۔ یہاں ایک ضمنی بحث تتمہ کے طور پر لکھنا ضروری ہے۔ ہم نے جن عقلمندوں کو اس مسئلہ پر متفق مانا ہے وہ فقط وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں ہم اپنی اصطلاح خاص میں کامل کہتے ہیں یعنی وہ اپنے اندر حجر بحت کو مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے وہ تمام وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے تمام کامل انسانوں کا اور ان کے تمام متبعین کا اتفاق ہے کہ وجود کو تین مرتبوں میں ماننا چاہیئے۔ مگر ایک ایسا طبقہ عقلمندوں کا جس نے انانیت کی تحلیل کرنے میں بدن انسانی کو سمجھنے میں زیادہ وقت صرف کر دیا اور اس کے ساتھ نسمے کا تلازم اس کی عقل میں روشن ہو گیا مگر نفس ناطقہ اور امام النوع کا سمجھنا ابھی باقی ہے۔ وہ اس نقصان کے زمانے میں سوائے مادے کے مرتبۂ عقل یا مرتبہ ذات بحت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ یہ انکار ان کا جہل بسیط ہے، یعنی انہیں ابھی فرصت نہیں ملی کہ وہ اپنے نظریات کے مطابق ان مسائل کو حل کر سکیں ایک سائنٹسٹ مادی تحقیقات میں منہمک ہو کر اپنی بے بساطی کا ان لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ میں سائنس کا محیط نہیں ہوں بلکہ میری مثال ایسی ہے جیسے سمندر کے کنارے پر

ایک بچہ سیپ سے کھیل رہا ہو اس کا یہ کہنا کہ سیپ کے سوا اور کوئی چیز نہیں اسی معنیٰ میں ان ناقص طالب العلموں کے اقوال سمجھنے چاہئیں۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وجود کے مسئلہ کو سمجھنے والا انسان کبھی خدا کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم شاہ ولی اللہ کا فلسفہ جو وجود کی وحدت حقیقی پر مبنی ہے یا پرانی ویدانت فلاسفی کی دوسری ایڈیشن ہے اس سائنس کے عروج کے زمانے میں اس فلسفہ کا پڑھنا ہم ضروری قرار دیتے ہیں، تاکہ اصطلاحی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر خدا کا انکار نہ کیا جا سکے۔

سطحہ اول کی تمہید ختم ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

حضرت شاہ بدر الدین عالم زاہدیؒ

وفا راشدی ایم اے

بدر کے نام سے بہار اور بنگال میں کئی بزرگانِ دین گزرے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے اس نام کے بزرگوں کے تذکروں کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ یہ سارے بزرگ ایک ہی شخصیتیں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'پیر بدر' کا جو مزار صوبۂ بہار (بھارت) میں واقع ہے وہ حضرت مخدوم شاہ بدر الدین عالم (۱۴۴۵ء مطابق ۸۴۴ھ) کی ابدی آرامگاہ ہے اور ان کا خاندان آج بھی بہار شریف میں سکونت پذیر ہے۔ اس طرح مغربی بنگال (بھارت) کے موضع کلنا ضلع بردوان میں بدر نام کے ایک صاحبِ تصوف مدفون ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بدر نامی دو بزرگوں نے اشاعتِ اسلام اور دینِ الٰہی کی تبلیغ سے دائمی زندگی حاصل کی۔ ان میں سے ایک بندۂ خدا پیر بدر الدین ضلع دیناج پور کے ایک مقام موضع ہمت آباد میں آسودہ ہیں۔ آپ کی درگاہِ مبارک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ آپ صاحبِ کشف و کرامات بھی تھے اور واقفِ سیف و طبل بھی۔ دیناج پور میں آپ کے ورودِ مسعود کے وقت وہاں کے راجہ مہیش راج نے انسانوں پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ آپ نے گوڑ کے حاکم سلطان علی مبارک

علاؤ الدین جو حسین شاہ (۱۳۱۹-۹۴ء) کے لقب سے مشہور تھا، کی مدد سے راجہ نہیشں پر چڑھائی کی اور اسے شکست دے کر اس علاقے کو مسلم حکومت میں شامل کرلیا اور اس طرح وہاں کے انسانوں کو ظالم راجہ کے ظلم و ستم سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔ آج دیناج پور اور اس کے گرد و نواح میں حضرت بدر کے دم سے اسلام کا بول بالا ہے۔

مشرقی پاکستان میں بدر نام کے جس اللہ والے نے چاٹگام کے پہاڑی علاقوں اور دریائے کرنافلی کی حسین وادیوں میں توحید و تصوف کا چراغ روشن کیا، وہ حضرت بدرالدین عالم زاہدی رح ہیں۔ بعض مورخوں نے بہار کے بدرالدین اور چاٹگام کے بدرالدین کے حالات کو گڈمڈ کر دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ دو نام کے ایک ہی بزرگ ہیں حالانکہ یہ بات حقیقت کے برعکس ہے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ چاٹگام کے حضرت بدر نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں بہار اور دوسرے مقامات کی سیر و سیاحت کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جہاں جہاں بھی گئے ان کے معتقدین و مریدان نے ان کے نام سے خانقاہیں قائم کیں لیکن ممکن نہیں کہ ایک ہی شخص کے مزارات مختلف مقامات میں واقع ہوں۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ بعض مورخوں نے تحقیق سے کم اور سنی سنائی باتوں پر زیادہ بھروسہ کیا ہے یا زیادہ سے زیادہ انہوں نے انگریزی اور اردو مطبوعات پر اکتفا کیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ بنگال کے صوفیائے کرام سے متعلق زیادہ تر مواد بنگلہ زبان میں ہے۔ اس کے علاوہ قلمی نسخوں کی صورت میں یا قدیم کتابوں میں محفوظ ہے اور ان مسودوں کا صحیح مطالعہ بنگلہ زبان سے واقفیت کے بغیر آسان نہیں۔

زیر نظر مضمون میں چاٹگام کے "پیر بدر" کے حالات ہدیۂ قارئین ہیں۔ حضرت شاہ پیر بدر زاہدی رح چاٹگام کے جلیل القدر صوفی تھے۔ لوگ جوش عقیدت میں انہیں کئی ناموں 'بدر پیر'، 'بدر شاہ'، 'پیر بدر' یا 'بدر' سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے اصل نام میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن تحقیق کی روشنی میں آپ کا پورا نام "شاہ بدرالدین عالم زاہدی رح" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور یہی نام مقامی طور پر زبان زد

عام ہے۔ آپ کو "علامہ" کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا اس لئے کہ آپ عربی زبان کے ماہر، علم دین وفقہ کے فاضل اور تصوّف وعرفان کے ایک بلند مقام پر فائز تھے۔

حضرتِ علامہ شاہ بدر الدین عالم زاہدیؒ حضرت شاہ فخر الدینؒ کے پوتے اور حضرت شاہ شہاب الدین کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کے جدِ امجد حضرت شہاب الدین امام مکی صاحبِ علم وعرفان بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شاہ بدر الدین، سلسلۂ زاہدی میں اپنے دادا حضرت فخر الدینؒ کے مرید تھے اور آپ ہی کی ہدایت پر رشد وہدایت کے لئے بنگال تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے صوبۂ بہار[1] اور کئی مقامات کا دورہ بھی کیا تھا۔

سرزمین چاٹگام میں آپ کی آمد کی داستان دل چسپ بھی ہے اور عجیب بھی۔ کہتے ہیں کہ چھ سو سال قبل حضرت شاہ بدر الدین ایک بہتے ہوئے چٹائی کے ٹکڑے پر بیٹھ کر پانی کے راستے چاٹگام کے ساحل پر پہنچے۔ اس زمانے میں وہ علاقہ جنّات اور بدروحوں کا مسکن تھا، بھوت پریت نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ آپ نے ان خبیثوں کی اجازت سے پہلی بار اس مقام پر ایک دیپ (مٹی کا چراغ) جلایا۔ مسجد قدم مبارک رحمت گنج کے شمالی جانب ایک پہاڑ پر روزانہ مغرب کے وقت چراغ جلایا کرتے اور اذان دیا کرتے۔ فضا میں چراغ کی لَو پھیلتے اور اذان کی روح پرور آواز گونجتے ہی بھوت پریت اور بدروحیں اس مقام سے بہت دور بھاگ جاتیں۔ اس طرح آپ کی روحانی قوتوں سے رفتہ رفتہ وہ علاقہ ان منحوسوں اور خبیثوں سے ہمیشہ کے لئے پاک صاف ہوگیا۔

---

[1] حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بہار میں آپ کی آمد کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی چنانچہ آپ موصوف کی وفات (۷۸۲ھ ۱۳۸۰ء) کے وقت بہار میں قیام فرما تھے۔ (تذکرۂ اولیائے بنگالہ)

حضرت بدر عالم زاہدیؒ پہاڑ کی جس چوٹی پر چاٹی[1] (دیپ) جلاتے وہ جگہ "بدر چاٹی" یعنی "بدر پیر کے چراغ جلانے کا مقام" کے نام سے موسوم ہے۔ آج بھی ہر مذہب و ملت کے لوگ بلا ناغہ ہر روز شام کو اس پربت کی چوٹی پر ان کی یاد میں چراغ جلاتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ "بدر کی چاٹی" کی مناسبت سے اس علاقے کا نام "چٹو گرام[2]" "چٹگاؤں[3]" یا چاٹی گرام[4] پڑا۔ یہ حضرت بدر کی ریاضت وعبادت اور روحانی کرامات کا نتیجہ تھا کہ چاٹی گرام کا وہ حصہ جو کبھی جنوں اور بھوتوں کا ٹھکانہ تھا آپ کی پاکیزگی اور روحانی اثرات کی بناء پر "پوریہ پہاڑ" یعنی پریوں کا پہاڑ کہلاتا ہے۔

ایک مورخ کا بیان ہے کہ چاٹگام ان کی 'چاٹی' سے منسوب ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ اس زمانے میں چاٹگام کے اس علاقے میں جہاں آپ کا مسکن اور آستانہ تھا، مگ قبیلہ آباد تھا۔ یہ لوگ وحشی، ناشائشتہ اور غیر مہذب تھے۔ انسان انسانی جان ومال کا دشمن تھا۔ انسانیت ومحبت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ علاقہ "مگیر ملک" یعنی 'مگوں کا دیس' کہلاتا تھا۔ ان کے شادی بیاہ کے رسم ورواج بھی عجیب تھے اور اس سلسلے میں بڑی دلچسپ و سنسنی خیز کہانیاں ایک داستان بنی ہوئی ہیں۔ یہ دنیا گویا ایک طلسماتی، جنوں اور پریوں کی دنیا تھی پریوں کے دیس سے جنّ دولہا بن کر آتے اور مگ کے دیس سے بیاہ کر دُلہن کو ڈولی میں لے جاتے۔ یہ مخلوق آپس میں شادی رچا کر انسانوں کی طرح گھر گرہستی بھی کرتی۔ اس قسم کی باتیں واقعی عقل سلیم سے بعید ہیں لیکن ان واقعات سے یہ اندازہ ضرور

---

[1] بنگلہ زبان میں مٹی کے چراغ کو "چاٹی" کہتے ہیں۔

[2]، [3]، [4] بنگلہ زبان میں گرام کے معنی گاؤں کے ہیں۔ چاٹگام کا تلفظ دوسری زبانوں میں مختلف ہے، انگریزی میں چٹاگانگ، اردو میں چاٹگام۔ لیکن بنگلہ میں چٹو گرام، چٹگاؤں یا چاٹی گرام کہتے ہیں۔ (و-ر)

کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں مگ قبیلے کے لوگ کس قدر درندے اور انسانی اقدار سے محروم تھے۔ قتل وغارت، لوٹ مار، ظلم وتشدد ان کی زندگی کا معمول تھا۔ چاٹگام میں ترکی مسلمانوں کے وُرود سے مگ قبیلے کی وحشت وبربریت کا خاتمہ ہوا لیکن پھر بھی مگوں کا اثر قائم تھا۔ حضرت بدرؔ نے اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور سب سے پہلے اس علاقے کے نفوس کو اپنی تعلیمات سے متاثر کیا۔ مگ کے یہی لوگ جو تاریکی وگمراہی کے راستے پر چل رہے تھے حضرت بدرؔ کی رشد وہدایت کی بدولت راہِ راست پر آگئے۔ ان کے دلوں میں ایمان کے دیپ جلے۔

چاٹگام میں محسن اولیاء کے مزار پر ایک کتبہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۳۴۰ء مطابق ۷۴۱ھ میں حضرت بدرؔ بقید حیات تھے۔ قادل خان غازی سے آپ کے خاص مراسم تھے۔ قادل خان غازی سلطان فخرالدین مبارک شاہ (۱۳۳۸-۱۳۴۹ء) کا سپہ سالار تھا اور سلطان فخرالدین کے ایماء پر اس نے بنگال کو فتح کیا تھا۔ بنگال میں اسلامی مملکت کی تشکیل اور اسلامی معاشرے کی تطہیر میں قادل خان غازی کا بڑا ہاتھ رہا اس نے حضرت بدرؔ کے تبلیغی کاموں میں بڑی مدد کی تھی۔

آپ کے کمالات اور کرامات کے بہت سے قصے مشہور ہیں، ان میں کچھ مستند ہیں اور کچھ غیر مستند۔ طوالت کے خیال سے ان کا ذکر کسی اور موقعہ پر کیا جائے گا۔

آپ کے فیض وکمال کی دھوم اراکان، اکیاب (برما) ملایا کے ساحلوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ چاٹگام، کومیلا اور نواکھالی کے ملاحوں کو آپ سے بے انتہا عقیدت ہے۔ جب ملاح عازم سفر ہوتے ہیں تو پیر بدرؔ کا نام ان کی زبان پر ہوتا ہے، خصوصاً جب کشتی آندھی اور طوفان میں گھر جاتی ہے تو "پیر بدر، پیر بدر" کی پکار ان کی ہمت اور جوش میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور ان کی کشتی ساحل پر آلگتی ہے

لے پوربو پاکستانیر صوفی سادھوک (بنگلا نسخہ) ڈاکٹر غلام ثقلین۔

یہ عقیدہ مسلمان ملاحوں کا نہیں ہندو مانجھیوں کا بھی ہے۔ ہندو ملاح کی زبان پر یہ الفاظ ہوتے ہیں ؎

آمورا آچھی پولاپان	ہم ان کی اولاد ہیں،
غازی آچھے نگابان	غازی ہمارے نگہبان ہیں
شیرے گنگا دھوری یا	اے کشتی! گنگا کنارے لگ جا
پانچ پیر، بدر، بدر	پانچ پیر، بدر، بدر

اور مسلمان ملاح یہ گیت ایک خاص سُر کے ساتھ گاتے ہیں ؎

آمورا آچھی پولا پان	ہم ان کی اولاد ہیں
غازی آچھے نگابان	غازی ہمارے نگہبان ہیں
اللہ، نبی، پانچ پیر،	اللہ اور نبی کے بعد پانچ
بدر، بدر،	پیر ہیں، بدر، بدر،

حضرت بدر عالم زاہدی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم مبارک اہل چاٹگام کی زبان زد عام ہے۔ کُشتیوں کے موقعہ پر جب پہلوان اکھاڑے میں اترتے ہیں تو پہلے شاہ بدر، غازی بدر یا پیر بدر کا نعرہ لگاتے ہیں۔ آپ کی شہرت و مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ چاٹگام کی پہاڑیوں کے علاوہ اراکان اور اکیاب کی وادیاں آپ سے منسوب ہیں۔

مشرقی پاکستان کے ان پہاڑی حصوں میں حضرت پیر بدر رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید میں صوفی منش شعراء نے بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں حصّہ لیا ہے وہاں بہت سے ایسے شعراء بھی گزرے ہیں جو شعروں کے روپ میں اپنے دینی عقائد، صوفیانہ خیال اور پاکیزہ رجحانات سے عوام کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ اس قسم کے بے شمار اشعار مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں، بطور نمونہ ایک صوفی شاعر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم نے اپنے خیالات کو تمام دلکشی سے ہٹا کر
ایک طرف مرکوز کر دیا ہے

ہمارے خیالات ورجحانات کی یہ تبدیلی
بے شمار اللہ والوں کی رہینِ منت ہے
چراغ توحید روشن کرنے والے
ہمارے پیغمبر اور ہمارے پیر ہی تو ہیں،
ہمیں فخر ہے
ان بلند و برتر ہستیوں میں
چاٹگام کی ایک عظیم المرتبت شخصیت
حضرت بدر کی بھی ہے۔

(پوربو پاکستانیر صوفی سادھوک (بنگلہ نسخہ) صفحہ ۸)

حضرت بدر عالمؒ کی تزویج و اولاد کا حال کچھ زیادہ مستند نہیں. کسی تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۲ دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی فیروز شاہ تغلق کی صاجزادی بی بی فہمیدہ سے ہوئی۔ دوسری بار ایک ہندو لڑکی آپ کے عقد میں آئی۔ پہلی شریک حیات سے چار بیٹے شہاب الدین، پیر قتال، شاہ ابو سعید، جنید اور تیز طبع تھے۔ دوسری بیگم سے ایک بیٹا شاہ سلطان زاہدی اور ایک لڑکی ابدال زاہدی گزری ہیں۔ دوسرے سوانح نگاروں نے صرف ایک ہی شادی کا ذکر کیا ہے اور ایک ہی لڑکی کا نام لیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

محققوں کی تحقیق وجستجو کے باوجود اب تک حضرت پیر بدر کی صحیح تاریخ وفات میں اختلاف ہے لیکن آپ کا عرس درگاہ مبارک پر ہر سال ماہ رمضان المبارک کی ۲۹ دیں تاریخ کو بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ یہاں تک کہ مگ قبیلہ کے افراد بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں عرس میں شریک ہوتے، اپنے پیر بابا کی بارگاہ پر عقیدت کے پھول چڑھاتے، یادوں کے چراغ جلاتے اور روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ آپ کا مزار پر انوار شہر چاٹگام کے وسط میں بخشی بازار کے جنوبی جانب واقع ہے۔ چاٹگام اور نواح چاٹگام میں آپ کے تبلیغی کارناموں، دینی تعلیمات، مذہبی خدمات، اور کشف وکرامات کے قصے کہانیاں سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں اور اب تو مستند تذکروں میں بھی محفوظ ہو چکی ہیں۔

ترجمہ

تاویل الاحادیث

(ادارہ)

لوط علیہ السلام

لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گروہ میں سے تھے جس نے ان سے ادب سیکھا تھا اور ان سے سنا تھا، یہ تعلیم آپؑ کے دل میں بیٹھ گئی تھی اور یہ ان کی نیکیوں میں سے ایک نیکی تھی، وہاں ایک قوم بستی تھی جن پر بے حیائی اور نفس پرستی نے غلبہ پایا تھا اور انہوں نے ملک میں فساد ڈال رکھا تھا اور وہ جسمانی لذتوں کے حاصل کرنے میں بہائم سے جا ملے تھے، (اس لئے) اللہ نے ان پر غضب کیا۔

اللہ کی یہ حکمت تھی کہ ان کو ان کے بداعمال کی سزا سے پہلے ڈرائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ ان کو ڈرائے، اگرچہ یہ ڈرانا اپنے گروہ میں سے کسی ایک شخص کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ پھر انہوں نے لوط علیہ السلام کو (ان کی طرف) بھیجا۔ جس نے جا کر ان کو وعظ و نصیحت کی اور سمجھایا لیکن اس تبلیغ سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا، پھر حکمتِ الٰہی ایسے سماوی اور ارضی اسباب کے انتظار میں رہی جن سے ایک ایسے واقعے کی تیاری ہو سکے جس سے ان کو عذاب کیا جائے۔ پھر جب اللہ کا حکم آیا تو ملائکہ انسانی صورت کا لباس اوڑھ کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس مہمان بن کر آئے، کیوں کہ ڈرانے والے اصل میں ابراہیم علیہ السلام

ہی تھے اور ان کے ہی ہاتھ میں ان کی پیشانیاں مہمانوں کی صورت میں رکھی گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے وہ کھانا جو مہمانوں کے لئے لائق ہوتا ہے ان کے سامنے رکھا اور جب آپؑ نے دیکھا کہ وہ اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تو انہیں اوپرا سمجھا اور ان سے نامانوس ہوا یہاں تک کہ جب آپؑ پر یہ واضح ہوا کہ یہ ملائکہ ہیں تو ابراہیم علیہ السلام اور ان کے گھر والوں سے ظاہری وحشت زائل ہوئی اور ان کو خوشی حاصل ہوئی اور ان کے نفوس نے ملکوت کا رنگ اختیار کیا اس لئے (فرشتوں کی) ان کے حق میں یہ دعا تھی کہ "اے اس گھرانے والو! تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں"

(جاننا چاہئے کہ) ملائکہ اللہ کے روح ہوتے ہیں اور ایسی روح کی یہ خاصیت ہے کہ جب بھی اس کا کسی چیز پر گذر ہوتا ہے تو اس چیز کی زندگی اور شباب اس کی طرف لوٹ آتا ہے، جب ملائکہ نے (ان کے لئے) برکت کی دعا کی اور انہوں نے اپنی پوری کوشش سے یہ قصد کیا کہ بی بی سارہؓ کی حالت سدھر جائے (اور دوسری طرف) رحمت (الٰہی) بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے مقبول ہونے کی منتظر تھی، تب اسی حالت میں بی بی سارہ جوان ہوگئیں (اس لئے کہ) بیٹے کی بشارت ملنے کے بعد ان کو ظاہری اور باطنی طور پر سرور اور تعجب لاحق ہوا اور بیٹے کے تخیل سے بدن کے اندر اس کی روح منشرح ہوئی اور انشراح میں برکت ہوئی جیسے کوئی مریض شدید مرض میں مبتلا ہو (اس میں کبھی ایسا ہوتا ہے) کہ اچانک فرح و سرور پہنچنے سے شفایاب ہو جاتا ہے اور اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ضعف باہ والوں کو اگر قوی قوت والے لوگوں کی حکایتیں سنائی جائیں تو ان کے سننے سے وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

پھر ابراہیم علیہ السلام نے ملائکہ سے پوچھا کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے آپؑ کو سب کچھ بتلا دیا۔ پھر لوط علیہ السلام کے قریہ کی طرف گئے اور ان کے ہاں اترے (ان کو دیکھ کر) لوط علیہ السلام کی قوم ان کے پاس دوڑتی ہوئی آئی، ان کا فساد کا ارادہ تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی لوط علیہ السلام کے خلاف معرکے میں جلد بازی اور دوری میں ہی اندھا کر دیا، پھر ان کے لئے زمین کو اس طرح لپیٹا (اور کم) کر دیا گیا کہ ان کے چلنے میں برکت رکھی گئی اور ان کو یہ حکم ہوا کہ (چلتے وقت) پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں تاکہ (اپنے) سیر (کی مسافت) کو زیادہ نہ سمجھیں لیکن ان کا ارادہ جو کہ روح الٰہی کے لئے ایک مثالی صورت کی طرح تھا پراگندہ ہوا پھر ان پر عذاب

نازل ہوا۔ اور وہ زمین سے سخت زلزلہ تھا اور بارش، ہوائیں اور اولے کے مادّے کے منعقد ہونے سے کنکر کے پتھر بن گئے تھے (ان سے بھی ان کو عذاب کیا گیا)

جاننا چاہئے کہ کائنات جوّیہ کی قسم کے تمام عذاب جو آتے ہیں وہ سب ستاروں کے نامناسب اتصال کی وجہ سے آتے ہیں اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب سحار (بادل) میں بارش بند ہوجاتی ہے۔ اور بڑی مدت تک اس میں بہت سے مادے جمع ہوجاتے ہیں پھر ان کے ساتھ ملاء اعلیٰ کا غضب اور لعنت بھی مل جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ ان اسباب میں بسط فرماتا ہے اور ان موادکو کبھی تو زلزلے اور مہیب آواز بنا دیتا ہے اور کبھی زمین میں دھنسنا ہوتا ہے اور کنکر کے پتھر برستے ہیں اور کبھی تند اور تیز تر ہوا بنا دیتا ہے اور کبھی ان کو گری ہوئی بجلی اور منتشر آگ کر دیتا ہے۔

تاویل احادیث یوسف علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تقدیر میں تکلیف و مصیبت اور ان کے والد سے جدائی لکھی تھی، کیونکہ اس پر سماوی اسباب کی موافقت ہوگئی تھی، آخر آپؑ کو ایک بڑا واقعہ پیش آیا، جیسے بھائیوں کا ان کے ساتھ حسد کرنا اور یوسفؑ کو کنویں میں گرانا، پھر (تاجروں کے ہاتھ) فروخت کرنا اور ان کا زلیخا کے یہاں پہنچنا اور جیل ہونا، یہ تب تک ہوتا رہا جب تک بلاء و مصیبت کا زمانہ گذر گیا۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت فرمائی اور اپنی رحمتوں کی ظاہری اور باطنی طور پر بارش برسائی، ان کے لئے اس حادثے میں ان کے پروردگار کی مختلف نعمتیں تھیں:

ایک یہ ہے کہ ــــ یوسف علیہ السلام پاکباز تھے، ان کے خواب میں ان پر وہ سب ظاہر ہوا جو آخر امر میں ان پر اللہ کا انعام ہوتا تھا۔ مثلاً خلوق ان کی اطاعت کرے گی، ان کے ماں باپ ان کی تعظیم کریں گے۔ یعقوب علیہ السلام نے اس خواب کی تعبیر فرمائی اور اللہ کی مراد کو معلوم کیا اور اپنے تنبّہ سے کلّی طور پر مقصد کے راز کو بھی جان لیا کہ یوسف علیہ السلام تعبیر واقعات (اور خواب) کے لئے (بھی) مستعد ہیں کیوں کہ خواب اور حوادث کے لئے کوئی تعبیر ہوتی ہے جس کو جامع تنبّہ کا مالک معلوم کر لیتا ہے۔ تنبہ جامع سے میرا مقصد یہ ہے کہ معنی مراد

کو قوت خیالیہ ایسی صورت پہنائے جو کہ طبیعت کی صورت کے مناسب ہو اور اس کی بنا طبیعت کلیہ کی اقتضاء پر ہوتی ہے، جب حقیقت اجمالیہ (اس کا) عالم ناسوت میں افاضہ کرتی ہے۔

ان عنایات میں سے دوسری عنایت یہ ہے کہ ـــــ جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان پر حسد کیا اور ان کو جان سے مار ڈالنے کا باہمی مشورہ کیا تو ان میں سے ایک کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ نکلوایا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو اور ان کو کنویں میں ڈال دو، پھر اللہ نے سب کو اس کی بات کا قائل کرا دیا۔ (اور اس کے کہنے پر اس کو قتل نہ کیا) تو خدا نے یوسفؑ کے قتل کو کنویں میں ڈالنے سے بدل دیا اور قضاء کو اس پر آسان کر دیا۔

ان پر تیسری عنایت یہ تھی کہ جب ان کو بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے اپنے حال کی جو آگے ہونے والا تھا اور ان کے بھائیوں کے حال کی وحی کی کہ وہ سب ان کے تابعدار ہوں گے اور یوسفؑ کی فضیلت اور ان کے حق میں اپنی خطا کا یہ کہہ کر اعتراف کریں گے کہ "تحقیق اللہ نے تجھ کو ہم پر فضیلت دی[1]" اس وحی کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ یوسفؑ کے دل کو تسلی ہو جائے اور اس سے اس کی وحشت دفع ہو جائے۔

چوتھی عنایت یہ ہے کہ اس حادثے کی طبعی اقتضا یہ تھی کہ یوسفؑ ہلاک ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو روک دیا۔ حقیقت میں تو اس کو ہلاکت کا سبب نہ بنایا لیکن ظاہر، حکایت، گمان اور یعقوب علیہ السلام کے (ان پر) غم کرنے کے لحاظ سے اس کو ہلاکت کا باعث بنا دیا۔

پانچویں عنایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، یوسف علیہ السلام کی خلاصی کے لئے یہ تقریب فرمائی کہ قافلے والوں کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اس طرف کو جائیں اور اپنے میں سے ایک کو کنویں کی طرف بھیجیں ان کا یہ گمان تھا کہ وہاں پانی ہوگا اس طرح یوسف علیہ السلام پر اس کو اطلاع ہوئی اور اس نے ان میں رغبت دکھائی اور ان کی اس خیال سے حفاظت کی کہ ایک عمدہ پونجی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اس سے یوسف علیہ السلام کی طول حیات مراد تھی اور ان کا اپنے کمال کی حد تک پہنچنا تھا۔

---

[1] سورۂ یوسف، آیت ۹۲

چھٹی عنایت یہ ہے کہ ـــ جب ان کو (مصر کے) عزیز نے خریدا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اپنی بیوی کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ اچھے برتاؤ کی وصیت کرے اور بیوی کے دل میں بھی یہ القاء کیا کہ وہ ان کا خیال رکھے اور شاید ان کو اپنا بیٹا بنا دے۔ حق یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے حق میں اللہ کی مراد یہ تھی کہ ان کو ملک مصر میں سکونت دے اور بڑی نعمت سے پہلے ان پر اپنی رحمت کو کامل کرے۔

ساتویں عنایت یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے سوا اللہ نے ان پر اپنی حکمت اور علم کو ظاہر فرمایا اور ان پر ملتِ حنیفی کو واضح کیا، اگرچہ ان کی بود و باش کافروں کی قوم میں تھی جہاں بُری رسمیں تھیں۔

آٹھویں عنایت یہ ہے کہ ـــ جب عورت (زلیخا) ان پر عاشق ہوئی، اور ان کو پھسلانا شروع کیا، وہ ایک قوی مزاج والے جوان تھے، "اور البتہ عورت نے فکر کی اس کی اور اس نے بھی فکر کی عورت کی"[1] تو اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی دلیل ظاہر فرمائی، جس سے ان کے دل میں عصمت نے جوش مارا اور اس نے ان کے مزاج کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا، اگرچہ ان کا مزاج قوی تھا اور اس کی یہ صورت ہوئی کہ ان کو اپنے باپ (یعقوب علیہ السلام) کی صورت نظر آئی، جن کو وہ جانتے تھے کہ یہ (باپ) اللہ کے شعائر میں سے ہے اور وہ ملک میں اللہ کی طرف بلانے والے ہیں اور اس فعل سے ان کو روکنے والے ہیں۔

نویں عنایت یہ ہے کہ ـــ جب یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی اور لوگوں میں (آپ کی عصمت اور صداقت پر) کوئی گواہی دینے والا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ایک بچے کو ایسی حکمت سے گویا کر دیا کہ جس سے ان کی برات (اور صفائی) ہو گئی۔

دسویں عنایت یہ ہے کہ ـــ جب عزیز مصر کی بیوی نے یوسف علیہ السلام کو بنا سنوار کر عورتوں کو اس لئے دکھلایا کہ اپنے سے ان کی ملامت کو دفع کرے تو وہ عورتیں ان پر عاشق ہو گئیں۔ اور انہوں نے ان تک رسائی کی بڑی کوشش کی (ایسی حالت میں) بظاہر یوسف علیہ السلام

---

[1] یہ سورۃ یوسف کی آیت ۲۴ کی طرف اشارہ ہے، مؤلف امام نے اس آیت کے تحت عصمت کی مزید تحقیق تفہیمات جلد ۱ صفحہ ۲۶ میں فرمائی ہے۔

کی عصمت کا باقی رہنا مشکل معلوم ہوتا تھا اس لئے انہوں نے اپنے پروردگار سے اپنی خلاصی کی دعا مانگی، چاہے وہ خلاصی قید ہونے سے کیوں نہ ہو، جس قید کی زلیخا نے اپنی مقصد برآری کے لئے ان کو دھمکی بھی دی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان لوگوں کے خیال میں یہی آیا کہ ان کو قید کریں، اگرچہ ان کی برارت ہو گئی تھی۔

گیارہویں عنایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی رہائی اور مصر میں ان کو قوت دینے کی عجیب تقریب فرمائی اور ان کے لئے ایسا سبب مہیّا کیا کہ عام اور خاص سب کی زبان ان کی مدح وثنا سے رطب اللسان ہو جائے اور (وہ تقریب یہ تھی کہ) دو شخصوں کو خواب دکھایا اور یوسف علیہ السلام کو اس خواب کی تعبیر کی توفیق عطا فرمائی اور انہوں نے اس خواب کی مراد کو سمجھ لیا اور انہوں نے ساقی سے کہا کہ اپنے مالک کے ہاں ان کا ذکر کریں اور ان کے فضل کو ظاہر کریں۔

بارھویں عنایت یہ تھی کہ — جب اہل مصر کو ایک ایسے عظیم قحط نے گھیر لیا جس سے وہ ہلاک ہونے والے تھے تو اللہ نے ان پر رحم کرکے ان کے بادشاہ کے دل میں ان کی نجات کی تدبیر ڈال دی اور یہ تدبیر اور الہام یوسف علیہ السلام کے سوا پورا نہیں ہو سکتا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی تب ہی ہو سکتی تھی جب اس کے لئے (بادشاہ کے دل میں ہی کا) القار کیا جائے اور لوگوں کو یوسف علیہ السلام کی ضرورت ہو، تب اللہ تعالیٰ نے بادشاہ اور شہر کو یوسف علیہ السلام کا محتاج بنایا اور یوسف علیہ السلام کو بھی بادشاہ اور لوگوں کی طرف حاجت پڑی تاکہ جو کام ہونے والا ہے اس کو اللہ پورا کرے، اکثر حوادثات اسی طرح ہوتے ہیں جن میں بہت سے لوگوں کے لئے عنایاتِ باری جمع ہوتی ہیں۔

تیرھویں عنایت یہ تھی کہ یوسف علیہ السلام کو یہ توفیق عطا ہوئی تھی کہ تب تک وہ جیل خانے سے باہر نہ آئیں جب تک ان کی برارت نہ ہولے اور قبل اس کے کہ اللہ کی نعمتیں ان کو گھیر لیں، لوگوں میں ان کی صداقت کی تشہیر ہو جائے تاکہ ان کا صدق دنیا سے آلودہ نہ ہو جائے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ثنا فرمائی اور ان کے فضل کا اعتراف کیا آپؐ نے (ایک حدیث میں) فرمایا کہ اگر میں جیل میں اتنی مدت ٹھہرتا جتنی یوسف علیہ السلام

ٹھہرے تھے تو میں داعی کی اجابت کرتا (یعنی جیل سے نکل آتا)[1]۔

چودھویں عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو حاکم بنایا اور (مصر کے بادشاہ) ریان کے دل اور دوسرے تمام لوگوں کے دل کو ان کا مطیع بنایا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام اور دوسرے تمام لوگوں کے لئے نعمت کر دیا۔

پندرھویں عنایت یہ تھی کہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں ان کے پاس آنے کی رغبت پیدا کی تاکہ غمزدہ لوگوں سے ملاقات ہو سکے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام توحید اور علم اسباب سب کو جانتے تھے وہ نظر لگنے سے ڈرے اور بیٹوں کو (اس سے) بچنے کی تدبیر بتائی۔

سولھویں عنایت یہ تھی کہ جب یوسف علیہ السلام نے یہ چاہا کہ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس روک رکھے تاکہ دوسرے بھائیوں کی بے خبری میں اپنے اس بھائی سے انس حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ نے (ایک تدبیر فرمائی کہ) ان کے بھائیوں سے یہ کہلوا دیا کہ جس کے سامان میں (کھوئی ہوئی چیز) پائی جائے تو وہی اس کے بدلے میں جائے۔ وہ اپنے زعم میں اپنی برات کے اظہار میں مبالغہ کر رہے تھے لیکن حقیقت میں غیر شعوری طور پر وہ یوسف علیہ السلام کے مقصد بر آری کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کے دل میں یہ اجمالی وحی کی کہ وہ اپنے بیٹوں سے ملیں گے، اور پھر ان پر اپنی رحمت پوری کی اور اس خوشی کے سلسلے میں جو ان کی رُوح کو بیٹوں کی ملاقات والی بشارت سے پہنچی تھی ان کی بینائی لوٹ آئی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ظاہر ہوا، پس یہ سب (عنایتِ الٰہی کی) علامات تھیں جو کہ یوسف علیہ السلام پر ظاہر ہوئیں سب مسلمانوں کو چاہیے کہ ان سے یہ سمجھ لیں کہ اللہ اپنی عنایت کو خلق میں کس طرح ظاہر

---

[1] اس حدیث کو امام احمد نے مسند میں اور شیخین نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صہ ۴۸۱ طبع مصطفیٰ محمد، مصر۔

فرماتا ہے، جب کسی شخص کو کسی ہلاکت سے بچا کر باقی رکھنا چاہتا ہے یا دنیا اور آخرت میں اس کے کمال تک اس کو پہنچانا چاہتا ہے۔ اور جب اللہ، کسی قوم کے بقا کا ارادہ کرتا ہے تو کس طرح نجات کی تدبیر دل میں ڈال دیتا ہے پھر جو بھی اس خدمت کے لئے مستعد ہوتا ہے اس کو اس تدبیر کی خدمت میں لگا دیتا ہے اللہ کی آیات میں تمہیں تدبّر کرنا چاہیئے اور تمہیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ خدا کی تدبیر مخلوق میں کس طرح کام کرتی ہے۔

تاویل احادیث ایوب علیہ السلام

ایوب علیہ السلام، نعمت، ثروت، آرام، عبادت اور نظافت میں رہتے تھے۔ پھر وہ اپنی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے یہ ان کو نیکی کا حکم کرتے تھے اور برائیوں سے ان کو روکتے تھے۔ اور ان کو ملّتِ حنیفی کی طرف بلاتے تھے، قوم کے فقراء اور مساکین کی حاجت روائی کرتے تھے۔ پھر موافق ہو گئے اسبابِ سماوی مصیبت پہنچانے پر، ان کے مال و اہل و عیال اور جسم، سب پر۔ اور اس وقت بھی ان کے پروردگار کی ان پر یہ عنایتیں تھیں کہ ان پر خیر کا فیضان ہوتا تھا اور ان کو (قلبی) اطمینان تھا، ان کی یہ حالت ان اصولوں میں شمار ہوتی ہے جن سے اللہ کے لئے ان کی فرماں برداری اور اطاعت کی وضاحت ہوتی ہے، یہ حالت ان کے نامۂ اعمال میں لکھی گئی اور اس پر اللہ نے ان کے شکر بجا آوری کو قبول فرمایا۔

جب ان کی مصائب جاتی رہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمتیں برسائیں اور جو رحمت پوشیدہ تھی وہ ظاہر ہوئی اور ان سے کہا گیا "لات مار اپنے پاؤں سے، یہ چشمہ نکلا نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو"۔[1] زمین پر لات مارنا تو اسبابِ ارضی میں اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی تاکہ وہ یوں ہی بیکار نہ رہ جائے، (اس سے) وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا، جس کی یہ خاصیت تھی کہ اس (کے استعمال) سے جذام کا خاتمہ ہو جائے، جس طرح گندھک کے چشمے کی خاصیت ہوتی ہے خارش کا ازالہ، حضرت ایوب علیہ السلام اس پانی سے نہائے اور اسے پیا، جس سے ان کا سارا بدن اچھا ہو گیا اور مرض کا مادّہ جاتا رہا، حضرت ایوبؑ اور ان کی بیوی دونوں کی

---

[1] سورت صٓ، آیت ۴۱، ۴۲

جوانی اور شباب لوٹ آیا، پھر ان کی جتنی اولاد ہوئی تھی وہ اور اس قدر مزید ان کے لئے پیدا ہوئی۔ اور اپنے زمانے کے لوگوں اور ان کے بعد کے آنے والے لوگوں سب میں سچے (مشہور) ہو گئے۔ اللہ نے ان کے مال میں برکت کی جس طرح اس سے پہلے برکت کی تھی یا اس سے بھی زیادہ۔

ایک دن حضرت ایوب علیہ السلام غسل کر رہے تھے کہ اللہ کی رحمت سے ٹڈیاں آئیں اور جب ان کے گھر میں گر پڑیں تو سب سونے کی ہو گئیں اور ان میں سے ایک گھر کے باہر گری تو اس کو بھی اُٹھا لائے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ جب کسی طرف سے رحمت متوجہ ہوتی ہے تو حتی الامکان (اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے) اس کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔

حضرت ایوبؑ نے یہ منت مانی تھی کہ اپنی بیوی کو سو دُرّے ماریں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت اور آسانی کی نظر تھی تو نذر کی ایفا میں منت کی حقیقی صورت کو چھوڑ کر اس کی ظاہر صورت پر اکتفاء کی کیوں کہ ایک سو مرتبہ مارنے کے معنی ہیں تشدید درد پہنچانا اور اس سے ظاہری مراد ہے ایک سو مرتبہ مارنا۔ (چاہے وہ ایسی شکل میں ہو کہ اس سے کوئی خاص تکلیف نہ پہنچے،) اللہ تعالیٰ کا اپنے پیارے بندوں کے ساتھ برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان سے حدودِ شرعیہ کی ظاہری صورت پر اکتفاء کی جاتی ہے اصل حقیقت کو چھوڑ دیا جاتا ہے یہ اللہ کی عنایت اور ارادے سے ہوتا ہے جس کا تعلق ان شرائع سے ہوتا ہے جو ملاء اعلیٰ کے سینوں میں بنتی ہیں (یعنی ملاء اعلیٰ میں ان کا فیصلہ ہوتا ہے) پھر ان میں ان شرائع اور احکام کی وجہ سے حرج اور تکلیف نظر آتی ہے، اسی طرح ہر پسندیدہ نظام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہی برتاؤ ہوتا ہے۔ جب اسبابِ ارادی اس پر موافقت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان عدل اور انصاف سے اسی طرح فیصلہ کرتا ہے کہ شئ کے ایک پہلو کو لیا جاتا ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تاویل احادیث شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام صاف دل والے مؤمن، اپنے پروردگار کے فرماں بردار تھے۔ ان کی قوم نے زمین میں فساد کیا اور لوگوں کے حقوق میں بے انصافیاں

گیں اور بد رسموں پر جمع ہو گئے تھے، مظلوم لوگ فریاد کرتے تھے لیکن ان کی کوئی نہیں سنتا تھا، انہوں نے اللہ اور آخرت پر ایمان کو بالکل بھلا دیا تھا۔ اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ شعیب علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائے کہ وہ ان کو (گناہوں کی پاداش میں) خدا کی طرف سے جو سزا ملنے والی تھی اس سے ڈرائے اور ان کو خدا کے غضب سے باخبر کرے

جب شعیب علیہ السلام کے (سمجھانے اور) ڈرانے سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حکمتِ الٰہی منتظر رہی، تاکہ جب ایک دراز مدت تک ان سے بارش رک گئی، زمین کے مواد بند ہو گئے اور شدت کی گرمی ہوئی تو اللہ کا حکم آپہنچا، ان پر گرم ہوا چلے پھر ان میں اضافہ ہوا اور وہ آگ ہو گئے اور ان پر ارعد کی مہیب) آواز آئی (اس سے) وہ ہلاک ہو گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام جس طرح پہلے اپنے رب کے فرماں بردار تھے اسی طرح اب بھی مطیع مؤمن رہے اور قوم کے ساتھ جھگڑنے اور ڈرانے کا خیال جو ان کے سینے میں جوش مارتا تھا وہ ختم ہو گیا اور یہ جوش ملاء اعلیٰ میں قوم شعیب پر لعنت اور غضب کرنے کے فیصلے کے نتیجے میں تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام پر ایک حالتِ الٰہی کا نزول ہوا تھا اس سے وہ لذت حاصل کرتے تھے۔ اور اس لئے ان کی یہ خواہش تھی کہ بعض افراد ایمان لائیں اور بعض نہ لائیں۔

تاویل احادیث موسیٰ وہارون علیہما السلام

جاننا چاہیئے کہ فرعون نے اللہ اور اس کے شعائر سے تکبّر کیا اور اس نے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا، خدا کی مخلوق کو اپنا غلام بنایا، ملک میں فساد کیا اور بنی اسرائیل پر ان کے بیٹوں کے قتل کرنے اور ان کو ذلیل وخوار رکھنے سے غلبہ حاصل کیا۔ (اس دور میں) بنی اسرائیل ملک میں اللہ کی مخلوق میں سب سے اچھے لوگ تھے، انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی سے فریاد کی (ان کی دُعا قبول ہوئی) اللہ تعالےٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ فرعون اور اس کی قوم پر ان کے بداعمال کی سزا میں عذاب بھیجے اور کمزور بنی اسرائیل پر احسان فرمائے اور ان کو (قوموں کا) پیشوا بنائے اور ان کو زمین کا وارث کرے۔ تب اللہ نے (اپنی مراد کو بروئے کار لانے کے لئے) ایک عظیم الشان شخص کی پیدائش کا حکم کیا۔ جس کا یہ کارنامہ ہوگا کہ فرعونی اس کے ذریعے ہلاک ہوں گے اور بنی اسرائیل اس کی مدد سے (فرعونیوں کے

مظالم سے) نجات پائیں گے. پھر اس شخص پر اس کے شروع سے لے کر اس کے قوت پانے تک اللہ تعالیٰ کی عنایتیں تھیں اور اس کو پورے طور پر آزمایا تاکہ اس پر اس کی جبلت منکشف ہو اور اس کی استعداد میں جو چیز پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو جائے.

ان عنایات میں سے ایک عنایت یہ تھی کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی عورتوں میں دائیوں کو جاسوس بنا کر بھیجا اور (اللہ نے) موسیٰ علیہ السلام کو ان سے اس طرح چھپایا کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہاں کسی کو حمل نہیں ہے. پھر جب وہ پیدا ہوئے تو ان کی ماں کے دل میں ان کی نجات کے حیلے کا الہام کیا کہ اس کو دودھ پلاتی رہ! پھر جب تجھ کو ڈر ہو تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غم کھا ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں سے[1]

اس کی عملی شکل یہ تھی کہ اس (حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ) کے دل میں یہ بات آئی کہ موسیٰ کو اپنے پاس رکھنے میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے اور اگر اس کو دریا میں ڈال دیا جائے تو یہ اس کی خلاصی کا سبب ہو سکتا ہے، اور شاید یہ وہی نبی مرسل ہو جس کی علماء بنی اسرائیل نے بشارت دی ہے اور جس سے فرعون خائف ہو گا. یہ الہام پہلے تو ایک معمولی خیال کی شکل میں نمودار ہوا پھر اس میں اضافہ ہوا اور اس خیال میں (عزم کی طرح) اتنی قوت پیدا ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نہ روک سکی، (تدبیر الٰہی اور الہام نے) دریا میں شدید موجوں کو ابھارا اور ان موجوں نے صندوق کو آل فرعون تک پہنچا دیا، انہوں نے اس صندوق کو نکال لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رغبت ڈال دی وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یہ بچہ ان کے لئے سود مند ہو گا اور وہ اس کو اپنا بیٹا بنائیں گے.

(اس میں) صریح حق بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اچھی تربیت ہو اور اس کو فرعون کے خوف سے مامون و محفوظ بنائے، اور اللہ کی یہ

---

[1] یہ سورۂ قصص کی ساتویں آیت کی طرف اشارہ ہے.

شان رہی ہے کہ جب کسی ملت یا حکومت کی ترقی چاہتا ہے تو اکثر اوقات ایک فاجر آدمی کے دل میں اس کے ذہن کے موافق ایک خیال ڈال دیتا ہے اور وہ شخص اس کا مرتکب ہوتا ہے، اس طرح حق تعالیٰ اپنی مراد کو پورا کرتا ہے کہ اس شخص کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تحقیق اللہ اس دین کو ایک فاجر و فاسق آدمی سے قوت دیتا ہے[1]

پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل فارغ ہوا[2] اس لئے کہ وہ الہام الٰہی کی مناسب طور پر تابعدار ہو کر طبیعت کے احکام سے جدا نہ ہوئی تھی اس لئے وہ سوچ میں پڑ گئی اور اس نے یہ سمجھا کہ اس سے تدبیر میں خطا واقع ہوئی ہے اس سے پہلے کہ موجیں صندوق کو کہیں لے جائیں اس پر صندوق کی تلاش ضروری تھی، لیکن خدا نے اس کے دل کو مضبوط کیا، پھر کبھی تو وہ یہ کہتی تھی کہ شاید خدا وہی کرے جس کی مجھے آرزو ہے اور کبھی اس راز کو بے قرار ہو کر فاش کرنا چاہتی تھی۔

---

[1] یہ صحیح بخاری کی ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے، اصل روایت حضرت ابوہریرہ رض سے مروی ہے کہ ہم خیبر (کی لڑائی) میں حاضر ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کے حق میں جو مدعیٔ اسلام تھا، فرمایا کہ "یہ شخص جہنمی ہے"۔ لڑائی کے موقعہ پر اس شخص نے دشمنوں سے سخت لڑائی لڑی اور شدید زخمی ہو گئے، اس شخص کے بظاہر اس مجاہدانہ کارنامے کو دیکھ کر بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شخص کے حق میں کہی ہوئی بات میں شک کرنے لگے لیکن ہوا یہ کہ جب اس زخمی شخص نے شدید درد کو محسوس کیا تو خودکشی کر لی اور لوگوں نے دوڑ کر آپؐ کو اس کا سارا قصہ سُنایا، تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ اعلان کرنے کا حکم فرمایا کہ "جنت میں مؤمن ہی داخل ہوتا ہے۔ بیشک اللہ دین کو فاجر آدمی سے تائید دیتا ہے۔ (صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۰۶۔ اصح المطابع)

[2] سورۂ قصص کی آیت ۱۰ کی طرف اشارہ ہے۔ [3] سورۂ قصص آیت ۱۱۔

پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ والدۂ موسیٰ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہوں اور وہی موسیٰ کی پرورش کرے اور فرعون سے بے خوف ہو کر ان کو دودھ پلائے۔ تاکہ یہ امر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے زیادہ مناسب اور ان کے نسب کے لئے مزید استحکام کا باعث اور ملتِ حنیفی کو اپنے لئے مذہب قرار دینے کے لئے زیادہ قریب ہو، تاکہ حضرت موسیٰ کی والدہ سمجھ لے کہ یہ بات جو اس کے سینے میں ڈالی گئی ہے وہ درحقیقت اس کے پروردگار کی طرف سے الہام تھا، اس طرح وہ اپنے رب کی فرماں بردار اور اس کی شکر گذار ہو جائے تاکہ یہ بات اس کے کمال میں اس کے لئے زیادہ نفع بخش ہو، تب اللہ تعالیٰ نے یہ تقریب فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہر کسی کا دودھ پینا حرام کر دیا آپؑ نے کسی بھی دودھ پلانے والی عورت کی چھاتی کو منہ نہ لگایا۔ ہر دودھ کو بدمزہ سمجھنے لگے یہاں تک کہ وہ لوگ عاجز آگئے، پھر جب ان کو موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق علم ہوا (اور وہ دودھ پلانے کے لئے بلائی گئیں) تو ان کا دودھ انہیں خوش گوار معلوم ہوا، اور یہ دودھ پلانے والی مقرر ہوئیں۔

پھر حضرت موسیٰؑ اپنے عقل اور علم میں بڑھتے گئے اور ان پر ان کی فطرت کھلتی گئی یہاں تک کہ جب اپنی قوت کو پہنچے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت اور علم عطا فرمایا اور وہ احکامِ الٰہی کی تاویل سمجھ گئے اور ملأ اعلیٰ سے منصبغ (اور مستفیض) ہونے کے لئے تیار ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی تربیت سے خلاصی دینے اور اس سے نجات دینے کا ارادہ فرمایا تاکہ وہ (فرعون سے جدا ہو کر) اپنے علم اور ہدایت میں کامل ترین انسان ہوں، کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے تھے جن پر ان کی فطرت کا انشراح مؤمنوں کی صحبت سے کمال کو پہنچتا ہے اور فرعونی لوگوں کی صحبت اور ان کی چال وچلن حضرت موسیٰؑ کو (اس کمال تک پہنچنے سے) مانع تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے (ان کو فرعون سے الگ رکھنے کے لئے) ایک ایسی تقریب فرمائی جو ان کی عصمت سے بھی نہ ٹکراتی تھی اور (وہ یہ تھی کہ) حضرت موسیٰؑ اصلاح کے لئے ایسے دو۲ شخصوں کے بیچ میں پڑ گئے جو ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، اور اس سے ظالم کی تادیب مطلوب تھی، آخر آپؑ کے ہاتھ سے وہ مر گیا اور انہوں نے اس زبان

سے جو اس دور میں متعارف تھی، اللہ سے بخشش مانگی اور اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل پر جو پردہ تھا اس کو ہٹا دیا ۔ یہ پردہ اس لئے ہوا تھا کہ انہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ میں نے گناہ کیا ہے، ورنہ وہ تو اس قتل میں اللہ کے امر کے خادم اور مطیع تھے ، لیکن اس وقت کی زبان اور اس کے حال کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اس راز کو نہ سمجھے اور وہ شرعی حکم ان پر مشتبہ رہے جس کو وہ شریعت سے جانتے تھے تب وہ ڈر گئے ۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی زبان سے جس کی حضرت موسیٰ ع نے مدد کی تھی اور اس پر احسان کیا تھا ایسی چیز کہلوادی جس میں ان کی ہلاکت کا خوف تھا ، یہ خدا کی طرف سے ایک تدبیر تھی تاکہ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نکل جائے اور اس کی نعمت سے امید اٹھالے اور یہ اس طرح ہوا کہ اس شخص نے موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے کہ "تو واضح گمراہ ہے" یہ سمجھ رکھا کہ حضرت موسیٰ اسے پکڑنا چاہتے ہیں ۔ پھر یہ خبر پھیل گئی اور شہر میں مشہور ہوگئی اور فرعون غصہ ہوا ، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مخبر سے ایسی بات کہلوادی جو انہیں مصر سے نکل جانے پر برانگیختہ کرے ۔

پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مَدیَن کی طرف سوا کسی زادِ راہ ، سواری اور رہنما کے چلے اور اپنا کام اللہ کو سونپا اور اس پر توکّل کیا تو اللہ نے ان کی حفاظت اور رہنمائی کی اور جب مدین کے پانی پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا سبب فرمایا جس سے ان کا مدین میں رہنا ممکن ہوجائے اور وہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ ڈال دیا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو بلا کسی معاوضے کے پانی پلائے ۔ اور دوسری طرف شعیب علیہ السلام اور ان کی دو بیٹیوں کے دل میں حضرت موسیٰ ع کے حق میں رغبت پیدا کی کیوں کہ وہ طاقت ور اور امانت دار تھے اس لئے ان کو گلہ بانی کے لئے مقرر فرمایا اور وہ بھی یہی چاہتے تھے ۔

(حضرت شعیب ع نے ان سے کہا کہ کوئی عصا لے لو) خدا نے حضرت موسیٰ ع کو اس لاٹھی کے اٹھانے کی ہدایت فرمائی جس کے انبیاء علیہم السلام ایک دوسرے کے بعد وارث ہوتے آتے تھے اور اس میں برکت تھی ، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کی طرف

نکلے اور یہ سفر بظاہر تو اپنی قوم کی محبت کی وجہ سے تھا لیکن فی الحقیقت اس سے اللہ امرِ رسالت کو پورا کرنا چاہتا تھا اور جب حضرت موسیٰؑ علیہ السلام وادی طویٰ کو پہنچے، (اور یہ برکت والی وادی تھی جہاں ملائکہ کی روحیں جمع ہو گئی تھیں) تو خدا نے ایک تقریب فرمائی، حضرت موسیٰؑ کو آگ اور راستہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی بی بی کو دردِ زہ شروع ہوا (اس وقت) سردی ہو گئی اور راستہ (بھی) بھول گئے۔ پھر جب اس وادی میں ایک بیری کے درخت کے پاس پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ایک ایسی عجیب تجلی فرمائی کہ اس جیسی تجلی اس سے قبل دوسرے کے لئے نہ ہوئی تھی اور وہ یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ (مقدس ملائکہ کی جماعت) میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بالمشافہہ خطاب کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ طبیعت کے سخت، بہادر اور غیور تھے تو آپؑ کی طبیعت نے اس جگہ پے در پے آگ کا تصور کیا اور اس پر اللہ تعالیٰ نے آگ کی صورت کا افاضہ کیا اور یہ آگ عناصر کی قسم سے نہ تھی لیکن خالص عالم مثال کی چیز تھی، اسی طرح خدا نے ملاء اعلیٰ کی زبان پر آگ کے اندر حضرت موسیٰؑ سے رو برو کلام کیا، (اس کو دیکھ کر) حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے، اللہ نے اس کو مانوس کیا اور ان سے فرعون کی طرف جانے اور اس کو ایمان کی طرف بلانے کا حکم فرمایا اور ان کو عصا اور روشن ہاتھ کا معجزہ دکھایا۔

اب ان دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عالم مثال کا ظہور کبھی ایسے موجود کی صورت میں ہوتا ہے جس کا کسی بھی موجودِ طبیعی مانند آگ کے کوئی ربط نہیں ہوتا، اسی طرح عالم مثال کبھی جسم طبیعی میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کو مثال کا حکم دیا جاتا ہے اور اس پر مثالی ہستی غالب آتی ہے تب وہ ناسوتی مثالی عصا بن جاتا ہے[1] اور اس کی دو[2] شاخیں اژدہے کے دونوں جبڑوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہاتھ میں چمک تھی وہ بعینہٖ نور ہو گیا، اور اس دور میں جادو انسانی حواس میں تصرف کرنے کا نام تھا یہاں تک کہ لوگ اجسام طبیعی میں وہ اوصاف اور عوارض خیال کرتے تھے جو درحقیقت ان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ پھر ظاہر ہوا حق اس جیسی صورت میں، اور جادو باطل تھا کیونکہ وہ ایسا تخیل ہے

---

[1] یعنی عالم مثال اور عالم ناسوت دونوں سے اس کو بہرہ ملتا ہے۔

جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اور یہ (عالم مثال سے آنا) حق ہے کیوں کہ اس کی اصل ہے۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ تمام عنایات جو ان پر ہوتی تھیں کھول کر بتائیں مثلاً جس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کو وحی فرمائی اور جس وقت ان پر اپنی محبت ڈالی، اسی طرح اس وقت سے لے کر اس حالت تک[1]۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو علم عبادت کے اصول سکھائے اور فرعون پر دلائل سے غلبہ پانے کا علم۔ موسیٰؑ نے بہت چیزوں کے متعلق اللہ تعالیٰ سے سوال کئے، جیسے اس کی زبان سے لکنت کی گرہ کا نکلنا اور ان کے بھائی (ہارون) کو ان کے لئے وزیر مقرر کرنا۔ حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ سوال کئے تھے اللہ تعالیٰ نے وہ سب ان کو عطا کیا۔

پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مقابلہ شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کی ان کے حق میں (بے انداز) عنایتیں تھیں اس لئے کہ وہ اللہ کے پیارے اور پسندیدہ تھے اور اس کی کچھ نشانیاں بھی تھیں جیسے فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کا ہونا۔

ان عنایات اور آیات میں سے ایک یہ تھی کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کے پروردگار کے متعلق پوچھا تو حضرت موسیٰؑ نے اس کا واضح آیات ہی سے جواب دیا، کیوں کہ ذات باری کی پہچان تھوڑے لوگوں کے سوائے دوسروں کو نہیں ہوتی، اور احکام الٰہی عام اور سب لوگوں کو شامل ہیں۔ فرعون نے معجزہ طلب کیا تو آپؑ کی عصا اژدھا بن گئی اور آپؑ نے جب ہاتھ نکالا تو کسی عیب کے سوا چمکتا نظر آیا اور انہوں نے جادوگروں کو عاجز کر دیا اور حق واضح ہو گیا۔

---

[1] یہ مضمون سورت طٰہٰ کی آیت ۳۸ سے شروع ہو کر آیت ۴۱ تک ختم ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2543

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

محمد سرور پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

جلد نمبر ۵ ماہ اکتوبر ۱۹۶۷ شمارہ نمبر ۵

بیادگار الحاج سیّد عبد الرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلّہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے

فی پرچہ:- اچھتر پیسے

نمبر ۵	ماہ اکتوبر ۱۹۶۷ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ	جلد ۵

فہرست مضامین

شذرات

متحدہ عرب جمہوریہ یعنی مصر میں اوقاف سے متعلقہ محکمے جو وہاں ایک مستقل وزارت - وزارۃ الاوقاف کے تحت ہیں، کیا کام کرتے ہیں اور ان کے کام کرنے کا طریقہ کیا ہے ؟ اُن کی تفصیلات ایک کتاب سے جو ہمیں قاہرہ سے ملی ہے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ مشرق قریب کے مسلمان ملکوں میں عرصۂ دراز سے اوقاف کا نظام موجود ہے۔ اور گو ترکی میں اتاترک کے برسر اقتدار آنے کے بعد اوقاف کی جداگانہ حیثیت ختم کر دی گئی، لیکن عرب ملکوں میں اوقاف کا مستقل نظام موجود ہے۔ اور تمام تر دینی اور فلاح عامہ کی سرگرمیاں اُس کے دائرہ کار میں داخل ہیں۔

۱۸۸۲ء میں مصر پر برطانیہ کا براہِ راست تو نہیں بالواسطہ قبضہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں حکومت مصر کے تمام محکمے انگریز افسروں کی نگرانی میں آگئے، لیکن ایک محکمہ اوقاف ایسا تھا جو اس نگرانی سے آزاد رہا اور بھلا بُرا جس طرح بھی ہو سکا، مصری اُسے چلاتے رہے۔

حالیہ سالوں میں متحدہ عرب جمہوریہ کے نظام اوقاف میں کافی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور اس کی افادیت اور کارکردگی کو موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے مطابق کرنے کے لئے اُسے بالکل نئے طریقوں پر ڈھالا گیا ہے۔ یہ نظام دو بڑے شعبوں پر مشتمل ہے۔ ایک دعوتِ اسلامیہ کا ادارہ عامہ اور دوسرا "مجلس اعلیٰ للشئون الاسلامیہ"۔

پہلے شعبے سے متعلق یہ کام ہیں، متحدہ عرب جمہوریہ کی تمام مساجد کی خواہ وہ حکومت کی تعمیر کردہ ہوں یا عام لوگوں کی، فعّال نگرانی۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں مسجد وہ مقام حاصل کرے، جو اُسے عہد نبوی اور صحابہ و تابعین کے دور میں حاصل تھا، یعنی "وہ عبادت گاہ بھی ہو، درس گاہ بھی۔ وہاں مسلمان مل کر صلاح و مشورہ بھی کریں، صدقہ و خیرات کا وہ مرکز ہو، اور اُس کے ذریعہ مسلمانوں میں تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کے کام ہوں"۔

اسی شعبے نے قرآن کی اشاعت، اُسے حفظ کرنے کی حوصلہ افزائی اور اُسے ریکارڈ کرنے کے کام بھی اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ اس کے لئے وزارتِ اوقاف نے کوئی دس لاکھ پونڈ کے خرچ سے قاہرہ کے ایک مرکزی مقام پر "دار القرآن" کے نام سے ایک شاندار عمارت تعمیر کی ہے۔ اس کے علاوہ مصر کے مشہور قاریوں کی قرأت کے ریکارڈ تیار کرائے ہیں، جو اندرونِ مصر اور باہر فراہم کئے جاتے ہیں۔

اسی شعبے کے ذمے یہ بھی کام ہے کہ وہ ملک کے اندر مختلف شہروں میں اسلامی کتابوں کی لائبریریاں قائم کرے، اور دوسرے ملکوں کو بھی اسلامی کتابوں کے عطیات دے۔ اس کے علاوہ یہ شعبہ وہ مسودات،

دستاویزیں، کتبے اور تصاویر وغیرہ بھی جمع کرتا ہے، جو عظیم اسلامی تاریخی ورثے کی حامل ہیں۔

یہی شعبہ دینی مواعظ کا انتظام کرتا ہے تاکہ لوگوں میں اسلامی شعور اُبھرے۔

نظام اوقاف کا دوسرا بڑا شعبہ 'مجلس اعلیٰ للشئون الاسلامیہ' کا ہے۔ اس کی سرگرمیاں پورے عالم اسلام کے لئے ہیں وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان دینی اور روحانی روابط استوار کرتا ہے، اور باہر سے اسلامی ملکوں کے جو وفد آتے ہیں، اُن کے استقبال اور عالمی اسلامی کانفرنسوں کے انعقاد کا انتظام کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس شعبے کی طرف سے دوسرے ملکوں کے ہزارہا مسلمان طلبہ کو وظیفے دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ مصر میں آکر تعلیم حاصل کرسکیں۔ نیز اس کے زیر اہتمام عربی اور دوسری زندہ زبانوں میں رسالے پمفلٹ اور کتابیں شائع ہوتی ہیں، اور یہ قرآن مجید کی تفسیر، احادیث کی جمع و تدوین اور مختلف مذاہب فقہ پر مشتمل جامع کتابوں کی ترتیب کا کام کر رہا ہے ۔ وزارتِ اوقاف کا ایک اور شعبہ بھی ہے، جو ایک لحاظ سے 'دعوت اسلامیہ' کی ایک عملی شق ہے اس شعبے کا کام بِرّ اور خیرات کا انتظام کرنا ہے۔ مریضوں کا علاج، فقراء و مساکین کی اعانت، یتیموں کی نگہداشت اور وہ خاندان جو محتاج ہیں، لیکن وہ اپنی احتیاج کو ظاہر نہیں کرتے، ان کی مدد۔ یہ فرائض بھی اس شعبے سے متعلق ہیں۔

یہ شعبہ اُن لوگوں کو، وہ خواہ ملازمین ہوں یا غیر ملازمین، جو حوادثِ زمانہ کا نشانہ بن جائیں یا اُن پر کوئی فوری مصیبت آجائے، بلا سُود قرض حسنہ دیتا ہے تاکہ وہ مجبوری میں سود خواروں یا دوسرے چال بازوں کے پنجے میں نہ آجائیں۔

مساجد کی دینی، روحانی، اخلاقی اور اجتماعی افادیت کے دائرہ کو وسیع تر اور مؤثر تر بنانے کے لئے وزارت اوقاف نے یہ انتظام کیا ہے کہ ائمہ مساجد کو اس امر کا مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی اپنی مساجد میں قرآن مجید کو حفظ کرانے (چونکہ اہل مصر کی زبان عربی ہے، اس لئے وہ قرآن کو حفظ کر کے براہِ راست اسے سمجھ سکتے ہیں) اور اس کی تعلیمات کو سمجھانے کے لئے حلقہ ہائے درس قائم کریں۔ اس وقت عام مساجد کے علاوہ کوئی اٹھارہ سو مسجدوں میں اس طرح کے حلقہ ہائے درس ہیں، ائمہ سے ان حلقہ ہائے درس کے متعلق رپورٹ مانگی جاتی ہے۔ اور اس ضمن میں اُن کے حُسنِ کار پر اُن کی ترقیاں ہوتی ہیں۔

متحدہ عرب جمہوریہ کی وزارتِ اوقاف قرآن مجید کی نشر و اشاعت پر بہت زیادہ خرچ کرتی ہے۔ اُسے اپنی "دار القرآن" کی اسکیم کو مالی اعتبار سے عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت سے ایسے اوقاف سے بڑی مدد ملی۔

جو عہدِ گزشتہ میں ان کے واقفین نے "قرأتِ قرآنی" کے ضمن میں وقف کئے تھے۔ مثلاً بہت سے ایسے وقف تھے، جن کی آمدنی سابق شاہی خاندان کے افراد کی قبروں پر قرآن کی تلاوت کرنے والوں پر صرف ہوتی تھی۔ پھر ایسے وقف بھی تھے کہ ان کی آمدنی وقف کرنے والوں کی قبروں پر پھول چڑھانے میں صرف ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں کئی ایسے اوقاف کی آمدنیاں بھی "دارالقرآن" کی مد میں لے لی گئیں، جن کے وقف ناموں کی شرائط از کار رفتہ ہو گئی تھیں۔

حکومت نے قانون کے ذریعہ ایسے اوقاف کے وقف ناموں کو جو اس زمانے کی روح کے منافی تھے، منسوخ کرکے ان کی آمدنی دوسری مدّوں میں لے لی ہے۔ مثلاً بعض وقف تھے جن کی آمدنی کُتّوں کے لئے پانی پر صرف ہوتی تھی۔ بعض وقف ناموں میں یہ لکھا تھا کہ اُن کے اوقاف کی آمدنی تُرکی لشکر پر صرف ہو۔ اب یہ آمدنی مصری لشکر پر صرف ہوتی ہے — غرض واقفین کے وقف کرنے کی جو اصل غرض تھی، اُس کی روح کو پیشِ نظر رکھ کر اوقاف کی آمدنیوں کو نئی مدّوں میں خرچ کیا جا رہا ہے۔

مصر میں تو اوقاف کا کوئی حد و حساب نہیں۔ اور اُن کی سالانہ آمدنی کروڑوں پونڈ ہے۔ اس لئے وہاں اوقاف کی ایک مستقل وزارت قائم ہے، جس کی سرگرمیاں بڑی وسیع و عریض ہیں۔ لیکن ان برسوں میں مصر کی وزارتِ اوقاف نے جہاں اوقاف کی آمدنیوں کا صحیح استعمال کرنے کا طریقہ نکالا، وہاں اس نے ایک اور کام بھی کیا ہے۔ جسے ہمارا محکمۂ اوقاف اپنے لئے دلیلِ راہ بنا سکتا ہے۔

ہمارے سامنے وزارتِ اوقاف مصر کی بارہ سالہ رپورٹ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۳ء تک اوقاف نے ۶۶۳۰ فلیٹوں پر مشتمل کوئی ساٹھ بڑی عمارتیں بنائیں۔ یہ عمارتیں موقوفہ زمینوں پر بنائی گئیں۔ اس سے ایک تو اوقاف کی آمدنی میں اضافہ ہوا، دوسرے متوسط، نچلے متوسط اور غریب طبقوں کو رہنے کے لئے مکانات مل گئے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان عمارتوں پر کوئی اکسٹھ لاکھ چالیس ہزار پونڈ صرف ہوئے۔

مغربی پاکستان کے بعض بڑے بڑے شہروں میں ایسی بہت سی موقوفہ زمینیں ہیں، جن میں محکمہ اوقاف رہائشی مکانات بنا کر اپنی آمدنی بڑھا سکتا ہے اور بے گھر لوگوں کو کرائے کے مکانات مہیا کر سکتا ہے۔

تفسیر فتح العزیز
چند حقائق کی روشنی میں

جناب محمد عضد الدین خاں صاحب ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح کے علمی کارناموں میں ان کی تحفہ اثنا عشریہ اور تفسیر فتح العزیز دو اہم تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر اپنے موضوع پر یقیناً حرف آخر ہے، اور اس لحاظ سے شاہ صاحب کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بھی انتہائی علمی اہمیت کی حامل ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تحفہ سے اہم ہے، شاہ صاحب رح کی گوناگوں علمی و ادبی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ اسی تفسیر سے ہوتا ہے۔ وہ اس تفسیر میں بیک وقت نحوی بھی نظر آتے ہیں اور متکلم بھی، محدث بھی اور صوفی بھی، فقیہ بھی اور ادیب بھی۔ اس کے علاوہ اس تفسیر میں نظم قرآنی اور دوسرے تفسیری نکات جتنے خوب صورت پیرائے میں ملتے ہیں، شاید ہی کسی ہندوستانی تفسیر میں اس وقت تک بیان کئے گئے ہوں، اسی لئے خود شاہ عبدالعزیز صاحب رح بھی اس معرکۃ الآراء تفسیر پر فخر و مسرت محسوس فرماتے تھے، چنانچہ اپنے شاگرد مرزا حسن علی محدث کے ایک خط کے جواب میں جو اصل میں تحفہ اثنا عشریہ کے معترضین کے جواب کے سلسلے میں تھا، تحریر فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔۔ و مع ہذا جائے طعن معاندان و حاسدان وقتے متوجہ

فقیر می تواند شد کہ ایں فقیر دعوی تصنیف ایں کتاب موجبِ افتخارِ خود دانستہ تقریرًا و تحریرًا بقلم زبان یا بزبانِ قلم کردہ باشد معلوم است کہ ایں کتاب را تصنیف حافظ غلام حلیم ابن شیخ قطب الدین احمد ابن شیخ ابوالفیض نوشتہ ام اگر منظور دعوے نسبت ایں کتاب بخود می بود چرا ایں قدر اخفا بنا ئےہائے غیر معروف بعمل می آوردم بلکہ حالا ہم ہرگز بہ نسبت ایں کتاب بطرف خود خوش نمی شوم آرے اگر تفسیر فتح العزیز و امثال ایں تصانیف را اگر بہ فقیر نسبت کنند موجب شادمانی خاطر میگردد[1]۔"

ان کی اس اہم تفسیر کے سلسلے میں دو متضاد روایات ملتی ہیں۔ بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے یہ تفسیر مکمل نہیں کی تھی، بلکہ شروع کے سوا پارے سے کچھ زیادہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر فرمائی تھی۔ اور بعض شواہد سے اس کا قوی گمان ہوتا ہے کہ یہ تفسیر اگر لکھی گئی تو مکمل ہی لکھی گئی۔ اس مضمون میں اصل حقیقت کی تلاش کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ تفسیر ۴۹ برس کی عمر میں ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء میں لکھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ صاحب متعدد موذی امراض کا شکار ہو چکے تھے، اور ان کی بصارت بھی تقریبًا جاتی رہی تھی، جیسا کہ انہوں نے خود تفسیر کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے۔ تفسیر لکھنے کا سبب خود شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان کے مطابق مولانا شاہ فخر صاحب کے مرید شیخ مصدق الدین عبداللہ کی خواہش اور ان کا شوق تھا، چونکہ بصارت اس وقت تقریبًا زائل ہو چکی تھی اس لئے تفسیر کو خود لکھنے کے بجائے املا فرمایا تھا[2]۔

یہ تفسیر غیر مکمل پائی جاتی ہے یعنی اس میں صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی شروع کی ۱۸۴ آیتوں "وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" تک کی تفسیر ہے جو سوا پارے سے کچھ زائد پر مشتمل ہے، اس کے بعد آخر کے دو پاروں کی تفسیر ہے جو متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

---

[1] مجموعۂ فتاویٰ عزیزی جلد اول ص ۱۳۷۔ [2] تفسیر فتح العزیز (مقدمہ) ص ۳۔

اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی یا پورے قرآن شریف کی؟ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی جتنی کہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ صرف اتنی ہی تفسیر قلمی یا مطبوعہ شکل میں ملتی ہے اور یہ گمان بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تھی جس کا بیشتر حصہ کسی وجہ سے ضائع ہو گیا، کیونکہ ان کی کوئی اور تصنیف ضائع نہیں ہوئی، ایسی حالت میں صرف اسی تفسیر کے حصوں کا ضائع ہو جانا قرینِ قیاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مختلف تذکرہ نگاروں نے بھی عام طور پر یہی لکھا ہے کہ یہ تفسیر نامکمل رہی۔ چنانچہ مولوی رحمان علی (۱۲۴۴ھ تا ۱۳۲۵ھ) نے اپنی کتاب تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی لکھا ہے۔

مقالاتِ طریقت میں بھی جو شاہ صاحب کے حالات میں اہم تذکرہ ہے، صراحت سے مذکور ہے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی میں اس تفسیر کو مکمل نہ کر سکے، اس لئے ان کے شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی (ف ۱۲۹۹ھ) صاحب منتہی الکلام نے نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال کی خواہش پر اس کو ستائیس جلدوں میں مکمل کیا۔ صاحبِ مقالاتِ طریقت کا کہنا ہے کہ انہوں نے خود اس تفسیر کو دیکھا ہے[1]۔

مگر یہ عام خیال کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی جتنی آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے، مندرجۂ ذیل وجوہ سے بہت کمزور اور مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) شاہ عبدالعزیز صاحب کی مختلف عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ

---

[1] مقالاتِ طریقت از عبدالرحیم ضیاء حیدرآباد ۱۲۹۲ھ ص ۳۳ - راقم الحروف کو حیدر علی صاحب کی تفسیر کی یہ تمام جلدیں دستیاب نہ ہو سکیں، صرف آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں اس کے چند اجزاء ملے جن میں کسی طرح کا مقدمہ یا کوئی عبارت نہیں ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تفسیر کا تکملہ ہے۔

انہوں نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ ان کے فتاوی میں جابجا ایسی سورتوں کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں جو اس وقت قلمی یا مطبوعہ شکل میں نہیں پائے جاتے، مثلاً یہاں چند عبارتیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک جگہ تفسیر کے سلسلے میں پوری بات لکھنے کے بعد یہ لکھتے ہیں:

... نقلاً عن مسودۃ فتح العزیز	فتح العزیز کے مسودہ سے یہ عبارت نقل
فی سورۃ آل عمران قولہ تعالیٰ	ہے جو سورۂ آل عمران کی تفسیر میں
قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا	قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا
فقط۔[1]	کے تحت مذکور ہے۔

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے:-

"و ایں فقیر در تحت آیت اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ[2] تحقیق نفیس نوشتہ کہ ایں وقت نقل آں بسبب دور افتادن مسودات متعذر است[3]۔"

ایک جگہ سورہ حدید کی آیت ھُوَالَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ کی تفسیر کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:-

"چنانچہ تفصیل آں دفعات در سورۂ سجدہ مذکور است و در تفسیر فتح العزیز شرح آں بوجہ مستوفی مذکور شد چوں ایں وقت حواس درست نبود نقل از مسودات آں ممکن نشدہ[4]۔"

اسی طرح فتاوی کی دوسری جلد کے صفحہ ۴۳ پر یہ عبارت ملتی ہے:-

من تفسیر فتح العزیز فی سورۃ النساء	تفسیر فتح العزیز میں سورۂ نساء کی آیت
تحت قولہ تعالیٰ کُلَّمَا نَضِجَتْ	کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ

---

[1] فتاوی عزیزی۔ ج دوم (مجتبائی پریس دہلی ۱۳۱۴ھ) ص ۴۹۔

[2] یہ آیت سورہ قصص یعنی بیسویں پارے میں ہے۔

[3] فتاوی عزیزی ج دوم ص ۶۱۔ [4] ایضاً

جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ۔ | جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ) ۔۔۔۔

اسی کے دوسرے صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے:-

"ایضًا منها (ای من تفسیر فتح العزیز) من سورۃ الصافات من باب اسرار القصص تحت قوله وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ o اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ o ۔۔۔۔۔ سنفصل لك تفصیلاً لا یقافی تفسیر سورۃ الزخرف انشاء الله تعالیٰ۔ | اور یہ عبارت بھی تفسیر فتح العزیز کی سورۃ الصافات میں اسرار القصص کے ذکر میں قرآن شریف کی آیت ولقد سبقت الخ کی تفسیر سے ماخوذ ہے۔۔۔ ۔۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ اس امر کی مناسب تفصیل سورہ زخرف کی تفسیر میں بیان کروں گا۔

اس کے علاوہ انہی فتاویٰ کے صفحہ ۳۶ پر مندرجۂ ذیل عبارت ملتی ہے:-

من تفسیر فتح العزیز تحت قوله تعالیٰ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً فان قلت ما السر فی ان الادعیة الواردة فی الکتاب العزیز کلها مصدرة بقوله رَبَّنَا الانادرًا ۔۔۔۔ | تفسیر فتح العزیز میں آیت رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر یہ خیال ہو کہ کیا وجہ ہے کہ قرآن شریف میں بعض کو چھوڑ کر جتنی دعائیں ہیں سب رَبَّنَا سے شروع ہوتی ہیں۔۔

یہ بات عجیب ہے کہ اس وقت تفسیر فتح العزیز کا جو حصہ مطبوعہ شکل میں ملتا ہے وہ مذکورہ بالا آیت یعنی رَبَّنَآ اٰتِنَا الخ سے سولہ آیت پہلے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اس وقت مطبوعہ تفسیر میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۴ تک کی تفسیر ہے اور یہ آیت اس تفسیر کی آخری آیت سے سولہ ۱۶ آیتوں کے بعد ملتی ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یقیناً تفسیر فتح العزیز مکمل کر لی تھی، اسی لئے انہوں نے اس کے حوالے اپنے خطوط میں لکھے ہیں جو آج فتاویٰ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

فتاویٰ عزیزی کی مندرجہ بالا عبارات کی تصدیق ایک دوسری کتاب سے ہوتی ہے جس کا نام ہے افاداتِ عزیزیہ[1]، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد شاہ رفیع الدین مراد آبادی نے مختلف قرآنی موضوعات پر شاہ عبدالعزیز صاحب کے خیالات کو خود شاہ عبدالعزیز صاحب کی زندگی ہی میں ایک جگہ کتابی صورت میں جمع کیا تھا، جس کا نام انہوں نے "افاداتِ عزیزیہ" رکھا تھا۔ یہ خیالات زیادہ تر خود شاہ صاحب کی ہی عبارت میں تھے جو انہوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کو خطوط کی شکل میں لکھے تھے۔ اس کتاب کے مقدمے میں یہ عبارت ملتی ہے :-

"فرید دہر و وحید عصر .... شاہ عبدالعزیز سلمہ اللہ تعالیٰ ... تفسیرے مسمے بفتح العزیز تالیف نمودہ وہنوز مسودات آں بہ بیاض نہ رسیدہ وتحقیقات بسیار ولطائف بے شمار دراں محرر شدہ لیکن پنج علم باستقلال باآں مخصوص است اول عنوانات سور وضبط مضمون ہر سورہ اجمالاً۔ دوم ربط آیات بعضہا مع بعض۔ سوم متشابہات القرآن۔ چہارم اسرار القصص والاحکام۔ پنجم لطائف نظم قرآن۔ ومصنف سلمہ اللہ تعالیٰ بفقیر محمد رفیع الدین جستہ جستہ نمونہ از ہر پنج علم در مکاتیب نوشتہ وبعض سوالہا کہ فقیر ازاں استفسار نمودہ جوابہا آں در مکاتیب نوشتہ اند ہمہ آنرا دریں اوراق نقل کردہ شد"

مندرجہ بالا عبارت سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہی صاحب نے اس کتاب کا نام "اَسْوِلَہ وَاَجْوِبَہ" تحریر فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو ان کا مضمون سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (الفرقان مئی ۱۹۶۷ء)۔ حالانکہ اس کا اصل نام افاداتِ عزیزیہ ہے، انہوں نے اس نسخہ کو مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی بتلایا ہے۔ شاید دونوں کے سلسلے میں مولانا کو تسامح ہوا۔ دار العلوم ندوہ کے کتب خانے میں جہاں سے مولانا نے عبارت لی ہے، اس کے دو نسخے اسی افاداتِ عزیزیہ کے نام سے موجود ہیں۔

قرآن کی تفسیر لکھی تھی، ورنہ شاہ رفیع الدین صاحب اس کا ضرور ذکر فرماتے، یا کم از کم تفسیر کے متعلق وہ الفاظ نہ لکھتے جو انھوں نے لکھے ہیں، اس کے علاوہ خود اس کتاب میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کی ان سورتوں کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں جو آج کل قلمی یا مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہیں جن سے اس کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر یقیناً مکمل کر لی تھی۔ اس کتاب کی اکثر عبارتیں عربی میں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ رفیع الدین صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ عربی میں تھے، اسی لئے انہوں نے تفسیر فتح العزیز سے ضروری مقامات کا ترجمہ یا خلاصہ عربی ہی میں دیا ہے۔
اس کتاب کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر فتح العزیز شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات سے بہت پہلے یعنی ۱۲۰۸ھ کے قریب مکمل ہو چکی تھی، اس لئے کہ افاداتِ عزیزیہ کے مرتب شاہ رفیع الدین صاحب کا انتقال ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۲۳ھ[1] میں ہوا ہے، اور خود اس کتاب کے اندر ایک دو جگہ جو تاریخیں ملتی ہیں۔ مثلاً ۲۸ صفر ۱۲۱۵ھ یا جمعہ ۱۹ صفر ۱۲۱۵ھ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر ۱۲۱۵ھ سے پہلے مکمل شکل میں تحریر ہو چکی تھی، جبھی شاہ صاحب ان کے حوالے ۱۲۱۵ھ کے خطوط میں دیتے ہیں[2]۔

---

[1] ان کی تاریخ میں اختلاف ہے، تذکرہ علمائے ہند میں ۱۲۱۸ھ اور نزہۃ الخواطر میں ۱۲۲۳ھ ہے۔

[2] مولانا نسیم احمد فریدی امروہی صاحب اپنے حالیہ مضمون "سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ملفوظات" میں جو جولائی کے الفرقان میں شائع ہوا ہے ملفوظات کے مندرجہ ذیل قطعے سے عجیب و غریب نتیجہ نکالتے ہیں، وہ قطعہ یہ ہے :-

جامعِ علم و عمل، شیخ الورٰی عبدالعزیز — آنکہ او اندر جوانی کارِ پیراں می کند
بسکہ استمداد، دارد از سحاب معنوی — بحر مواجے است چوں تفسیرِ قرآں می کند

اس قطعہ کا ترجمہ لکھنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:" اس قطعہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے تفسیر فتح العزیز جوانی کے زمانے میں لکھی تھی"۔ (الفرقان جولائی ۱۹۶۷ء ص ۳۰)۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اس کے علاوہ ایک اور قدیم اور نایاب تذکرہ یعنی مقالاتِ طریقت کی روایت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تھی، مقالاتِ طریقت میں صفحہ ۳۲ پر یہ عبارت ملتی ہے :-

"حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔"

یہ ہیں دو طرح کی متضاد روایات جن سے ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر نہیں بلکہ شروع کے سوا پارے کے قریب اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر لکھی اور دوسری طرف چند روایات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یقیناً پورے قرآن شریف کی تفسیر لکھی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی کتاب میں دو طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً مقالاتِ طریقت میں ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) پتہ نہیں مولانا نے آخری مصرعے سے تفسیر فتح العزیز کی تصنیف کا نتیجہ کیسے نکالا۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جب قرآن شریف کی تفسیر بیان فرماتے ہیں تو گویا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر معلوم ہوتے ہیں، اس سے بیانِ تفسیر مراد ہے نہ کہ تصنیف۔ اگر مولانا کی رائے مان لی جائے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے خود مقدمے میں جو سنہ تالیف یعنی ۱۲۰۸ھ دیا ہے، غلط ہو جائے گا اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ بات بھی غلط ہو جائے گی کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی جو ابھی بیاض تک نہیں پہنچی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب نے ۱۲۰۳ھ میں سفر حرمین سے واپسی کے بعد افاداتِ عزیزیہ کی ترتیب ۱۲۱۵ھ کے بعد کی ہے، اگر انہوں نے جوانی ہی میں اسے تحریر فرمایا تھا تو اس وقت تک تو پوری تفسیر شائع ہو جانی چاہیئے تھی، جس طرح تحفہ خود شاہ صاحب کے زمانے ہی میں شائع ہو گئی۔ اس کے علاوہ جوانی میں اگر یہ تفسیر لکھی جاتی تو اس کے مقدمے میں صحت کی خرابی، مختلف بیماریوں کی وجہ سے سخت ذہنی انتشار کا اس قدر ذکر نہ فرماتے۔ اس لئے اس طرح کے نتائج نکالنے میں احتیاط کرنی چاہیئے۔

تفسیر مکمل نہیں کی تھی، اور مولانا حیدر علی فیض آبادی نے اس کا تکملہ کیا، دوسری طرف یہ روایت ہے کہ اکبرآباد کے قاضی کے یہاں پورے قرآن مجید کی تفسیر موجود ہے، مگر وہ چھپی نہیں؟ آخر یہ تضاد کیا اور کیسے ہوا؟ اور ان متضاد روایات میں کس کو صحیح سمجھا جائے، اور ان میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

اس سے پہلے کہ ہم اس تضاد کے وجوہ اور تطبیق کی صورتوں پر غور کریں۔ ایک اہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تو کیا ان کی مکمل تفسیر کا کوئی مطبوعہ یا قلمی نسخہ اس وقت کہیں پایا جاتا ہے؟ راقم الحروف کو ہندوستان کے بیشتر مشہور کتب خانوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر کسی میں مکمل تفسیر نہ مل سکی، البتہ دو چیزیں ایسی ملیں جو شاہ صاحب کی تفسیر سے متعلق ہو سکتی ہیں، پہلی چیز ایک تفسیر کے چند صفحات ہیں جو قلمی شکل میں کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوہ) کے کتب خانے نمبر ۲۷ کے تحت موجود ہیں، جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نام سے منسوب ہے، یہ سورہ مائدہ کی تیسری آیت سے ۳۷ ویں آیت تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اور مخطوطہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:-

"تمام شد تفسیر چند آیات سورہ مائدہ تصنیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہشتم جمادی الاول روز پنجشنبہ در لکھنؤ در عمل نصاری ۱۲۷۰ھ
الحمد للہ رب العلمین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علی محمد خیر خلقہ و اصحابہ اجمعین۔"

دوسری چیز ایک مطبوعہ تفسیر "تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی" ہے یہ تفسیر مجھے اپنے ایک محترم بزرگ مولانا مسیح الزماں صاحب قاسمی کے ذاتی کتب خانہ میں ملی ہے، جو سورۃ المؤمنون سے لے کر سورۂ یٰسین تک کی فارسی تفسیر اور ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، مگر سنہ طباعت درج نہیں ہے، البتہ کتاب کے مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں شائع ہوئی ہے۔ اس وعظ کے مرتب شاہ صاحب کے

ایک شاگرد مولانا ابو الفرید امام الدین[۱] صاحب ہیں۔ چنانچہ شروع میں اپنے حالات اور شاہ صاحب سے اپنا تلمذ اور شاہ صاحب کے سلسلے میں ایک مثنوی لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :-

"چوں معمول قدیم آں سر حلقہ ورثۃ الانبیاء بود کہ روز سہ شنبہ وجمعہ درسِ قرآن وحدیث می فرمود و ربط سور وآیات بیک دگر بصد ہزار نکات بتوضیح تام دلنشین ہر خاص وعام شدی و اسرار احادیث علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بتشریح تمام مفہوم ہر وضیع وشریف گشتہ بندہ بہ تحریر تقریر دلپذیرش کمر ہمت چست بربستم وبایں سعادت عظمیٰ از سورہ مؤمنون تا والصّافات بہرہ ور گشتم، چوں کل امر مرہون باوقاتہا در سنہ یک ہزار و دوصد وپنجاہ ونہ ہجری مسودہ مذکورہ را نظر ثانی نمودم ومرۃ بعد اولےٰ بہ تسویدش زنگ حسرت از دل احبار زدودم۔ ابیات

شنیدم آنچہ در ہر درس تقریر نمودم جستہ للہ تحریر
ندارم خواہش اجرت من از کس امید اجر دارم از خدا بس

اس کتاب کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ درحقیقت یہ شاہ صاحب کے درس کے نوٹ ہیں جنھیں امام الدین صاحب نے دوران درس میں قلمبند کیا ہے، اسی وجہ سے مفصل نہیں ہے۔ مگر انداز بالکل وہی ہے جو تفسیر فتح العزیز کا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ فتح العزیز مفصل ہے اور مستقل تصنیف اور وعظ عزیزی ان کے درس کا خلاصہ ہے۔

---

[۱] مولانا سید عبد الحیٔ لکھنوی، صاحب نزہۃ الخواطر ان کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی نسبت کی وجہ سے ان کا لقب بھی حجۃ اللّٰہی پڑ گیا تھا، اس لئے کہ شاہ صاحب کو اس وقت لوگ حجۃ اللہ کہا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۷۵-۷۶) ان ہی امام الدین صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی شاہ صاحب کی کتابیں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔

"وعظِ عزیزی" میں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ فتاویٰ عزیزی میں جو عبارتیں تفسیر فتح العزیز سے متعلق ملتی ہیں، جن میں سے چند کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے، وہ عبارتیں اس وعظِ عزیزی سے ماخوذ نہیں ہیں، گو وعظِ عزیزی میں بھی بعض اس طرح کی باتیں ملتی ہیں مگر بہت مختصر اور الفاظ بھی بالکل مختلف ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عبارتیں اسی سے لی گئی ہیں۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاہ صاحب نے غالباً اپنے درس میں پورے قرآن مجید کی تفسیر فرمادی تھی جس کا ایک حصہ امام الدین صاحب نے قلمبند کر لیا تھا، جو شایع ہو گیا ہے۔ ممکن ہے ان کے شاگردوں میں سے کسی اور نے بھی اس طرح سے درس کے نوٹ لئے ہوں، اس کے بعد شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید یا کم از کم اس کے زیادہ حصے کی تفسیر درس میں یا وعظ میں فرما دی ہو، تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ بعد میں لوگوں کے اصرار پر اسے املا بھی کرا دیا ہو، جب کہ واقعہ بھی ہے۔ کیونکہ تفسیر فتح العزیز جو اس وقت مطبوعہ شکل میں موجود ہے وہ املائی[1] ہے۔

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب تاریخِ مشائخ چشت میں صفحہ ۴۹۲ پر فرماتے ہیں کہ "مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں تفسیر عزیزیہ کا ایک قلمی نسخہ (کتبہ ۱۲۴۹ھ) ہے۔ شیخ مصدق الدین جو شاہ فخر صاحب کے مرید تھے شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس تفسیر میں شریک ہوتے تھے اور جو کچھ سنتے تھے "لفظ بلفظ اورا در سلک تحریر کشیدند" (ص ۲)۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب اس مجموعہ کو ملاحظہ فرمایا تو ایک مقدمہ لکھا۔"

پتہ نہیں پروفیسر نظامی صاحب نے یہ کیسے نتیجہ نکالا کہ شیخ مصدق الدین صاحب جو کچھ شاہ صاحب کے درس میں سنتے تھے اس کو لکھتے گئے اور بعد میں اس مجموعے کو دیکھ کر شاہ صاحب نے اس پر مقدمہ لکھ دیا۔ حالانکہ خود اس مخطوطہ میں اور اس طرح اور تمام مطبوعہ نسخوں میں لفظ بلفظ اورا در سلکِ تحریر کشیدند سے پہلے یہ عبارت بھی موجود ہے۔۔۔

"تفسیرے بلغت فارسی بحسب روزمرہ متعارف ایں دیار (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اب آئیے خود تفسیر فتح العزیز کے مقدمے کو دیکھیں، اس مقدمے میں شاہ صاحب حمد وثنا اور اپنا تعارف جیسا کہ کتاب کے شروع میں لکھا جاتا ہے، کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:-

"در سنہ یک ہزار و دوصد وہشت از ہجرت مقدسہ نبویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ والف الف تحیۃ بجاذبہ شوق وداعیہ عزم برادر دینی[1] جوہر نتیجہ حق گزینی سالکِ راہِ خدا جوئے ملازم طریقۂ صدق گوئی مقبول جناب عالی قباب خلائق مآب مولانا وبالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس سرہ الامجد شیخ مصدق الدین عبداللہ وفقہ اللہ لمایحبہ ویرضاہ . . . . . کہ اولاً برائے ایضاح معانی سورۂ فاتحۃ الکتاب و دوسیپارہ آخرین از حضرت قرآن مجید نفعنا اللہ بآیاتہ فی الدنیا والآخرہ کہ اکثر مسلمین درصلوٰۃ خمسہ وجمعہ وجماعات ومحاضر

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) واستعمال تمثیلات رائج ایں روزگار وحذف تطویلات لاطائل اہل عربیت واسقاط توجیہات بعیدہ مبنیہ بر روایات بے وثاق املا نمود وآں برادر دینی لفظ بلفظ اورا درسلک تحریر کشیدند" نظامی صاحب کو شاید اس سلسلے میں سہو ہوا۔

[1] نظامی صاحب مشائخ چشت میں اسی صفحہ پر مذکورۂ بالا سطور کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں: "اس میں ایک جگہ مصدق الدین کی شاہ فخر صاحب سے نسبتِ ارادت کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح نام لیتے ہیں: " برادر دینی جوہر . . . . . حق گزینی، سالک راہ خدا جوئی، ملازم طریقۂ صدق گوئی مقبول جناب مولانا عالی جناب خلایق مآب وبالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس سرہٗ الامجد"

اس سلسلے میں بھی غالباً نظامی صاحب کو غلط فہمی ہوئی، اس لئے کہ برادر دینی سے صدق گوئی تک کی عبارت شیخ مصدق الدین صاحب کی تعریف میں ہے، اس کے بعد مولانا عالی قباب سے شاہ فخر صاحب کی نسبت ذکر ہے۔ اصل مسودہ میں عبارت "مقبول جناب مولانا عالی قباب" ہے نہ کہ "عالی جناب"

ارواحِ مقدسہ انبیاء و اولیاء و زیارتِ قبورِ صلحا و عرفا بتلاوت ایں سورہا تشرف و استعداد می نمایند و تعطش بدریافت مضامین آنہا بہم میرسانند وثانیاً باستیناف از سورہ بقرہ کہ بحکم سہ

شربت الحب کأسًا بعد کأسٍ فما نفد الشراب ولا رویت

مزید رغبت بحل حقائق و دقائق کلام الٰہی قرار دادہ اند تفسیرے بلغت فارسی بحسب روزمرہ متعارف ایں دیار و استعمال تمثیلات رائج ایں روزگار و حذف تطویلات لاطائل اہل عربیت و اسقاطِ توجیہاتِ بعیدہ مبنیہ بر روایات بے وثاق املا نمود۔"

اگر مقدمے کی مندرجہ بالا عبارت کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے دو اہم نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) یہ مقدمہ اس وقت لکھا گیا ہوگا جب تفسیر موجودہ صورت میں لکھ کر تیار ہوگئی ہوگی۔

(۲) کم از کم سورہ بقرہ کی تفسیر مکمل لکھی گئی ہوگی۔

مگر عجیب اتفاق ہے کہ تفسیر فتح العزیز کے پہلے حصے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صورت نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تفسیر سورہ بقرہ کے ۲۳ ویں رکوع کی دوسری آیت کی تفسیر کرتے کرتے اچانک ختم ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ آخری جملہ بھی مکمل نہیں ہو سکا۔ وہ آخری اور نامکمل جملہ یہ ہے:۔

"و در ترمذی ونسائی و دیگر کتبِ معتبرۂ حدیث از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روایت آوردہ کہ حق تعالیٰ حضرت یحییٰؑ پیغمبر را بپنج چیز حکم فرمودہ بود کہ خود ہم بداں عمل نمایند و بنی اسرائیل را نیز بفرمایند تا موافق آں عمل کنند حضرت یحییٰ علیہ السلام بنا بر تمرد بنی اسرائیل در اظہار آں احکام توقف فرمودند حضرت عیسٰی علیہ السلام را وحی شد کہ بحضرت یحییٰؑ بگویند کہ حق تعالیٰ شمارا"

اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی جتنی کہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے، تو شاید اس کا کوئی جواب نہیں ہے کہ شاہ صاحب نے اس

رکوع یا کم از کم اس آیت ہی کی تفسیر کیوں نہ مکمل کر دی، جسے انہوں نے شروع کیا تھا، یا آخری جملہ کیوں نہ مکمل کر دیا جس کا بڑا حصہ لکھ چکے تھے؟ اس کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد شاہ صاحب اچانک بیمار پڑ گئے اور اس کے بعد انتقال ہو گیا ہو گا، اس لئے کہ خود اس مقدمے کے مطابق شاہ صاحب نے یہ تفسیر ۱۲۰۸ھ میں لکھی اور شاہ صاحب کا انتقال اس کے ۳۱ برس کے بعد ۱۲۳۹ھ میں ہوا۔ اس اکتیس سال کے دوران اتنا تو بہرحال ہو سکتا تھا کہ وہ جملہ یا وہ رکوع مکمل کر سکتے تھے، حالانکہ مقدمہ کو لکھنے سے پہلے امید یہی کی جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے سورہ بقرہ تو ختم ہی کر لی ہو گی اس لئے کہ ناتمام جملہ لکھ کر یہ طے کر لینا کہ اب اس کے آگے نہ لکھا جائے گا اور مقدمہ لکھ کر بات ختم کر دینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تصانیف کے اصل یا کم از کم ان کے زمانے کے قلمی نسخے نہیں ملتے، جو بھی ملتے ہیں سب بعد کے ہیں، مجھے اس سلسلے میں سب سے قدیم جو قلمی نسخہ تفسیر فتح العزیز کا مل سکا ہے وہ ۱۲۴۹ھ کا مکتوبہ ہے یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں محفوظ ہے، اس کے مقدمے میں سورہ بقرہ کی تفسیر سے متعلق جو جملہ عام طور پر مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے، مجھے نہیں ملا۔ بلکہ یقین سا ہو چلا ہے کہ شاید یہ جملہ بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں مذکورہ بالا حقائق کو سامنے رکھ کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:-

شاہ عبد العزیز صاحب نے جیسا کہ مقدمہ سے ظاہر ہے، غالباً پہلے سورہ فاتحہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر شیخ مصدق الدین کو املا کرائی، مگر بعد میں لوگوں کے اصرار پر یہ خیال ہوا ہو گا کہ پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے، چنانچہ انہوں نے سورہ بقرہ سے اس کو شروع کیا اور اٹھائیسویں پارے کے آخر تک پوری تفسیر لکھوا دی۔ پھر مختلف عوارض نے اس کام پر نظر ثانی کرنے اور اس کو آخری شکل دینے کی مہلت نہ دی اور معاملہ آج کل آج کل پر ٹلتا رہا، مگر تفسیر کا پہلا مسودہ تیار ہو چکا تھا، اس لئے اپنے خطوط میں اپنے احباب

کو اس کا حوالہ دیتے رہے، جیسا کہ فتاویٰ کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ رفیع الدین مرادآبادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی مگر وہ مسودہ بیاض تک نہیں پہنچا، یعنی آخری شکل میں نہیں آیا، مگر مسودہ پورا ہو چکا تھا اس لئے شاہ صاحب اس کے اقتباسات اپنے احباب کو عند الضرورت لکھ دیتے تھے، لیکن مسودہ آخری شکل میں نہیں آیا تھا، اس لئے سب لوگوں تک یہ کتاب نہیں پہنچ سکی اور اس کی مختلف کاپیاں نہ ہو سکیں غالباً شاہ صاحب کا خیال رہا ہوگا کہ اگر طبیعت سنبھل گئی تو اس پر نظر ثانی کر کے آخری شکل دے دیں گے، مگر اس کا موقع نہ مل سکا، اور یہ مسودہ آخری وقت تک اسی شکل میں پڑا رہا، اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ اسی لئے اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف چند لوگوں ہی کو اس کا علم تھا۔ اسی دوران میں غالباً یہ بھی ہوا کہ شاہ صاحب کی وفات اور پھر شاہ اسحٰق صاحب اور شاہ محمد یعقوب صاحب کی ہجرت کے بعد یہ اصل مسودہ کسی طرح ضایع ہو گیا، اور اس کا صرف اتنا ہی حصہ مل سکا جو آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے، غالباً یہی وجہ اس آخری جملے کے نامکمل رہ جانے کی ہے، ممکن ہے اس کی کوئی کاپی مقالاتِ طریقت کے شائع ہونے کے وقت تک جیسا کہ خود اس کے مصنف کا خیال ہے اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود رہی ہو، مگر ناشروں کو صرف نامکمل اور ناقص کاپی مل سکی اسی کو انہوں نے شائع کر دیا، پورا مسودہ کچھ دنوں میں ضائع ہو گیا، اور چونکہ سورہ بقرہ کی اس آیت کے بعد سے تفسیر کا کوئی حصّہ نہ مل سکا، اس لئے غالباً نواب سکندر جہاں بیگم نے مولانا حیدر علی فیض آبادی سے اس کا تکملہ لکھوایا۔ بہرحال جو صورت بھی ہوئی ہو، اغلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، اس کے بعد کیا ہوا، اس کا صحیح علم نہ ہو سکا، اس لئے اس سلسلے میں قیاس ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سامنے بھی غالباً مذکورہ بالا شواہد اور قرائن تھے، جن کی بنا پر انہوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے قرآن مجید کی پوری تفسیر لکھی تھی، جس کا بیشتر حصہ غدر کے دوران ضائع ہو گیا، وہ اپنی

معرکۃ الآرا تصنیف نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:۔

و اما مصنفاتہ فاشہرھا؛ تفسیر القرآن المسمی بفتح العزیز صنفہ فی شدۃ المرض و لحوق الضعف املاءً وھو فی مجلدات کبار ..... ضاع معظمھا فی ثورۃ الھند وما بقی منھا الا مجلدان من اول و آخر۔	ان کی تصنیفات میں سب سے مشہور ان کی قرآن شریف کی تفسیر ہے، جس کا نام فتح العزیز ہے، اس تفسیر کو انہوں نے سخت بیماری اور ضعیفی کے زمانے میں املا فرمایا تھا اور وہ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی ..... جس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کے غدر کے زمانے میں ضائع ہوگیا اور صرف شروع اور آخر سے دو جلدیں باقی رہ گئیں۔
(نزہۃ الخواطر، جلد ۷، ص ۲۷۳)	(بشکریہ معارف)

اعلم العلماء، افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، اعرف العرفاء، اشرف الاماثل، فخر الاماجد والاماثل، رشک سلف، داغ خلف، افضل المحدّثین، اشرف علماء ربّانیّین، مولانا و بالفضل اولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرّہ العزیز کی ذات فیض سمات ان حضرت بابرکت کی فنون کسبی و وہبی اور مجموعہ فیضِ ظاہری و باطنی تھی، اگرچہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ہندسہ و ہیئت کو خادم علوم دینی کا کر کر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبوی و تفسیرِ کلام الٰہی اور اعلائے اعلام شریعتِ مقدسہ حضرت رسالت پناہی میں مصروف فرماتے تھے۔

(آثار الصنادید۔ سرسید احمد خاں)

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصہ اوّل

مبادیات اخلاقیات

مصنف :- ڈاکٹر عبد الواحد ہالی پوتہ

مترجم :- سید محمد سعید ایم اے

باب ۶

شخصی زندگی کے کردار کے اصول

اخلاقیات کی جو شاخ، شخصی زندگی کے کردار کے شعبہ سے تعلق رکھتی ہے اس میں وہ کردار بھی شامل ہوتا ہے جو ایک فرد اپنی ضروریات کی تسکین کے لئے اختیار کرتا ہے۔ جو اُس کی شخصی بقاء، بہبودی اور ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

فرد کی ضرورت

ہر فرد کی ابتدائی ضروریات یہ ہیں :- خوراک کی ضرورت، تحفظ کی ضرورت، زن وشو کی رفاقت اور ولادت کی ضرورت لیکن جیسا کہ فرد ارتقاء کے ساتھ فروغ پاتا ہے تو اُس کی دوسری ضروریات میں اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً جمالیاتی، ذہنی اور روحانی ضروریات، جو ایک فرد کی بقاء و بہبود کے لئے لازمی ہوتی ہیں لیکن وہ اِن ضروریات کو حاصل کرنے کی راہ میں، دوسرے افراد کے حقوق کو نہ تلف کرتا ہے اور نہ ہی خطرہ میں ڈالتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے جن ضروریات کا تذکرہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(الف) ایک شخص کی طبعی بقاء کی ضروریات :-

۱- خوراک کھانا پینا -

۲- تحفظ، کپڑے (لباس) اور مقام رہائش (مکان) -

۳- شریک ضروریات:- صفائی، نیند، بیماری میں امداد و علاج -

(ب) زیب و زینت کی جمالیاتی ضروریات -

(ج) اپنے ہم جنسوں میں میل جول یا معاشرتی خلط ملط کی شخصی ضروریات - دوسرے الفاظ میں یہ حسب ذیل ضروریات ہیں:-

۱- دوسرے رفیق انسانوں کے درمیان چلنا پھرنا، ملنا جلنا اور باہمی سلوک -

۲- رفاقت اور تصورات کا مبادلہ، اور باہمی تبادلۂ خیال کرنا -

(د) شادی اور ولادت یا ازدواجی تعلقات -

اخلاقی کردار

پس شخصی کردار جب اخلاقی طور پر زیرِ غور آتا ہے تو یہ ایک فرد کے اس کردار میں ہوتا ہے جو نہایت مستعدی کے ساتھ اپنی اعلیٰ تر ضروریات کی تسکین کو پس پشت ڈالے بغیر، متذکرہ بالا ضروریات کی تسکین کرتا ہے اور یہ اعلیٰ تر ضروریات اُس کی ذہنی تمدنی اور روحانی ضروریات ہیں - ایک مقام پر شاہ ولی اللہؒ نے اِسی تصوّر کو بیان کیا ہے جسے ذیل کے الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے:-

"ایک شخص کا موزوں کردار یا اخلاقی کردار، اِس کردار میں ہوتا ہے جو اس کی ابتدائی ضروریات کو سات اخلاقِ فاضلہ (دیانت اور السمتہ الصالح یعنی بہتر کارکردگی، یکسانیت اور تقدس کی عادات سمیت) کی مطابقت کرتے ہوئے نہایت اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ تسکین کرتی ہیں اور وہ اس کے ساتھ رائے کلّی اور معاشرہ کی تاریخِ ماضی سے حاصل شدہ تصوّرات، مشاہدات اور رجحانات کا بھی پورا خیال رکھتی ہیں۔"

طبعی ضروریات

اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ کے مباحث کے تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شخصی کردار کی بنیاد نہ صرف طبعی ضروریات (ضروریاتِ علاج و صحت کے سمیت) کی تسکین میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ دوسری ضروریات کی بھی تسکین میں پائی جاتی ہے جس کے لئے سہولت کے پیشِ نظر نفسیاتی ضروریات

کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

نفسیاتی ضروریات ان میں بنی نوعِ انسان کی یہ ضروریات شامل ہوتی ہیں مثلاً ذہنی ترقی، تمدنی شائستگی اور روحانی کمال کی ضروریات، جمالیاتی صفت کی ضروریات، پیدائشی وصف کے محرکات کی ضروریات یا سات اخلاقِ فاضلہ کی صلاحیتیں، عام جذبات، تحریکات، جوش و ہیجانات کی ضروریات، تمدنی اور روحانی رجحانات۔ شخصی کردار کی اخلاقیات کا معیار یہ ہے کہ ان کی تصدیق ایک ساتھ طبعی و نفسیاتی دونوں اسباب کی بنیاد پر کی جا سکے۔ اگر کردار کے کسی نمونے کی صرف طبعی اسباب کے تحت تصدیق کی جا سکے گی اور دونوں اسباب کے تحت نہیں ہوگی تو یہ یقیناً کردار کی ایک غیر موزوں شکل ہوگی اور اِسی لئے غیر اخلاقی ہوگی۔

معاشی ضروریات ان ضروریات میں معاشی ضروریات بھی شامل کر لینا چاہئیں جن کا مقصد اعلیٰ معیارِ زندگی ہے۔ انسانی معاشرہ میں اس کے افراد کی ضروریات کی تسکین ان کی طبعی ضروریات کی تسکین سے مراد ہے اور جو بہتر معاشی حالات پیدا کرنے کے بعد انہیں اُن کی تسکین کے قابل بناتی ہے اور اُن کی نفسیاتی ضروریات کی تسکین جو ایک اعلیٰ معیارِ زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک بہتر ذہنی اور علمی حالت پیدا کرکے تسکین کے قابل بنائی جاتی ہیں۔ اِسی لئے معاشرتی ضروریات دونوں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے طبعی اور نفسیاتی ضروریات دونوں میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ یہاں یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ ان ضروریات کی تسکین کو ایک اعلیٰ معیارِ زندگی کے سبب اعتدال کے اضافی غور و فکر سے نہ صرف طبعی طور پر، بلکہ جمالیاتی، ذہنی اور روحانی طور پر اعلیٰ بنایا جا سکتا ہے۔

عام اصولوں اور معیارات کے مختصر بیان کے بعد یہ مناسب ہوگا کہ شخصی اخلاقی کردار کے نفاذ کے بارے میں بحث کی جائے۔

خوراک شاہ ولی اللہ کے بیان کے مطابق جو اخلاقی کردار، ضرورتِ خوراک کی تسکین سے تعلق ہے وہ سب سے پہلے یہ بتاتا ہے کہ روزی صحیح طور پر

حاصل کی جائے اور پھر نہ صرف خورد و نوش کے طریقے بلکہ خورد و نوش کی اشیاء اور اُن کی عمدگی کی پسند، طرزِ خدمت اور برتنوں کی ساخت کا سامان بھی اہمیت رکھتا ہے۔

خوراک کی نوعیت اور برتنوں کی پسند کو مستثنیٰ کرتے ہوئے، باقی کے متذکرہ نکات کردار کی اخلاقی یا موزوں شکلوں سے تعلق رکھتے ہیں جو طبعی اور نفسیاتی دونوں اسباب پر مصدقہ ہوتے ہیں اور خوراک کی قسم اور برتنوں کی پسند کے بارے میں اخلاقی کردار اصولِ اعتدال اور معاشی بہبودی پر قائم ہوتی ہے نیز اُسی نفسیاتی اصول کے مطابق ہوتی ہے جس کے تحت سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال اور انتہائی پر تکلّف کھانے بھی قابلِ اعتراض ہو جاتے ہیں کیونکہ ان سے طمع، نخوت اور شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ خورد و نوش کی اشیاء کی پسند میں طبی نقطۂ نگاہ بھی شامل ہوتا ہے جو اس حقیقت پر مبنی ہوتا ہے کہ خورد و نوش کی اشیاء اور طریقے اس قسم کے ہوں کہ جو نہ صرف انسانی ضروریات کی تسکین کر سکیں لیکن بحیثیت مجموعی جسم کی نشو و نما کرتے ہوں اور انسانی جسم کی عام عضویاتی نظام کے مطابق ہوں۔ اس پسند کے نفسیاتی اسباب بھی ہیں جو بنی نوعِ انسان کے عام احساسات، جذبات اور جمالیاتی مذاق کی بنیاد پر ملتے ہیں جو انسانوں کو ناپاک خوراک اور ایسے حیوانات جو فضلہ اور سڑی ہوئی چیزیں کھاتے ہیں اور اُن کی عادتیں گندی ہوتی ہیں، کے گوشت کے استعمال سے باز رکھتے ہیں کیونکہ یہ اشیاء انسانوں کے لئے انتہائی مضر ہوتی ہیں اور اس کے رجحانِ طبیعت کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔

خورد و نوش کے طریقے، علمِ صحت کے اسباب رکھتے ہیں جو ہاتھ مُنہ کی صفائی اور اُس جگہ اور اُن برتنوں کی صفائی کا تقاضا کرتے ہیں جن میں اشیائے خورد و نوش رکھی جاتی ہیں۔ ان کے بعض طبعی اسباب بھی ہوتے ہیں جیسے پُر امن طرزِ عمل اور نشست کا مناسب طریقہ۔ نفسیاتی طریقے اچھے آداب وصفات کا تقاضا کرتے ہیں جو کہ طمع و بیہودگی جیسی برائیوں کے اظہار سے روکتے ہیں۔ اور ایسے طرزِ عمل سے باز رکھتے ہیں جو ساتھ خورد و نوش کرنے والوں کے دلوں میں بدمزگی، ناپسندیدگی یا حسد کے جذبات پیدا کریں۔

منشیات کے استعمال کے خلاف شاہ ولی اللہؒ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ معاشی

خوش حالی اور نفسیاتی ضروریات دونوں کی بنیاد پر ہیں۔ نشہ آور اشیاء کا استعمال نہ صرف صحت کے لئے خطرہ ہوتا ہے بلکہ جو لوگ ان کے عادی ہو جاتے ہیں یہ عادت اُن کی آمدنی اور معاشرہ پر ایک فاضل معاشی بار ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ان کی پاکیزگیٔ اطوار (سمت) اور ذہن و دماغ کی صفائی پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ لہٰذا نشہ آور اشیاء نہ صرف انسانی صحت بلکہ معاشرتی نفسیاتی اور معاشی اسباب کی بناء پر اس کو غیر موزوں کردار میں مبتلا کر دیتی ہیں اور یہ اسی لئے غیر اخلاقی کردار ہے۔

لباس اور مقام رہائش

شاہ ولی اللہ کے یہاں لباس اور مقام رہائش (مکان) کی اخلاقیات، انسان کے طبعی تحفظ اور اس کی جمالیاتی اور نفسیاتی کے تقاضوں کے مطابق ہے جو اِن دونوں اداروں کے مطابق انسانی ذہن کا رجحان ترتیب دیتے ہیں۔

طبعی ضروریات کے پیشِ نظر، لباس اور مقام رہائش ایسے ہونا چاہئیں جو طوفان و موسم کے خلاف تحفظ دے سکیں اور مقام رہائش میں ایک اور گنجائش ہونی چاہیئے کہ اِن میں خلوت و تنہائی ہونے کے علاوہ چور اچکوں کی دست بُرد سے صاحبِ مکان کی املاک بھی محفوظ رہیں۔

جہاں تک نفسیاتی ضروریات کا تعلق ہے لباس اور مقام رہائش صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان کے وصفِ حیاء کا تحفظ ہو سکے۔ اُن سے خلوت کے ساتھ بیرونی مداخلت نہ ہو۔ اس کے علاوہ اِن دونوں سے ایک انسان کے اخلاقِ فاضلہ مثلاً سماحت (فیاضی و عالی ظرفی) ظاہر ہو اور بخیلی و کم ظرفی کا مظاہرہ نہ ہو اور انسان میں عظمت و احترام کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہوں۔ لباس کے لئے ایک موزوں کپڑے کی پسند اور لباس کا پر عظمت طرز، ذہن کے اُن رجحانات کے اثرات کا نتیجہ نہیں ہونا چاہیئے جو عالی ظرفی اور پاکیزگیٔ اخلاق کے خلاف ہوں۔ ایسے لباس کو نہیں اپنانا چاہیئے جو امارت پرستی، نخوت، خود نمائی اور انتہائی طرب و مسرت کا اظہار کریں۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کی پسند اور استعمال کے غیر صحت مند اثرات انسانوں کے ذہن پر غلط اثر ڈالتے ہیں اور وہ غیر موزوں و غیر اخلاقی

کردار میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ ترین تعمیراتی نمونے اور پرشکوہ مصوّری کسی مکان کے رہنے والے افراد کے ذہنوں میں جھوٹی شان وشوکت کا جذبہ پیدا کرسکتے ہیں اسی لئے یہ اشیاء وعمل غیر اخلاقی ہوتے ہیں۔

جمالیاتی ونفسیاتی ضروریات جو انسان کے ذہن میں پیدائشی طور پر ہوتی ہیں کے اسباب کی کمی کی بناء پر شاہ ولی اللہؒ انسان کو اچھے اور موزوں لباس پہننے اور خوبصورت وآرام دہ مکانات میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن معاشی اسباب اور معاشی بہبود کے لوازمات کے پیشِ نظر وہ لباس ومکان دونوں معاملوں میں اعتدال پسندی کی تلقین کرتے ہیں۔

جہاں تک کہ لباس میں امتیاز جنس کا تعلق ہے، شاہ ولی اللہ اسے مرد وعورت کے طبائع وسیرت پیدائشی رجحانات اور مخصوص فرائض کی بنیاد پر درست ٹھہراتے ہیں۔ نازک، رنگین اور عورتوں کی پسند کے کپڑے مردوں کے لئے موزوں نہیں ہوتے جو اُن کے لئے غیر موزوں اور غیر اخلاقی لباس ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایک مرد مستقلاً عورتوں کے فیشن کے نرم ورنگین کپڑے پہننے کا عادی ہوجائے تو اُس سے اس کے مردانہ مزاج کا انداز بگڑ جاتا ہے، اسی طرح یہ عورتوں کے لئے ہمیشہ غیر موزوں ہوتا ہے کہ وہ مردوں کی طرح کھردرے کپڑے پہنیں جس میں اُن کے حسن اور شائستگی کا معمولی خیال بھی نہ رکھا گیا ہو۔

زیب وزینت

یہاں اس معاملہ کے جمالیاتی پہلو پر کچھ کہنا مناسب ہوگا جیساکہ شاہ ولی اللہ نے اسے ایک بڑے عنوان 'زینت اور تجمل' کے تحت بیان کیا ہے۔ ایک شخص کے لباس یا مکان یا اس کی زیب وزینت کے تصوّرات کو شاہ ولی اللہؒ نے اپنے مخصوص نفسیاتی اسباب کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے جسم کو نشانات سے 'گودنا'، کھال کو گرم لوہے سے 'داغنا'، یا زیب وزینت کی خاطر جسم کو کسی طرح 'بگاڑنا'، یہ سب طریقے، طبعی اور طبی دونوں لحاظ سے جسم کے لئے موزوں نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ تہذیب وشائستگی کا تقاضا ہے۔

زیب وزینت کی حمایت میں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی طبائع کے جمالیاتی پسند

عنصر میں پیدائشی طور پر ہوتی ہے اور یہ کہ اوصافِ سماحت وعظمت اور پاکیزگی اخلاق و اطوار کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص موزوں، پُرعظمت اور شائستہ وضع قطع میں نظر آئے۔

ذاتی زیب و زینت میں ضرورت سے زیادہ مبتلا ہونے کے خلاف نفسیاتی اسباب کی بنار پر کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں مثلاً ضرورت سے زیادہ ذاتی تزئین و آرائش سے ایک شخص 'خود سے محبت' کے مرض میں مبتلا ہو جائے اور اس کے ساتھ خود پسندی، امارت اور نخوت وغیرہ کی خرابیاں بھی وابستہ ہوتی ہیں جو انسانی عظمت و سماحت اور 'رائے کلی'، جیسے اخلاقِ فاضلہ کی ضد ہوتی ہیں زیب و زینت میں ضرورت سے زائد مبتلا ہونے سے معاشی نقصان بھی ہوتا ہے اُس کا کم سے کم یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کے لئے ایک بری مثال ہوتی ہے جس کی طرف انسان فطرتاً مائل ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح سے نام و نمود، خود نمائی و نخوت اور فضول خرچی کی معاشرتی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ کردار میں معیارِ اعتدال کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں جس کی متذکرہ بالا تمام اسباب کی روشنی میں تصدیق کی جاسکتی ہے۔

صفائی کردار کے بیان میں صفائی کا ذکر بھی شامل کرنا چاہیئے۔ صفائی میں جسم کپڑے اور مکانات کو دھونا اور صاف کرنا شامل ہوتا ہے۔ اس عادت کو 'خصال الفطرت' یا ایک عام انسان کی حفظانِ صحت کی عادات کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے نظامِ اخلاقیات میں اس کو حفظانِ صحت کی تفصیل تو بیان نہیں کرتے، البتہ وہ اپنے قارئین کو علم العلاج کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس ضمن میں مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ صفائی کے طریقوں (مثلاً وضو غسل وغیرہ) کی حمایت اور حفظانِ صحت کی دس عادات کی حمایت میں کافی نفسیاتی دلائل پیش کرتے ہیں۔ خصال الفطرت (اچھی عادتیں) انسانی مزاج کی جمالیاتی صفت میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے عام انسانی مزاج، گندگی اور غلاظت کو پسند نہیں کرتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کے جسم کی گندگی سے ایک قسم کی طبعی ذہنی اور روحانی غفلت و بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور

اس سے اس کے ذہن کی صفائی اور صلاحیت قبولیت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور اس کا اثر زیادہ تر سستی و غفلت میں ظاہر ہوتا ہے اور گہرے ذکر و فکر کے وقت یہ غفلت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

رفع حاجت کرنا یا ہاتھ منہ دھونا، جسم کے کسی حصہ سے خون یا پیپ وغیرہ کا رسنا، اور ہم خوابی و ہم بستری وغیرہ سے ذہن پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ان اثرات سے بچنے کے لئے صفائی کا زیادہ عمدہ و مکمل طریقہ 'غسل' کی ضرورت ہوتی ہے اس کے علاوہ دوسرے قسم کے صاف کرنے اور دھونے کے طریقے اور وضو باقی ماندہ اثرات کی پاکیزگی کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ نیند بھی ذہن پر ایسی ہی سستی و غفلت کا اثر پیدا کرتی ہے جس کے اثرات کو دور کرنے کے لئے نہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

نفسیاتی جوش و احساسات بھی جو صفائی کے مخصوص طریقوں کے لئے ترقی پاتے ہیں، صفائی کے طریقوں میں سے ایک ہیں، جن کی بنیاد پر شاہ ولی اللہؒ نے حفظانِ صحت کی عادتوں کی حمایت کی ہے۔ بعض حالات میں لوگوں کے ذہن اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک وہ خود کو اُن طریقوں کے مطابق پاک و صاف نہ کرلیں جو اُن کے معاشرہ میں رائج ہیں۔

نیند | شاہ ولی اللہ نے نیند کے بارے میں جس کردار کی حمایت کی ہے اس کے طبعی و نفسیاتی اسباب کے تحت تصدیق کی جاسکتی ہے ایک بار پھر شاہ صاحب یہاں طبعی اسباب کی تفصیل بیان نہیں کرتے ہیں۔ البتہ ایک مقام پر وہ یہ ہدایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کو اپنی بائیں کروٹ پر سونا چاہیئے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح سونا زیادہ آرام دہ ہے اور جگر و ذہن کے فعل کی بیداری کے لئے زیادہ بہتر ہے۔

جیسا کہ نیند نہ صرف طبعی آرام کے لئے ضروری ہوتی ہے بلکہ ذہنی آرام کے لئے بھی ضروری ہوتی ہے اس لئے شاہ ولی اللہؒ نے ذہن کو منتشر خیالات سے جو نیند میں خلل انداز ہوتے ہیں پاک کرنے کے بعض خاص طریقے بھی بیان کئے ہیں۔

بیماری | بیمار ہونے کی صورت میں مناسب علاج کرانے کے بارے میں شاہ ولی اللہ

کی تجویزوں کو طبعی علاج اور نفسیاتی علاج کی اقسام کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے طبعی علاج میں طبی علاج شامل ہوتا ہے اور اس میں شاہ ولی اللہ، مخصوص دعاؤں اور آیاتِ قرآن کے ذریعہ نفسیاتی علاج بھی شامل کر دیتے ہیں جو اُن کے نزدیک بڑا سکون پہنچاتا ہے، وہ ایسے طریقے بھی تجویز کرتے ہیں جو ذہن کے صبر و سکون کو تکلیف یا بیماری کے دوران بحال و محفوظ رکھتے ہیں اور ان کی بنیادیں فطرتاً نفسیاتی ہوتی ہیں۔

اشتراکِ عمل کے اطوار

معاشرہ کے دوسرے افراد کے ساتھ معاشرتی میل جول اور اشتراکِ عمل جن کے لئے ایک فرد مجبور ہے۔

شاہ ولی اللہ نے اس عمل کو شخصی ضروریات کی تلاش و جستجو اور بنی نوع انسان کے مزاج میں اجتماعی جبلت کے وجود پر قائم کیا ہے۔ اس مقام پر شاہ صاحب نے اچھے طرزِ عمل اور عمدہ عادتوں کی بہت سی مثالیں دے کر اُن کی تصدیق کی ہے۔ چلنے کی صحیح شکل کے لئے انہوں نے طبعی اور نفسیاتی دونوں اسباب بیان کئے ہیں۔ طبعی سبب تو یہ ہے کہ انسانوں کو بے ہنگم اور سست چال سے آزاد ہونا چاہیئے۔ نفسیاتی سبب یہ ہے کہ بے ہنگم یا بے ڈھنگی چال بعض اعلیٰ اوصاف کے برخلاف، بداطوار کی دلالت کرتی ہے۔ جیسے جسم کے عضو کو جھٹکا دے کر چلنا یا تیز تیز چلنا، چلنے والے شخص کی حماقت یا مسخرہ پن کی علامت ہو سکتا ہے، یا چلنے کے مختلف طریقے انسان کے غرور و نخوت کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک دوسرے کو زبانی، برملا یا خوش خلقی کے طور پر پیش آنے یا سلام کرنے کی عادت شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانوں میں اعلیٰ صفات پیدا کرتی اور ان کو مستحکم کرتی ہے اور بڑوں سے محبت سکھاتی ہے، بڑے عہدے والوں کے لئے عزت و احترام کے احساسات کو فروغ دیتی ہے اور چھوٹوں کے معاملہ میں کمینگی اور گھمنڈ جیسی برائیوں کو ختم کرتی ہے اور یہ معاشرہ کے افراد کے درمیان باہمی محبت و اخوت پیدا کرتی ہے۔

تنظیم و سلام کے دوسرے منکسرانہ طریقوں مثلاً گھٹنوں کے بل جھکنے (جو ایران و روم کے شہنشاہوں کے درباروں میں عام تھا) کے خلاف شاہ ولی اللہ نے یہ دلیل

پیش کی ہے کہ یہ طریقے لوگوں کے ذہنوں کو غلامی اور شرک و کفر کی سطح پر لانے کے لئے رائج کئے جاتے ہیں اور ان سے انسان کے ذہن پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

آدابِ نشست و برخواست کے اطوار بھی انسان کی طبعی پاکیزگی، خوش خلقی اور معاشرتی دل آویزی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً کتے کی طرح پیٹ کے بل بیٹھنا، غرور اور نخوت کے انداز میں بیٹھنا یا اس طرح پیش آنا کہ جس سے دوسرے لوگوں کو شکایت پیدا ہو جائے یا مسخرہ پن سے پیش آنا وغیرہ متذکرہ بالا اسباب کی بنا پر کسی طرح درست نہیں ملاقات کے وقت پر خلوص اشارات کا تبادلہ اور توجہ آمیز سلوک کا مشاہدہ وغیرہ بھی ان ہی اسباب کی بنا پر درست نہیں۔

بات چیت کے دوران نرم گفتگو شاہ ولی اللہ کے بیان۔ "بات چیت کا انداز" کی بنیاد فراہم کرتی ہے لیکن وہ غرور و نخوت، خود پسندی اور خودستائی کی خرابیوں کے خلاف نفسیاتی طبائع کے تحفظ کے لئے فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی بات چیت "تصنع"، سخت لہجہ اور مشکل الفاظ کے غیر ضروری استعمال سے پاک وصاف ہونی چاہیئے۔ دوسروں کے دل میں محبت و خیر سگالی کو پیدا کرنا ان کے مراسم گفتگو کی بنیاد ہے۔ اور اسی لئے انسان کی بات چیت، غیبت، ہتک آمیز زبان، طنزیہ اور بہتان آمیز فقرہ اور نام بگاڑ کر پکارنے وغیرہ سے پاک وصاف ہونا چاہیئے۔

بیرونی اثرات سے ذہن کا تحفظ اِن کی اِس تلقین کی بنیاد فراہم کرتی ہے کہ ایک شخص کو غیر ضروری گفتگو، فضول باتیں، گپ شپ اور فحش کلامی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

ازدواجی تعلق

ازدواجی تعلقات میں ایک موزوں کردار شاہ ولی اللہ کے نزدیک حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی اسباب کی بنا پر پایا جاتا ہے۔

جنسی تسکین اور تولید کی خواہش اور بچے رکھنے کی عادت، بنی نوع انسان کی حیاتیاتی ضرورت سے متعلق ہے جس کی اگر صحیح طور پر تسکین نہ ہو تو نفسیاتی خرابیاں، انسانی مزاج میں بدمزگی اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے۔

جنسی خواہش کی تسکین کے غیر فطری طریقے اور رضامندانہ ضبطِ ولادت کا طریقہ،

متذکرہ بالا اسباب کی بنا پر غیر منصفانہ ہے یہی صورت حال ان غیر فطری طریقوں کے ذریعہ جنسی تسکین سے نجات پانے کے لئے ہے جیسے طبی علاج کرالینا یا "آختہ" ہوجانا وغیرہ، ان طریقوں سے ایک شخص ہمیشہ کے لئے جنسی تسکین کے لئے ناقابل ہوجاتا ہے۔

ایسے مجرم اور گنہ گار کی عمدہ صلاحیتوں پر ان طریقوں کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے معاشرہ کے دوسرے افراد کے درمیان اس کے باہمی تعلقات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں غیر منکوحہ عورت کے ساتھ 'زنا' اور حرام کاری کا رجحان بڑھتا ہے۔ اس لئے ایک قانونی ازدواجی معاہدہ کے بغیر مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات غیر موزوں، غیر معاشرتی اور غیر اخلاقی ہوتے ہیں۔ انہی اسباب کی بنیاد پر نکاح کے معاہدے اور ادارۂ نکاح کی تہذیب کو پسند کیا گیا ہے۔

ایک شخص کے شادی کے لئے نااہل ہونے کی صورت میں شاہ ولی اللہ "جنسی تحریک کے عذاب" کی شدت کو گھٹانے کے لئے بعض طریقے تجویز کرتے ہیں مثلاً فطری مزاج اور اس کی فطری تحریکوں کو خوراک اور روزے کے ذریعہ بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

(مسلسل)

مقالہ امثال القرآن للماوردی

کا

مختصر تعارف

جناب عبدالرشید قدیری

نوٹ:۔ مقالہ نگار کو اس مقالہ پر جامعہ سندھ کی طرف سے ڈی۔ فل کی سند عطا ہوئی ہے۔

مصنف ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی البصری الشافعی متوفی ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء بصرہ کے مشہور علماء سے ہیں۔ انہوں نے جہاں فقہی مسائل پر خامہ فرسائی کی ہے وہیں امثال پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اُن کی ایک کتاب الامثال والحکم ہے جس میں انہوں نے امثال عرب جمع کئے ہیں۔

مصنف کی امثال پر دو کتابیں دوسری کتاب امثال قرآن ہے جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اس میں انہوں نے ۳۲۔ امثال قرآنیہ کی عالمانہ توضیح فرمائی ہے۔ یہ ایک نادر مخطوطہ ہے جو دارالکتب مصریہ اور جامعہ بروصہ (ترکی) میں محفوظ ہے۔ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اُستاد قانون وقاضی اختر میاں صاحب مرحوم کی کوششوں سے ایڈیٹر کو یہ نسخہ ۱۹۵۷ء میں سندھ یونیورسٹی کے کتب خانہ سے مل گیا۔

مخطوطہ سے متعلق یہ مخطوطہ دیگر سات رسائل کے ساتھ منسلک ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

کتاب امثال القرآن تالیف ابی القاسم الحسن بن محمد بن حبیب المفسر النیشابوری المعروف بالماوردی رحمہ اللہ ...... وفیہ
کتاب لغات القرآن الکریم عن الفراء رحمہ اللہ . . . . وفیہ
کتاب النکت فی اعجاز القرآن الکریم عن الرمانی .... وفیہ
کتاب المجاز فی کلام العرب لشواهد القرآن عن قطرب .... وفیہ
من امثال القرآن الکریم نظایر ماوافق من امثال العرب للمخرمی .... وفیہ
کتاب الابواب المؤلفة فی معانی کلام العرب للاصفهانی .... وفیہ
کتاب ما اتفق لفظہ واختلف معناہ من القرآن الکریم للمبرد ..... وفیہ
کتاب احکام الهمز وصفاتہ ومواقعہ وصورہ فی الغایة لابی زید .... العدۃ ثمانیۃ کتب

کاتب کا کہیں نام نہیں۔ نہ اس بات کا صحیح پتہ چلتا ہے کہ اس کو کس زمانہ میں لکھا گیا۔ یہ مخطوطہ ۵۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۲ امثال قرآنیہ، ۲۳ احادیث و آثار، ۱۷ عربی مقولے اور ۱۴۶ اشعار کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ دار الکتب مصریہ کا ایک دوسرا نسخہ مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کراچی کی لائبریری میں بھی دستیاب ہے۔

نسخِ مخطوطہ سے متعلق یہ ایک مسلّم بات ہے کہ کسی مخطوطہ کا صحت کے ساتھ پڑھنا ہی قابل قدر چیز ہے۔ پھر ایسے مخطوطہ کا پڑھنا جو آج سے تو سو برس پہلے کا ہو اور جس کے سطور روشنائی سے ملوث ہوں۔ مقالہ میں ایڈیٹر نے مخطوطہ کے پہلے ورق کا عکس منسلک کر دیا ہے جس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مخطوطہ کے اکثر و بیشتر صفحات کی کتابت اتنی خلط ملط ہے کہ اُس کو پڑھنا ایک دشوار کام ہے۔ جامعہ بروصہ والا مخطوطہ بلحاظ کتابت بہتر ہے۔ البتہ مؤخر الذکر مخطوطہ میں ورق نمبر ۸ غائب ہے۔ ایڈیٹر نے دونوں نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ فٹ نوٹس میں مقابلہ کے نتائج درج کئے ہیں۔ بعض الفاظ اتنے مٹے ہوئے تھے کہ ان کی تصحیح اور تحقیق میں کئی کئی دن صرف ہو گئے۔ بعض

مقامات پر اتنا شدید اشکال ہوا کہ ایڈیٹر کو "لم اقف علی مراد الناسخ" لکھ کر چھوڑ دینا پڑا۔

نسخ کے چند نمونے صرف ورق نمبر ا پر حسب ذیل نمونے پائے گئے جن سے مخطوطہ کی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :۔

لا اسل، یعنی بلا ابتہاء۔ سا یعنی فی۔ س یعنی عن اور من کے لئے۔ ک عموماً متروک ہوتا ہے جیسے لرجوع یعنی کرجوع۔ تلوین یعنی تکوین۔ س س بدیه یعنی من بین یدیه۔ ذلسر یعنی ذکرہٗ۔ مالابن عباس یعنی قال ابن عباس۔ سفین، قسم، حرث یعنی سفیان، قاسم اور حارث کے لئے۔ من غیلوسراء یعنی من غیلہ سواء۔

اس طرح تقریباً تمام اوراق میں نسخ کے ایسے ہی نمونے پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ایڈیٹر نے تمام مشکل مقامات کو بصحت پڑھ ڈالا سوائے چند مقامات کے جن کی رہبری میرے قابل اساتذہ نے فرمائی۔

مخطوطہ کی تقسیم ایڈیٹر نے تمام مخطوطے کی امثال کو نمبر وار تقسیم کیا ہے۔ الماوردی کے بیانات کو سیاق و سباق کے تحت پیراگراف میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آیاتِ قرآنی کی نشاندہی کی ہے اور سور و رکوع کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ جو الفاظ یا جملے چھوٹے ہوئے تھے اُن کو براکٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مخطوطہ کے صفحات کو ورقہ ا اور ورقہ ب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ احادیث کی نشاندہی حرف "ح" سے اور قرآنی آیات کو حرف "ق" سے کی گئی ہے۔ مخففات کا جہاں تک تعلق ہے "ت" ترکی والے مخطوطہ کے لئے اور "م" مصر کے لئے ثبت ہے۔ مخطوطہ میں جہاں جہاں مقامات کا ذکر ہے اُن کے تفصیلی نوٹس دیئے گئے ہیں اور صفحہ ۱۷۲ پر اُن کی ایک علحدہ فہرست حروف وار مرتب کی گئی ہے۔

مخطوطہ کے موضوعات مصنف نے چند مقامات پر صوفیانہ اور عارفانہ انداز اختیار کیا ہے جس کی تفصیل ایڈیٹر نے مختلف کتب سے مزید شہادت کے لئے فراہم کردی ہے۔

امثال امثال کی تحقیق و تفصیل مستند کتب مثلاً لسان العرب، الکشاف، تفسیر خازن تفسیر طبری، فتح القدیر، تفسیر کبیر وغیرہ کی مدد سے کی گئی ہے جس سے بیانات والفاظ کا اختلاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ امثال علیحدہ نمبروار مرتب کئے گئے ہیں۔

آیات حسب ضرورت مختلف مقامات پر الفاظ کی صحیح تعبیر پیش کرنے کے لئے قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان تمام قرآنی آیات کے اوپر، جو مخطوطہ میں پائے جاتے ہیں، خط کھینچ دیا گیا ہے تاکہ آیات نمایاں ہو جائیں۔ مصنف نے بعض جگہ تھوڑے سے ٹکڑے پر اکتفا کیا تھا ایڈیٹر نے فٹ نوٹس میں پوری آیت لکھ دی ہے تاکہ بات مکمل ہو جائے۔

احادیث احادیث کی تحقیق کے لئے ایڈیٹر نے فتح الکبیر للشوکانی، مسند امام حنبلؒ، جامع ترمذی اور النہایۃ فی غریب الحدیث وغیرہ سے مدد لی ہے اور جابجا اُن کے حوالے دیئے ہیں۔

اشعار جہاں تک اشعار کے حوالوں کا تعلق ہے ایڈیٹر نے کوشش کی ہے کہ شعراء کے دواوین سے اُن کی نشاندہی کر دی جائے۔ چنانچہ دیوان جریر، دیوان اخطل، دیوان فرزدق اور دیوان حضرت حسان بن ثابتؓ کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے جابجا صرف ایک مصرعہ پر اکتفا کیا ہے۔ ایڈیٹر نے دوسرے مصرعہ کو تلاش و جستجو کے بعد لکھ دیا ہے۔ بعض قطعات شعر میں سلسلہ کلام منقطع ہے اس لئے مزید دو دو تین تین متعلقہ اور متواتر اشعار ترتیب وار لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ اصل مطلب واضح ہو جائے۔ بعض اشعار مطلق سمجھ میں نہیں آئے اور نہ اُن کے حوالے مل سکے اس لئے ایسے مقامات پر بھی ایڈیٹر نے "لم اقف علی مرادہ" لکھ کر انہیں چھوڑ دیا ہے۔

مشکل الفاظ تاج العروس للزبیدی، لسان العرب اور القاموس المحیط جیسے مستند لغات سے الفاظ کی تحقیق کی گئی ہے اور حوالے دیئے گئے ہیں صحاح للجوہری سے بھی حل لغات میں مدد لی گئی ہے۔

محاورات مصنف نے اپنی عالمانہ وضاحت میں جابجا عرب کے محاورات

لکھے ہیں۔ ان کی حتی الامکان توضیح کی گئی ہے۔ یہی محاورات دوسری عبارت کے ساتھ ایسے گھل مل گئے تھے کہ صحیح عبارت کا سمجھنا دشوار تھا۔ لیکن لسان العرب لابن منظور کی مدد سے ان کو حل کیا گیا۔

وُہ اہم شخصیات جن کا تذکرہ مخطوطہ میں پایا جاتا ہے

جن شخصیتوں کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب میں کیا ہے اُن کی مختصر سوانح عمریاں فراہم کردی گئی ہیں۔ اور ان کی تقسیم و ترتیب فنی لحاظ سے حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ ان شخصیتوں کا ذکر پانچ عنوانوں ۔ قرّاء، شعراء، محدّثین، مفسرین، نحویین کے ماتحت کیا گیا ہے۔ ان شخصیات کے حالات سیر کے مستند کتب مثلاً مروج الذهب، الاستیعاب، الاصابه، اسد الغابه، طبقات ابن سعد، تهذیب التهذیب هدیة العارفین، کتاب الاعلام وغیرہ سے جمع کئے گئے ہیں۔

معاصرین

مصنف کے چند اہم معاصرین کا تذکرہ مع اُن کے مختصر علمی حالات کے نہایت ضروری سمجھا گیا تاکہ چوتھی صدی کے علمی کارنامے ہمارے سامنے آجائیں۔ چنانچہ احمد بن خالویہ، ابو ہلال عسکری، دارقطنی، عثمان بن جنّین، حماد الجوهری، الباقلّانی، عبد الرحمٰن السُّلمی، ثعالبی، المعرّی، الطبری، ابن رشیق صاحب العمده، قدوری وغیرہ جیسے یکتائے روزگار شخصیات کے حالات، کتاب الاعلام، تاریخ بغداد، طبقات الشافعیة الکبریٰ، معجم الادباء، هدیة العارفین وغیرہ سے جمع کر دیئے گئے۔

انتساب

مخطوطہ خود اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ کتاب امثال القرآن ماوردی سے منسوب ہے کیونکہ کتاب کے آٹھ رسائل میں سے ایک رسالہ امثال القرآن ہے جو ماوردی کی تصنیف ہے۔ حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں اس کی صراحت کی ہے۔ علامہ سیوطی نے تو اپنی الاتقان میں نہ صرف ماوردی کا حوالہ دیا ہے بلکہ کئی امثال کی انہی کے طرز پر تشریح کی ہے۔ آقا علی اصغر حکمت نے اپنی کتاب امثال قرآن میں نہ صرف ماوردی کی کتاب کا ذکر

کیا اور اس کا انتساب مصنّف سے کیا ہے بلکہ مخطوطہ کے بہت سے جملے من وعن نقل کر دیئے ہیں اور ترکی والے مخطوطہ کا ذکر کر کے "ہنوز چاپ نرسیدہ" لکھا ہے۔ اس سے یہ انتساب اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔

کتاب نما مقالہ کے آخر میں کتاب نما کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جس میں اسماء کتب، مصنّفین، مطابع و سنن طباعت کا ذکر ہے۔ کتاب نما کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ عام کتب کی فہرست سے ہٹ کر لغات کی فہرست علیحدہ دی گئی ہے۔

اجماع عصرِ حاضر میں

شیخ نجیب محمد بکیر
ترجمہ:۔ قاضی فتح الرسول نظامانی

عربی لغت میں اجماع کے دو معنی ہیں ۱۔ کسی چیز کا عزم مصمم کرنا۔ عربی محاورہ میں "اجمع فلان علیٰ کذا" اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی چیز کا عزم کرتا ہے۔ یہ جو روزہ کے متعلق حدیث میں "لم یجمع" آیا ہے وہ بھی عزم کے معنیٰ میں آیا ہے، حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "لاصیام لمن لم یجمع الصیام من اللیل"، یعنی جس نے رات کو روزوں کا عزم نہ کیا تو اس کے روزے نہ ہوں گے۔

اجماع کے دوسرے معنیٰ ہیں: کسی چیز پر اتفاق کرنا۔ عربی محاورہ میں کہا جاتا ہے:۔ "اجمع القوم علیٰ کذا" اور یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی بات پر قوم کا اتفاق ہوتا ہے، اور وہ چیز "متفق علیہ" دینی امر ہو یا دنیوی۔

یہ دونوں 'عزم و اتفاق' "الجمع" سے ماخوذ ہیں، کیونکہ عزم میں دلوں کی جمعیت اور آراء کا اتفاق ہوتا ہے۔ ان دونوں معناؤں میں یہ فرق ہے کہ اجماع اول معنیٰ کے لحاظ سے ایک شخص سے بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے معنیٰ کی صورت میں دو یا اس سے زائد کے سوا اجماع متصور نہیں ہوتا۔

اصولی علمائے ہاں اجماع

اجماع کی ایک تعریف وضع کرنے کے سلسلے میں اصولی علماء کا اسی طرح باہمی اختلاف پیدا ہوا جس طرح دوسرے مسائل میں ان کا اختلاف ہے ۔ انہوں نے اجماع کی جو تعریفیں لکھی ہیں ان میں سے کچھ یہاں بیان کی جاتی ہیں !

۱ ۔ نظّام کہتا ہے :۔ اجماع ہر اس قول کو کہا جائے گا جس کی حجت قائم ہو، چاہے وہ ایک شخص کا قول کیوں نہ ہو۔

۲ ۔ غزالی اجماع کی اس طرح تعریف کرتا ہے کہ کسی دینی بات پر خاص امت محمدیہ کے اتفاق کو اجماع کہا جائے گا ۔

۳ ۔ غفاری اور جمہور علماء کی رائے میں، کسی بھی زمانے میں ایک حکم شرعی پر امت محمدیہ میں سے مجتہدین کے اتفاق کا نام اجماع ہے ۔

۴ ۔ ایک جماعت اجماع کی یہ تعریف کرتی ہے کہ اجماع کے معنیٰ ہیں اہل حل و عقد کا کسی واقعے کے حکم پر قولی اتفاق ہونا ۔

اجماع کی تعریف میں اصولی علماء کے اختلاف کا اصلی سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اجتہاد کے دور میں ہر امام کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے شہر کے فقہاء کی مخالفت نہ کی جائے، اس لئے امام ابوحنیفہ اپنے سے سابقین علماء کوفہ کے اجماع کا شدت سے اتباع کرتے تھے اور امام مالک اہل مدینہ کے اجماع کو حجت خیال فرماتے تھے ۔

جمہور نے جو اجماع کی تعریف کی ہے، اکثر علماء نے اسی کو پسند کیا ہے، اس لئے ہم جمہور کی تعریف کو ہی اپنے بحث کا موضوع قرار دیتے ہیں ۔

جمہور نے اجماع کی یہ تعریف کی ہے کہ کسی حکم شرعی پر کسی نہ کسی زمانے میں اُمّتِ محمدیہ کے مجتہدین کا متفق ہونا ۔ بعض علماء نے "بعد وفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم" کی قید بھی بڑھائی ہے ۔ جمہور کے ہاں اجماع کی تعریف کے لئے مندرجہ ذیل امور کا ہونا ضروری ہے :۔

۱ ۔ مکان اور گروہی اختلاف سے صرف نظر کر کے تمام مجتہدین کا متفق ہو جانا، اگر جملہ مجتہدین کا اتفاق نہ ہو سکے لیکن ان کی اکثریت کسی حکم پر اتفاق کرے تو اس کو

بھی جمہور کے ہاں اجماع نہیں کہا جائے گا کیوں کہ ایسی صورت میں یہ احتمال باقی ہے کہ اقلیت حق پر ہو چاہے وہ ایک کیوں نہ ہو۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ اکثر مجتہدین کے اتفاق سے بھی اجماع متحقق ہوگا، اور اقلیت کی مخالفت اس پر اثر انداز نہ ہوگی۔ امام احمد سے بھی ایک روایت اس قسم کی مروی ہے۔ بعض علماء اس کو حجت تو قرار دیتے ہیں لیکن اس کا نام اجماع نہیں رکھتے۔

۲۔ اتفاق کرنے والے مجتہد امت محمدیہ میں سے ہوں، دوسرے انبیاء کی امتوں میں سے مجتہدین کے اتفاق کو شرعی اجماع نہیں کہا جائے گا۔ یہ بھی اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں مجتہدین کے وجود کو تسلیم کیا جائے، کیوں کہ امتِ محمدیہ کا جب کسی حکم پر اتفاق ہو جائے تو عصمت یعنی خطا سے بچنے کے لئے پیغمبر علیہ السّلام کا قول دلیل موجود ہے جو یہ ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ دوسری امتوں کی عصمت کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳۔ جس حکم پر مجتہدین کا اتفاق ہوا ہو وہ شرعی اور عملی ہو جیسے وجوب، حرمت اور صحت وفساد وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ احکام لغویہ یا عقلیہ پر اگر اتفاق ہو جائے تو اس کو شرعی اجماع نہ کہا جائے گا، کیوں کہ علمائے اصول صرف ایسے شرعی احکام سے بحث کرتے ہیں جن کا مکلفین کے اعمال کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

۴۔ یہ اتفاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کا ہو، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اجماع نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اگر موافقت فرمائی ہوتی تو ایسے حکم کو سنت سے ثابت کہا جائے گا، اجماع سے ثابت نہ ہوگا اور اگر پیغمبر علیہ السلام نے اس کی مخالفت فرمائی ہوگی تو ایسا اتفاق ساقط ہو جائے گا اور متفق علیہ چیز کو شرعی حکم نہیں کہا جائے گا۔

کیا اس دور میں اجماع ممکن ہے؟

موجودہ دور میں جمہور کے ہاں پسندیدہ تعریف اجماع تب متحقق ہو سکتی ہے جب دنیا کے جملہ مجتہدین کا صحیح شمار کیا جائے اور پھر کسی واقعے میں سب مجتہد اظہارِ خیال کر سکیں اور

سب کی رائے متفق ہو۔ ظاہر ہے کہ ان سب شرائط کا اس دور میں موجود ہونا بعید معلوم ہوتا ہے بلکہ محال سا ہے۔

شیخ عبدالوہاب خلاّف نے لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ اگر اجماع امم اسلامیہ کے افراد اور عوام کے حوالے کیا جائے تو اس کا انعقاد ناممکن معلوم ہوتا ہے اور اس کا انعقاد تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب اسلامی حکومتیں اس کی ذمہ داری اٹھائیں اور ہر ایک حکومت ایسی شرائط مقرر کرے جن کو اجتہاد کے درجے تک پہنچنے کا معیار مقرر کیا جائے اور پھر اجتہاد کی اجازت صرف اس شخص کو ہو جس میں وہ شرائط پائی جائیں، اس طرح ہر حکومت اپنے اپنے ملک کے مجتہدین کو پہچان سکے گی اور ان کی آراء معلوم کرے گی۔ پھر جب کسی حکومت نے ایک واقعے میں اپنے مجتہدین کی آراء کو معلوم کر لیا اور اس واقعے میں دوسری اسلامی حکومتوں کے مجتہدین کا بھی اس حکم پر اتفاق ہو جائے تو یہ اجماع ہو گا اور اس اجماع کو ایسا شرعی حکم کہا جائے گا جس کا اتباع جملہ مسلمانوں پر واجب ہو گا۔ لیکن اس میں یہ رکاوٹیں ہو سکتی ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں اسلامی ملکوں کے کچھ ایسے بھی مجتہد ہوں جن کا علم حکومت کو نہ ہو سکے یا کسی سبب سے وہ اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکیں، اس سے معلوم ہوا کہ جمہور کی تعریف کے مطابق اجماع کا انعقاد نہیں ہو سکتا۔

اجماع کی ایسی تعریف جس سے اس کا انعقاد ممکن ہو سکے

جب صورت حال یہ ہے تو بہتر ہے کہ اجماع کی کوئی ایسی تعریف کی جائے جس سے اس کا وقوع ممکن ہو سکے اور شرعی مصادر میں سے وہ ایک مصدر ہو جس سے ہم احکام کو حاصل کر سکیں، کیونکہ ہمارے ہاں ایسے متعدد واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کے احکام کے متعلق کوئی نص نہیں پائی جاتی، اس لئے ہمارے مقصد کے زیادہ قریب اجماع کی تعریف یہ ہے کہ وہ کسی حکم میں ایسے لوگوں کے اتفاق رائے کا نام ہے جن کی رائے سے حکومت اتفاق کر سکے اور وہ گمراہی پر مجتمع نہ ہوں، اس تعریف سے اجماع عملی طور پر واقع ہو سکتا ہے اور وہ حجت ہو گا اور اس پر عمل کرنا واجب ہو گا۔

سوسائٹی فقہ اسلامی

اجماع کی سہل ترین صورت یہ ہے کہ فقہِ اسلامی کی ایک سوسائٹی

بنائی جائے شریعت اسلامی کے مشہور ماہر اس کے ممبر ہوں اور جب کسی پیش آمدہ واقعے کے حکم کے متعلق ان سب کا اتفاق ہو جائے تو یہ ان کی طرف سے اجماع ہوگا۔ یہ اجماع اگرچہ جمہور کے مقرر کردہ شرائط کے موافق تو نہ ہوگا، لیکن حکومت کے جانے پہچانے مجتہدین کا اجماع ہوگا جو کہ فقہی سوسائٹی کے اعضاء اور اراکین ہوں گے، بلاشبہ اس فقہی سوسائٹی کے ممبر عالم اسلام کے مجتہدین کی اکثریت ہوگی اور وہ حکومت کے ہاں معروف شخصیتیں ہوں گی جن سے ان کی رائے کا معلوم کرنا دشوار نہ ہوگا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام کی سب حکومتیں اگرچہ اپنے اپنے ملک کے جملہ مجتہدین کی شناخت نہ کرتی ہوں، لیکن مجتہدین کی بڑی تعداد ان کو ضرور معلوم ہوگی، یہ دور بنو امیہ اور بنو عباس کا تو نہیں ہے کہ مجتہد اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے اور چھپ جاتے۔ پھر اس دور میں بڑی سہولتیں ہیں۔ سلف صالحین کی تو یہ حالت تھی کہ ایک حدیث کو حاصل کرنے میں ان کو ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف جانا پڑتا تھا۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے متاخرین کے لئے اجتہاد کو ایسا آسان بنا دیا ہے کہ اس طرح اس سے پہلے کبھی آسان نہ تھا۔ قرآن مجید کی بیسیوں تفاسیر جمع ہو گئی ہیں اور سُنتِ مطہرہ کی بھی تدوین ہو گئی، ائمہ نے تفسیر، تجریح اور ترجیح پر مجتہد کی ضرورت سے زیادہ کلام کیا ہے۔

مذکورہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ "اجماع" نام ہے کسی شرعی عملی حکم پر سوسائٹی فقہ اسلامی کے ممبروں کا متفق ہونا اور وہ ایسے لوگ ہوں جس کی رائے سے حکومت مانوس ہوں اور وہ گمراہی پر جمع نہ ہوں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے قائد کا یہ فرض ہوگا کہ ان کے قائم کردہ فیصلے کو عملی شکل پہنا دے، اس طرح اجماع شریعتِ اسلامیہ کے مصادر کا ایک عمدہ ماخذ ہوگا اور وہ تشریع کے تجدید کا کفیل ہوگا اور اس سے تمام نئے واقعات کا زمان اور مکان کی رعایت کے ساتھ امتِ مسلمہ آسانی سے فیصلہ کر سکے گی۔

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

بزرگانِ سلہٹ

وقار راشدی ایم اے

تاریخ شاہد ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کی تبلیغ اور اصلاحی تعلیمات کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ صوفیائے عظام اور اولیائے کبار کا رہا ہے۔ اللہ کے یہ نیک و برگزیدہ بندے عرب، چین اور دنیا کے مختلف گوشوں سے برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور اپنے فیوض و برکات، کمال و کرامات، علوم و فنون، اخلاق و اخلاص سے چپے چپے میں اسلام کا پرچم بلند کیا۔ انہیں بزرگانِ دین کا فیضان و احسان ہے کہ آج مملکت پاکستان کا مشرقی حصہ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور دین و ثقافت کی آماجگاہ ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں بعض اُن اہل تصوّف اور مقتدائے دین کے حالات پیش کئے جاتے ہیں جو اپنی ذاتِ برکات سے منبعِ فیض، مرقعِ انوار، متبعینِ شریعت و طریقت، عرفانِ اسرار و رموز تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے زاویۂ فکر و نظر، دائرۂ ریاض و عمل کے مطابق رشد و ہدایت اور وعظ و نصیحت سے سرزمینِ سلہٹ میں مشعلیں روشن کیں ؎

کافرستان تھا سلہٹ، در و دیوار سے پوچھ
کون آیا تھا یہاں، کس کی اذانیں گونجیں

سلہٹ تخلیقِ پاکستان سے قبل صوبۂ آسام کا دارالخلافہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اسے

مشرقی پاکستان کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔ سلہٹ کی حسین وادیوں اور دلفریب سبزاروں میں جس عظیم المرتبت شخصیت نے سب سے پہلے چراغِ توحید روشن کیا وہ مبارک نام نامی حضرت شاہ جلال یمنی سلہٹی المجردؒ کا ہے۔ آپ کے ساتھ مشائخ عظام و اولیائے کرام کا ایک کارواں آیا، پھر چراغ سے چراغ جلتے رہے۔ آپ کے بے شمار معتقدین و مریدان تھے۔ آج سلہٹ کے کونے کونے میں حضرت شاہ جلالؒ ہی کی بدولت مسجدیں آباد اور دلِ مسلمان شاد ہیں۔

حضرت شاہ کمال الدین کی ولادت باسعادت عرب کی سرزمین یمن میں ہوئی تھی۔ جب آپ علمِ معرفت سے بہرہ ور ہوئے اور سراغِ حیات پایا تو اپنی زندگی کو خدمتِ خلق، عبادتِ حق کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۳۸۵ء میں اپنے وطن یمن کو خیرباد کہا اور بنگال کی راہ لی۔ آپ کی رفیقۂ حیات اور نو پرستارانِ توحید آپ کے ہم سفر تھے۔ یہ نو حضرات صوفی اور درویش تھے۔ آپ نے اپنے والد ماجد کے حسبِ ہدایت سلہٹ میں قیام فرمایا۔ حضرت شاہ کمال کے ہمراہ جو جان نثارانِ حق سلہٹ آئے تھے ان میں (۱) شاہ شمس الدین (۲) شاہ بہاء الدین نے داؤد پور، (۳) شاہ تاج الدین نے تاج پور (۴) شاہ جلال الدین نے خوچکی پور، (۵) شاہ رکن الدین نے قدرہاٹی، (۶) شاہ ضیاء الدین نے بہادیشور، (۷) کالا مانک نے منی ہارا (۸) شاہ کالو نے چاند بھوانک اور (۹) خواجہ شمس الدین نے آٹھ گھر میں سکونت اختیار کی اور اپنے اپنے علاقوں میں علم و عرفان کے گوہر لٹائے۔

جب حضرت شاہ کمالؒ سلہٹ تشریف لائے تو سب سے پہلے حضرت شاہ جلالؒ سلہٹی کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی اور آپ سے بیعت کی۔ حضرت شاہ کمالؒ کے والد مکرم حضرت شاہ برہان الدین حضرت جلالؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ موصوف بڑے پایہ کے صاحب دین تھے۔ فقہ و حدیث پر عبور رکھتے تھے۔ آپ کا مزار پُر انوار کورنگا جوڑا نامی مقام پر واقع ہے۔ حضرت شاہ جلالؒ نے حضرت شاہ برہانؒ کے لائق فرزند کو مائل بہ حق و صداقت دیکھ کر حوصلہ افزائی کی ان کو اپنی خاص تربیت

میں رکھا۔ جب وہ دینی علوم سے آراستہ، حقیقت و معرفت کے اسرار و رموز سے باخبر ہوئے تو آپ نے انہیں اللہ کے لئے کام کرنے کی غرض سے شاہ پاڑہ نامی ایک علاقے میں بھیجا۔ حضرت شاہ جلالؒ نے حضرت شاہ کمالؒ کے ذمے جو فرائض عائد کئے تھے انہیں آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ ریاضت و عبادت کے علاوہ جو وقت ملتا اسے درس و تدریس اور خدمتِ خلق میں صرف کرتے۔ شاہ پاڑہ میں آپ کی خانقاہ منبعِ معرفت تھی۔ اس علاقے میں کفر و الحاد کی تاریکی آپ کی ذاتی کوششوں سے دور ہوئی۔ آج آپ ہی کی بدولت وہاں کے گلی کوچوں میں اسلام کے پیرو کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ حضرت شاہ کمالؒ کے ارادت مندوں اور مریدوں کی تعداد کم نہ تھی، لیکن ان میں نو مریدوں کو خاص مرتبہ حاصل ہوا۔ ان حضرات نے آپ کے کاموں کو آگے بڑھایا، دینِ الٰہی کو پھیلایا۔ شاہ کمالؒ کا خاندان کمال یا قریشی کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت شاہ کمال کے عزیزوں میں آپ کے بھانجے حضرت سید شمس الدینؒ نے تصوف و عرفان میں شہرت حاصل کی۔ آپ کو شاہ تاج الدین کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا۔ آپ شاہ جلالؒ کے ایک مرید حضرت سید علاؤالدین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا مزارِ مبارک اتواجن پرگنہ سید پور میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

حضرت سید نصیر الدینؒ شہر بغداد کے سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ پہلے آپ بغداد سے متحدہ ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ دلّی کے بادشاہ فیروز شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ بادشاہ آپ کا بڑا احترام کرتا تھا، دلی عقیدت رکھتا تھا۔ لیکن دنیاوی وجاہت، شاہی جاہ و حشمت آپ کو ایک نظر نہ بھائی۔ آپ شاہی دربار کو خیرباد کہہ کر جادۂ معرفت و منزلِ عاقبت کی طرف گامزن ہوئے۔ سلہٹ میں آپ کے ورودِ مسعود کے وقت وہاں حضرت شاہ جلالؒ کے جاہ و جلال کا طوطی بول رہا تھا۔ آپ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ ایک سعادت مند شاگرد کی طرح اسرارِ حقیقت سے آشنا ہوئے۔ آپ کی خانقاہ پیر محلہ میں تھی۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ وہیں

آپ کو دفن کیا گیا تھا لیکن وہاں آپ کے مدفن کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خانقاہ میں آپ کا مزار نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا پتہ چل سکا ہے کہ آپ کس مقام پر آسودہ ہیں۔ مولانا مفتی اظہر الدین نے اپنی بنگلہ کتاب "سلہٹ گہوارۂ اسلام" میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت سید نصیر الدین کا مقبرہ سلہٹ کے ایک مقام موار بندر میں ہے لیکن اس کی تائید کسی اور سوانح نگاروں نے نہیں کی۔ واضح رہے کہ یہ حضرت نصیر الدینؒ وہ بزرگ نہیں ہیں جن کا تذکرہ راقم الحروف نے اپنے مضمون بعنوان حضرت سید نصیر الدین اور ان کی اولاد "مطبوعہ الرحیم جون ۶۷ء" میں کیا ہے۔

بندر بازار کے شمال میں ایک قدیم درگاہ ہے یہاں حضرت سید ابو ترابؒ آسودہ ہیں۔ آپ بھی حضرت شاہ جلالؒ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ بندر بازار میں آپ کا آستانہ تھا یہی مقام آپ کی زندگی میں عارضی قیام گاہ اور حیاتِ ابدی میں ابدی آرام گاہ ثابت ہوا۔ لیکن آج بھی آپ کے مزارِ پُر انوار پر آپ کے زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اور آپ کے اُسوۂ حسنہ وعظمت رفتہ کی نشان دہی کرتا ہے۔

حضرت شاہ جلالؒ کے ہمراہ جو مبلغینِ اسلام سلہٹ آئے تھے، ان میں آپ کے کئی اعزّا واقربا بھی تھے۔ حضرت شاہ فارانؒ اور خواجہ نصیر الدین عرف شاہ چٹ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں یہ دونوں حضرات بابرکات، حضرت شاہ جلالؒ کے بھانجے ہوتے تھے۔ حضرت شاہ جلالؒ کی درگاہِ مبارک سے کوئی سات میل دور گھنے جنگلوں کی آغوش میں حضرت شاہ فارانؒ کی آخری آرامگاہ ہے۔ حضرت خواجہ نصیر الدین عرف شاہ چٹ کا مقبرہ گورنمنٹ ہائی اسکول سلہٹ کی مسجد کے احاطے میں ہے۔

ترجمہ

تاویل الاحادیث

(ادارہ)

دوسری عنایت یہ تھی کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے قتل کرنے کا ارادہ کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون میں سے ایک ایماندار شخص کو ان کے پاس بھیجا۔ اس نے فرعونیوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے ان کو ان کے ارادے سے روک دیا اور ان کو شک میں ڈال دیا۔ پھر ان کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ چند روز کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو ڈھیل دی جائے اور جادوگروں کو ان سے مقابلے کے لئے طلب کیا جائے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ جیت جائیں گے۔ حق یہ ہے کہ یہ ایک تقریب تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا حق پہ ہونا اور ان کے معجزے کا ظہور (لوگوں پر منکشف) ہو۔

تیسری عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جادوگروں کو حق بات کی ہدایت دی تاکہ آپؑ کی حجت (مخالفوں پر) صریح تر ہو کہ جو شخص آپؑ کے مقابلے کے درپے تھا وہی آپ کا فرماں بردار ہو گیا۔

چوتھی عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نو (۹) واضح آیات کے ساتھ فرعونیوں

کی آزمائش لہ کی جب (ان پر کوئی مصیبت آتی تھی اور) حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے ہٹانے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے تو اللہ اس کو ہٹا دیتا تھا اور جب اس کے نازل کرنے کے لئے دعا کرتے تھے تو اس کو نازل کرتا تھا۔

پانچویں عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا کی طرف جانے کا حکم فرمایا۔ جب آپؑ اپنی قوم کو لے کر نکلے تو فرعون نے اپنے لشکر کو لے کر ان کا تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰؑ جب دریا پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ایک تیز ہوا کو دریا پر مُسلّط کیا، جس نے دریا کے بعض حصّے کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بعض کو خشک کر دیا اور اس نے اس کے بعض حصے میں ایسا تصرف کیا جس طرح وہ زمین کے اجزاء میں تصرف کرتی ہے جس وقت گرداب بن جاتی ہے۔ (اسی طرح) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون اور اس کے لشکر کو ہلاک کیا۔

اس کے بعد جب بنی اسرائیل بیت المقدس کو چلے تو ایک ایسی قوم پر گزرے جو بت پرستی کرتی تھی۔ (اس کو دیکھ کر) بنی اسرائیل کے جاہل لوگوں نے جن کے دل میں ایمان کی تازگی داخل نہ ہوئی تھی حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ جیسے اس قوم کے لئے کئی خدا ہیں ہمارے لئے بھی ایک خدا بنا دے۔ اور یہ بات ان سے اس لئے صادر ہوئی کہ ان کی جبلت کو جبروت کی طرف التفات نہ تھا، جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کو مواعظ (اور نصیحتوں) کے کوڑوں سے تادیب کی تو انہوں نے جبروت (ذات باری) کے مشابہ صورت کی طلب کی جس کو

لہ ان آیات کا بیان سورۂ اسراء آیت ۱۰۱ میں آیا ہے اور یہ آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قطعی دلائل کی حیثیت رکھتی تھیں، ان آیات کی تعیین میں مفسروں کا اختلاف ہے حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہؒ، شعبی اور قتادہ کی رائے میں وہ علامات یہ ہیں، ہاتھ کا روشن ہونا، لاٹھی، قحط کے سال، پھلوں کا کم ہونا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک اور خون۔ حافظ ابن کثیر اس قول کو قوی اور اچھا کہتا ہے۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۶۶ طبع مصطفی محمد مصر۔

دیکھ کر جبروت کی طرف التفات کریں۔ (اس کے جواب میں) حضرت موسیٰ نے ان کو حق سمجھایا اور ان کی گفتار کو رُسوا کیا تو وہ زبردستی (اپنے خیال سے) رک گئے اور بحالت شک خاموش ہو گئے۔ سامری ان کی شکی حالت کو تاڑ گیا، پھر اس نے ان کے ساتھ وہ کیا جو کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس سے برکت والی جگہ میں مناجات کرے تو اللہ تعالیٰ ان کو توریت کی تختیاں اور احکام عنایت کرے۔ اس مبارک جگہ کی خصوصیت اس لئے ہوئی کہ وہاں ملائکہ کی روحانیات کا اجتماع ہوا تھا اور اس اجتماع کی وجہ سے ظاہری خبریں ناپید ہو گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں اعتکاف میں بیٹھ گئے اور تنہا ہو کر اللہ کا ذکر کیا اور ملکوت سے مشابہت پیدا کی، اور جب اس جگہ کو دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی تھی تو اس حالت کے فرماں بردار ہو گئے اور اس سے ان کو سرور حاصل ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت کی تختیاں عنایت کیں جن میں ہدایت اور رحمت تھی یعنی نصیحتیں اور خدا کی طرف سے (انبیاء علیہم السلام کی نصرت کے) گزشتہ واقعات اور اللہ کے صفات اور اس کے غالب افعال کا بیان تھا۔ تختیوں کا جوہر جنت کے زمرد سے تھا یعنی ایسے جوہر سے بنا ہوا تھا جو زمرد سے مشابہت رکھتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی عنصری سبب کے سوا اپنے حکم "کُنْ" سے پیدا کیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (کوہ طور پر) جانے کے بعد یہاں سامری نے لوگوں کو اس طرح گمراہ کیا کہ روح (جبریل) کے قدم سے مٹھی بھر مٹی لے کر بچھڑے کے قالب میں ڈال دی، اس کی یہ خاصیت تھی کہ جس شئے پر گزرتی تھی تو اس کی طرف اس کی مناسب زندگی لوٹ آتی تھی۔ یہ واقعہ فی الحقیقت بنی اسرائیل کے اچھے لوگوں کے لئے باعثِ رحمت اور جہلاء پر ان کی عزت کا باعث تھا جب تک وہ اس کے لئے تیار رہے۔

یہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ طبعی طور پر دجال تھے وہ غیر اللہ کی عبادت کے مطیع ہو گئے اور وقت بوقت ان پر کفر کے اوہام گزرتے تھے، تو اللہ نے چاہا کہ بنی اسرائیل

کو ایسے لوگوں سے صاف رکھے، بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایسے (بھی) تھے کہ اگر وہ اس دنیا میں باقی رہتے تو ایمان کی حقیقت کو کبھی نہ پہنچتے اس لئے کہ ان کی ارضی (اور گھٹیا درجہ کی) طبیعتیں ان کو اس سے روک رہی تھیں، ان کی بھلائی اس میں تھی کہ ان کو فرمانبرداری کی حالت میں قتل کیا جائے تاکہ عالم برزخ میں جاکر ان کی روحیں ترقی کریں۔ تو حضرت موسٰی علیہ السلام نے سامری کو بلایا اور اس کے اشکال کو زائل کیا اور اس پر بد دعا کی۔

حضرت موسٰی علیہ السلام پر اللہ کی یہ عنایت ہوئی کہ جب ایک جماعت نے آپؑ پر ادرۃ (فوطوں کے بڑھ جانے) کے عیب کا طعنہ دیا جس کا یہ سبب بنا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام غسل کے وقت حیا کی وجہ سے ستر کرتے تھے تو ان لوگوں نے اس کو عیب چھپانا خیال کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بری کیا اور وہ اللہ کے ہاں بڑے عزت والے تھے، اللہ تعالیٰ کو ان کے حق میں کسی کا بھی طعنہ دینا پسند نہ تھا۔ اس کی یہ صورت ہوئی کہ حضرت موسٰیؑ پانی سے گزرے تو وہاں غسل کرنے کا ارادہ فرمایا اور اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھے، پتھر کپڑے لے کر زمین پر لڑھکا اور قوم نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور موسٰی علیہ السلام کے حق میں ادرۃ کے عیب سے پاک ہونے کی گواہی دی۔

جب موسٰی علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ اللہ کی کمال عنایت اس کی طرف متوجہ ہوئی ہے اور ان کو ملأ اعلیٰ سے قوی مشابہت حاصل ہوئی ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ خدا ان کو ظاہر دکھائی دے یعنی نفس کلیہ پانچویں عنصر (مثال) کے ایک حصے کو احاطہ کرے اور وہ اس کے اندر ایسے جسم نورانی کو تصور کرے جو حضرت موسٰی علیہ السلام کی اپنے رب کے ساتھ معرفت کے لئے ناقل ہو۔ موسٰی علیہ السلام کو حق کی طرف سے اپنی پہچان کا علم عطا کرنا اس نورانی جسم کے لئے روح کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کا جسم ملأ اعلیٰ کی طرف سے تھا، اور روح و جسم کا باہمی اختلاط اس طرح ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک کی حالت کی نسبت دوسرے کی طرف جسم اخروی کی طرح صادق ہو۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کے اس قول اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ[1] (مجھے دکھائیے کہ میں تیری طرف دیکھ لوں) کا مطلب یہی ہے۔

---

[1] سورۃ اعراف آیت ۱۴۲۔

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تب صادر ہوئی جب وہ نفس اولیٰ کے تصرفات سے واقف ہوئے، اور یہ تب ہوتا ہے جب اللہ کے پیاروں میں سے کسی ایک کی ہدایت کے لئے نفس کی طرف سے ارادہ اور اہتمام ہوتا ہے جیساکہ ان کو آگ کی طرف شوق کے وقت تھا، لیکن شروع سے ہی موسیٰ علیہ السلام کو حق کی طرف توجہ عطا کی گئی تھی اور خلق میں حق کے ساتھ تصرف کرنا آپؑ کو نہ ملا تھا، اس لئے اس روز کی حدت مزاج کا خیال رکھتے ہوئے حق تعالیٰ نے آگ کی صورت میں تجلی فرمائی اور اس آگ نے ان کو نہیں جلایا، اور اگر حق تعالیٰ آج تجلی فرمائے تو وہ ایسی جلانے والی آگ سے تجلی ہوگی جو جس چیز کا بھی اس سے چھونا ہوگا تو وہ شئے جل جائے گی، کیوں کہ وہ آگ تو حق کے آئینے میں موسیٰ علیہ السلام کی اپنی صورت تھی۔ (اس سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ جب حق کے آئینے میں کسی چیز کے لئے تجلی کرتا ہے تو اس شئے کی صورت کے سوا نہیں کرتا۔ پھر وہ چیز حسبِ استعداد حق کی صورت کو لے آتی ہے، ایک پیغمبر اس علم سے جاہل نہیں رہ سکتے، آپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ آج وہ ایسی حالت میں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کی صورت میں تجلی فرمائے گا تو ان کا جسم تباہ ہو جائے گا، دوسری طرف لوگوں پر اللہ کی رحمت چاہتی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام باقی رہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تو پہاڑ پھٹ گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے جب ہوش میں آئے تو آپ پر سارا راز کھل گیا اور آئندہ کے لئے اپنی استعداد کے نامناسب سوال سے توبہ فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے وہی سوال کیا جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا کیوں کہ نفس کلیہ کے مظاہر کی طرف جو آپؑ کو اشتیاق تھا وہ شوقیہ حالت ان کی قوم کے دلوں میں منعکس ہوئی تھی۔ آخر حق تعالیٰ نے برق کی صورت میں تجلی فرمائی اور ان سب کو تلف کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پہ رحم فرماکر ان کو زندہ کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ ارض مقدس میں سکونت اختیار کریں اور یہ زمین ان کو بطورِ جاگیر عنایت فرمائی۔ جب کہ اس زمین پر جابر لوگوں کا قبضہ تھا اس لئے بنی اسرائیل کو ان سے جہاد کرنے کا حکم ملا

اور ان کو مدد اور نصرت کا وعدہ کیا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے پر ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے حالات سے باخبر ہو اور انہیں نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے تاکہ قوم کے اخلاقی اقدار ان کے سامنے واضح ہو جائیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سرکشوں کی طرف جاسوس بنا کر بھیجا۔ (وہاں کے حالات معلوم کرنے کے بعد) صرف دو شخصوں نے تو ایسی خبر دی جس سے بنی اسرائیل کی شجاعت بڑھی، اور باقی لوگوں نے تو ایسی خبر سنائی جس سے وہ سست (اور بزدل) بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو پر تو رحم کیا اور ان دو کو صدیق اور نائب بنایا اور باقی لوگوں سے سخت ناراض ہوا اور ان کو تباہ کر دیا۔

اب جب جاسوسوں کی مخبری میں اختلاف ہو گیا تو بنی اسرائیل جابر لوگوں کے مقابلے سے بزدل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس طرح عتاب کیا کہ ایک مدت تک انہیں تیہ (بڑے صحرا) میں حیران و پریشان رکھا کہ راستہ نہ پا سکے اور ان کا زادِ راہ ختم ہو گیا، تب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری ہمت سے دعا کی (یہ دعا مستجاب ہوئی) اللہ تعالیٰ نے ان کو منّ اور سلویٰ جیسا رزق عطا کیا جس کی تدبیر اسباب کے قبض اور بسط سے فرمائی اور ان کے لئے سائے کے مشابہ ایک گاڑھا بادل مقرر کیا، یہ بادل ان کو دھوپ سے بچاتا تھا اور ستون کی طرح ان کے لئے آگ کو بھی بنایا یہ آگ ان کو مشعلوں اور چراغوں کا کام دیتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے کپڑوں میں برکت رکھی کہ وہ نہ تو میلے ہوتے تھے اور نہ گھنے ہوتے تھے۔ یہ سب بادل اور برق کے مادے میں تصرف کرنے سے ہوا تھا، اس کے لئے علم طبیعی میں کئی نظائر موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام ہوتا تھا پھر وہ ایسے پتھر کو ملتے جس میں پانی کے بہانے کی قریبی استعداد ہوتی، تو وہ پھٹ جاتا اور اس سے پانی جاری ہوتا اور اس کو قبائل کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے بنا دیتے تھے۔

جابر لوگوں میں ایک شخص انبیاء کے علوم کو جانتا تھا اور ان کی کتابیں یاد کر رکھی تھیں پھر وہ شیطان کا مطیع بن گیا اور دنیا کی طرف جھک پڑا، اس نے اپنے لوگوں سے

کہا کہ بدکار عورتوں کو بنی اسرائیل کی طرف بھیج دو تاکہ ان میں فسق و فجور بڑھ جائے اور اس طرح ان سے برکت نکل جائے اور عنایتِ (الہٰی) میں پراگندگی ہو، کیوں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کی محبوبیت کی وجہ سے اگرچہ ان میں برکت تھی جو نصرت کی طالب تھی، لیکن بنی اسرائیل میں فسق و فجور کا غلبہ ہوگیا تھا اور وہ ان کی رسوائی کا مقتضی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بدکار عورتوں کے نکالنے کی توفیق عطا ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے جابر قوم سے قتال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس ملک پر غلبہ دیا اور ان کو وہاں بسایا جہاں سے کوئی ان کو ان کے اعمال کی جزا کے سوا نکالنے والا نہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سرزمین کا بادشاہ بنا دیا وہ بڑے آرام اور عیش میں تھے، اور موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان میں جمعیت پیدا کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو توریت کی تعلیم دیتے تھے اور وعظ کرتے تھے اور ان کو پاک کرتے تھے ان کے اندر شرعی حدود کو قائم کرتے تھے اور ظالم سے مظلوم کی داد رسی کرتے تھے۔ اپنے محبوب بندوں سے اللہ کا یہی دستور رہا ہے، ان کے لئے دنیا کو آسان کرتا ہے، ان کو گفتار کے سچے اور لوگوں میں مقبول بناتا ہے، پھر اگر کسی قوم نے اللہ پر توکل کیا اور بلا کسی تردد اور پریشانی کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اللہ ان کو اپنی طرف سے رزق عطا کرتا ہے اور ان کی کھیتی، جانوروں اور کمائی میں برکت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جن علوم کی تعلیم دی تھی ان میں سے ایک علم کیمیا بھی تھا، قارون کو یہ خبر پہنچ گئی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا، کیمیا کی وجہ سے وہ بڑا مالدار بن گیا اور اس نے (دنیا کے غرور میں) سرکشی کی اور باغی بن گیا اور اوّل آخر کو بالکل بھول گیا، اور وہ بھی فرعونیوں میں ایک فرعون تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو روکا، لیکن وہ نہ رُکا، اُلٹا حضرت موسیٰؑ سے بغض رکھنے لگا اور ان کو زنا سے متہم کیا۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری ہمت سے اس کے حق میں بددعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ایک بڑی نشانی تھی تاکہ لوگ جان لیں کہ جو شخص اللہ کے

نبیوں سے تکبر کرتا ہے اور ان سے بغض رکھتا ہے، دنیا کی زندگی سے مطمئن ہے اور اللہ کے حق کو بھلا دیتا ہے تو اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب کے اقسام میں سے اس قسم کو اختیار کرتا ہے جو اس دن اسباب طبیعیہ کے زیادہ قریب ہو، قارون کے گھر کا دھنسانا اس روز دوسرے عذابوں سے اسباب طبیعیہ کے بہت قریب تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ تھا کہ میں سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں اس لئے مزید علم کی طلب میں توقف کیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے واقعے کے ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا جو اُن کو مزید علم کی طلب کے لئے رغبت دلائے جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں امر کے ساتھ کفایت کیا اور فرمایا وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا[1] اے میرے پروردگار میرے علم کو بڑھا۔

یہ اس لئے ہوا کہ جب حق تعالیٰ کسی بندے کے لئے وقت کی صورت میں تجلّی کرتا ہے اور جن علوم کی تجلی تقاضا کرتی ہے وہ علوم اس شخص کے پاس متمثل ہوتے ہیں تو وہ ان علوم کے سوا دوسرے علوم سے بے خبر ہو جاتا ہے، ان دوسرے علوم کے اثبات یا انکار سے اس کا سروکار نہیں ہوتا بلکہ مطلقاً ان کو بھول جاتا ہے، اسی طرح اس کی آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہتی ہے جہاں تک اللہ چاہتا ہے اور محبوب کو اکثر پریشانی نہیں ہوتی اور نہ حد سے زیادہ شوق ہوتا ہے۔

الغرض، ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں لوگوں کو وہ تعلیم دینے لگے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھایا تھا۔ آپ کی تقریر اتنی مؤثر تھی کہ لوگوں کے دلوں پر چھا گئی۔ تب ایک شخص نے ان سے یہ سوال کیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام آپ سے علم میں کوئی شخص زیادہ بھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے سے زیادہ کوئی عالم نہیں دیکھتا[2]۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف

---

[1] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۴ - [2] امام بخاری رحؒ نے حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت کی ہے کہ مجھے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ اس نے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۷ پر)

وحی کی کہ ہمارا ایک بندہ خضرؑ تجھ سے علم میں زیادہ ہے، یعنی خاص اوقات میں جو الٰہی تدبیر ہوتی ہے اس کے جانتے ہیں۔ اور جب اللہ کسی شئے کی تدبیر کی تکمیل کا ارادہ کرتا ہے تو خدا کا جارحہ بن کر اس تدبیر کو بروئے کار لانے میں وہ تجھ سے زیادہ معلومات رکھتا ہے، جیساکہ موسیٰ علیہ السلام احکام کلیہ اور عام لوگوں کے لئے جو شرائع مقرر ہیں ان میں اس سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ اسی طرح دین کی اقامت میں اللہ کا جارحہ بننے میں بھی اس پر فوقیت رکھتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال کیا کہ اس سے کیوں کر ملاقات ہوگی؟ آپؑ کے دل میں یہ ڈال دیا گیا کہ اس کی طرف راستہ بتانے والی نمک لگی ہوئی مچھلی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ مچھلی خضر کا پتہ کیسے بتلائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک جوان یوشع علیہ السلام دونوں خضر کی تلاش میں نکلے اور اپنے ساتھ زنبیل میں جو کی روٹیاں اور نمکین مچھلی کو لیا اور چل پڑے۔ چلتے چلتے جب ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام سفر کی تھکان کی وجہ سے وہاں سوگئے اور یوشع علیہ السلام وضو کرنے بیٹھ گئے (وضو کے) پانی کی بوند جو اس مچھلی پر پڑی تو وہ زندہ ہوگئی اور دریا میں گرپڑی، اور جہاں سے وہ مچھلی دریا میں گئی وہاں ایک خشک راستہ ظاہر ہوگیا۔ یہ واقعہ اس لئے ظاہر ہوا کہ پانی میں جانوروں کے زندہ کرنے کی خاصیت موجود ہے، پانی کی اس خاصیت میں برکت پیدا کی گئی اور اس طرح ان دونوں نے اس علامت سے خضر کو پایا۔

(ص ۳۶۶ کا باقی حاشیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطبہ دینے لگے تو ان سے یہ سوال کیا گیا کہ لوگوں میں کون سب سے زیادہ علم رکھتا ہے؟ حضرت موسیٰ عؑ نے کہا کہ میں۔ اس پر اللہ نے ان پر عتاب فرمایا کیوں کہ ان کو اس بارے میں خدا کی طرف رجوع کرنا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی کہ مجمع البحرین کے پاس میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔ بخاری ج ۲ ص ۶۸۷ طبع اصح المطابع کراچی۔

ان دونوں کا حال یہ ہے کہ حضرت خضرؑ نے ان کو ان واقعات میں سے ایسے تین واقعے دکھائے جن کی تقریب کی تدبیر اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے یا مخلوق کی اس میں اصلاح ہوتی ہے پھر اللہ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو فعل مراد کو پورا کرنے میں اپنا جارحہ بناتا ہے۔(حق بات یہ ہے کہ) شرائع کا مدار احکام کلیہ اور حکم کے موقع پر ہوتا ہے اور تقریبات کا مدار جزئی مصلحتوں پر ہے، اور ہر فیصلہ وقت (اور حالات) کے موافق ہوتا ہے۔ یہ باتیں سب علموں سے باریک تر ہیں، ان کو صرف وہی شخص جانتا ہے جو حق کا جارحہ بنتا ہے، پھر واقعے کے بعینہ راز کو معلوم کر لیتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو کئی بار اس علم سے ذہول ہوا، مثلاً اس وقت جب انہوں نے رویتِ باری کی طلب کی اور اس وقت بھی جب قبطی کے قتل سے توبہ کی اور اس وقت جب حضرت آدم علیہ السلام سے حجت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ احکام شرعیہ میں دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے، لیکن یہ اللہ کی حکمت تھی کہ انہیں اس جیسی بات دکھائے جو ان کے لئے واقع ہوئی تھی۔

پھر حضرت خضرؑ نے اس خوف سے کہ ظالم بادشاہ کشتی کو غصب نہ کرلے کشتی کا تختہ نکال لیا، اور اللہ تعالیٰ نے کشتی کو اس طرح ڈوبنے سے بچا لیا کہ جب موج کشتی پر آتی تھی تو اس کی رفتار سخت تیز ہو جاتی تھی، اس طرح پانی کی سطح نہ پھٹی۔

اسی طرح حضرت خضرؑ نے ایک لڑکے کو قصاص کے بغیر اس لئے قتل کیا کہ وہ طبعًا کافر تھا، اگر وہ زندہ رہتا تو اس سے جبلت کے احکام (کفر وغیرہ) صادر ہوتے اور اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے اپنے ماں باپ کو قتل کرتا، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس کا اچھا بدلہ دیا۔

(تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ) حضرت خضرؑ نے ایک دیوار کی اصلاح کر کے اس کو گرنے سے بچا لیا، اور یہ اس لئے کیا کہ اس کے نیچے اللہ کے ایک صالح اور پیارے بندے نے مال چھپا رکھا تھا اس کی حفاظت ہو جائے[1] (کیوں کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ تھا)۔

---

[1] یہ قصہ سورۂ کہف میں آیت ۷۱ سے ۸۲ تک آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کا ایک بڑا واقعہ یہ (بھی) ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے لڑکے پر جو اپنی ماں کا فرماں بردار تھا رحمت کرنی چاہی، کیوں کہ اس کے باپ نے اس کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی اس کے لڑکپن سے کفالت کی یہاں تک کہ وہ جوان ہوا تو اللہ نے ارادہ کیا کہ اس پر اپنی نعمت کرے اور یہ بھی ارادہ کیا کہ جس نے اس کے قریبوں میں سے کسی کو مار ڈالا تھا اس کو یہ جزا دے کہ اس کو ورثہ نہ ملے اور اس کی رسوائی ہو اور اس کا قصاص سے قتل ہو جائے اور بنی اسرائیل پر رحمت کرنی چاہی تاکہ وہ یہ جان لیں کہ آخرت میں لوگوں کو زندہ کرنے کا جو وعدہ اللہ نے فرمایا ہے وہ حق ہے، اور یہ بھی جان لیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس چیز کا حکم دیا تھا وہ بظاہر اگرچہ بعید ہے لیکن اس کی اطاعت ضروری ہے، کیوں کہ اس میں ایک ایسا راز ہے جو ابھی منکشف نہیں اور یہ بھی جان لیں کہ اللہ کے حکم میں تشدد اور گہرائی میں جانا بے ادبی ہے، ان عنایتوں سے اللہ تعالیٰ نے واقعہ معلومہ کو پورا کیا[1]۔

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رحمت کی طرف اٹھایا تو بنی اسرائیل کی خوب حفاظت فرمائی۔ ان میں انبیاء کو بھیجا تاکہ وہ ان کو ڈرائیں، خوش خبری سنائیں، وعظ و نصیحت کریں اور انہیں نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔ اس کا نام "استطاعت میسّرہ" آسان بنانے والی قدرت ہے۔

ان میں سے کوئی بادشاہ ہوا جیسے یوشع علیہ السلام اور کوئی عالم جیسے اشعیا، یسع،

---

[1] یہ واقعہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا ہے جس کا کوئی بیٹا نہ تھا اور اس کا بھتیجا اس کا وارث تھا، اس نے اپنے چچا کو قتل کر کے دوسرے شخص کے دروازے پر پھینک دیا اور اس پر قتل کا مدعی بن گیا، اس پر دونوں فریقوں میں جھگڑا پیدا ہوا، قتل و خوں ریزی کی نوبت قریب تھی تب ایک شخص نے دونوں سے یہ کہا کہ تم کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ اللہ کے رسول تمہارے اندر موجود ہیں، تب وہ مل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سارا قصہ عرض کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو گائے کے ذبح کا حکم فرمایا۔ وہ اس کو مذاق سمجھنے لگے۔

اور شمویل علیہم السلام اور کوئی قوی ریاضت والا زاہد جیسے الیاس علیہ السلام۔ یہ سب مصلحت کی اقتضا تھی اور ہر وقت اقرب اور اسہل کے انتخاب کا خیال رکھا جاتا تھا۔

جملہ انبیاء علیہم السلام باہم بنو علات ہیں یعنی ان سب کا باپ ایک ہے جو کہ نبوت کے مناسب تربیتِ الٰہی سے عبارت ہے، اور ان کی مائیں الگ الگ ہیں اور یہ وہبی اور کسبی استعدادات کا نام ہے۔ اور بنی اسرائیل جب تک توریت کی اطاعت کرتے رہے اور اس کے احکام بجالاتے رہے اللہ ان کو برکت عطا کرتا رہا اور جب بھی انہوں نے احکام کی نافرمانی کی تو خدا نے ان سے انتقام لیا اور جب ان پر کوئی آفت آتی تھی تو اس سے نکلنے کی تدبیر (بھی) ان کے دلوں میں ڈال دی جاتی تھی اگر اس سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔ اس کا نام الٰہی سیاست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاویل احادیث شمویل و داؤد وسلیمان و یونس علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے توریت میں یہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل دو مرتبہ غلبہ حاصل کریں گے اور فساد و کفر برپا کریں گے اور ہر مرتبہ ان پر بڑی قوت والے اور طاقتور لوگوں کو بھیجا جائے گا وہ ان کے گھروں میں گھس جائیں گے۔ جب پہلا وعدہ آپہنچا تو انہوں نے توریت کے احکام کی نافرمانی کی، اور (ان کو سزا دینے کے لئے) اللہ نے ان پر جالوت کو مسلط کیا جس نے کچھ کو قتل اور قید کیا اور وہ صندوق جس میں آل موسیٰ وہارون کی تبرکات تھیں چھین کرلے گئے، اس پر بنی اسرائیل غمگین ہوئے اور توبہ کی۔ اپنے نبی شمویل علیہ السلام کی طرف رجوع ہوئے اور ان سے یہودیوں کے لئے بادشاہ کی طلب کی، کیونکہ ان کو علم تھا کہ دشمن کی بڑی جمعیت کا مقابلہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب سب کی رائے مجتمع ہو اور ملکی انتظام کے لئے ایک شخص کی قیادت ہو۔ اللہ کی حکمت میں یہ ضروری تھا کہ جس سے چاہے کافروں کو دفع کرے لیکن یہاں اس طور دفع کیا کہ مؤمنوں کے دل میں یہ خیال ڈالتے رہے کہ وہ جہاد کریں اور انہیں ثابت قدم رکھے اور بہادری دلاتے رہے اور ان کے دشمنوں پر ان کو غالب رکھے۔ اور یہ نہایت قریبی تقریب اور تدبیر تھی اور یہ طبعی مصلحتوں کے بھی زیادہ قریب تھی۔ اس واقعے میں اللہ تعالیٰ کی متعدد عنایتیں تھیں۔

اول عنایت یہ تھی کہ جب طالوت بادشاہ ہوئے تو بنی اسرائیل نے اس میں یہ عیب نکالا کہ پہلے ملکی انتظام سے اس کو کوئی واسطہ نہ پڑا ہے اور نہ یہ مالدار ہے۔ تو شمویل علیہ السلام پیغمبر نے ان کے اس اعتراض کو اس طرح دفع کیا کہ اللہ اپنی خلق میں تدبیر کے لئے جو الہام فرماتا ہے اس کا اتباع ضروری ہے۔ یہ سمجھانا بھی ان کے لئے مفید نہ ہوا تب اللہ نے ایک نشانی ظاہر فرمائی جس سے وہ مطمئن ہو گئے اور وہ علامت یہ تھی کہ ان کے پاس وہ صندوق واپس آئے گا جس میں آل موسیٰ و ہارون کی تبرکات تھیں جس کو ملائکہ اٹھاتے تھے[1]۔

اور یہ اس طرح ہوا کہ وہ لوگ باہمی اختلاف اور قحط جیسے مصائب میں مبتلا ہو گئے، تب ملائکہ نے ان کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ صندوق کی وجہ سے ان مصائب میں مبتلا ہوئے ہیں۔ تب وہ اس صندوق کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک ہٹاتے رہے یہاں تک کہ اس کو بنی اسرائیل کے ملک کے متصل پہنچا دیا اور اس کو ایک گاڑی میں رکھ کر اس خیال سے بنی اسرائیل کی طرف بھیج دیا کہ وہ ان مصائب میں مبتلا ہو جائیں۔ فی الحقیقت ان کے لئے یہ ایک تقریب اور تدبیر تھی۔ جب ان کی کوشش کے سوا ان کے پاس صندوق آگیا تو یہ ان کے لئے (فتح کی) ایک علامت تھی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے تبرکات کو دیکھ کر وہ مانوس ہو گئے (اور ان کا خوف کافور ہو گیا) اور ان کو اطمینان و آرام حاصل ہوا اور یہ تصدیق ہوئی کہ بادشاہ غیب سے مؤید اور مبارک ہے۔

دوسری عنایت یہ تھی کہ طالوت کو اپنے لشکر کی حالت اور ان کی بہادری اور قوتِ قلبی کے معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ہر ایک پر اس کی قوت کے موافق اعتماد کرے۔ اس کے لئے کافی تجربہ اور وسیع وقت کی ضرورت تھی، طالوت کو جلدی تھی، اللہ تعالیٰ نے ایک نہر ظاہر کی، وہاں ان کی آزمائش ہوئی اور طالوت نے ان کو ایک لپ (چلو) کے سوا پانی پینے سے منع کیا، اور یہ ظاہر میں وثوق، قلبی قوت اور طبیعت کے انقیاد کی علامت تھی اور اس کی بھی کہ وہ حکمت کے موافق خوفناک جگہوں میں گھسنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

خوفناک موقعوں میں گھسنے سے عقلی طور پر بہادری اور بادشاہ کی اطاعت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے

---

[1] یہ قصہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ آیت ۲۴۸ میں آیا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حادثے میں برکت کی، اس لئے طالوت کے اس پانی نہ پینے والے حکم کی اطاعت صرف ان لوگوں کو حاصل ہوئی جو کامل طور پر بہادر اور فرمانبردار تھے۔ اس طرح طالوت بہادروں اور فرماں برداروں کو پہچان گئے۔ اب جب وہ جالوت کے مقابلے کے لئے نکلے اور اس کے پاس ایک بڑا اور شان و شوکت والا لشکر تھا تو صرف وہی اس کے مقابلے کے لئے ٹھیر سکے جن میں طالوت نے بہادری کو معلوم کیا تھا۔

تیسری عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت داؤدؑ کو بنی اسرائیل میں صادق سمجھا جائے اور ملک کے والی بنیں تو اللہ نے ایک پتھر کو اس طرح گویا کر دیا کہ جب حضرت داؤد اس کے پاس سے گزرے تو پتھر کی حقیقت ان پر کھل گئی گویا کہ حضرت داؤد پتھر کی زبانی سُن رہے ہیں کہ جالوت اس پتھر سے قتل ہوگا۔ اور دوسری طرف طالوت کے قلب کو مضطر کیا کہ اس نے جالوت کے قاتل کے لئے یہ شرط لگا دی کہ جو اس کو قتل کرے گا اس کو آدھا ملک ملے گا اور طالوت اپنی بیٹی کا نکاح بھی اس سے کرے گا۔ پھر اللہ نے حضرت داؤدؑ کو دلیر کیا اور اس کے ہاتھ کو (جس میں پتھر تھا) جالوت کے نتھنوں کے مقابل کیا اور پھر ہوا کو حکم کیا کہ پتھر کو اس کے نتھنوں تک پہنچائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جالوت کو ہلاک کیا اور اس نے بنی اسرائیل کی مدد، کافروں کو دفع کرنے، داؤد علیہ السلام کی شان کو بلند کرنے اور ان کو بادشاہ بنانے کا جو ارادہ فرمایا اس کو پورا کر دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام ایک بہادر اور طاقتور انسان تھے اور ملکی سیاست کے ماہر تھے، اس لئے خدا نے ان کو ملک کا خلیفہ کیا اور اسے امامت عطا کی اور بنی اسرائیل کی قیادت ان کے ہاتھ میں رکھی اور ان کا بنی اسرائیل پر حق قائم کیا اور ملأ اعلیٰ میں یہ لکھا کہ اگر وہ داؤدؑ کی بے فرمانی کریں گے تو وہ اللہ کے بے فرمان ہوں گے اور اگر وہ داؤد کی اطاعت کریں گے تو یہ اللہ کی اطاعت ہوگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان میں اچھی طرح حکومت کی، ان کے اندر شرعی حدود جاری کیں اور کافروں سے جہاد کیا، مشکل معاملوں کے فیصلے کیے، اللہ کے احکام کو رائج کیا اور بنی اسرائیل کے مختلف قبائل میں باہمی الفت پیدا کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو عبادت کرنے اور اللہ کے سامنے عجز ظاہر کرنے کا اچھا طریقہ تھا،

اللہ نے ان پر زبور نازل کی جس کے ایک سو پچاس حصے تھے، اور ہر ایک حصہ دُعا، عاجزی اور دنیا و آخرت میں طلبِ خیر پر مشتمل تھا اور اس میں اللہ سے پناہ مانگنے کی دُعائیں تھیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام ہاتھ کے کاریگر تھے (ہنر کی صلاحیت رکھتے تھے) ان کو زرہ بنانے کا الہام ہوا، یہ خدا کی طرف سے اس پر رحمت تھی تاکہ وہ کشادہ رزق والے ہوں اور لوگوں کے لئے بھی اس میں بھلائی تھی کہ ان کو خوف سے محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر کلام الٰہی پڑھنے کو آسان کر دیا تھا وہ تھوڑی مدت میں اتنا پڑھ جاتے تھے کہ دوسرا اس مدت میں نہیں پڑھ سکتا تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان اور قوتِ خیالیہ میں برکت رکھی تھی، اس لئے وہ معمولی ساعت میں ہر لفظ کو واضح طور پر خیال میں لاتے تھے اور اس کے موافق تیزی سے تلفظ بھی فرماتے تھے، خدا نے ان کو اچھی آواز دی تھی جس سے لوگوں اور چوپایوں دونوں پر اس کا اثر ہوتا تھا اور پہاڑوں کو بھی اس کا مطیع کیا تھا کہ جب حضرت داؤد تسبیح پڑھتے تھے تو وہ صبح و شام اس کو جواب دیتے تھے، جس کی یہ صورت تھی کہ گنبد میں جب آواز کی جائے تو اس کا جواب مل جاتا ہے اسی طرح پہاڑوں سے بھی آواز ہوتی تھی، پھر اس میں برکت ہوئی اور اس سے لفظ نکلتے تھے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ قوی ہمت والا نفس کسی کیفیت سے جب پُر ہو جاتا ہے تو اس کے قریبی نفوس اور طبائع میں بھی اس کی کیفیت سرایت کرتی ہے، اور جب تجھے کسی پتھر یا درخت سے کوئی معرفت وقت کی مقتضا کے موافق سننے میں آتی ہے تو اس کی قوت دوسرے لوگوں میں بھی سرایت کرتی ہے اور پھر وہ بھی اسی طرح سنتے ہیں جس طرح تم نے سنا تھا۔

داؤد علیہ السّلام کی آواز اچھی تھی اور تالیفی طبیعت کے مالک تھے، خدا کی طرف سے اس میں برکت ہوتی اور ہر سانس میں تاثیر کی طبیعت رکھتے تھے ان انفاس میں بھی برکت ہوئی تو ایک لذیذ ترجیع وجود میں آگئی، اسی کا نام مزامیر داؤد علیہ السّلام ہے۔

حضرت داؤد علیہ السّلام کے عجیب واقعات تھے۔ ایک یہ کہ جب ان کی ایک خوب صورت عورت پر نگاہ پڑی تو آپ نے اسے بے حد پسند کیا۔ اور وہ عظیم قوت باہ والے انسان

اور اپنے مزاج کی قوت کی وجہ سے عورتوں کو دوست رکھنے والے تھے۔ انہوں نے اس عورت کے نکاح میں نامناسب رویہ اختیار کیا، شریعت نے جو اس کے لئے حد بنائی تھی اس کی رعایت نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو اس طرح تنبیہ کی کہ ملائکہ کو مدعی اور مدعیٰ علیہ کی صورت میں خصوم بنا کر بھیجا۔ ایک نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے وہ کہتا ہے کہ یہ بھی مجھے دے دو، بات کرنے میں مجھ پر غالب آتا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے جو کام خود کیا تھا وہ عالم مثال میں متمثل ہو کر ان کے سامنے آگیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا۔ داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ ایک خواب تھا جس کی تعبیر اس پر تنبیہ کرنا ہے جو اس سے نامناسب واقعہ سرزد ہوا۔ پھر اللہ سے مغفرت مانگی اور اس کی طرف رجوع کیا اور کفارے دیئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کیا۔[۱]

---

[۱] مؤلف امام نے حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے میں بعض تفسیروں کی موافقت کی ہے اور یہ تحقیق نہیں۔

ہمارے استاذ علامہ عبید اللہ سندھیؒ فرماتے تھے کہ عہد عتیق میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی طرف یہود کی طرف سے کچھ ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ہندوؤں کی کتابوں کے افسانوں سے زیادہ فحش ہیں۔ حضرت استاد فرماتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ کے اس قصے میں میرا ایک خصوصی فکر ہے جس کو میں نے کسی سے نہیں لیا، یہ صرف خدا کی طرف سے فہم ہے جو مجھے عنایت ہوا اور میری کوشش ہے۔ اس کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ حکومت کے مختلف درجے ہوتے ہیں، شاہ شہیدؒ نے ان کو اپنی تالیف "منصب امامت" میں ذکر کیا ہے، میں ان میں سے یہاں صرف اسلامی حکومت کے اندر جو دو درجے ہیں ان کو نقل کرتا ہوں (۱) ایک درجہ خلافتِ راشدہ ہے جس کی سیرت اور صورت اس عقلی قانون پر ہے جو اہل امانت کے ہاتھوں کتاب کریم میں معروف ہے؛ اس درجے میں مال کا جمع کرنا، لوگوں کو حقیر کرنا اور کسی کو غلام بنانا نہیں ہوتا۔ (۲) یہ دوسرا دور خلافت کے بعد کا دور ہے، اس میں پہلے دور کے آثار ایک ایک ہو کر کم ہوتے جاتے ہیں، اور اس کا بڑا

(باقی حاشیہ صہ ۳۷۴ پر)

(صفحہ ۳۷۴ کا باقی حاشیہ)

مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسکینوں سے ٹیکسوں وغیرہ کے ذریعے مال لے کر ایک قوم (سرمایہ داروں) کو دوسری قوم (عوام) پر فوقیت دی جاتی ہے، اس میں سرمایہ داروں سے تعاقب نہیں کیا جاتا، ابتدا میں تو یہ معمولی بات نظر آتی ہے اور لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی لیکن اس کا انجام بڑا ظلم ہوتا ہے جو سب کو دیکھنے میں آتا ہے۔

خصوم والی مثال کا مقصد خلافت کے ان دو درجوں کا فرق بتانا تھا یہ ایک ایسی حکیمانہ مثال ہے جس میں بڑے فوائد پنہاں ہیں "یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک بھیڑ ہے"۔ یہ بادشاہ اور رعیت کے ایک فرد کی مثال ہے۔ رعیت کے ایک فرد کے مال و دولت کی نسبت بادشاہ کے سرمایہ سے وہی ہے جو ایک کو ننانوے سے ہے۔ بادشاہ اپنی قوت کے بل بوتے پر اس ایک حصے کو بھی چھیننا چاہتا ہے۔ یہ ایک واضح مثال تھی جس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبہ ہوا اور سمجھ گئے کہ یہ ایک بڑا ظلم ہے اور یہ اس دور میں ہوا جب آپ خلیفہ نہ تھے، بادشاہوں کے نظام کے مطابق ملکی نظام چلاتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس مثال سے سمجھ گئے کہ یہ ہماری آزمائش ہے۔ انہوں نے اپنے رب سے مغفرت چاہی، رکوع میں چلے گئے اور خدا کی طرف رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ خیال نہ تھا کہ لوگوں کی ضرورت کے لئے اگر ان سے حکومت مال لے گی تو اس سے ظلم واقع ہوگا، بعد میں ان کو حکم ہوا:۔ "اے داؤد ہم نے تجھے ملک میں خلافت عطا کی ہے، لوگوں میں حق و انصاف سے فیصلہ کر نفسانی خواہش کا اتباع نہ کر!" یہاں ہویٰ اور نفسانی خواہش سے مراد ہے آخرت سے محروم ہو کر صرف دنیا میں انسان کی لذت والی چیزوں کی طرف نفس کا مائل ہونا۔

(کتاب حروف اوائل السور عربی تالیف علامہ موسیٰ جار اللہ صفحہ ۱۹۰ طبع بھوپال)

سنوسی تحریک

حافظ عباد اللہ فاروقی ایم اے

سنوسی تحریک کے بانی شیخ سنوسی ہیں، جن کا پورا نام سید محمد بن علی بن السنوسی الخطابی الحسینی الادریسی المناجری تھا، یہ فاطمی سید تھے جو الجزائر کے شہر مستغنم میں پیدا ہوئے، تاریخ پیدائش ۱۸۰۳ء ہے۔ الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہونے لگا تو انہوں نے وطن عزیز کو خیرباد کہا، اور کئی اسلامی ملکوں میں پھرنے کے بعد طرابلس میں قیام پذیر ہوئے، اور وہیں سنوسی تحریک کی بنیاد رکھی۔ ان کا انتقال ۱۸۶۰ء میں ہوا اس تحریک کو طرابلس کی جنگ آزادی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ جنگ عظیم میں سنوسیوں نے تقریباً پورے طرابلس کو اٹلی کے قبضہ سے چھڑا لیا تھا، ۱۹۳۳ء میں دوبارہ اتحادیوں نے طرابلس پر برطانوی قبضہ تسلیم کرلیا تو سنوسی لیڈروں نے اپنی جدوجہد پھر شروع کر دی۔ مسولینی نے ہر طرح سے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی، ان کے خلاف وحشی غیر مہذب اور ظالم ہونے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے وجود کو عیسائیت کے لئے مستقل خطرہ قرار دیا گیا۔ مسولینی کی اس روش پر جب یورپ کی دیگر اقوام معترض ہوئیں تو مسولینی پکار اٹھا اقبال کی زبانی سنیئے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے، مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج!
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام!
تم نے لوٹی کشت دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی،
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج[1]

آخر ۱۹۳۱ء میں جدید ترین ہتھیاروں کے استعمال سے انہیں کچل دیا گیا۔ اگرچہ انہیں شکست ہوگئی لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اگر استبداد کا مقابلہ کرنے کے لئے سنوسی مجاہدین میدان میں نہ آتے تو اسلامی افریقہ انیسویں صدی میں ہی یورپ کی ہوس استعمار کا شکار ہوگیا ہوتا۔

علامہ اقبال ان حالات سے پوری طرح سے متاثر تھے۔ کم و بیش یہی زمانہ تھا، جب انہوں نے جاوید نامہ لکھا (یعنی ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان) اس میں فلکِ زہرہ کی سیر کرتے ہوئے خدایانِ قدیم کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں۔ سوڈانی درویش یعنی سید محمد احمد روحِ عرب کو بیداری کا پیغام دیتی ہے پھر روحِ افریقہ کو یوں خطاب کرتی ہے ؎

اے جہانِ مومنانِ مشک فام
از توے آید مرا بوئے دوام،

---

[1] ضرب کلیم صد ۱۵۲

زندگانی تاکجا بے ذوقِ سیر تاکجا تقدیرِ تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تابکے، استخوانم در بےِ نالہ چو نے
از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰ است
مرد را روزِ بلا روزِ صفاست

"اے مشک جیسے چہروں والے مومنوں کی دنیا! یعنی اے افریقہ مجھے تیرے اندر سے دوام کی خوشبو آرہی ہے۔ آخر کب تک تو ذوقِ سیر کے بغیر زندگی گذارے گی کب تک تیری تقدیر غیروں کے قبضہ میں رہے گی؟ تو کب تک اپنے اصل مقام پر نہ پہنچے گی؟ میری ہڈیاں 'نے' کی طرح وقفِ فریاد و فغاں ہیں۔ کیا تو مصیبتوں اور بلاؤں سے ڈرتی ہے؟ آہ! تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد نہیں کہ مرد کے لئے بلاؤں اور مصیبتوں کا دن گناہوں اور خطاؤں سے پاک وصاف ہونے کا دن ہے۔"

اس مختصر تمہید کے بعد ہم شیخ سنوسی کی تحریک کا پورا جائزہ لیتے ہیں۔

شیخ سنوسی کی تعلیم اور تبلیغ کے اصول خالص اسلامی تھے وہ قرآن وحدیث کے براہ راست مطالعہ پر زور دیتے تھے۔ نیز اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ پیغمبر اسلام جس سیدھے اور صاف انداز میں اسلام پیش کیا اور شروع زمانہ کے مسلمانوں نے جس طرح اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا وہی طریق کار امت کو اختیار کرنا چاہئے۔ وہ آزادی کو اسلام کی بنیادی تعلیم قرار دیتے تھے اسی وجہ سے فکری اور سیاسی آزادی کے علمبردار تھے۔ فکری آزادی سے ان کی یہ مراد تھی کہ مسلمان کا ذہن آزاد رہ کر خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرے۔ اس کے بعد کسی مذہبی پیشوا یا بزرگ کی تقلید اس پر فرض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو شیخ سنوسی اپنے آپ کو مالکی فقہ کے پیرو کہتے تھے لیکن اس کی پیروی وہ سختی اور باقاعدگی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے مفسروں کی رائے کو ضروری نہ بتاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے علم حدیث کافی ہے۔ جب تک لوگ علماء کی تقلید میں مقید رہیں گے ان کے ذہن پر قرآن کی حقیقت روشن نہ ہوسکے گی۔ اس

طرح وہ ابتدائی دور کے اسلام کو عقائد اور عمل کا نمونہ قرار دیتے تھے اور اپنے رفقاء کو اسی نمونہ پر چلنے کی تبلیغ کرتے تھے۔

وہ سیاست کو اسلام سے الگ نہیں سمجھتے تھے، ان کی تحریک کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی مثال اسلام کی تعلیم پر ہو۔

شیخ سنوسی کی تبلیغ الجزائر، ٹیونس اور طرابلس میں کامیاب رہی لیکن جب وہ مصر پہنچے تو جامعۂ ازہر کے علماء نے ان کو غیر مقلد قرار دیکر ان کی مخالفت کی۔ چنانچہ انہیں مکہ جانا پڑا۔ یہاں ۱۸۳۵ء میں انہوں نے ابوقبیس میں اپنی پہلی خانقاہ قائم کی اور وہابی فرقہ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب مکہ کے علماء ان کے خلاف ہوگئے تو انہیں ۱۸۴۳ء میں مکہ چھوڑ کر لیبیا کے صوبہ سائری نیکا میں قیام پذیر ہونا پڑا یہاں انہوں نے اپنی مشہور خانقاہ "زاویۂ بیضئی" کے نام سے قائم کی۔ لیبیا .... میں یہی خانقاہ ان کی تبلیغ کا مرکز بنی۔ سنوسی تبلیغ کا پروگرام یہ تھا کہ وہ پہلے ایک مرکز قائم کرتے جو "زاویہ" کہلاتا ہے یہ ایک شیخ کے ماتحت ہوتا تھا جو دینی تعلیم سے مکمل طور پر آراستہ ہوتا تھا وہ اپنے حلقے میں اشاعتِ مذہب کے علاوہ قبائلی اور انفرادی جھگڑوں کا بھی فیصلہ کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں سنوسی شیخ کو وہ کامیابی حاصل ہوئی جو کبھی ترکوں کو میسر نہ آئی تھی۔ شیخ کے عقیدت مندوں پر فرض تھا کہ وہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے "زاویہ" کو امداد دیں۔ اس طرح جو رقم وصول ہوتی تھی اس کا زیادہ حصہ "زاویہ" کی کوششوں کے سلسلہ میں صرف ہوتا تھا بقایا رقم تحریک کے مرکزی امیر کو پہنچائی جاتی اس طرح شیخ محمد علی سنوسی کے زاویوں نے بہت جلد ترکوں کی سلطنت کے اندر ایک دوسری سلطنت کی سی حیثیت اختیار کرلی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کو سنوسی تحریک کھٹکنے لگی۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء میں جب ترک ان کے خلاف آمادۂ جنگ ہوئے تو سنوسی لیڈروں نے گریز کیا اور جنگ کا موقعہ نہ دیا،

ان کا مقصد ملک گیری یا جنگ وجدل نہ تھا۔ بلکہ وہ اسلام کی تبلیغ کے لئے نکلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا، میں انہوں نے کوئی فوجی تنظیم بھی نہ کی تھی لیکن انہیں جلد محسوس ہونے لگا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ تاہم انہوں نے ترکوں کی جنگی کاروائی دیکھ کر 'سائری نیکا' کا علاقہ چھوڑ دیا اور 'جغبوب' کے نخلستان کو اپنا مرکز بنالیا اب ان کی جماعت فوجی رنگ اختیار کرنے لگی۔ شیخ سنوسی کا اس جگہ ۱۸۶۰ء میں انتقال ہوگیا۔ شیخ نے دو۲ لڑکے، شیخ محمد شریف اور المہدی چھوڑے۔ المہدی کو مسند خلافت پیش کی گئی جو اس نے قبول کرلی۔

شیخ مہدی سنوسی نیک اور باشعور انسان تھے۔ ان کو بھی اپنے تقدس اور سیاسی دُور اندیشی کی وجہ سے قوم میں وہی مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کے باپ کو حاصل تھی ان کے زمانہ میں سنوسی 'زاویے' "لیبیا" سے باہر الجزائر فلسطین ترکی اور ہندوستان میں بھی قائم ہوئے شمالی افریقہ میں مشرق کی طرف مصر کی مغربی سرحد سے سوڈان کے وسط تک اور مشرقی صحرا میں طرابلس کے ساحلی علاقہ تک شیخ احمد سنوسی کا اثر قائم ہوگیا اور ان کو بادشاہی اختیارات حاصل ہوگئے۔ سنوسیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ترکوں کو خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ سلطان عبدالحمید دوم کو اس بات کا پورا اندازہ ہوچکا تھا کہ طرابلس اور سائری نیکا کے بیشتر حصوں میں ترکی گورنروں کی وہ عزت اور وقار نہیں جو سنوسی شیخ کو حاصل ہے۔ سلطان عبدالحمید نے جنگ کا قصد کیا لیکن سنوسیوں نے ۱۸۸۹ء جغبوب کو چھوڑ کر 'کفری' کے ریگستان کو اپنا مرکز بنالیا یہاں حبشیوں کی ایک کثیر تعداد ان کے ساتھ مل گئی۔

یہاں انہیں فرانسیسیوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا کیونکہ فرانسیسی کانگو کی طرف سے وسط سوڈان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ سنوسی علاقہ تھا۔ سنوسی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک ان کے خلاف برسرپیکار رہے بالآخر سنوسیوں کو یہ علاقہ فرانس کو دینا پڑا۔ فرانس نے ٹیونس پر بھی قبضہ کر رکھا تھا جس کو اٹلی بعض وجوہ کی بناء پر برداشت نہ کرتا تھا۔ لیکن فرانس نے یہ چال چلی کہ اٹلی کو اجازت دے دی کہ وہ طرابلس پر قبضہ

کرلے تاکہ ٹیونس کے بارے میں خاموش ہو جاتے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ طرابلس الغرب کی تمام آبادی مذہباً مسلمان تھی اور نسلاً عرب، بربر اور ترک تھے۔ قلیل تعداد میں اطالوی بھی تھے۔

فرانس کے ایماء پر اٹلی نے طرابلس کو ہڑپ کرنے کی ٹھانی۔ برطانیہ نے اطالویوں کے اس جارحانہ اقدام کو باضابطہ منظور کیا۔ مصر جو ابھی تک ترکوں کی سیادت و سلطنت میں تھا اس کو برطانیہ نے مجبور کر کے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کروا دیا تاکہ ترکوں کو مصر کے راستے سے طرابلس کے محاذ جنگ پر فوجیں بھیجنے سے روک سکیں۔ ان حالات میں 'لیبیا' کی دونوں جماعتیں یعنی سنوسی عرب اور طرابلسی عرب ترکیہ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ادھر ۱۹۱۲ء میں ترکوں کے خلاف یونان، بلغاریہ اور سرویہ کا اتحاد قائم ہو گیا۔ پھر عیسائی سلطنتوں نے سلطنت ترکیہ کی مسیحی آبادی کے حقوق کی حفاظت کے بہانے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس موقعہ پر ترکی نے مسلمانوں کو اتحادِ اسلامی . . . . . . کی دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرابلس کی جنگ میں اٹلی کا صرف ترکوں اور لیبیا کے باشندوں ہی سے مقابلہ نہ تھا بلکہ کل اسلامی دنیا کی مخالفت کا سامنا تھا۔

ترکوں کی بدقسمتی ملاحظہ ہو۔ یہ جنگ ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں پہلی جنگ بلقان شروع ہو گئی۔ ترکوں کے لئے طرابلس اور بلقان کے محاذ پر بیک وقت لڑنا ناممکن ہو گیا۔ ناچار انہوں نے طرابلس کو چھوڑ کر اٹلی کے ساتھ لوازن کے مقام پر صلح کر لی۔ یہ صلح نامہ لوازن کا صلح نامہ کہلاتا ہے۔ اس کی رُو سے ترکوں نے عملاً طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ اٹلی نے اس کے جواب میں جزائر بحیرۂ ایجین سے اپنی فوجیں ہٹانا منظور کیا مگر بعد میں یہ وعدہ پورا نہ کیا۔

ادھر لیبیا کو اگرچہ ترکوں نے اٹلی کے حوالے کر دیا۔ لیکن لیبیا کے سنوسی عربوں اور طرابلسی عربوں نے اٹلی کا سیاسی اقتدار تسلیم نہ کیا کیونکہ اس سے پیشتر ترک عربوں کی آزادی کا اعلان کر چکے تھے۔ چنانچہ جنگ کا میدان گرم رہا۔ اس علاقہ سے ترکی کا تسلط

اٹھ جانے کے باوجود اٹلی اس ملک کو فتح نہ کرسکا۔ ۱۹۱۵ء تک اٹلی کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ سنوسیوں نے اٹلی کو "سولم" کے مقام پر شکست دی لیکن آخرکار اطالوی فوجیں طرابلس اور حمص کے علاقوں پر قابض ہوگئیں۔

ادھر فرانس نے مراکش الجزائر اور ٹیونس کو ہضم کر رکھا تھا انگریز مصر کو غلام بنا چکے تھے۔ ایران کو روس ہڑپ کرنے کی فکر میں تھا جنگِ عظیم کے بعد مسلمانوں پر وہ آفتیں ٹوٹیں کہ ان کے قویٰ مفلوج ہو کر رہ گئے۔ فرانس نے علاوہ ٹیونس اور الجزائر کے شام اور لبنان پر بھی قبضہ کرلیا۔ برطانیہ نے عراق اور شرق اردن پر اپنا تسلط جمالیا۔ اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ یونانیوں نے انگریزوں کی شہ پاکر سمرنا کے مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھائے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مشہد مقدس پر بھی گولہ باری کی گئی۔ ان حالات میں مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں ؎

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اے شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن واماں شام و نجد و قیرواں کب تک؟

غرض جب کہ ترکیہ کی قوت پارہ پارہ ہوئی تو مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ان پُرآشوب اور نامساعد حالات میں بھی سنوسی عرب مقصد کی خاطر میدانِ جنگ میں لڑتے رہے۔ اس زمانہ میں سنوسی جماعت کے صدر نشین سید احمد شریف سنوسی تھے جو تحریک کے بانی سیّد محمد بن علی کے پوتے تھے۔ چونکہ یہ اِتحادِ اسلام کے زبردست حامی تھے، اس لئے ترکی خلافت کی طرف سے ان کو شمالی افریقہ کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک) کے دوران میں چونکہ سنوسی فرقہ ترکوں کے ساتھ تھا اس لئے ترکوں کی مدد کی خاطر شیخ احمد سنوسی نے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ چنانچہ وسطی سوڈان اینگلو مصری سوڈان اور جھیل چھڈ کے علاقہ میں اتحادی طاقتوں کے ساتھ ان کی جنگ چھڑ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں سنوسیوں نے مصر پر بھی حملہ کر دیا لیکن دو سال کی جنگ کے بعد سنوسیوں کو شکست ہوئی اور شیخ احمد کو جلاوطن ہونا پڑا۔ اٹلی والوں نے شیخ سید محمد ادریس سنوسی کو جو شیخ احمد شریف سنوسی کے چچازاد

بھائی تھے اور مدت سے مصر میں مقیم تھے، بُلا کر سنوسیوں کا سردار بنایا اور اس سے یہ معاہدہ کیا کہ ان مقامات کو چھوڑ کر جو فوجوں کے قبضہ میں ہیں باقی کل سائرینیکا کا علاقہ شیخ ادریس کے قبضہ میں رہے گا۔

۱۹۱۸ء میں جب ترکی کو جنگ عظیم میں شکست ہوئی تو طرابلس کے عربوں نے اپنے ملک میں جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے شیخ احمد ادریس کو جمہوریت کا صدر بنایا۔ اٹلی کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اسی زمانہ میں اٹلی میں انقلاب ہوا، فسطائی جماعت برسر اقتدار آئی اور اٹلی میں آمریت (ڈکٹیٹر شپ) قائم ہو گئی۔ اٹلی کی نئی حکومت نے لیبیا کی آزادی کو کچلنا چاہا۔ شیخ احمد سنوسی کو لیبیا چھوڑ کر مصر میں پناہ لینی پڑی، لیکن اس کے باوجود طرابلس کے قبائلی سردار اور سنوسی عرب اٹلی کے خلاف لڑتے رہے بالآخر لیبیا کے دونوں صوبوں کو انتظامی معاملات میں کچھ اختیارات مل گئے۔ لیکن یہاں کے باشندوں کو تسلی نہ ہوئی ملک میں بغاوت پھیل گئی اٹلی والوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ سینکڑوں عربوں کو برسر بازار پھانسی دی گئی۔ اٹلی کے یہ مظالم نو سال تک جاری رہے۔ عرب نہایت بہادری سے ان کا مقابلہ کرتے رہے آخر ان کے ملک پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا لیکن سنوسی تحریک جاری رہی۔

گو شیخ محمد ادریس مصر میں جلاوطن تھے، لیبیا میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اٹلی کے قبضہ کے بعد بہت سے عرب لیڈروں کو جلاوطن ہو کر مشرقِ وسطیٰ میں پناہ لینی پڑی جہاں انہوں نے بالخصوص دمشق میں اٹلی کے خلاف انجمن قائم کی۔ یہ انجمن لیبیا سے باہر رہ کر اٹلی کی مخالفت کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیگر عربی ممالک بھی لیبیا کے ساتھ ہمدردی کرنے لگے۔

۱۹۳۹ء میں جب یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس وقت لیبیا کے عرب ایک کثیر تعداد میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان سب نے مصر میں اسکندریہ کے مقام پر ایک کانفرنس کی اور بذریعہ قرارداد یہ اعلان کیا کہ وہ لیبیا کے دونوں صوبوں کا لیڈر سید ادریس سنوسی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد کانفرنس ہی

کی تحریک پر سید ادریس سنوسی برطانوی فوجی افسروں سے ملے اور ان سے کہا اگر یہ وعدہ کیا جائے کہ برطانیہ لیبیا کو آزاد کرکے سید ادریس سنوسی کے حوالے کردے گا تو لیبیا کے باشندے انگریزوں کو اٹلی کے خلاف مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ انگریز اس شرط کو ماننے پر آمادہ ہو گئے۔ لیبیا نے ۵ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج جس کا نام 'لیبین عرب فورس' تھا، انگریزوں کی مدد کے لئے بھیجی۔ ۱۹۴۲ء میں انگریزوں نے اٹلی کو شکست دی۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد انگریزوں نے لیبیا میں اپنا عارضی تسلّط قائم کرلیا ملک کا نظام حکومت انگریزی فوج کے ہاتھ آگیا۔ البتہ بعض وہ عہدے جو اب تک اٹلی والوں کے پاس تھے عربوں کو دے دیئے گئے لیکن عربوں کو تشفی نہ ہوئی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سید ادریس کو امیر لیبیا مقرر کیا جائے اس کے جواب میں انگریزوں نے یہ کہا کہ ہیگ کے معاہدے کی رُو سے ہم اس وقت تک دشمن سے چھینے ہوئے ملکوں کی آزادی کے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکتے جب اتحادی قومیں متفقہ طور پر نئے نظام کے متعلق یہ طے نہ کردیں کہ کونسا ملک کس کے پاس رہے گا۔

لیبیا والے آزادئ ملک کے لئے کوشاں رہے، بالآخر ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو انہیں آزادی نصیب ہوئی اور سید محمد ادریس کو لیبیا کا پہلا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح الجزائر کے مسلمان پیہم کوششوں کے بعد لیلائے آزادی سے ہمکنار ہوچکے ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے۔

عروس ملک کسے درکنار گیرد تنگ
کہ بوسہ برلبِ شمشیر آبدار زند

سلسلۂ مجدّدیہ کا ایک نادر مخطوطہ

(ڈاکٹر) غلام مصطفیٰ خان

(مخطوطہ کے جامع نے رسالے کے مصنف کی کتاب ' الجنات الثمانیۃ '
میں سے مجددیت سے متعلق مضمون یہاں بطور ضمیمہ نقل کردیا ہے)

تذئیل:- قال المصنف قدس سرہ فی رسالتہ المسمی بجنات الثمانیۃ الاولیٰ فی البشارۃ المخبرۃ عن وجودہ قبل ان یوجد فالاولیٰ والاعلیٰ والافضل و اشرف ما اوردہ العارف باللہ خواجہ محمد ھاشم فی مقاماتہ ان صاحبًا لی قال یومًا انک تذکر من کمالات شیخک یعنی بہ المجدد رضی اللہ عنہ مالا یذکر

ضمیمہ:- مصنف قدس سرہٗ نے اپنے رسالہ الجنات الثمانیۃ میں فرمایا ہے کہ پہلی جنت تو اس بشارت میں ہے، جس میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی تھی۔ یہ بشارت سب سے اولیٰ، اعلیٰ، افضل اور اشرف ہے یہ روایت عارف باللہ خواجہ محمد ہاشمؒ نے اپنے مقامات میں اس طرح بیان کی ہے کہ میرے ایک ساتھی نے ایک روز مجھ سے کہا کہ آپ اپنے شیخ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے ایسے کمالات بیان کرتے ہیں جو مشائخ کرام میں سے کسی

من المشائخ الکرام وما
یتحیر فیه العقول والافهام
ولو کان کذلک لاخبر
بوجوده صاحب الوحی
علیه الصلوٰة والسلام کما
اخبر بوجود المهدی
علیه السلام للانام قلت
لعله اخبر بوجود ذلک
ولم نطلع علیه ولا
یلزم من عدم العلم
بالشئ عدم وجود
ذلک الشئ - وقال
عندی کتاب جمع الجوامع
للسیوطی رحمة الله علیه
فیه احادیث النبی صلی
الله علیه وسلم فاجمعها
التفحص فیه فان کان
هناک خبر الحالة اعتقد بها
ففتح الکتاب فاذا فیه
هذا الحدیث اخرجه ابن سعد
عن عبد الرحمٰن بن یزید ایضاً عن
جابر بلاغاً عنه صلی الله علیه وسلم
" یکون فی امتی رجل یقال

کے بیان نہیں کئے گئے اور جنہیں سن کر
عقل پر حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سب
کچھ صحیح ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش
کی خبر ضرور دیتے جیسے حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے لوگوں کو امام مہدی علیہ السلام
کے ظاہر ہونے کی خبر دی ہے۔ میں نے انہیں
جواب دیا کہ ہو سکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے
پیدا ہونے کی خبر دی ہو مگر اس کا ہمیں علم
نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونے
سے اس چیز کا موجود نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔
پھر خواجہ ہاشمؒ نے فرمایا کہ میرے پاس سیوطی
رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب 'جمع الجوامع'
ہے جس میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
جمع کی گئی ہیں، میں نے اپنے عقیدے کے
مطابق حدیث تلاش کرنے کے لئے کتاب
کھولی تو اس میں ایک حدیث ملی جو ابن سعد
نے عبد الرحمٰن بن یزید سے اور انہوں نے
جابر رضؓ سے روایت کی ہے۔ حضرت جابرؓ
نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا
کہ حضورؐ نے فرمایا کہ " میری امت میں
ایک شخص ایسا پیدا ہو گا جو 'صلہ' کے نام

له صلة يدخل الجنة
بشفاعته كذا وكذا"
وانت خبير بان هذا
اللقب له مشهور بين
اصحابه قدس سرهم
وذلك لانه كتب فى مكاتبه
الحمد لله الذى
جعلنى صلة بين البحرين
ووصلة بين الفئتين۔ وهذا
اشارة الى انه كما بلغ هذا
الجهد فى تطبيق اقوال الصوفية
والعلماء الشريعية والطريقية
فيسمى نفسه بالهامه سبحانه۔

منها ماذكر الفاضل الكامل
الشيخ بدرالدين السرهندى فى
المقامات ان الشيخ الاسلام احمد
الجامى صاحب الكرامات التى
قلما يذكر بمثلها من الاقطاب
والاوتاد، كما فى نفحات الانس
وغيرها قدس سره ونور
مرقده قال يجئ من بعدى
سبعة عشر رجلا من
اهل الله يسمون باحمد

سے مشہور ہوگا اور اس کی شفاعت سے
بہت سے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔
پھر میں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت
مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصحاب
میں اسی لقب سے مشہور تھے کیونکہ
آپ نے اپنے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے
"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے
مجھے دو سمندروں کو ملانے والا بنایا اور مجھے
دو گروہوں کو متحد کردیا"۔ یہ آپ کی جدّو
جہد کی طرف اشارہ ہے جو آپ نے صوفیہ
عظام اور علماء شریعت کے اقوال میں تطبیق
کرنے کے لئے تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنا نام
اسی حدیث کی بناء پر "صلہ" رکھا۔

فاضل کامل حضرت شیخ بدرالدین
سرہندیؒ نے اپنے مقامات میں ذکر کیا ہے
کہ شیخ الاسلام احمد جامی رحمۃ اللہ علیہ سے
ایسی ایسی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اقطاب
و اوتاد سے بھی ایسی کرامات کا ظہور نہیں
ہوا۔ اسی قسم کا مضمون "نفحات الانس"
میں بھی بیان کیا گیا ہے ۔ چنانچہ شیخ الاسلام
احمد جامیؒ نے فرمایا ہے "میرے بعد سترہ
اہل اللہ ایسے ظاہر ہوں گے جن کا نام
"احمد" ہوگا اور دسویں صدی کے اوائل

آخرھم یخرج علی راس الالف احسنھم و اعلمھم و اجمعھم، فقال غفیر من ارباب الکشف ان المراد منه المجدد للالف الثانی۔ ووقع فی مقامات الشیخ ظھیرالدین خلف الشیخ المذکور قدس سرھما حکایة عجیبة یؤید ھٰذہ البشارۃ تائیدا اجلیا۔

منھا ما نقله الثقات من الولی الشھیر الشیخ خلیل اللہ البدخشانی قدس سرہ انه وقع فی بعض رسالة انه سیخرج من سلسلة خواجہ روّح اللہ ارواحھم من الھند رجل کبیر عظیم صاحب کمال لانظیر له فی عصرہ یا أسفا علیٰ لقائه۔ فلما توفی الشیخ طلع ھٰذا الکوکب الدری۔

منھا ان قدوۃ الاولیاء خواجگی الامکنگی قال لخلیفة الاکمل وھو امام العرفاء وشیخنا خواجہ محمد الباقی

میں اسی نام کے ایک ایسے بزرگ پیدا ہوں گے جو آخری احمد ہوں گے اور مرتبۂ ولایت میں سب سے اعلیٰ وارفع ہوں گے چنانچہ ارباب کشف کے ایک جم غفیر نے فرمایا ہے کہ وہ صاحب کرامات ولی حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں — شیخ الاسلام احمد جامی کے خلف الرشید حضرت شیخ ظہیرالدین کی کتاب مقامات میں ایک ایسی عجیب وغریب حکایت بیان کی گئی ہے جس سے بشارت مذکورہ کی تائید ہوتی ہے۔

آپ کی مجدّدیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ثقہ راویوں نے حضرت شیخ خلیل اللہ بدخشانی قدس سرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت شیخ مذکور نے اپنے ایک رسالہ میں تحریر فرمایا ہے: کہ بسلسلہ خواجگان رحمہم اللہ ہندوستان میں ایک ایسا عظیم اور باکمال شخص پیدا ہوگا جس کی نظیر نہ ہوگی افسوس کہ میں اس کی زیارت نہ کرسکوں گا — چنانچہ جب حضرت شیخ خلیل اللہ قدس سرہ کا وصال ہوگیا تو حضرت مجدّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ظہور اجلال فرمایا۔

ایک ثبوت یہ ہے کہ قدوۃ الاولیا حضرت خواجہ امکنگی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خلیفۂ کامل امام العارفین وشیخنا خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ

قدس سره انه یخرج رجل من الهند علی یدك اماما فی عصره صاحب الحقائق و الاسرار اسوع فان اهل الله منتظرون لقدوم ذلك العزیز فلما توجه قدس سره من البخارا الی الهند و ادركه المجدد رضی الله عنه واخذ منه الطریقة خاطبه بهذا الكلام "قد علمت انك ذلك الرجل المبشر به" و لما دخلت بلدة سرهند رأیت رجلاً وقیل لی هذا قطب زمانه فلما رأیتك عرفتك بتلك الحلیة والصورة۔

و قال ایضا لما دخلت سرهند رأیت هنالك مشعلة اوقدت فی غایة الرفعة و العظمة كانها وصلت الی السماء

سے فرمایا "ہندوستان کا ایک ایسا شخص آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوگا، جو اپنے زمانہ کا امام ہوگا وہ صاحب اسرار وحقائق ہوگا، اسے جلد اپنے سلسلہ میں داخل کیجئے کیونکہ تمام اہل اللہ اس باکمال شخص کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ بخارا سے ہندوستان تشریف لائے تو مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر حضرت باقی باللہ قدس سرہ نے آپ سے فرمایا "بیشک آپ وہی شخص ہیں جس کی بشارت مجھے دی گئی تھی"۔ پھر حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ نے فرمایا "جب میں شہر سرہند میں داخل ہوا تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ یہ قطب زمانہ ہیں پس جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ کے حلیہ اور شکل وصورت سے پہچان لیا کہ آپ ہی وہ بزرگ ہیں جن کی مجھے بشارت دی گئی تھی۔

اسی طرح حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے "جب میں سرہند میں داخل ہوا تو وہاں میں نے ایک مشعل دیکھی جو انتہائی رفعت وعظمت کے ساتھ روشن ہے گویا کہ وہ آسمان تک پہنچ

وقد امتلأ العالم من نورها شرقا وغربا، و تزايد انوارها ساعة فساعة ويستوقد عنها الناس سراجا سراجا وهذا فی شانك۔

منها ماذکر اصحاب المقامات ان قدوة الكاملين الشاه كمال الكيتلی القادری الذی اخبار خوارقه وكراماته بلغت حد التواتر، ودّع الجبة المباركة قيل انها كانت متوارثة من الشيخ الاعظم والغوث الاكرم السيد عبدالقادر الجيلانی قدس سره عنده فان هذا العارف الربانی الشاه سكندر حسين لماجاء بنفسه و قال لتكن هذه الجبة عندك وديعة وامانة حتی يخرج صاحبه۔ فلما كان اوان ظهور المجدد قال له فی المعاملة ان اوصل هذه الی الشيخ احمد السرهندی فانه اهلها، فلم يوصلها اليه۔ ثم

گئی ہے اور سارا عالم شرقاً و غرباً اس کے نور سے معمور ہوگیا ہے۔ اس کی روشنی ساعت بساعت زیادہ ہوتی جارہی ہے اور اس مشعل سے لوگ اپنے اپنے چراغ روشن کر رہے ہیں یہ سب آپ کی شان تھی۔

ایک ثبوت یہ ہے کہ اصحابِ مقامات نے بیان کیا ہے کہ قدوۃ الکاملین حضرت شاہ کمال کیتھلی قادری رحمۃ اللہ علیہ جن کے خوارقِ عادات اور کرامات تواتر کی حد تک پہنچ چکے ہیں، ان بزرگ کے پاس حضرت غوثِ اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا جبّہ مبارک تھا جو انہیں اس طرح پہنچا تھا کہ عارفِ ربانی حضرت شاہ سکندر حسین رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جبّہ مبارک حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ کے پاس بطور امانت رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضرت شاہ سکندر حسینؒ رحلت فرما گئے اور حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آیا تو شاہ سکندر حسین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ کمال کیتھلی سے خواب میں فرمایا کہ یہ جبّہ مبارک حضرت شیخ احمد سرہندی کو دیدو کیونکہ وہی اس جبّہ کے اہل ہیں۔ مگر حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ نے وہ جبّہ حضرت شیخ کو نہ دیا۔ پھر حضرت

خاطبه فی عالم السر بذلك فلم یفعل ذلك، و قال کیف یخرج هذه البرکة عن بیننا فعاتبه فی المرتبة الثالثة فجاء بها الیه - فترتب علی ذلك امور عظیمة کما هو مرقوم فی المقامات والملفوظات معارف لدنیة[1]۔

شاہ سکندر حسینؒ نے حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ سے عالم سر میں یہی فرمایا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور فرمایا کہ میں یہ برکت اپنے پاس سے کیسے علیحدہ کر دوں۔ پھر تیسری بار حضرت شاہ سکندر حسینؒ نے عتاب فرمایا تو حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ جبّہ مبارک حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پیش کر دیا۔ چنانچہ اس جبّہ مبارک کے بڑے بڑے فیوض و برکات ظہور میں آئے جنہیں مقامات اور ملفوظات "معارف لدنیہ" میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] یہ حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرّہ کا رسالہ ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

المسوّیٰ من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ———— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّیٰ میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰ روپے

ہمعات (فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوّف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

جلد نمبر ۵ ماہ نومبر ۱۹۶۷ شمارہ نمبر ٦

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

جلد ۵	ماہ نومبر ۱۹۶۷ئہ مطابق رجب ۱۳۸۷ھ	نمبر ۶

فہرست مضامین

شذرات

پاکستان اپنی زندگی کے جس تعمیری مرحلے میں اس وقت داخل ہو رہا ہے، اُس میں یہ اشد ضروری ہے کہ پاکستانی ملت کا ہر طبقہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس تعمیر میں بھرپور حصّہ لے۔ اب تعمیر صرف کارخانے لگانا، دریاؤں پر بند باندھنا اور بنجر اراضی کو آباد کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ معنوی روح جو قوم کو ان کاموں پر اُبھارتی اور اُس کے اندر مثبت اخلاق پیدا کرتی ہے، اُسے قومی زندگی میں برسرِ کار لانا بھی تعمیر ہے۔ اب یہ معنوی روح مذہب سے پیدا ہوتی ہے، تعلیم سے پیدا ہوتی ہے اور اسے صحت مند ادب پیدا کرتا ہے۔

خدا کے فضل سے پاکستان میں علمارِ کرام کی بہت بڑی تعداد ہے، اور دینی مدارس بھی بکثرت ہیں اگر ہمارے ہاں کی مذہبی سرگرمیوں کا مقصد قوم کے اندر یہ معنوی روح پیدا کرنا ہو جائے، تو استحکام، فارغ البالی حُسنِ اخلاق اور حُسنِ عمل کی وہ منزل جس کی طرف ملت کا کارواں رواں ہے کم سے کم مدت میں سر ہو سکتی ہے۔

آج مذہبی حلقوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مذہبی سرگرمیوں کا رُخ کس طرح قوم میں معنوی روح کو بیدار اور متحرک کرنے کی طرف موڑا جائے، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ جب تک علمارِ کرام اس کام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے، ہماری تعمیری جدوجہد صحیح معنوں میں کبھی بارآور نہیں ہو سکتی۔

محکمہ اوقاف کے سامنے اور کاموں کے علاوہ سب سے بڑا اور اہم کام یہ ہے کہ ملّی زندگی میں علمارِ دین کا ایک فعّال اور تعمیری کردار ہو۔ اور وہ جو دینی تعلیم دیتے ہیں، مساجد میں نمازوں کی امامت کراتے ہیں جمعوں کے خطبے دیتے ہیں اور عام اجتماعات میں وعظ و ارشاد کرتے ہیں، تو اِن سب کا عملی نتیجہ یہ نکلے کہ جہاں ہم ایمان و اعمالِ صالح میں اچھے ہوں۔ وہاں علمارِ کرام کی اِن مساعی سے پاکستانی ملت میں اتحاد و اتفاق بڑھے۔ تمام مسلمان اسلام کی اساس پر "بنیان مرصوص" بنیں۔ یہ ملک مضبوط ہو، ترقی کرے اور اس میں بسنے والے سب مسلمان آسودہ حال و مطمئن ہوں۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس میں سب سے محرک قوّت اسلام ہے۔ اور اس کے سامنے سب سے بڑا مقصد اسلام کا احیاء اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اسلامی اُصولوں پر ڈھالنا ہے۔ اب اگر ہمارے علمائے کرام کی موجودہ مذہبی سرگرمیوں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو پھر قوم کس کی طرف رجوع کرے اور کس سے اپنی مراد پائے۔

پاکستان کو لازماً متحد ہونا ہے۔ اور اتحاد ہی ایک ملک کی ہمیشہ سب سے بڑی قوت رہا ہے۔ اگر اتحاد نہ ہو تو ایک ملک نہ بیرونی جارحیت سے مصئون رہ سکتا ہے۔ اور نہ اسے اندرونی استحکام ہی میسّر آسکتا ہے، اس کے ترقی کرنے کا سوال تو الگ رہا۔

اب محکمہ اوقاف کو جس سے کسی حد تک مغربی پاکستان کی مذہبی سرگرمیاں متعلق ہیں، لابدی طور پر یہ دیکھنا ہے کہ اُن سے ملک و قوم کی یہ ضرورتیں پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اگر ان مذہبی سرگرمیوں سے قوم میں اتحاد کے بجائے باہمی منافرت کو ہوا ملتی ہے، اور اس طرح ملک کی سالمیت خطرے میں پڑتی ہے، تو محکمہ اوقاف اپنے فرائض کی ادائیگی سے مجرمانہ غفلت کرے گا، اگر وہ اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دے۔

ایسے ہی دینی تعلیم کا وہ نصاب جس سے فارغ ہونے والے ملک و قوم کی تعمیر میں ـ اور تعمیر سے ہماری مراد معنوی روح پیدا کرنا بھی ہے۔ کماحقہ مفید نہ ہوں، بلکہ اُلٹا ان سے عدم اتفاق اور بے اعتمادی کو تقویت ملے اور آپس کے فرقہ وارانہ مناقشات بڑھیں، تو اگر محکمۂ اوقاف اس قسم کے دینی تعلیم کے نصاب کو بدلنے کا اقدام نہیں کرتا، اور اس کو پڑھانے والے اداروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو یہ اُس کی اپنے فرض منصبی سے کوتاہی ہوگی۔

محکمۂ صحت عطائی حکیموں اور "ڈاکٹروں" کے سدباب کے سلسلے میں قواعد و ضوابط بنا رہا ہے اور طب کے پیشہ سے تعلق رکھنے والوں کو ایک مستقل نظام میں رجسٹر کیا گیا ہے۔ کیا محکمۂ اوقاف کا یہ کام نہیں کہ جہاں تک بھی ممکن ہو اور جس حد تک بھی موجودہ حالات اجازت دیں، دینی و عربی مدارس کو کسی نہ کسی نظام کے تحت لایا جائے۔ تاکہ یہ قوم و ملک کی تعمیر و ترقی میں ایک مثبت اور فعّال کردار ادا کرنے کے قابل ہوسکیں۔

دیر یا سویر محکمۂ اوقاف کو ان امور سے عہدہ برآ ہونا ہے، اور جتنی جلد وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے، ملک و قوم کے لئے اچھا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا مسلمان ملک نہیں، جہاں مذہبی سرگرمیاں محکمۂ اوقاف یا اس طرح کے دوسرے انتظامیہ شعبوں سے متعلق نہ ہوں۔ یہ چیز خود ان عربی و دینی مدارس کے حق میں اچھی ہے۔ اس سے ان کی حالت بہتر ہوگی، اور اس میں کام کرنے والوں کا وقار بڑھے گا۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب واپس وطن آئے تھے، تو آتے ہی کلکتہ میں علماء کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ علماء کو چاہئے کہ وہ مقامی زبانوں میں دینی اصول عوام کے سامنے پیش کریں۔ کیونکہ یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ کسی قوم کی عمومی تعلیم اس کی مادری زبان کے سوا

کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ نیز یہ کہ ایسے علماء بھی ہونے چاہئیں جو قرآن مجید کی حکیمانہ تفسیر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے پیش کریں۔

۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو مولانا سندھی نے عربی طالب علموں کے ایک اجتماع کو جو حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا، مخاطب کیا، اور ان سے کہا کہ ایک تو وہ سندھی زبان پڑھیں، دوسرے عربی زبان میں کافی استعداد بہم کریں، تیسرے اُن کو چاہئے کہ وہ انگریزی پڑھیں تاکہ آج کل یورپ میں جو ہلچل ہے۔ اور وہاں جو انقلاب برپا ہے، اُس کے حالات سے وہ براہ راست واقف ہو سکیں۔ یقیناً ایک امام مسجد، ایک خطیب اور ایک عالم اپنے اپنے دائرہ میں ایک رہنما کا درجہ رکھتا ہے، اور اپنے اس منصب کا حق وہ اسی شکل میں ادا کر سکتا ہے کہ وہ نہ صرف خود دینی اُصول سے پوری طرح واقف ہو، بلکہ وہ اُن کو لوگوں کے ذہن نشین بھی کر سکے۔ اس کے لئے ایک تو حالاتِ گردوپیش سے اس کا باخبر ہونا ضروری ہے، اور دوسرے جو مسائل لوگوں کو آئے دن پیش آتے ہیں۔ اُن پر اُس کی گہری نظر ہو۔

بدقسمتی سے ہمارے دینی مدارس کا موجودہ نصاب طلبہ کو اس قابل بنانے سے یکسر قاصر ہے کہ وہ لوگوں کی دینی رہنمائی کر سکیں۔ اور پھر جو اس نصاب کو پڑھانے والے علماء ہیں، وہ اس کی محدود علمی فضا سے باہر نہیں نکل سکتے۔

دینی نصابِ تعلیم میں آج کی ضرورتوں کے مطابق مناسب تبدیلیاں ہوں۔ اور عربی اور دینی مدارس کی موجودہ حالت کو بہتر بنایا جائے، یہ آج کی فوری ضرورت ہے، اور اسے کسی نہ کسی حد تک محکمۂ اوقاف ہی پورا کر سکتا ہے۔

ہمارے ہاں عام مسلمانوں کے لئے ایسا دینی لٹریچر تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، جو اُنہیں فرقوں اور مذہبی جماعت بندیوں سے بالاتر ہو کر اسلام کے بنیادی اور حقیقی اصولوں سے واقف کرائے، ان کے سامنے اسلامی تاریخ اس طرح پیش کرے کہ اس سے اُن کے اندر نئی روح پیدا ہو، اور وہ اپنے زمانے کے مسائل سے نبرد آزما ہو سکیں۔ قوم کی تاریخ میں عبرت بھی ہوتی ہے، اور وہ حیات تازہ بھی عطا کرتی ہے ہمارے ہاں عام مسلمانوں کے لئے نہ دینِ اسلام کو اس طرح پیش کیا گیا ہے اور نہ اسلام کی تاریخ کو۔

اور مسلمان ملکوں میں یہ کام وہاں کے اوقاف کے ادارے کر رہے ہیں۔ ہمارے محکمہ اوقاف کو بھی اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

رشید احمد ارشد ایم اے لیکچرر کراچی یونیورسٹی

حضرت خواجہ رضی الدین محمد باقی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان کابل میں علمی خاندان تھا اور کئی پشتوں تک اس خاندان کے علم و فضل کا چرچا رہا۔ آپ کا نسب نامہ بائیس ۲۲ واسطوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ اس نسب نامہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کے والد ماجد، جدِ محترم اور پردادا بھی کابل اور اس کے اطراف کے قاضی رہ چکے ہیں کسی تذکرہ میں آپ کے آباء و اجداد کا مختصر حال بھی نہیں ملتا ہے۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ کے والدِ محترم کی شہرِ کابل میں بڑی شہرت تھی اور آپ اپنے علم و فضل میں بہت ممتاز تھے اسی زمانے کے بہت بڑے علماء کو شیوخ کے لقب سے سرفراز کیا جاتا تھا اور آپ کے والد کو بھی شیخ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بعض لوگ شیخ کے لفظ کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور وہ آپ کو حسینی سید نہیں سمجھتے تھے مگر معتبر ذرائع سے آپ کا حسینی سید ہونا ثابت ہے[1]۔

آپ کے والد قاضی عبدالسلام بہت عابد و زاہد تھے اور آپ کا قلب مبارک

---

[1] سیرت باقیہ۔ مطبوعہ دہلی۔

اس قدر نرم تھا کہ خوفِ الٰہی سے اکثر گریہ و بکا میں مشغول رہتے تھے[۱]۔

آپ کی والدہ ماجدہ بھی نہایت عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں اور درویشوں کی خدمت کرتی تھیں۔ ان کا تعلق بھی خاندانِ سادات سے تھا۔ وہ اپنے صاحبزادے سے بے حد محبت کرتی تھیں اور انہی کی دعاؤں کی بدولت خواجہ صاحب نے بقولِ خود روحانی ترقی حاصل کی[۲]۔

ولادت باسعادت

ولادت سے پہلے آپ کی والدہ ماجدہ کو خواب میں آپ کی بزرگی کی بشارت مل گئی۔ آپ شہر کابل میں ۹۷۱-۷۲ھ / ۱۵۶۳-۶۴ء میں پیدا ہوئے۔

بچپن ہی میں آپ کو طہارت اور پاکیزگی پسند تھی۔ اگر کوئی ناپاک چیز آپ کے کپڑوں کو لگ جاتی تو فوراً پوشاک تبدیل کرا لیتے تھے۔ کھیل کود سے کم رغبت تھی اور ابتدائی عمر ہی سے آپ کو تنہائی پسند تھی اور آپ لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ آپ کی انہی باتوں کو دیکھ کر اکثر بزرگ افراد آپ کے ہونہار ہونے کی پیشین گوئی کرنے لگے تھے۔

ابتدائی تعلیم

جب آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو آپ کو خود بخود تعلیم کی طرف رغبت ہوئی۔ اور آپ خواجہ سعد کے مکتب میں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مکتب میں آپ اپنے تمام ساتھیوں سے پہلے سبق یاد کر لیتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ سال کی عمر میں آپ نے تمام قرآن کریم حفظ فرما لیا اور اس عرصے میں نماز روزے کے ضروری مسائل بھی یاد کر لئے تھے۔

قرآن کریم کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے علومِ عربیہ کی تعلیم شروع کی۔ دس سال کی عمر میں آپ نے عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

علومِ عربیہ کی تحصیل

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے کابل کے مشہور عالم مولانا صادق حلوائی[۳] سے تعلیم حاصل کی جو اپنے زمانے کے بہت بڑے

---

[۱] زبدۃ المقامات از حضرت محمد ہاشم کشمی مطبوعہ مطبع نول کشور واقع کانپور ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء بار اوّل ص ۵۔

[۲] زبدۃ المقامات ص ۸۔

[۳] مولانا صادق کا وطن سمرقند تھا جب ۹۸۱ھ میں حج سے واپس آئے تو (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

عالم تھے جب کابل سے مولانا صادق حلوائی ماوراء النہر تشریف لے گئے تو آپ بھی ان کے ساتھ ماوراء النہر پہنچے اور وہاں بھی ان سے اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کرنے لگے اور اپنے ساتھیوں سے بہت جلد آگے بڑھ گئے۔ مولانا صادق حلوائی بہت بڑے ادیب اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ اسی لئے ان کے فیضِ صحبت سے آپ میں فارسی ادب اور شاعری کا عمدہ مذاق پیدا ہوگیا تھا۔

تلاشِ حق

ابھی آپ فارغ التحصیل ہونے نہیں پائے تھے اور ایک دن آپ ایک ویران مسجد میں بیٹھے ہوئے درسی کتب کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ ایک مجذوب ادھر آنکلا اس نے آپ کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎

در کنز و ھدایہ نتواں دید خدارا   آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

ترجمہ:۔ کنز و ہدایہ (جیسی فقہ کی کتابوں) میں خداوند تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ تم اپنے دل کے آئینہ کو دیکھو کیونکہ اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔

اس کا یہ شعر آپ کے دل پر اثر کر گیا اور آپ نے درسی کتب کا مطالعہ چھوڑ کر اس مجذوب کی تلاش شروع کی مگر وہ آپ کو نہیں مل سکا، لیکن وہ آپ کے دل میں تلاشِ حق کی لگن پیدا کر گیا۔

آپ کی اس حالت کو دیکھ کر آپ کے بعض اہلِ علم ہمدردوں کو افسوس ہوا اور ان میں سے ایک صاحب نے آکر آپ کو یہ مشورہ دیا:۔

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) اکبر بادشاہ کے چھوٹے بھائی مرزا حکیم نے جو کابل کا حاکم تھا، ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصہ کابل تشریف لا کر انہیں اور وہاں کے لوگوں کو اپنے علمی فیض سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ لہٰذا وہ ان کی فرمائش پر کچھ عرصے کابل میں درس دیتے رہے۔ اسی زمانے میں حضرت خواجہ باقی باللہ نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی وہ بہت بڑے عالم و فاضل اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ ان کے بھائی ملا علی محمد شہ سمرقندی بھی بہت بڑے عالم اور محدث تھے، وہ کچھ عرصہ ہندو پاکستان میں بھی رہے تھے اور ۹۸۱ھ میں وفات پائی۔

"اگر آپ کچھ عرصہ مزید تعلیم حاصل کر لیتے تو آپ فارغ التحصیل ہو جاتے اور مکمل عالم بن جاتے"۔

تبحر علمی کا دعویٰ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:۔

"اگر فارغ التحصیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ درسی کتب کے مشکل مقامات کو سمجھ سکے اور انہیں پڑھا سکے تو یہ قابلیت مجھے حاصل ہے میرے سامنے آپ کوئی مشکل کتاب لے آیئے میں اُسے پڑھا سکوں گا"[1]

آپ کے اس کلام مبارک کے مطابق بعض طلبہ اور اہلِ علم نے آپ کا مختلف طریقوں سے امتحان لیا۔ ہر موقع پر انہوں نے آپ کو علم کا بحر ناپیدا کنار پایا۔ اس زمانے میں ماوراء النہر کی درسگاہوں میں منطق، فلسفہ اور الٰہیات (فلسفہ مابعد الطبعیات) کا بہت چرچا تھا لہٰذا آپ نے معقولات کے تمام علوم کو حاصل کیا۔ ان علوم میں آپ کے تبحر علمی کا ثبوت آپ کے تصوف کے رسائل سے ملتا ہے، جن میں آپ نے نہایت فلسفیانہ انداز میں ذات باری اور وحدت الوجود کے بارے میں بحث فرمائی ہے۔

مرشد کامل کی تلاش مگر جب آپ حقیقت اور حق کی طلب میں مشغول ہو گئے تو آپ نے ظاہری علوم کے مشغلے کو خیر باد کہہ دیا اور جنگلوں اور بیابانوں میں مرشد کامل کی تلاش میں گشت کرنے لگے۔ اس عرصے میں بعض علمی معرکے بھی ہوئے تھے اور اس میں آپ کامیاب ہوئے تھے۔ آپ کو قرآن کریم کی آیات کی صوفیانہ تفسیر و تشریح کرنے میں بہت مہارت حاصل تھی۔ جن مشکل آیات کی تفسیر و تشریح کرنے میں بڑے بڑے علماء عاجز ہو جاتے تھے۔ ان کی تفسیر آپ نہایت عجیب و غریب انداز میں فرماتے تھے۔

آیت کی تفسیر ایک روز آپ ایک خراسانی عالم کی علمی مجلس میں جا پہنچے۔ وہاں ہر عالم نے کسی علمی موضوع پر تقریر کی۔ جب آپ کی باری آئی تو حاضرین نے بھی آپ سے علمی تقریر کرنے کی درخواست کی آپ نے مندرجہ ذیل آیت کی

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۶ مطبوعہ مطبع نول کشور ۱۸۹۰ء۔

انوکھے انداز میں تفسیر فرمائی :-

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝

اس آیتِ کریمہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے :" ان (کافروں) نے مکر و تدبیر کی اور اللہ نے بھی مکر و تدبیر کی اور اللہ سب مکر کرنے والوں سے بہتر ہے "۔

اس آیتِ کریمہ کے بارے میں سب موجود علماء کو یہ شبہ لاحق تھا کہ مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنی اس کے شایانِ شان نہیں ہے ۔ اس خراسانی عالم کو بھی یہ شبہ بہت عرصے سے لاحق تھا ۔ لہٰذا جب آپ نے اس کی صحیح توضیح و تاویل فرمائی تو سب کے شبہات دور ہو گئے بالخصوص وہ خراسانی عالم آپ کی تقریر سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے رفیقِ خاص سے اس بات کا اقرار کیا کہ (خواجہ) محمد باقی نے اس انداز سے تقریر فرمائی کہ ان کے دیرینہ شبہات اور اعتراضات دور ہو گئے ۔

مناظرہ میں کامیابی

آپ کے تبحر علمی کا دوسرا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی عالم کابل آیا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام میں توحید نہیں ہے ۔ اس بارے میں اس نے تمام علمائے اسلام کو مناظرہ کی دعوت دی ۔ کئی علماء اس سے مناظرے کے لئے آئے مگر وہ چرب زبانی سے ان پر غالب آجاتا تھا ۔ حضرت خواجہ باقی صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ مناظرہ کرنے کے لئے اس کے سامنے آئے ۔ جب کہ آپ معقولات کے بہت بڑے عالم تھے اس لئے آپ نے عقلی دلائل کے ذریعے بہت جلد اس کو شکست دے دی ۔ اور وہ سچے دل سے مسلمان ہو گیا ۔

معتزلین کی اِصلاح

اسی طرح ایک دفعہ ایک معتزلی آیا اس نے اپنے عقائد کی تائید میں عقلی دلائل پیش کئے آپ نے اس کے عقلی دلائل کی اپنے عقائد اور عقلی دلائل سے اس انداز سے تردید فرمائی کہ وہ خود حیران رہ گیا اور آخر کار اس نے اپنے عقائد سے توبہ کی ۔

نوجوانی میں عِلمی شہرت

آپ نے اس قدر علمی شہرت اور کمالِ علمی محض انیس [19] سال میں حاصل کر لیا تھا جب کہ اکثر علماء ساری عمر علمی کاموں

میں مشغول رہنے کے باوجود اس قدر شہرت حاصل نہیں کر سکے تھے۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حق کی تلاش

نوجوانی میں جب آپ پر عشقِ حقیقی کا غلبہ ہوا تو آپ تلاشِ حق میں مختلف مقامات پر پہنچے۔ آپ کسی بندۂ کامل کی جستجو میں جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی سرگرداں رہے۔ کابل کے علاوہ آپ ماوراء النہر کے بزرگوں کی خانقاہوں میں بھی پہنچے اور ان سے فیض حاصل کیا۔ ان کی صحبت میں رہ کر کسی قدر عارضی سکون اور اطمینان میسر آجاتا تھا، مگر مستقل اور حقیقی سکونِ قلب میسر نہیں آسکا۔

مشائخ کی صحبت

آپ کچھ عرصہ تک شیخ لطف اللہ کے خلیفہ خواجہ عبید اللہ کی خدمت میں بھی رہے۔ اس کے بعد شیخ احمد یسوی کے سلسلہ کے ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کا اسم مبارک حضرت افتخار شیخ تھا[۱]۔ بعد ازاں امیر عبد اللہ بلخی کی خدمت میں بھی حاضری دی، مگر روحانی کشمکش اور بے چینی دور نہ ہوئی۔ البتہ اس عرصہ میں خواجۂ بزرگ (نقش بند) کا روحانی فیض حاصل ہوا۔ اور حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سے بھی روحانی فیض ملا۔ اس روحانی فیض کی بدولت آپ نقشبندی سلسلے کے ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔

کشمیر میں آمد

عشقِ حقیقی کی کشش آپ کو کشمیر بھی لے گئی۔ وہاں کچھ عرصہ تک آپ شیخ بابا بھائی وال کی خانقاہ میں جو اسی سلسلے سے منسلک تھے مقیم رہے[۲]۔ وہاں رہ کر آپ کو بہت فیض حاصل ہوا کیونکہ بابا صاحب نے خاص روحانی توجہ آپ پر مبذول فرمائی تھی[۳] اور نقشبندیہ سلسلے کے ممتاز بزرگ تھے۔

۱؎ یہ بزرگ سمرقند کے رہنے والے تھے۔　۲؎ عمدۃ المقامات ص ۸۴ – ۸۶۔

۳؎ زبدۃ المقامات ص ۹ – ۱۰ حضرت بابا کشمیری خوارزم کے رہنے والے تھے ۹۹۹ھ ۱۵۱۰ء میں کشمیر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے روحانی کمالات کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ لیکن بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے مرزا یادگار نے انہیں زہر دلوا دیا، کیونکہ آپ حکام کے سامنے حق و صداقت کی گفتگو کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

لاہور میں قیام

اس جستجو اور طلب حق میں آپ ہندوستان بھی تشریف لائے تھے اور کافی عرصہ تک وہاں مقیم رہے۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں آپ کی وارفتگی انتہا درجے تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں آپ جنگلوں، پہاڑوں، ویرانوں اور قبرستانوں میں "مرد کامل" کی تلاش میں پھرتے رہے جو آپ کی روحانی قلق و اضطراب کا علاج کر سکے۔ آپ کیچڑ، دلدل اور ایسے ناقابل عبور مقامات میں سے گزرتے تھے جہاں کوئی آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اسی صحرانوردی میں آپ کو ایک مجذوب ملا جسے آپ نے پسند فرمایا اور آپ نے اس کی صحبت میں رہنے کی کوشش کی مگر وہ آپ سے دور بھاگتا تھا۔ جب آپ اس کا پیچھا کرتے تو وہ آپ کو دیکھ کر سب وشتم پر اتر آتا اور کبھی آپ کی طرف پتھر پھینکتا تھا اور دوسری طرف بھاگ جاتا تھا مگر آپ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اور اس کے پیچھے لگے رہتے تھے، آخرکار ایک دن اسے رحم آیا اور اس نے آپ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی کہ خداوند تعالیٰ آپ کی دلی مراد پوری کرے۔

انتظار و قلق کی زحمت

حضرت خواجہ باقی باللہ اس زمانے کے واقعات کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے تھے:-

"گو ہم نے دیگر بزرگوں کی طرح ریاضت ہائے شاقہ برداشت نہیں کیں مگر انتظار و قلق کی زحمت بہت برداشت کرنی پڑی"۔

آپ کی والدہ ماجدہ آپ کی اس روحانی بے چینی اور بے قراری سے بہت متاثر ہوتی تھیں اور ان سے آپ کا قلق و اضطراب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس لئے وہ صدقِ دل سے دن رات اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگتی تھیں کہ وہ آپ کے روحانی مقصد کی تکمیل کرے[1]۔

---

[1] مرشدِ کامل کی تلاش میں آپ دہلی بھی تشریف لائے اور وہاں شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں ان کے صاحبزادے شیخ قطب العالم کے پاس رہے۔ اسی زمانے میں شیخ قطب العالم صاحب کو کشف سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ باقی کو فیضِ روحانی مشائخِ بخارا سے حاصل ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے اس کا ذکر حضرت خواجہ صاحب سے کیا، اور انہیں بخارا روانہ کیا۔

(انفاس العارفین از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ)

آپ خود فرماتے ہیں :-

"میں ابتدائی زمانے میں خواجہ عبید کی خدمت میں رہا۔ جو شیخ لطف اللہ کے خلیفہ تھے ان کی خدمت میں جاکر میں نے گناہوں سے توبہ کی اس کے بعد خواجہ احمد یسوی کے سلسلے کے ایک بزرگ اور حضرت امیر عبداللہ بلخی کی خدمت میں پہنچا۔ بعد ازاں خواب میں خواجہ بہاء الحق کی زیارت حاصل ہوئی۔ اور ان کی خدمت میں جاکر میں نے توبہ واستغفار کی اور ان کی ہدایت کے مطابق دو سال تک نقشبندی سلسلے کے مطابق ذکر ومراقبہ میں مشغول رہا"[1]

اُویسی طریقہ مختلف بزرگوں کے فیض سے آپ تصوّف وروحانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ چکے تھے۔ ابھی تک آپ نے کسی خاص بزرگ کے دست مبارک پر بیعت نہیں کی۔ لہٰذا آپ اُویسی طریقے کے مطابق براہِ راست روحانی مدارج کی تکمیل کرتے رہے۔ جیساکہ آپ نے اپنے اشعار میں بھی بیان فرمایا ہے۔ تاہم روحانی مدارج کے بعد آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے نقشبندی سلسلے کے کسی مرشدِ کامل کی ادنیٰ توجہ کی ضرورت تھی۔

خواجہ امکنگی سے بیعت لہٰذا آخر میں آپ کی روحانی کشش آپ کو ماوراء النہر (ترکستان) کے شیخ کامل حضرت خواجہ امکنگی[2] کی خدمت میں لے گئی اور آپ نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی۔ خواجہ امکنگی نے تھوڑے عرصے میں آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچادیا اور بہت جلد آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۹-۱۰۔

[2] خواجہ امکنگی اپنے والد محترم خواجہ محمد درویش کے خلیفہ تھے۔ خواجہ درویش اپنے ماموں خواجہ زاہد کے مرید تھے اور وہ خواجہ عبید اللہ احرار کے فیض یافتہ تھے۔ حضرت خواجہ احرار نے حضرت خواجہ یعقوب چرخی سے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے روحانی فیض حاصل کئے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی تھے۔

خواجہ امکنگی کے بہت سے مریدین. جو آپ کے پاس عرصۂ دراز سے روحانی فیض حاصل کر رہے تھے آپ کے اس فعل سے بہت متعجب ہوئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔ اس پر خواجہ آمکنگی نے فرمایا:۔

"ان کا روحانی کام مکمل ہو چکا تھا وہ تو ہمارے پاس صرف اصلاح وتصحیح کے لئے آئے تھے"

خرقۂ خلافت دینے کے بعد آپ کے پیر و مرشد نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ ہندوستان جاکر نقشبندی سلسلے کو قائم کریں کیونکہ سرزمینِ ہند نقشبندی بزرگوں سے خالی ہے۔

برّصغیر میں قیام

خواجہ آمکنگی کے حکم کی تعمیل میں آپ براہ کابل پشاور تشریف لائے یہاں کچھ عرصہ قیام فرمانے کے بعد آپ لاہور آئے، یہاں آپ پورے ایک سال تک مقیم رہے۔ یہاں کے بہت سے علماء وفضلاء اور امراء آپ کے روحانی فیض سے مستفیض ہوتے رہے۔ آپ اس سے پہلے بھی مرشدِ کامل کی تلاش میں لاہور تشریف لا چکے تھے اس زمانے میں شیخ فرید بخاری اکبر بادشاہ کے بخشی بیگی تھے۔ وہ آپ کے بہت معتقد ہو گئے تھے۔ اس دفعہ بھی بہت سے امراء اور علماء آپ کے روحانی کمالات سے مستفید ہوئے۔

دہلی میں قیام

چونکہ سارے ہندوستان میں دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور وہ "بائیس ۲۲ خواجہ کی چوکھٹ" کہلاتی تھی اور یہ شہر ہمیشہ سے اولیاء کرام کا مستقر رہا ہے۔ اسی لئے ایک سال کے بعد آپ دہلی تشریف لائے اور قلعہ فیروزآباد میں مقیم ہوئے. جو اس زمانے میں دریا کے کنارے پر واقع تھا اور نہایت دلکش اور پُرفضا مقام تھا اس قلعہ کی مسجد نہایت عظیم الشان تھی، مگر اب ویران ہو گئی ہے تاہم اس کے آثار اس کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ آپ نے خاص اس مسجد میں قیام فرمایا اور وفات تک آپ وہیں سکونت پذیر رہے[1]۔

---

[1] زبدۃ المقامات صـ ۱۴

سفر کا حال دہلی پہنچنے کے بعد روحانی حلقوں میں آپ کی آمد کی شہرت جلد پہنچ گئی اور دور دراز سے طالبانِ حقیقت آپ کے پاس رشد و ہدایت کے لئے پہنچنے لگے۔ لاہور سے دہلی کا سفر آپ نے گھوڑے پر کیا، مگر ابھی آپ نے ایک میل کا سفر طے نہیں کیا تھا کہ ایک کمزور و ناتواں پا پیادہ مسافر آپ کو نظر آیا تو آپ گھوڑے پر سے اُتر گئے اور اُسے گھوڑے پر سوار کرا دیا اور خود منزل تک پا پیادہ چلتے رہے، اور اس غرض سے کہ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے آپ نے سر مبارک پر لنگی باندھ رکھی تھی۔ بعض دفعہ اس خیال سے کہ لوگ آپ کو شناخت نہ کر سکیں منزل کے قریب آبادی میں گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے۔[۱]

اُمراء کی عقیدت دہلی کے قیام کے زمانے میں بہت سے امرائے شاہی آپ کے معتقد ہو گئے تھے حالانکہ آپ ہمیشہ گوشۂ گمنامی میں رہے اور کبھی اپنے روحانی کمالات کا اظہار نہیں کیا اور طالبانِ ہدایت کو بہت اصرار کے بعد مرید کرتے تھے تاہم عقیدت مند افراد آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اور بعض امرائے شاہی بھی آپ کے دامن سے وابستہ ہونے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

شیخ فرید بخاری آپ کے سب سے بڑے مرید اور معتقد حاکم شیخ فرید الدین بخاری تھے جو نواب مرتضٰی خاں کے شاہی لقب سے مشہور ہوئے، وہ شہنشاہ اکبر و جہانگیر دونوں کے دور میں رہے تھے۔ انہوں نے جہانگیر کو تخت نشین کرایا تھا۔ اور اس سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ اسلامی شریعت کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کرے گا نیز اس نے رفاہِ عام کے بہت سے کام کئے۔ یہ سب خواجہ صاحب سے عقیدت مندی اور آپ کی فیض صحبت و تربیت کا نتیجہ تھا۔ وہ آپ کی خانقاہ کے مصارف کا آخر دم تک کفیل رہا۔ اس نے خانقاہ کے درویشوں کے معقول وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ خواجہ صاحب نے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرانے کے لئے اس سے مخلصانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ دہلی کے قریب شہر فریدآباد ان ہی کے نام پر آباد ہے۔ ان کی وفات ۱۰۲۵ھ مطابق

---

[۱] زبدۃ المقامات ص ۲۰-۲۱۔

۱۶۱۶ء میں ہوئی۔ ان کا مزار حضرت شاہ چراغ دہلی کے مزار کے راستے پر ہے[1]۔

خواجہ صاحب شیخ فرید جیسے نہایت صالح اور نیک عقیدت مند امراء کی امداد قبول کر لیتے تھے۔ ان کے علاوہ اکثر امراء آپ کے درویشوں کا یومیہ وظیفہ مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آپ ان کی امداد قبول نہیں فرماتے تھے، کیونکہ آپ کے نزدیک ان کی کمائی مشتبہ ہوتی تھی اور آپ اکلِ حلال پر بہت زور دیتے تھے۔

عبدالرحیم خانخاناں

مرزا عبدالرحیم خانخاناں بھی آپ کا بہت معتقد تھا، جب آپ نے حج کے لئے سفرِ حجاز کا ارادہ کیا تو مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے زادِ راہ اور اخراجات کے لئے ایک لاکھ روپے آپ کو نذر کئے مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ رقم عوام کی فلاح و بہبودی میں خرچ کی جائے[2]۔

دیگر امراء کی عقیدت مندی

مرزا قلیج خاں بھی جو شہزادہ دانیال کا خسر تھا اور پنجاب کا حاکم تھا، نہایت دیندار عالم اور پابندِ شرع تھا وہ بھی آپ سے بہت عقیدت رکھتا تھا نیز حضرت مجدد صاحب کے بعض مکاتیب سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ صدرِ جہاں صدر الصدور کے بھی آپ سے نیازمندانہ تعلقات تھے۔

ملحدانہ خیالات کا انسداد

ان سب امراء کے ذریعے آپ اکبر بادشاہ کی ملحدانہ پالیسی کے بُرے اثرات دور کرنے کی کوشش فرماتے تھے تاکہ ان کے ذریعے شاہی دربار میں اور پورے ملک میں اسلامی ماحول پیدا ہو اور وہ مسلمانوں کو بدعت و ضلالت کے خیالات سے محفوظ رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ امراء کے

---

[1] رودِ کوثر۔ از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب۔

[2] مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی اس پیشکش کے جواب میں آپ نے نہایت ناراضگی کے لہجہ میں یہ تحریر فرمایا تھا "ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ضائع کر کے حج کو جائیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے زادِ راہ مہیا ہونے کی شرط مقرر کر رکھی ہے۔" (حیات باقیہ ص۱۷ مطبوعہ دہلی)۔

نام اپنے مکتوبات میں آپ نے انہیں شریعت اور سنت نبوی کی پابندی کی بار بار نصیحت فرمائی ہے، اور انہیں ان کی اسلامی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے۔

آپ کی فیضِ صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض امرار اپنے سرکاری عہدے چھوڑ کر آپ کے فیضِ صحبت میں آگئے۔ اس قسم کے حضرات میں خواجہ حسام الدین احمد کا اسم گرامی بہت نمایاں ہے جو آپ کی وفات تک آپ سے جُدا نہیں ہوئے، بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کی اولاد کی نگرانی اور تربیت کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔

رُشد و ہدایت دہلی آنے کے بعد آپ کو رشد و ہدایت کے تین چار سال میسّر آئے اور اسی قلیل مدت کے آخر سال میں آپ گوشہ نشین ہو گئے تھے لیکن اللہ کا فضل و کرم آپ پر اس قدر وسیع ہوا کہ اس قلیل مدت میں ہزاروں انسان آپ سے فیض یاب ہوئے، ان میں امیر و غریب، مرد و زن، عالم و جاہل ہر قسم کے حضرات شامل تھے۔ آپ ہر طبقہ کے انسان کو اس کے حسبِ مقام ہدایت فرماتے تھے اور اسی سلسلے میں آپ نے کبھی اپنی مشیخت اور اپنی روحانی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کشف و کرامات کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ عاجزی اور انکساری سے کام کرتے رہے۔

شریعت کی پابندی آپ علمار و سادات کا بہت ادب و احترام فرماتے تھے۔ شرعی معاملات میں بالعموم پرہیزگار علمار و فقہار سے رجوع فرماتے تھے اور فتوای لینے والوں کو انہی علمار کی طرف بھیجتے تھے اور تمام درویشوں اور فقیروں کو شریعت کی پابندی کرنے کی نصیحت فرماتے تھے بلکہ مرید کرنے سے زیادہ آپ شریعت کے احیار اور تبلیغ پر زیادہ زور دیتے تھے، کسی کو بڑے اصرار اور طویل آزمائش کے بعد ہی مرید کرتے تھے۔

طریقۂ ہدایت آپ طالبانِ ہدایت کو سب سے پہلے گناہوں سے توبہ کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس کے بعد جب آپ انہیں رشد و ہدایت کی راہ پر ثابت قدم پاتے تو ان کی صلاحیت کے مطابق انہیں اوراد و اذکار میں مشغول رکھتے تھے۔ اکثر حضرات کو آپ مقررہ طریقے کے مطابق "ذکر قلب" کی تلقین فرماتے تھے۔ کچھ

لوگوں کو نفی و اثبات کے ذکر کی اور کچھ حضرات کو ذکر اسم ذات کی ہدایت فرماتے تھے۔

رُوحانی مشاغل آپ بہت کم بولتے تھے، بہت کم کھاتے اور سوتے تھے۔ نماز عشاء کے بعد تہجّد کی نماز تک روزانہ دو مرتبہ قرآن کریم ختم کر لیتے تھے۔[1] آپ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے بلکہ ہر وقت با وضو رہتے اور عبادات میں عزیمت (بلند ہمتی) کے اعمال انجام دیتے تھے۔

جذب و استغراق آپ پر عالمِ استغراق اور جذب و مستی کی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی، تاہم اس قدر روحانی استغراق اور گوشہ نشینی کے باوجود آپ تمام شرعی فرائض وقت مقررہ پر ادا فرماتے تھے اور نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے مسجد تشریف لے جاتے تھے اس موقع پر عوام آپ کے دیدار سے مشرف ہوتے تھے اور جو کوئی دیکھتا تھا وہ آپ کے رعب اور ہیبت و جلال سے لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا بلکہ بعض حضرات بے ہوش ہو جاتے تھے۔

اُکلِ حلال کی تاکید آپ اُکلِ حلال پر سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے اور اپنے معتقدین کو بھی ہدایت فرماتے تھے کہ وہ اکل حلال میں بہت احتیاط رکھیں آپ ارشاد فرماتے تھے کہ کھانا پکانے والا باورچی بھی پارسا ہو اور وہ کھانا پکاتے وقت باوضو ہو، اور اس وقت وہ کوئی دنیاوی بات نہ کرے آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر بے احتیاطی کے ساتھ کوئی لقمہ کھا لیا جائے تو اس سے ایسا دھواں پیدا ہوتا ہے جو روحانی فیض و برکت کی نالیوں کو بند کر دیتا ہے، اور پاکیزہ روحیں جو منبعِ فیض ہیں دل کے سامنے نمودار نہیں ہوتی ہیں۔

سماع و رقص سے نفرت آپ سماع و نغمہ اور رقص کو ناپسند فرماتے تھے بلکہ آپ درویشوں کو بہ آواز بلند اللہ کا ذکر کرنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ آنے والے کو ہماری مجلس کے آداب کا لحاظ

---

[1] ترجمہ تذکرہ علمائے ہند۔ از رحمان علی ص ۲۷۱۔

رکھتے ہوئے آنا چاہیئے۔[1]

بیعتِ خلفاء آپ کے اکابر خلفاء میں غالباً سب سے پہلے شیخ تاج الدین سنبھلی نے بیعت کی وہ آپ سے پہلے شیخ اللہ بخش سے جو سید علی قوام کے مرید تھے، سندِ خلافت حاصل کر چکے تھے اور آپ سے پہلے سے متعارف تھے کیونکہ جب حضرت خواجہ باقی باللہ سب سے پہلے لاہور اور ہندوستان مرشدِ کامل کی تلاش میں آئے تھے تو اس زمانے میں آپ سنبھل بھی تشریف لے گئے تھے اور شیخ اللہ بخش اور شیخ تاج الدین سنبھلی سے ملاقات فرمائی تھی، لہٰذا جب دوبارہ آپ دہلی میں مسندِ ہدایت پر سرفراز ہوئے تو اس وقت شیخ تاج الدین کے پیر و مرشد وفات پا چکے تھے اس لئے انہوں نے دوبارہ حضرت خواجہ صاحب سے بیعت کی اور بہت جلد وہ آپ کے "مونس خلوت خاص" ہو گئے وہ سب سے زیادہ آپ کے فیضِ صحبت میں رہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۵۹۹ء میں آپ سے بیعت کی تھی جب کہ آپ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے، اس زمانے میں جب آپ دہلی پہنچے تو آپ کو خواجہ صاحب کی آمد اور ان کے بلند روحانی مقامات کا علم ہوا۔ لہٰذا آپ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو ماہ سے کچھ دن زیادہ مرشدِ کامل کی خدمت میں رہ کر سلسلہ نقشبندیہ کے جملہ اسرار و رموز کو حاصل کیا۔

خواجہ حسام الدین خواجہ حسام الدین احمد بھی جو ابوالفضل کے بہنوئی تھے، اس زمانے میں آپ کی بیعت سے سرفراز ہوئے جب کہ آپ ماوراء النہر سے واپس آئے، اس سے پیشتر وہ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے مگر آپ نے ازراہِ تواضع اور کسرِ نفسی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کسی دوسرے مرشدِ کامل کو تلاش کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ وہ آگرہ چلے گئے اور وہاں پیرِ کامل کی تلاش میں پھرتے رہے۔

---

[1] عمدۃ المقامات ص ۸۴-۹۷۔

اسی حالت میں ایک دن انہوں نے کسی کے گھر سے قوالی کی آواز سُنی اس وقت قوال، شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

تو خواہی آستیں افشاں و خواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دکانِ حلوائی

یہ شعر سنتے ہی ان کی آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور وہ سیدھے حضرت خواجہ باقی باللہ کے پاس دہلی پہنچے اور تمام ماجرا ان کے سامنے بیان کیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے انہیں مرید کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے امارت اور گھر بار چھوڑ کر ہر وقت "درِ خواجہ کی ناصیہ فرسائی" کو اپنا شیوہ بنالیا اور جلوت و خلوت میں آپ کے ساتھ رہنے لگے۔ مرزا حسام الدین احمد ہی وہ واحد خلیفہ تھے جو وفات کے وقت اپنے شیخ کے پاس تھے اور ان کی وفات کے بعد بھی حضرت خواجہ کی درگاہ کی نگرانی اور آپ کی اولاد و خاندان کی خدمت کرنا آپ کی زندگی بھر کا مقصد رہا۔

شیخ اللہ داد شیخ اللہ داد لاہور سے ماوراء النہر کے سفر کے زمانے میں آپ کی خدمت میں پہنچے تھے اور آپ سے فیض حاصل کر کے طریقۂ مراقبہ اور ذکر و اذکار اکابرِ نقشبندیہ کی تلقین حاصل کی اور آخر دم تک درگاہ کی خدمت اور مسافروں کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہے۔

خواتین کی تربیت حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مکتوباتِ شریفہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ہر طبقہ میں تبلیغ اور رشد و ہدایت کا کام انجام دیا۔ آپ طالبانِ رُشد و ہدایت کی بتدریج اصلاح فرماتے اور ان کے روحانی مقامات و احوال کا حال دریافت کرتے رہتے تھے اور اس میں نہایت سرگرمی اور جانفشانی فرماتے تھے۔ خواتین بھی آپ سے مستفید ہوتی تھیں۔ آپ کے مکتوبات بعض ایسی نیک اور شریف خواتین کے نام بھی ہیں جو اپنے شہر میں کسی بزرگ سے فیض حاصل نہیں کر سکتی تھیں چنانچہ مکتوب شریف نمبر ۴۷ میں آپ ایک خاتون کو مندرجہ ذیل ہدایات و نصائح تحریر فرماتے ہیں۔

اخلاقی ہدایات "اللہ تعالیٰ کی توفیق کامل تمہارے ساتھ رہے۔ تمام سعادتوں کا ذریعہ

یہی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکامات بجالاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی پیروی کرو اور ناجائز کاموں سے پرہیز کرو۔ کسی پر غم و غصّہ نہ کرو، کسی مسلمان کے حق میں بُرائی کے خیالات دل میں نہ لاؤ ۔ دنیائے بے وفا کے مال و متاع پر نظر نہ ڈالو۔ اپنے آپ کو تمام مخلوق سے افضل نہ سمجھو اور آخرت کے سفر کو فراموش نہ کرو۔

کلمۂ توحید کا وِرد

ان اوصاف کو حاصل کرنے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور توفیق بخشے تو کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا وِرد کرتی رہو۔ ذکر کرتے وقت اہلِ دنیا اور دنیا کی چیزوں کا خیال دِل میں نہ لایا جائے، اس سے بہت عُمدہ فوائد و نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ تمام ظاہری اور باطنی احوال میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھا جائے۔ طالبِ صادق کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ مخلوق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ ہمیشہ خُدا کی رحمت کا منتظر رہے۔

اَکلِ حلال کی تاکید

یہ ذہن نشین رہے کہ دل کو اطمینان اور یکسوئی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب بقدرِ ضرورت پاکیزہ اور حلال کھانا کھایا جائے اور بے ہودہ گو دنیا داروں کی صحبت ترک کر دی جائے۔ اگر تمہارا کھانا حلال کا نہیں ہے تو اگر ہزار سال بھی ذکر میں مشغول رہو گی تو اس وقت بھی تمہارا روحانی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔[۵۱]

دوسری خاتون کی اصلاح

مکتوب شریف نمبر ۵۶ بھی ایک صالحہ خاتون کے نام ہے جس کا خدمت عالیہ میں حاضر ہونا آپ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اعلیٰ روحانی مقام پر فائز تھی اس لئے آپ اس کے احوال و مقامات کی نگرانی فرما رہے تھے لہٰذا آپ نے اس کے شوہر سے اس کا حال معلوم کیا اور فارسی میں تصوّف کی اصطلاحوں کے مطابق اس کے احوال دریافت فرمائے۔ وہ خاتون فارسی زبان نہیں جانتی تھیں تاہم معمولی ترجمہ کے ذریعے وہ تمام مفہوم کو اچھی طرح سمجھ گئی یہ آپ کی فیض و کرامات کا نتیجہ تھا۔[۵۲]

---

۵۱ ترجمہ مکتوبات خواجہ باقی باللہ۔ مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۵۸-۱۵۹۔

۵۲ ترجمہ مکتوبات صفحہ ۱۴۶۔

ماوراء النہر کا سفر

مسندِ شیخیت پر سرفراز ہونے کے بعد آپ کا قیام صرف دہلی تک محدود نہ تھا بلکہ آپ بوقت ضرورت سفر بھی فرماتے تھے آپ کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ آگرہ بھی تشریف لے گئے[1] اور لاہور جاتے ہوئے ماوراء النہر بھی تشریف لے گئے تھے) اور وہاں بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی اور مشہور علماء اور روحانی شیوخ سے بھی ملاقات کی تھی چنانچہ مکتوبات نمبر ۵۵ میں ایک دوست کے نام اس سفر کا حال اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے علاقہ بلخ میں پہنچا، ان لوگوں میں جو مسندِ ارشاد پر مقرر ہیں ذاتی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے علم کی تاثیر نہ پائی۔ شمر خاں کے ساتھ ملا صاحب کی ملاقات کے لئے گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اپنی منزل صاف نظر آئی۔ جناب مولوی صاحب باطن کی کمال تجرید سے موصوف ہیں ان کے اشعار کے دیوان سے جو انہی دنوں میں مکمل ہونے والا ہے۔ معرفت کے آثار نظر آتے ہیں۔ میں دو تین روز تک وہاں رہا۔ برہان المحققین اور حجۃ المرشدین حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کے مزار فیض انوار کی زیارت کا دل میں پختہ ارادہ تھا، وہاں بھی نہ ٹھہر سکا[2]"

مشائخ سے محبّت

آپ کے مکتوبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماوراء النہر کے مشائخ اور علماء سے آپ کو بے حد محبت تھی، اور آپ ان کی ملاقات و زیارت کے خواہاں تھے مگر آخر زمانے میں جسمانی ضعف کی وجہ سے ایک دفعہ آپ ماوراء النہر کا سفر نہیں کر سکے چنانچہ مکتوب نمبر ۶ میں جو آپ نے اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی کے صاحبزادے خواجہ ابوالقاسم رحمۃ اللہ علیہ کے نام تحریر فرمایا ہے، ملاقات کے اشتیاق و عقیدت کے ساتھ جسمانی کمزوری کی وجہ سے معذرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

1۔ ترجمہ مکتوبات ص ۱۴۲۔

2۔ ترجمہ مکتوبات ص ۱۴۵۔۱۴۶ مطبوعہ لاہور۔

اہل و عیال آپ کے دونوں فرزندانِ نرینہ حضرت خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبداللہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ یکم ربیع الاوّل ۱۰۱۰ھ میں بوقت عصر پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش پر آپ کے والدِ محترم حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے نہایت برجستہ قصیدہ لکھا جس سے آپ کا سالِ ولادت اور وقتِ ولادت دونوں کا اظہار ہوتا ہے، خواجہ بزرگ فرماتے ہیں :-

روگشتہ دریں خرابہ منزل	روز یکم از ربیع الاوّل
بود آخر عصر کاں یگانہ	افتادہ دریں سیاہ خانہ
طبعم غزل نشاط می گفت	دیدم ناگہ بہار بشگفت
تاریخ شناس تیز بیں مرد	بشگفت بہار در خط آورد

ان اشعار میں بشگفت بہار کے الفاظ سے سن ولادت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ولادت سے قبل ایک خدا رسیدہ درویش کو (جنہیں ذکری بابا کہا جاتا ہے) بذریعۂ کشف یہ معلوم ہوا کہ محترم خواجہ بزرگ کے گھر میں فرزند ارجمند پیدا ہونے والا ہے۔ لہٰذا انہیں ہدایت کی گئی کہ اس فرزندِ ارجمند کا نام خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ کے اسم گرامی پر رکھا جائے۔

اس صاحب دل درویش نے اس واقعہ کا اظہار حضرت خواجہ باقی باللہ سے کیا تو آپ نے اپنے فرزند ارجمند کے تولد ہونے پر ان کا اسم مبارک خواجہ عبید اللہ رکھا۔

خواجہ عبید اللہ نے دو سال تک اپنے والد بزرگوار کے زیر نگرانی پرورش پائی۔

خواجۂ خورد خواجۂ بزرگ کے دوسرے فرزند ارجمند خواجہ محمد عبداللہ جو خواجہ خورد کے لقب سے مشہور ہیں، آپ کی دوسری زوجہ محترمہ سے اپنے بڑے بھائی کے چار مہینے بعد ماہ رجب میں پیدا ہوئے۔ حضرت خواجۂ بزرگ نے اس دوسرے فرزند کی پیدائش پر بھی چند اشعار کا ایک قصیدہ نظم کیا، جس میں تاریخِ ولادت اور وقتِ ولادت کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں :-

تاریخ یکے چو شد نمودار	ہنگام تولد دگر آر

افتادہ بہ بحر در تلاطم	ماہ رجب، وپگاہ ششم
مابین ظہور ایں دو گوہر	بگزشتہ چہار ماہ اکثر
چوں صبح رسید آخر شب	چوں روز زردشتی لبالب
چوں ماہ تمام، نشرح صدر	در ظلمتِ شب چو ساعتِ قدر

دونوں فرزند صورت وسیرت میں اپنے والد محترم کے مشابہ تھے۔

مذکورہ بالا فرزندوں کے علاوہ شاید آپ کی ایک دو صاحبزادیاں بھی تھیں، کیونکہ شاہ غمگین جی کے بارے میں بعض تذکروں میں یہ مذکور ہے کہ وہ آپ کے داماد تھے۔ تاہم اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوسکی۔

والدہ ماجدہ آپ کی والدہ ماجدہ دہلی میں آپ کے ساتھ رہتی تھیں، آپ بروقت فقراء اور درویشوں کو کھانا کھلانے کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ صاحب کی خانقاہ کے باورچی خانے کا کل کام آپ کے سپرد تھا۔ ایک دفعہ حضرت خواجہ صاحب نے از راہ رحم وشفقت، ضعف پیری کی وجہ سے یہ کام والدہ صاحبہ سے لے لیا تھا اور دوسروں کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر آپ بہت رنجیدہ ہوئیں، لہٰذا دوبارہ یہ خدمت انہی کے سپرد کر دی گئی۔ اور ان کی مدد کے لئے اپنے سالے محمد صادق کی بیوی، بی بی بانو اور شیخ محمد صدیق کشمیری کی بیوی بی بی آغا کو خمیر کرنے اور مطبخ کے دوسرے کاموں میں مدد دینے کے لئے مقرر فرمایا۔[1]

ازواجِ مطہرات آپ کی دو[2] ازواج مطہرات تھیں اس لئے آپ کے دو گھر تھے، آپ کی ازواج مطہرات آپ کی کثرت عبادت و ریاضت کی وجہ سے اپنے تمام حقوقِ زوجیت سے دست بردار ہوگئی تھیں تاہم آپ ان کے تمام حقوق شرعی انصاف کے ساتھ ادا فرماتے تھے اور باری باری ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ سخت بیماری اور ضعف کے آخری دنوں میں بھی عدل وانصاف کو قائم رکھا۔

---

[1] ترجمہ مکتوبات ص۷۶۔

آپ کی یہ عادت تھی کہ جس گھر میں رات بسر کرتے فجر کی سنت بھی وہیں ادا فرماتے پھر نماز جماعت کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے بلکہ تحیۃ الوضوء کی نفلیں بھی گھر میں ادا فرماتے تھے۔

عوام کی خدمت مسجد جاتے وقت اکثر ضرورت مند افراد آپ سے گفتگو کر کے اپنی ضرورتیں بیان کرتے تھے۔ لہٰذا آپ تھوڑی دیر ٹھہر کر ان کی باتیں توجہ سے سنتے اور نہایت خنداں پیشانی سے ہر ایک کو جواب شافی دیتے تھے۔

نماز باجماعت سے فارغ ہونے کے بعد جب آپ مسجد سے نکلتے تھے تو اس وقت بھی معتقدین اور حاجت مندوں کی ایک جماعت اکٹھی ہو جاتی تھی۔ اور وہ لوگ آپ سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ انہیں تسلی بخش جواب دیتے تھے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

مخلوق خدا کی حاجتیں بر لانے کی وجہ سے آپ کو بڑی بڑی فتوحات اور کشائش حاصل ہوئی تھی، اس لئے آپ تندہی سے عوام کی خدمت کرتے تھے۔ اس طرح آپ کی ذات سے نہ صرف آپ کے مریدوں کو روحانی فوائد پہنچے بلکہ عوام کو بھی ظاہری اور باطنی فیض سے بہرۂ وافر ملا[1]۔

خلوت نشینی آخر زمانے میں جب آپ عدم اور فنا کے عالم میں پہنچ گئے تھے اور جسمانی ضعف اور ظاہری امراض غالب آگئے تھے، اس وقت آپ نے لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی آپ صرف مسجد سے آتے جاتے وقت لوگوں کی اصلاح اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کچھ وقت ان سے گفتگو میں صرف فرماتے تھے ورنہ آپ اپنا تمام وقت تنہائی اور عبادت میں صرف فرماتے تھے۔

فیضِ عام آپ مسندِ ارشاد و ہدایت پر صرف دو[2] سال فائز رہے، جب حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی آپ سے فیض یاب ہو گئے تو آپ نے اپنے تمام مریدوں کی روحانی تعلیم و تربیت ان کے سپرد کر دی تھی، اور خود بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ تاہم اس قلیل عرصے میں آپ نے سلسلۂ نقشبندیہ کو جو اس برصغیر ہند و پاکستان میں بالکل اجنبی تھا، ملک کے گوشے گوشے میں روشناس کرایا۔

---

[1] ترجمہ مکتوبات ص ۷۳۔

مولانا ہاشم کشمی کا بیان

مولانا ہاشم کشمی اپنی مشہور کتاب زبدۃ المقامات میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

اس حقیر سے ایک فاضل نے فرمایا "بعض بزرگوں نے برصغیر ہند و پاکستان میں تقریباً سَتّر سال تک اپنے مریدوں کو فیض یاب کیا مگر اس کے باوجود ان کا سلسلہ ختم ہوگیا مگر تمہارے خواجہ صاحب کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ گو وہ چالیس سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئے اور صرف دو سال تک مسندِ ارشاد و ہدایت پر سرفراز رہے مگر اس قلیل عرصے میں آپ تمام دنیا کو فیض یاب کر گئے اور توقع ہے کہ قیامت تک ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ جاری رہے گا"[1]

ترکِ توجہ خصوصی

آخر میں آپ نے اپنے خصوصی مریدوں کو توجہ دینا بھی بند کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ کو تن تنہا رہنے کا حکم مل گیا تھا۔ لہٰذا آپ نے اپنے معتقدین اور مریدین کو بلا کر نہایت شفقت سے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی مرضی مشیخت کے ترک کرنے میں ہے تو دوستوں کو چاہیئے کہ ہم کو اپنی تربیت کے لائق نہ سمجھیں اور جہاں چاہیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے چلے جائیں"۔

یہ بات سُن کر آپ کے نیازمند بہت پریشان ہوئے اور وہ ان الفاظ سے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔ لہٰذا آپ نے ان کی غلط فہمی اور پریشانی دور کرنے کے لئے یہ فرمایا:۔

"میں یہ بات حکم کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں بری الذمہ ہو جاؤں کیونکہ بعض رفقاء اپنی تعلیم، روزگار اور کاروبار کو چھوڑ کر یہاں آکر فقر و درویشی کی تکالیف برداشت کر رہے ہیں"۔

وفات کی پیشینگوئیاں

وفات سے پیشتر آپ نے وفات اور رحلتِ دُنیاوی کے بارے میں پیشینگوئیاں کرنی شروع کر دی تھیں چنانچہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا:۔

---

[1] زبدۃ المقامات صفحہ ۳۱۔

"ایسا دیکھا گیا ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ میں سے کوئی بزرگ فوت ہو جائے گا۔"
اس کے بعد آپ نے یہ خواب دیکھا کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے: "جس مقصد کے لئے تمہیں دنیا میں لائے تھے وہ مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، لہٰذا اب یہاں سے سفر کرنا چاہیئے۔"

وفات سے چند دن بیشتر آپ نے فرمایا:۔

"میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے لوگ کہتے ہیں کہ:۔ زمانے کا قطب مر گیا ہے اس وقت میں اپنے مرثیہ میں بہت ہی عمدہ نظم پڑھ رہا ہوں اور اس میں نہایت اعلیٰ درجے کے اشارات و کنایات مذکور ہیں۔"

وفات کا حال

آپ کی وفات کا حال، آپ کی مجالس مرتب کرنے والے نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے وہ اپنی سولہویں (۱۶) مجلس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بتاریخ پندرھویں ماہ جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ، پرانی دائمی بیماریوں کے علاوہ جن میں آپ بظاہر تندرست دکھائی دیتے تھے آپ کو بخار بھی لاحق ہو گیا تھا یہ آپ کا آخری مرض تھا۔ اس مرض کی حالت میں آپ فرماتے تھے:۔

"خواب میں حضرت خواجہ احرار قدس سرہ سے ملاقات ہوئی خواجہ صاحب نے بڑی عنایت و مہربانی فرمائی اور حکم دیا 'پیراہن پہن لو'۔"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد آپ مسکرانے لگے اور فرمایا "اگر زندہ رہے تو ایسا کریں گے ورنہ کفن ہی پیراہن ہے۔"

اس مرض کے لاحق ہونے سے ایک دن پہلے آپ نے اپنی ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک سے فرمایا "جب میری عمر چالیس (۴۰) سال کی ہو جائے گی۔ تو اس وقت مجھے ایک بڑا واقعہ پیش آئے گا۔" اس خبر کو سن کر گھر کے لوگ بہت پریشان ہوئے اس پر آپ نے فرمایا "چالیس سال عمر کم نہیں ہے، کیا چالیس سال زندہ رہنا کم مدّت ہے"؟

مؤلفِ مجالس کا بیان

مؤلفِ مجالس تحریر فرماتے ہیں:۔

بروز ہفتہ، ۱۷ جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ کو حضرت مخدومی حاجی

شیخ عبدالحق سلمہ اللہ تعالیٰ کے ہمراہ فقیر مجلس عالی میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا:۔

"کل رات سے بدن کے جوڑ اور اعضاء اس قدر درہم برہم ہوئے کہ گویا نزع کی حالت ہوگئی، نصف شب تک ایسا ہی حال رہا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایت سے آرام آگیا اگر مرنے سے یہی حالت مراد ہے تو بہت ہی عجیب نعمت ہے، کیونکہ اس حالت سے نکلنے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی۔"

وصیت اس بیماری کی حالت میں آپ نے وصیّت فرمائی:۔

"ہمارے پاس دو مشتبہ کتابیں ہیں۔ انہیں ان کے مالک کے پاس واپس کردو۔"

یہ کتابیں شرعی ہبہ کے مطابق آپ کی جائز ملکیت میں تھیں تاہم آپ نے انہیں واپس کرنا احتیاط و تقوای کے مطابق سمجھا۔

میراث آپ نے میراث میں جو چیزیں چھوڑیں وہ مندرجہ ذیل تھیں۔ ایک نقد روپیہ۔ چند کتابیں۔ ایک گھوڑا اور ایک فرش اور یہ روحانی طریقہ (نقشبندیہ) جو مریدوں میں رائج ہے۔

آخری ایام بروز پنجشنبہ ۲۳ رجادی الثانی کی شام کو آپ بہت تندرست نظر آتے تھے۔ چنانچہ عصا ہاتھ میں لے کر اپنے پائے مبارک سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تشریف لے گئے۔ اور بہت خوش ہوکر اس گھر میں جو دریا کے سامنے تھا اور جس میں مخالف ہوا آتی تھی رونق افروز ہوئے۔ آپ نے شام کی نماز اشارہ سے ادا فرمائی۔ اس کے بعد بلند آواز میں مثنوی مولانا روم پڑھنے لگے۔ آپ کے وہ مخلصین جو تیمارداری کی خدمت پر مامور تھے یہ حال دیکھ کر حیران ہوگئے تاہم بعض لوگوں نے تصوّف کے بعض اسرار و غوامض کے بارے میں دریافت کرنا شروع۔

ایک سوال کا جواب چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے یہ دریافت کیا۔ "قرآن کریم میں ایمان بالغیب کا حکم ہے وہ غالباً عام مسلمانوں کے لئے ہوگا اہل مشاہدہ کے لئے نہیں ہوگا، کیونکہ اہل مشاہدہ کا ایمان شہود کے ساتھ ہے۔"

آپ نے فرمایا "ایسا نہیں ہے، ایمان بالغیب کا حکم عام و خاص سب مؤمنین کے لئے ہے۔"
جمعہ کی رات کے آخر حصّے میں آپ کے دل پر ضعف غالب آگیا اور آپ بے ہوش ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش آیا تو چہرۂ مبارک پر خوشی اور تروتازگی کے آثار نمایاں تھے اور آرام و قرار کا اظہار ہو رہا تھا، آپ نے آنکھیں کھولیں مگر اس کے بعد سے لے کر وفات تک آپ نے بات چیت نہیں کی۔ یہ خاموشی صرف بارہ پہر تک باقی رہی تھی۔ اس عرصے میں بعض ایسی دواؤں کا استعمال جاری رہا جو آپ کی طبیعت کے مخالف تھیں تاہم آپ نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس وقت سے لے کر وصال کے وقت تک آپ کا چہرہ نہایت مطمئن اور پُرسکون رہا۔ البتہ جب ایک مرتبہ ایک ہندو طبیب کو علاج کے لئے بلوایا گیا تو آپ نے اس کی آمد کو ناپسند فرمایا اور چیں بجبیں ہو کر اس ہندو وید کی طرف سے منہ پھیر لیا یہ حال دیکھ کر خواجہ حسام الدین احمد نے عرض کیا:۔

"حضور کی والدہ ماجدہ کی رضامندی سے یہ گستاخی کی گئی ہے ورنہ آپ کی طبیعت کا حال ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہندو طبیب کے لانے سے خوش نہیں ہیں۔"

یہ بات سُن کر آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ تبدیل ہوگیا اور آپ اپنی والدہ کی مرضی کے تابع ہوگئے۔ اس اثنا میں ایک مخلص نے اللہ العالمین کا نام لیا۔ یہ لفظ سن کر آپ نے جلدی سے اس کی طرف نگاہ کی اور اپنے سرِ مبارک کو جو نہایت ہی بے چینی کی حالت میں تھا اس کی طرف پھیر لیا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا:۔

"دیکھو محبوب کا نام سن کر کس درجہ شوق میں آپ نے جنبش فرمائی ہے۔"

یہ بات سُن کر آپ کی حقائق بیں آنکھیں گردش میں آئیں اور بے اختیار آنسو ڈبڈبا آئے۔[1]

مؤلف مجالسِ باقیہ اپنی سترھویں مجلس میں جو آخری مجلس ہے، آپ کے وصال کا حال یوں بیان فرماتے ہیں:۔

---

[1] حیات باقیہ صـ ۶۱ — ۶۲ (سولہویں مجلس)۔

"بروز ہفتہ ۲۵ رجادی الثانی ۱۰۱۲ھ کو حضوری کی سعادت حاصل ہوئی اس وقت سکرات موت میں مبتلا تھے۔ مخلصوں میں سے جو کوئی حاضر ہوتا، تھوڑی دیر آپ اسے دیکھتے اس کے بعد آپ آنکھیں پھر کر یا بند کر کے اسے رخصت فرما دیتے تھے۔ جب اس مسودہ (مجالس) کا جامع آپ کی نظر مبارک کے سامنے آیا تو آپ بہت دیر تک اس فقیر کی طرف متوجہ رہے اور کسی دوسری طرف نگاہ نہ ڈالی۔ اے خدا تو ہمیں ان کی برکات سے بہرہ مند فرما۔

حجۃ الاسلام حضرت مخدومی خواجہ حسام الدین احمد رو رہے تھے آپ نے الوداعی نظروں نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور ان کے حال پر بہت ہی شفقت و مہربانی فرمائی۔ لیکن حضور کے چہرہ سے حسب عادت تبسم اور تعجب کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم اپنے آپ کو درویشوں کی جماعت میں سمجھتے ہو اور اس معاملہ میں بچوں کی طرح رو رہے ہو"

آپ نے بہت دیر تک ان کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے کر پکڑے رکھا اور اپنا دست مبارک ان کے چہرے اور سر پر پھیرا۔

اس آخری بیماری کے وقت خواجہ حسام الدین احمد کے علاوہ اور کوئی اصحابِ کرام میں سے خدمتِ عالی میں ہر وقت حاضر نہیں رہتا تھا۔ اگرچہ میاں شیخ اللہ داد بھی قریب رہتے تھے لیکن وہ آپ کے مرض کی شدت اور ضعف کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکے اور انہیں ایسا ضعف لاحق ہو گیا تھا کہ وہ اس موقع پر خدمتِ عالیہ میں حاضر نہیں ہو سکے۔

لہٰذا خواجہ حسام الدین احمد کے علاوہ اور کوئی شب و روز آپ کی خدمت میں حاضر نہیں تھا چونکہ آپ پر سکرات موت کا عالم طاری تھا اور مکان تنگ تھا۔ اس لئے معتقدین یکے بعد دیگرے آکر رخصت ہو جاتے تھے میں بھی ان عزیزوں سے رخصت حاصل کر کے جو وہاں موجود تھے، چلا گیا۔

ہفتہ کی شام کو جب کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، آپ بلند آواز کے ساتھ اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہوئے۔ اور دو تین گھڑی کے بعد اسی حالت میں جوارِ رحمتِ حق میں جا ملے اور عالمِ قدس میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (حیات باقیہ

مطبوعہ دہلی ص ۶۶-۶۸ سترھویں مجلس) -

آپ کی وفات کے بعد آپ کے معتقدین کے فیصلے کے مطابق ایک عمدہ زمین میں آپ کا مزار تیار کیا گیا، لیکن جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو رنج و غم سے نڈھال ہو کر بے حواسی کے عالم میں آپ کے معتقدین اس مقام کے بجائے، جہاں آپ کا مزار مبارک تیار کیا گیا تھا آپ کا جنازہ دوسرے مقام پر لے گئے - وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ وہی سرزمین ہے جہاں حضرت خواجہ صاحب نے وضو کر کے دوگانہ ادا فرمایا تھا، اور وہیں بیٹھ کر آپ نے اپنے مریدین کو روحانی تلقین کی تھی - اور جب آپ وہاں سے اٹھے تو آپ کے دامنِ مبارک پر کچھ خاک لگ گئی تھی اس موقع پر آپ نے فرمایا :-

"یہ مقام ہمارا دامن گیر ہے، یہی ہمارا مدفن ہوگا"

لہٰذا آپ کے مخلص دوستوں نے اسی واقعہ کے پیشِ نظر اس خود فراموشی کے فعل کو خدا کی حکمت و ہدایت پر محمول جانا اور وہیں قبر کھود کر آپ کو دفن کیا یہ مقام قدم شریف کے قریب درگاہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے مشہور ہے[1] -

حضرت خواجہ باقی باللہ نے ۲۵ رجمادی الثانی ہفتہ کی شام کو اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا، مگر آپ کو ۲۶ رجمادی الثانی بروز یکشنبہ اس مقام پر دفن کیا گیا جو قدم گاہ کے مجاوروں کے لئے بنایا گیا تھا -

آپ کی وصیت اور ہدایت کے مطابق آپ کے مزار مبارک پر کوئی چھت یا گنبد تعمیر نہیں کیا گیا اور نہ کوئی کتبہ لگایا گیا تھا - تاہم حضرت خواجہ حسام الدین احمد نے جو آپ کے بعد آپ کی خانقاہ اور درگاہ کے منتظم اور متولی تھے، آپ کے مزار کے اردگرد بہت سے خوشنما درخت لگوا دیئے تھے جن کی وجہ سے یہ قطعۂ زمین رشکِ گلستان بن گیا تھا -

---

[1] حیات باقیہ مطبوعہ دہلی ص ۶۶-۶۸ (سترھویں مجلس) -

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ

ملفوظات

(مسلسل)

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ارشاد فرمایا کہ — کتاب مفتاح الفیض، شیخ حسنؒ ع طاہرؒ کی تصنیف ہے انہوں نے سلوک میں بڑی اچھی کتاب تحریر فرمائی ہے۔

فرمایا کہ — وہ علوم جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی بساط کے مطابق ان کو یاد

ع راجی حامد شاہؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کے والد شیخ طاہرؒ ملتان سے طلب علم کے سلسلے میں نکلے تھے وہ ایک مدت تک بلدۂ بہار میں رہے۔ شیخ حسنؒ بہار ہی میں پیدا ہوئے۔ عالمِ شباب میں طلبِ علم کے زمانے ہی میں دردِ طلب معرفت دامنگیر ہو گیا تھا۔ بنابریں درویشوں کی خدمت میں رہنے لگے بعدہٗ راجی حامد شاہؒ کی خدمت میں پہنچے اور علماء میں سب سے پہلے یہی وہ شخص ہے جو حضرت راجی حامد شاہؒ کے مُرید ہوئے۔ جونپور میں سکونت اختیار کر لی تھی بعدہٗ سلطان سکندر لودھی کی درخواست پر اوّل آگرہ پھر دہلی تشریف لے آئے وہیں کوشک نجے منڈل میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکونت اختیار کر لی تھی ۲۴ ربیع الاوّل ۹۰۹ھ کو وصال ہوا۔ (اخبار الاخیار)

بھی رکھتا ہوں ـــــ ڈیڑھ سو علوم ہیں۔

ایک عالم نے عرض کیا کہ (عام طور پر) ۱۴ علوم بتائے جاتے ہیں ـــــ فرمایا یہ تحصیلِ علم کے اعتبار سے ہیں ـــــ (نہ کہ مطالعہ کے اعتبار سے)۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک روز ذکر تھا کہ منظوم خطبہ ہندوستان میں رواج پا گیا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ فرمایا مکروہ ہے مگر اس صورت میں مکروہ ہے جب کہ بالکل نظم ہی نظم ہو خواہ وہ نظم اردو میں ہو خواہ فارسی میں خواہ عربی میں ـــــ اگر بعد نثر (عربی) کچھ اشعار (عربی، نصیحت آمیز) پڑھ دے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے ـــــ

فرمایا کہ ـــــ فوائد الفواد (ملفوظات سلطان المشائخؒ) سلوک کا دستور العمل ہے۔ بہت ہی اچھی کتاب ہے ـــــ ہر چند کہ امیر خسرو نے بھی ملفوظاتِ سلطان المشائخؒ جمع کئے ہیں، لیکن وہ اس قدر مقبول نہیں ہیں۔

فرمایا کہ ـــــ سلطان المشائخؒ عظیم الشان بزرگ تھے اور ان کے خلفاء بھی کیسے کیسے عالیشان ہوئے ہیں جیسے حضرت اخی سراجؒ (یعنی شیخ سراج الدین عثمان اودھیؒ) حضرت نصیر الدینؒ (چراغ دہلی)۔

فرمایا کہ ـــــ حضرات قدمائے چشتیہ نے سماع، مزامیر کے ساتھ نہیں سنا، چنانچہ سلطان المشائخؒ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) جو کہ سماع کے عاشق تھے، فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مزامیر سنے وہ میری محفل میں نہ آئے۔

ارشاد فرمایا کہ ـــــ شیخ سدوؒع کے نام کا کھانا نہ کھانا چاہئے، اس لئے کہ اس کھانے کو

ع امروہہ میں سلطان معز الدین کیقباد کے زمانے میں اب سے ٹھیک سات سو سال پہلے سب سے پہلی جامع مسجد حکومت کی جانب سے بنائی گئی۔ عہدِ اکبری میں سید محمد میر عدل امروہیؒ نے اس کی شان و شوکت میں اور اضافہ کیا اس مسجد میں ایک مدرسہ بھی تھا جو مدرسۂ معزیہ کہلاتا تھا۔ اس مسجد کے ایک مؤذن صدر الدین (جو سدو کہلانے لگا) کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عملیات کا ماہر تھا اور غلط طریقے پر یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی روح ماری ماری پھرتی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

لوگ بھوگ کے طور پر کرتے ہیں، سدّو کی ایذا رسانی کے خوف سے۔

ایک مُرید نے عرض کیا کہ بعض جگہ بعض جنّات کی پختہ یا خام چیز پر نیاز دلاتے ہیں صرف اس خیال سے کہ یہ جن فلاں بزرگ سے تعلق رکھتا تھا۔

فرمایا —— ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

ارشاد فرمایا —— میرے شاگردوں میں دو شاگرد خوب ہیں ایک مولوی رفیع الدین (شاہ رفیع الدین دہلویؒ) اور دوسرے مولوی الٰہی بخش (مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ) یہ دونوں بقیدِ حیات ہیں (مولوی) مُراد علی (جوکہ میرے شاگرد ہیں) کلکتہ میں رہتے ہیں مگر شغلِ تدریس چھوڑ دیا ہے۔ تجارت میں مشغول ہو گئے ہیں —— باقی (اکثر شاگرد) انتقال کر گئے۔

فرمایا کہ —— مولوی رفیع الدین (دہلوی) نے ریاضیات میں اتنی ترقی کی ہے کہ ریاضی کے موجد محمد علی نے شاید اسی قدر ترقی کی ہو۔

ارشاد فرمایا کہ —— والد ماجدؒ نے ہر ایک فن میں ایک ماہر شخص تیار کیا تھا اور ہر فن کے طالب کو اُس فن کے ماہر کے سپرد کر دیتے تھے —— خود معارف گوئی اور معارف نویسی میں مشغول رہتے تھے اور درسِ حدیث دیتے تھے (بعض مضامین) بعدِ مراقبہ اور کشف کے ذریعے معلوم کر لینے کے بعد تحریر فرماتے تھے —— بیمار کم ہوتے تھے —— عمر شریف ۶۱ سال چار ماہ کی ہوئی۔ ۴ شوال المکرم کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ محرم الحرام کو بوقت ظہر وفات پائی

(گزشتہ صفحہ کا باقی حاشیہ) ہوس پرستوں اور شرک پسندوں نے سدّو کے نام پر کھانے کمانے کے دھندے نکال لئے اور مسلمانانِ امروہہ کی روشن پیشانی پر بدنامی کا ٹیکہ لگا دیا۔ صحیح طور پر متعین کر کے نہیں کہا جا سکتا مگر کوئی دو سو سال سے یہ شرک کا بازار گرم تھا۔ سدّو کا بکرا تو مشہور ہی ہے جس کو فتاویٰ اور تفسیر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے حرام قرار دیا ہے۔ شرک پسندوں نے جن میں سنّی اور شیعہ دونوں ہیں مسجد سے باہر میلا کرتے کرتے یہ چاہا کہ اس قدیم مسجد کو اپنے مشرکانہ رسوم کا مرکز بنائیں، امروہہ کے حساس مسلمانوں نے ان کے مقصد کو پورا نہ ہونے دیا۔ اس کا مقدمہ سال بھر سے چل رہا ہے ناظرین دعا کریں کہ اہلِ حق کو کامیابی ہو۔

(اس کے بعد غالباً دوبارہ معلوم کر کے جامع ملفوظات نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ) آپ کی تاریخ تولد ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ روز چہار شنبہ ہے ۔ تاریخ وفات ۔ او بود امام اعظم دین ۱۱۷۶ھ ہے ۔

ارشاد فرمایا کہ — سلطنت، کفر کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے ۔ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی ۔

ارشاد فرمایا کہ — فی الحقیقت بیعت ، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلکہ خدا سے ہوتی ہے — تمام (مُرشد) نائب حضرتِ رسالت مآب ہیں اور مُرید ، بشرط اجازت نائب مرشد ہوتا ہے ۔

فرمایا کہ — مثنوی مولانا روم ؒ کُل کی کُل جواہرِ نفیسہ کی مانند ہے لیکن اُس کا ایک شعر تو لاکھ روپے کا ہے ۔

ور کُند رو لطفِ او شد بیشتر بہر تقریب سخن ، بار دگر

(یعنی اگر اللہ تعالیٰ بندے کی دُعا کو قبول نہ فرمائے تو یہ بھی اس کا ایک بڑا لطف وکرم ہوتا ہے اس لئے کہ اس صورت میں دوبارہ اس سے مناجات کرنے اور گفتگو کرنے کی تقریب پیدا ہو جاتی ہے) ۔

ایک شخص کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ — میں نے عربی اشعار ایک مدت تک کہے ہیں ، اب ۲۵ سال سے کہنے موقوف کر دیئے ہیں — نیز فرمایا کہ عربی نظم ونثر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عجمیت بالکل محسوس نہ ہو ۔ چنانچہ ہمارے خاندان میں (عربی نظم ونثر کے اندر) یہی بات ہے (کہ ہوئے عجمیت نہیں پائی جاتی) ۔

فرمایا کہ — والد ماجد ؒ کی مثل مجھے کوئی شخص نظر نہیں آیا علاوہ کمال علوم اور دیگر کمالات کے ان کو ضبطِ اوقات میں بھی کمال حاصل تھا کہ بعد اشراق (تحریر وتصنیف کے لئے جا بیٹھتے تھے اور دو پہر تک زانو نہیں بدلتے تھے حتّٰی کہ جسم کو کھجاتے اور تھوکتے بھی نہ تھے ۔

ایک بزرگ نے عرض کیا کہ میں نے آپ کے جدِّ امجد (حضرت شاہ عبدالرحیم ؒ) کو خواب میں دیکھا ہے بالکل آپ کی صورت تھے ۔ فرمایا ہاں میں اپنے دادا سے بہت مشابہ ہوں ۔

فرمایا ــــــ میں نے نعتِ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت سے اشعار کہے ہیں اور والد ماجدؒ کے ہر دو قصیدۂ ہمزائیہ و یائیہ کو مخمس کیا ہے یعنی ہر شعر پر تین مصرعے اپنی طرف سے لگائے ہیں ــــــ ادبی تذکرے میں بید مجنوں کا ذکر آگیا تو فرمایا کہ میں نے بھی بید کو ایک شعر میں نظم کیا تھا وہ شعر یہ ہے ؎

زنازک طبع غیر از خود نمائیہا نمی آید　　درختِ بید را دیدم کہ دائم بے ثمر باشد

(ترجمہ) :- نازک مزاج لوگوں سے سوائے خودنمائی کے اور کچھ نہیں آتا میں نے درخت بید کو (جو کہ نازک ہوتا ہے) دیکھا کہ ہمیشہ بے ثمر رہتا ہے)۔

فرمایا کہ ــــــ ہر چند والد ماجدؒ نے مجھے شغل معالجہ اور طبابت سے منع فرما دیا تھا لیکن طب (فی نفسہ) ہے اچھی چیز ــــ گویا جاں بخشی ہے۔

نیز فرمایا کہ میں ایک مرتبہ بچپن میں بیمار ہو گیا تھا ایک حکیم نے میرا علاج کیا (بفضلہ تعالےٰ) مجھے شفا ہو گئی ــــ والد صاحبؒ نے ان حکیم صاحب سے فرمایا کہ چونکہ تم نے مجھے خوش کیا ہے اس لئے بولو میں تمہارے حق میں کیا دُعا کروں۔ اگرچہ اس انداز میں بات کہنی والد ماجدؒ کی عادت کے خلاف تھی (مگر حکیم صاحب سے یہ بات فرمادی) حکیم صاحب نے عرض کیا کہ آپ دعا کر دیں کہ میں ملازم ہو جاؤں۔ اُسی زمانے میں وہ نو روپے کے ملازم ہو گئے اور سواری بھی ان کو ملی ــ جب انہوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں (آپ کی دُعا سے) ملازم ہو گیا۔ تو فرمایا کہ تمہاری ہمت بہت کم تھی کہ تم نے فقط دنیا پر اور اتنی حقیر چیز پر اکتفا کیا۔

ارشاد فرمایا کہ ــــــ مکہ معظمہ میں اس وقت سلطان مراد (شاہ روم) کی بنوائی ہوئی عمارت ہے جس کو ۱۰۱۶ھ میں تعمیر کرایا تھا۔

ارشاد فرمایا ــــــ قطب مینار سات منزل کا تھا، اب چھ منزل رہ گیا ہے۔ اس پر سے ایک فقیر (تماشے کے طور پر) جست لگایا کرتا تھا اور کمال یہ کرتا تھا کہ اپنے لمبے اور گھیر دار لباس کے ساتھ ہوا میں معلق ہو جاتا تھا، پھر انتہائی کمال یہ دکھاتا تھا کہ (نیچے کھڑے ہوئے تماشائیوں کے مجمع میں سے) کوئی انعام کے لئے روپیہ دکھاتا تھا تو اس روپے کو لینے کے لئے اوپر سے نیچے

جست لگا کر اُترتا تھا اور اس مجمع کثیر میں سے اسی روپیہ دکھانے والے کو پکڑ لیتا تھا، حالانکہ اتنے جمگھٹے میں ایک مخصوص شخص کا شناخت کرلینا مشکل بات ہے۔ میں نے اس کا یہ کمال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ارشاد فرمایا۔۔۔(ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں) ایک رات میں نے دہلی کی جامع مسجد میں شمار کیا تھا ۳۵ جگہ حُفاظ، جماعت کے ساتھ تراویح پڑھا رہے تھے۔

فرمایا کہ ـــــ اگر آدمی کردار کا سچّا اور پکّا ہو تو بڑی اچھی بات ہے ـــــ کتب سلوک میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک چور تھا اُس نے اپنے گروہ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں سوائے بادشاہ کے گھر کے کسی کے یہاں چوری نہیں کروں گا چنانچہ ایک رات موقع پاکر وہ بام بادشاہ پر چڑھ گیا، دیکھا کہ بادشاہ جاگ رہا ہے اور اپنی بیوی سے لڑکی کی شادی کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ درمیانِ گفتگو میں بادشاہ نے کہا کہ میں گردو نواح کے شاہوں میں اس لڑکی کا رشتہ نہیں کروں گا، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کسی ایسے شخص سے اس کی شادی کروں جو صالح ہو اور دین کا بادشاہ ہو۔ بیوی نے کہا کہ آپ کس طرح پہچانیں گے کہ یہ دین کا بادشاہ ہے۔ جواب دیا کہ جو شخص ایک سال تک تکبیر اولیٰ فوت کئے بغیر نماز باجماعت پڑھے گا وہ بلاشبہ صالح ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو اور اس کی وجہ سے کبھی تکبیرِ اولیٰ رہ جائے۔

اس چور نے جب یہ سُنا تو چوری چھوڑ چھاڑ ایک مسجد میں ڈیرا ڈال لیا اور سال بھر تک اس کی تکبیرِ اوّل فوت نہیں ہوئی ـــــ اب سوائے اس کے کوئی ایسا نہ تھا کہ اس کی تکبیر اوّل سال بھر تک فوت نہ ہوئی ہو (ایک سال گزرنے پر بعد تحقیقات) بادشاہ اس مسجد کی طرف گیا۔ سلام و کلام اور تعظیم و تکریم کے بعد بادشاہ نے اس شخص سے دریافت کیا کہ آپ کے پیرو مرشد کون ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میرے پیرو مرشد تو سرکار ہی ہیں اور پورا قصہ بیان کیا۔ پھر (بادشاہ کے کہنے کے باوجود) اس کی لڑکی سے اپنی شادی کرنا منظور نہیں کیا۔

پھر ارشاد فرمایا کہ نیت ہمیشہ ڈانوا ڈول رہا کرتی ہے، اسی بنا پر بزرگوں نے کہا ہے کہ عملِ خیر میں مشغول رہنا چاہیئے انشاء اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی نیّت درست ہو ہی جائے گی۔

فرمایا کہ ـــــ حکومتِ نواب وزیر (حکومتِ اودھ) ابھی تک دارالحرب نہیں بنی

اگرچہ دارالرفض ہے —— تجربے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس حکومت میں بے برکتی بہت ہے اگرچہ یہ بے برکتی انگریزوں کی عملداری والے علاقوں سے کم ہے۔

مولانا عبدالعلیؒ (بحرالعلوم فرنگی محلی) کا اور آصف الدولہ کے ان کو طلب کرنے کا ذکر آیا تو فرمایا کہ غازی الدین حیدر اگر مجھے بلا منصب و جاگیر بھی طلب کرے گا تو میں وہاں جاؤں گا بشرطیکہ وہ میرے مسلک سے معترض نہ ہو، اور پھر انشاء اللہ تعالیٰ دکھاؤں گا کہ ایک مخلوق راہِ ہدایت پر آجائے گی، اپنی تقاریر کا ڈھنگ بھی بدل دوں گا، یعنی وہ تقاریر بالکل اچھوتے اور نئے انداز کی ہوں گی، جو سب میں مقبول ہوں گی اور لوگ متوجہ ہو کر دینِ حق اختیار کرلیں گے۔

ارشاد فرمایا —— پانی کم پینے سے قوتِ گویائی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ حکیم سنائیؒ نے فرمایا ہے ؎

ذہنِ ہندی ونطقِ اعرابی بود از کم خوری و کم آبی

(یعنی ہندوستانی کا ذہن کم کھانے اور عرب کے دیہاتی کی قوتِ گویائی کم پینے کی وجہ سے ہے)۔

فرمایا کہ —— ہر قوم کا ذہن کسی نہ کسی فن میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ذہنِ ہنود، حساب میں اور ذہنِ انگریز جزوی صنعت و حرفت میں اور ریاضیات میں خوب ہے، اگرچہ وہ دقائقِ منطقیہ اور مسائلِ الٰہیات و طبیعات کو کم سمجھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

فرمایا کہ —— دو[2] میوے ایسے ہیں کہ تین[3] حواس ان سے لذت یاب ہوتے ہیں۔ ولایت میں سیب اور ہندوستان میں آم —— قوتِ باصرہ ان میووں کے رنگ سے، قوتِ شامّہ ان کی خوشبو سے اور زبان ان کے ذائقے سے لذت حاصل کرتی ہے۔

فرمایا —— کسی شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

کیمیا خواہی، زراعت کُن کہ خوش گفت آنکہ گفت
زُرع را ثلثین زر است وثلثِ دیگر ہم زر است

(یعنی اگر تو کیمیا کا خواہشمند ہے تو زراعت کر، بقول شخصے زُرع (کھیتی) کے حروف میں دو[2] ثلث تو زر ہے ہی، آخری ثلث بھی عین ہے جس کے معنی سونے کے ہیں)۔

چہل قدمی کے وقت نواب فیض محمد خاں وغیرہ اُمراء سواری سے اُتر اُتر کر ملاقات اور مصافحہ کر رہے تھے، ان میں بعض اُمراء ایسے بھی تھے کہ پھر سوار نہیں ہوئے، حضرتِ والا کے پیچھے پیچھے چلتے تھے (اسی چہل قدمی کی حالت میں) فرمایا کہ میں اس مرض سے جس کی بنا پر یہ چہل قدمی کر رہا ہوں — دیگر امراض کے مقابلے میں زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رُسوا شُدیم

(یعنی میں اور مجنوں دونوں مکتبِ عشق میں تعلیم پایا کرتے تھے — وہ جنگل کی طرف چلا گیا اور میں گلی کوچوں میں رسوا ہو گیا)۔

پھر فرمایا، جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہو وہی بہتر ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں خاک، بر فرقِ قناعت بعد ازیں

(یعنی اگر سلطانِ دیں مجھ سے بالفرض، طمع کا مطالبہ کرے تو پھر میں طمع کروں گا اور قناعت کے سر پر خاک ڈال دوں گا)۔

پھر امیر خسروؒ کے وہ اشعار پڑھے جو تعریفِ دہلی میں ہیں (ان میں ایک شعر یہ ہے)

حضرتِ دہلی، کَنَفِ دین وداد جنّتِ عدن است کہ آباد باد

چہل قدمی کے بعد مکان واپس آ کر چارپائی پر استراحت فرما ہوئے، شاہزادہ مرزا محمد جان تشریف رکھتے تھے وہ چارپائی کے نیچے بیٹھے رہے — ارشاد فرمایا کہ معاف کرنا میں معذور ہوں، میرا خادم بھی مالشِ اعضاء کے لئے چارپائی کے اوپر بیٹھے گا — (یہ سُن کر) شاہزادے نے تواضع کا اظہار کیا اور اپنے ہاتھ سے بدن مبارک کو دابنا شروع کر دیا۔ حضرتِ والا نے معذرت کر کے اس کو اس خدمت سے باز رکھا۔

اسی اثناء میں ایک حافظ صاحب وارد ہوئے۔ ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد فرمایا — میں نے سُنا ہے کہ تم اچھی آواز سے اشعار پڑھتے ہو۔ مجھے اشتیاق ہے، کچھ سناؤ، مگر یہ واضح رہے کہ اگر میری مرضی کے موافق نہ ہوئے تو منع کر دوں گا، اس کو معاف کر دینا۔

پھر ایک مرید سے ارشاد فرمایا کہ کلمات الصادقین میں سے جو کہ صلحاء دہلی کے حالات پر مشتمل ہے۔ کچھ پڑھو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ ترکِ اَولیٰ یا خطائے اجتہادی کی وجہ سے کسی پر طعن واعتراض کرنا اچھی بات نہیں ہے ۔ ہر معاملے میں خصوصاً کسی پر اعتراض کرنے میں طریقۂ اعتدال اختیار کرنا اچھا ہے ۔

فرمایا کہ ـــ شاہ عبداللطیف گجراتی رح کے متعلق عالمگیر رح نے بہت کچھ تعظیمی الفاظ لکھے ہیں۔ جب عالمگیر رح نے دکن سے اُن کو لکھا کہ اشتیاقِ قدمبوسی غالب ہے، اگر اجازت ہو تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں تو انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے یہاں آنے میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ آپ مجھ (ناکارہ) کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ اولیائے سابق بس اسی طرح کے ہوں گے جیسا کہ یہ ہے، اس صورت میں اولیائے کبار کی طرف سے آپ کا ذہن غلط ہو جائے گا۔

(بشکریہ الفرقان)

حضرت شیخ عثمانؒ کا رسالۂ عشقیہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

ہالانی (ضلع نواب شاہ - سندھ) میں محترم مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس ایک قلمی نسخہ موسومہ عشقیہ موجود ہے جس میں دو سو اُنتیس اوراق ہیں اور خاتمے کی یہ عبارت ہے :-

تمت الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب نسخۂ عشقیہ من تصنیف سیّد عثمان مروندی قدس اللہ سرہ العزیز - روز شنبہ بوقت یک نیم پاس. بتاریخ نہم شعبان ۵۹۱ھ - کاتب الحروف بندہ قادر بخش قادری خاکِ پائے عالمان و فقیران غفر اللہ لہ ولوالدین و لاستاذی و لجمیع المؤمنین و المؤمنات والمسلمین والمسلمات یا ارحم الراحمین . . .

اس عبارت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت عثمان مروندی (لعل شہباز قلندر سہوانی) رحمۃ اللہ علیہ کا ہوگا جن کی عمر قریب ایک سو سال بتائی جاتی ہے اور جن کا سالِ وفات ۶۷۳ھ ہے۔ لیکن اس عبارت میں جو ۵۹۱ھ درج ہوا ہے اس کو بغور دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے اور اُس پر بعد میں قلم پھیرا گیا ہے - پھر جو یہ کہا گیا ہے کہ ۵۹۱ھ کی نویں شعبان کو شنبہ تھا، تو یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اُس سال اس تاریخ کو شنبہ نہیں، چہار شنبہ تھا (۱۹ جولائی ۱۱۹۵ء) - پھر کتاب کی داخلی شہادتوں سے کتاب

اور مصنّف دونوں کے زمانے کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شہادتیں پیش کردی جائیں۔

کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد والہ اجمعین۔ سبحان اللہ قادرے کہ خاک را از لطفِ عمیم جان بخشید و بتشریفِ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیٓ اٰدَمَ مشرّف گردانید و بخلوتِ یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ معزّز ساخت و بدولت وصال وَهُوَ مَعَكُمْ بنواخت وَفِیٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اشارے است باختصاص وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کرامتے ست خاص. فَاذْكُرُوْنِیٓ اَذْكُرْكُمْ نعمہ ایست یگانہ نواز وصلائے دعوتے اَسْتَجِبْ لَكُمْ نعمتے است بابرکت و ساز وصلوات اللہ من الازل الی الابد علیٰ افضل العالم دوام احمد محمد کہ تجلّی نخستینِ اوّل ماخلق اللہ نورے است و بر آل واصحاب او کہ بایّھم اقتدیتم اھتدیتم ہریک وسیلۂ قرب از دوری رضوان اللہ علیھم اجمعین۔ امّابعد چوں دریں جہاں لطفِ الٰہی وفضلِ نامتناہی مر بندہ را توفیق طلب بخشد و در محبت خود بخود کشد در دلِ او مہر و دوستی خود اندازد تا در ذکر و بندگی شتابد و ہدایت یابد و کسے را کہ گمراہ کند، بمحبّتِ دنیائے تباہ، مشغول کند و محجوب باسبابِ دنیوی در آرد کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا کنیلِ مصر ماءٌ للمحبوبین وبلاءٌ للمحجوبین ؎

نیلِ مصری خود بقبطی خون نمود ۔۔۔ قومِ موسیٰ را نہ خون بود آب بود

بیت

آن را کہ تو رہبری کنی کسے گم نہ کند ۔۔۔ وآں را تو گم کنی کسش رہبر نیست

زہے لطف کمال کہ خاکِ صلصال را تاجِ شرافتِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً بر فرق نہاد و فرزندانِ خلفِ اورا در ولایت الاان اولیائی تحت قبائی تصرف داد و راہ روانِ دین را بشرفِ قربِ محض بکارِیں محبت از ماسوای پرداخت۔

خصوصاً حضرت غوث الثقلینؒ کہ در طیِّ مسالکِ سلوک و احیائے مراسم دینی و ایجادِ شواہد یقینی بنہایت رسانیدہ محی الدین شد و در طریقِ وصول از فنائے تقییدِ عبودیت بقائے قدرتِ مطلق پیوستہ عبد القادر شد و خواجۂ زمان و زمین، رفیع قدر و دور بین، صاحبِ دولت و دین خواجہ بہاء الدین کہ بانفاسِ متبرکہ و برہانِ مبرہن و بیُمنِ نظرِ روشن، توجہ شریفش در دلہائے نقشِ حق می بست۔ بیت

خواجۂ کش جہاں غلام شدہ   او خود از بندگیش دارد عار

و ارشاد پناہی مظہرِ جلالِ ذوالجلال حضرت شیخ جلالؒ کہ خلیفۂ حضرت غوث الثقلینؒ است قدس اللہ سرہٗ و نخست ارادتِ فقیر بسلسلۂ قادریہ بوسیلۂ بیعت مبارکش بود و بحکم اشارت خواجۂ نقشبندؒ و اجازتِ غوث الثقلینؒ . . . . نقشبندیہ از خدمت خواجہ اسحٰقؒ یافتہ کہ سحق و خود فانی و قرب حیاتِ جاودانی مخلصان را از صحبتِ ایشان حاصل می شد و چون شرفِ ملازمتِ حضرت پیر ولی برکیؒ میسّر شد از کمال ولایت و محض کرامت ۳ روز توجہ بحالِ بندہ فرمودند و . . . نمودند کہ سالہا بل قرنہا زبانِ تقریر و خامۂ تحریر در ادائے شکر آں عاجز و قاصر است و دورِ باقی از فیضِ ساقی یعنی منشأۂ از خدمتِ حضرت خواجہ باقیؒ نصیب شد۔ خادم . . . عثمان کہ ریزہ چینِ خوانِ اخوان الصفائیست بلکہ خاکِ جرعہ نوشِ بزمِ خمرُ الوفا۔ وَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاْسِ الْکِرَامِ نصیب، ہمیشہ دریوزہ استمداد از درِ دلہا نمودہ . . . دستگیری از پائے مردے مردان کردہ و در جستجوئے ایں دولت و تگ و پوی ایں سعادت از خاکِ اقدامِ وارستگانِ ننگ و نام، کحل الجواہر ہر دیدہ دیدۂ . . . بر وفقِ مقال و حسب حال است ؎

دولتِ فقر خدایا بمن ارزانی دار   کیں کرامت سببِ حشمتِ تمکینِ من است

اے درویش تا بر چہار آتش گداختہ نہ گردی پختہ نشوی۔ اوّل آتشِ فقر۔ دوم آتش محبت۔ سوم آتش دم نہ زدن در قضا و قدر یعنی تسلیم۔ چہارم آتش از غمِ روزی بے غم بودن یعنی توکّل۔ اے درویش تا ازیں چہار عقبہ در نگزری ترا عاشق نخوانند۔ و ایں تحفۃ القلوب و ہدیۃ الارواح بچہار مفصّل شد و ہر فصل بچہار باب منسوب گشتہ و ہر باب

بکلام ربانی و حدیثِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و سخنانِ اہل اللہ کشایش یافت تا دوستانِ لائق وعاشقانِ صادق ازیں بہرہ برگیرند و باغیر مشغول شدن راحت نپذیرند کہ لا وحشۃ مع اللہ ولا راحۃ مع غیر اللہ ۔ ایں رسالہ مسمّیٰ بعشقیہ دریائے معرفت شد تا عاشق را الفتے باشد ۔

یہ طویل اقتباس ضرورتاً پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے مطالعے سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :۔

(۱) مصنّف پہلے حضرت شیخ جلال[1] (تھانیسری ۔ المتوفی ۹۸۹ھ) سے بیعت ہوئے تھے جو حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۴۴ھ) کے خلیفہ تھے ۔ یعنی مصنّف نے پہلے قادری سلسلے میں ارادت حاصل کی تھی ۔

(۲) اس کے بعد حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے "اشارہ" (روحانی) اور حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "اجازت" (روحانی) سے خواجہ اسحٰق[2] رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نقشبندی طریقہ اختیار کیا ۔

(۳) پھر حضرت پیر ولی برکی علیہ الرحمہ سے صرف تین دن کی صحبت میں ولایت کے کمالات کے عجیب عجیب مشاہدات ہوئے ۔

(۴) ان بزرگوں کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) کی خدمت

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ۔ جلد اوّل (صفحہ ۴۴۰ ۔ طبع لکھنؤ) میں کتاب کے مؤلّف غلام سرور لاہوری نے حضرت جلال تھانیسری کی تاریخ یوں لکھی ہے :۔

جلال از جہاں چوں بجنّت رسید   پئے سالِ ترحیلِ آں ذی کمال
یکے "شیخ پاکیزہ دل" شد عیاں   دگر ہست "مہتاب عزّت جلال"
۹۸۹ھ   ۹۸۹ھ

[2] ممکن ہے کہ یہ اسحٰق رحمہ حضرت ہاشم کشمی رحمہ (صاحبِ زبدۃ المقامات) کے بھائی ہوں جن کے انتقال پر حضرت ہاشم رحمہ کا مرثیہ ان کے دیوان میں موجود ہے ۔

میں شرف باریابی حاصل ہوا۔

(۵) مصنف نے اپنے اس رسالے کا نام "عشقیہ" رکھا تھا اور یہ کہ اس رسالے میں چار فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چار باب ہیں۔

ان فصلوں کی تفصیل اس طرح آتی ہے کہ پہلی فصل میں فقر[۱]، تسلیم[۲]، توکّل[۳] اور ذکر[۴] کے چار ابواب ہیں۔ دوسری فصل میں بھی چار ابواب (۱) سلوک کی انتہا، (۲) درویشوں کی عادات (۳) اہل اللہ کی ریاضت اور (۴) رضائے الٰہی کے تحمّل سے متعلق ہیں۔ تیسری فصل میں بھی اسی طرح چار ابواب ہیں :۔(۱) خاموشی اور گوشہ نشینی (۲) ذوق و محبت (۳) شوق اور (۴) تواضع ۔ یہ فصل طویل مضامین پر مشتمل ہے ۔ اس کے بعد آخری یعنی چوتھی فصل ہوتی ہے جس میں حسبِ معمول چار ابواب ہیں اور وہ یہ ہیں :۔(۱) تضرّع (۲) عاشقوں کی جان بازی (۳) نصیحت، دلجوئی، عیب پوشی وغیرہ اور (۴) عاشقوں کے حالات اور خاتمۂ کتاب ہے۔

ان تمام فصلوں میں جگہ جگہ علماء، صلحاء اور صوفیہ کے اقوال یا اشعار ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے علاوہ اِن بزرگوں کا ذکر آتا ہے :۔

عبداللہ سری سقطی (م سنہ ۲۵۳ھ ۔ ۷۱/الف) ۔ شیخ جنید بغدادی (م سنہ ۳۰۲ھ ۔ ۶۱/ب)۔ حسین حلاج (م سنہ ۳۰۹ھ ۔ ۵۳/الف ۔ ۵۶/الف)۔ شیخ ابو علی دقاق (م سنہ ۴۰۵ھ ۔ ۶۲/ب)۔ ابوسعید ابو الخیر (م سنہ ۴۴۰ھ ۔ ۱۶۶/ب) ۔ عبداللہ انصاری (م سنہ ۴۸۱ھ ۔ ۶۲/ب ۔ ۴۳/ب)۔ خواجہ یوسف ہمدانی (م سنہ ۵۳۵ھ ۔ ۶۲/ب) ۔ احمد جامی (م سنہ ۵۳۶ھ ۔ ۵۵/ب)۔ عبدالقادر جیلانی (م سنہ ۵۶۱ھ ۔ ۳/الف ۔ ۴۰/ب) ۔ خواجہ معین الدین چشتی (م سنہ ۶۳۳ھ ۔ ۴۴/ب)۔ سعدی (م سنہ ۶۹۱ھ ۔ ۵/الف ۔ ۵۰/ب) ۔ جلال الدین رومی (م سنہ ۶۷۲ھ ۔ ۲۶/الف ۔ ۳۸/ب ۔ ۶۳/الف)۔ سیف الدین باخرزی (م سنہ ۶۵۸ھ ۔ ۱۰۵/الف) ۔ عراقی (م سنہ ۶۸۸ھ ۔ ۹۰/الف) ۔ بہاء الدین نقشبند بخاری (م سنہ ۷۹۱ھ ۔ ۳/الف ۔ ۲۸/ب ۔ ۴۸/ب) ۔ حافظ شیرازی (م سنہ ۷۹۲ھ ۔ ۳۵/ب ۔ ۴۴/ب ۔ ۵۸/الف ۔ ۷۸/الف ۔ ۱۰۱/الف ۔ ۱۱۴/الف) ۔ شرف الدین یحییٰ منیری (م سنہ ۷۸۲ھ ۔ ۱۲۲/الف) ۔ خواجہ محمد پارسا (م سنہ ۸۲۲ھ ۔ ۱۹/الف ۔ ۶۳/ب) ۔ زین الدین خوافی (م سنہ ۸۳۸ھ ۔ ۶۳/الف) ۔ عبیداللہ احرار (م سنہ ۸۹۵ھ ۔ ۵۷/ب)۔

عبد القدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ - الف ۱۱۹) - خواجہ باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ - ب ۲) رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے بکثرت بزرگوں کے اقوال، احوال یا اشعار درج ہیں - خود شیخ عثمان[۱] علیہ الرحمہ (مصنّف) نے اپنے اشعار یا غزلیں کثیر تعداد میں نقل کی ہیں - مثلاً یہ اوراق ہیں :- الف ۳ - الف ۱۵ - الف ۱۶ - الف ۱۹ - ب ۳۱ - ب ۳۴ - الف ۳۸ - الف ۵۱ - الف ۶۴ - ب ۶۹ - ب ۷۰ - ب ۷۳ - ب ۸۵ - ب ۹۶ - ب ۱۱۷ - الف ۱۳۲ - ب ۱۶۱ - الف ۱۸۱ - ب ۱۸۲ - الف ۱۸۸ - ب ۱۹۶ - ب ۲۰۰ - الف ۲۱۲ - ب ۲۱۳ - الف ۳۲۱ - شیخ عثمان علیہ الرحمہ کی ایک غزل (الف ۱۵) ملاحظہ ہو :-

اے در عیاں نہاں ونہاں در عیاں توئی	بے مثل ولامثال نشاں بے نشاں توئی
تو آں نہ کہ کس ز تو یابد یکے نشاں	اے برتر از بلند و بلند از گماں توئی
در ظاہرا ترا طلبم و آنگہی نہاں	ور چوں نہاں بجو ئمت آنگہ عیاں توئی
در دہر و دورِ گردشِ عالم، جہان و خلق	غائب میان ہر ہمہ و با ہماں توئی
ہر رو برو ئے ظاہر و ہر سو بسو نہاں	معلوم شد چناں کہ ہمیں وہماں توئی
بودیم در پئے تو بہر سو بجست و جوی	عثماں طلسم بود جمالِ جہاں توئی

مصنّف رح کی شاعری کا عام رنگ یہی ہے اور غالباً ان کا کوئی اور موضوع نہیں -

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے زمانے کی تعیین کی جائے - انڈیا آفس لندن کا مخطوطہ نمبر ۲۹۱۵ بھی اسی رسالے کا دوسرا نسخہ ہے جو محمد شاہی جلوس کے اکیسویں سال یعنی ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں لکھا گیا تھا HERMMANN ETH کا خیال ہے کہ اس کے مصنف "شاہ عثمان" وہی ہیں جن کے انتقال ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۷ء سے متعلق حضرت ہاشم کشمی[۲] علیہ الرحمہ نے

---

[۱] رسالہ عشقیہ کے مالک مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس شیخ عثمان رح کا دیوان قلمی بھی موجود ہے -

[۲] یہ ہاشم کشمی رح وہی بزرگ ہیں جو حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ اور زبدۃ المقامات (برکاتِ احمدیہ) کے مُصنّف ہیں - ان کی ایک اور تصنیف "نسمات القدس من حدیقۃ الانس" قلمی ہے جو مدینۂ طیبہ کے مکتبۂ عارف حکمت میں محفوظ ہے - اس کتاب میں نقشبندیہ سلسلے کے ان بزرگوں کا ذکر ہے جو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے ہوئے ہیں -

اپنے دیوان (مخطوطہ نمبر ۲۸۹۸ - انڈیا آفس - لندن) میں قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔ لیکن رسالۂ عشقیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ عثمان نہیں ہیں جن کا انتقال ۱۰۰۵ھ میں ہوا تھا بلکہ یہ موخّر ہیں۔ کیونکہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) سے استفادہ کیا تھا اور رسالے میں ایک ریختہ (۹۶/ب) اس طرح آتا ہے:-

دلا غافل چہ می خسپی کہ اپنی میچ تھیں ڈریے — چو روزے مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریے
چو دزداں در کمیں باشد کرے جو نیند بنجارا — نہ باشد سود یک حبّہ گواوے مول بھی سارا
دریں دنیائے دہ روزے بڑائی کائیں کوں کریے — اگر صد سال شد عمرت نہایت ایک دن مریے
چہ مغروری دریں دنیا سدا اس جگ نا رہنا — ہمیں راہے کہ در پیش سبھی اس پنتھ ہے چلنا
کجا رفتند آں شاہاں کہ جن کے بار تھے ہستی — گرفتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی
کجا رفتند آں مرداں کہ بانکی ٹوپیاں دھرتے — ہمہ در خاک خسپیدند جن سیں سیہ بھی ڈرتے
کجا رفتند آں یاراں جنہاں تھے جیونی تیرا — چناں رفتند زیں عالم کہ نہ کیا پھر کدی پھیرا
کجا رفتند آں خوباں جنہوں کے نین تھے بانکے — چناں بگذاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دھر جھانکے
کجا آں ماہ رُو خوباں چو مور کندا وتے پاتی — نہ نام و نے نشاں ماندہ سبھی گل گل بھئے ماٹی
کجا سوداگراں منعم جنہاں کے بار تھے تاندھے — کلالاں خاکِ شاں مجرد ند گھڑے کمہار بھانڈے
کجا آں زیب و آں زینت کہاں اوہ روپ اوہ ریکھا — ہمہ رفتند از دنیا بھیا اس جگت کا لیکھا
در آں وقتے کہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آوے — کسے کو داد بخشیدہ وہی کچھ ساتھ پھر جاوے
نہ آنجا خویش کس باشد نہ کر سی یار کو یاری — نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری
ترا در گور بسپارند پھر کر لوگ گھر آوے — بیفتد با خدا کارے نہ کوئی آوے چھڑ کاوے

در آں درگاہ بے رشوت نہ جانوں کیوں رہے پردا
جنید ا مرد آں باشد کہ اس سنسار تھیں ڈردا

یہ شیخ جنیدؒ وہی ہیں جن کا ذکر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں کیا ہے[1] اور اُن کا مذکورۂ بالا ریختہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ گیارھویں صدی

---

[1] پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۲۳۴ (مطبوعہ لاہور ۱۹۲۸ء)۔

ہجری کے بزرگ ہیں۔ پھر اسی کتاب (صفحہ ۲۳۲) میں حافظ مرحوم نے شیخ عثمان جالندھری کا ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ (م ۱۰۳۴ھ) کے پیر بھائی تھے اور ان کا ایک یہ ریختہ بھی نقل کیا ہے:-

عاشقِ دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب ۔۔۔ از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب
اے نظرت آفتاب بر منِ مسکیں بتاب ۔۔۔ جان و جگر شد کباب آؤ پیارے حبیب
لے دل و اے جانِ من دردِ تو درمانِ من ۔۔۔ ذکرِ تو سامانِ من آؤ پیارے حبیب
زاں لبِ شیریں شکر بارِ تو دُرّ و گہر ۔۔۔ ساز مرا بہرہ ور آؤ پیارے حبیب
چند کُشی کشتہ را عاشقِ آشفتہ را ۔۔۔ بے دلم و بے نوا آؤ پیارے حبیب
دمبدمم انتظار یک نظرم و اگمار ۔۔۔ عاشقم و خستہ دار آؤ پیارے حبیب
اے تو کسِ بے کساں مونسِ بے چارگاں ۔۔۔ غمخورِ آوارگاں آؤ پیارے حبیب
حکمِ ترا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام ۔۔۔ زار و سر افگندہ ام آؤ پیارے حبیب
وقتِ شبابم گزشت کار نیامد ز دست ۔۔۔ پُشت زغمہا شکست آؤ پیارے حبیب
دربدر و کو بکو نعرہ زناں سو بسو ۔۔۔ دیدنِ تست آرزو آؤ پیارے حبیب
روز و شب انتظار دم بدمم بے قرار ۔۔۔ دیدہ چو ابرِ بہار آؤ پیارے حبیب
بر دلِ عثمانِ غریب رحمتِ خود کن قریب ۔۔۔ زانکہ تو ہستی مُجیب آؤ پیارے حبیب

یہی ریختہ کچھ فرق کے ساتھ ہمارے مخطوطہ میں (ق $\frac{188}{\text{الف}}$) بھی موجود ہے[1]، اس لئے کُلّی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ رسالہ جو غلطی سے حضرت عثمان مروندی (لعل شہباز قلندر) رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کر دیا گیا ہے، صحیح نہیں۔ بلکہ اس کے مصنف حضرت شیخ عثمان جالندھری علیہ الرحمہ ہیں[2]۔

---

۱ مخطوطے میں ($\frac{85}{\text{ب}}$، $\frac{109}{\text{الف}}$) کچھ ہندی دوہرے بھی نقل کئے گئے ہیں۔

۲ شیخ عثمان جالندھری رح کے "چہل مکتوبات" اور "تفسیر سورہ رحمٰن" وغیرہ کئی غیر مطبوعہ رسالے پنجاب کے بعض ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

اُردو کے ابتدائی اسلامی لٹریچر کا جائزہ

طفیل احمد قریشی

زبان معاشرے میں افراد کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہوتی ہے کسی ایک سیاسی وحدت کے زیرِ اثر بسنے والے مختلف علاقوں کے لوگوں یا مقامی عوام اور بیرونی فاتحین کے میل ملاپ سے نئے الفاظ جنم لیتے ہیں اور ہوتے ہوتے روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہونے والے نئے الفاظ کا بہت سا ذخیرہ ایک زبان کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانیں اسی طرح معرضِ وجود میں آئیں اور یہی صورت اُردو کے ساتھ بھی پیش آئی۔

اِس بَرِّصغیر میں مسلمان خواہ دیبل اور سراندیپ کے ساحلوں پر لنگرانداز ہوئے ہوں یا درّۂ خیبر کے راستے آئے ہوں۔ وہ عربی بولتے ہوں یا فارسی لیکن جب اندرونِ ہند میں مختلف علاقوں میں پھیلے اور وہاں مستقل طور پر بس گئے تو اس کا لازمی نتیجہ افہام و تفہیم کے لئے ایسے الفاظ کا وضع ہونا تھا جو مقامی لوگوں اور نئے بسنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب کریں۔ مسلمان جب شمالی ہند کے علاقوں میں گئے تو وہاں برج بھاشا اور مگدی بولی جاتی تھی اور جو مسلمان جنوبی ہند کے علاقوں میں بسے تو انہیں تلنگی سے سابقہ پڑا۔ عربی، فارسی، برج، بھاشا، مگدی، تلنگی اور دوسری زبانوں کے اختلاط سے جو زبان بولی اور لکھی جانے لگی اسے ہم اس دور کی اردو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے ذخیرے

میں جب ہم قدیم کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو افعال تو مگدی اور برج کے ملتے ہیں اور اسمار میں تقریباً پچاس فی صد مقامی زبانوں کے الفاظ ہیں اور باقی عربی و فارسی ہیں۔ جہاں تک حروف کا تعلق ہے وہ مگدی کے ہیں۔ اس دور کے ادب میں جو اصطلاحات استعمال ہوئیں وہ تقریباً سب اسلامی ہیں۔

اردو ادب کے سلسلہ میں اس ابتدائیہ کے بعد جو بات محلِ نظر ہے وہ اردو ادب میں مذہبی لٹریچر کی ابتدا سے متعلق ہے۔ کسی بھی زبان میں نظم و نثر کی ابتداء اور ترویج میں دو قسم کے لوگوں کی کاوشوں کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر اور مذہبی پیشوا۔ معاشرے میں شاعر جو کچھ دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے یا جن حالات سے متاثر ہوتا ہے انہیں اپنے انداز میں بیان کرتا ہے۔ چونکہ شاعر کی زبان معاشرے کے مختلف گوشوں کی عکاسی ہوتی ہے اس لیے اس کا کلام زبان زدِ عام ہو جاتا ہے۔ دوسرا گروہ مذہبی راہنماؤں کا ہے اس کا عوام سے براہِ راست تعلق رہتا ہے۔ انسان چونکہ کسی نہ کسی مذہب سے متعلق رہا ہے اس لئے عقائد، معاملات اور عبادات و رسوم میں ہمیشہ اسے مذہبی رہنماؤں کی ضرورت بھی رہی ہے۔ جو مختلف مسائل پر عوام کو مذہبی افکار سے آگاہ کرتے رہے۔ اور اس طرح مختلف زبانوں کے نثری ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہا۔

قدیم ہندوستان میں پنڈتوں، پروہتوں کے اشوک اور بھجن نے سنسکرت، یہودی اور عیسائی ربیوں اور پادریوں نے عبرانی اور رقی کے نثری ذخیرے میں جو گرانقدر اضافہ کیا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اس برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا سہرا صوفیار علمار کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ شہر ہوں یا دیہات، سرسبز وادیوں کے قبہ و محراب ہوں یا کوہساروں کے غار اور سربکف پہاڑوں کے دامن میں خانقاہ۔ غرض یہ کہ ہر جگہ صوفیا و علماء براہِ راست عوام میں تبلیغ و ارشاد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس وعظ و ارشاد اور افکارِ اسلاحی کی ترویج کے لئے ظاہر ہے وہ عوام میں مروجہ زبان ہی استعمال کرتے تھے جسے اس دور کی اردو کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم و نثر دونوں ہی میں صوفیار کے وعظ و ارشاد، سلوک و طریقت اور

علماء کے فرائض وسنن، کلام وشریعت کا بے پناہ ذخیرہ اردو کے ابتدائی دور میں عوام میں پھیلتا نظر آتا ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک اردو زبان میں تقریباً ساڑھے چار لاکھ کتب لکھی گئی ہیں۔ جن کا ایک چوتھائی حصہ مذہبی کتب پر مشتمل ہے۔ انجمن ترقی اردو نے "قاموس الکتب" کے عنوان سے جو مذہبی کتب کی فہرست مرتب کی ہے ان کی تعداد گیارہ ہزار سات سو سڑسٹھ ۱۱۷۶۷ ہے، جن کا بیشتر حصہ اسلامی علوم کی کتب پر مشتمل ہے جو مختلف مطابع سے شائع ہو چکی ہیں۔ ایسی کتب جن کے قلمی نسخے اب تک لائبریریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں یا مختلف عجائب خانوں میں محفوظ ہیں یا امتدادِ زمانہ کی وجہ سے تلف ہو چکی ہیں ہزاروں ہیں۔ اس کے باوجود بھی پاکستان میں مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں ہزارہا کتب اسلامی علوم پر موجود ہیں۔ یہ سب کتب علماء اور صوفیا کی قلمی کاوشوں کا عدیم المثال نمونہ ہیں جن کی مساعی سے اس برصغیر میں اسلامی افکار کی ترویج ہوئی۔ آئیے ذرا اردو زبان میں ہم اپنے مذہبی ذخیرے کے ابتدائی دور کا مختصر سا جائزہ لیں۔

اردو زبان کی تاریخ کا جائزہ اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کے آخر اور نویں صدی کے اوائل میں ہی اردو زبان دوآبہ دکن اور گجرات میں بولی جاتی تھی۔ ابتدا میں اس کی شکل گو کہ خسروؒ (المتوفی ۷۲۵ھ) کے اس کلام کی سی تھی ؎

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھ ہے

لیکن مذہبی نثری لٹریچر میں جو تصانیف سب سے قدیم معلوم ہوتی ہیں ان میں شیخ عین الدین گنج علم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دکن کے ایک مشہور بزرگ عالم ہیں جو دلی میں ۷۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے رسالے فرائض وسنن اور مختلف مسائل میں بہت مشہور ہیں جن کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے۔ ویسے مختلف علوم میں آپ کی طرف ایک سو بتیس ۱۳۲ کتابوں کی تعداد منسوب ہے[1]۔

---

[1] شمس اللہ قادری، تاریخ زبانِ اردو، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء۔ بحوالہ روضۃ الاولیا بیجاپور ص ۲۷۔

حضرت سید محمد گیسو دراز (المتوفی ۸۲۵ھ) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلفائے کبار میں شمار ہوتے ہیں تصوّف میں آپ کی تیس سے زیادہ تصانیف ہیں۔ ان میں "ہدایت نامہ" اور معراج العاشقین" مشہور بھی ہیں اور ضخیم بھی۔ ملتقط کے نام سے آپ نے قرآن پاک کی ایک تفسیر بھی لکھی جس میں تصوّف وسلوک کا رنگ نمایاں ہے۔

خواجہ کے بعد آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسنی نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[1] کے ایک رسالہ کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا جو نشاط العشق کہلاتا ہے۔ اردو جب گجرات پہنچی تو گوجری یا گجراتی کہلائی۔ چنانچہ گجرات کی اردو میں پہلا کلام شیخ بہاؤ الدین باجن (المتوفی ۹۱۷ھ) کا ملتا ہے۔ ان کے بعد شیخ خوب محمد چشتی (المتوفی ۱۰۲۳ھ) کی خوب ترنگ صوفیانہ مثنوی کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب کے بارے میں شیخ فرماتے ہیں[2]

خوب ترنگ اس دیا خطاب مدح رسول اللہ باب

بیجاپور کے صوفیا میں حضرت میراں جی (المتوفی ۹۰۲ھ) امیر خسرو ثانی کہلاتے ہیں، اردو نثر اور نظم میں آپ نے متعدد رسالے لکھے، ان میں گنج عرفان، شہادت التحقیق بہت مشہور ہیں۔ ان رسالوں میں حقیقتِ روح، توحید و الحاد نیز اخلاق و تصوّف کے مختلف مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ ۱۰۷۷ھ میں شاہ ملک بیجاپوری نے دینی مسائل پر دکنی نظم میں ایک رسالہ لکھا جس میں زیادہ تر نماز کے فرائض و احکام کی بحث کی ہے، بلوم ہارٹ نے تو اس کا نام شریعت نامہ لکھا ہے لیکن شمس اللہ قادری کے نزدیک محقق یہ ہے کہ اس رسالہ کا نام احکام الصلوٰۃ تھا[3]۔ شیخ امین الدین (المتوفی ۱۰۸۵ھ) حضرت میراں جی کے پوتے ہیں جواہر الاسرار کے نام سے پانچ سو صفحات پر مشتمل مجموعہ آپنے

---

[1] شمس اللہ قادری، تاریخ زبان اردو، لکھنؤ ۱۹۲۵ء۔ بحوالہ روضۃ الاولیاء بیجاپور۔

[2] ایضاً۔ [3] ایضاً ص ۸۸۔

تیار کیا۔ اس میں مختلف مثنویاں ہیں جن میں رموز السالکین، محبت نامہ، مفتاح التوحید، رسالہ قربیہ اور رسالہ وجودیہ بہت مشہور ہیں[1]۔

روضۃ الشہداء ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی اس کے متعدد تراجم ہوئے۔ دکنی نظم میں اس کا پہلا ترجمہ سیوا بیجاپوری نے ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۰ء میں کیا۔ ان کی ایک مشہور تصنیف قانونِ اسلام ہے۔ جس میں احکامِ شرعیہ اور مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اسی سال حنفی فقہ کی ایک کتاب "کنز المؤمنین" لکھی گئی جس کے مصنّف سید شاہ عابد حسین (المتوفی ۱۰۹۳ھ) ہیں۔ اسی دور کی ایک مشہور کتاب شمائل الاصفیاء دلائل الاتقیاء کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جس کا ترجمہ میراں یعقوب نے بقول سکسینہ ۱۰۷۸ھ اور بقول مولوی ضامن علی ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں کیا[2]۔ اسی زمانے میں سید محمد قادر کے رسالہ جات وحدت الوجود وغیرہ پر لکھے گئے۔ شاہ راجو کا رسالہ تصوف، وجہی گولکنڈوی کی تاج الحقائق اسی دور کا مذہبی لٹریچر ہے۔

گیارھویں صدی ہجری کے آخر تک کے مذہبی لٹریچر کا یہ مختصر سا جائزہ لینے کے بعد جب ہم نتائج کی طرف آتے ہیں تو دو باتیں بڑی شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اردو کے ارتقاء میں ایک طرف مذہبی لٹریچر نے جو کردار ادا کیا وہ اردو کی تاریخ میں اہم ترین بنیادی شئے ہے بلکہ بقول ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی "اردو کے (اس) پہلے دور کو اگر ہم مذہبی دور کہیں تو بے جا نہ ہوگا[3]" دوسری جانب ہم ان علماء اور صوفیاء کی مساعی پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جن کے قلم اور زبان کی بدولت اس برصغیر میں اسلام کا نور ہر طرف پھیلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس لٹریچر نے اصطلاحات کے معاملے میں ہندوؤں کے مذہبی لٹریچر کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ پتیال   گھنگھور، پدماوت، رانی کیتکی گوکہ اردو کی قدیم کتابیں ہیں، اور ہندو دیومالا سے متعلق ہیں لیکن لطف کی بات

۲، ۳۔ بحوالہ شبلی ایک دبستان، ص ۵۲، ڈھاکہ۔

یہ ہے کہ ان میں اصطلاحات زیادہ تر اسلامی تصوّف ہی کی استعمال کی گئی ہیں۔ دیاشنکر کی مثنوی "گلزار نسیم"، کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری　　　ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
حمد خدا اور مدحت پیمبر　　　کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
گویا کہ مُطیع پنجتن ہے　　　پانچ انگلیوں میں نغمہ زن ہے

اگرچہ یہ کلام بعد کا ہے لیکن اردو زبان میں اسلامی لٹریچر کے گہرے اثرات ہندؤں کی ابتدائی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

اُردو کے اس ابتدائی دور یعنی گیارھویں صدی ہجری کے بعد اردو نظم ونثر کی ترقی کا زریں دور شروع ہوتا ہے جس میں سرسید، مولوی احمد شہید، علامہ شبلی، حالی، مولوی چراغ الدین، مولوی محمد باقر، مولانا محمد حسین آزاد، اور دوسرے مشاہیر علماء ہند اسلامی علوم مثلاً ترجمہ قرآن، تفسیر، اصولِ تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصولِ حدیث، اسماء الرجال، عقائد، کلام، فلسفہ، تصوّف، سیرت وسوانح، وغیرہ میں تصانیف کرتے یا مشہور عربی وفارسی کتب کے تراجم کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ فی الواقع ان آخری صدیوں میں شائع ہونے والا اسلامی کتب کا یہ بے بہا ذخیرہ انہی بنیادوں پر ایک شاندار عمارت ہے جنہیں اردو ادب کے ابتدائی دور میں برصغیر کے علماء وصوفیاء نے اردو ادب کی زمین پر اپنی انتھک محنتوں سے رکھا تھا۔

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

حضرت شاہ سید امیر الدین

وفا راشدی ایم اے

بنگال میں طریقہ چشتیہ کے جن مشائخ کرام اور اولیائے عظام نے تحریکِ اسلامی کی اشاعت اور تعلیماتِ دینی کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں حضرت سید امیر الدینؒ کی ذاتِ گرامی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ وسیع النظر عالم اور مصلحِ قوم تھے۔ آپ نے بنگال کے مشرقی حصے میں سلسلۂ چشتیہ کو فروغ دینے میں بڑا کام کیا۔ آپ صرف صاحبِ تصوّف و معرفت نہ تھے بلکہ علم و فضل میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ کے زمانے میں اصنام پرستی کا دور دورہ تھا۔ ہندو ماحول اور بت پرستی معاشرے میں توہمات اور غلط رسم و رواج نے انسانی زندگی کو حقیقت و صداقت سے بہت دور کر دیا تھا۔ حضرت شاہ سید امیر الدینؒ نے ایسی ہی ہمت شکن اور بُت فروش فضا میں آنکھیں کھولیں، آپ نے جس خلوص و انہماک کے ساتھ مسلم معاشرے کی تشکیل و تطہیر میں حصّہ لیا، کفر و شرک زدہ ماحول کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

آپ کا اصل نام شاہ سید امیر الدینؒ تھا لیکن آپ کی مجذوبیّت اور دیوانگی کی

کیفیت دیکھ کر لوگ آپ کو پاگل میاں کہا کرتے تھے۔ یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام کے بجائے پاگل میاں کے نام سے جانے پہچانے لگے۔ آپ کے جد امجد بغداد سے بنگال آئے تھے۔ آپ ضلع نواکھالی میں پیدا ہوئے۔ فینی کے ایک گاؤں فاضل پور میں آپ کا آستانہ تھا۔ آپ اپنے والدین کے واحد چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والدِ ماجد کا نام سید بشیر الدین اور والدہ ماجدہ کا نام سیدہ میمونہ خاتون تھا۔ آپ حضرت قطب الاولیاء کے خاندانِ باسعادت سے تعلق رکھتے تھے۔ چار سال کی عمر میں قرآن کریم کا مطالعہ فرمایا۔ اپنے والد مکرم کے زیرِ عاطفت و شفقت ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اپنی ذاتی کوششوں سے فقہ و حدیث اور دیگر علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ پھر ایک مدرسہ قائم کر کے باقاعدہ درس و تدریس کے ذریعہ عوامی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ آپ صرف پیری مریدی اور خانقاہ نوازی کے قائل نہ تھے بلکہ معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنے، روز مرہ کی زندگی میں صحت مند انقلاب برپا کرنے کے زبردست حامی تھے۔ چنانچہ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق، تزکیۂ نفس اور جہاد کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے ان اصولوں پر بھی زور دیا کہ دنیا داری اور دین داری دونوں لازم و ملزوم شئے ہیں۔ اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ ؎

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست

اوائلِ عمر سے آپ بے حد ذہین و ذی فہم تھے۔ آپ کی یہ صفات کشادہ پیشانی اور چمکدار آنکھوں سے ظاہر تھیں۔ آپ میں کم سنی سے ہی دانش مندی اور خدا ترسی کی باتیں رونما ہوگئی تھیں۔ آپ کی طبیعت شروع سے توحیدِ الٰہی کی طرف مائل تھی مزاج کی سنجیدگی و شگفتگی بڑی کشش انگیز تھی۔ آپ کی ذہانت و عاقبت اندیشی اکثر اوقات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ بڑے بڑوں کے درمیان بیٹھ کر باتوں باتوں میں اہم سے اہم مسائل حل کر دیتے تھے۔ سنگین سے سنگین جھگڑے فساد کا تصفیہ اس طرح کرتے تھے کہ لوگ انگشت بدندان رہ جاتے تھے۔ آپ کی ان خوبیوں

کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ لوگ اکثر خانگی، نجی و سرکاری معاملات میں صلاح مشورے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ آپ کی باتیں اتنی دلچسپ مفید اور باا‌ثر ہوتی تھیں کہ دورانِ گفتگو آپ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے بعض فقرے اقوال گراں مایہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ذیل میں آپ کے چند قیمتی فقرے نقل کئے جاتے ہیں :-

۱۔۔۔ آئین کی پابندی سے انسان دیانت داری اور انصاف کے اصولوں پر گامزن ہوتا ہے۔ آئین کی خلاف ورزی بے اصولی اور گمراہی کے مترادف ہے۔

۲۔۔۔ اللہ کی مصلحت اللہ ہی بہتر جانے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل کی جائے اور اپنا ہر معاملہ اس پر چھوڑ دیا جائے۔

۳۔۔۔ زندگی مسلسل حرکت ہے۔ جدوجہد، سعی و محنت کے بغیر خوش نصیبی حاصل نہیں ہوسکتی۔ محرک زندگی کائنات کے لئے باعثِ رحمت ہے۔

۴۔۔۔ فقیری آگ کھانے کے برابر ہے یہ انگارے آسانی سے ہضم نہیں ہوتے۔

۵۔۔۔ حضرت حسین رضؓ کی شہادت بھی مشیتِ ایزدی تھی۔ ایثار و قربانی کی یہ ایک مثال تھی جس نے مفہوم حیات کو واضح کیا اور اللہ کی راہ میں جان نثاری کا درس دیا۔

۶۔۔۔ گھٹنے تک دودھ بھات، حلق تک کانٹا۔

درویش ایک آزمائش ہے جو اس آزمائش سے گزر جاتا ہے۔ اس کے نصیب میں دودھ اور چاول ملتے ہیں اور جو اس آزمائش میں ناکام رہتا ہے، اس کے حلق میں گویا کانٹے پھنس جاتے ہیں اور یہ کانٹے آسانی سے نہیں نکلتے۔

۷۔۔۔ نیک سلوک اور خوش خلقی سے تھانے دار جیسے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

حضرت شاہ امیر الدینؒ ویسے تو پاگل میاں مشہور تھے لیکن باتیں ہمیشہ سیانے پن اور دانشمندی کی کرتے تھے۔ اگر مندرجہ بالا الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اقوال آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ یہ جواہر پارے زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کا کام دے

سکتے ہیں۔ آپ درویش کامل، معاملہ فہم، دور اندیش اور جہاندیدہ تھے۔ دنیا کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھے۔ بلا امتیازِ مذہب و ملت، ہندو، سکھ، مسلمان سب ہی آپ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مریضوں اور حاجتمندوں کی حمایت و حاجت روائی آپ کا عین فریضہ تھا۔ اللہ نے آپ کو دستِ شفا بھی عطا کیا تھا، دعاؤں کے ساتھ ساتھ دوائیں بھی نہایت مفید ثابت ہوتی تھیں۔

جس علاقے میں حضرت پاگل میاںؒ کی سکونت تھی وہاں یوسف نامی ایک شخص رہتا تھا، اس نے یکایک گھر بار چھوڑ کر عبادت و ریاضت کی، جنگل کی راہ لی اور سنسان و ویران مقام پر بیٹھ کر شب و روز اللہ اللہ کرتا رہتا۔ جب حضرت پاگل میاںؒ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ خود ان کے پاس گئے اور فرمایا کہ فقیری و درویشی جنگلوں، ویرانوں میں نہیں ملتی۔ یہ وہ دین ہے جو آبادیوں میں ملتی ہے، تارک الدنیا ہونا اور راہب بن کر زندگی گزارنا اصولِ اسلام کے خلاف ہے۔ سچی عبادت وہ ہے جو دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ رہ کر خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ دینِ حق کی پیروی کی جائے، جو شخص اپنے گھر کا نظام قائم رکھتا ہے۔ اپنی اولاد و وابستگان کے حقوق کا پاس رکھتا ہے۔ اہل و عیال، اعزا و اقربا، کی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برا ہوتا ہے وہ تارک الدنیا درویشوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ حضرت پاگل میاںؒ کی رشد و ہدایت کا یوسف کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ خانگی نظام اور امورِ خانہ داری میں از سرِ نو دلچسپی لی۔ اپنے بچوں اور عزیزوں کی تعلیم و تربیت اس انہماک سے کی کہ اس کی اولاد میں سے بعض نفوس بہترین تعلیم سے آراستہ ہو کر قوم و ملت کے لئے باعثِ فخر ثابت ہوئے۔

حضرت شاہ امیر الدین عرف پاگل میاںؒ صاحب کی کشف و کرامات بنگال کے متعدد علاقوں میں قصّے کہانیوں کی طرح بیان کی جاتی ہیں اور سینوں میں ایمان کا سمندر امنڈ آتا ہے۔ آپ کی روحانی قوت کا ایک زمانہ قائل اور ایک دنیا معترف ہے۔ آپ دوسرے صوفیوں سے قدرے مختلف تھے۔ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ سب سے میل جول رکھتے اور ہر کس و ناکس کے دُکھ سُکھ میں دل سے شریک ہوتے، بلکہ دوسروں کو

بھی اس انداز سے سوچنے اور رہنے سہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ آپ کی سکونت گاہ گہوارۂ علم و عرفان اور آماجگاہِ فکر و دانش تھی۔ آپ کی مجلس میں کسبِ فیض کے لئے لوگ دور دور سے آتے اور خدمتِ خلق و عبادتِ حق کا ایک نیا جذبہ، نیا ولولہ لے کر واپس جاتے۔

آپ کے زمانے میں نوبن چندر سین فینی کا مجسٹریٹ تھا، وہ چاٹگام کا رہنے والا تھا۔ مجسٹریٹ سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ نوبن چندر سین گرچہ ہندو تھا لیکن حضرت پاگل میاں کا بڑا احترام کرتا تھا اور ذاتی و سرکاری معاملات میں آپ سے اکثر مشورے کیا کرتا تھا۔ اس کی ارادت مندی کی انتہا یہ تھی کہ اس نے اپنے بنگلہ کے سامنے ایک مکان بنوایا اور حضرت پاگل میاں سے اصرار کیا کہ وہ اس میں قیام فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"دیکھو نوبن تم نے جس طرح میری آؤ بھگت کی ہے اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں، اللہ تمہیں خوش رکھے لیکن میں نے تمہیں اس جگہ دفن کر دیا ہے۔"

یہ کہہ کر آپ نے اپنے عصا سے مختلف جگہ سوراخ کر دیئے اور فرمایا:۔

"جہاں جہاں میں نے سوراخ کئے ہیں سمجھ لو، وہاں وہاں تمہارے جسم کا ایک ایک ٹکڑا دفن ہے۔"

اس کے بعد آپ اس مکان سے کہیں اور چلے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ نے اس مکان میں جتنے سوراخ کئے تھے اتنے ہی سال نوبن چندر سین فینی میں نہایت باعزت اور کامیاب حاکم رہا۔

حضرت پاگل میاںؒ نے کبھی اصول کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپ کے نزدیک ایک باعمل اور کامیاب زندگی کے لئے اصول کی پابندی بہت ضروری تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار نوبن چندر نے اپنی مجسٹریٹی کے دور میں اپنی عدالت کو دیوان گنج سے منتقل کر دیا۔ اس بات سے وکیلوں اور مختاروں میں کھلبلی مچ گئی، اور وہ لوگ اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو نوبن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دست بستہ التجا کی۔

"بابا! میں نے ایک مشکل کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ دُعا فرمائیے کہ میری مشکل آسان ہو جائے"۔

آپ نے ہمدردی کا اظہار فرمایا اور شفقت آمیز لہجہ میں کہا:۔

"بابائے نوبن! دائرۂ قانون میں رہنے کی کوشش کرو۔ تم خود قانون کے محافظ، قانون ساز اور قانون گر ہو۔ اگر تم نے خود قانون کا پاس نہ کیا تو اس کی امید دوسروں سے کس طرح رکھ سکتے ہو"۔

پھر آپ نے اسے تین طمانچے لگائے اور گرج کر کہا:۔

"دائرۂ آئین میں رہو"۔

اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے:۔

"عدالت کو اپنی جگہ واپس لے آؤ"۔

لیکن اس بد بخت نے آپ کی ہدایت پر عمل نہ کیا۔

دوسرے دن صبح لوگوں نے نئی عدالت کی عمارت کے در و دیوار ڈھا دیئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جم غفیر ہے کہ سیلاب کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے۔ کسی کے سر پر چھت، کسی کے ہاتھوں میں دروازہ اور کسی کے کندھوں پر کھڑکیاں رکھی ہیں۔ ایک عجیب منظر تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے عدالت کی عمارت قدموں سے چل کر آرہی ہو۔ حضرت پاگل میاںؒ کی ہدایت پر عمل نہ کرنے کے باعث نوبن کو یہ دن دیکھنے پڑے۔ اپنے کئے پر بے حد پشیمان ہوا۔ حضرت پاگل میاںؒ نے جس خطرے کی طرف اسے اشارہ کیا تھا وہ حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔ یہ آپ کی کرامت تھی کہ وہ جس بات کی قبل از وقت پیشین گوئی فرماتے وہ مابعد ہو کر رہتی۔ اس سے آپ کی درویشانہ عظمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ امیر الدین عرف پاگل میاںؒ ایک با اصول اور بلند کردار صوفی تھے۔ آپ نے توحیدِ الٰہی اور تعلیماتِ اسلامی کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ عام کیا۔ آپ نے بتایا کہ اسلام

لہ بنگال میں اپنے چھوٹوں کو بھی پیار سے "بابا" کہا جاتا ہے۔

ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ۔ اس حیات کو توانائی و تازگی بخشنے کے لئے تاحیات کام لیا ۔ آپ کی صالح زندگی ، مفید ہدایات اور صحیح تعلیمات کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آپ کے بعد آپ کے بے شمار شاگردوں اور مریدوں نے آپ کی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔ صوفیائے کرام کی ایک جماعت نے کفرستان کے ظلمت کدوں میں شمع توحید روشن کی۔ بت پرستوں کے دلوں میں نورِ الٰہی اور سینوں میں ایمان کی روح پھونک دی ۔ جہالت کی تاریکی دور ہوئی ۔ علم و عرفان کی ضیاپاشی سے ساری فضا منور و روشن ہوگئی ۔ مشرقی پاکستان کے بعض علاقوں میں آج بھی حضرت پاگل میاںؒ کی نسل کے افراد زندہ ہیں ۔

حضرت پاگل میاںؒ نے ۱۳ر شعبان ، بنگلا سال ۱۲۹۳ھ میں وصال فرمایا ۔ آپ کی شہرت نہ صرف بنگال بلکہ پاک و ہند کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ گوشے گوشے سے حاجی، نمازی ، درویش ، غرض کہ ہزاروں زائرین آپ کی درگاہِ مقدس کی زیارت کو آتے اور عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں ۔

شاہ ولی اللہؒ کی حکمتِ الٰہی کی یہ بنیادی کتاب ہے ۔ اس میں وجود سے کائنات کے ظہور تدلی اور تجلیات پر بحث ہے ۔ یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی ۔

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے ۔

قیمت :- دو روپے

(ادارہ)

حضرت داؤد علیہ السلام کا دوسرا عجیب واقعہ یہ ہے کہ جب ایک رات وہ اللہ کو یاد کر رہے تھے تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بیت المقدس پر ملائکہ اتر رہے ہیں، حالانکہ وہ جالوت کے دور میں منہدم ہو چکا تھا اور جس کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ اور بیت المقدس میں بھی وہی عظیم راز (تجلی گاہ ہونا) پنہاں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے رہنے کے لئے بیت المقدس کی جگہ کو معین کیا، جیسے حضرت ابراہیم کے لئے کیا تھا. لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں بڑا جہاد کیا اور آپ کے صحیفے میں یہ لکھا ہوا تھا کہ وہ (جالوت) رب تعالیٰ کی کئی (شعائر اور) بنیادیں گرا چکا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس تعمیر میں انتقام اور غضب کی آمیزش ہوتی اور یہ کام خدمت کے طور پر نہ ہو سکتا تھا لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے اور یہ سوال کیا کہ اس کو اس کی نیکیوں میں سے ایک نیکی بنا دے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں لوگوں نے سنیچر کے دن کا احترام چھوڑ رکھا تھا، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو شریعت نازل ہوئی اس میں سنیچر کے

احترام کا تاکیدی حکم تھا۔ حضرت داؤد کے دور میں لوگ (سنیچر کے دن) مچھلیاں پکڑتے تھے (اس حکم کی خلاف ورزی کے بدلے میں) اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر بنا دیا جس کی یہ صورت ہوئی کہ اس نے مچھلی کے مزاج کو فاسد اور طبیعت کو متعفن اور بدبودار بنا دیا جب وہ اس کو کھاتے تھے تو یہ سوء مزاج ان میں بھی سرایت کر گیا اور ان کے ابدان بگڑ گئے اس سے پہلے خوراک سے جو نسمہ یا روح انسانی پیدا ہوتا تھا اس کی پیدائش میں تبدیلی آ گئی یہ تبدیلی بڑھتے بڑھتے تکمیل کو پہنچ گئی تب ان کے بدنوں پر (بندروں کی طرح) بال نکل آئے اور اللہ نے ان پر ذلت اور رسوائی کو مسلط کیا اور وہ بندر بن گئے۔ یہ عذاب (ان کی استعداد کو) بہت قریب تھا اس لئے وہ اس عذاب میں گرفتار ہوئے اور یہ عذاب اس قریہ کے آگے، پیچھے والے لوگوں کے لئے عبرت کا باعث بن گیا۔[1]

آپ کا تیسرا بڑا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسے فرزند عطا ہونے کا سوال کیا جو ان کے بعد ان کا جانشین ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو سلیمان علیہ السلام عطا کیا جو بڑے پاک باز، دین دار، حکیم، اچھے اخلاق والے اور نیکوکار تھے، وہ (بڑے ہو کر) مشکل معاملوں کے فیصلے کرنے میں (اپنے باپ) داؤد علیہ السلام کے شریک کار ہو گئے۔ وہ خصوصی واقعات میں اضافی اور وقتی بھلائی کو جلدی معلوم کر لیتے تھے (اور اسی کے موافق فیصلے کرتے)

ایک مرتبہ ہوا یہ کہ ایک رات ایک قوم کی بکریاں دوسری قوم کا کھیت چر گئیں،

---

[1] شاہ صاحبؒ اپنی دوسری تالیف تفہیمات الٰہیہ میں ان لوگوں کی صورتیں بدلنے کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ان کی قوم کے جن لوگوں نے سنیچر کے دن میں تجاوز کیا تھا ان کا یہ برا عمل ان کے صحیفوں میں ثبت کیا تھا اور وہ اپنے ذلت کے اعمال اور برے اخلاق میں بندروں سے مشابہت رکھتے تھے تو بندروں کی صورت ان کے چہروں پر آ گئی اور اس میں کوئی عجب بات نہیں کیونکہ شکل و صورت ایک عرض کا درجہ رکھتی ہے، اس لئے وہ دوسرے پر بھی پڑ سکتی ہے۔ دیکھئے تفہیمات الٰہیہ جلد ۲ صہ ۱۵۲۔

وہ لوگ اپنی فریاد لے کر داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے، حضرت داؤد علیہ السلام نے وہی فیصلہ دیا جو اتلاف کی صورت میں ان کی شریعت میں رائج تھا اور اس فیصلے میں بکریوں والوں کو خصوصی نقصان پہنچتا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس خاص واقعے میں خیر نسبی (اور وقتی بھلائی) سمجھا دی (جس کے موافق انہوں نے فیصلہ دیا) حضرت سلیمان علیہ السلام کے اکثر فیصلے اسی طرز کے ہوتے تھے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ارتفاق دوم اور سوم کا علم (بھی) عطا کیا تھا اس لئے داؤد علیہ السلام نے ان کو اپنی قوم پر جانشین مقرر کیا حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی کا فہم بھی عطا ہوا تھا۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ پرندوں اور بہائم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہیں تو خدا کی طرف سے ان پر علوم عادیہ کا الہام ہوتا ہے۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے جس میں چوپایوں کے لئے بھلائی ہوتی ہے جیسے کسی تکلیف اور محنت سے چھڑانا یا کسی بھلائی اور نفع کو حاصل کرنا تو اس وقت اس جانور کے دل میں کسی چیز کا علم الہام فرماتا ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کچھ سکھانا چاہتا ہے تو ایک پرندے کو بھیج دیتا ہے اور اس کے دل میں الہام ہوتا ہے اور خدا اس بندے کو پرندے کے ذریعے تعلیم دیتا ہے جیسے ہُدہُد کے قصے میں ہوا۔

(جاننا چاہیئے کہ) پرندوں کی مختلف آوازیں ہوتی ہیں جو ان کے مختلف حالات کی نشان دہی کرتی ہیں، جیسے غضب، بے قراری، گھبراہٹ، جفتی کی خواہش اور بھوک اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو ان علوم کا اکثر حصہ سکھا دیا تھا۔ اور اکثر اوقات بعض عارفوں کو بھی ایسے علوم عطا ہوتے ہیں ان امور کے لئے چند جزی اسباب ہیں جو ضبط اور انحصار میں نہیں آ سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا اور جنّوں کو مسخر کیا تھا،[2] اس کو

---

[1] یہ واقعہ قرآن مجید کی سورۂ انبیاء کی آیات ۷۷، اور ۷۸ میں مذکور ہے، وہاں دیکھیں۔

[2] سورۂ انبیاء کی آیت ۸۱ کو دیکھیں۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ ہوا، آگ اور دوسری چیزوں کے بننے اور موجود ہونے میں عنصر اول پانی میں حق تعالیٰ کی قیومیت کی تاثیر سبب بنتی ہے، تو کبھی قیومیت کی تاثیر سے ایک چیز ہوا بن جاتی ہے، اور دوسری قیومیت سے پانی ہو جاتی ہے اسی پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کریں۔

کامل بندے کو کبھی بعض قیومیت سے مناسبت ہوتی ہے حضرت سلیمانؑ کو ہوا اور آگ کی قیومیت سے مناسبت تھی اور ان کے اندر تسخیر شئ کی ہمت قوی تھی۔ اس مناسبت کی وجہ سے ہمت میں اور اضافہ ہوا تو انہوں نے شیاطین کو تابعدار بنالیا، وہ ان کے لئے بڑے بڑے محراب اور تصویریں بناتے تھے اور دریا میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے سوا اور بہت کام کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ تخت پر بیٹھ کر ہوا کو اس تخت کے اٹھانے کا حکم کرتے تو ہوا ان کو وہاں لے جاتی جہاں وہ چاہتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے عجیب واقعات ہیں: ایک یہ کہ ایک دن ان کے سامنے گھوڑے لائے گئے اور وہ ان کی پسندیدگی میں اتنے محو ہو گئے کہ ان کی عبادت کا وقت بھی ان سے فوت ہو گیا۔ اس پر آپؑ کو سخت غصہ آیا اور اس جوش میں گھوڑوں کو قتل یا زخمی کروا دیا۔[1]

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کی طرف سے لڑنے اور جہاد کرنے کے جو احکامات صادر ہوتے تھے ان میں اپنے امیروں کی سستی اور ٹال مٹول کو دیکھ کر تنگ دل ہوئے اور یہ آرزو کی کہ اپنی بیبیوں سے صحبت کریں اور ان میں ہر ایک سے ایک ایک ایسا شہسوار پیدا ہو جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اس معاملے میں انہوں نے صرف اسباب کو دیکھا اور اس کو خدا کی طرف تفویض کرنا اور اس سے مدد مانگنا بھول گئے، حالانکہ عارف اسباب کی طرف دیکھنے سے پہلے اللہ سے مدد مانگتا ہے اور اس میں اللہ کی تدبیر کی سرایت کو دیکھ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس پر اس طرح تنبیہ فرمائی کہ کسی بھی بی بی سے کوئی بچہ

---

[1] یہ قصہ قرآن مقدس کی سورۂ صٓ آیت ۳۱ - ۳۳ میں وارد ہوا ہے۔

پیدا نہ ہوا کیونکہ ان کا نطفہ دقیق ہوگیا۔ جماع کی کثرت خواہش اس کا باعث بنی، اس لئے اس مادے سے ایک ناقص خلقت کے سوا کوئی بھی پوری صورت نہ بن سکی، اور اس جسم غیر مستوی کو ان کے تخت پر ڈال دیا گیا۔ اس واقعے سے وہ اصل حقیقت کو سمجھ گئے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور اس سے حکومت میں مدد چاہی اور یوں کہا کہ یا اللہ مجھے بخش دے اور ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے لائق نہ ہو۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ان کا وادی النّمل پر گزر ہوا اور آپؑ ہوا پر سوار تھے، وہاں ایک چیونٹی نے اور چیونٹیوں سے کہا کہ اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں روند نہ ڈالے، اس چیونٹی نے اپنے علم کے موافق احتیاط سے کام لیا۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام نے اسے سن لیا اور اس کی گفتار کو سمجھ گئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہیں[1] جانوروں کی بولی کی سمجھ عطا ہوئی ہے۔

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز انہوں نے پرندوں کی تلاش کی تو ہدہد کو غیر حاضر پایا، اس پر ہدہد کو سخت دھمکایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک عجیب علم کی تعلیم فرمائی، اس میں ہدہد پر بھی رحمت تھی کہ وہ سزا کی دھمکی سے بچ جائے اور سلیمان علیہ السّلام کی بھی بھلائی تھی کہ بلقیس کی حکومت ان کے ہاتھ آجائے اور بلقیس اور اس کی قوم پر بھی یہ احسان تھا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس دن حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ کو ہُدہُد کی زبانی بلقیس کی ساری حقیقت معلوم ہو جائے اور ہدہد نے یہ اشارہ کیا کہ بلقیس کافر ہے اور اس کو مال اور جمال کا وافر نصیب عطا ہوا ہے، بہر حال اس واقعے میں جتنی بھی پوشیدہ عنایتیں تھیں ان سب سے ان کو آگاہ کیا۔

پانچواں واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کے تخت کو احکام ناسوتیہ (اس دنیا کے اثرات سے) خالی کر کے انہیں عالم مثال کی شے بنا دیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السّلام کے اصحاب میں سے ایک نیک بندے کی دُعا کی برکت سے اس جگہ اسے ناسوت (اس دنیا کی چیز) کا

---

[1] سورۂ نمل آیت ۱۸ - ۱۹ میں یہ قصّہ آیا ہے۔

لباس پہنایا، حضرت سلیمانؑ اس عورت سے نکاح کا ارادہ رکھتے تھے تب انہوں نے بلقیس کے عقل وجمال کو پرکھنے کے لئے ایک حیلہ چلایا کہ اس کے تخت کو بدل دیا، بلقیس نے اسے پہچان لیا۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کی (خوبصورت) پنڈلی کو دیکھ لیا اور آپؑ نے یہ دیکھ لیا کہ وہ بڑی خوب صورت عورت ہے[1]۔

آل داؤد میں ہمیشہ حکومت رہی، جب دنیاء بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ان پر غلبہ حاصل کرتا تھا تو اللہ ان کے انبیاء کو فتح ونصرت کے وعدے کی وحی فرماتا اوران کی مدد کے لئے ایک عجیب تقریب ظاہر کرتا جیسے کبھی ان کے سامنے سخت ہوا چلتی اوران کے تیر بنی اسرائیل کو نہ پہنچتے اور کبھی ایسا ہوتا کہ جب دشمن لڑنے کو آتے توان پر گرمی اور پیاس کو مسلط کیا جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتے اور بزدل بن جاتے اور کبھی ان کے اندر باہمی دشمنی اور عداوت کی آگ کو بھڑکاتا اور وہ آپس میں لڑپڑتے (بنی اسرائیل بچ جاتے تھے) کئی صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کے بعد نینوا مقام کی ایک قوم راہ اعتدال سے ہٹ گئی اور انہوں نے بغاوت کا علم بلند کیا، خدا کی حکمت نے یہ چاہا کہ اس دور کے نبی اشعیا علیہ السلام کو اس باغی قوم کے ڈرانے کے لئے حکم کرے اگرچہ یہ انذار اپنے پیروکاروں میں کسی ایک شخص کے ذریعے کیوں نہ ہو، اشعیا علیہ السلام نے اس کام کے لئے یونس علیہ السلام کو بھیجا اور ان کو منتخب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یونس علیہ السلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی بخشش اوران کی عنایت سے تھا، کیوں کہ ان کے ماں باپ کے بوڑھے ہونے کے بعد ہی بطور خلاف عادت یونس علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی پھر اس عنایت الٰہی نے اس کو گھیر لیا اور اس کے بچپن ہی سے

---

[1] مؤلف علام نے حضرت سلیمان اور بلقیس کے قصے کو دوسرے مفسروں کے بیان کے مطابق ذکر فرمایا ہے اور اس کی بنیاد اکثر اسرائیلی روایتوں پر ہے، اگر اس کی تحقیق چاہتے ہو تو ہمارے استاد علامہ عبید اللہ سندھیؒ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں یا ہمارے دوسرے بزرگ استاد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے قرآنی تعلیقات کو دیکھیں۔

اللہ تعالیٰ اس کی تربیت کا اس طرح کفیل ہوا کہ چارپایوں اور وحشی جانوروں کو اس کے دودھ پلانے کا بذریعہ الہام حکم کیا، اور (جب وہ بڑے ہوئے تو) ان کی شادی کا بھی اس طرح انتظام فرمایا کہ انہیں خواب میں دکھایا کہ وہ ایک دوسرے شخص کی بیٹی کا خطبہ کرے اور اس دوسرے شخص کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو یونس علیہ السلام سے بیاہ دے (اس طرح ان کی شادی بھی ہو گئی)۔

خلاصہ یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام کی روح میں عنایتِ الٰہی پوشیدہ تھی اس لئے اشعیا علیہ السلام نے ان کو پیغام کے لئے منتخب کیا، حضرت یونس نے جابر لوگوں کے مقابلے سے کمزوری دکھائی اور نبی کے حکم کو عقلی کراہت سے نہیں لیکن طبعی کراہت سے ناپسندیدہ سمجھا، اس کی کراہت کا یہ اثر ہوا کہ ان کے نفس نے ایک غلیظ رنگ (اور نامناسب کیفیت) کو حاصل کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے مواخذہ کیا، اس کی بی بی راستے میں گم ہو گئی اور ان کے ایک بیٹے کو پانی کی موج بہالے گئی اور دوسرے کو بھیڑیا کھا گیا، اسی سے وہ غمگین ہوئے اور توبہ کی اور آرام پرستی کو چھوڑ کر دعوت و تبلیغ کی تکالیف پر قائم ہو گئے۔

جب وہ اس قوم کے پاس پہنچے تو ان کو توحید کی طرف بلایا۔ انہوں نے آپؑ کو جھٹلایا قید میں رکھا اور اذیتیں پہنچائیں۔ تب حضرت یونسؑ نے اپنی پوری کوشش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی، لیکن اس قوم کی ہلاکت و بربادی کا وقت ابھی نہ ہوا تھا کیوں کہ اللہ کسی قوم کے ہلاک کرنے پر تب راضی ہوتا ہے جب وہ ہر طرح سے ملعون ہو جائیں (یہ اُن کے لئے ابتدائی ڈرانا تھا) تب آپؑ کے نفس کو ایک ایسی کیفیت لاحق ہوئی جو قتل ناحق کے مشابہ ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اس حالت میں نظر کی اور ہلاکت ملتوی ہو گئی۔ (اس میں) آپؑ کے لئے بہت سے واقعے ہیں :-

ایک واقعہ یہ ہے کہ جب قوم یونسؑ نے عذاب کو دیکھا تو اللہ سے توبہ کی اور سب نے مل کر خدا کی بارگاہ میں عاجزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور عذاب کو ان سے ہٹا دیا۔ اس پر شیطان نے یونس علیہ السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈال دیا کہ قوم نے ان کو جھٹلایا ہے اور انہوں نے ان کے ایذار کا پختہ ارادہ

کیا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام، اللہ کی طرف رجوع کئے بغیر ان سے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے (یہ آپ کے شایانِ شان نہ تھا) کیونکہ کامل لوگوں کے لئے یہی مناسب ہوتا ہے کہ اپنے سب کام اللہ کو سونپ دیں اور وہ اس وقت اسباب کی تلاش کرتے ہیں جب تدبیرِ الٰہی کو ان میں کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جب یونس علیہ السلام بھاگ گئے تو ان کے نفس نے ایک دوسری ہیئت حاصل کی۔ کشتی میں سوار ہوئے تو دریا کی موجوں نے جوش کیا۔ قرعہ پڑا تو ان کے نام پر نکلا۔ دریا میں گرے تو مچھلی نے آپؑ کو نگل لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہی اور گناہ سے بیزار ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور رحمتِ الٰہیہ ان پر لوٹ آئی۔ مچھلی نے آپؑ کو چٹیل میدان میں ڈال دیا اور یہ سقیم (اور عاجز) تھے اور ان پر کدو کی بیل پیدا ہوئی۔ یہ اس لئے ہوا کہ (وہ کدو کے پتوں میں رہیں اور) ان کو مکھی نہ ستائے اور صحرائی جانوروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو دودھ پلائیں۔ جس کی صورت یہ تھی کہ وحشی جانوروں کے اندر یہ خیال ڈال دیا کہ یہ ان کا بچہ ہے، اس لئے ان کے سینوں میں رحم نے جوش مارا جیسے اپنے بچے پر ہوتا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے سب کاموں کا کفیل ہوا یہاں تک کہ وہ قوی اور تندرست ہو گئے۔ اس کے بعد کدو سوکھ گیا اور وہ ہرنی (جو آپ کو دودھ پلاتی تھی) وہ بھی چلی گئی، ان دونوں پر ان کو غم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی کہ اے یونسؑ کدو پر تو روتا ہے جس کو تو نے پانی نہیں پلایا اور ہرنی (کے جانے) پر بھی تو گریہ کرتا ہے جس کو تو نے کچھ نہیں کھلایا، دوسری طرف ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی تباہی کا تجھے خیال نہ آیا۔ آپ کے نفس نے جن نامناسب باتوں کا ارتکاب کیا تھا، اس وحی میں ان پر آپ کو ظاہر کیا گیا تھا کیونکہ جب پاک نفس کسی نامناسب ہیئت کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس ہیئت کو سمجھ لے اور یہ بھی جان لے کہ یہ ہیئت اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ ہے، پھر یہ اطلاع خواب سے ہوتی ہے یا کسی خارجی واقعے کے ذریعے سے اور وہ بھی خواب کی مانند ہوتا ہے یا وحی کے ذریعے سے ان کو مطلع کیا جاتا ہے جیسا کہ عالمِ برزخ میں طبیعت کے سکون کے وقت سب نفسوں کو اطلاع

ہو جاتی ہے!

پھر حضرت یونس علیہ السلام کا ایک ایسی قوم پر گزر ہوا جو اپنے پھلوں کو چن کر زمین پر پھینکتے، حضرت یونسؑ نے (یہ دیکھ کر) ان سے کہا کہ تم لوگ اپنے پھلوں کو کیوں خراب کر رہے ہو، کچھ عقل سے کام لو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کی کہ اے یونسؑ! تم کو ان کے پھلوں پر تو شفقت آئی اور ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں پر شفقت نہ آئی۔ پھر ایک شخص نے آپؑ کی مہمانی کی اور وہ کمہار تھا مٹی کے برتن بناتا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو یہ وحی کی کہ وہ کمہار کو اپنے برتن توڑنے کا حکم کرے۔ انہوں نے جب کمہار سے کہا تو وہ (بگڑ گیا اور) ان کو برا بھلا کہنے لگا اور کہا تو دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت یونسؑ جو اپنی قوم کی ہلاکت چاہتا تھا، خدا تعالیٰ نے انہیں اس کی مثل بتائی۔ پھر اس نے ایک شخص کی کھیتی کے لئے اللہ سے دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور اس کھیتی کو خوب اگایا اور شاداب کیا لیکن اس کے بعد اس کو پھر برباد کیا اس پر ان کو رنج ہوا۔ یہ بھی انہیں اللہ تعالیٰ نے (سمجھانے کے لئے) ایک مثال بتائی، اس کو دیکھ کر انہوں نے اللہ کے حضور عاجزی کی اور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور پہلے کی طرح ان کی پرورش کی اور ان کی بیوی کو لوٹایا اور ان کو سو دینار عنایت کئے اور ان کو ان کی اولاد بھی مل گئی۔ اور ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا اور ان پر نشانیاں ظاہر کیں اور ان کو اپنی قوم میں سچا بنایا۔

یہ سب اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ آئینہ کی طرح ہے جیسا کہ اس نے فرمایا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لئے محفوظ کرتا ہوں اگر کسی نے نیک رنگ اختیار کیا تو اس کو اچھا بدلہ ملے گا اور جو برے رنگ پر قائم ہوا تو اس کو بری سزا ملے گی اور سب انسانوں کے دل ان کے ہاتھ میں ہیں جب وہ کسی بندے کو عذاب کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کے دلوں کو اس شخص کی ایذارسانی کے لئے پھیر دیتا ہے اور جب کسی بندے پر نعمت کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کو اس شخص کو فائدہ پہنچانے کی طرف موڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ہمیشہ رہتا ہے خاص طور پر ان لوگوں کے حق میں جو سب کو چھوڑ کر اللہ کے لئے ہو جاتے ہیں اور خدا جن کی خصوصی تربیت کا کفیل ہو جاتا ہے، حضرت یونس علیہ السلام بھی ایسے ہی (خدا پرست) لوگوں میں تھے۔ (مسلسل)

مادہ تاریخ وفات

چکیدہ فکر مولانا دین محمد ادیب فیروز شاہی

مرحوم میاں محمد منیر وکیل ولد مولانا دین محمد ادیب بتاریخ شانزدہم رجب المرجب سنہ ۱۳۸۷ھ مطابق بست ویکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء جان بجان آفرین سپردہ و رخت سفر آخرت باخود بردہ غفرلہ اللہ وجعل الجنۃ مثواہ -

گشت غائب از افق مہرِ مُنیر　　　گشت تاریکی بہ ملکِ دل پدید
گورِ او پُر نور گردان یا خدا!　　　یا خدا! فرما بر او فضلِ فرید
رحمتِ حق بر سرش بارندہ باد　　　جنّت الفردوس بخشش یا مجید!
از عطایش باد جارِ مُصطفیٰ　　　از لقایش باد در عیشِ رغید
چہل و ہفت و نیم سالش عمر بود　　　از حکیم پاکُ خلّاقِ وحید

بے سرِ انکار فرمودہ سروش
گو ادیبا! سال: "مغفورِ حمید"
۱۳۸۷ھ

المسوّٰی من احادیثِ الموطا (عربی)

حضرت شاہ ولی اللہ رح کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۴ برس پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی رح کے زیرِ انتظام چھپی تھی۔ اس میں جابجا مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں۔ مولانا رح نے حضرت شاہ صاحب رح کے حالاتِ زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شرح پر مؤلف امام نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

قیمت :- بیس روپے ۲۰

نکولائی میکیاویلی

۱۴۶۹ — ۱۵۲۷ء

ڈبلیو۔ ٹی جونز
جناب ممتاز احمد

مختصر سوانح نکولائی میکیاویلی کی زندگی کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اُسی کے ایک فقرے کو سامنے رکھنا چاہیئے کہ انسان "نہ تو بالکل بُرا ہوتا ہے اور نہ ہی بالکل نیک" سادہ ترین انسانی کردار بھی پیچیدگیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر ہم میکیاویلی کو بالکل ہی خودغرض اور بے ایمان قسم کا منصوبہ باز سمجھ لیں جو اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے میڈیسی خاندان کی خوشامد کیا کرتا تھا تو ہمارے لئے اس کی کتاب "بادشاہ" (THE PRINCE) کا آخری باب جس میں وہ اطالوی قوم پرستی کی نہایت شدت سے تبلیغ کرتا ہے اور "DISCOURSES" کے اکثر حصے جہاں وہ جمہوریت کا داعی نظر آتا ہے، ناقابلِ فہم ہو جائیں گے۔

اسی طرح اگر ہم روسو کی طرح میکیاویلی کو جمہوریت کا عظیم علمبردار قرار دینے لگیں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ "بادشاہ" کی تصنیف سے میکیاویلی دراصل یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ظالم اور جابر بادشاہوں کے مذموم مقاصد کیا ہوتے ہیں، تو بھی میکیاویلی کی حقیقی شخصیت ہماری نظروں

سے اوجھل ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ میکیاویلی بھی ـــــ دنیا کے دوسرے عام انسانوں کی طرح ـــــ نہ تو بالکل نیک تھا اور نہ ہی بالکل بُرا۔ عام انسانوں کی طرح اس کا کردار بھی کم و بیش انہی متضاد محرکات سے عبارت تھا جنہیں اس کی شخصیت نے اضافی اور جزوی طور پر متحد کر رکھا تھا۔ ایک طرف اُس کی جمہوریت پسندی ہے اور دوسری طرف وُہ شہنشاہیت کی بھی تبلیغ کرتا ہے اور ان دو متضاد نظریات کو جو چیز متحد کرتی ہے وہ دراصل میکیاویلی کا یہ خیال ہے کہ ایک ایسے میں جب کہ لوگ بدخصلت ہو چکے ہیں، اور اپنے اوپر خود حکومت کرنے کے اہل نہیں رہے کسی مضبوط اور متحد قوّت کو ان پر حکومت کرنی چاہیئے۔ پھر جہاں میکیاویلی کو اپنے مفادات عزیز ہیں، وہاں اٹلی کی خوشحالی بھی پیشِ نظر ہے اور ان دونوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے والی چیز اس کا یہ یقین ہے کہ اس کے اپنے اور اٹلی دونوں کے مستقبل کا انحصار میڈیسی خاندان کی کامیابی اور خوشحالی پر ہے۔

میکیاویلی میڈیسی خاندان کے دورِ عروج میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا۔ لورینزو (LORENZO) کی موت کے بعد جب میڈیسی خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور جمہوریت قائم ہوئی، اس وقت میکیاویلی نوجوانی کے عالم میں تھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں وُہ اس نئی حکومت میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوا اور سیکنڈ چانسری کے سیکرٹری کی حیثیت سے ۱۴ سال تک خدمات انجام دیتا رہا۔ یہ عہدہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے فلورنس کی سیاسی زندگی کا مرکز تھا جہاں سے میکیاویلی نہ صرف اس امر کا مشاہدہ کر سکتا تھا کہ ملکی سیاست کس رُخ پر چل رہی ہے بلکہ اسے چلانے میں خود اس کا بھی اہم حصّہ ہوتا تھا۔ اس کا کام صرف ملک کے داخلی معاملات ہی کی دیکھ بھال نہ تھا بلکہ اٹلی کی دوسری شہری ریاستوں اور الپس سے پرے بڑی طاقتوں سے بھی فلورنس کے تعلقات کا تعیّن کرنے میں اُس نے اہم کردار ادا کیا۔

۱۵۱۲ء میں جمہوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میکیاویلی کی سیاسی زندگی کا بھی! ہوا یوں کہ فرانس اور پوپ جولیس دوم کے مابین کشمکش میں فلورنس نے فرانس کا ساتھ دیا جسے بعد میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب فرانسیسیوں کو اٹلی سے نکالا گیا تو پوپ نے

صلح کی شرائط میں میڈیسی خاندان کی بحالی کو بھی شامل کرلیا۔ اس پر میڈیسی خاندان دوبارہ فلورنس پر قابض ہوا۔ اس تبدیلی کے فوراً بعد میکیاویلی کو گرفتار کرلیا گیا اور قید میں اُسے تکلیفیں بھی دی گئیں۔ بالآخر اُسے اس شرط پر آزاد کر دیا گیا کہ وُہ باقی ماندہ زندگی دیہات میں اپنی زمینوں میں گزارے گا اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ اس موقع پر، اُس نے بھی جیسا کہ بے کار اور بے خانماں سیاست دانوں کا شیوہ ہے، اپنے آپ کو علمی کاموں میں مشغول کرلیا۔

ظاہر ہے کہ جو شخص ایک مدت تک سیاسی ہنگاموں کا مرکز رہا ہو، وہ تنہائی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتا۔ میکیاویلی کو اس تنہائی سے نجات پانے کا ایک راستہ نظر آیا اور وہ راستہ یہ تھا کہ وُہ اپنی تحریروں کے ذریعے میڈیسی خاندان کا قُرب حاصل کرے۔ اُسے امید تھی کہ اس طرح کوئی نہ کوئی سیاسی عہدہ اُسے مل ہی جائے گا، لیکن اس کی امیدیں پوری نہ ہوسکیں۔ اس کی کتاب ــــــ (DISCOURSES ON LIVY) جس کی تیاری میں وُہ ۱۵۱۸ء تک مصروف رہا، کامیاب نہ ہوسکی۔

میکیاویلی ان دونوں کتابوں میں اپنی معلومات دو ذرائع سے حاصل کرتا ہے ــــ ماضی اور حال۔ وُہ اپنی کتاب DISCOURSES میں لکھتا ہے :۔

"عقل مند آدمیوں کا کہنا ہے ــــ اور ان کا یہ کہنا بجا ہے ــــ کہ اگر آپ مستقبل کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ماضی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کیونکہ انسانی زندگی کے ہر حالیہ واقعہ کی نظیر ماضی میں بھی موجود ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ واقعات کا محرّک انسان ہے جو ہر دور میں ایک ہی طرح کے جذبات سے تحریک حاصل کرتا ہے، جن سے ہمیشہ ایک ہی طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔"

لیکن یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ میکیاویلی اپنے نتائجِ فکر کی بنیاد صرف تاریخی مواد پر ہی رکھتا ہے۔ "بادشاہ" اور DISCOURSES دونوں میں متعدد مقامات پر میکیاویلی نے اپنے ہم عصر حکمرانوں مثلاً سیزر بورجیا اور جولیس دوم اور لوئی دوازدہم کی پالیسیوں،

حکمت عملیوں اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ دراصل میکیاویلی کا طریقِ تحقیق زیادہ تر تجربی (EMPIRICAL) ہے۔ اس نے خود لکھا ہے کہ اس کا مقصد اپنی کتاب میں اُن باتوں کو جمع کر دینا ہے "جو مجھے طویل تجربے اور کٹھن تحقیق کے بعد دنیوی معاملات کے بارے میں معلوم ہوئیں"۔ یہی وجہ ہے کہ میکیاویلی کے نتائج فکر بھی اس کے طریقِ تحقیق کی خصوصیات سے الگ نہیں ہیں۔

دراصل میکیاویلی کی پوزیشن ایک ڈاکٹر کی سی ہے۔ ڈاکٹر اس بات کو بغیر کسی لمبی چوڑی دلیلوں کے فرض کر لیتا ہے کہ اُس کے پیشے کا مقصد مریض کی صحت ہے وُہ یہ نہیں سوچتا کہ فلاں مریض زندہ رہنے کا مستحق ہے یا اس کا مرجانا ہی بہتر ہے (کیونکہ اگر ڈاکٹر یہ باتیں سوچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اخلاقی معیارات کے سوالات زیرِ بحث لا رہا ہے)، ڈاکٹر تو بس اپنی ساری توجہ اس بات پر لگا دیتا ہے کہ وُہ تجربات سے ایسے قواعد دریافت کرے یا ایسا نسخہ تیار کرے جس سے مریض کی صحت بحال ہو یا برقرار رہے۔

بعینہٖ میکیاویلی، کم از کم اپنی کتاب "بادشاہ" میں یہ فرض کر لیتا ہے کہ مقصد ہے قوت کا حصول! وہ اس سوال کو سرے سے زیرِ بحث لاتا ہی نہیں کہ اس قوت کو کس مقصد کے لئے استعمال کیا جانا چاہیئے۔ اُس کی ساری توجہ جس مرکزی سوال پر مرکوز رہتی ہے وُہ یہ ہے کہ قوت حاصل کیسے کی جائے اور پھر اُسے برقرار کیسے رکھا جائے؟

میکیاویلی صحیح معنوں میں کوئی فلاسفر نہ تھا — وُہ تو بس دنیا کے روزمرہ معاملات کو سمجھنے والا ایک آدمی تھا۔ اُس کے پاس فرصت تھی چنانچہ اُس نے دوسری بہت سی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ، دنیا اور انسان کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے شروع کر دیئے۔ اب یا تو وُہ خود ہی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا، یا اُس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، بہر حال یہ بات طے ہے کہ وُہ اپنے تاثرات کو کوئی منظم شکل نہ دے سکا۔ میکیاویلی کی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح میڈیسی خاندان سے اس کے تعلقات بحال ہو جائیں، وُہ ارسطو کی طرح اُس فراغت کا طلبگار نہ تھا جو فلاسفروں کے لئے بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔

اگرچہ اس کی کتاب DISCOURSES حکمران طبقے میں مقبولیت حاصل نہیں کرسکی تاہم کارڈینل ڈی میڈیسی نے (جو بعد میں پوپ کلیمنٹ ہفتم کے نام سے مشہور ہوا) اُسے فلورنس کی تاریخ لکھنے پر مأمور کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ میکیاویلی کو اس کام پر مأمور کیا جانا اس کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر کم تھا اور اس مقصد کے لئے زیادہ کہ ایسے کام میں مشغول رہ کر میکیاویلی بعض دوسری شرارتوں سے تو باز ہی رہے گا۔ اگر واقعی ہمارا یہ خیال درست ہے تو کارڈینل کوئی انوکھی بات نہیں کر رہا تھا وُہ تو دراصل میکیاویلی ہی کی ایک نصیحت پر عمل کر رہا تھا:۔

"اگر ایک لائق ماہر سیاسیات کو کوئی کام نہ ہو تو وُہ ایک بڑی وہیل مچھلی کی طرح پورے جہاز ہی کو الٹنے کی کوشش کرے گا الّا یہ کہ اُس کے ہاتھوں میں شغل کرنے کے لئے خالی کارک دے دیا جائے۔"

میکیاویلی نے فلورنس کی تاریخ ۱۵۲۵ء میں ختم کرلی لیکن اس نے بھی اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا کیونکہ اس وقت تک میڈیسی خاندان ایک مرتبہ پھر روبہ زوال ہو رہا تھا۔ ۱۵۲۷ء میں جب شاہی فوجیں روم پر چڑھ دوڑیں اور پوپ کو بھاگنا پڑا تو فلورنس نے بھی بغاوت کر دی اور یہاں ایک نئی جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ میکیاویلی کی امید کا چراغ ایک بار پھر روشن ہؤا اور اُسے توقع ہوئی کہ اس حکومت میں تو اسے ضرور ہی کوئی نہ کوئی عہدہ مل جائے گا، لیکن میکیاویلی نے چونکہ کلیمنٹ سے سمجھوتہ کرلیا تھا اس لئے نئی حکومت کی نظر میں بھی اُس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ پھر جب اُسے یہ خبر ملی کہ اُس کا سابقہ سکریٹری کا عہدہ ایک اور شخص کو دے دیا گیا ہے، اور اس عہدے پر بحال ہونے کی آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی ہے، تو اس خبر کو سُننے کے چند دن بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

میکیاویلی اور رینے ساں

اگر میکیاویلی کو اُن معنوں میں فلاسفر نہ بھی کہا جائے جن معنوں میں ہم یہ لفظ بعض معروف فلاسفروں کے لئے استعمال کرتے ہیں تو بھی اتنی بات تو تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ اس نے کچھ نظریات ضرور قائم کیے ہیں خواہ ان کا تعلق بعض بنیادی امور کے بارے میں اُس کے لاشعوری مفروضات

ہی سے کیوں نہ ہو۔ اب اگر ہم ان نظریات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ ہم میکیاویلی کے کردار کا تجزیہ کریں۔ دراصل یہ میکیاویلی کی شخصیت ہی تھی جس نے دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کر زندگی کے بارے میں اُس کے رویّے کو ایک مخصوص رنگ دیا اور اس کی ساری توجہ انسانی فطرت کے ان پہلوؤں پر رکھ کر دی جو اس کے نزدیک خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ فلورنس اور رینے ساں میکیاویلی کے لئے اُس کے فکری والدین کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وُہ تمام خصوصیات جو اس کے شہر اور اس کے عہد میں پائی جاتی ہیں، خود اس کی اپنی شخصیت میں بھی موجود ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی انسان اور اس کی کائنات کے بارے میں ایک نئے رویّے کے اظہار کی صدی ہے۔ اس صدی نے زندگی کے بارے میں نئی اقدار کو جنم دیا اور اپنا رشتہ ہر اُس روایت سے توڑ ڈالا جسے قرونِ وسطیٰ میں اہم یا قابلِ قدر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وُہ نئے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی ادارے جن کی وساطت سے نئی اقدار اور نئے افکار کو اپنا اظہار کرنا تھا اور جن کی ترقی پر جدید ذہن کے ظہور کا انحصار تھا، ابھی تک منصۂ شہود پر نہ آسکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ صدی ناگزیر طور پر انفرادیت پسندی، اور تشدّد پسندی کے رجحانات کی حوصلہ افزائی کرنے لگی۔

قرونِ وسطیٰ کی تمام تر فکر کا مرکزی نکتہ، جو سارے فکری مباحث کا آغاز بھی تھا اور انجام بھی، یہ تھا کہ خدا موجود ہے — خُدا جو اپنی ذات میں کامل ہے، لامحدود ہے اور رحیم ہے۔ زمین پر خدا کا نمائندہ روم کا پوپ ہے اور خدا کی آسمانی بادشاہت کی ارضی تمثیل کیتھولک چرچ ہے جسے خود پیغمبروں نے قائم کیا ہے۔ خدا کے مقابلے میں انسان ادنیٰ اور حقیر ہے البتہ اس کے جسم میں وُہ روح مقیّد ہے جسے خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ یہ دنیا آنسوؤں کی ایک ندی ہے جس نے انسان کو اس کے خدا سے الگ کر رکھا ہے۔ وُہ تمام اشیاء جن کا تعلق انسان کے جسم سے ہے، خطرناک اور گناہ آلود ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اس کے حقیقی مقصد سے دُور لے جانے والی ہیں۔ اور وہ حقیقی مقصد ہے انسانی رُوح اور خدا کے درمیان صحیح تعلق کا استوار کرنا۔ چنانچہ

قرونِ وسطیٰ میں رُوح کی نجات نہ صرف یہ کہ انسان کا اوّلین نصب سمجھا جاتا تھا بلکہ اُسے واحد نصب العین کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کام کے علاوہ ہر کام غیر اہم اور ہر سرگرمی بے مقصد تھی بلکہ ہر کام اور ہر سرگرمی کی قدر و قیمت کا معیار ہی یہی تھا کہ اس سے روح کی نجات کا نصب العین پورا کرنے میں مدد ملتی ہے یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً موسیقی مصوّری اور دوسرے فنونِ لطیفہ صرف اُسی حد تک جائز اور صحیح سمجھے جاتے تھے جس حد تک یہ لوگوں میں نیکی کے جذبات پروان چڑھاتے تھے لیکن بالعموم ان کو بُرا سمجھا جاتا تھا کیوں کہ "رنگ وحدت" کا بجائے خود باعثِ مسرّت ہونا ایک دامِ فریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے ایک سیاسی مفکّر سینٹ تھامس کے نزدیک سیاسیات کا بنیادی مسئلہ ہی یہی ہے کہ ایک ایسی سیاسی تنظیم دریافت کی جائے جو روحانی نجات میں سب سے زیادہ ممد و معاون ہو سکے۔

لیکن رینے ساں میں یہ سارا نقشہ الٹ پلٹ ہوگیا۔ اب انسان خدا سے زیادہ اہم تھا اور ایک انسان کے دوسرے انسانوں سے تعلّقات، انسانی روح اور اس کے خالق کے تعلقات سے زیادہ اہم تھے۔ اللہ تعالیٰ کے کامل ہونے کے قدیم اور ما فوق الفطرت تصوّر کی جگہ اب انسان نے ایسے آئیڈیل سامنے رکھنے شروع کر دیئے جو فطری اور انسانی دسترس میں تھے۔ اب جو چیز اہم تھی وُہ اِس دُنیا کے معاملات تھے، آخرت کے نہیں۔ اب جو نصب العین متعیّن ہوئے وہ تھے — انفرادی شخصیت کا نشوونما، انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کا جِلا، حُسن و خوب صورتی سے اس کی ہر شکل میں محظوظ ہونا، اور امیرانہ اور متنوّع زندگی!۔ اب یہ دنیا بھی ایک جامد آئینہ یا انسان کے لئے خُدا کی طرف سے طے کردہ مقاصد کی تکمیل کی علامت نہیں رہی تھی — یہ دنیا فطری قوّتوں کی کشمکش میں سرگرمی سے حصّہ لینا ہوگا ورنہ وُہ اس کشمکش میں کُچل کر رکھ دیا جائے گا۔

ایک کامیاب زندگی کے بارے میں قرونِ وسطیٰ اور رینے ساں کے نقطۂ نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہ فرق مقاصد ہی میں نہیں بلکہ کائنات کے اُس تصوّر میں

بھی ہے جس کائنات میں ان مقاصد کو حاصل کیا جانا مطلوب ہے۔ رینے ساں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کامیابی کبھی نیکی، صالحیت اور عبادت سے حاصل نہیں کی جا سکتی برعکس اس کے کامیابی کے لئے اپنے حق پر شدّت سے اصرار کرنا اور روایتی اخلاقیات سے پوری جرأت کے ساتھ صرفِ نظر کرنا ضروری ہے۔

میکیاؔویلی رینے ساں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے قرونِ وسطیٰ کے اس نظریے کو رد کرتا ہے کہ خدا کا طے کردہ کوئی معروضی اخلاقی نظام بھی موجود ہے جس کی پیروی کر کے انسان "بہترین" زندگی گزار سکتا ہے۔ برعکس اس کے میکیاؔویلی کے نزدیک بہترین زندگی وُہ ہے جس میں شہرت، امتیاز، اعزاز اور فضیلت حاصل ہو۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے قوّت کی ضرورت ہے — نہ صرف اس لئے کہ قوّت ہی کے ذریعے سے انسان شہرت، فضیلت اور امتیاز حاصل کر سکتا ہے اور انہیں برقرار رکھ سکتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ قوّت بذاتِ خود بھی انسان کے لئے باعثِ تسکین اور وجہِ مسرّت ہے۔ اگر کوئی شخص قوّت کا مالک ہے تو وُہ اپنے حق پر بزور اصرار کر سکتا ہے بصورتِ دیگر نہیں۔ میکیاؔویلی کے نزدیک قوت کی تعریف یہ ہے کہ اسے ایک فرد دوسرے افراد کے بالمقابل اور ان کے حوالے سے اپنی ملکیت بناتا ہے اور اس کا استعمال سیاسی اداروں کی وساطت سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ پس رینے ساں کے انسان کے لئے اخلاق اور سیاست کوئی الگ الگ شعبے نہیں رہے بلکہ آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ اخلاق اور سیاست کا اختلاط یونانیوں کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن ایک مختلف نوعیت کے ساتھ!

مذکورہ بالا بحث سے ظاہر ہے کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ میکیاؔویلی اخلاقی سوالات سے صرفِ نظر کرتا ہے، میکیاؔویلی تو اخلاقی سوالات کو نہایت سرگرمی سے زیرِ بحث لاتا ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ میکیاؔویلی نے جو اخلاقی معیارات پیش کئے ہیں، اور ایک اچھی زندگی کا جو تصوّر دیا ہے، ان کی بنیاد محض مفروضات پر ہے، اُس نے ان مفروضات کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اپنے مقاصد ابتداء ہی میں، بغیر کسی عقلی دلیل کے فرض کر لئے اور پھر اس نے اپنی ساری

توجہ اس تلاش پر مرکوز کردی کہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بہترین ذرائع کون سے ہو سکتے ہیں۔

میکیاویلی نے انسانی زندگی کا جو مقصد متعین کیا ہے اور جو تصورِ دنیا دیا ہے وہ خالصتہً رینے ساں کی پیداوار ہے۔ میکیاویلی کی کتابیں درحقیقت اس کے عہد کی فکر کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں لیکن میکیاویلی کا مطالعہ صرف تاریخی اہمیت ہی کا حامل نہیں ہے، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جہاں ہم اپنے ماضی کی روایات کے وارث ہیں، وہاں رینے ساں سے تو ہمارا رشتہ وہی ہے جو والدین اور اولاد کا ہے۔ رینے ساں کے دور میں متعدد نئی فکری لہریں سطح پر نمودار ہوئیں جو قدیم فکری لہروں سے خلط ملط ہو کر نئے ذہن کی تخلیق کا باعث بنیں۔ یہ جدید ذہن جن نئے تصورات پر مشتمل تھا وہ یہ تھے — انسانی عظمت اور فطرت کی اہمیت، خوب صورتی کا ایک نیا احساس، انفرادیت پسندی کا اثبات، یعنی یہ خیال کہ کسی شخص کی ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بجز ان رکاوٹوں کے جو خود اس کی اپنی صلاحیتوں اور خواہشات نے اس کے راستے میں کھڑی کردی ہوں، فضیلت کے ان تمام دعوؤں کی تردید جو پیدائش اور منصب کی بنا پر کئے جاتے ہیں — عقلیت پسندی، جس کے تحت انسان اور دنیا کو ان کے حسّی وجود کی حیثیت سے سمجھا جاتا تھا اور اس میں مذہبی اعتقادات کو کوئی دخل نہ تھا — قوم پرستی جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ انسانی مقاصد کی تکمیل شہری ریاست سے وسیع تر سیاسی یونٹ میں ہی ممکن ہے — اور پھر یہ نظریہ کہ اہلِ مذہب نے انسان کے لئے آخرت کا ایک ناقابلِ حصول آئیڈیل بنا رکھا ہے حالانکہ اخلاقی معیارات اور زندگی بسر کرنے کے آداب اور طریقے وہ ہونے چاہئیں جن پر انسان آسانی کے ساتھ عمل کر سکے۔

بدقسمتی سے جدید ذہن رینے ساں اور میکیاویلی کے ذہن سے صرف انہی خصوصیات کی بنا پر ہی مشترک نہیں ہے ہم نے رینے ساں سے اور بھی بہتیری خصوصیات حاصل کرلی ہیں:۔ رینے ساں سے ہم نے دہریت کی روایت بھی لے لی جس کے مطابق کسی ایسے معروضی اخلاقی ضابطے کا وجود نہیں ہے جو انسانوں کے مابین تعلقات کی صحیح نوعیت کا تعین

کرتا ہو۔ ہم رینے ساں کی انانیت پسندی اور خود پرستی کے بھی وارث بن گئے ہیں جس کے مطابق ہر شخص دوسرے کو اپنے سے کم تر سمجھتا ہے اور جس میں انسانی قسمتوں کا فیصلہ قوت اور طاقت کے بل پر ہوتا ہے۔ ہم نے اُس کلبیت اور قنوطیت کو بھی اپنا لیا ہے جس نے انسانوں کو جانوروں اور چوپایوں کی سطح تک گرا دیا بس اتنے فرق کے ساتھ کہ انسان دوسرے جانوروں سے کچھ زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے، جہاں تک اس کے وحشی ہونے کا تعلق ہے، اس میں اور دوسرے چوپایوں میں کوئی فرق نہیں۔

رینے ساں کی مذکورہ روایات (جنہیں میکیاؔولیت کہا جانے لگا ہے) گو اپنے مابعد کے ادوار میں ہمیشہ موجود رہی ہیں لیکن دورِ جدید میں تو اُن کا احیاء حیرت انگیز طور پر ہوا ہے۔ آج ہم میکیاؔویلی کی کتاب "بادشاہ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک ایک صفحے پر بیان کئے جانے والے اصولوں کی متعدد مثالیں اپنی ہم عصر تاریخ میں ہمیں نظر آنے لگتی ہیں۔

یہ بات خواہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند لیکن آج ہر شخص، جہاں تک اُس کی صلاحیتیں اُس کا ساتھ دیتی ہیں، میکیاؔویلی ہی کے بیان کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض افراد اس سے مستثنیٰ ہوں لیکن جہاں تک "بڑی طاقتوں" کا تعلق ہے اُن کے بارے میں تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹی ریاستوں سے اُن کے تعلقات میکیاؔویلی ہی کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ میکیاؔویلی کا نظریۂ ریاست غلط تھا، ایک بے معنیٰ اور فضول بات ہوگی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ میکیاؔویلی کا نظریہ ریاست اگر صحیح ہے تو کیونکر؟

(مسلسل)

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱ - شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲ - شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳ - اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴ - تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵ - شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶ - حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷ - شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly "AR-RAHIM"

Hyderabad

شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

المسوّیٰ من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——— الامام ولی اللہ الدھلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے شاہ صاحب نے المسوی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰٫۰۰ روپے

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

جلد نمبر ۵ ماہ دسمبر ۱۹۶۷ شمارہ نمبر ۷

بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدرآباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

غلام مصطفےٰ قاسمی،

قیمت سالانہ: آٹھ روپیہ — فی پرچہ: چھتر پیسے

نمبر ۷	ماہ دسمبر ۱۹۶۷ء مطابق شعبان ۱۳۸۷ھ	جلد ۵

فہرست مضامین

شذرات

حال ہی میں گورنروں کی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دیہات کی مساجد کے اماموں اور خطیبوں کے لئے ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ فرائض دینی کی ادائیگی کے علاوہ دیہی زندگی کی اقتصادی و معاشرتی زندگی میں بھی حصہ لیں۔ وہ یونین کونسلوں کی سرگرمیوں کو دیکھیں، کاشت کاروں کو زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں مفید مشورے دیں اور اس طرح دیہات میں اُن کا مقام دینی مرشد کا بھی ہو اور معاشرتی رہنما کا بھی۔

ناظم اعلیٰ محکمہ اوقاف نے لاہور کے ائمہ و خطباء کے ایک سیمینار کو خاطب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ائمہ و خطباء کو اپنی علمی قابلیت بڑھانے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے اقتصادی مشغلے کو بھی اپنانا چاہیئے جس سے ان کی آمدنی بڑھے۔ کیونکہ جب تک ان اصحاب دین کی معاشی حالت اچھی نہیں ہوگی، معاشرے میں اُن کو عزت و احترام کا وہ مقام حاصل نہیں ہوگا، جس کے وہ بحیثیت امام و خطیب مستحق ہیں۔

ساہی وال (سابق منٹگمری) میں بنیادی جمہوریتوں کے ایک کنونشن میں ایک اطلاع کے مطابق علماء نے بھی کافی تعداد میں شرکت کی متعلقہ وزیر نے اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ علماء کرام کو چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے بلند ہو کر قوم کے اتحاد و ترقی میں رہنمائی کرنی چاہیئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی خدمت جس مؤثر طریقے سے علماء حضرات سرانجام دے سکتے ہیں اور کوئی نہیں دے سکتا۔ وزیر موصوف نے علماء سے درخواست کی کہ وہ دینی فرائض کے ساتھ لوگوں کو آج کی قومی، معاشرتی اور اقتصادی ضروریات سے بھی باخبر کریں۔

غرض آج حکومت کے ہر درجے میں یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر اس ملک کو ترقی کرنا اور مستحکم ہونا ہے اور قوم کو متحد، مضبوط اور صاحبِ اخلاق ہو کر آگے بڑھنا ہے، تو یہ علماء کرام کے تعاون اور اُن کی عملی شرکت کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک مسلمان کے لئے سب سے محرک اور فعّال جذبہ جو اُسے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ کر سکتا ہے، مذہب کا ہے۔ اگر اس جذبے کی صحیح تربیت ہو۔ اور اس سے ٹھیک کام لیا جائے تو یہ قوم کم سے کم مدت میں بہت کچھ کر سکتی ہے۔

اب اس کے لئے ضرورت ہے کہ اوّل تو خود علماء اپنے اس منصب کو سمجھیں۔ اس کے حقوق ادا کرنے کے لئے اپنے اندر آج کی ضرورتوں کے مطابق اہلیت پیدا کریں۔ اور پھر حکومت اور اہل اختیار علماء کرام کا دلی اور مخلصانہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

علماء کو موجودہ معاشرے میں وہ مقام ملنا چاہئیے جو اسلامی تاریخ میں شروع میں اُن کا تھا۔ اور اُن کا تعاون حاصل کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

بے شک نمازوں کی امامت اور جمعوں کے خطبوں کے علاوہ علماء کو معاشرے کی تعمیری واقتصادی سرگرمیوں میں بھی ضرور حصہ لینا چاہئیے، بلکہ ان میں رہنمائی کرنی چاہئیے۔ یہ سب صحیح، لیکن اس کے ساتھ ساتھ محکمہ اوقاف کو دینی فضا کو بہتر بنانے اور اُسے ترقی دینے کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئیے۔ اس وقت جو دینی مدارس اور دارالعلوم ہیں اگر محکمہ اوقاف چاہے تو بغیر اُن میں کسی زیادہ خلل اندازی کے ان کی افادیت کو کافی بڑھا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مصر کی جامعہ ازہر کے اربابِ اختیار عرصہ دراز تک اس بات کے سخت مخالف رہے کہ ان کے نصاب میں کوئی تبدیلی ہو، اور باہر والے اس کے نظم ونسق میں دخل دیں۔ شیخ محمد عبدہ نے کوششیں کر دیکھیں، بعض اور اطراف سے بھی زور ڈالا گیا، لیکن "ہیئت علمائے کبار" جو جامعہ ازہر کی کرتا دھرتا تھی کسی طرح اس طرف نہیں آتی تھی۔

آخر ایک وقت آیا کہ ازہر والے اس پر تیار ہو گئے کہ جدید یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے نئی تعلیم پائے ہوئے استاد جامعہ ازہر میں روز ایک آدھ گھنٹہ کوئی خاص مضمون پڑھا دیا کریں، اس طرح تاریخِ اسلام، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ کے درس جامعہ ازہر میں شروع ہوئے، جو اکثر یورپ کے فارغ التحصیل مصری اساتذہ دیتے تھے۔ حیران کُن بات یہ تھی کہ ازہری طالب علم ان درسوں میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے۔ دراصل ان طالب علموں میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ تھا، اور اس جذبے کو تقویت اُن کے دینی احساس سے ملتی تھی، بدقسمتی سے انہیں نئے علوم سے محروم رکھا گیا تھا۔ چنانچہ جب ان کے سامنے ان علوم کو پیش کیا گیا تو وہ ان کی طرف بے اختیار لپکے۔ یہ ابتدا تھی ازہر کی اصلاح کی، اور اب تو اُس کا نقشہ ہی بدل گیا ہے ——— محکمہ اوقاف کو جامعہ ازہر کی اس مثال سے فائدہ اٹھانا چاہئیے۔

جامعہ اسلامیہ بھاولپور، شاہ ولی اللہ اکیڈمی اور اس طرح کے جو اور ادارے محکمہ اوقاف سے متعلق ہیں۔ ان کی حیثیت علمی وذہنی مرکز کی ہونی چاہئیے۔ محکمہ اوقاف کی نگرانی میں یہاں تحقیقی، علمی ودینی کام ہو۔ مثال کے طور پر آج دینی مدارس اور دارالعلوموں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، اس کی افادیت اور عدم افادیت کا مفصل جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی دیکھا جائے کہ اور اسلامی ملکوں میں اس قسم کے پُرانے دینی نصاب کو کس طرح بدلا گیا، اور ان کی ایسی تبدیلیوں سے ہم کیا فائدہ اٹھا

سکتے ہیں ۔ جامعہ اسلامیہ بہاول پور ایک نمونہ بن سکتی ہے نئے دینی مدارس اور دارالعلوموں کے لئے ۔ اس میں دینی تعلیم کے تجربات ہوں ۔ اور اس بارے میں وہاں ملکوں ملکوں سے ضروری معلومات فراہم کی جائیں تاکہ وہ مرجع بن سکیں مطالعہ و تحقیق کا ۔

جامعہ اسلامیہ بہاول پور ہماری دینی تعلیم کی اصلاح و ترقی کی راہ میں ایک بڑا اہم اور مفید اقدام ہے ۔ اگر محکمۂ اوقاف اسے علمی و تعلیمی و ذہنی مرکز بنانے کی کوشش کرے تو وہ مستقبل میں ایک تاریخی کردار ادا کر سکتی ہے ۔

اب رہی شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ تو جیسے کہ اس کے میمورنڈم سے ظاہر ہے ، اس کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہؒ ، اُن کے خانوادۂ علمی اور مکتبِ فکر کے علوم و معارف کی نشر و اشاعت تو تھا ہی ، لیکن اس کے علاوہ اکیڈمی کے قیام کے وقت محکمہ اوقاف کے اربابِ اختیار کے پیشِ نظر یہ بھی تھا کہ چونکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ذات گرامی اور اُن کے علوم کی بدولت اس برصغیر میں مسلمانوں کی تجدیدِ دینی ، اصلاحِ معاشرت اور اسلامی اقتدار کی بحالی کی جدوجہد شروع ہوئی ، اور اس وقت تک پاک و ہند کے مسلمانوں نے دین و سیاست میں جو کچھ حاصل کیا ہے ، اُس کی کوششوں کا آغاز اُن سے ہوا ۔ اس لئے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کو مسلمانوں کی اس تجدید دینی کی ابحاث STUDIES کا علمی و ذہنی مرکز بننا چاہیئے ۔ اور اس سلسلے میں دوسرے مسلمان ملکوں میں اس قسم کی جو بھی تحریکیں اُٹھی ہیں ، اُن کا بھی یہاں تحقیقی مطالعہ ہو ۔ اور اُن کے بارے میں ضروری لٹریچر جمع کیا جائے ۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدید و اصلاح کی تحریک عالم اسلام میں جو اُس وقت تنزل و پستی کی طرف بڑی سُرعت سے جا رہا تھا اور تنہا نہ تھی ۔ اُس سے پہلے اور اُس کے بعد ہر اسلامی ملک میں ایسی تحریکیں اُٹھیں ۔ انہوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑا ، اور انہیں دین اسلام کے صحیح اور زندگی بخش سرچشموں سے فیض یاب ہونے کی دعوت دی ۔ اکیڈمی کا مقصد مکتبِ ولی اللہی کا اس وسیع و عریض پس منظر میں مطالعہ کرنا تھا ۔

ناظم اعلیٰ اوقاف جناب محمد مسعود صاحب کی خدمت میں ہم یہ معروضات کرتے ہیں ، اور اُن سے متمنی ہیں کہ وہ علمائے کرام کو ملک کی معاشرتی و اقتصادی زندگی میں ایک فعّال عنصر بنانے کے ساتھ ساتھ اُن کے لئے ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ علمی و ذہنی فضا بھی پیدا کرنے کی کوشش فرمائیں گے ۔

حضرت مخدوم سیّد علی ہجویریؒ

حافظ عباداللہ فاروقی

آپ کا اسمِ گرامی ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الجلابی ہے۔ وطنِ عزیز غزنی تھا، ہجویر اور جلّاب غزنی کے دو مشہور محلّے تھے۔ جلّابی محلہ میں حضرت کے دادا اور ہجویری محلہ میں آپ کی والدہ رہائش پذیر تھیں۔ چونکہ ان دونوں محلّوں میں مختلف اوقات میں آپ قیام پذیر رہے اس لئے یہ دونوں محلّے آپ کے نام کے ساتھ ہی مشہور ہو گئے۔

آپ سیّد حسنی ہیں۔ شجرۂ طیبہ اکثر تذکروں میں حسب ذیل ہے۔

مخدوم سید علی ہجویریؒ بن سید علیؒ بن عبدالرحمٰنؒ بن سید عبداللہؒ بن سید ابوالحسنؒ بن سید حسنؒ بن حضرت زید شہیدؒ بن حضرت امام حسنؓ شبیر بن حضرت علی المرتضیٰ شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ۔ چونکہ حضرت علی کرم اللہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے اس لئے نو واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

شجرۂ طریقت

آپ کا سلسلۂ طریقت جنیدیہ فرقہ سے تھا۔ جس کی ابتدا حضرت جنید بغدادیؒ سے ہوئی۔ آپ کے پیرِ طریقت کا نام شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی قدس سرہٗ ہے۔ آپ کا شجرۂ طریقت حسب ذیل واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تک پہنچتا ہے:-

حضرت علی ہجویریؒ مرید خواجہ ابو الفضل بن حسن ختلی جو شیخ ابوالحسن حصر مکیؒ کے مرید تھے۔ ابوالحسن حصر مکیؒ حضرت شیخ ابوبکر شبلی کے مرید تھے۔ اور وہ خادم سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے تھے۔ حضرت جنید بغدادی حضرت سری سقطیؒ کے مرید تھے اور ان کے مرشد حضرت معروف کرخی تھے۔ حضرت معروف کرخی کے مرشد حضرت داؤد طائیؒ تھے۔ ان کے مرشد حضرت حبیب عجمیؒ تھے اور وہ خادم حضرت خواجہ حسن بصریؒ اور وہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے خادم تھے۔

حضرت علی ہجویریؒ اپنے پیر شیخ ابو الفضلؒ کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"طریقت میں آپ میرے راہنما ہیں۔ آپ زبردست عالم تفسیر و حدیث تھے۔ تصوّف میں مذہب جنیدیہ پر چلتے تھے، شیخ حصر کے مرید تھے۔ ساٹھ (۶۰) سال عزلتِ صادق کے طور پر کوہساروں میں پھرے۔ اور لوگوں سے اپنے آپ کو چھپایا۔ آیات و براہین کے مالک تھے۔ صوفیوں کے لباس اور ان کی رسوم کے پابند نہ تھے۔ بلکہ اہلِ رسم سے سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے آپ سے زیادہ رُعب و ہیبت والا شخص نہیں دیکھا۔ آپ کا قول ہے۔ اَلدُّنیا یَوْمٌ وَّلَنَا فِیھَا صَوْمٌ یعنی دنیا ایک دن کی مانند ہے اور اس میں ہمیں روزہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہم نہ اس کے کسی حصّہ میں شریک ہیں نہ اس کی محبت میں گرفتار۔ کیونکہ ہم نے اس کی آفتیں دیکھی ہیں اور اس کے حجابوں سے واقف ہو کر اس سے کنارہ کشی کی ہے۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ایک دن میں اپنے پیرِ طریقت کے ہاتھ دُھلا رہا تھا۔ میرے دِل میں خیال گزرا کہ جب جملہ امور تقدیر سے وابستہ ہیں۔ تو پھر آزادوں کو پیروں کا غلام کیوں بنایا جاتا ہے۔ آپ فرمانے لگے، اے بیٹا جو کچھ تو نے سوچا ہے میں نے سمجھ لیا ہے خدا تعالیٰ جب کسی کو سرفراز کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے توفیقِ توبہ ارزانی فرماتا ہے۔ پھر اسے اپنے کسی دوست کی خدمت میں مشغول کرتا ہے۔

اور یہ خدمت اس کی سرفرازی کا موجب بنتی ہے۔" بقول خواجہ حافظ شیرازیؒ ؎

کیمیائیست عجب بندگیٔ پیرِ مغاں خاکِ اُو گشتم وچندیں درجاتم دادند

تحصیلِ علمِ دین

آپ حصولِ علم کی خاطر کبھی فرغانہ میں جانکلے۔ کبھی خراسان میں۔ کبھی آذربائیجان میں اور کبھی ماوراء النہر میں۔ آپ نے وقتاً فوقتاً خواجہ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ اور بقول بعض شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ حضرت امام ابوالعباس احمد اشقانیؒ کے متعلق فرماتے ہیں کہ" اندر بعضے علوم استاذِ من بُود۔"

ازدواجی زندگی

حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی پہلی شادی کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ کب ہوئی اور کہاں ہوئی۔ جہاں انہوں نے دوسری شادی کا ذکر کیا ہے وہاں لکھتے ہیں :۔

"میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں۔ خداوند کریم نے مجھے گیارہ برس تک نکاح کی آفت سے بچایا ہوا تھا مگر تقدیراً میں ارادہ وخواہش کے بغیر اس فتنے میں پھنس گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ میں ایک پری صفت کا بن دیکھے عاشق و شیفتہ ہوگیا۔ ایک سال اسی پریشانی اور اضطراب میں مبتلا رہا۔ چنانچہ نزدیک تھا کہ میرا دین وایمان تباہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کمال لُطف وکرم سے عصمت وعفّت کو میرے قلب کے استعمال کے لئے بھیجا اور اپنی رحمت واعانت سے مجھے اس فِتنۂ عظیم سے نجات دی۔"

اس عبارت سے بعض لوگوں نے یہ مفہوم بھی لیا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے کبھی شادی نہیں کی۔ چنانچہ John A. Subhan رقمطراز ہیں کہ :۔

Ali Hajveiri was a great advocate of celibacy for sinfis and himself never married. From a passage in "Kashful Mahjul" it has been inferred that he had a short

and the pleasant experience of married life, but the words in question may be taken to refer to his experience of "falling in love" without going to the length of entering the matrimenials State."[1]

مذکورہ بالا سطور سے پادری کی قیاس آرائی درست معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم کہ پادریوں کے نزدیک تجرّد کی زندگی کو مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن واقعات کی رُو سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی ہجویریؒ نے تجرّد کی زندگی بسر کی ہو۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ دُوسرا فتنہ یا نکاح جس کے بارے میں آپ نے اشارہ کیا ہے اُس میں آپ مبتلا ہونے سے بچ گئے۔

میاں محمد طفیل صاحب بھی کشف المحجوب کی ترتیب و تلخیص میں اسی غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ۔ آپ چونکہ اپنی عُمر کا بیشتر حصّہ سفر اور مسافرت ہی میں رہے اس لئے آپ نے شادی نہیں کی بلکہ تجرّد کی زندگی گزاری۔ لیکن تجرّد کے ہلاکت خیز خطرات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اللہ عزّ وجل نے گیارہ برس تزویج کی آفت سے بچایا۔ لیکن تقدیر کا لکھا سامنے آیا اور میں بن دیکھے ایک پری صفت کا دل و جان سے گرویدہ ہوا اور ایک سال اسی طرح اس میں مستغرق رہا، کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ و برباد ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال لُطف و مہربانی سے میرے دل پر عصمت و پاکزگی کا فیضان فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے اس آفت سے نجات بخشی۔[2]

نکاح کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جو شخص مخلوق میں رہنا چاہے اس کے لئے

---

[1] Sufusion its Sainls and Shrines by John A. Subhan 127

[2] تلخیص و ترتیب کشف المحجوب ص ۳۰ مطبوعہ اسلامک پبلیکشنز۔ لاہور۔

نکاح کی شرط ہے، اور اگر بغیر نکاح کے اس کے زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے نکاح فرض ہے۔ لیکن جو مخلوق سے الگ تھلگ رہتا ہو اس کے لئے مجرد رہنا اچھا ہے تاکہ اس کی وجہ سے کوئی نیک بخت پریشان نہ ہو، اور وہ بھی یکسوئی کے ساتھ خدا کی ملازمت کر سکے۔

آنکہ صحبت اختیار کند با خلق اُو را تزویج شرط باشد و آنکہ عزلت جوید از خلق اُو را تجرید زینت بُود[1]

آپ کے کسی ہم عصر اور قریب العہد سوانح نگار نے آپ کی تاریخ ولادت نہیں لکھی جدید دور کے تذکرہ نگاروں نے سنہ ۴۰۰ھ متعین کی ہے جو غلط ہے، اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی ولادت باسعادت سلطنتِ غزنی کے ایام شباب میں ہوئی اور یہ سلطان محمود غزنوی کے آخری ایام حکومت یا سلطان مسعود غزنوی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہ زمانہ غزنوی کی تاریخ کا زریں زمانہ شمار ہوتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی اور اُس کے جانشینوں کی فیاضیوں سے غزنی علوم وفنون کا مرکز بن چکا تھا ہر طرف سے علماء وفضلا ادھر کھنچے چلے آتے تھے۔ ادیب، شاعر اور مؤرخ اور ماہرینِ علوم وفنون اُن کی داد و دہش سے مالا مال ہو رہے تھے۔ اور اُن کی مُربیانہ سرپرستی میں تصنیف وتالیف میں مصروف تھے۔ گھر گھر شعر وسخن کے چرچے تھے۔ جابجا علمی محفلیں گرم تھیں۔ مُلک بھر میں علم کی اشاعت کے لئے کوشش جاری تھی۔ مدارس، بیتُ العلوم اور بیت الحکمت قائم ہو چکے تھے۔ جہاں ہر قسم کی پریشانیوں سے آزاد ہو کر بڑے بڑے ماہرین درس وتدریس میں مشغول تھے۔ اُن کی خدمت میں دُور دُور سے علم کے طالب آتے اور اُن کے درس میں شریک ہو کر علمی تشنگی بجھاتے۔ شعر وادب اور علوم وفنون کی ان بزم آرائیوں کے علاوہ مُلک میں کئی رُوحانی مرکز بھی قائم تھے۔ اُن کو خانقاہ یا جماعت خانے کہتے تھے۔ اُن میں رُوحانی دُنیا کے شہنشاہ انسان اور اللہ تعالیٰ کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے میں مشغول تھے۔ بڑے بڑے امیر وزیر سپہ سالار اور خود بادشاہِ اِن

---

[1] کشف المحجوب صفحہ ۲۲۷ مطبوعہ پنجابی پریس لاہور ۱۸۶۲ء۔

آستانوں پر حاضر ہونا سعادت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی شیخ ابو الحسن خرقانیؒ کے آستانے پر حاضر ہؤا اور نذرِ عقیدت پیش کی جس پر شیخ نے یہ دعا دی
ع "الٰہی عاقبت محمود بادا"!

سیر و سیاحت حضرت علی ہجویری ریاضت جفاکشی حصولِ تجربہ اور حصولِ علم کی خاطر اپنے پیر و مرشد کے ساتھ مختلف ممالک میں پھرتے رہے اور تنہا بھی کئی مقامات پر گئے اور ریاضتِ شاقہ کے عملی سبق حاصل کرتے رہے۔ ہندوستان میں تشریف لانے سے پہلے خراسان۔ ماوراء النہر، مرو، عراق، آذربائیجان تک سیاحت کی جن کا تذکرہ آپ کی تصنیفات میں پایا جاتا ہے۔

عراق کا ایک واقعہ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں کہ عراق میں اپنے قیام کے زمانے میں ایک دفعہ میں دُنیا کمانے اور اسے خرچ کرنے میں بہت دلیر ہوگیا۔ جس کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی وہ میری طرف رجوع کرتا، اور میں نہ چاہتا تھا کہ میرے دروازے سے کوئی خالی جائے اس لئے اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ میں بہت زیادہ مقروض اور اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہوگیا۔ آخر وقت کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے مجھے لکھا بیٹا! دیکھو اس قسم کی مشغولیت میں کہیں خُدا سے دُور نہ ہو جاؤ۔ یہ مشغولیت ہوائے نفس ہے۔ اگر کسی کے دل کو اپنے سے بہتر پاؤ تو اس کی خاطر پریشانی اُٹھاؤ۔ تمام مخلوق کے کفیل بننے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اپنے بندوں کے لئے خدا خود کافی ہے۔ فرماتے ہیں اس نصیحت سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہؤا۔[1]

تصنیفات سیر و سیاحت کے بعد آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا اور ایسے ایسے جواہر گرانمایہ اور نکات و رموز ظاہر فرمائے جو حجاب بشریت کے کاشف اور شرع و تحقیق کے کلمات ثابت ہوئے۔ شہزادہ داراشکوہ سفینۃ الاولیاء

---

[1] کشف المحجوب ترتیب و تلخیص بزبان اردو۔ از میاں محمد طفیل صاحب صفحہ ۳۹
مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔

میں لکھتے ہیں کہ "حضرت پیر علی ہجویری رح را تصانیف بسیار است۔" لیکن آج ان تصانیف کا وجود تو ایک طرف ان کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں۔ البتہ خود کشف المجوب میں مصنف کے حوالوں کو یکجا کرنے سے حسب ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے (۱) دیوان۔ (۲) منہاج الدین (۳) البیان لاہل العیان (۴) اسرار الخرق ——— (۵) کشف الاسرار۔ (۶) الرعایۃ بحقوق اللہ (۷) کشف المجوب۔

دیوان اور منہاج الدین کی نسبت آپ خود ہی لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے یہ کتابیں پڑھنے کے لئے لیں لیکن ان پر اپنا نام لکھ دیا اور قبضہ کر گیا۔ (۳) البیان لاھل العیان یہ کتاب ناپید ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ زیور طبع سے آراستہ ہی نہیں ہوئی۔ (۴) اسرار الخرق ——— یہ کتاب شیخ و مرید کے باب میں لکھی گئی ہے (۵) کشف الاسرار۔ یہ مختصر سی کتاب تصوف و معرفت کے نکات سے مالا مال ہے اس کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ (۶) الرعایۃ بحقوق اللہ۔ یہ کتاب ان حقوق کی رعایت میں لکھی گئی ہے جو عبد ہونے کی حالت میں ہم پر واجب ہیں۔ یہ کتاب بھی ناپید ہے (۷) کشف المجوب، عام طور پر ملتی ہے۔ اس میں تصوف و معرفت کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو نظر انداز کیا گیا ہو۔ یہ کتاب گم گشتگانِ راہ کے لئے چراغِ ہدایت ہے۔ مولانا جامی رح اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:-

> از کتب مشہور کہ دریں فن است و لطائف و حقائق بسیار دراں کتاب جمع کردہ است۔

> شاہزادہ داراشکوہ کے نزدیک فارسی زبان میں تصوف پر کوئی کتاب کشف المجوب کے ٹکر کی نہیں۔

سب سے بڑھ کر قابلِ استناد و قابلِ افتخار قول حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کا ہے فرماتے ہیں:-

> "کشف المجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری است اگر کسے را پیرے نباشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند اُو را پیر پیدا شود۔ (فواد الفواد)

(یعنی جس کا کوئی مرشد نہ ہو وہ کشف المجوب کا مطالعہ کرے اس کی برکت سے

لسے پیر کامل مل جائے گا۔

غرض کشف المحجوب حضرت علی ہجویریؒ کی گراں مایہ تصنیف ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں "ظاہری علم باطنی علم کے بغیر ادھورا ہے۔ بعض اوقات یہ حجاب اکبر کی سی صورت اختیار کر جاتا ہے اس لئے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ علم ظاہر سے مُراد معاملات کا علم ہے۔ علم باطن کا مقصد نیّت کا درست کرنا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ ان دونوں میں صرف ایک حاصل کرے تو وہ بالکل ناکام رہے گا، کیونکہ ان دونوں کو حاصل کئے بغیر چارہ نہیں۔

علم ظاہری شریعت اور علمِ باطن حقیقت ہے۔ علمِ حقیقت کے تین ارکان ہیں،
(الف) خداوند تعالیٰ کی ذات کا علم، یعنی وہ ہر چیز کو جانتا، دیکھتا اور سُنتا ہے۔
(ب) خداوند تعالیٰ کے افعال کا علم یعنی وہ تمام خلائق کا پیدا کرنے والا اور پرورش کرنے والا ہے (ج) اللہ کی ذات کا علم۔ یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ پاک ہے اور بے عیب ہے اس کا کوئی مثل نہیں۔

اسی طرح علمِ شریعت کے بھی تین ارکان ہیں (الف) کتاب۔ (ب) سنّت۔ (ج) اور اجماعِ اُمّت۔

حضرت گنج بخش فرماتے ہیں کہ علم بغیر عَمل کے ناقص اسی طرح عَمل بغیر علم کے ناقص رہتا ہے۔ عارضی حجاب دور کرنے کے لئے سالک کو یہ ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے عابد کو جو علم سے بے بہرہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گدھے سے تشبیہ دیتے تھے۔ آپ نے اپنی مایہ ناز تصنیف کا نام کشف المحجوب اس لئے تجویز کیا کہ ان کے نزدیک یہ کتاب تمام کدُورت بشری اور حجابات کو دُور کر کے اصل حقیقت آشکارا کرتی ہے۔ کشف المحجوب کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ یہ حجاب کو دُور کرنے والی ہے۔

حضرت ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ حجاب کی ۲ دو قسمیں ہیں (الف) حجاب رینی۔ (ب) حجابِ غینی۔ حجابِ رینی فطری حجاب ہوتا ہے جو دُور نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح پتھر کی یہ فطرت ہے کہ اس میں آر پار دکھائی نہیں دیتا اور اس کو آئینہ میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہ کسی

انسان کا رینی حجاب دُور کرنا محال ہے۔ پھر ان کے بارے میں قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے!
"اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی آنکھوں
پر پردے ڈال دیئے ہیں اس طرح وہ فطری طور پر حجاب میں پڑ گئے ہیں"

حجابِ غینی عارفی حجاب ہوتا ہے جس کو دُور کرنا قدرتِ انسان میں داخل ہوتا
ہے اس کی مثال یوں ہے کہ آئینہ کا خاصا ہے کہ اس میں سے انعکاس ہو۔ لیکن اگر اس
کے اوپر گرد و غبار جم جائے تو اس میں سے دکھائی نہ دے گا۔ اگر اس کا غبار دُور کر دیا جائے
تو پھر مجلّا ہو سکتا ہے بعینہ وہ نفوس جن کو نورِ ہدایت بخشا گیا ہے۔ اور جن کے دِل
معصیت کی وجہ سے مکدّر ہو چکے ہیں وہ کسی رہبرِ کامل کے فیضِ صحبت سے دوبارہ روشن
ہو سکتے ہیں۔

علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے اس لئے
حجابِ ظلمت سے اس کا دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن جو لوگ راہِ حق میں دم مارتے ہیں
ان کے لئے حجاب کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور وہ لیلائے حقیقت سے ہمکنار ہو کر حیاتِ
سرمدی سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ جلوہ گاہِ احدیت ہے اور اس کی
شان جلالی اور جمالی اس کی بے نیازی اور قدرت کے ذرّہ ذرّہ سے عیاں ہو رہی ہے۔
مگر جوہر، عرض، اجرام اور اجسام وغیرہ سب اس کے لئے بمنزلہ حجاب کے ہیں اور محلِّ
توحید میں ان کا ثابت کرنا شرک ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس دُنیا کو حجاب میں مستور
کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہر طبیعت اپنے وجود کے باعث توحیدِ حق سے حجاب میں ہے ورنہ
بقول عارف شیرازیؒ عاشق و معشوق کے درمیان کوئی پردہ حائل ہی نہیں ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ ارواح بھی وجود کی کدورت سے مکدّر ہو گئی ہے
جب تک یہ تکدّر دور نہ ہو انسان اسرار و رموز و تجلیات سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔
علاوہ ازیں عقلِ انسانی بھی ایک بہت بڑا حجاب ہے۔ چونکہ اسرارِ ربانی کا احاطہ عقل

میں آنا محال ہے اس لئے عقل کو ذریعۂ معرفت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آپ کا وُرودِ لاہور آپ خواجہ ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی کے مُرید تھے۔ ایک مدت تک آپ ان کی صحبت میں رہے اور ان کی توجہ سے روحانیت کے بہت سے مدارج طے کئے۔ جب مُرشد کو معلوم ہوگیا کہ مرید اب تکمیل کو پہنچ گیا ہے تو آپ نے ایک دن فرمایا کہ تم لاہور جاؤ وہاں تمہاری ضرورت ہے اور لوگ اس چشمہ کے منتظر ہیں اور اس سے سیراب ہونے کے متمنّی ہیں جو تمہارے پند و نصائح سے اِس سرزمین میں جاری ہونے والا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ وہاں ہمارے پیر بھائی حسین زنجانی موجود ہیں ان کی موجودگی میں میری کیا ضرورت ہے۔ آپ کے مرشد نے فرمایا۔ تم کو چوں و چرا این و آں اور بحث مباحثہ سے کیا مطلب، بلا توقف جاؤ۔[1]

یہ حکم پاتے ہی حضرت علی ہجویریؒ پا پیادہ بغیر کسی ساز و سامان اور بغیر کسی اہتمام و انصرام کے صرف دو ہمراہیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک تو خواجہ احمد سرخسیؒ جو سرخس کے رہنے والے تھے اور دوسرے ابو سعید ہجویریؒ جو آپ کے ہم وطن تھے۔

لاہور میں تشریف آوری آپ ۴۳۱ھ میں سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے آخری ایام میں لاہور پہنچے۔

اس وقت لاہور اور غزنی میں سیاسی ابتری پھیل رہی تھی۔ آپ نے لوگوں کو تسلّی دی اور مہاجرت سے روکا۔ جب آپ لاہور پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ شہر سے ایک جنازہ لے کر آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ ہے۔ آپ ان کے جنازہ کے ساتھ اس مقام تک گئے جہاں اب موضع چاہ میراں آباد ہے اور جنازہ پڑھنے کے بعد وہیں ان کو دفن کردیا۔ (فواد الفواد)

آپ نے لاہور آکر ایک مسجد بنوائی جس کا ذکر شاہزادہ دارا شکوہ نے

---

[1] فواد الفواد ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

بھی کیا ہے[1]۔ جس جگہ آپ کا مزار ہے یہ مسجد اس کے سمتِ مغرب واقع تھی۔ اور قریب قریب کے زمانہ تک قائم رہی۔ جب چودھری غلام رسول نے نئی مسجد بنوائی تو قدیم مسجد کو شہید کر دیا گیا اور نئی مسجد کے صحن میں قدیم مسجد کی جائے محراب کے نشان کو سنگِ مرمر کی ایک سِل کے ذریعہ قائم رکھا گیا۔

پہلا شخص جو آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا وہ رائے راجو حاکم پنجاب کا نائب تھا۔ وہ حضرت کا مُرید ہو کر مسلمان ہو گیا۔ چونکہ یہ پہلا ہندو بلکہ ہندوستانی شخص تھا جو حضرت کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنی دِلی خواہش سے اس کا نام شیخ ہندی رکھا۔ مجاور اور خدّام جن کا تعلق آپ کے روضۂ مبارک سے رہا ہے اسی شیخ ہندی کی اولاد سے ہیں۔

کشف المحجوب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپ کے مُرشد شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی کا انتقال ہوا (۴۶۰ھ) تو اُن کا سر آپ کی آغوش میں تھا آپ اُس روز دمشق کے قریب ایک مقام بیت الحسن میں تھے آپ فرماتے ہیں کہ آپ کا سر میری گود میں تھا اُس وقت میرے دِل کو سخت پریشانی تھی۔ اس واقعہ سے بعض لوگوں نے یہ

---

[1] شہزادہ دارا شکوہ سفینۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت نے یہ مسجد بنائی تو اور مسجدوں کی بہ نسبت اس کے قبلہ کا رُخ ذرا سا جنوبی سمت کو تھا۔ علماء لاہور نے اس پر اعتراض کیا۔ حضرت تو اعتراض سُن کر خاموش رہے۔ جب تعمیرِ مسجد سے فراغت پائی۔ تو آپ نے علماء و فضلاء کو بلایا اور خود امام بن کر اس میں نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد تمام حضرات سے فرمایا کہ تم لوگ اس مسجد کے قبلہ پر اعتراض کرتے تھے اب دیکھو قبلہ کس طرف ہے۔ جب انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو یکبارگی قبلہ بالمشافہ بچشم ظاہر نظر آیا قبلہ کو سیدھے رُخ دیکھ کر سب معترضین نادم ہوئے اور آپ سے معذرت چاہی۔

علاوہ سفینۃ الاولیاء کے یہ واقعہ تاریخ الاولیاء میں بھی مذکور ہے ملاحظہ ہو صـ ۳۲۴ تاریخ الاولیاء۔

نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ دو بار لاہور تشریف لائے۔ جناب پروفیسر علم الدین سالک صاحب نے اپنے تحریر کردہ پمفلٹ میں اس بات کی پوری تائید کی ہے فرماتے ہیں "پہلی بار اپنے مُرشد کے حُکم سے آئے یہاں تبلیغ و اشاعت کے فریضہ میں مشغول رہے اور کچھ عرصہ بعد پھر واپس چلے گئے اور اپنے مُرشد کی وفات کے وقت وہ ان کی خدمت میں موجود تھے اور دُوسری بار مستقل قیام کی غرض سے۔ اس بات کی تائید خود کشف المحجوب سے بھی ہوتی ہے۔ آپ نے اسی کتاب میں دو مختلف مقامات پر ہندوستان کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے آپ نے اس مُلک کی سیاحت کی اور کتاب لکھتے وقت آپ اس مُلک سے دُور بیٹھے ہوئے تھے۔[1]"

اس بیان کی تصدیق نہیں ہو سکی اوّل تو جناب پروفیسر سالک صاحب نے حوالے درج نہیں کئے۔ دوسرا یہ کہ اولیاء اللہ کے لئے رُوحانی طور پر نقلِ مکانی کرنا کوئی دُشوار بات نہیں۔ حاجی امداد اللہ مکیؒ اور دیگر اولیاء اللہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ "جب حضرت داتا گنج بخش پاکستان آئے اس وقت تصوّف اپنی تاریخ کے دوسرے دور میں تھا۔ منصور حلّاجؒ۔ ذوالنون مصریؒ اور خواجہ بایزید بسطامیؒ نے تصوّف میں بعض نئی اور غیر اسلامی چیزیں داخل کر دی تھیں۔ لیکن ابھی زہد و اتقاء کو تصوّف میں نمایاں جگہ حاصل تھی، اور داتا صاحب تو شرع اور اصولِ دینی پر پوری طرح عامل تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے صُوفی فرقوں کا حال لکھا ہے۔ اس میں حسین فارسی (منصور حلّاج) اور ابو سلمان کے حلولی فرقوں کو ملحد اور لعنتی کہا ہے فرماتے ہیں:-

ترجمہ:- "میں نہیں جانتا فارسی کون ہے اور ابو سلمان کون اور انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا۔ جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے۔ اس کو دین میں کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اور جب دین جو اصل ہے مضبوط نہ ہو تو تصوّف جو اس کی شاخ ہے کس طرح مفید ہو سکتی ہے"!

---

[1] حضرت مخدوم علی ہجویری داتا گنج بخشؒ صفحہ ۱۴ از پروفیسر علم الدین سالک۔ شائع کردہ انتظامیہ کمیٹی دربار داتا گنج بخش (سن ندارد ہے) قیاس ہے ۱۹۶۴ء میں لکھا گیا۔

داتا گنج بخش کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً کشف المحجوب، کشف الاسرار، منہاج الدین، البیان لاہل العیان۔ یہ کتابیں اس وقت لکھی گئیں جب تصوّف کی مشہور کتابیں مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف اور ابن عربی کی فصوص الحکم ابھی نہیں لکھی گئی تھیں اور تصوّف کی موجودہ تدوین جس نے بعض باتوں میں اسے شرعِ اسلامی سے ایک مختلف نظام بنا دیا ہے، نہ ہوئی تھی[1]۔

چونتیس ۳۴ سال تک آپ لاہور میں قیام فرما رہے۔ اِس عرصہ میں آپ کی ظاہری و باطنی برکات سے لاکھوں آدمی فیضیاب ہوئے اور ہزارہا بندگانِ خدا جو جہالت اور بے علمی کی وجہ سے بُت پرستی میں مصروف تھے وحدانیت کے سایہ میں آئے۔ شیخ اکرام صاحب نے حضرت داتا گنج بخش کا سنِ ولادت ۱۰۰۹ء اور وفات ۱۰۷۲ء لکھی ہے لیکن لاہور میں آنے کی تاریخ نہیں لکھی۔ کشف الاسرار کے اُردو ترجمہ میں آپ کے ورودِ لاہور کا سن ۴۱۰ھ مطابق ۱۰۲۵ء درج ہے۔ یہ زمانہ سلطان محمود سبکتگین کا تھا۔ لاہور کے لوگ علم و تہذیب سے عاری تھے چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں "میری کتابیں غزنی میں تھیں اور میں ہندوستان کے شہر لاہور میں ناجینوں کے درمیان گرفتار تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ "آبِ کوثر" کے مصنف شیخ اکرام صاحب نے آپ کا جو سنِ ولادت تحریر کیا ہے وہ درست نہیں کیونکہ اگر آپ کا ورود لاہور میں ۱۰۲۵ء تسلیم کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ جب آپ لاہور تشریف لائے آپ کی عمر ۱۶ برس تھی جو بعید از قیاس ہے۔ اگرچہ آپ کے سنِ وفات میں بھی کچھ اختلاف ہے مگر غالب رائے یہی ہے کہ آپ کا سنِ وصال ۴۶۵ھ ہے۔ چنانچہ مزار مبارک کے اندرونی دروازے پر بھی جو قطعہ تاریخ درج ہے اس میں "سالِ وصالش برآید از سردار" (۴۶۵ھ) لکھا ہے۔

مزار کی اندرونی ڈیوڑھی پر جس کی مینا کاری کا کام اب بھی اس کی قدامت اور مٹی ہوئی شان و شوکت کو ظاہر کر دیا ہے حسب ذیل قطعہ سنگِ مرمر پر لکھا ہوا ہے ۔

---

[1] آبِ کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ص۷۷ مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔

این روضہ کہ بانیش شدہ فیضِ الست — مخدوم علی راست کہ باحق پیوست
در ہستی ہست نیست شد ہستی یافت — زاں سالِ وصالش افضل آمد از ہست
۴۶۵ھ

صحن مزار اور مسجد کا جو دروازہ ہے اس پر یہ قطعہ لکھا ہوا ہے ؎

خانقاہِ علی ہجویری ست — خاکِ جاروب از درش بردار
طوطیا کُن بدیدۂ حق بیں — تا شوی واقفِ درِ اسرار
چونکہ سردار ملکِ معنی بود — سالِ وصلش برآید از سردار
۴۶۵ھ

یہ دونوں قطعات نہایت ہی قدیم ہیں۔ صاحبِ قطعہ نے اپنا نام نہیں لکھا۔ سید محمد لطیف نے لکھا ہے کہ پہلا قطعہ مولانا جامی کی تصنیف سے ہے[1]۔ مگر خود مولانا جامیؒ نے اپنی تصنیف نفحات الاُنس میں حضرت علی ہجویریؒ کا ذکر کرتے ہوئے اس قطعہ کو درج نہیں فرمایا۔

گنبد کے شرقی جانب یہ اشعار ملتے ہیں ؎

واہ ایں گنبد فلک شانی — کہ بجاروب اُو ملایک و حُور
ایستادہ بگیسوئے مشکیں — از پئے عطر یافتند سرور
سالِ ایں گنبد مجبر نو — از چراغِ جمال یافت ظہور

۱۲۷۸ A-H

"چراغِ جمال" سے اِس تعمیر کا سن $\frac{۱۲۷۸}{۱۸۶۱ء}$ نکلتا ہے۔

اگلی محراب پر یہ شعر کندہ ہے ؎

ہمیشہ باد خدایا کشادہ ایں درگاہ
بحق اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

مزارِ مقدس کے اردگرد شیش محل بھی تھا جو مغلیہ عہد تک رہا بعد میں تاراج ہوگیا۔

---

[1] ہسٹری آف لاہور مصنفہ سید محمد لطیف سشن جج لاہور صفحہ ۱۸۱ سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء سن طبع۔

چنانچہ سیّد محمد لطیف رقم طراز ہیں :-

The quarters adjoning the mausolence of Data Ganj Bakhsh are still known as Shish Mahal, from the place of mirrors which exhisted here in the time of the Mohammedan emperors.

خانقاہ پر بادشاہوں کی حاضری

سلطان ابراہیم غزنوی جو سلطان محمود غزنوی رح کا برادرزادہ اور سلطان مسعود کا بیٹا تھا، جب لاہور پہنچا تو حضرت علی ہجویری رح کے مزار پر بھی حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت کی وفات کو صرف آٹھ برس ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی مزار کی تعمیر کا حکم دیا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے مزارِ اقدس کی عمارت میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں لیکن چبوترہ اور لوحِ مزار سلطان ابراہیم کے زمانہ کا ہے۔ تعویذ مزار ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ سلطان ابراہیم کے بعد اس کے جانشین یکے بعد دیگرے حضرت کے مزار پر آتے رہے اور نذرِ عقیدت پیش کرتے رہے۔ اس کے بعد خاندانِ غوری، خاندانِ غلاماں، خاندانِ مغلیہ وغیرہ سے جتنے بادشاہ لاہور آئے نذرِ عقیدت پیش کرتے رہے۔ کتبِ تواریخ سے اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، عالمگیر اور شاہزادہ دارا شکوہ کا یہاں آنا ثابت ہے۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اس مزار کا بہت ادب ملحوظ رکھتا تھا۔

بادشاہوں اور شہنشاہوں کے علاوہ لاہور کے مقامی حکام یعنی ناظم اور صوبیدار وغیرہ سب کو اس آستانہ سے عقیدت تھی۔

اس مزار پر کچھ قلمی قرآن بھی ہیں جو صدہا سال سے چلے آرہے ہیں، اس وقت

History of Lahore by S.M. Latif P. 181
Published by Syed M. Minlaj-ud-Din (grand son of the author).

محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہیں۔ بعض تذکرہ نویس چار بڑے قرآنوں کا پتہ دیتے ہیں جن کا الگ ایک ایک سیپارہ ہے۔ ایک قرآن شریف نظام حیدرآباد دکن کا نذر کردہ ہے۔ یہ قرآن شریف ۱۱۳۷ھ میں مزار حضرت علی ہجویری کے خدام یا مجاور کی تولیت میں دیا گیا جیسا کہ ہر سیپارہ کی آخری تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا قرآن شریف موراں طوائف محبوبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۲۵۱ھ میں نذر کیا تھا۔ تیسرا قرآن محمد خاں چٹھہ احمد نگر ضلع گجرانوالا نے نذر کیا۔ چوتھا قرآن امیر بخش کی طرف سے ہدیہ ہے جس کی زیادہ کیفیت معلوم نہیں ہو سکی۔ ان بڑے قرآن شریف کے نسخوں کے علاوہ ایک اور قرآن بھی ہے۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور کی فتح کے بعد وہاں سے حاصل کیا تھا اور دربار حضرت داتا صاحب میں بطور نذر چڑھایا تھا۔ دوسرا شیخ غلام محی الدین صوبیدار کشمیر کا نذر کردہ ہے جو اس نے کشمیر سے یہاں بھجوایا تھا۔ تیسرا میاں کشمیری سوداگر پشمینہ امرت سر کا نذر کیا ہوا ہے اور چوتھا میاں غلام یٰسین خوشنویس لاہور کا نذر کردہ ہے۔ ایک قرآن شریف بہاری خط میں ہے جو نواب ملتان نے نذر کیا تھا۔ ایک اور ہے جو بخطِ ثلث ہے اور بہت قدیم ہے۔

مسجد } یہ مسجد وہی ہے جو حضرتؒ کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسجد کی ظاہری ہیئت وقتاً فوقتاً بدلتی رہی ہے لیکن جگہ وہی ہے جہاں حضرت نے اپنی زندگی میں مسجد تعمیر کی تھی۔ مسجد کی موجودہ تعمیر چودھری غلام رسول ٹھیکیدار نے کرائی تھی جس پر کم و بیش ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس مسجد کے پانچ گنبد ہیں اور ان پر گلکاری کا بہت زیادہ کام کیا گیا ہے۔ مسجد کا صحن کشادہ ہے۔ دربار حضرت گنج بخش کے صحن کی توسیع کی وجہ سے نمازیوں کے لئے مزید گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تجویز بھی ہے کہ مغرب کی جانب اس مسجد کی مزید توسیع کی جائے بعض مخیّر حضرات اس کے لئے اپنے مکانات دینے کے لئے تیار بھی ہو گئے ہیں۔ تین برس گزرے کہ مسجد کے حوض کے پاس مسجد کا مینار ہوا کی تندی سے گر گیا۔ یہ عرس کا موقع تھا، بعض لوگ اس انہدام کی وجہ سے شہید ہو گئے۔ مندرجہ ذیل قطعہ علامہ اقبال نے لکھا تھا جو باہر کے دروازے پر نصب ہے ؎

سالِ بنائے حرمِ مؤمناں خواہ ز جبریل وز ہاتف مجو
چشم بہ المسجد الاقصیٰ فگن الذی بارکنا ہم بگو
۱۳ ھ ۴۰

حجرۂ اعتکاف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ۵۸۰ھ کے قریب ہندوستان میں تشریف لائے اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر ایک عرصہ تک معتکف اور چلہ کش رہے آپ کا حجرہ مسجد کے بالمشافہ ایک گز کے فاصلہ پر ہے۔ اِس حجرہ کی عمارت اکبر بادشاہ کے حُکم سے تیار ہوئی تھی۔ اب سنگِ مرمر کے پتھر پر حسب ذیل عبارت تحریر ہے:۔

"حجرۂ اعتکاف حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ"

حجرہ کے اندر سفید اور سیاہ پتھر کا خوبصورت فرش ہے جس کو خان بہادر میاں محمد بخش مرحوم ٹھیکیدار نے بنوایا تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پُر انوار میں گنبد کے نیچے دائیں اور بائیں حضرت کے مجاہد ہمراہیوں خواجہ احمد سرخسی اور ابو سعید ہجویری کی قبریں ہیں۔

مسجد کے مشرق کی طرف حجرۂ اعتکاف کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ قبر مسجد کی سیڑھیوں کے ساتھ ہے، جو سب سے پہلے مجاور شیخ ہندی کی تیرھویں پشت کے ایک مجاہد شیخ سلیمان کی ہے۔ اس قبر کی نسبت تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں بنی تھی۔ حضرت کے روضہ کے سامنے اور مشرق کی جانب مجاوران کی قبریں ہیں، انہی میں ایک قبر سب سے پہلے مجاور شیخ ہندی کی بھی بیان کی جاتی ہے۔

خان بہادر میاں محمد بخش مرحوم نے احاطۂ مزار میں عالیشان کمرے بنوائے تھے، مندرجہ ذیل اشعار بطور قطعہ اس عمارت کے مشرقی دروازہ کے اوپر سنگِ مرمر پر کندہ ہیں:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْوَقْفُ لِوَجْہِ الْکَرِیْم

زخاں صاحب محمد بخش نامی | کہ مشرب قادری دارد عظامی
بنا شد ایں عمارت بہر مولا | بطیب رُوحِ مخدوم علیؒ را
یکے آرام خلق عام آراست | ازیں وقفے رفاہِ عام درخواست
خلیقا سالِ تاریخش چہ جوئی | ززادِ آخرت حقّا بگوئی

۲۸ ۱۳ ھ

۱۸۳۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مزار مقدس کی مرمّت کرائی تھی اور نئی چھت ڈلوائی تھی۔ حضرت کا مزار سفید سنگ مرمر کے چبوترے پر واقع ہے۔ مقبرہ عالیہ پر ہمیشہ ایک غلاف پڑا رہتا ہے۔ آپ کے تعویذ کے گرد ایک پنجرہ چوبی ہشت پہلو تھا جو اب نہیں، جس کو میاں عرض خاں فیلبان مہاراجہ رنجیت نے ۱۲۴۰ھ میں بنوایا تھا۔ جس طرح پہلے مسجد کے اُوپر گنبد نہیں تھا اسی طرح مزار بھی گنبد سے خالی تھا۔ مگر ۱۲۷۸ھ میں حاجی نُور محمد سادھو (کشمیری) نے مزار پر ایک مدوّر گُنبد نہایت خوبصورت بنوایا۔ روضہ کے گرد ہشت پہلو آئینے تھے جو خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین صاحب مرحوم کی عقیدت مندی کا نتیجہ تھے۔

روضۂ اطہر رسولِ کریمؐ کا نقشہ جو پیتل پر کھود کر تیار کیا گیا ہے اور بہت سے گُلکاری کا کام اس پر مستزاد ہے۔ ماسٹر خیردین قلمکار کی چابک دستی کا ایک بہت اعلیٰ نمونہ ہے یہ نقشہ ۱۹۳۸ء میں لگوایا گیا تھا۔ آج کل یہ مسجد میں لگ رہا ہے۔

حضرت کے چبوترہ کے گرد کٹہرے پر نواب غلام محبوب سبحانی نے چاندی لگوائی تھی جو اب نہیں ہے۔ بلّور کا ایک جھاڑ بھی قبر کے تعویذ کے کچھ اُوپر لٹک رہا ہے جو خان بہادر شیخ نصیر الدین کا عطا کیا ہوا ہے۔ روضہ کا گنبد ہشت پہلو بیضوی شکل کا ہے۔

نوٹ:- فیروزالدین گورنر کشمیر، شیخ نصیر الدین اور نواب غلام محبوب سبحانی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

آج کل اس کا رنگ سبز ہے دروازہ کے اُوپر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

گنبد کے ہر پہلو پر فارسی اشعار کا ایک ایک شعر منشی عبدالمجید پروین رقم کی شوخیٔ تحریر کا ایک پاکیزہ نمونہ ہے۔ مزار کے بالمقابل جو دالان ہے جس میں ختم پڑھا جاتا ہے اس کی دیوار پر جو اشعار ہیں وہ حافظ محمد یوسف اور تاج زریں رقم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

برآستانِ تو ہر کس رسید مطلب یافت ‏ ‏ رو امدار کہ من نا اُمید برگردم

؎ بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود ‏ ‏ سالہا سجدہ گہ صاحب نظراں خواہد بود

؎ ابوبکر ہم چو کعبہ عمر در طوافِ اُو ‏ ‏ عثمان آبِ زمزم علی حج اکبر است

؎ چہ حسنست آنکہ دریکدم رخت را صد نظر بینم
ہنوزم آرزو باشد کہ یکبار دگر بینم

؎ جائیکہ زاہداں ہزار اربعین رسند
مستِ شرابِ عشق بیک آہ میرسند

حضرت کے سرہانے ایک چھوٹا سا حوض ہے جس میں پانی بھرا رہتا ہے۔ لوگ اسے متبرّک سمجھ کر پیتے ہیں۔ ایک دو سال ہوئے اس میں چھوٹی چھوٹی نلکیاں لگادی گئی ہیں تاکہ پانی ہاتھ لگانے سے خراب نہ ہو مزار مقدس کی تعمیر سکھوں کے زمانہ میں ہوئی چنانچہ موراں طوائف جہر نشاں طوائف (یہ نام غالباً جہر النساء ہوگا) اور نواب شیخ امام الدین صوبہ کشمیر نے روضہ کی سفیدی اور مرمت پر بہت خرچ کیا۔ جس دالان میں قرآن شریف رکھے جاتے ہیں وہ بھائی ہیرا مصاحب کنور نونہال سنگھ نے بنوایا تھا بعد میں رانی جنداں والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ نے اس کو اور کشادہ کرادیا۔ اس کے بعد دُختر فیروزالدین نے ۱۳۳۶ھ میں از سرِ نو اس کو تعمیر کرایا۔ چنانچہ برآمدے کی پیشانی پر حسب ذیل کتبہ لگا ہوا ہے ؎

دخترِ فیروز الدین ادنیٰ کنیز گنج بخش
ہر سعادت قسمتِ اُو گشتہ از روزِ ازل
کرد تعمیرِ این بنا از ہاتفے آمد ندا
پاک چوں بیت الحرم این حجرۂ علم و عمل
۱۳۳۶ ھ

ڈیوڑھی بیرونی ڈیوڑھی میاں غلام حسین ولد حاجی غلام حسن مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں بنوائی تھی، ڈیوڑھی کا فرش جو پہلے خشتی تھا ۱۹۳۸ء میں عبدالمنان مالک پیراماؤنٹ ٹاکیز بھاٹی گیٹ نے سنگِ مرمر کا لگوایا جو حضرت کے روضہ تک جاتا تھا لیکن حال ہی میں محکمہ اوقاف نے جو ضروری تعمیریں کی ہیں اس کی وجہ سے بیرونی ڈیوڑھی صحن میں آگئی ہے۔

مندرجہ ذیل شعر جو زبان زدِ خلائق ہو گیا ہے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحؒ کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا جب وہ اعتکاف ختم کر کے رخصت ہونے لگے تھے ؎

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

ان کے بعد حضرت بابا فرید گنج شکر رحؒ ۶۰۰ھ میں لاہور تشریف لائے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی آپ کے دادا پیر تھے، آپ نے وہاں چلّہ کشی کرنا مناسب نہ سمجھا اور از راہِ ادب قبر کی پائنتی کی طرف ایک ٹیلے پر اپنی نشست مقرر کی یہ جگہ ضلع کچہری کے مغرب کی طرف واقع ہے آپ کے قیام کی وجہ سے اس جگہ کا نام فرید آستانہ یا ٹبہ بابا فرید مشہور ہو گیا ہے۔ یہ جگہ اب تقریباً منہدم ہو چکی ہے تاہم ہر سال یہاں میلہ لگتا ہے۔

لال حسین اور شیخ حسّو شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں لاہور کے قطب المشائخ ہو گزرے ہیں۔ دونوں نے حضرت داتا گنج بخش رحؒ کے مزار سے رُوحانی فیض حاصل کیا۔ اسی طرح شاہزادہ دارا شکوہ بھی یہاں معتکف رہا۔

چونکہ مزار اور اس کی آمدنی کا انتظام محکمہ اوقاف کے ذمہ ہے اس لئے مجاور حضرات کا اب دخل نہیں۔ ان میں سے بعض مخیّر حضرات مسجد کی توسیع کے لئے اپنی قیامگاہیں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے یہ منصوبہ جلد پورا ہو جائے گا۔

ذیل میں حضرتؒ کا منظوم شجرہ طیبہ نقل کیا جاتا ہے جو کشف الاسرار کے ترجمہ کے آخر میں دیا گیا ہے۔

شجرہ طیبہ شیخ علی ہجویریؒ این است

علی ہجویری آں پیرِ ولایت — زدستِ شیخ ابوالفضل ہدایت

ابوالفضل از علی حصری گرفتہ — بدست خدمت اسرار نہفتہ

علی حصری بوے اسرار کلی — رسید از خدمتِ بوبکر شبلی

بہ شبلی از جنید آمد عطائے — کہ در عالم شدہ اُو رہنمائے

جنید از سری وسقطی بپوشید — لباسِ پارسائی راچہ خوش دید

سری سقطی از معروف خرقہ — بہ برپوشید و شد والی فرقہ

شدہ معروف از داود طائی — چراغِ خانقاہِ پارسائی

بداؤد از حبیب آں فتحیاب است — حبیب آں کز حسنِ اُو کامیاب است

حسن بصریؒ مرید مرتضےٰ بود

علیؓ راپیرِ کامل مصطفےٰؐ بود

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

ملفوظات

(مسلسل)

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک شخص نے دریافت کیا کہ فرض نماز میں امام کو لقمہ دینا درست ہے یا نہیں؟ ارشاد فرمایا کہ ـــ فقہاء نے اس میں اختلاف کیا ہے صحیح تر یہ ہے کہ لقمہ دینا چاہیئے۔ اگر امام نے ایسی غلطی کی ہے جس میں معنیٰ بدل رہے ہیں تو لقمہ دینا فرض ہے ورنہ مستحب۔

ارشاد فرمایا کہ (سورۂ فاتحہ میں) اِھْدِنَا سے پہلے نَسْتَعِیْنُ کا جو نون ہے اس میں وصل کر کے (یعنی اھدِنا سے ملاکر) پڑھنا اچھا نہیں ہے اگرچہ نماز میں کوئی خلل نہیں آتا۔

ارشاد فرمایا کہ کسی بزرگ کے بارے میں ایسا عقیدہ قائم نہ کرنا چاہیئے جو خلاف کتاب وسُنّت ہو سمجھ کر عقیدت کرنی چاہیئے اور سوچنا چاہیئے کہ اولیاء کے حالات لکھنے والا سوائے کرامت اور خرقِ عادات کے اور باتیں کب لکھتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ انبیاء معصوم اور اولیاء محفوظ ہیں ـــ معصوم وہ ہے کہ اس سے باوجود استعدادِ گناہ، گناہ کا سرزد ہونا محال ہو اور محفوظ وہ ہے کہ گناہ اس سے ممکن ہو اگرچہ واقع نہ ہو۔

پہلی صورت مستلزم محال ہے دوسری ممکن غیر واقع۔

ارشاد فرمایا کہ ۱۵ ر شعبان کی رات (شب برات) کو مغرب کے وقت سے لے کر صبح صادق تک تجلیاتِ الٰہی کا نزول آسمانِ دنیا پر ہوتا ہے اگر ہو سکے تو تمام رات ورنہ اکثر حصۂ شب میں عبادت کرے۔

ارشاد فرمایا کہ فن ریاضی میں مولوی رفیع الدین (دہلوی) سے بہتر (شاید) ہند اور بیرونِ ہند میں کوئی نہ ہوگا۔ اہلِ قصبات کو اس قسم کے فنون سے مناسبت نہیں ہوتی ہاں مولوی عبدالعلی صاحب (بحرالعلوم فرنگی محلیؒ) کو مناسبت و مہارت ہے۔

فرمایا — آج کی رات (شب برات میں) سب مؤمنین کی بخشش ہوگی۔ مگر مشرک، کینہ ور، طوائف، زناکار، والدین کا نافرمان، رشتے داری کو منقطع کرنے والا، ناحق قتل کرنے والا اور متکبر وغیرہ یہ لوگ نہیں بخشے جائیں گے۔

امیر خسروؒ کا یہ شعر پڑھا۔ حضرتِ دہلی کنفِ دین وداد الخ۔ پھر فرمایا — کہ جس وقت امیر خسروؒ نے یہ اشعار دہلی کی تعریف میں کہے ہیں اس زمانے میں دہلی ایسی ہی تھی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت جب کوئی شخص غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین اولیاء) میں داخل ہوتا تھا تو اس کی حالت دگرگوں ہوجاتی تھی۔

فرمایا۔ کہ سید حسن رسول نماؒ میرے جدِّ امجد (حضرت شاہ عبدالرحیمؒ) کے ہم عصر تھے۔ باہم بہت دوستانہ تھا اور آپس میں ہنسی دل لگی کی باتیں بھی ہوتی تھیں چنانچہ ایک دن جدِّ امجد ان کی ملاقات کو گئے وہ قصداً چارپائی پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ تم سمجھے بھی کہ میں چارپائی پر تم سے اونچا ہو کر کیوں بیٹھ گیا، اس لئے بیٹھ گیا کہ تمہارے مُرید مجھ سے ناراض ہوجائیں۔ میرے دادا نے فرمایا کہ میرے مُرید ناراض نہیں ہوں گے اس لئے کہ بلی وغیرہ کی عادت ہوتی ہے کہ بالائے بام چڑھ جاتی ہے اور گھومتی رہتی ہے۔ وہ اس بات کو سُن کر بہت خوش ہوئے۔

(ایک محفل میں) یہ شعر پڑھے۔

یارسول اللہ نمی گویم کہ مہمانِ تو ام   مافقیرے طعمہ خوارِ ریزۂ خوانِ تو ام

برلب افتادہ زباں، گرگیں سگے ام تشنہ جاں آرزومندے نمے از بحرِ احسانِ توام [۱]

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ (بعض) اعمالِ سفلی، قوی التاثیر اور (بعض) اعمالِ علوی ضعیف التاثیر پائے جاتے ہیں اس کا کیا سبب ؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ شرعِ شریف میں اعمالِ سفلی سے جو منع کیا گیا ہے وہ اِس بنا پر ہے کہ اُن سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ اُن کی تاثیر سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ جیسے زہر ہے کہ وہ حرام ہے مگر اس کی تاثیر کی قوت بھی بالکل ظاہر و مُسلّم ہے۔

ایک دن حضرت شاہ صاحب حسبِ دستور چہل قدمی کر رہے تھے (چھوٹے چھوٹے بچّوں نے بھی بڑوں کی دیکھا دیکھی راستے میں حضرت والا سے مصافحہ کیا اس پر) ارشاد فرمایا کہ بچّے بڑوں کو بوقتِ چہل قدمی مصافحہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو خود بھی ایسا ہی کرتے ہیں مقلّد اور محقق کا فرق یہی ہے۔ محقق جو کچھ کرتا ہے سمجھ کر کرتا ہے پھر فرمایا کہ (اچھے کام کی) تقلید بھی اچھی ہے بسا اوقات کام آجاتی ہے۔

فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز شکر بار دہلوی ؒ کے برادرِ کلاں خیالی تخلص کرتے تھے۔ پھر اُن کے چند خلفاء کے نام بیان فرما کر ان کی ایک مشہور غزل پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے :-

اے تیرِ غمت را دلِ عُشّاق نشانہ خلقے بتو مشغول، تو غائب ز میانہ

تراویح پڑھتے وقت زور کی بارش آگئی۔ مگر امام نے قرأت کم نہیں کی۔ لوگ تربتر ہوگئے اِس کو سُن کر ارشاد فرمایا کہ ایسے وقت میں نماز توڑ کر سائبان یا چھت کے نیچے چلا جانا بہتر ہے۔ خصوصًا بعض بیماروں کا خیال کرکے (جو جماعت میں ہوں گے) نیز ایسے وقت میں کم پڑھنا چاہیئے اور سورۂ کوثر (جیسی سورتوں) پر اکتفا کرنا اچھا ہے۔

---

[۱] آقائے نامدار میں یہ نہیں کہتا کہ میں آپ کے دربار میں مہمان بن کر آیا ہوں۔ میں تو آپ کے دسترخوانِ کرم کا ایک ریزہ چیں اور معمولی فقیر ہوں۔ میں ایک ایسا بیمار کُتا ہوں جس کی زبان پیاس کی وجہ سے ہونٹوں پر آگئی ہے۔ میں آپ کے بحرِ احسان سے تھوڑی سی تری کا آرزومند ہوں ۱۲

فرمایا کہ دو واقعے ہمارے سامنے عجیب پیش آئے جن میں سے ایک قاضی سونی پت کا ہے کہ وہ حالتِ روزہ میں حقّہ پیتا تھا اور کہتا تھا کہ دھواں کھینچنا بموافقِ روایت ہدایہ درست ہے کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ اگر خاک وغبار اور دھواں حلق میں چلا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ بہت سے لوگ اس (نادان جاہل) قاضی کا اتباع کرتے تھے۔ میں نے ہر چند اسے سمجھایا کہ بھائی دخل و ادخال (دھواں داخل ہونے اور داخل کرنے میں) بہت بڑا فرق ہے، مگر اس قاضی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ارشاد فرمایا کہ اصل چیز کیفیت و نسبت ہے اس کو حاصل کرنا اور اس میں مشغول رہنا چاہیئے باقی موافقِ استعداد جو کچھ مقدر ہے ظہور میں آئے گا۔

حدیثِ مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو　　　که کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را[1]

ارشاد فرمایا کہ میرے دادا قوتِ نسبت اور کشف کے جامع تھے۔ ایسے جامع اشخاص کم ہوا کرتے ہیں۔ جس کسی میں نسبت قوی ہوتی ہے اس کو کشف کم ہوتا ہے اور جس کو کشف زیادہ ہوتا ہے نسبت کمزور ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ اصل چیز دل کا رنگین ہونا ہے کہ یہی چیز وقتِ مرگ اور بعد مرگ کام آئے گی۔ فقط کشف گوئی دنیا کمانے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ارشاد فرمایا ایک غزل بہت اچھی معلوم ہوئی اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ہر جا کہ کنم خانہ، ہم خانہ ترا یابم　　　آنجا نروم ہرگز کانجا نہ ترا یابم[2]

ارشاد فرمایا۔ تعزیت کے واسطے جانے میں بہت ثواب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعزیت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔

---

[1] تم تو ذوق و شوق کی باتیں کرو اور رازِ دہر کو مت تلاش کرو کیونکہ کسی نے بھی ناخنِ عقل و حکمت سے اس معمّے کی عقدہ کشائی نہیں کی۔

[2] میں جہاں بھی ساکن ہوتا ہوں وہاں تجھے ہم خانہ پاتا ہوں اور میں ایسی جگہ جاتا ہی نہیں جہاں تجھے نہ پاؤں۔

(سحری کے متعلق ایک سوال کے جواب میں منجملہ اور ارشادات کے یہ بھی) فرمایا کہ سحری کھانے کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہے کہ (صبح صادق سے پہلے) بیدار ہو جائے گا اور کم از کم اتنی بات تو ہو گی کہ اس کی عادت کے خلاف ایک عمل ہو جائے گا (بظاہر) مصلحتِ شارع یہ معلوم ہوتی ہے کہ (رمضان میں) کھانے کے وقت تو کھانے نہ دیں اور جو نیند کا اور آرام کا وقت ہے اس میں کھانا کھلائیں (باوجود ضعف کے) اس مضمون کی تقریر اس طرح فرمائی کہ سوال کرنے والے نے اپنے دل میں طے کیا کہ مقتداؤں اور بزرگوں کی سمجھی ہوئی اور فرمائی ہوئی بات پر ہی عمل کرنا چاہیئے۔ ان کی سمجھی ہوئی بات کو چھوڑا نہ جائے بدل وجان قبول کیا جائے اگرچہ بالفعل اس کی حقیقت ذہن نشین نہ بھی ہو۔

ارشاد فرمایا مردم روم وکشمیر بالطبع خوش الحان ہوتے ہیں۔ میرے بچپن کے زمانے میں ایک خطیب رُوم سے (دہلی) آئے تھے ان کے خطبے کو سن کر لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ بعضے (ہمہ تن گوش ہو کر) بیٹھے رہتے تھے، بعضے دل پکڑ لیتے تھے اور جو لوگ بہت ہی سخت دل ہوتے تھے وہ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ اس خطیب کی آواز تیر کی طرح براہِ راست دل تک پہنچتی ہے۔ فرمایا کہ بعض اہلِ قلم نے لکھا ہے کہاں تک صحیح ہے اس کو خدا جانے کہ ایک دن داراشکوہ پسرِ شاہجہاں نے حُفاظِ لاہور کو جمع کیا، صرف ایک محلّے سے پانچ ہزار حافظ نکل کر آئے۔ فرمایا کہ دہلی میں حکیم اور شاعر بہت ہیں۔ پھر فرمایا کہ اس شہر کو شعر سے اور تاریخ سے طبعی مناسبت ہے اور اسی کو علم سمجھتے ہیں۔ تحفہ اثنا عشریہ کے بارے میں فرمایا کہ ایک شخص نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا تھا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اگر اس کی برابر سونا لے کر اس کو بیچا جائے تو بائع کو خسارہ رہے گا۔

ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص داداصاحب (حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے مزار پر جا کر مراقب ہوتا ہے تو نسبت ابوالعلائی کے آثار محسوس کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ داداصاحب نے خلیفہ ابوالقاسمؒ (ابوالعلائی اکبرآبادی) کی بہت کچھ صحبت اٹھائی ہے اور ان سے فوائد حاصل کئے ہیں۔

رمضان المبارک میں افطار کے بعد اور سحری میں پانی (زیادہ) پینے اور معمول کے

مطابق عرق بادیان وغیرہ کا استعمال نہ کرنے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب کے چہرۂ اقدس پر اور آنکھوں پر ورم بہت آگیا تھا اور یہ ورم کچھ دنوں رہا۔ حکماء و احباء جب حالات مزاج دریافت کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ میری صورت دیکھ لو میرا حال نہ دریافت کرو۔ میرا ظاہر حال تو یہ ہے جو تم دیکھ رہے ہو اور میرا باطن اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ایک مُرید نے عرض کیا کہ اس زمانے میں مقامات فنا و بقا میں قوت کیوں نہیں ہے؟ فرمایا کہ۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ ہر زمانے کی ولایت اس زمانے کی سلطنت کے مثل ہوتی ہے۔ ایک شخص بادشاہِ وقت (اکبر شاہ ثانی) کا بھیجا ہُوا آیا۔ اس نے بادشاہ کی طرف سے بعد سلام التماس کیا کہ چونکہ وبا شدّت سے پھیلی ہوئی ہے اس میں کل کو (بغرضِ دُعا) چار گھڑی دن چڑھے جامع مسجد میں آؤں گا۔ حضرت والا بھی تشریف لے آئیں -- پھر اس قاصد نے سوال کیا کہ وبا کے زمانے میں دوسرے شہر کو چلا جانا جائز ہے؟

ارشاد فرمایا۔ منع آیا ہے۔ اس لئے کہ مریض بے تیمار دار رہ جائیں گے اور شکستہ دل ہوں گے -- ارشاد فرمایا کہ قحط وغیرہ مصائب میں ذِمّی کی بیع اور احرارِ مسلم کی بیع کو مُلّا الہداد شارح ہدایہ نے جائز لکھا ہے اور (بعض) علمائے قصباتِ مشرق (علماء اودھ) نے اس کے مطابق فتویٰ بھی دیا ہے۔ چنانچہ میں نے مولوی نظام الدین (فرنگی محلی رح) کے دستخط کا فتویٰ خود دیکھا ہے۔ مگر میں اور میرے اکابر اس قول پر فتویٰ نہیں دیتے اور اس بیع کو صحیح نہیں جانتے۔

ایک مُرید نے عرض کیا کہ جس دن کے لئے بادشاہ نے آدمی بھیجا تھا اس دن بادشاہ سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟ میں تو حضرت شاہ غلام علی کے ساتھ تھا (پیچھے رہ گیا) اول تو میں بادشاہ کی سواری اور اس کے تزک و احتشام کا نظارہ (جامع مسجد سے باہر) کرتا رہا اس کے بعد ہر چند چاہا کہ آپ سے اندر جا کر ملاقات کر لوں مگر (کثرت ہجوم کی وجہ سے) موقع نہ مل سکا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچا تھا کہ بادشاہ بھی پہنچ گئے۔ سلام و مصافحہ ہُوا بادشاہ نے کہا کہ جناب عالی کو بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ کے پاس خاطر اور خلق اللہ کے نفع کے لئے تکلیف اٹھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

پھر میں نے ایک گوشے میں نماز دوگانہ ادا کی اس کے بعد بادشاہ نے مجھے اپنے پاس بلالیا۔ میں نے چاہا کہ تواضع اور معذرت کرکے بادشاہ سے کچھ دور بیٹھوں مگر اس نے اپنے قریب ہی بٹھایا — توبہ، کلمہ اور دُعا کی تلقین کی گئی۔ اس کے بعد شاہ غلام علی کی تعریف کرکے میں نے بادشاہ سے کہا کہ ان کو بھی بلائیے چنانچہ وہ بھی بلائے گئے۔ پھر ہم نے دُعا کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

فرمایا کہ انگریزوں کے شروع زمانہ میں ایک سال بارش رُک گئی (خشک سالی ہوگئی) بادشاہ پیادہ پا عیدگاہ تک گیا اور مجھ کو بھی بلایا (اتفاق ایسا ہوا کہ) عیدگاہ کی طرف جانے کے وقت آسمان پر کچھ بادل تھا بھی اور واپس آنے کے بعد وہ بھی نہ رہا۔ ایک نواب صاحب نے سلام کرکے مجھ سے کہا طلب ابر و باراں کے واسطے تشریف لے گئے تھے یا بارش کے رکوانے کے لئے؟ میں نے جواب دیا کہ وہ بادل جو دکھائی دے رہا تھا ناقص و ناکارہ تھا۔ ایسے بے فائدہ بادل کو ہٹوانے اور کارآمد و نافع بادل کی طلب کے لئے گیا تھا۔ نواب صاحب کہنے لگے کہ جناب کی تقریر کے آگے کون کامیاب ہوسکتا ہے؟ غرضیکہ نواب صاحب نے ایک قسم کا استہزاء کیا تھا (جس کا جواب دے دیا گیا) دوسرے دن بھی (برائے استسقاء عیدگاہ جانا ہوا اور) بارش نہیں ہوئی۔ تیسرے دن گئے تو خوب ابر آیا اور خوب بارش ہوئی چنانچہ تر بتر واپس آیا نواب صاحب نے شرم کے مارے اپنے مکان کا دروازہ بند کرلیا۔ میں نے آواز دی کہ جناب دروازہ تو کھولئے، انہوں نے دروازہ کھولا اور کہا کہ واقعی اچھا بادل آیا اور ناقص چلا گیا ان پر پشیمانی کے آثار تھے۔ انہوں نے معذرت بھی چاہی۔

(بشکریہ الفرقان لکھنو)

کتب خانہ شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ

محمد ایوب قادری

شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ تحصیل ہالا ضلع حیدرآباد میں ایک چھوٹے سے موضع ڈیپر کے قریب، ریلوے لائن سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر نہایت پرفضا مقام پر واقع ہے اور ہنگاموں سے الگ تھلگ اپنی دنیا قائم کئے ہوئے ہے۔ چند حضرات کی مساعی جمیلہ کا مظہر ہے۔

اس کالج کے اخراجات کے لئے مولوی شفیع محمد صاحب نظامانی نے تین سو ایکڑ اراضی عطا کی ہے اور عوام کے مالی تعاون سے چل رہا ہے۔

ہمیں اس کالج کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کالج کے ساتھ ایک میوزیم (عجائب گھر) بھی قائم ہے۔ جس میں مختصر سے پیمانے پر اچھے نوادر جمع کئے گئے ہیں جس سے ہمیں اپنی ثقافت، تاریخ اور قومی ورثے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تصاویر، خطوط، فرامین، نادر خطی کتابیں، سکہ جات، پتھر، اوزار، برتن اور بہت سی نادر چیزیں اس عجائب گھر میں جمع کی گئی ہیں۔

اسی طرح کالج کا کتب خانہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اگرچہ کتب خانہ ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے لیکن اس مختصر سے زمانے میں بھی اس نے جو ترقی کی ہے وہ خاص طور سے

قابلِ اعتنا ہے کتب خانے میں اس وقت تقریباً دس ہزار کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامیات، عقائد، منطق، فلسفہ، مناظرہ، تصوف و اخلاق، تاریخِ اسلام، سوانح، معاشیات، سیاسیات، کتب حوالہ جات، لغت اور قومی تحریکات مثلاً۔ مسلم لیگ، خلافت، خاکسار اور اخوان المسلمین وغیرہ پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتب خانے کے پاس سب سے بڑا ذخیرہ تقریباً چھ ہزار اخبار و رسائل کا ہے جو ابھی تک مزین نہیں ہوا ہے۔ یہ ہماری قومی تاریخ کا بڑا گرانقدر اثاثہ ہے۔ بہت سے اخبار اور رسالے جن کے صرف نام سنتے تھے وہ شاہ ولی اللہ اورینٹیل کالج کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ مجھے اشاعۃ السنہ لاہور (مولوی محمد حسین بٹالوی) کی سخت تلاش تھی کئی سال کے فائل یہاں مل گئے، جن سے بعض بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں۔ اسی طرح ترجمان القرآن کا مکمل فائل موجود ہے۔ ترجمان القرآن کا پہلا شمارہ بھی ہے جو کتابی سائز پر نکلا تھا اور جس کو مولانا ابو محمد مصلح صاحب بانی ادارہ عالم گیر تحریک قرآن مجید نے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے شرکت کر لی اور بعد کو پھر یہ پرچہ کُلی طور سے مولانا مودودی کا ہو گیا۔

کتب خانے میں کم و بیش ڈھائی سو مخطوطات ہیں جو بعض لحاظ سے نہایت نادر ہیں۔ مثلاً ان مخطوطات میں علمائے سندھ کی تصانیف کی بڑی تعداد ہے، اس سے ہمیں سندھ کی علمی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم نے اپنے اس مختصر سے قیام میں مخطوطات کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ اور اس میں سے تقریباً سو مخطوطات کی فہرست درجِ ذیل کر رہے ہیں تاکہ کتب خانے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے اور تحقیقی کام کرنے والوں کو ان نوادر کا علم ہو سکے۔

پروفیسر محمد سلیم صاحب نے اپنا ذخیرہ کتب خانہ کو مستعار دیا ہوا ہے۔

فہرست مخطوطات

۱۔ ڈکشنری انگلش اینڈ سندھی

حکومت بمبئی کی طرف سے چھپی ہے۔ بمبئی ۱۸۴۹ء
انگریزی لفظ پھر سندھی کا لفظ ہندی میں لکھا ہے۔

۲۔ بیان العارفین و تنبیہ الغافلین ۔ از شاہ عبدالکریم۔
انہوں نے سلطان ابراہیم بخاری سے فیض حاصل کیا۔ اور یہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دادا ہیں۔
۱۰۴۳ھ میں ان کا وصال ہوا۔ شروع میں ان کا شجرہ سلسلہ دیا ہے پھر منظوم شجرہ ہے، سادات سے ہیں۔
شاہ عبداللطیف کا قطعہ تاریخ درج ہے (۱۱۶۵ھ)۔ شاہ عبدالکریم کے ملفوظات میں جابجا سندھی اشعار بھی درج ہیں۔ ۱۲۴۱ھ کی کتابت ہے۔
لعل محمد ولد محمد بقا کی ملکیت کا ترجمہ دیا ہوا ہے۔

۳۔ هندستان جي تاريخ ۔ از غلام علي قاضي محمد يحيیٰ جي پٽ ترجمو ڪيو ۔ ۱۸۵۴ء ۔ سنڌ نيوز جي ڇاپي خاني ۾ ڇپيو ۔
جنگ میانی ۱۸۴۳ء کے بعد پہلا سندھی شخص ہے جس نے یہ حال لکھا ہے۔ اعراب لگے ہوئے ہیں موجودہ سندھی زبان سے اس کتاب کی زبان کافی مختلف ہے۔

۴۔ راحة المؤمنین ۔ مخدوم محمد ہاشم کا سندھی نعتیہ قصیدہ (۱۱۳۰ھ)۔
۵۔ شرح قصیدہ بردہ ۔ شرف الدین بوصیری (شرح) نامکمل۔
۶۔ شرح قصیدہ امالی } از اخوند درویزہ پشاوری۔
شرح قصیدہ قادری } از محمد غوث سید حسین لاہوری (اکتوبر ۱۲۴۳ھ)۔
۷۔ احسن الدلائل علیٰ بعض المسائل ۔ از محمد عمر سندھی حنفی بن محمد عبدالغنی۔
۸۔ شرح مراح الارواح
۹۔ اوراد ۔ من تصنیف بہاء الدین زکریا ملتانی ۔ مع کنز العباد فی شرح اوراد۔
تمام شد کتاب کنز العباد بوقت عصر روز جمعہ بتاریخ ۱۸ ، شہر ذی قعدہ ۱۰۶۳ھ
کاتب فقیر غریب محمد مراد ، ولد فتح محمد انصاری ساکن موضع کمال پور۔

۱۰- تحفۃ القلوب و ہدایۃ الارواح - تصنیف محمد عثمان بینوا نقشبندی۔

۱۱- حل الروائح فی شرح تحفۃ النصائح - از محمد یوسف جونپوری -

شرح از محمد . . . . . .

کاتب عبدالرزاق بن تاج محمد ۱۲۹۱ھ -

۱۲- رسالہ در تصوّف -

۱۳- رسالہ غوثیہ -

۱۴- مکتوبات قطب الزماں پیر صاحب روضہ والا -

از دست آخوند ولد عمر قوم کھوکھر ۱۳۰۲ھ -

۱۵- . . . . . . فی علم الحدیث - از کبیر احمد بن ابوالقاسم (۷۷۳ھ)

۱۶- خلاصۃ العارفین

۱۷- شرح نام حق مع نظم سندھی -

۱۸- ظہر الفاح فی علم سلوک - کاتب عبداللہ بن ابراہیم ۹۰۶ھ -

۱۹- دُعائے سریانی - مکتوبہ ۱۰۸۰ھ -

۲۰- بیان فضائل مکہ مکرمہ - از شیخ حسن بصری (   )

۲۱- الحرز الثمین شرح حصن حصین - ملا علی قاری -

۲۲- رسالہ در تصوّف - کاتب ملا صاحب ڈنہ -

۲۳- تحفۃ النصائح - ۷۹۴ھ -

۲۴- دلائل الخیرات

۲۵- گلشن راز

۲۶- مزرع الحسنات شرح دلائل الخیرات - شارح محمد فاضل

بن محمد عارف سفیدونی دہلوی - کاتب تاج محمد ولد . . . (۱۱۸۶ھ) -

۲۷- کتاب حاصل النہج - فارسی

تصنیف مخدوم محمد جعفر بوبکانی رح (۱۲۷۹ھ) محمد جعفر بوبکانی نے کتاب نہج التعلم

لکھا اور اس کا خلاصہ (حاصل النہج) لکھا۔ حاصل النہج مندرجہ فصول پر مشتمل ہے

(۱) فصل اول ۔ درفضل علم ونیت وتحصیل آں۔

(۲) فصل دوم ۔ در معنی علم وفقہ وشرع۔

(۳) فصل سوم ۔ در تقسیم علم۔

(۴) فصل چہارم ۔ دربیان علوم محمودہ ومذمومہ۔

(۵) فصل پنجم ۔ در ترتیب درمیاں علوم محمودہ ومباحثہ۔

(۶) فصل ششم ۔ در اختیار علم وکتاب واستاد، ثبات برآں واختیار شریک درآں۔

(۷) فصل ہفتم ۔ در تعظیم علم واہل آں۔

(۸-۹) فصل ہشتم ونہم ۔ در جدّ ومواظبت در طلب علم۔

(۱۰) فصل دہم ۔ در زمان تحصیل علوم ومکان اشتغال بدان۔

(۱۱) فصل یازدہم ۔ در طریقہ استفادہ علم وشروط حصول واسباب آں۔

(۱۲) فصل دوازدہم ۔ در سیاہی ساختن وکتابت وروایت ومقابلہ کتب وخواندن آں۔

(۱۳) فصل سیزدہم ۔ در آداب استاد وشاگرد۔

(۱۴) فصل چہاردہم ۔ در اسباب حفظ ونسیانِ علم ونقصانِ آں۔

(۱۵) فصل پانزدہم ۔ در علل زیادتی علم وکمال آں۔

(۱۶) فصل شانزدہم ۔ در آنچہ کہ لازم است خواہندۂ رتبہ محدثان کامل ومفسران مسلم را۔

(۱۷) فصل ہفدہم ۔ در انچہ لازم است طالب رتبہ اجتہاد۔

(۱۸) فصل ہشدہم ۔ در بعضے انچہ تعلق بہ استفتاء وافتاء دارد۔

(۱۹) فصل نوزدہم ۔ در مدح علماء با عمل وذم علماء سوء وقضاۃ وعلماء سوء۔

کتابت سنہ ۱۳۷۹ھ از فتح الرسول بن فتح محمد۔

۲۸۔۱ مفتاح الصلوٰۃ ۔ از شیخ ابو حفص عمر کبیر سنہ ۱۰۶۱ھ

کاتب عبدالجلیل متوطن ہالہ کندی (سنہ ۱۱۵۷ھ)

۲۔ المنتخب من الرسالۃ المسماۃ بتجہیز الجنازۃ لفوز السعادۃ

حامد بن کمال الدین البوبکانی سنہ ۱۰۹۹ھ۔

۲۸- درہم الکیس - حامد بن کمال الدین البوبکانی۔

۲۹- ماثبت بالسنۃ - از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

۳۰- عمدۃ الاسلام (فقہ و عقائد) - محمود بن ملا حسین قوم بھوٹہ (سنہ ۱۲۷۴ھ)۔

۳۱- تسہیل الفرائض (تصنیف: علی سنہ ۱۱۶۳ھ)

۳۲- لباس الاحمر - از مخدوم روح اللہ سنہ ۱۲۳۳ھ)

۳۳- کتاب الزمرد فی الطب - عبدالعزیز بن احمد بن حامد - فی بلدہ ملتان فی عہد شاہنواز خاں امیر السند سندھ سنہ ۱۲۲۸ھ۔

۲- اصول الترکیب از نجیب الدین سمرقندی

۱- حرمت مزامیر
۲- تحفۃ الالباب } از مولوی محمد مبارک (سندھی) زمانۂ حال۔
۳- اسلامی رسموں

۳۴- ردالنصارٰی - تصنیف ع۰ اللہ ہالہ کندی سنہ ۱۲۸۰ھ

ترجمہ از قاضی عبدالحکیم ہالائی۔

سیف اللہ المتین علیٰ عنق الرفضۃ والمرتدین - از مولوی عبدالرزاق۔

در ردِّ کواکب السادات فی مناقب السادات - از ہدایت اللہ متعلوی۔

۳۵- ترجمہ پارہ اوّل نظم - در زبان سندھی - ناقص الاول - ترجمہ نہیں دیا ہے۔ قدیم ہے (محمد ہاشم)۔

۳۶- طب غیاثیہ - بتاریخ ہفتدہم شہر ربیع الثانی سن اور جلوس بادشاہ جہاندار شاہ روز سہ شنبہ بخط بندہ امیدوار تفضل بخش بندہ بے ہمتا حکومت رائے ولد مہرچند درج قوم زناردار (ناقص الاول)۔

۳۷- ادویات الہند - از حکیم محمد شریف خاں شاہجہاں آبادی۔
کاتب غلام حسین نظامانی سنہ ۱۲۶۰ھ۔

۳۸- بیاض مرقومہ ۱۲۶۱ھ ، ۱۲۶۲ھ از احمد خاں بھرگڑی

۳۹- بیاض مرقومہ ۱۹۳۴ء عرضی عبدالواسع -

۴۰- شرح پندنامہ عطار - مولوی عبدالرزاق ۱۲۹۰ھ -

۴۱- بدائع منظوم - مصنف علی رضا ہندی ثم بغدادی کاتب عبدالرزاق ۱۲۹۱ھ

۴۲- شرح قران السعدین (۱۲۰۰ھ)

۴۳- گلستان سعدی - کاتب شہاب الدین ولد یار محمد فقیر نوشاہی -

۴۴- انیس انجمن خلاصہ شمع انجمن ۱۱۲۲ھ تصنیف از نظام الدین بن عبدالغفور ساکن دربیلہ سرکار بھکر (کتابت ۱۲۶۸ھ) کاتب لطف اللہ -

باب اول ، درصرف مصادر باب دوم ، در رسمہائے جامد مع ترجمہ سندھی

باب سوم ، در عبارات اعلیٰ واوسط وادنیٰ باب چہارم ، دربیان خطوط شرعیہ

باب پنجم ، در علم سیاق — تاریخی نام گلزار معانی (۱۱۲۲ھ) -

۴۵- مقتل نامہ امیرالمومنین حسن و حسین - کاتب ملا صاحب ڈنہ -

۴۶- شرح یوسف زلیخا - کاتب ملا مبارک ولد مولانا محمود ۱۲۸۶ھ -

۴۷- شرح کریما - مصنفہ مولانا محمد حسین دراوچ - ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۹ھ
کاتب ملا مبارک ۶ شعبان ۱۲۸۵ھ -

۴۸- شرح بوستان - کاتب عبدالرزاق ۱۲۹۳ھ -

۴۹- یوسف زلیخا (جامی) - کاتب عبدالکریم بن جمال الدین کتابت ۱۷ صفر ۱۱۷۰ھ -

۵۰- حملہ حسینی (منظوم) - (کتابت ۱۲ صفر ۱۲۱۷ھ) -

۵۱- لغت ، عربی ، فارسی و ترکی - (ناقص الآخر) -

۵۲- صراح ترجمہ صحاح جوهری (ناقص الآخر) -

۵۳- کتاب الامینیہ (فقہ) - محمد امین بن عبداللہ مومن آبادی (بخارا) -

۵۴- الدرالمختار - محمد علاء الدین الحنفی (امام جامع اموی بدمشق ۱۰۱۷ھ)
کاتب عبدالخالق -

۵۵- دہ مسائل اہل سنۃ (عربی)۔ (۱) تفضیل الشیخین (۲) حب الختنین۔
(۳) والمسح علی الخفین (۴) والصلوٰۃ خاز متن (۵) صلوٰۃ العیدین (۶) صلوٰۃ خلف الامامین
(۷) ترک الخروج عن الامامین (۸) تعظیم القبلتین (۹) رضاء القدرین (۱۰) قبول الشہادتین
۵۶- مفتاح الصلوٰۃ - ازمولوی فتح محمد برہان پوری (ذی الحجہ ۱۰۶۱ھ)۔
کاتب اکبر علی ولد سید محمد ملاح (صفر ۱۲۱۳ھ)۔
۵۷- تجہیز الجنازۃ لفوز السعادۃ - حامد بن کمال الدین بن صلاح الدین بوبکانی ۱۰۹۹ھ۔
۵۸- ذم الغناء المحترمۃ فی مذاہب الائمۃ الاربعۃ - حاجی محمد عیسیٰ۔
۵۹- تمیز الغناء الصحیحۃ عن السماع الممنوعۃ - فضل علی۔
۶۰- فتوای جواز دہل عرس - محمد سعید بن محمد حسن نقشبندی۔
۶۱- منتخب اصباح الاسرار فی منع ضرب الطبل والمزمار
قاضی عبدالغنی بن عمر الکڈہری۔
۶۲- شموس الانوار علی اصباح الاسرار - حاجی ولی محمد
۶۳- نفاس الفرائد - عبدالغنی الکڈہری
۶۴- خلاصۃ الآثار المحمدیۃ والاخبار الاحمدیۃ (عربی) (سیرت، عقائد وفقہ)
۶۵- الدر المنتقی شرح الملتقی (جلد ثانی) کاتب عبدالہادی بن سلیمان پنجورائی
ثم ہالائی ۱۱۷۶ھ۔
۶۶- کتاب فی اخبار الموتیٰ (ناقص الطرفین)۔
۶۷- انتخاب الاحادیث ۶۸- اربعین - محمد بن الجابکی (۱۱۷۸ھ)
۶۹- تحفۃ الفقہ - ازمبارک بن عبدالحق بن نور - کاتب عبدالواحد بن مخدوم عبداللطیف ۱۱۴۴ھ
۷۰- طریقۃ المحمدیۃ (عربی)۔ کاتب . . . ولد ولی محمد ساکن قصبہ ہالہ کنڈی۔
۷۱- نقل بیاض مخدوم محمد روح اللہ - کاتب لعل خان ولد عبدالاول افغان (۱۱۷۸ھ)
۷۲- رسالہ دررد صلوٰۃ احتیاط الظہر - ازمولانا عبدالغفور ہمایونی۔
نوٹ :- مولانا عبیداللہ اهروڈی کے رسالہ کا رد ہے۔

۷۳۔ کتاب الطحاوی۔ (ہر دو جلد)

۷۴۔ بیاض فقہ۔ از مولانا محمد مبارک بھٹو۔ چندو ڈیرو۔

۷۵۔ رسالہ در بیان ایمان و احکام۔ از قاضی قطب الدین محمد بن غیاث الدین علی

۷۶۔ مجموعہ سلطانی۔ محمود غزنوی کے حکم سے علماء نے مرتب کی اور مجموعہ سلطانی نام رکھا گیا۔

۷۷۔ ترجمہ کنز الدقائق (فارسی)۔ از نصر اللہ بن محمد بن جمال الازدی المعروف بالکریانی۔

۷۸۔ المختصر المتلی فی شرح منیۃ المصلی۔ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم۔

۷۹۔ رسائل تسعہ۔

(۱) وسیلۃ الغریب الیٰ جناب الحبیب (فارسی)۔ از مخدوم محمد ہاشم بن عبد الغفور سندھی ٹھٹوی۔

(۲) دفع النصب لتکثر التشہدات فی صلوٰۃ المغرب (عربی)۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی۔

(۳) تحفۃ المرغوبہ فی افضلیۃ الدعاء بعد المکتوبہ۔ مخدوم محمد ہاشم

(۴) رشف الزلال فی تحقیق فی الزوال (فارسی)۔ از مخدوم محمد ہاشم (۱۱۳۳ھ)۔

(۵) رسالہ فی تحریم الدخان۔ محمد حیات سندھی (عربی)۔

(۶) رسالہ استدراک۔ عبد الواحد سیوستانی۔ (در حرمت تمباکو)۔

(۷) رسالہ در بیان کرامت الاولیاء۔ از محمد عابد سندھی۔

(۸) رسالہ فی جواز الاستغاثہ۔ از محمد عابد سندھی۔

(۹) منال الرجاء فی شروط الاستنجاء۔ از محمد عابد سندھی۔ (کاتب عبد القادر عباسی سنہ ۱۳۶۱ھ)

۸۰۔ مجمع الفرائض در علم فرائض۔ جمال الدین بن مسعود۔ (کاتب محمد حسن سنہ ۱۲۷۵ھ)

۸۱۔ شرح سراجیہ۔ سعد الدین تفتازانی۔

کاتب محمد افضل ولد ملا اللہ رکھیو سنہ ۱۲۱۰ھ

۸۲۔ تفصیل عذاب القبر ۸۳۔ رسالہ در احوال برزخ وغیرہ۔

۸۴۔ اسماء صحابہ بدریین۔ از شیخ عبد الحق محدث دہلوی

۸۵۔ رسالہ در علم فرائض (در نثر و نظم)۔ ۸۶۔ رسالہ مناسک الحج

۸۷- عین الفقہ - از یعقوب بن صالح۔

۸۸- الدرجۃ المنیفہ فی الاٰباء الشریفہ - جلال الدین سیوطی

۸۹- شمائل ترمذی - (کتابت ۱۲۳۳ھ)

۹۰- کتاب المستدرک (جلد ثانی) - یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ غازی کے کتب خانہ میں رہی ہے، محمد یار خاں کتابدار کی مہر ہے - بعض اکابر علماء سندھ کی مہریں بھی ثبت ہیں۔

۹۱- مختصر البخاری (قلمی) - کاتب عبدالرشید بن عبدالسلام ساکن ہالہ کنڈی ۱۲۷۶ھ۔

۹۲- الباقیات الصالحات فی ذکر الازواج الطاہرات - مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی۔ تالیف ۱۱۴۷ھ (فارسی) کتابت ۱۳۱۹ھ۔

۹۳- مطالع الانوار بترجمہ الآثار - (سیرت و تاریخ)۔

۹۴- روضۃ الشہداء - از حسین واعظ کاشفی - کاتب شیخ عبدالغفور بن شیخ عبدالقدوس پانی پت - ۱۱۵۷ھ۔

۹۵- معارج النبوۃ - ملا حسین واعظ کاشفی - کتابت ۱۱۳۰ھ در دہلی۔

۹۶- تفسیر مظہری - قاضی ثناء اللہ پانی پتی - کتابت ۱۲۰۲ھ - جلد سادس۔

۹۷- تفسیر قرآن مجید (فارسی) - از سورۃ فاتحہ تا سورہ انعام۔

۹۸- رسالہ تجوید

۹۹- فتویٰ متعلق ادائے ضاد - از مولانا عبدالجلیل پشاوری۔

۱۰۰- کتاب شرح تحفۃ الاحرار (جامی) - محمد رضا ولد محمد اکرم ملتانی ۱۱۷۲ھ۔

۱۰۱- چار گلزار - (قواعد زبان فارسیہ ضروریہ) بہ تحریک مسٹر گوراوزلی - طبع ۱۷۹۵ء

۱۰۲- ترجمہ بھگوت گیتا - شروع کے بڑے حصہ کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے اور آخر کے سو صفحہ سے زائد کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا ہے۔ رسم الخط اردو ہے، جس کو اردو قدیم کی شکل کہہ سکتے ہیں

بھگوت گیتا تہت پورن ماشی تاریخ چہاردہم ماہ محرم ۱۱۹۶ سندھی ماہ پوہ سمیت ۱۸۲۸ بکرما سری کرشن بھگوان جیو کرپا ساگر دیا سروپ آنند روپ کرپال دیال بدستخط

درسال کے داسس بندہ نیازار تسام مول رام ولد آنند رام سرگ باشی صورت تمامیت یافت واقع حویلی سیوستان۔

بھگوت گیتا کا نمونہ

جب پانڈو اُر کیرون مہا بھارتیہ کے جدہ کوں کورکھیتر کوں چلے تب راجا دہراشٹ کہو۔ ہوں بھی جدہ کا کوتک دیکھن کھوں چلوں ہوں۔ جب یہ بات دہراشٹ کہر تب تس کوں سری بیاسس جیو کہیو۔ جو ہی راجا تیرے تو نیتر ناہیں، نیتر بناں کیا دیکھیں گا۔ تب ویراشٹ کہو۔

مشی گن یونیورسٹی امریکہ

میں

مستشرقین کا ستائیسواں عالمی اجتماع

ڈاکٹر قاضی نبی بخش[1]

ڈیڑھ سال قبل، مستشرقین کے ستائیسویں بین الاقوامی اجتماع میں شریک ہونے اور علمی مقالہ پڑھنے کے لئے مجھے مشی گن یونیورسٹی امریکہ کی طرف سے دعوت موصول ہوئی تھی۔ دوسری طرف ۱۹۶۷ء موسم گرما میں مغربی جرمنی کی طرف سے جرمن یونیورسٹیوں میں علمی تحقیق کے لئے بلایا گیا تھا اور میں مغربی جرمنی پہنچ چکا تھا۔ عالمی اجتماع میں جرمنی سے شریک ہونے والے محققوں کے لئے ایک خاص ہوائی جہاز کا انتظام کیا گیا تھا اس لئے مجھے مستشرقین کے اس بین الاقوامی اجتماع کی دعوت قبول کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور میں نے اپنے مقالے کا نام بھی ان کو لکھ کر بھیجا تھا۔ مذکور اجتماع اگست ۱۹۶۷ء کے وسط میں ہونا تھا اور اس وقت میں میونک یونیورسٹی جس کو جرمن میں مئن شین کہتے ہیں ملا صدرا شیرازی کے فلسفہ وجود پر تحقیق کر رہا تھا، اگست کے اوائل میں اطلاع مل گئی کہ ۱۲ر اگست کو فرینکفرٹ شہر سے صبح کو ۱۱ بجے طیارہ اڑان کرے گا۔ ٹھیک ۱۲ر اگست کی صبح کو میونک سے طیارے پر سوار ہوا اور ایک گھنٹے کی اڑان کے بعد فرینکفرٹ شہر

[1] صدر شعبہ فارسی جامعہ سندھ۔

کے مطار پر اتر گیا، دوسرے پروفیسر نہیں پہنچے تھے۔ جیسے جیسے اجتماع کا وقت قریب آتا گیا، سارے جرمنی سے علمی ماہر اور محققین پہنچ گئے، کچھ پروفیسر ڈنمارک، ہالینڈ، ترکی اور دوسرے ملکوں سے بھی آئے تھے۔

کانگریس کی طرف سے ایک خاص طیارے کا انتظام کیا گیا تھا۔ طیارہ فرینکفرٹ (جرمنی)، پاریس (فرانس) ٹوکیو (جاپان) اور جنوبی امریکہ سے مشرقی علوم کے ماہرین کو لے کر آتا تھا۔ مطار پر ڈنمارک کے مشہور پروفیسر بار (جن کی عمر ستر سال سے اوپر تھی) سے ملاقات ہوئی۔ یہ آنجہانی جرمن پروفیسر آن ڈری آس کے شاگرد ہیں اور اس وقت کوپن ہاگین یونیورسٹی کے شعبہ علوم مشرق کے صدر ہیں۔ پروفیسر بار کو اگرچہ عربی، فارسی، ترکی اور دوسری زبانوں پر اچھی دسترس ہے، لیکن موصوف کا خصوصی علمی میدان اوستا اور پہلوی قدیم ایرانی زبانیں ہیں۔ انہوں نے زردشتی مذہب کی پہلوی زبان میں لکھی ہوئی کتاب "نبدھشن" پر کافی تحقیقی کام کیا ہے۔ انہوں نے ترخانی کتبے بھی چھپوائے ہیں۔ فارسی میرا بھی خاص موضوع ہے اور جامعہ سندھ میں فارسی کی تعلیم دیتا ہوں، اس مناسبت سے پروفیسر بار سے میری کافی علمی مجلسیں ہوتی رہیں۔ پھر یہ عجیب اتفاق کہیئے کہ پروفیسر موصوف جرمن کی اسی یونیورسٹی سے پڑھ کر نکلے تھے جس یونیورسٹی کا میں تلمیذ رہا ہوں اور جہاں سے مجھے ڈاکٹری کی سند عطا ہوئی اور یہ تھی "گوٹنگن یونیورسٹی" — یورپ کے دوسرے پروفیسروں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔

یہ طیارہ تقریباً نو گھنٹے اڑان کے بعد ڈی ٹرائٹ شہر کے مطار پر پہنچا۔ اس وقت امریکہ میں شام کے ۵ بجے تھے اور جرمنی میں دس بجے تھے، ہم تو جرمن ٹائم کے عادی تھے، اس لئے مجھے نیند آنے لگی، ڈی ٹرائٹ مطار پر پروفیسر ڈاکٹر سید رضی واسطی سے ملاقات ہوئی، موصوف بھی اسی طیارے میں آئے تھے، میرے سر پر جناح کیپ دیکھ کر مجھے پہچان گئے۔ اور پھر امریکہ کے پورے دو ہفتے کے سفر کے دوران ہم دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ پروفیسر رضی واسطی ہند و پاک تاریخ کے ماہر ہیں اور جامعہ لندن سے فارغ تحصیل ہیں، برصغیر ہند و پاک کے برطانوی دور پر آپ کی ایک تحقیقی تالیف ہے،

جو آکسفورڈ یونیورسٹی والوں نے شائع کی ہے اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی مل سکتی ہے۔

جامعہ مشی گن، آئن آربر (ANN ARBOR) شہر میں واقع ہے اور یہ جامعہ، ممالک متحدہ امریکہ کی بڑی اور قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی ہے، اس یونیورسٹی کا تقریباً ایک سو سال سے علوم مشرقیہ سے تعلق رہا ہے اور وہاں کے کئی شعبے ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ ان میں اکثر شعبے ایسے ہیں جن کا تعلق مشرق قریب کے ادب اور زبانوں سے ہے جن پر عربی اسلام کا اثر غالب ہے۔ اسی طرح عجم میں اسلام پر بھی کافی تحقیقیں ہوئی ہیں اور یہاں کے کتب خانوں میں بھی اسلامی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔

بجز چین روس اور مشرقی یورپ کے کچھ ملکوں کے علاوہ باقی تمام دنیا سے تقریباً سترہ سو عالم اور اساتذہ کانگریس کے عالمی اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے بعض پروفیسر تو اہل وعیال کے ساتھ آئے تھے، اس لئے مہمانوں کی تعداد ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

وہاں ایک جرمن پروفیسر آئلرس (EILERS) سے میری ملاقات ہوئی — پروفیسر موصوف فارسی کے استاد ہیں، ہم نے آپس میں فارسی زبان میں بات چیت کی، پروفیسر کی جرمن عورت تھی، وہ بھی فارسی جانتی تھی۔ پروفیسر آئلرس کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں تو انہوں نے میرے ساتھ بلوچی میں بات کرنا شروع کر دی، میں نے لاعلمی کی معذرت کی اور پھر متاسف ہوا کہ باہر کے لوگوں کو بلوچی آتی ہے اور میں اس سے نابلد ہوں۔ اس اجتماع میں اورینٹیل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر (جو اس وقت نیویارک میں مہمان پروفیسر کی حیثیت میں مقیم تھے) بھی شریک ہوئے تھے، اسی طرح راجشاہی یونیورسٹی سے اسلامی تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد باری نے بھی اجتماع میں شرکت کی۔

مستشرقین کی کانگریس پہلے دن کی افتتاحی مجلس کے بعد مختلف شعبوں میں بٹ

گئی اور مختلف جگہوں میں ایک ہی وقت اساتذہ اور علمی ماہرین نے اپنے اپنے علمی اور تحقیقی مقالے پڑھے۔ مقالوں کے عنوانوں پر جو کتاب شائع ہوئی تھی، اس میں تقریباً پانچ سو مقالات کے عنوانات درج تھے، لیکن بعض پروفیسروں کی عدم شمولیت کی وجہ سے ان کے مقالے پڑھنے سے رہ گئے۔ مختلف شعبے جہاں مقالے پڑھے گئے ان کے نام یہ ہیں :

۱۔ قدیم مشرق قریب ۲۔ مشرق قریب اور اسلامی دُنیا ۳۔ جنوب ایشیا قدیم اور کلاسیکی دور میں ۴۔ جدید جنوب ایشیا ۵۔ جنوب مشرقی ایشیا (برما، تھائی لینڈ، لاؤس، کمبوڈیا، ویٹ نام، فلپائن، ملائیشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا) ۶۔ قدیم چین ۷۔ جدید چین ۸۔ جاپان ۹۔ کوریا ۱۰۔ وسط ایشیا اور التائی علوم۔

مذکورہ شعبوں سے معلوم ہوگا کہ اساتذہ اور ان کے مقالوں کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا !!

اس کانگریس میں جاپانی اور جرمن مستشرقین کی تعداد دوسرے تمام ملکوں کے مستشرقین سے زیادہ تھی، جاپان سے ایک پورا طیارہ بھر کر آیا تھا۔ جاپان کے ایک پروفیسر ازوسی نامی 'ملا صدرا' کے فلسفے پر تحقیق کر رہے تھے، وہ اجتماع میں نہ آسکے۔ انہوں نے قرآنی اخلاق پر ایک کتاب لکھی ہے۔ پاریس سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب آئے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مشرق اور مغرب دونوں میں ایک مانی ہوئی علمی شخصیت ہے۔ انہوں نے سیرت اور حدیث میں کئی تحقیقی کتابیں تالیف کی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر فرینچ زبان میں ایک کتاب تالیف کی ہے جو فرانس میں چھپی ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اسلامی تقویم پر ایک عالمانہ مقالہ پڑھا جس میں علمی، تاریخی اور تشریعی نقطۂ نظر سے بحث کی۔ اور یہ تحریک پیش کی کہ ماہرین اور علماء کے ذریعے علم ہیئت کے اصول کے مطابق جدید آلات کی مدد سے اسلامی تقویم کو باقاعدہ بنایا جائے۔ کانگریس نے اس تحریک کو منظور کر کے اقوام متحدہ کے تعلیمی، اجتماعی

اور ثقافتی ادارہ یونیسکو کی طرف بھیج دیا کہ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

ترکی کے علماء پروفیسر زکی ولیدی طوغان اور پروفیسر عبدالقادر قارہ خان سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔

مختلف علوم پر مقالے نہایت دلچسپ تھے: اسلامی تاریخ، فقہ، فلسفہ، ادب تصوف اور دوسرے موضوعات پر مقالات پڑھے گئے۔ میں نے ایک شعبے میں احمد رومی کی فارسی مثنوی "دقائق الطریق" (تصنیف ۷۲۵ھ) کے مخطوطے پر مقالہ پڑھا۔ ایران شناسوں کی نشست میں شریک ہونے والوں کو میں نے بتایا کہ پاکستان میں ایران اور فارسی زبان پر کیا کام ہو رہا ہے۔ اس کانگریس میں مقالاتی نشست کے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی کتابوں کے مخطوطوں کی نمائش بھی ہوئی تھی، جس میں مشی گن یونیورسٹی کے کئی نادر خطی نسخے موجود تھے، اسلامی ملکوں کے ہنر اور فنوں کی بھی نمائش ہوئی تھی۔ دنیا کے مشہور کتب فروشوں نے اس موقعہ پر اپنی مطبوعہ کتب اور قلمی نسخوں کی نمائش کی تھی، جہاں ۲۵ فیصد کم قیمت پر کتاب خریدی جا سکتی تھی یا آرڈر دیا جا سکتا تھا۔ چینی اور جاپانیوں نے اپنے ہنر اور فنوں کی الگ نمائش کی تھی۔ موسیقی کی محفلیں بھی رکھی گئی تھیں۔ ایک دن شام کو مغربی موسیقی کی مجلس تھی تو دوسرے دن شام کو مشرقی موسیقی کی محفل تھی جہاں انڈونیشیا، ملایشیا، چین اور جاپان کی موسیقی وہاں کے آلات طرب اور لباس کے ساتھ پیش کی گئی۔ امریکہ والوں نے اس کانگریس میں میزبانوں کے لئے رہائش اور طعام کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ اجتماع ایک ہفتہ جاری رہا اس کے بعد ایک ہفتہ کے لئے ہمیں واشنگٹن اور نیویارک لے گئے، جہاں سے ہم بذریعہ طیارہ جرمنی واپس آگئے۔

ترجمہ

تاویل الاحادیث

(ادارہ)

تاویلِ احادیث زکریاؑ، مریمؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام

بی بی حنہ ایک بانجھ عورت تھی اور عمر رسیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے ایک کبوتری کو اپنے بچوں کو دانہ کھلاتے ہوئے دیکھا تو اسے بھی بچے کا اشتیاق ہوا اور رو پڑی۔ پھر اللہ کے حضور میں عاجزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس مشاہدے اور ہمت میں برکت فرمائی اور اس کے بانجھ پن کو ختم کر دیا اور اس کی جوانی کو اس کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اس طرح ہے جیسے اطباء کہا کرتے ہیں کہ حیوانات کو بحالت جفتی دیکھنے سے انسان کی نسلی قوتوں میں جان آجاتی ہے، اور اس طرح ایک نامرد بھی مرد بن جاتا ہے۔ بی بی حنہ نے بھی جب کبوتری کو اپنے بچوں کو دانہ کھلاتے ہوئے دیکھا تو اس کو بچہ یاد آگیا اور اس کی طرف اس کو پورا میلان اور شوق پیدا ہوا (اس کا یہ فائدہ ہوا کہ) اس کے نقصان کی اصلاح ہو گئی۔

پھر اس کے دل میں لڑکے کی رغبت پیدا ہوئی اور اس کی قوت متخیلہ، ارادے کی پختگی اور امید کی درستی نے بچے میں اثر کیا تو وہ برکت والی بی بی مریم ہو گئی جو مرد کا مزاج رکھتی تھی اور وہ بڑے لوگوں کی طرح طاقتور، کامل مزاج، صحیح فطرت اور نظافت کی مالک تھی۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مردوں میں بہت سے لوگ کامل گزرے ہیں۔ حدیث کے آخر تک[1] اور وہ

---

[1] حدیث کا آخری حصہ یہ ہے کہ عورتوں میں سوائے فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم کے کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی فضیلت دوسرے طعام پر۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت کیا ہے۔

مرد عورت تھی یعنی بظاہر وہ عورت تھیں لیکن اس میں مردوں جیسی صفات موجود تھیں۔ یہ اس لئے تھا کہ اس کی ذات میں اللہ کی طرف توجہ اور اس سے امید باندھنے کی صفت پوشیدہ تھی اور اس پر اس کی ہمت مجتمع تھی یہاں تک کہ یہ ہمت اس کی قوت مصورہ میں نفوذ کر گئی تھی۔ جب حنہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اللہ کے حضور میں اپنے شدید غم کا اظہار کیا، کیوں کہ (بیت المقدس میں) اللہ کی عبادت کے لئے صرف لڑکوں کو ہی رکھا جاتا تھا، لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کے لئے حضرت مریم کو قبول کرلیا کیوں کہ وہ برکت والی اور مردانہ وار عورت تھی، خدا نے زکریا علیہ السلام اور (بیت المقدس کے) دوسرے مجاوروں کے دل میں بی بی مریم کو قبول کرنے کی بات الہام فرمائی اگرچہ یہ بات ان کے دستور کے خلاف تھی۔

بی بی مریم پر اللہ تعالیٰ کی عنایتوں میں سے ایک عنایت یہ تھی کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو ہی اس کا کفیل بنا دیا، کیوں کہ وہ نبی، عالم اور بی بی مریم پر شفیق تھے اور ان کی بیوی، حضرت مریم کی خالہ تھیں، اللہ تعالیٰ نے (بیت المقدس کے) خادموں اور عالموں کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ حضرت مریم کو اپنے پاس رکھنے کے سلسلے میں تیر میں قرعہ ڈال کر فیصلہ کریں[1] اور ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس کے نام پر قرعہ نکلے گا اور اس میں حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے حق کے ظہور کی ایک تقریب تھی۔

حضرت مریم پر اللہ کی دوسری عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی نشانیوں کو ظاہر فرمایا اور کسی عنصری سبب کے سوا کلمہ "کن" کہنے سے اس کے لئے میوے پیدا کیے جس طرح جنت میں جنتیوں کے لئے پیدا کرے گا۔ زکریا علیہ السلام، اللہ کے عارف اور مخلوق میں اس کی سنت کو جاننے والے تھے، انہوں نے ان دنوں میں روحانی قوتوں کے عجیب ظہور کو معلوم کیا تھا اور اس کو بھی جان گئے تھے کہ آج تکوین کسی عنصری سبب پر موقوف نہیں ہے جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش کے دنوں میں تھا، تب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بیٹے کے لئے دعا کی کہ وہ زکریا علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین ہو، اس کے علم کو قائم رکھے، لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بلائے، کیوں کہ ان کو اپنے چچازاد بھائیوں سے یہ ڈر تھا کہ وہ اس دنیا کی عزت اور آبرو کو اختیار کریں گے تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ تب حضرت زکریا علیہ السلام نے کمال

---

[1] یہ قصہ قرآن مجید کی سورۃ آل عمران، ۳۷ - ۴۱ آیات میں آیا ہے۔

رغبت سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو قبول فرمایا اور ان کو جوان کر دیا اور اس کی بیوی کی ناسازگی کو دور کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے جو حکیم اور اللہ کی طرف متوجہ رہتے تھے اور عورتوں سے دور رہتے تھے، اس کی یہ وجہ ہے کہ ہر وہ شئے جس کے موجود ہونے میں ارضی اسباب کو کم دخل ہوتا ہے اس میں حیوانی اخلاق کے لحاظ سے ضعف پایا جاتا ہے اور وہ دنیا کے منافع سے محروم ہوتا ہے اگرچہ وہ الٰہی عبادات کے لحاظ سے کتنا ہی برکت والا کیوں نہ ہو۔ حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا زہد اور گمنامی کو دوست رکھنا اور ریاسات سے منہ پھیرنا اور پناہ مانگنا بھی اسی قسم سے ہے کیونکہ انسانی کمالات نفس میں اس قدر ظاہر ہوتے ہیں، جس قدر روح اپنی جبلت کے لحاظ سے ان کے لئے آمادہ ہو۔ کوئی انسان ذکی ہوتا ہے، ان کا کمال حکمت اور علم کی پختگی ہے۔ اور کچھ انسانوں میں عدالت اور سیاست روانی کی استعداد ہوتی ہے تب وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اللہ ان کو حکومت عطا کرتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کے مبشر بیٹے کے ساتھ بیوی کے حاملہ ہونے کی نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ وحی کی کہ تین دن تک کسی سے کوئی بات نہ کریں[۱]۔ یہ اس لئے ہوا کہ جب حق کی عنایت اور ملاء اعلیٰ کی ہمتیں عالم ناسوت میں آتی ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو اس وقت ایک ملکی ہیئت نے اس کے نفس کو گھیر لیا تب وہ کسی مخفی اشارے کے سوا کسی سے بات نہ کر سکے۔

پھر حضرت مریم کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساری و جاری ہونے کے زمانے میں ماہواری کے دن آئے، جب ان سے پاک ہوئیں تو لوگوں سے دور ایک الگ مکان میں غسل کرنے کے لئے گئیں اور پردہ ڈال کر کپڑے اتارے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک کامل خلقت جوان کی صورت میں جبرئیل کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت مریم نے ان کو دیکھا اور وہ خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں[۲]، ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا اور دل سے اللہ کے حضور میں دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے۔ پھر اس کو ایک عجیب حالت پیش آئی

۱؎ یہ قصہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۴ میں ہے۔ ۲؎ یہ قصہ قرآن مجید کی سورۂ مریم کی آیت ۱۶ سے ۲۳ تک آیا ہے۔

طبیعت میں قواۓ نسلیہ کا ہیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت کی) کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے۔ جیسے کبھی کسی کو نظر کرنے سے انزال ہوجاتا ہے اور نفس کو اللہ تعالیٰ سے التجا تھی اور اسی کے ساتھ تمسک تھا یہاں تک کہ وہ غیب سے فائض ہونے والی پاک دامنی کی حالت سے مالا مال ہوگئیں۔ صورتِ انسانیہ کی یہ حالت تھی کہ جبرئیل کے اختلاط سے عنقریب ظاہر ہونے والی تھی۔

جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان سے یہ کہا کہ میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں کہ دے جاؤں تجھ کو ایک ستھرا لڑکا[1] تو حضرت مریم خوش وخورم اور مانوس ہوگئیں اور حضرت جبرئیل نے جب ان کے اس حال کو دیکھا تو ان کے ستر میں پھونک لگادی، اس پھونک سے اس میں تاثر ہوا اور اور وہ منزل ہوگئیں، حضرت مریم کے نطفے میں مرد کے نطفے جیسی قوت تھی، اس لئے وہ حاملہ ہوگئیں۔ اور جو بات سیدہ مریم میں تھی وہ سب اس بچے میں آگئی مثلاً اللہ سے تمسک کرنا، اسی کی طرف التجا کرنا، اور ملکی ہیئت سے خوش وخورم ہونا، کیوں کہ حضرت مریم کی حالت اس کے نفس کی ہر قوتِ مصورہ اور مولدہ تک میں سرایت کرگئی تھی اور بات وہ ہے جو اطباء کہتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اس کو لڑکا پیدا ہو تو جماع کے وقت لڑکے کا تصور کرے۔ حضرت جبرئیل کی پھونک سے اس لڑکے میں عالم مثال کا حکم اور روح کے خواص آگئے تھے، کیونکہ صورت بننے کا سبب وہی تھا اس سے حضرت مسیح کی جبلت میں جبرئیلؑ کے مشابہ ایک راسخ ملکہ پیدا ہوا اور حضرت مسیح کی روح القدس کے ساتھ تائید کا یہی مقصد ہے۔

جب حضرت مریم کے یہاں بچہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نشانیاں ظاہر کیں، ان میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ ملائکہ نے اسے آواز دی کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم کے لڑکے کو کمالات عطا کرے گا اور سیدہ مریم نے اپنے بیٹے کے حالات اور سب کمالات اجمالی طور پر جان لیے۔ لڑکپن، جوانی اور پیری کے۔

(مسلسل)

---

[1] سورۂ مریم، آیت ۱۹۔

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

بنگال میں سلسلہ قادریہ کے چند بزرگ

وفا راشدی

بنگال میں سہروردیہ، چشتیہ، قلندریہ، مداریہ، ادہمیہ (یا خضریہ) نقشبندیہ اور قادریہ، تقریباً تمام سلسلوں کے بزرگانِ دین کا فیضان ہر دور میں جاری و ساری رہا ہے۔ سلسلۂ قادریہ کا چشمۂ فیض برصغیر پاک و ہند میں غوث الاعظم حضرت شیخ محی الدین ابو محمد، عبدالقادر جیلانی (گیلانی) کی ذاتِ بابرکات کی بدولت جاری ہوا۔

بنگال میں حضرت شاہ نعمت اللہ قادری نے سلسلۂ قادریہ کی داغ بیل ڈالی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد زریں میں بنگال میں اس سلسلے کی بڑی ترقی ہوئی۔ حضرت شاہ نعمت اللہ نارنول سے بنگال تشریف لائے تھے اور راج محل میں سکونت اختیار کی تھی۔ آپ کا سن وفات ۱۶۶۴ء مطابق ۱۰۷۵ھ بمقام فیروز آباد، نواح قصبہ گوڑھ ہے۔[1]

---

[1] حضرت شاہ نعمت اللہ کا مفصل حال آئندہ کسی شمارے میں پیش کیا جائے گا۔ (و ـــ ر)

حضرت شاہ نعمت اللہ کے بعد جن اولیائے کرام اور مشائخ عظام نے قادریہ سلسلے کو بنگال میں فروغ دیا ان میں حضرت مولانا سید حافظ احمد انوری توکلی عرف میراں شاہ کا نام نامی اسم گرامی قابلِ ذکر ہے۔ آپ کا تعلق اس خاندان عالی مقام سے تھا جس خاندان کا فیض نہ صرف بنگال بلکہ متحدہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں عام تھا۔ یہ وہ خاندان ہے جس کے سربراہ سلسلہ قادریہ کے مؤسس و بانی حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رحؒ جیسی عظیم المرتبت ہستی اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ حضرت میراں شاہ حضرت غوث الاعظم کے پوتے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا سید عاجل رحؒ اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ تھے۔ جس زمانے میں تاریخ کے جابر و ظالم بادشاہ ہلاکو خان نے دہلی کو تخت و تاراج کیا، بے گناہوں اور مظلوموں کا خون ناحق بہایا، قتل و غارت گری سے جبین انسانیت پر بدنما داغ لگایا، دہلی کا چمن اجڑ گیا، باشندگانِ دہلی اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر متحدہ ہندوستان کے دیگر مختلف مقامات میں جا بسنے پر مجبور ہوئے۔ اسی پُرآشوب دور میں حضرت عبدالقادر جیلانی کے بعض اعزا و اقربا، رفقاء خوشہ چینوں اور مریدوں نے بھی دہلی ترک کر کے کابل، قندھار، پارس، یوپی، بہار اور بنگال میں ہجرت کی لیکن حضرت سید عاجل رحؒ نے سلطان فیروز شاہ کے عہد میں دہلی میں سکونت اختیار کی۔ حضرت سید عاجل رحؒ کے فرزند ارجمند سید احمد نوری نے دہلی میں آنکھیں کھولیں۔

حضرت مولانا سید احمد نوری نے اپنے والدِ محترم حضرت مولانا سید عاجل رحؒ کے زیرِ شفقت و عاطفت تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سب سے پہلے قرآن پاک کا مطالعہ فرمایا اور حافظِ قرآن کا درجہ پایا۔ اس کے بعد مقتدر علمائے دین کے زیرِ تلمذ علم و فضل سے آراستہ ہوئے۔ جب آپ علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور ہوگئے تو آپ نے علم سلوک اور طریقۂ شریعت کے لئے مرشدانِ کامل کی خانقاہوں میں حاضری دی۔ مشق و ریاضت سے علوم ظاہری و باطنی کے اسرار و رموز سے واقف ہوئے۔ آخرکار اس مقام پر پہنچے کہ آپ کو طریقۂ قادریہ کا خرقۂ خلافت عطا ہوا۔

ہلاکو خان کی وفات کے بعد حضرت عاجلؒ دلی سے بغداد واپس چلے گئے اور وہاں یادِ الٰہی میں زندگی کے باقی دن گزار دیئے لیکن اللہ نے ان کے نیک فرزند حضرت سیّد میران شاہ کو سرزمین ہند میں دینی امور کے لئے تعینات کیا۔ شاید اس لئے آپ نے اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ بغداد جانے کے بجائے دلّی ہی میں قیام کرنا مناسب خیال فرمایا۔ شب و روز درس و تدریس، خدمتِ خلق اور عباداتِ الٰہی میں مصروف رہے۔ بادشاہ وقت سلطان رکن الدین فیروز شاہ آپ کے والد حضرت عاجل کے دل سے بڑے معتقد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان کے عظیم فرزند حضرت سید میران شاہ کو دلّی میں رہنے پر اصرار کیا۔ بادشاہ دلّی میں آپ کے قیام کو باعثِ خیر و برکت سمجھتا تھا۔ ایک شب حضرت سید میران شاہ کو خواب میں بشارت ہوئی کہ بنگال جاکر اپنے علم و ریاضت سے اللہ کا نام پھیلاؤ اور دین حق کی خدمت کرو۔ چنانچہ آپ نے دہلی سے بنگال کا رخ کیا، مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد ضلع نواکھالی میں پہنچے۔ کنچن پور نامی گاؤں میں آپ کا آستانہ تھا۔ آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت کی آماجگاہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلہٹ میں حضرت شاہ جلال یمنی سلہٹی المجردؒ اور ڈھاکا میں حضرت شاہ علیؒ جیسے بانئ اسلام کا طوطی بول رہا تھا۔

حضرت میران شاہ نے پہلے پنڈوا میں قیام فرمایا۔ بادشاہ رکن الدین فیروز شاہ نے آپ سے متعلق ایک فرمان جاری کیا جس کی رُو سے آپ بنگال کے جس علاقے، جس حصّے میں چاہتے سکونت اختیار کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ بادشاہ موصوف نے آپ کو کئی بیگھہ زمین بطور جاگیر عطا کردی تاکہ آپ کو ذریعۂ معاش کی کوئی فکر نہ رہے۔ آپ پہلے پنڈوا میں مقیم رہے پھر نواکھالی ضلع کے سونار باغ میں اقامت پذیر ہوئے۔ جہاں حضرت میران شاہ آسودہ ہیں وہ مقام ضلع نواکھالی کے ایک گاؤں کنچن پور سے کوئی دس بارہ میل دور حاجی پور اسٹیشن کے پاس واقع ہے۔ یہ ایک قدیم درگاہ ہے جو آج تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

حضرت سید میران شاہ کے مزار مبارک سے متصل آپ کی بھانجی، محبوبہ بی بی رحؒ

کا مزارِ مقدس ہے۔ مرحومہ محترمہ بھی بڑی نیک، متقی، پرہیزگار اور ولی صفت خاتون تھیں۔ بنگال میں چند خواتین ایسی بھی گزری ہیں جنہوں نے مردوں کی طرح اپنی جان مال سب کچھ اللہ کے لئے نثار کر دیا۔ عبادتِ الٰہی اور اتباعِ رسول کی ناقابلِ فراموش مثال قائم کی۔ ان میں مجوبہ بی بی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ان کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ جب کوئی شخص کوئی مراد لے کر ان کے مقبرے پر حاضری دیتا تو اللہ تعالیٰ اس نیک و برگزیدہ خاتون کے وسیلے سے حاجت مند کی حاجت روائی کرتا اور اس کے ارمان کا دامن گلہائے مراد سے بھر دیتا۔ یہ امر بھی مجوبہ بی بی کے مرتبہ اور شان بزرگی پر دال ہے کہ جب لوگ حضرت میران شاہ کی زیارت کو جاتے ہیں تو پہلے مجوبہ بی بی کے مزار پر عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں۔

سندیپ کے علاقہ اور حضرت سید میران شاہؒ و مجوبہ بی بیؒ کے مزارات کے قریب ہی حضرت میاں صاحب بغدادیؒ کی ابدی آرام گاہ ہے، یہ وہ درویش ہیں جو بارہ اولیائے کرام کے ہمراہ بغداد سے پاک بنگالا میں تشریف لائے تھے۔

حضرت سید احمد معروف بہ "کلا شہید" جو حضرت جلال کے مرید اور درویش کامل تھے نواکھالی اور تری پورہ ضلع میں اسلام کی گراں قدر خدمات انجام دیں، آپ کی عرفیت "کلا شہید" (یعنی جس نے اللہ کے لئے اپنا سر قربان کر دیا) سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے جہادِ اسلام کے دوران جام شہادت نوش فرمایا۔ ضلع نواکھالی کے "ششتو دیا" نام کے ریلوے اسٹیشن سے متصل ششتو دیا نامی ندی کے کنارے پُر فضا مقام پر آپ کا آستانہ تھا۔ اکھاڑا ریلوے اسٹیشن ضلع تری پورہ کے قریب ایک دیہات کھڑم پور میں آپ کی خانقاہ تھی۔

کہتے ہیں کہ وہاں کا راجہ اشاعت اسلام کی وجہ سے ان کا جانی دشمن ہو گیا۔ اس نے آپ کو تبلیغی کاموں سے باز رہنے کی تاکید کی لیکن آپ کا جذبۂ دینی اور تیز ہو گیا جب آپ نے کفر و الحاد کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا تو اس منحوس راجہ نے آپ کو دھوکے سے قتل کروا دیا اور آپ کا سر ندی میں پھینکوا دیا۔ وہاں کے مسلمانوں نے آپ

کے سر مبارک کو ندی سے اٹھا کر سپردِ خاک کیا۔ جب سے آپ پیر کلا شہید مشہور ہوئے۔

حضرت پیر اعظم شاہد بغداد کے رہنے والے تھے۔ آپ کے جدامجد حضرت شاہ جلال کے معتقد اور عقیدت مند تھے۔ مشرقی پاکستان میں حضرت شاہ جلال کی قیادت میں جن بزرگانِ دین نے سب سے زیادہ اسلام کی خدمت انجام دی ان میں آپ کی شخصیت نمایاں ہے۔ آپ کی خدمت کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ آپ نے عام طور پر ان علاقوں کا دورہ کیا اور کفر والحاد کے خلاف جہاد کیا جہاں کفر و شرک، الحاد و بت پرستی کا دور دورہ تھا، جہاں مسلمانوں کا وجود برداشت نہیں کیا جاتا تھا بلکہ انہیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے منجدھار میں حضرت صوفی پیر اعظم نے کشتیٔ اسلام کو پار لگانے کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ نے اپنی روحانی قوت اور حسنِ اخلاق سے رفتہ رفتہ باشندوں کو متاثر کیا۔ وہی ہندو جو مسلمانوں کے سخت حریف تھے نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ مسلمانوں کے دوش بدوش تبلیغی مشن کو بھی فروغ دیا۔ جب آپ نے اس ظلمت کدے کو روشن کدے سے بدل دیا، ایک دینی ماحول، ایک اسلامی فضا پیدا ہوگئی تو آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں کا ایک کھیپ خدمتِ دین میں مصروف ہوگیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ سرزمین بنگالا میں دین الٰہی کی ترویج و ترقی کی بہت گنجائش ہے، لہذا پہلے چاٹگام پھر مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ جہاں جہاں بھی گئے مشعلِ حق روشن کرتے گئے۔ ۸۵ھ ۱ء میں لکھی پور پہنچے۔ لکھی پور تلاطم خیز بحرِ بیکراں میگھنا ندی کے کنارے واقع ہے، یہ وہی میگھنا ندی ہے جس کی حسین تصویر شاعر (عمور اکبر آبادی) نے کس دلکش انداز میں کھینچی ہے ؎

وہ ہمارے میگھنا، پدما کے طغیاں الاماں   جن کی پہنائی سے حیرت میں ہے بحرِ بیکراں

جن کی موجوں سے ازل کا جوش ہے اب تک عیاں   ان کے طوفاں لے چکے سو بار تیرا امتحاں

تجھ پہ جب بپتا پڑی ہے اور گرایا ہے، تو

کارزارِ امتحاں سے سرخ رُو آیا ہے، تو

(سنہرا دیس، مصنفہ وفا راشدی)

اِس ندی کے آس پاس دہشت ناک جنگل، ہُو کا عالم۔ میگھنا کے کنارے گھنے جنگلو

کے آغوش میں ایک کٹیا تھی جو آپ کا آستانہ تھی ۔ یہ مقام دیارب باڑی کے نام سے مشہور تھا ، یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی ، مدرسہ تعمیر کیا ، خود دینی تدریس اور اسلامی تعلیم دیا کرتے ۔ بعد میں اس مدرسے نے بہت ترقی کی ۔ بے شمار طلبار علوم دین و دنیا سے آراستہ ہوئے ۔ آپ کے علم و فضل کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نماز کے بعد آپ جو خطبہ فرماتے اور مدرسوں میں جو تقریریں کرتے وہ نہایت عالمانہ اور فاضلانہ ہوتی تھیں ان سے لوگ فیض یاب ہوتے اور اپنے اپنے دلوں کو منور کرتے ۔ آپ کے خطبے اور تقریریں قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہیں اگر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو اشاعتِ دین کے سلسلے میں بڑی مفید ثابت ہوسکتی ہیں ۔ آپ کی تحریروں میں آپ کے تجربات اور مشاہدات کے بہت سے پہلو بھی نظر آتے ہیں مثلاً یہ کہ تبلیغ دین کے سلسلے میں آپ نے بغداد سے بنگال تک کا جو سفر اختیار کیا اس میں آپ کو کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح کفر و الحاد کی عمارتوں کو ڈھایا گیا ۔ مزید یہ کہ دینی خدمات کس مؤثر طریقے پر انجام دی جاسکتی ہیں اور کتنی آسانی سے عوام کے گمراہ دلوں کو اللہ کی طرف پھیرا جاسکتا ہے ۔

نکولائی میکیاویلی

۱۵۲۷ — ۱۴۶۹ء

ڈبلیو۔ٹی جونز
جناب ممتاز احمد

سیاسی فلسفہ

انسانی فطرت کا تصوّر

سیاسیات کے بارے میں ہر بحث سے پہلے دو سوالوں کا جواب دینا لازمی ہوتا ہے ۔ انسانی فطرت کے امکانات اور اس کی حدود کیا ہیں ؟ ہمارا تصور انسان ہی اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ انسان کس قسم کی حکومت کا مستحق ہے اور کس قسم کی حکومت وہ چلا سکتا ہے ۔ اوپر کے صفحات میں ہم نے 'رینے ساں' کے دور کا تصور انسان وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ 'میکیاویلی' نے اپنی کتب میں کہیں بھی اس تفصیل کے ساتھ انسانی نفسیات پر بحث نہیں کی جس تفصیل کے ساتھ بعد میں مثلاً ہالس نے کی ہے لیکن بعض افراد کے بارے میں جگہ جگہ میکیاویلی نے جو رائے دی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کے اس تصوّر سے متفق تھا جس میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو اجاگر کیا جاتا تھا۔

میکیاویلی نے انسانی فطرت کا جو تصور قائم کیا تھا اس کا ثبوت اس کے ہم عصر، بادشاہ سیزر بورجیا اور دوسرے اطالوی بادشاہوں کی شخصیت میں بھی ملتا ہے جن کے

کردار کا اس نے بغور مطالعہ کیا ہے۔

سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ میکیاؤیلی کے نزدیک انسانی اعمال کا بنیادی محرک کیا ہے؟ — آدمی آخر چاہتا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب نہ صرف اس بات کا فیصلہ کر دے گا کہ ریاست کی کونسی شکل ممکن ہے بلکہ یہ بھی طے ہو جاتے گا کہ کسی بادشاہ کو اپنے آپ کو اقتدار پر برقرار رکھنے کے لئے کس پالیسی پر عمل کرنا چاہیئے۔

آئیڈیل صورت یہ ہے کہ انسان کو اپنے مفادات کا — جو اس کے اعمال کا محرک ہیں — نہایت محتاط، معروضی اور پرسکون طریقے سے جائزہ لینا چاہیئے۔ بجائے اس کے کہ آدمی، جو بھی ضرورت سامنے آجائے، تو اُسے اختیار کر لے اور وقتی اور عارضی مفادات کو اپنے اعمال کی بنیاد بنا لے، اسے چاہیئے کہ نہایت ٹھنڈے طریقے سے پوری صورت حال کا جائزہ لے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ ان حالات میں اس کے لئے کون سی چیز مستقل طور پر مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

لیکن کسی شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان بھی نہیں ہے کہ اس کا بہترین مفاد کیا ہے؟ بیشتر انسان غبی اور کم عقل ہوتے ہیں:

"لوگ اکثر ایک موہوم بہتری کی امید میں دھوکہ کھا جاتے ہیں اور خود اپنے لئے تباہی مول لیتے ہیں ..... دراصل جب تک لوگوں کو اپنے سے اعلیٰ تر افراد کی رہنمائی حاصل نہ ہوگی وہ اس طرح کی خلاف عقل باتیں کرتے ہی رہیں گے. لیکن چونکہ بداطوار اور بگڑی ہوئی جمہوری حکومتوں میں اعلیٰ تر افراد سے بالخصوص زمانۂ امن میں حسد اور حب جاہ کی وجہ سے عموماً نفرت کی جاتی ہے اس لئے ایسے حالات میں ترجیح عوام کی غلط رائے ہی کو حاصل ہو جاتی ہے یا ایسے افراد کی باتیں پسند کی جاتی ہیں جو عوام کی مستقل فلاح و بہبود سے زیادہ ان کی وقتی خوشی کا خیال رکھتے ہیں۔"

مختصر یہ کہ میکیاؤیلی کے نزدیک آدمی مفادات کے تعین میں بھی جذباتیت کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ چیز ایسے اعمال کا باعث بنتی ہے جو خالص خودغرضی اور ذاتی مفادات کے

نقطۂ نظر سے بھی اکثر و بیشتر غلط اور غیر مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اصل میں دو محرکات ہیں جو انسانی طرز عمل کو متعین کرتے ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے ——

"جدت پسندی جو خوش حال اور بدحالی دونوں طرح کے لوگوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ آدمی غربت کی طرح امارت میں بھی زیادہ دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ یہ تبدیلی کی خواہش اور جدت پسندی دراصل ہر اس شخص کے آگے بڑھنے میں محدو معاون ثابت ہوسکتی ہے جو کسی ملک میں کوئی نئی اختراع نکال سکتا ہو۔ اگر وہ شخص غیر ملکی ہے تو لوگ اس کے پیچھے پڑ جائیں گے لیکن اگر وہ ان کا ہم وطن ہے تو لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو جائیں گے، اس کا اثر و رسوخ بڑھے گا اور ہر طرح سے اس کی خاطرداری کی جائے گی۔ اب خواہ اس کا طرز عمل اور چال چلن کیسا ہی کیوں نہ ہو اسے ترقی کے راستے پر جلد آگے بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اب دو بنیادی محرکات اور بھی ہیں جو انسان کے طرز عمل کو متعین کرتے ہیں —— محبت اور خوف، یعنی جس شخص سے عوام محبت کرتے ہیں اس کا بھی اثر و رسوخ اتنا ہی ہوگا جتنا کہ اس شخص کا جس سے کہ عوام خوف کھاتے ہیں۔ گو لوگوں کے دلوں میں، اطاعت اور تابعداری کا داعیہ دوسرے شخص کے لئے زیادہ ہوگا اور پہلے کے لئے کم۔"

ان محرکات کے علاوہ دولت کی محبت، حسد اور حب جاہ بھی طاقتور عوامل ہیں جو انسانی طرز عمل کو متعین کرتے ہیں۔ پھر آدمی آزادی کا بھی خواہش مند ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کا محتاج نہ ہو، اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق بسر کرے اور کوئی دوسرا شخص اس پر پابندی عاید کرنے والا نہ ہو اب چونکہ اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار بنانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دوسروں کو اپنا پابند اور محتاج بنایا جائے، اس لئے غلبہ پانے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ پس فرد اور ریاست کے درمیان کشمکش ناگزیر ہے:

"انسان کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو کوئی اور خواہش اس کے سامنے آجاتی ہے۔ پہلے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کے حملے سے محفوظ رہے

اور پھر جب یہ خواہش پوری ہوجاتی ہے تو وہ دوسروں پر حملہ آور
ہوجاتا ہے۔"

میکیاویلی TITUS LIVIUS کے حوالہ سے اس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ لوگ خوف سے بچنے کے لئے دوسروں کو خوف زدہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جن زخموں سے وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، وہ زخم وہ دوسروں کو لگا دیتے ہیں — گویا دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہے یا ظلم کرو ورنہ مظلوم بنو!

ظاہر ہے کہ میکیاویلی نے انسانی فطرت کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ کوئی خوشگوار تصویر نہیں ہے۔ گو میکیاویلی کا خیال ہے کہ ماضی میں، جس کی طرف اس کی نگاہیں بڑے احترام سے اٹھتی ہیں، ایک عام آدمی میں بھی مضبوطی اور دلیری کے ساتھ ساتھ اعتدال اور توازن کی خصوصیات پائی جاتی تھیں اور اس طرح اس زمانے میں لوگ اپنے اوپر خود حکومت کرنے کے اہل تھے — برعکس اس کے اب لوگ اس حد تک تنزل، پستی اور ذلت کو پہنچ چکے ہیں کہ جمہوریتوں کا قیام ناممکن ہوگیا ہے اور اگر جمہوری حکومتیں قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو زبردست ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا اس دور میں اب ایک ہی حکومت عملاً ممکن ہے اور وہ ہے بادشاہت، جس میں ایک فرد واحد آہنی قوت کے ساتھ حکومت کرے۔ چنانچہ میکیاویلی کے نزدیک اس دور کے لئے مطلق العنانیت ہی مؤثر ترین نظام حکومت تھی:

"امن و امان اور نظم قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ بادشاہت قائم کردی جائے، جہاں لوگوں کی اکثریت اس حد تک بدخصلت ہوچکی ہو کہ قوانین بھی اُن کے سامنے بے بس ہوں، وہاں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ کوئی اعلیٰ تر فرد مکمل اور مطلق اختیارات کے ساتھ ان پر حکومت کرے تاکہ معاشرے کے طاقت ور افراد کی بڑھتی ہوئی خواہشات اور ان کے بگاڑ کو روکا جاسکے۔"

میکیاویلی DISCOURSES میں بار بار اپنے عہد کے لوگوں کی پستی اور زمانۂ قدیم

کے لوگوں کی فضیلت اور اچھائی کے گن گاتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ وقت اور حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ نہایت سخت اقدامات کئے جائیں۔ لیکن جمہوری حکومتوں کے فوائد بھی اُس کے پیش نظر رہتے ہیں۔ ایک مقام پر وہ یونانیوں اور رومیوں کی عظمت اور ترقی کی تعریف کرنے کے بعد کہتا ہے:

"ریاستوں کو عظیم بنانے والی چیز کسی ایک فرد کی خوش حالی نہیں بلکہ عام فلاح و بہبود ہوتی ہے اور یقیناً عام فلاح و بہبود کا خیال سوائے جمہوری حکومتوں کے اور کسی حکومت میں نہیں رکھا جاتا۔"

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ میکیاویلی کو بادشاہت پسند یا شاہ پرست کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اس کے نزدیک فرد واحد کی حکومت بہترین حکومت نہیں برعکس اس کے میکیاویلی عوام کی حکومت کو فرد واحد کی حکومت سے بہتر قرار دیتا ہے:

"عوام کے کردار کو بادشاہوں کے کردار سے کچھ زیادہ الزام نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ جب تک کنٹرول نہ ہوگا دونوں کی غلطی کے مساوی امکانات موجود رہیں گے۔ میں رومی اور دیگر شہنشاہوں اور بادشاہوں کی متعدد مثالیں پیش کر سکتا ہوں جنہوں نے اسی طرح تلوّن مزاجی عدم استقلال اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا ہے جس طرح کہ عوام کے بارے میں سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس بات سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ عوام کی حکومت زیادہ غیر مستحکم، بے اصول اور صبر آزما ہوتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بالکل یہی خصوصیات بادشاہوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان باتوں کا الزام اگر بادشاہ اور عوام دونوں کو دیا جائے، تب تو بات صحیح ہوگی، لیکن بادشاہوں کو اس سے مستثنیٰ کر دینا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اگر عوام کی اپنی حکومت ہو اور وہ قانون کی پابندی کرتے ہوں تو میری رائے میں وہ ایک دانا بادشاہ سے بھی زیادہ زیرک، مصلحت اندیش محتاط اور مستقل مزاج ثابت ہوں گے۔ برعکس اس کے ایک بادشاہ جو کسی قانون کی پابندی اپنے اوپر ضروری نہ سمجھتا ہو، ایسے حالات میں عوام سے بھی

زیادہ متلون مزاج اور ناعاقبت اندیش ثابت ہوگا"

لیکن میکیاویلی کی یہ ساری تعریفیں زمانۂ قدیم کے لوگوں کے لئے ہی ہیں۔ اب اگر قاری یہاں یہ پوچھنا چاہے کہ انسانی فطرت میں یہ غیر معمولی تبدیلی کیونکر آئی تو میکیاویلی کے پاس اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ قدیم کی "نیکی" سے لے کر زمانۂ حال کی "بدی" تک کوئی بڑی تبدیلی واقع ہی نہیں ہوئی۔ میکیاویلی نے جہاں زمانۂ قدیم سے اپنی دوری کی بنا پر اس دور کی نیکیاں بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے وہاں زمانۂ حال سے اپنے قرب کی وجہ سے اس کی برائیوں کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔

میکیاویلی کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے — اور وہ یہ کہ وہ سارا الزام چرچ کو دے دیتا ہے، اس میں شک نہیں کہ میکیاویلی کے زمانے میں اٹلی میں جو حالات پائے جاتے تھے ان کے پیدا کرنے میں چرچ کا بھی ہاتھ تھا۔ لیکن میکیاویلی جب چرچ پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کا مقصد اپنے ہمعصر دور کی برائیوں کا منبع تلاش کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس حملے کا اصل محرک اس کے جدید ذہن کی چرچ دشمنی ہوتی ہے:

"اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ موجودہ کی نسبت زمانۂ قدیم میں لوگ کیوں زیادہ آزادی پسند ہوتے تھے۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ آج کے لوگوں سے زیادہ طاقت ور تھے اور اس کی وجہ اس تعلیمی مواد کا اختلاف ہے جو ان کے اور ہمارے مذاہب پر مشتمل ہے۔ جہاں ہمارا مذہب ہمیں سچائی کی تعلیم دیتا ہے اور زندگی گزارنے کے ایک اچھے طریقے سے آگاہ کرتا ہے وہاں اُس کے اثرات میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم اس دنیا کے اعزازات اور ملکیتوں کو کمتر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں، جب کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انہی چیزوں کو اعلیٰ ترمرتبہ دیتے ہیں، اور اس طرح ان کے کاموں میں قوت اور جوش و خروش کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے ...... علاوہ ازیں دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ہیرو اور معبود نہایت شان و

شوکت کے حامل ہوتے ہیں، مثلاً فوجوں کے کمانڈر اور حکومتوں کے سربراہ، جب کہ ہمارے ہیرو عاجز، مسکین یا ایسے افراد ہوتے ہیں جو عملی آدمی نہیں ہوتے بلکہ غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے مذہب میں سب سے سچی خوشی عاجزی اور مسکنت میں ہے اور دنیا کے بارے میں اس کا رویہ حقارت آمیز ہے، جبکہ دوسرے مذاہب میں سب سے بڑی اچھائی رُوح اور جسمانی طاقت کی شان و شوکت اور ان کو ممکن بنانے والی چیزوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہمارا مذہب ہم سے رُوح کی حفاظت کا مطالبہ بھی کرتا ہے تو صرف اس لئے کہ یہ مزید دکھ اور تکالیف برداشت کرنے کے قابل ہو سکے نہ اس لئے کہ کوئی بڑے کارنامے انجام دے۔۔۔۔۔ میرے خیال میں ان اصولوں نے لوگوں کو کمزور اور ضعیف بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظالموں اور بدکاروں کے سامنے یہ لوگ نہایت آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے افراد کے لئے لوگوں کو دبا کر رکھنا نہایت آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لوگوں کی ایک عظیم اکثریت بہشت کی امید میں ان کے لگائے ہوئے زخم برداشت تو کرے گی، مگر ان زخموں کا انتقام نہ لے سکے گی"

اٹلی اور جمہوریت

میکیاویلی کا خیال تھا کہ اٹلی کے حالات جمہوری حکومت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ میکیاویلی اس صورت حال کا حل اسپین اور فرانس کی مثالوں میں تلاش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان ممالک کے استحکام کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہاں بادشاہت قائم ہے۔ میڈیسی خاندان سے میکیاویلی کی اپیل کی بنیاد یہی دلیل ہے۔ اپنی کتاب " بادشاہ " کے آخری حصے میں وہ کہتا ہے کہ اٹلی ایک ایسے مسیحا کی تلاش میں ہے جو اس کے تن مردہ میں ایک بار پھر زندگی کی روح پھونک دے۔۔ میڈیسی خاندان کو مطلق العنان بننے کی ترغیب دینے میں میکیاویلی کے ذاتی مفادات کو بھی دخل ہو سکتا ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود میکیاویلی کی اپیل میں کچھ اخلاقی عنصر بھی ہے۔ میکیاویلی اپنے مفادات میں بھی مخلص ہے کہ بادشاہ اس کے مجوزہ پروگرام پر عمل

درآمد کا آغاز کرے جو میکیاویلی کی رائے میں صرف میڈیلیسی خاندان ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے اٹلی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔

DISCOURSES میں میکیاویلی کئی جگہ فرد واحد کی حکومت کے نقائص بیان کرتا ہے اور اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ بادشاہ کے ذاتی مفادات عوام کے مفادات سے کبھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتے اور یہ صورت حال ریاست کو ظلم وتشدد کی آماجگاہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے خیال میں عوام کو مجبوری کے طور بادشاہت سے کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچتا سوائے اس بالواسطہ فائدے کے کہ ایک کامیاب بادشاہ امن وامان قائم رکھتا ہے اور اندرونی و بیرونی خطرات سے ملک کو محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن ایسی حکومتوں میں عوام کو تحفظ اور آزادی کی وہ دولت نصیب نہیں ہوسکتی جو قدیم زمانے کے لوگوں کو حاصل تھی۔

جمہوریت پسندی کے باوجود میکیاویلی بادشاہت کے نتائج بد سے نہیں گھبراتا اور یہاں اس کی قنوطیت کی حد کو پہنچی ہوئی حقیقت پسندی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے — پسندیدہ نظام حکومت تو جمہوریت ہی ہے لیکن یہ نظام چونکہ ناقابل عمل ہے، اس لئے ہمیں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے ——— کیوں نہ ہم جیتنے والوں ہی کا ساتھ دیں!

یہاں سے سیاسیات کا علم، میکیاویلی کے لئے، اقتدار کو حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا علم بن جاتا ہے اور ذاتی مفادات ہر چیز پر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کے بعد میکیاویلی کا تمام علمی کارنامہ "فن حکمرانی" کی ایک "ہینڈ بک" (HAND BOOK.) کی شکل میں سامنے آتا ہے جس میں "مقاصد" کی بحث کو غیر متعلق سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میکیاویلی بڑی صاف گوئی سے اپنے اس رویئے کا اظہار کرتا ہے:

"جو شخص کسی ریاست کی حکومت میں اصلاح کا خواہش مند ہے اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس اصلاح کو قبول کر لیں اور اس پر مطمئن رہیں، تو اسے چاہیئے کہ اصلاحات کے باوجود پرانی روایات کی کچھ نشانیاں ضرور

باقی رکھے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ اداروں میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے اگرچہ نئے ادارے پرانے اداروں سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی ایک عظیم اکثریت ظاہری صورتوں کو ہی دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے اور انہی کو حقیقت سمجھ لیتی ہے۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ میکیاویلی کو اس بحث کے دوران اس سوال سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہ کون سا نظام حکومت قابلِ ترجیح ہے۔ وہ تو بس اس قدر بتاتا ہے کہ اگر آپ جمہوریت چاہتے ہیں تو آپ کو یہ اور یہ کام کرنے ہوں گے اور اگر آپ کی خواہش مطلق العنانیت کا قیام ہے تو آپ کو کچھ اور طریقے آزمانے ہوں گے۔ "بادشاہ" کے ایک بڑے حصے میں اور DISCOURSES میں متعدد مقامات پر میکیاویلی کا سارا زورِ قلم اس بات پر ہی صرف ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو برسرِ اقتدار کس طرح رکھ سکتا ہے۔ میکیاویلی کی یہ "فنی" بحث صرف ایک ہی سوال کے گرد گھومتی ہے (یعنی یہ کہ بادشاہ اپنے آپ کو کس طرح برسرِ اقتدار رکھ سکتا ہے)، اسی لئے میکیاویلی کو "ظالم بادشاہوں کا معلم" کہا جانے لگا ہے۔ لیکن اس رائے میں اور اس نقطۂ نظر میں جو ہم اوپر پیش کر چکے ہیں یعنی یہ کہ موجودہ ناگفتہ بہ اور ابتر حالات میں لوگوں کی آزادیوں کے تحفظ کے لئے ایک سخت ہاتھ کی ضرورت ہے، بہت فرق ہے۔ اس فرق کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے میکیاویلی کی ان تحریروں کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے جہاں وہ ظالم اور جابر بادشاہوں کی مذمت کرتا ہے۔ مثلاً کسی ریاست میں حزبِ اختلاف کو دبانے کے فعل کو جواز دینے کے لئے جہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اقدام (ا) ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اپنی حاکمیت کو برقرار رکھنا چاہتا ہو اور (ب) یہ کہ یہ امر خود شہریوں کے مفاد میں بھی ہے، وہاں صرف اتنی بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ بادشاہ اگر اپنا اقتدار برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہیں کرنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ پہلی صورت میں قوت کے استعمال کے لئے کم از کم کوئی اخلاقی جواز پیش کرنے کی تو ضرورت محسوس کی گئی ہے، خواہ اُس کے لئے دی جانے

والی دلیل کتنی غلط ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ دلیل اپنے اندر یہ مضمرات تو رکھتی ہے کہ بڑی اچھائی (امن وامان) کے لئے ایک حد تک برائی (مخالف اقلیت کو دبانے کا فعل) بھی جائز ہے۔ دوسری صورت میں تو اخلاقی جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں قوت کے استعمال کا مشورہ تو دیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی اخلاقی جواز پیش نہیں کیا جاتا ــــ صرف بادشاہ کے ذاتی مفادات کا ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنا بادشاہ کے اپنے مفاد میں ہے۔

کچھ یہی دوہری کیفیت میکیاویلی کی "نیکی" کی تعریف میں بھی سامنے آتی ہے۔ اوپر ہم نے چند اقتباسات نقل کئے ہیں، جن میں میکیاویلی اپنے عہد کے لوگوں کی بداخلاقی اور قدمار کی نیکیوں کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں نیکیوں سے اس کی مراد جرأت، دیانت داری قانون کی تعمیل اور اسی طرح کی دوسری اخلاقی صفات سے تھی، جنہیں عیسوی چرچ نے ختم کر دیا تھا اس کے علاوہ میکیاویلی کے پیش نظر وہ اخلاقی صفات بھی تھیں جو "الہیاتی نیکیاں" کہلاتی ہیں، یعنی ایمان، توکل، محبت وغیرہ،

دوسری طرف جب میکیاویلی اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے کہ قوت بجائے خود ایک مقصد ہے تو اس کا نیکی کے بارے میں بھی تصور بدل جاتا ہے پھر وہ صفات نیکیوں میں شمار ہونے لگتی ہیں، جو بادشاہ کو اس مقصد کے حصول میں مدد دیں۔ مثلاً عیاری، فریب دہی، بے ایمانی، سنگدلی اور بے رحمی یہی وہ صفات ہیں جو بادشاہوں کو ان کے اقتدار کے برقرار رکھنے میں معاون ہوتی ہیں۔

نیکی کے اس تصور کا ماخذ یونانی فکر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کی نظر میں ہر چیز کی نیکی اس کی بنائے افضیلت میں ہے بالفاظ دیگر اس کام میں ہے جو مذکورہ چیز بہتر طور پر انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے یعنی کوئی چیز نیکی کی حامل اس وقت کہلائے گی جب وہ اپنا وظیفۂ اصلی انجام دے رہی ہو۔ مثلاً ایک کلہاڑا اس وقت نیکی کا حامل سمجھا جائے گا جب اس سے درخت کاٹنے کا کام لیا جا رہا ہو کیونکہ اس کی ساخت اسی کام کے لئے موزوں اور مخصوص ہے اور یہ کلہاڑا اس وقت بدی

کا حامل سمجھا جانا چاہیئے جب اسے گڑھا کھودنے کے کام میں استعمال کیا جائے کیونکہ کلہاڑا یہ کام بُرے انداز میں انجام دے گا۔ افلاطون اور ارسطو انسان کا بنیادی وظیفہ عقل کو سمجھتے ہیں اور پھر اس کے مطابق نیکیوں کی ایک فہرست مقرر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نیکیوں کی حامل زندگی وہ ہے جس میں انسان اپنی استعدادِ عقلی کو دوسری کم تر استعدادوں کو نظم و ضبط میں لانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لیکن "جمہوریہ" میں سوفسطائیوں کا نمائندہ تھریسی ماچس ایک دوسرے ہی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد یا وظیفہ کسی بھی دوسرے حیوان سے مختلف نہیں ہے اور دوسرے حیوانات کی طرح اس کا مقصد بھی محض مسرّت اور لذّت کا حصول ہے۔ پس تھریسی ماچس کے نزدیک ان افعال کو نیک کہا جانا چاہیئے جو اس مسرت اور لذّت کے حصول میں مدد دیں اور چونکہ اس کے لئے دوسروں پر بھی غلبہ پانا ضروری ہے اس لئے عیاری اور فریب دہی وغیرہ، جیسا کہ میکیاویلی کے یہاں ہم دیکھ چکے ہیں، اس کے ہاں بھی نیکیوں ہی میں شمار ہوئی ہیں۔ انیسویں صدی میں نطشے بھی انہی نتائج تک پہنچا اس نے ڈارون کے اس نظریے کو اختیار کیا کہ زندگی بقائے اصلح SURVIVAL OF THE FITTEST کی کشمکش سے عبارت ہے، جیسا کہ میکیاویلی بھی اس سے قبل اس خیال کا اظہار کر چکا تھا کہ زندگی مختلف قوتوں کے مسلسل تصادم کا نام ہے۔ عالمگیر پیمانے پر ہونے والے اس مقابلے میں اگر ہمارا مقصد کامیابی حاصل کرنا ہے اور اگر یہ کامیابی دوسروں سے لڑکر اور ان سے آگے بڑھ کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے تو فریب دہی، عیاری اور سنگدلی یقیناً نیکیوں میں شمار ہونی چاہئیں۔ اگر ایک بادشاہ اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ یہ مقصد وعدے پورے کر کے، معاہدوں کا احترام کر کے اور سچ بول کر تو پورا کرنے سے رہا۔ پس جھوٹ بولنا، غدّاری اور بد دیانتی سب کی سب نیکیاں ہیں۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بادشاہ کے لئے بہتر بات کونسی ہے ـــ لوگ اس سے محبّت زیادہ کرتے ہوں یا اس سے ڈرتے زیادہ ہوں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا خوف ہونا بھی ضروری ہے اور اس کے لئے محبت کا ہونا بھی ضروری ہے لیکن دونوں کا یک جا ہونا چونکہ مشکل ہے اس لئے زیادہ محفوظ صورت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا خوف زیادہ ہو اور محبت کم، کیونکہ انسان کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ عموماً ناشکر گذار، مکار اور حیلہ جُو ہوتے ہیں، خطروں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور فوائد کے متمنی رہتے ہیں۔ جب تک آپ انہیں فائدہ پہنچاتے رہیں گے وہ آپ کے ساتھ ہیں، وہ اپنا خون، اپنا مال اپنی جان، حتی کہ اپنی اولاد تک بھی آپ کے حوالے کردیں گے...... لیکن جب ضرورت باقی نہ رہے گی تو وہ بغاوت پر آمادہ ہوجائیں گے۔ اگر کسی بادشاہ نے صرف لوگوں کی باتوں پر اعتبار کرلیا اور کوئی تیاری نہ کی تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ کیونکہ جو دوستی شان وشوکت کی بناء پر حاصل کی جانے کی بجائے محض خریدی جاتی ہے وہ بس خریدی ہوئی ایک شئ ہے جس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی آڑے وقت میں وہ کام آسکتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسے تکلیف پہنچانے میں اتنی جھجک محسوس نہیں کرتا جتنی اس شخص کو نقصان پہنچانے میں محسوس کرتا ہے جس سے وہ خوف کھاتا ہے کیونکہ محبت تو چند اخلاقی ذمہ داریوں کا نام ہے جنہیں آدمی اپنی خودغرضی کی بناء پر جب چاہے گا، توڑ ڈالے گا برعکس اس کے خوف کا اثر لوگوں کے دلوں میں مستقل رہنے والا ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد سزا کی دہشت پر ہے۔"

"بلاشُبہ بادشاہوں کے لئے یہ بات بے حد قابل تعریف ہے کہ وہ لوگوں پر اعتبار کرنے والے ہوں، دیانت دار ہوں اور عیار نہ ہوں۔ ... اس کے باوجود ہمارے دور کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ انہی بادشاہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، جو لوگوں پر اعتبار ذرا کم ہی کیا کرتے تھے بلکہ اپنی مکاری اور عیاری سے خود لوگوں کے ذہنوں میں الجھنیں پیدا کرنے کا موجب بنتے تھے اور ان لوگوں پر غالب آتے تھے جو وفاداری کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ پس آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ لڑنے کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ ہے قانون کی مدد سے لڑنے کا اور دوسرا طاقت کی مدد سے۔ پہلا طریقہ

انسانوں کا ہے اور دوسرا جانوروں کا۔ اب چونکہ پہلا طریقہ اکثر وبیشتر ناکافی ثابت ہوتا ہے اس لئے ہمیں دوسرے طریقے کے استعمال کے لئے بھی ہر وقت تیار رہنا چاہیئے یعنی بادشاہ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ آدمی اور جانور دونوں کو کب اور کیسے استعمال میں لائے"!

"اب جب کہ بادشاہوں نے جانوروں کی طرح کام کرنا طے کر لیا ہے تو اسے جانوروں میں لومڑی اور شیر دونوں کی نقل کرنی ہوگی کیونکہ جہاں شیر دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہاں لومڑی بھی بھیڑیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے قابل نہیں ہوتی۔ پس بادشاہ کو جہاں ایک طرف لومڑی کی طرح ہونا چاہیئے تاکہ وہ دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال کو پہچان سکے وہاں اس کے لئے شیر کی خاصیت کا حامل ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ بھیڑیوں کا مقابلہ کر سکے۔ جو لوگ صرف شیر ہونا پسند کرتے ہیں، وہ اس رمز سے آگاہ معلوم نہیں ہوتے! پس ایک ہوشیار بادشاہ کو لوگوں پر اس وقت ہرگز اعتبار نہ کرنا چاہیئے جبکہ ایسا کرنا اس کے مفادات کے خلاف پڑتا ہو اور جب وہ سبب موجود نہ رہا ہو جس کی بنا، پر وہ لوگوں پر اعتبار کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ اگر لوگ سب کے سب اچھے اور نیک ہوتے تو بلاشبہ یہ اصول صحیح نہ ہوتا لیکن اکثر وبیشتر لوگ چونکہ بُرے ہوتے ہیں اور آپ پر ان کا اعتماد کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس لئے آپ کے لئے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ان پر اعتماد کریں ..... اس لئے موجودہ وقت میں بھی مثالوں کی کمی نہیں ہر شخص اس طرح کی مثالوں سے آگاہ ہے کہ بادشاہوں نے بے وفائی کا مظاہرہ کر کے امن کے معاہدے توڑے اور وعدوں کو پس پشت ڈالا۔ گویا جو بھی جتنے اچھے طریقے سے لومڑی کی مثال پر عمل کر سکا، اتنا ہی کامیاب ثابت ہوا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ بادشاہ اپنے کردار کے اس پہلو کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھے اور ایک کامیاب جعل ساز اور منافق بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ لوگ اس قدر سادہ اور موجودہ صورتِ حال کی تعمیل کرنے والے ہوتے ہیں کہ ایک فریب دینے والے

کو فریب کھانے والوں کی کبھی بھی کمی محسوس نہیں ہوگی۔"

حکمرانی کا فن

اب تک تو ہم ان صفات کا جائزہ لیتے رہے ہیں جو میکیاویلی کے نزدیک بادشاہوں کے اخلاقی ضابطے کا اہم حصّہ ہونی چاہئیں میکیاویلی کے ان نظریات کا اصل ماخذ وہی ہے جو ہابس کا ہے۔ دونوں انسانی فطرت کے تاریک پہلو پر نظر رکھتے ہیں، لیکن جہاں ہابس مجرّد تعمیم کی سطح سے آگے نہیں بڑھتا اور اس ابتدائی مفروضے سے اقتدار اعلیٰ کی صفات اخذ کرنے لگتا ہے، وہاں میکیاویلی ان نظری بحثوں میں الجھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ اس ابتدائی مفروضے کے فوراً بعد یہ دکھانے کے لئے کہ مقتدر اعلیٰ کے لئے انسانی فطرت کے اس علم سے فائدہ اٹھاکر، ان مختلف قوتوں کے حصول کی عملی ترکیب کیا ہے، مخصوص واقعات اور مثالوں کو سامنے لاتا ہے۔ برعکس اس کے ہابس یہ قوتیں مقتدر اعلیٰ کو محض تفویض کر دینے سے آگے نہیں بڑھتا۔

میکیاویلی مطلق العنان بادشاہوں کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کرتا ہے وہ بڑی ہوشیاری سے مرتب کیا گیا ہے۔

۱۔ طاقت کا استعمال

میکیاویلی کی نظر میں یہ اصول بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کا خیال ہے کہ نئی بادشاہتوں میں اِس کا استعمال زیادہ ضروری ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ (ایسے شہروں) پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اس سے زیادہ یقینی طریقہ اور کوئی نہیں ہے کہ انہیں غارت کر دیا جائے۔ جو بادشاہ ایک آزاد ریاست کا حکمران بنتا ہے اور اسے غارت نہیں کرتا، دراصل خود اپنی غارت گری کو دعوت دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی ریاست میں آزادی اور قدیم روایات کا نام لے کر کسی وقت بھی بادشاہ کے خلاف بغاوت کی جاسکتی ہے اور یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی یاد وہاں کے شہریوں کے دلوں سے نہ تو وقت کے گزرنے سے مٹ سکتی ہے اور نہ

ہی کسی فائدے کے لالچ میں آ کر وہ انہیں بھول سکتے ہیں۔ ..... یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جب کسی بادشاہ کا کسی نئی ریاست پر قبضہ ہو جائے تو وہ اپنے تمام تر مظالم کا مظاہرہ شروع میں ایک بار ہی کر دے۔ تاکہ ہر روز ان مظالم کو دہرانے کی ضرورت نہ پڑے اور خود بادشاہ بھی اس قابل ہو سکے کہ اس مظاہرے کے بعد لوگوں کو اپنے ساتھ ملا سکے اور ان کو کچھ فوائد پہنچا کر ان کو جیت سکے۔ جو بادشاہ اپنی بزدلی یا کسی کے غلط مشورے کی وجہ سے، اس کے برعکس عمل کرتا ہے اسے ہر وقت خنجر بدست رہنا ہو گا وہ کبھی اپنی رعایا پر اعتماد نہیں کر سکتا کیونکہ رعایا ہر روز نئے زخم کھا کر اس کی وفادار کیسے رہ سکتی ہے۔ سارے زخم ایک ہی بار لگا دینے چاہئیں۔ بار بار زخم لگانے کی نسبت ایک ہی بار بہت زخم لگا دینے سے تکلیف نسبتاً کم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر رعایا کو فوائد پہنچا پہنچانے مقصود ہوں تو وہ بتدریج اور ایک ایک کر کے پہنچائے جائیں تاکہ لوگ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف لے سکیں اور مستفید ہوں۔"

۲۔ ترغیب تاہم ایک دانا بادشاہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے صرف طاقت کے استعمال پر ہی انحصار نہیں کرتا۔ طویل مدت کی حکمت عملی کی حیثیت سے طاقت ایک انتہائی مہنگا اور ناکافی آلۂ حکومت ہے ..... لوگوں کو پُر امن رکھنے اور انہیں زبردستی خاموش کرنے کے لئے ـــ انہیں کوئی حقیقی اور بامعنی رعایتیں دیئے بغیر ـــ اور بھی کئی طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ 'پروپیگنڈہ' ان میں سے اہم ترین ہتھیار ہے اور پروپیگنڈہ میں بھی اہم چیز وہ ہے جسے آج ہم "مذہب" کہتے ہیں۔ میکیاویلی یہاں رومن بادشاہوں کی مثال دیتا ہے جنہوں نے ملک میں سیاسی وحدت برقرار رکھنے کے لئے اور لوگوں میں قانون کی پابندی اور حکومت کی وفاداری کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے نہایت کامیابی سے ان کے مذہبی جذبات کو استعمال کیا۔ میکیاویلی کے نزدیک یہ سوال غیر ضروری ہے کہ کوئی مذہب سچا بھی ہے یا نہیں،

وہ بادشاہ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتا کہ وہ خود بھی کسی مذہب پر ایمان رکھتا ہو اس کے نزدیک مذہب کی افادیت یہی ہے کہ بادشاہ لوگوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی اطاعت کی ترغیب دے۔ مذہب چونکہ لوگوں کو مطیع، فرماں بردار اور قانون و اخلاق کا پابند بناتا ہے اور ان کو متحد رکھتا ہے، اس لئے اچھا ہے۔ اور بادشاہ کو اس سے حسبِ ضرورت استفادہ کرتے رہنا چاہیئے۔

۳- فوری اقدام

میکیاویلی کے نزدیک کسی بادشاہ کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کام کے کرنے میں تامل کرے اور فوری قدم نہ اٹھا سکے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ چند غلطیوں کے ساتھ کام جلدی ٹھوس اور فیصلہ کن انداز میں کر دیا جائے بہ نسبت اس کے کہ بے یقینی، گومگو اور سوچ بچار میں وقت ضائع کرکے دوسروں کو پہل کرنے کا موقعہ دے دیا جائے۔

۴- مضبوط قومی فوج

ظاہر ہے کہ بادشاہ کسی مضبوط فوج کے بغیر کوئی فیصلہ کن اقدام نہیں کر سکتا۔ میکیاویلی کے نزدیک فوج باقاعدہ طور پر منظم کی جانی چاہیئے اور اسے شہریوں پر مشتمل ہونا چاہیئے نہ کہ کرائے کے سپاہیوں پر، جو دوستوں کے لئے بہادر اور دشمنوں کے لئے بزدل ثابت ہوتے ہیں،

"جب تک آپ جنگ نہیں کرتے، یہ لوگ آپ کے دوست ہیں، جب جنگ چھڑتی ہے تو یہ لوگ بھاگ جاتے ہیں اور منتشر ہو جاتے ہیں"

میکیاویلی اور ہم

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ میکیاویلی اپنے عہد کا بہترین نمائندہ تھا۔ اس کی ٹھنڈی، اور محتاط قنوطیت، اس کی بے باک اور واضح فطرت پرستی، اس کی شدید انفرادیت پسندی اور نتائجیت، قدیم زمانے کے لئے اس کا اظہار پسندیدگی اس کا مذہب اور مافوق الفطرت تصورات کو مسترد کرکے اس دُنیا کی موجود حسی حقیقتوں اور لذتیت پر مبنی نظریۂ اخلاق کو قبول کرنا ــــ ان سب باتوں میں وہ

رینے ساں کی نمائندگی کر رہا ہے ـــــــ اور بڑی حد تک جدید دور کی بھی!

یہ ساری باتیں، ظاہر ہے کہ فکری تاریخ اور ثقافتی مطالعہ کے لئے ناگزیر ہیں، لیکن ان سے یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ نظریۂ سیاسی کی کتابوں میں میکیاویلی پر ایک باب کیوں شامل ہوتا ہے یا زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ، جدید نظریۂ سیاسی کا مطالعہ میکیاویلی سے کیوں شروع ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میکیاویلی صحیح معنوں میں سیاسی فلاسفہ نہ ہوتے ہوئے بھی، جدید نظریۂ سیاسی کا بانی ہے۔ میکیاویلی وہ پہلا شخص تھا جو نہایت فیصلہ کُن انداز میں سیاسی مسائل پر کیتھولک قرونِ وسطیٰ سے قطع تعلق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ریاست ایک فطری اکائی ہے جو فطری قوتوں کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے اور ان کے درمیان برقرار رہتی ہے۔ اب اگر کسی حکمران کو اس کشمکش اور سنگ لانہ مقابلے میں اپنا اور اپنی سیاسی ریاست کا وجود برقرار رکھنا ہے تو اسے اس ساری صورت حال کا فہم حاصل کرنا ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہوگا یہاں میکیاویلی دراصل مارکس اور بعد میں آنیوالے ان مفکرین کے نظریات کے لئے بنیادیں فراہم کر رہا ہے جو سیاست کو مختلف قوتوں کے تصادم اور اس تصادم کو کنٹرول کرنے کے طریقوں کا مطالعہ قرار دیتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ میکیاویلی اور بعد میں آنے والے ان مفکرین میں بہت سے اختلافات بھی ہیں۔ مثلاً میکیاویلی کو ان معاشی عوامل کا کوئی شعور نہ تھا جو مارکس کے نزدیک تمام سیاسی معاشرتی اور فکری تبدیلیوں کا بنیادی محرک ہیں لیکن میکیاویلی اور مارکس دونوں اس بات پر ضرور متفق ہیں کہ خدا کے بنائے ہوئے کسی ایسے منصوبے کا وجود ہرگز نہیں ہے۔ جس کے ساتھ انسان اور کائنات کی مطابقت ضروری ہو۔ یہ بات میکیاویلی کی ان بحثوں میں زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے جہاں وہ اشیاء کی تغیّر پذیری کا ذکر کرتا ہے اور انسانی زندگی میں "بخت و اتفاق" کی کارفرمائی پر زور دیتا ہے ـــ یہ بھی دراصل میکیاویلی کا ایک انداز ہے الوہی منصوبے کی تردید کرنے کا اور اس بات کو ثابت کرنے کا کہ کائنات میں ایک خیر و شر سے بے تعلق، غیر انسانی علّیت کارفرما ہے

اس کے خیال میں "یہ ایک ناقابل تردید اور تاریخی حیثیت سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان بخت و اتفاق کی محض تائید تو کر سکتے ہیں، لیکن اس سے ٹکر نہیں لے سکتے، انسان اس کے منصوبوں کی تکمیل تو کر سکتے ہیں، انہیں شکست نہیں دے سکتے۔"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود دونوں کے نقطۂ نظر میں بنیادی موافقت موجود ہے۔ میکیاویلی کا اپنی بصیرت کی بنا پر یہ کہنا کہ ریاست کو صرف انسانی خواہشات کے حوالے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ نظریہ کہ ایک کامیاب حکمران کے لئے ان خواہشات کو کنٹرول کرنے کا ڈھنگ سیکھنا ضروری ہے، سیاسی فکر میں ایک نئے موڑ کا آغاز اور جدید فکر کی ترقی کی اصل بنیاد ہے۔

میکیاویلی اگرچہ اس موضوع پر کہیں بھی وضاحت سے سامنے نہیں آتا، لیکن یہ بات صاف ہے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ کے تصوّر اور اس سے متعلقہ قومی، جغرافیائی ریاست کے تصور کی تلاش میں سرگرداں وہ ریاست کے جاگیردارانہ تصور کو بالکلیہ مسترد کر دیتا ہے جس میں ریاست چھوٹی چھوٹی کئی نیم خود مختار جاگیروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ میکیاویلی اس کی جگہ مرکزی اقتدار کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس مرکزی اقتدار کا دائرۂ اختیار اس کی جغرافیائی حدود میں موجود ہر ادارے پر محیط ہے۔ میکیاویلی کے بعد آنے والے تمام مفکرین کے ہاں یہ تصوّر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ بوداں اور ہابس، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، بنیادی طور پر اقتدارِ اعلیٰ کی تعریف متعین کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اور لاک اور اس کے بعد آنے والے مفکرین ان مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں جو محولہ بالا تعریف کے تعین سے پیدا ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سیاسیات کا مسئلہ ہی اقتدارِ اعلیٰ کا مسئلہ ہے۔ قدیم نظریہ سیاسی اور جدید نظریہ سیاسی کو الگ کرنے والا کوئی واحد تصوّر ہے تو یہی اقتدارِ اعلیٰ کا تصور ہے جو ایک طرف انتہائی ترقی یافتہ، جدید صنعتی اور سرمایہ دارانہ معاشرے کا بہترین سیاسی پیرایۂ اظہار ہے اور

دوسری طرف اس معاشرے کی بنائے وجود بھی ہے۔

نظریۂ سیاسی کی تاریخ میں میکیاویلی کی اہمیت ایک اور سبب سے بھی ہے۔ میکیاویلی پہلا شخص تھا جس نے POWER - POLITICS کو نہایت واضح طور پر پیش کیا۔ آج سے کوئی سو سال قبل لارڈ گرے نے کہا تھا کہ بڑی ریاستوں کی سیاست کبھی سیاسی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھ سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ لارڈ گرے نے سیاست دانوں کے عمل کے لحاظ سے کوئی انوکھی بات نہیں کہی۔ بس اتنا ہے کہ اس نے دوسروں کی نسبت بات ذرا کھل کر کہہ دی ہے۔ ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق اخلاق پر کیسا ہی مبنی کیوں نہ ہو (اور لارڈ گرے کے دل میں ان اصولوں کی قدر و قیمت کسی سے کم نہیں ہے) لیکن اس بات کی تردید ممکن نہیں کہ ریاستوں کے آپس میں تعلقات میکیاویلی کے بتائے ہوئے طریقوں پر ہی طے پاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ حقیقت پسندی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہے کہ ہم بھی میکیاویلی کی طرح قنوعیت پسند ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا جس شکل میں موجود ہے، اس شکل میں ہمیں پسند نہ ہو لیکن اس کی خرابیوں سے آنکھیں بند کر لینے سے تو اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی!

(ماخوذ از W. T. JONES)

تنقید و تبصرہ

ڈاکٹر ایم۔ایس۔ایچ معصومی

ترکانِ عثمانی جلد اوّل - از ڈاکٹر محمد صابر - استاد تاریخِ اسلام و زبان ترکی - کراچی یونیورسٹی - اپریل ۶۷ء ، جاوید پریس - صفحات ۲۷۲ --- قیمت دس (۱۰) روپے

ڈاکٹر محمد صابر، استاذ تاریخ اسلام و زبانِ ترکی ، کراچی یونیورسٹی نے ترکانِ عثمانی جلد اول میں امیر عثمان غازی (۱۲۹۹ء) سے سلطان یلدرم بایزید خان (۱۴۰۲ء) تک کی تاریخ اردو زبان میں لکھی ہے ، یہ کتاب اپنی نوعیت کی اولین تالیف ہے، اس لئے کہ آج تک اردو زبان میں جتنی کتابیں آلِ عثمان ترکوں کی تاریخ میں لکھی گئی ہیں ، وہ یا تو عربی کتابوں پر مبنی تھیں یا انگریزی یا فرنچ و جرمن کتابوں پر۔ ان زبانوں میں لکھنے والے اپنی اپنی روایات اور اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ، ترکوں کی کہانی اپنی اپنی زبانی لکھتے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صابر نے جہاں اپنی کتاب کے لئے عربی اور یورپین زبانوں کی کتابیں پڑھی ہیں ، ان سے زیادہ انہوں نے خود ترکوں کی کتابوں کو اپنے لئے ماخذ بنایا ہے۔

فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ مغربی مصنفین نے بے جا تنقید و غلط روی سے کام لیا ہے ، اس لئے ان کی تالیفات گمراہ کن ہیں ، عام طور پر جو کتابیں مضمون پر لکھی گئی ہیں

ہیں ان میں سنین کی غلطیاں، ناموں کی غلطیاں بے شمار ہیں، اس لئے حقیقی کاموں کے لئے ان پر بھروسہ کرنا کسی طرح مفید نہیں سمجھا جاسکتا۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مضامین قدیم ترکی مصنفین — احمدی، شکر اللہ، عاشق پاشا زادہ، حسن بن محمود بیاتلی کی تصانیف سے ماخوذ ہیں، ان مستند کتابوں کے علاوہ "ترکی اسلامی انسائکلو پیڈیا" سے جو حال میں مکمل شائع ہوئی ہے بہت سے بیش بہا معلومات لئے گئے ہیں۔ تاریخی واقعات کے لئے جدید ترکی مصنفین کی تحقیقات پر اعتماد کیا گیا ہے۔ یونانی اور ارمنی تصنیفات کے ترکی ترجموں سے بھی معلومات میں اضافہ کیا گیا ہے۔

چونکہ مؤلف زبانِ ترکی سے واقف ہیں۔ اور ترکی قوم کے سولہویں صدی مسیحی کے بڑے شاعر امیر علی شیر نوائی پر مقالہ لکھنے پر استنبول یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کر چکے ہیں اس لئے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اس کتاب میں ترکی ناموں اور ان کے صحیح تلفظ کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے، موصوف کی وہ تقریریں جو کراچی یونیورسٹی میں ترکوں کی تاریخ پڑھانے کو تیاری کی گئی تھیں اس کتاب میں شامل کرلی گئی ہیں — اس طرح یہ کتاب طلباء نیز اساتذہ کے لئے بے حد کارآمد و مفید سمجھی جائے گی۔

برصغیر ہند و پاک کو ترکوں سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے۔ جنگِ عظیم اول سے پیشتر اور بعد میں بھی اس برصغیر کے مسلمانوں کو ترکی سے ہمدردی رہی ہے اور مغلوں کی برادری کے علاوہ اخوت اسلامی کا اثر جانبین پر نہایت گہرا ہے، ان تعلقات پر مستزاد آج حکومتِ پاکستان اور جمہوریہ ترکی کے دوستانہ روابط روزافزوں ہیں، بنا بریں ان کی تاریخ کا مطالعہ ہمارے لئے ناگزیر ہے، اور لائق مؤلف ہر طرح کی تہنیت و تحسین کے لائق ہیں کہ انہوں نے ملک کو قابل احترام ترک بھائیوں کی صحیح تاریخ سے روشناس کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ اس میں کتابت کی بعض غلطیاں پائی جاتی ہیں، امید ہے کہ دوسری طباعت میں دور کر دی جائیں گی۔

اِسلامی تعلیمات (عقائد و مسائل)

از مولانا قاضی سید عبدالحی چن پیر الہاشمی، فیلو اکیڈمی علوم اسلامیہ۔

ناشر جامعہ اسلامیہ بہاولپور • صفحات ۳۴۴ • قیمت چار روپے

مولانا قاضی چن پیر ساکن حویلیاں کی یہ کتاب درحقیقت اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ (جس کی ترقی یافتہ شکل جامعہ اسلامیہ بہاولپور ہے) کی یادگار ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کے روزمرہ مسائل اور عام اسلامی عقائد کو اختلافات سے بچتے ہوئے عام فہم اردو زبان میں واضح طور پر بیان کر دیا جائے۔ اس مختصر اور مفید کتاب کی تالیف لائق تحسین ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم زبان میں عقائد، عبادات، معاملات، آداب و حقوق، تصوف و احسان اور اخلاق و آداب کے مضامین قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ کی روشنی میں اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب جامعہ اسلامیہ کے زیریں درجات میں نصاب کے کام بھی آسکتی ہے نیز ائمہ مساجد کے لئے ضروری روزمرّہ کے مسائل اور دعاؤں کی تعلیم دینے کے لئے راہنما و گائیڈ بک کا کام بسہولت دے سکتی ہے۔

آج کل جب کہ مذہبی علوم کا فقدان ہے اور شرعی امور میں فتویٰ صادر کرنے کی وبا عام ہو چکی ہے اسلامی تعلیمات کی اشاعت قابل صد آفرین ہے کہ ایسی کتاب کی اشاعت درحقیقت حکومتِ پاکستان کے مساعی جمیلہ اور دینی و ملّی نصب العین کی تکمیل و ادائیگی میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوگی۔

"اسلامی تعلیمات" کے نشر و اشاعت پر نہ صرف جامعۂ اسلامیہ بالکل محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان، اور خود حکومتِ پاکستان مستحق تحسین و تہنیت ہے کہ ان کی توجہ اور اہتمام سے یہ کتاب ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اور عام مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے مستند طریقے پر بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

کاغذ و طباعت کی عمدگی کے باوجود کتاب کی قیمت نہایت مناسب رکھی گئی ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly **"AR-RAHIM"**
Hyderabad

ایس۔ ایم۔ رفیق منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد سرور پبلشر نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی جامع صدر سے شایع کیا

جلد نمبر ۵ ماہ جنوری ۱۹۶۸ شمارہ نمبر ۸

بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

ماہنامہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپیہ   فی پرچہ:- پچھتر پیسے

جلد ۵ | ماہ جنوری ۱۹۶۸ء مطابق رمضان ۱۳۸۷ھ | نمبر ۸

فہرست مضامین

شذرات

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کم و بیش اس مضمون کی تین حدیثیں نقل کی ہیں:۔

"جو ہماری نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے، جسے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے۔ اُسے وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے، جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور مسلمانوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہیں، وہی اس پر بھی عائد ہوں گی۔"

امام ابو یوسفؒ اہل سنت والجماعت کے بہت بڑے امام ہیں، اور ان کا زمانہ وہ ہے جب مسلمانوں میں کئی بڑے بڑے فرقے پیدا ہو گئے تھے جمہور مسلمان تو اہل سنت والجماعت تھے ہی، ان کے علاوہ شیعہ، خوارج، معتزلہ، قدریہ اور جبریہ وغیرہ فرقے وجود میں آچکے تھے اور ان میں آپس میں منازعات ہوتے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود امام ابو یوسف نے مسلمان کی تعریف یہ کی۔ جو ہماری نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے۔ امام صاحب کی نقل کردہ ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:۔ جو شخص بھی ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مُسلمان ہے ...

تمام مسلمانوں کو دینِ اسلام کے وسیع دائرے میں متحد و مجتمع کرنے کے لئے ایک مسلمان کی امام ابو یوسف نے جو تعریف کی ہے، اگر اسے بطور ایک اساسی اصول کے مان لیا جائے، تو آج مسلمانوں میں مذہبی فرقوں کی بنیاد پر جو تفرقہ پردازی کی شدت پائی جاتی ہے، وہ بہت حد تک کم ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں سے کہیں زیادہ عیسائیوں میں فرقے ہیں۔ اور اُن کے فرقوں میں ہم مسلمانوں سے کہیں زیادہ اختلافات ہیں۔ اور وہ اختلافات بھی بنیادی نوعیت کے ہیں، لیکن اس کے باوجود عیسائیوں کے دو بڑے فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں یگانگت پیدا کی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا برطانیہ کے پروٹسٹنٹ چرچ کا سب سے بڑا پادری کیتھولک چرچ کے سربراہ پوپ سے ملنے روم گیا تھا۔

عیسائیت کو آج جو کمیونزم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کی وجہ سے عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں میں دو بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، ایک تو وہ آپس کے نظری اور اعتقادی اختلافات کو نسبتاً کم اہم سمجھ کر سب فرقوں کے عیسائیوں کو باہم متحد کرنے کا سوچنے لگ گئے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ کمیونزم ساری عیسائیت کی مخالف ہے اور اگر عیسائیت نے مل کر اس کے سیلاب کو نہ روکا، تو وہ سب عیسائی فرقوں کو بہا کر لے جائے گی۔ اس کی

یلغار سے نہ پروٹسٹنٹ بچیں گے، نہ کیتھولک۔

دوسرے مسیحی پادری دیکھ رہے ہیں کہ کمیونزم کی سب سے زیادہ اور پُراثر اپیل اُن طبقوں سے ہوتی ہے جو غریب اور محروم ہیں۔ اور اس کی یہ اپیل بآسانی ان طبقوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ اور وہ اس کی زد میں بہہ جاتے ہیں۔ اس کا توڑ وہ یہ کر رہے ہیں کہ دینی مذہبی سرگرمیاں صرف گرجوں تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ وہ اپنے ہاں کے غریب اور محروم طبقوں میں جاتے ہیں۔ اور ان کی عام معاشی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے میں مدد کرتے ہیں، یعنی عیسائی چرچ مذہبی مراسم کے ساتھ اپنے لوگوں کی فلاحی خدمات بھی سرانجام دینے کی طرف متوجہ ہے۔

دوسرے اکثر مسلمان ملکوں میں تو مثال کے طور پر قومیت و وطنیت کو ملکی و قومی وحدت و استحکام کی بنیاد بنایا جا رہا ہے اور مسلمانوں کے آپس کے مذہبی فرقوں کے اختلافات کو قومی یک جہتی اور وطنیت کے تحت ختم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ یہاں تک کہ عیسائی عرب اور مسلمان عرب کو عربیت کے رشتے میں پرو کر من کُلّ وجہٍ ایک کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں بہت سے عرب ملکوں نے اپنے عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اشتراکیت (سوشلزم) کو اپنا لیا ہے اسلامی سوشلزم کو نہیں، بلکہ سوشلزم کو، علمی سوشلزم کو۔

ان مسلمان ملکوں کے برعکس اوّل تو پاکستان کی نظریاتی بُنیاد اُس طرح کی قومیت و وطنیت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے، جسے ترکی، ایران اور مصر وغیرہ میں ایک اصول موضوعی کی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستانی قومیت دو عناصر سے مرکب ہے، ایک اسلام اور دوسرا عنصر ملک کا جغرافیائی وجود ہے۔ اب اگر پاکستانی قومیت کو متحد اور مستحکم بنانا ہے۔ ۔۔۔ اور آج کوئی ملک داخلی لحاظ سے متحد و مستحکم ہوئے بغیر ترقی کرنا تو ایک طرف رہا۔ محفوظ و مامون نہیں رہ سکتا، خاص کر پاکستان جیسا ملک جو دنیا کے تین بڑے ملکوں سے گھرا ہوا ہے ۔۔۔ تو ہمیں اپنی مخصوص اسلامی قومیت کی بنیادوں کو مضبوط بنانا ہوگا۔ اور اس کی صرف ایک صورت ہے کہ مسلمان کی وہ تعریف، جس کا اثبات امام ابو یوسف ؒ نے کتاب الخراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث کے ذریعہ کیا ہے، اُسے یہاں کا ہر فرقہ تسلیم کرے، اور اہلِ قبلہ (قبلہ کی طرف رُخ کرنے والے) کی تکفیر کا موجودہ سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس کے حق میں یہاں اتنی مؤثر رائے عامہ پیدا ہو کہ ہماری حکومت اس کو حکماً نافذ کرنے پر مجبور ہو جائے۔

پاکستان میں اگر ایک مسلمان فرقہ دوسروں کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنا اپنا عقیدہ سمجھتا ہے، تو اُس کے بارے میں دین اسلام کا جو حکم ہے وہ تو ہے ہی، لیکن یہ فرقہ پاکستانی وحدت میں رخنہ ڈالنے کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کی اس حرکت سے لامحالہ پاکستان کے استحکام پر زد پڑتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تکفیر بین المسلمین کے خلاف ملک میں ایسی زبردست رائے عامہ کیسے پیدا ہو کہ کسی فرقے یا گروہ کو علی الاعلان جلسوں میں، منبروں سے یا اپنے رسائل میں دوسرے مسلمانوں کو کافر ثابت کرنے اور انہیں اسلام کے دائرہ سے نکالنے کی ہمت نہ پڑے۔ ظاہر ہے یہ اہل علم اور اصحاب قلم کا بھی کام ہے اور ہمارے سمجھ دار علمائے کرام کا بھی، لیکن ایک حد تک، بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہت حد تک یہ ذمہ داری ہماری اسلامی حکومت اور بالخصوص اُس کے ادارے محکمۂ اوقاف کی بھی ہے۔ میرے نزدیک یہ محکمہ صرف مزارات کی دیکھ بھال، مساجد کی نگرانی، ائمہ و خطباء کے تقرر اور اوقاف کے آمد و صرف کے انتظام ہی کے لئے نہیں، بلکہ اسے تکفیر بین المسلمین جیسے مسائل کے خلاف بھی رائے عامہ پیدا کرنے میں پہل کرنی چاہیئے۔ یہ مسئلہ صرف نظری و اعتقادی نہیں، بلکہ اس کی یہاں اجتماعی و ملی حیثیت ہے اور اس اعتبار سے یہ قابلِ دخل اندازیٔ حکومت ہے۔ بے شک ہر شخص اس امر کا مجاز ہے کہ وہ اپنے دل میں کسی دوسرے کے بارے میں جو چاہے خیالات رکھے لیکن جب وہ اس کی عام اشاعت کرے گا خواہ پبلک جلسے میں یا تحریر میں۔ تو وہ لازماً قانون کی زد میں آئے گا۔ تکفیر بین المسلمین پبلک طور پر شاید ہی کسی ملک میں یوں روا رکھی جاتی ہے، جیسے بدقسمتی سے آج کل ہمارے ہاں ہے۔ اُمید ہے اس کے سدِ باب کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کی جائے گی۔

حصولِ آزادی اور قیامِ پاکستان سے قبل برطانوی حکومت بالواسطہ اور براہِ راست بھی یہاں کے لوگوں کی فرقہ وارانہ نزاعات کو ہوا دیتی تھی، کیونکہ یہ چیز اجنبی حکومت کے حق میں جاتی تھی۔ ہماری آپس کی فرقہ آرائیاں سب اُس منحوس دور کی باقیاتِ سیّئہ ہیں، جن کے اب جاری رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مسلمان سب اہل قبلہ ہیں۔ اُن کا خدا بھی ایک، رسول بھی ایک، کتاب بھی ایک، اور سب قبلہ کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے ہیں۔ اس لئے کسی مسلمان فرقے یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پبلک طور پر دوسروں کو کافر اور خارج از اسلام ٹھہرائے، اور صرف خود کو مسلمان منوانے پر زور دے، اور اس کے متعلق علی الاعلان پروپیگنڈہ کرے۔

بے شک فرقوں کے آپس کے اختلافات شروع سے ہیں، اور وہ برابر رہیں گے، لیکن ان اختلافات کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر اور وہ بھی پبلک طور پر، اسے ایک اسلامی حکومت، جس کے وجود اور استحکام کی اساس ہی اسلام ہو، کب تک برداشت کر سکتی ہے۔ (م - س)

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

ملفوظات

(مسلسل)

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

نواب عبدالصمد علی خاں[عہ] کے نام ——— جو حضرت کے مرید تھے، ایک مرید سے مکتوب گرامی تحریر کرایا، کاغذ صاف اور عمدہ نہ تھا اس پر فرمایا ؎

شیشۂ صاف ار نباشد گو سفالِ کہنہ باشش[عہ]
رندِ دُرد آشام با ایں تکلفہا چہ کار

ایک شخص نے ایسے درود کی درخواست کی جس کے پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہو جائے ——— فرمایا کوئی سا بھی درود پڑھو اگر زیارت مقدر ہے تو ضرور ہوگی۔ بارہا تجربہ ہو چکا ہے کہ جو کوئی زیارت کے سلسلے میں زیادہ کوشش کرتا ہے زیادہ دیر

عہ نسخہ خطیہ کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں نواب عبداللہ علی خاں، نام لکھا ہے۔

عہ اگر صاف اور عمدہ گلاس نہیں تو پرانا مٹی کا پیالہ ہی سہی۔ بے تکلف اور آزاد مزاج آدمی کو تکلفات سے کیا تعلق؟

میں کامیاب ہوتا ہے اور جس کے نصیب میں زیارت ہوتی ہے وہ آسانی سے فیض یاب ہو جاتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ میں نجیب خاںؒ (نجیب الدولہ) کی عیادت کو (نجیب آباد) گیا ہوں (وہاں کے بعض دلچسپ واقعات بھی سنائے) پھر فرمایا کہ نجیب الدولہ کے یہاں نوسو۹ عالم رہتے تھے۔ جن کی پانچ روپے سے لے کر پانچ سو روپے تک تنخواہ تھی ــــ تین قاضی ــ حنفی، شافعی اور مالکی مذہب کے موجود تھے، ایک حنبلی قاضی کو بھی بلایا تھا، مگر وہ چلا گیا۔

ارشاد فرمایا کہ سلطان عالمگیرؒ نے میر زاہدؒ کے علم و تشرع کا شہرہ سن کر ان کو ہرات سے بلالیا اور محتسبِ اکبر آباد (آگرہ) بنایا اور اس کے بعد قاضی کابل ــــ اکبر آباد کے زمانۂ قیام میں میر زاہد نے شرح مواقف وغیرہ تین کتابوں کے حواشی لکھے اور شاگرد بھی تیار کئے۔ چنانچہ دادا صاحب یعنی حضرت شاہ عبد الرحیمؒ نے جن کو میر زاہد اخوند کہا کرتے تھے (معقول کی) تمام کتابیں میر زاہد ہی سے پڑھیں اور شریک مسودۂ حواشی بھی رہے ــــ میر زاہد کو فقہ میں کم دخل تھا ایک امیر ان سے شرح وقایہ پڑھنے آتا تھا اُس کو دادا صاحب کی موجودگی کے بغیر سبق نہیں پڑھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میرزا جانؔعہ کی تقریر میری جان ہے اور اخوند کی تقریر جانِ جاں ہے۔

ایک محفل میں تحریر کی معنوی حیثیت سے اقسام بیان فرمائیں۔ پھر فرمایا کہ والد ماجد (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کی تقریر درس وغیرہ میں وجد انگیز ہوتی تھی۔ مولوی احمد اللہعہ نے عرض کیا کہ حضرت والا کی تقریر بھی وجد انگیز ہوتی ہے، عوام و خواص دونوں اس کو سن کر وجد میں آجاتے ہیں ــــ فرمایا کہ جو چیز ناپائدار اور فانی ہے اگر اچھی بھی ہو تو کیا ہوتا ہے پائدار چیز میں خوبی پیدا کرنی چاہیے یعنی نسبت مع اللہ میں قوت پیدا کی جائے۔

ارشاد فرمایا کہ اگرچہ تفسیر (فتح العزیز) بھی اچھی خاصی کتاب ہے لیکن تحفۂ اثنا عشریہ

عہ میر زاہد کے استاد تھے۔

عہ نسخہ مطبوعہ میں نام کی جگہ بیاض ہے، نسخہ قلمی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں احمد اللہ نام درج ہے۔

میں عجیب و غریب تقاریر درج ہوگئی ہیں۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ جدِّ بزرگوار (حضرت شاہ عبدالرحیمؒ) وقتِ رحلت یہ دہرۂ ہندی بار بار پڑھتے تھے ؎

پات[ع] جھڑنتے یوں کہے کاری بن کے رائے
اب کے بچھڑے ناملے دور پڑیں گے جائے

ارشاد فرمایا کہ جب والد ماجدؒ مکۂ معظمہ گئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے ایک چادر والد ماجد کے سر پر ڈالی اور ایک قلم عنایت کیا اور فرمایا کہ یہ میرے نانا کا قلم ہے۔ پھر فرمایا کہ ابھی ٹھہرے رہو میرے چھوٹے بھائی حسینؓ بھی آرہے ہیں۔ حضرت حسینؓ نے وہ قلم اپنے دست مبارک سے تراشش کر والد ماجد کو دیا — اس وقت سے حضرت والد ماجد کا حالِ نسبت اور حال علم تقریباً ہی دوسرا ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس سے پہلے جن لوگوں نے آپ سے استفاضہ کیا تھا وہ آپ کے اندر نسبت سابق بالکل محسوس نہیں کرتے تھے۔ قبرِ شریف میں بھی (بذریعہ مراقبہ) ان سابقہ نسبتوں میں سے کسی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہرچند وہ طریقت کے ہر سلسلے میں قدرتِ تعلیم رکھتے تھے لیکن نسبتِ سنتِ نبوی کا غلبہ ہوگیا تھا۔

جب برادر عزیز القدر، فخر فضلائے زماں مولانا مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کو مرض وفات لاحق ہوا تو حضرت والا ایک دن دوبار عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ اثنار راہ میں ایک مرید نے عرض کیا کہ مولوی رفیع الدین صاحب کی زندگی سے تمام خاندان بلکہ دہلی بلکہ ہندوستان کی زندگی وابستہ ہے خدا ان کو سلامت رکھے۔ یہ سُن کر فرمایا کہ وہ

ع مطبوعہ و قلمی نسخوں میں یہ دوہرہ قریب قریب انہیں الفاظ میں درج ہے۔ اس کے بعض دوہرہ کے بعض الفاظ کا مفہوم بھی معلوم نہ ہوسکا۔ بعض لوگوں کی زبانی پہلا مصرعہ اس طرح سُنا گیا۔ پتا ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑائے۔ بہر صورت خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب پتے ہوا کے جھونکوں سے درخت سے گرتے ہیں تو منتشر ہو جاتے ہیں۔ کوئی کہیں اور کوئی کہیں۔ ایسے ہی موت بھی جدائی کا پیغام لے کر آتی ہے۔

جاہل بھی ہوتے تو مجھے ان کا ایسا ہی درد ہوتا مگر جب کہ وہ ایک عالم کے لئے فیض رساں ہیں تمام عالم کو اُن کا درد ہے۔ پھر فرمایا کہ ہماری زندگی تو برائے نام ہی ہے اس وقت جو کچھ فیض ہے ان ہی کا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ کے نزدیک تمام بندے چھوٹے ہوں یا بڑے یکساں ہیں وہ حیات و رزق کے معاملہ میں غنیٔ مطلق ہیں اُن کو کیا پرواہ اُن کے سامنے کسی کی لیاقت اور قابلیت نہیں چلتی (کوئی لائق و فاضل ہوا کرے)۔

شاہ رفیع الدینؒ کی رحلت کے وقت بہت سے لوگ جمع تھے۔ حضرت والا نے حفاظ سے فرمایا کہ وہ تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول رہیں، نیز سورۂ یٰسین پڑھتے رہیں — علماء، بخاری شریف کا ختم کر رہے تھے۔ خود مراقبے میں دوزانو بیٹھے تھے (کچھ وقفے کے بعد) استفسار حال کر لیتے تھے۔ جب کانوں میں یہ خبر پہنچی کہ مولوی رفیع الدین نے اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی تو غمناک ہوئے اور دوسروں کو تسلی دینے کے باہر تشریف لائے۔ قبر کے لئے جگہ تجویز ہوئی (بعد غسل) جنازہ باہر لایا گیا۔ چہرۂ حضرت اقدس پر لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ جنازے کو خود بھی اپنے ہاتھ سے پکڑا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت والا جنازے کے آگے چلیں ارشاد فرمایا کہ میں یہی چاہتا تھا مگر جنازہ اٹھانے والے ہجوم نے سبقت کی، لوگ آگے بڑھ چکے ہیں میں پیچھے رہ گیا ہوں، جو کچھ منظورِ الٰہی ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ میری تمام حالات اضطراری ہیں۔ کوچوں میں پھراتے ہیں پھرتا ہوں، مرضیٔ مولیٰ از ہمہ مولیٰ — اس کے بعد نماز جنازہ ادا کر کے لوگوں کو اذنِ عام دیا کہ جو جانا چاہے چلا جائے، پھر مقبرہ میں گئے۔ لحد تیار کی جا رہی تھی۔ شاہ صاحبؒ جنازے کے قریب اپنے والد ماجد (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کی قبر کے سامنے مراقبے میں بیٹھ گئے — دفن کے بعد لوگوں کو ہٹا کر قبر پر مٹی ڈالی — جب قبر درست ہو گئی تو بغیر چالیس قدم چلے دُعا کر کے اور السلام علیک کہہ کر رخصت ہوئے۔ بے حد غمگین تھے — پہلے زنانے مکان میں تشریف لے گئے پھر مدرسہ میں آئے لوگوں کو رخصت کیا اور تسکین دی — یہ بھی فرمایا کہ میرے مرحوم سے چار رشتے تھے، ایک تو برادرِ حقیقی تھے، دوسرے والد ماجد نے ایک موقع پر یہ فرما کر میرے سپرد کیا تھا کہ یہ تمہارا فرزند ہے، تیسرے میری دایہ کا دودھ انہوں نے پیا تھا۔ چوتھے میرے شاگرد تھے

حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا کہ مرحوم، حضرتِ والا کے مظہرِ علم تھے۔ فرمایا کیا کہوں طاقت گفتار نہیں ہے۔ بس اب سوائے وقتِ درس کے مجھ سے کچھ سوال نہ کرو۔ یہ کہہ کر گریہ طاری ہوگیا۔ جب پسِ جنازہ گریہ کناں جا رہے تھے تو اس وقت بھی لوگوں سے مولانا رفیع الدینؒ کے حالات بیان کرنے سے منع فرما رہے تھے اور فرماتے تھے کہ بس اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھو۔

شاہ رفیع الدینؒ کی وفات کے بعد ایک دن فرمایا کہ ہمارے (حقیقی) بھائیوں کی وفات میں ترتیبِ منعکسہ واقع ہوئی ہے، یعنی سب سے پہلے مولوی عبدالغنی (حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید کے والد ماجد) جو سب سے چھوٹے تھے فوت ہوئے، بعد ازاں مولوی عبدالقادرؒ جو ان سے بڑے تھے، اس کے بعد مولوی رفیع الدینؒ جو ان سے بڑے تھے فوت ہوئے اب میری باری ہے۔ میں سب میں بڑا تھا۔

ایک موقع پر ایک مرید سے دریافت فرمایا کہ تم نے اچھے صاحب (مارہرویؒ) کو دیکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں ڈھاکے سے لے کر دہلی تک اکثر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور ان کے ارشادات و توجہات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے ان میں سے ممتاز اکابر کے چند طبقات بھی میں نے قائم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ احوال بزرگانِ ڈھاکہ نیز حضرت شاہ غلام علیؒ کے بیان کرکے کہا کہ طبقۂ ثانیہ میں شاہ اچھے صاحب[ع۱] کو باعتبارِ علم و عمل، اس فنِ طریقت کا ماہر سمجھتا ہوں۔ دوسرے شاہ نعمت اللہ صاحبؒ[ع۲] (قادری)

ع۱ سید آل احمد عرف اچھے صاحب مارہرویؒ اپنے والد ماجد شاہ حمزہ مارہرویؒ کے مرید و سجادہ نشین اور اپنے وقت کے مشائخ عظام میں سے تھے۔ آپ نے اپنے وصیت نامے میں شریعت کی پابندی کی خاص طور پر تاکید فرمائی ہے۔ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۳۵ھ کو انتقال فرمایا اور مارہرہ میں اپنے اَب وجد کے قریب مدفون ہوئے۔ (انوار العارفین و نزہۃ الخواطر)۔

ع۲ الشیخ العارف الکبیر نعمۃ اللہ بن مجیب اللہ بن ظہور اللہ الہاشمی البھلواروی ۲۸ محرم الحرام ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اکثر کتب درسیہ مولانا وحید الحق پھلوارویؒ سے پڑھیں (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ساکن پھلواری کو بھی ایسا ہی تصور کرتا ہوں۔ پھر تھوڑے تھوڑے حالات ہر مقام کے اکابر کے مع ان کی نسبت اور کیفیت کے بیان کئے۔

ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ عالم کو حافظ پر فضیلت حاصل ہے جس طرح الفاظ کو معانی پر فضیلت ہے۔ لیکن (خواہ مخواہ) کسی کو کسی پر فضیلت دینا کچھ اچھا مشغلہ نہیں ہے۔ بس خدا بہتر جانتا ہے —— میں نے جو عالم کو حافظ سے افضل کہا وہ موافق ظاہر ہے۔ ورنہ حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے یعنی وہ ظلم بھی کرتے ہیں اور قرآن بھی پڑھتے ہیں اور بعضے علماء ہیں کہ جو بے عمل ہیں اُن کے حق میں بھی مذمت آئی ہے۔ پھر فرمایا کہ علم دین، غذا کی مانند ہے اور دیگر علوم مسالے کے مثل ہیں۔

ارشاد فرمایا کہ ایک شخص وجد و رقص کی حالت میں کہہ رہا تھا "عشقبازی مشکل ہے"۔ اس کے قریب ایک ایسا شخص تھا جو فکرِ معاش اور عیالداری میں پھنسا ہوا تھا اس نے بھی وجد کر کے کہنا شروع کیا کہ "کنبہ داری اور عیالداری مشکل ہے"۔

ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی امام لوگوں کے جماعت میں شامل ہونے کی غرض سے قرأت کو کچھ طویل کر دے تو جائز ہے جیسا کہ اس کا عکس یعنی قرأت کو کم کرنا بھی جائز و ثابت ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات میں چاہتا ہوں کہ قرأت کو طویل کروں، مگر کسی عورت کے بچے کے رونے کی آواز میرے کان میں آتی ہے تو قرأت کو کم کر دیتا ہوں۔

ارشاد فرمایا کہ والد ماجدؒ نے مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے اُستاد سے عرض کیا تھا کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا اس کو فراموش کر چکا ہوں مگر ہاں حدیثِ دوست کی برابر تکرار کرتا ہوں اور اسے یاد رکھتا ہوں —— فرمایا کہ والد ماجد عاشقِ جناب رسول اللہ

(گزشتہ صفحہ کا باقی حاشیہ) پھر اپنے والد ماجد سے طریقت کو حاصل کیا اور ان کے جانشین ہوئے۔ بہت سے علماء اور مشائخ نے آپ سے استفادہ کیا۔ آخر ماہ شعبان ۱۱۴۷ھ میں انتقال فرمایا۔ پھلواری میں آپ کا مزار مبارک ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ . . . وہ ۱۴ مہینے حرمین شریفین میں رہے اور وہاں کی سند حاصل کی۔
بعض وقت اُن کے اُستاد فرماتے تھے کہ اس حدیث کے معنی تم بیان کرو۔ اور سندِ اجازت میں لکھا ہے کہ اگرچہ انہوں نے سند مجھ سے حاصل کی ہے لیکن (فہم حدیث میں) مجھ سے بہتر ہیں۔

فرمایا کہ شاہ عالمگیرؒ کے حفظِ قرآن شروع کرنے کی تاریخ ایک مؤرخ نے اس آیت سے نکالی۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ——— پھر تاریخ ختمِ حفظ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ سے نکالی۔

شاہ صاحب کی پہلی محراب سُنانے کی تاریخ کسی نے اس طرح کہی ہے (جو ایک محفل میں خود ہی بیان فرمائی ہوگی)۔

عبدالعزیز آں خلفِ خاندانِ فضل — کز کود کیست لطفِ ازل را با وشمول
درگا ہوارہ بود کہ باشیر، دایہ کرد — انوارِ ایزدی بدلِ روشنش حلول
[1] . . . . — گفتند قدسیاں کہ تراویح تو قبول
۱۱۶۹ھ

ارشاد فرمایا کہ حضرت[2] راجے حامد شہ مانکپوریؒ جو کہ ہمارے پیرانِ عظام میں سے ہیں

---

[1] مطبوعہ وقلمی دونوں نسخوں میں تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ درج نہیں ہے ممکن ہے کہ خود شاہ صاحب کو یہ مصرعہ یاد نہ رہا ہو۔

[2] مانکپور کے خاندانِ سادات گردیزی میں سے تھے ان کا خاندان قدیم سے معزز و مکرم چلا آتا تھا اور اس علاقے کے لوگ اس خاندان کے افراد کو راجے کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ آپ کا حال بھی شروع شروع میں دنیا دارانہ اور سپاہیانہ تھا۔ بالآخر شیخ حسام الدین عمری مانکپوریؒ کی خدمت میں پہنچ، بیعت ہوئے اور مدتوں ان کی صحبت میں رہ کر اُن کے خلیفہ مجاز ہوئے۔ اگرچہ علمِ ظاہری کے لحاظ سے کم علم بلکہ بقولِ صاحب نزہۃ اُمّی تھے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر کشف و شہود کے ابواب کھل گئے تھے۔ بہت سے علماء آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر کامیاب ہوئے۔ اپنے زمانے کے کبارِ مشائخِ چشتیہ میں سے تھے۔ اور اپنی روحانیت کی بنا پر (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اور ہمارا سلسلۂ طریقت اُن تک پہنچتا ہے۔ قریباً ساٹھ سال کا عرصہ ہوتا ہے اُن کے مزار شریف پر ایک درخت (بے ڈھب طریقے پر) اُگ آیا تھا اس وجہ سے قبر کے کھولنے اور اس درخت کی جڑوں اور (لمبی لمبی) نسوں کے نکالنے کی ضرورت پیش آئی۔ مردم شہر مانکپور بلکہ اطراف وجوانب کے آدمی جمع تھے۔ دیکھا گیا کہ حضرتِ مانکپوریؒ کی لاش بالکل سالم ہے اور کفن بھی سفید ہے۔ عجب تر یہ کہ ریش مبارک دراز ہوگئی تھی اور سر کے بالوں میں بھی قوتِ نامیہ کام کر رہی تھی۔ . . اس واقعے کو بہت سے اشخاص نے مجھ سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ محمد نعمان[علہ] صاحب ساکن رائے بریلی جو خاندان سادات قطبیہ کے متقی بزرگ، پیرزادے ہیں وہ بھی اس دیکھنے والے مجمع میں موجود تھے (انہوں نے بچشم خود یہ واقعہ دیکھا ہے اور مجھ سے بیان کیا ہے) راجے حامد شاہؒ کی اولاد میں جو لوگ شیعہ ہوگئے تھے انہوں نے اس کرامت کے معائنے کے بعد ترکِ رفض کیا۔

فرمایا — قرآن شریف کی اس آیت سے کسی صاحب نے بندے کا تاریخی نام نکالا تھا فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ۔

توصیفِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنی شہادت کے وقت چھ ہزار غلام ہتھیار بند رکھتے تھے جو مستعدِ جنگ تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ تم میں سے جو اپنے ہتھیار ڈال دے میں نے اس کو آزاد کیا۔ بعض دیگر صحابہؓ سے بھی جو مقابلے میں جنگ کے لئے آمادہ تھے — فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ کلمہ پڑھنے والوں پر تلوار اُٹھاؤں

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) مرجع خاص وعام بن گئے تھے . . . . . ۲۵ شعبان المعظم ۹۰۱ھ کو شہر مانکپور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (اخبار الاخیار، انوار العارفین، نزہۃ الخواطر جلد ۴) یہ واقعہ جس کو حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان فرمایا انتقال سے ڈھائی سو، پونے تین سو برس بعد پیش آیا — تاریخ آئینۂ اودھ میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے اور مکرمی شہاب الدین فریدی مانکپوری نے بھی شہرت بلدی کے مطابق یہ واقعہ سنایا۔

علہ مولانا سید محمد نعمان، سید محمد نور کے صاحبزادے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی چچا تھے — متعدد بزرگوں کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ سے بھی فیضیاب تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت یہ دہلی میں موجود تھے۔ غالباً ۱۱۹۴ھ میں انتقال فرمایا۔

صبر وثباتِ حضرت عثمانؓ اور اُن کے "عدم قصدِ ایذا ئے کلمہ گویاں" کی تعریف وتوصیف بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ بزرگ (یعنی صحابہؓ) سب کے سب آفتاب، وماہتاب اور اپنے اپنے کمالات میں یکتا تھے ـــــ سبحان اللہ ـــــ سبحان اللہ ـــــ پھر فرمایا کہ حضرت عثمانؓ نے سب کو قتال وجدال سے منع فرما دیا اور خود مشغول تلاوتِ قرآن ہو گئے اور اسی حالت میں سر کٹوا دیا۔ اُف نہ کی۔

فرمایا کہ مولوی عبدالحکیم کے جواب میں ـــــ جو کہ منکرِ وحدتِ وجود تھے (مولوی) رشید الدین خاں (دہلوی) نے بندے کی مرضی اور اشارے سے کچھ لکھا ہے اس کو نقل کر لینا چاہیئے۔ میں بھی اس بارے میں عندالفرصت مختصر طور پر کچھ لکھواؤں گا۔ فرمایا کہ ملّا جلال الدین دوّانی نے اپنے زمانے کے (صوفیا وعلماء پر اعتراض کرتے ہوئے) یہ رباعی لکھی ہے ـــــ

در خانقاہ و مدرسہ گشتیم بسے　　انصاف کہ در پردہ ندیدیم کسے
دیدیم بلے بے ہُدہ گوئے چندے　　قانع شدہ از دوست ببانگ جرسے

(میں خانقاہ و مدرسہ بہت کچھ گھوما ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں نے وہاں کسی کو اہل نہیں پایا۔ دونوں جگہ میں نے دیکھا کہ کچھ خواہ مخواہ کی باتیں بنانے والے جمع ہو گئے ہیں اور مادیت کی طرف راغب اور حقیقی دوست سے غافل ہیں)۔

میرے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ نے اس رُباعی کا جواب اس طرح دیا ہے۔

در صحبتِ اہلِ دل رسیدیم بسے　　دریوزہ کناں زہر کسے یک نفسے
از چشمۂ آبِ زندگانی قدحے　　وز آتشِ وادیٔ مقدّس، قَبَسے

(یعنی میں اہلِ دل حضرات کی خدمت میں بہت کچھ حاضر ہوا ہوں۔ میں نے ہر بزرگ سے ان کے انفاسِ طیبہ کے فیوض میں سے ایک فیض کا سوال کیا ہے۔ اُن کی برکات کے چشمۂ آبِ حیات سے ایک پیالہ پانی طلب کیا ہے اور اُن کی روحانیت کی وادیٔ مقدس کی آگ سے ایک چنگاری مانگی ہے)۔

فرمایا کہ (حضرت شاہ ولی اللہؒ طریقۂ مجددیہ سے بواسطہ حضرت شیخ آدم بنوریؒ منسلک تھے) ایک مرتبہ دوسری شاخ کے بعض اشخاص نے حضرت شیخ آدمؒ پر اور ان کے سلسلے پر کچھ اعتراض

اور اظہارِ ناراضگی کیا تو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ؎

شخصے بخوردہ گیریٔ ما عاجزاں فتاد — زاں روکہ در طریقۂ مخدوم آدمیم
گفتم کہ حرفِ راست بگویم زما مرنج — تو آدمی نبودی و ما آدمی شدیم

(ایک شخص نے ہمارے اوپر اعتراض کرنے کو اپنا وطیرہ بنالیا، صرف اس بنا پر کہ ہم حضرت مخدوم آدم بنوریؒ کے طریقے میں داخل ہیں۔ میں نے اُس عیب گر معترض سے کہا کہ میں ایک سچی بات کہتا ہوں رنجیدہ مت ہوجانا۔ وہ یہ ہے کہ تو آدمی نہیں ہم آدمی ہیں (یعنی تو سلسلۂ آدمیہ میں داخل نہیں، ہم اس میں داخل ہیں)۔)

ایک شخص نے دریافت کیا کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ [ع] — کیا حدیث ہے؟ فرمایا اس مقولے کو میں نے کتبِ صوفیا میں دیکھا ہے (حدیث نہیں ہے) پھر اُس نے اس مقولے کا مطلب دریافت کیا تو فرمایا اس وقت ضعف غالب ہے —— پھر فرمایا کہ خیر مختصر سی بات کو تمہارے پاسِ خاطر سے کہتا ہوں اسی سے سب مضمون سمجھ لینا جس طرح تمہاری روح ہے کہ بدن کے کسی ایک حصّے کے ساتھ محدود و مخصوص نہیں اور ہر جگہ ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے اور سب سے مبرّا ہے۔

نہ تو در ہیچ مکانی نہ مکانے ز تو خالی

اگر اس قدر بھی کسی نے نہ جانا تو بے شک اُس نے اللہ تعالیٰ کو کچھ نہ پہچانا۔

ع علامہ سیوطیؒ نے ابن سمعانی کے حوالے سے اس کو یحییٰ بن معاذ رازی کا کلام بتایا ہے۔
(مجموعہ رسائل تسعہ سیوطی ص۲۱)

سندھ کے صوفیائے کرام

سید پیر مراد شیرازی
اور
ان کا خاندان

مولانا اعجاز الحق قدوسی

سندھ کے نویں صدی ہجری کے بزرگوں میں جو شہرت و عظمت حضرت پیر مراد شیرازی کو حاصل ہوئی، وہ دوسروں کا حصّہ نہ بن سکی، انہوں نے سندھ میں صحیح مذہبی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی، اور اصلاحِ باطن پر خاص زور دیا، اُنہوں نے اس خطے میں رشد و ہدایت کا جو چراغ روشن کیا تھا، صدیاں گزرنے پر بھی اُس کی تابانی و نورانیت آج بھی موجود ہے۔

حواشی مکلی نامہ میں ہے کہ حضرت پیر مراد شیرازی کا اصل نام محمد حسین، اُن کے والد کا نام سید احمد تھا، جو اپنے والد سید محمد معروف بہ میراں محمد کے ساتھ بعض نامعلوم وجوہ سے ۷۸۷ھ میں اپنے وطن شیراز کو ترک کر کے سندھ پہنچے۔ صاحب تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے ان کی آمد کا سال ۷۸۶ھ قرار دیا ہے، جس کی تاریخ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نکلتی ہے۔ معارف الانوار کے مؤلف مُلّا محمد صالح ولد مُلّا زکریا ٹھٹوی نے اُن کا سلسلۂ نسب اس طرح درج کیا ہے۔

سید محمد حسین (ولادت ۸۳۱ھ) بن سید احمد (ولادت ۷۵۷ھ شیراز میں۔ وفات ۸۴۵ھ)

بن سید محمد الحسینی شیرازی ثم سندھی (وفات ۱۰ محرم ۸۰۰ھ) بن سید محمود[۱] (وفات ۷۵۲ھ۔ مدفن شیراز۔ عمر ۴۵ سال) بن سید محمد (وفات ۷۱۴ھ مدفن شیراز۔ عمر ۴۰ سال) بن شاہ محمود (وفات ۶۹۴ھ مدفن شیراز۔ عمر ۵۶ سال) بن سید ابراہیم (وفات ۶۴۵ھ مدفن شیراز عمر ۵۵ سال) بن سید قاسم[۲] (وفات ۶۲۰ھ مدفن شیراز۔ عمر ۳۶ سال) بن سید زید (وفات ۶۰۹ھ۔ مدفن مکہ معظمہ۔ عمر ۳۴ سال) بن سید جعفر (وفات ۵۹۵ھ مدفن مکہ معظمہ۔ عمر ۶۱ سال) بن شاہ حمزہ (وفات ۵۴۹ھ مدفن کربلا۔ عمر ۲۴ سال) بن شاہ ہارون (وفات ۵۳۲ھ عمر ۲۴ سال) بن سید عقیل ثانی (وفات ۵۱۲ھ مدفن کربلا۔ عمر ۴۰ سال) بن سید جعفر برہان اللہ (وفات ۴۹۲ھ مدفن سامرہ۔ عمر ۶۰ سال) بن سید اسمٰعیل (وفات ۴۳۹ھ مدفن سامرہ۔ عمر ۷۹ سال)۔

حضرت مراد شیرازی کے دادا کی سندھ میں تشریف آوری۔

معارف الانوار میں ہے کہ اس خاندان کے سب سے پہلے فرد جو سندھ میں تشریف لائے، وہ پیر مراد کے دادا سید محمد تھے، جو مبارز الدین بن مظفر الدین کے عہدِ حکومت (۷۱۳ — ۷۵۹ھ) میں شیراز سے سندھ کے لئے روانہ ہوئے۔ حضرت سید محمد کے ساتھ مشہور شاعر حافظ شیرازی بھی تھے جو قندھار تک ان کے ساتھ تھے لیکن ان کے کہنے پر وہ قندھار سے واپس شیراز چلے گئے۔

۱؎ راشدی صاحب نے حواشی مکلی نامہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک سو سات کتابیں تصنیف کی تھیں (حواشی مکلی نامہ)۔

۲؎ سب سے پہلے ان کا لقب انجو پڑا۔ سید قاسم ۶۴۱ھ میں مکے سے شیراز آئے۔ شیراز کے جس محلے میں یہ آکر رہے اس کا نام بھی ان کے لقب کی وجہ سے محلہ سادات انجو پڑا، اور ان کی اولاد بھی سادات انجوی کہلائی، انجو بکسر الف کے معنی صاحب معارف الانوار نے سفید موتی کے لکھے ہیں، لیکن مکاتیبِ رشیدی (لاہور، ص ۱۶۸) پر ہے کہ انجو کے معنی خالصہ جات دیوانی کے ہیں، اور خالصہ کے املاک کو بھی انجو کہتے ہیں۔ تاریخ وصاف سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹے کی طرح شیراز کے ایک محلے کا نام بھی انجو ہے۔

سید محمد سندھ میں پہلے سیوھن آئے، اور حضرت قلندر شہباز کی زیارت کر کے سید پور موضع مراد اوٹھی پرگنہ منچھر میں سکونت پذیر ہو گئے، یہ جام صلاح الدین بن جام تماچی بن جام انڑ کا عہد حکومت تھا، سید صاحب نے ستر سال کی عمر میں ۱۰ محرم الحرام ۸۰۰ھ کو وفات پائی۔ سید صاحب کی عمر سندھ میں آنے کے وقت انسٹھ سال تھی، اور اُن کے صاحبزادے سید احمد کی عمر تیس سال تھی۔

سندھ کی تاریخ کے محقق سید حسام الدین راشدی نے حواشی مکلی نامہ میں اس امر پر بڑی وضاحت سے بحث کی ہے کہ اس خاندان کی آمد سندھ میں کس زمانے میں ہوئی۔

معارف الانوار میں سید محمد کے سندھ میں آنے کا سال ۷۸۰ھ بیان کیا گیا ہے، تحفۃ الکرام کے مؤلف میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے مکلی نامہ میں اُن کی آمدِ سندھ کا سن ۷۸۶ھ قرار دیا ہے۔

راشدی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر ہم اُن کی آمد کا سن ۷۸۶ھ صحیح مان لیں، تو صاحب مکلی نامہ میر علی شیر قانع کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اُن کی آمد مبارز الدین بن مظفر الدین کے عہدِ حکومت میں ہوئی، اس لئے کہ مبارز الدین حضرت سید محمد کے سندھ آنے سے ۲۱ سال پہلے وفات پا چکا تھا، مبارز الدین کی معزولی کے بعد اُس کا بیٹا محمد شجاع تخت نشین ہوا، جس کے متعلق حافظ شیرازی نے کئی شعر کہے ہیں، مثلاً

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دورِ شاہ شجاع است می دلیر بنوش

رندی حافظ نہ گناہیست صعب
با کرم بادشہ عیب پوش

داور دیں شاہِ شجاع، آنکہ کرد
روحِ قدس حلقۂ امرش بگوش

اے ملکُ العرش مرادش بدہ
و ز خطر چشم بدش دار گوش

شاہ شجاع کا زمانہ ۷۵۹ھ سے ۷۸۶ھ تک ہے، اس کے بعد اس کا بیٹا زین العابدین (۷۸۶ھ — ۷۸۹ھ) تخت نشین ہوا، جس کے بعد اس کے خاندان میں افتراق شروع ہوا۔ ۲۲ جمادی الآخر ۷۹۵ھ میں تیمور نے آلِ مظفر کا خاتمہ کر دیا۔ شاہ شجاع کے بعد ایران میں جو صورت حال پیدا ہوئی، اس کے متعلق ڈاکٹر غنی حافظ نے جلد اوّل میں لکھا ہے کہ:-

> شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں وفات پائی، اس کی وفات کے بعد اس وجہ سے کہ اُس نے اپنی زندگی میں سلطنت کو اپنے پس ماندگان میں تقسیم کر دیا تھا، اس کے پس ماندگان میں سخت جنگ اور کشمکش ہوئی، جس کی وجہ سے سخت انتشار فارس، یزد، کرمان اور اصفہان میں پیدا ہوا، جس کی جزئیات کا بیان کرنا حدِ تحریر سے باہر ہے۔
>
> اسی زمانے میں تیمور خونخوار نے شمالی ایران کے شہروں میں قتل و غارت گری شروع کی، اور اصفہان کو تاراج کر کے اور ان شہروں کو فتح کر کے اصفہان میں قتل عام شروع کیا، اور ستر ہزار آدمی قتل کر کے ان کی کھوپڑیوں کا ایک مینار بنایا، پھر وہاں سے فارس کا رُخ کیا، جس کی وجہ سے اہلِ شیراز سخت وحشت میں مبتلا ہو گئے۔

حواشی مکلی نامہ میں راشدی صاحب نے یہ اقتباس دینے کے بعد لکھا کہ شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں وفات پائی، اسی سال وہاں کے حالات خراب ہونا شروع ہو گئے، اور ملک کا امن و امان ختم ہو گیا، ممکن ہے کہ اِس صورت حال کو دیکھ کر سید محمد نے ترک وطن کر کے سندھ کا ارادہ کیا ہو، جو اس زمانے میں امن کا گہوارہ تھا۔

حافظ شیرازی کی آمد کے متعلق تحقیق

راشدی صاحب نے صاحب معارف الانوار کی اس روایت کو بھی قابلِ غور بتایا ہے کہ سید محمد کے ساتھ حافظ شیرازی بھی تھے جو سندھ کے ارادے سے اُن کے ساتھ قندھار تک آئے تھے، لیکن پھر کسی وجہ سے قندھار سے شیراز واپس چلے گئے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ

روایت صرف صاحب معارف الانوار کی ہے۔ حافظ شیرازی کو ہندوستان آنے کی دعوت صرف دو دفعہ دی گئی، ایک مرتبہ یہ دعوت سلطان محمود بہمنی (۸۰ - ۷۹۹ھ) میں دی۔ چنانچہ فارسی نامہ ناصری میں ہے کہ:-

۷۸۲ھ میں سلطان محمود شاہ بہمنی نے خواجہ حافظ شیرازی سے ہندوستان آنے کی استدعا کی، اور سفر خرچ کے طور پر اُن کے لئے بہت سا نقد و جنس اُن کے لئے روانہ کیا، جس سے خواجہ حافظ نے اپنا قرض وغیرہ ادا کیا، اور ہندوستان کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔

جس وقت حافظ بندر ہرموز پہنچے، اور کشتی میں چڑھے تو اتفاقاً شدید ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے طوفان آگیا، حافظ اپنا ارادۂ سفر ملتوی کر کے شیراز واپس چلے آئے۔

حسین پژمان نے حافظ کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ حافظ کو محمود شاہ بہمنی کی یہ دعوت ایک تاجر میر فضل اللہ انجو کے توسط سے ملی تھی، جس کے جواب میں حافظ نے یہ غزل لکھ کر اُسی تاجر کے ہاتھ بھجوائی۔

دمی با غم بسر بردن، جہاں یکسر نمی ارزد
بمی بفروشش دلق ماکزیں بہتر نمی ارزد
پس آساں می نمود اول، غم دریا ببوی سود
غلط گفتم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد
شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہ دلکش است اما بدردِ سر نمی ارزد

سلطان محمود شاہ بہمنی کی طرف سے یہ دعوت خواجہ حافظ کو ۷۸۲ھ میں دی گئی تھی۔
اس کے بعد سلطان غیاث الدین (۹۲ - ۷۹۹ھ) والیٔ بنگال نے اپنی تخت نشینی کے کچھ سال پہلے حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی جس کے جواب میں حافظ نے اُسے ایک غزل لکھ کر بھیجی، جس کے مشہور شعر یہ ہیں:-

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود   دیں بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند زین قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ میرود
حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث الدین
غافل مشو کہ کارِ تو از نالہ میرود

صاحب فارس نامہ ناصری کا قول ہے کہ خواجہ حافظ شیرازی عمر بھر میں دو مرتبہ شیراز سے باہر گئے تھے، ایک مرتبہ وہ ہرموز گئے تھے اور دوسری مرتبہ انہوں نے یزد کا سفر کیا تھا۔ اس سفر میں انہوں نے اہل یزد کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں، ان تکالیف کو یاد کر کے انہوں نے اہل یزد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:۔

اے صبا با ساکنان شہر یزد از ما بگو
کای سرحق ناشناساں گوئی میدان شما

بعض ان کے تذکرہ نویسوں نے اس کا بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے خراسان کا بھی سفر کیا تھا، چنانچہ حسین پژمان لکھتا ہے کہ:۔

اس میں بہت اختلاف ہے کہ حافظ نے خراسان اور طوس کا سفر شاہرود اور بسطام کے راستے کیا تھا..... بعض ایسے دوسرے شواہد تاریخ میں ملتے ہیں کہ جو حافظ کے خراسان کے سفر کرنے کو حقیقت کے قریب کر دیتے ہیں، ان میں سے ایک حافظ کی سابقہ عقیدت ہے جو انہیں حافظ زین الدین تابیادی سے تھی۔ یہ بزرگ تابیاد میں خراف کے نزدیک خراسان میں رہتے تھے۔ اور دوسرے ان کی سابقہ عقیدت سید زین العابدین گنا بادی سے تھی، صاحب حبیب السیر نے لکھا ہے کہ یہ دونوں بزرگ سابقہ دوستی اور ارادت کی وجہ سے حافظ کی مدد کرتے رہتے تھے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ یہ رابطہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ حافظ نے خراسان کا سفر نہ کیا، اور ان دونوں بزرگوں سے ملاقات اور دوستی کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔

راشدی صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس کو دیکر لکھا ہے کہ حافظ کے بزرگوں سے اس عقیدت مندانہ مزاج کو دیکھ کر یہ امکان ہوتا ہے کہ وہ حضرت سید محمد کو بر بنائے عقیدت

قندھار تک آئے ہوں اور سید صاحب کے اصرار پر شیراز واپس چلے گئے ہوں۔

صاحبِ معارف الانوار کی سید صاحب کے سندھ آنے کے سلسلے میں جو روایت ہے اور جسے حواشی مکلی نامہ (سندھی) میں راشدی صاحب نے نقل کیا ہے، ہم اس کا ترجمہ بلفظہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔

(سید محمد) ..... اپنے چند ہمراہیوں سادات و مریدوں وغیرہ کے ساتھ جن کی تعداد پچیس تھی وہاں سے کوچ کرکے سندھ کی جانب روانہ ہوئے، ان کے جملہ ہمراہیوں میں سے ایک شیخ شمس الدین خواجہ حافظ شیرازی قدس اللہ سرہ بھی تھے جنہیں حضرت سید محمد نے یہ کہہ کر قندھار سے (شیراز) رخصت کر دیا تھا کہ تیری تاریخ "خاک مصلیٰ" ہے[1] اور حافظ روتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے اور سید محمد وہاں سے روانہ ہو کر سیوستان پہنچے۔

راشدی صاحب نے خواجہ حافظ اور حضرت سید محمد کے سندھ کی آمد کے سلسلے میں مختلف تاریخوں اور تذکروں سے مندرجہ بالا اقتباسات دے کر لکھا کہ حافظ کے متعلق یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

سندھ میں سکونت اور حضرت سید محمد کی وفات۔

تحفۃ الکرام میں ہے کہ سید محمد ۷۸۶ھ میں جام صلاح الدین بن تماچی کے عہد میں سندھ تشریف لائے اور پرگنہ منچھر کے موضع مراد اوٹھی میں سکونت پذیر ہو گئے اور اسی موضع میں انہوں نے وفات پائی۔

سید احمد

سید محمد کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید احمد جو اپنے والد کے ساتھ شیراز سے آئے تھے اور اپنے وقت کے جلیل القدر بزرگ تھے، اسی موضع میں رہنے لگے۔ انہیں اہل اللہ اور صوفیائے کرام سے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ حضرت شیخ عیسیٰ لنگوٹی کی زیارت کے لئے ساموئی تشریف لائے، اتفاق سے اس وقت قاضی نعمت اللہ عباسی جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، وہ بھی شیخ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ عیسیٰ ان کے ساتھ نہایت عزت و احترام کے ساتھ

---

[1] خاک مصلیٰ سے حافظ کی وفات کی صحیح تاریخ ۷۹۱ نکلتی ہے۔

پیش آئے، لیکن قاضی نے ان کی طرف مطلقاً توجہ نہ دی۔

جب حضرت سید احمد رخصت ہونے لگے تو شیخ عیسیٰ نے ان کو رخصت کرتے وقت ان کی تعظیم پہلے سے بھی زیادہ کی قاضی نعمت اللہ نے ان کے جانے کے بعد شیخ سے ان کی اس قدر تعظیم وتکریم کی وجہ پوچھی، شیخ نے جواب دیا کہ مجھے ان کی پشت میں قطب زماں کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو ان سے مرید ہوں گا۔ ادھر حضرت سید احمد قاضی نعمت اللہ کی اس بے توجہی کو دیکھ کر ان سے سخت رنجیدہ روانہ ہوئے۔ قاضی نعمت اللہ ابھی گھر تک پہنچنے نہ پائے کہ ان کی بینائی جاتی رہی، رات کو ان کی صاحبزادی فاطمہ نے خواب میں دیکھا کہ اگر وہ سید احمد سے شادی کرے گی تو اس کے چار بیٹے پیدا ہوں گے جن میں سے ایک اپنی روحانیت سے دنیا کو منور کر دے گا۔

صبح کو قاضی نعمت اللہ نے یہ تمام واقعات شیخ عیسیٰ لنگوٹی سے بیان کیے اور شیخ عیسیٰ کے ذریعہ سے ان کی صاحبزادی کا نکاح حضرت سید احمد سے ہوا اور وہ اس کے بعد قاضی نعمت اللہ کے گھر ٹھٹے میں مقیم ہو گئے۔

درایت کی کسوٹی پر یہ روایت جس درجے کی ہے وہ ظاہر ہے، مگر اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ قاضی نعمت اللہ کی بیٹی فاطمہ کا نکاح حضرت سید احمد سے ہوا۔

معارف الانوار کے مؤلف نے اس سلسلے میں جو لکھا ہے۔ ہم 'حواشی مکلی نامے' سے اس کا ترجمہ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

> ۸۹۰ھ میں قاضی نعمت اللہ نے اپنی بیٹی کی منگنی حضرت سیّد احمد سے کی، اور جس نے بھی ان کے ساموئی میں آنے کی تاریخ اور قاضی نعمت اللہ عباسی کی بیٹی سے منگنی کی تاریخ 'بسم اللہ الرحمن الرحیم'
> ۷۸۶ھ
> سے نکالی، بہترین نکالی۔

معارف الانوار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شادی کے وقت حضرت سید احمد کے والد سید محمد بھی حیات تھے، کیونکہ صاحب معارف الانوار نے لکھا کہ

> القصد میر سید محمد اور سید احمد شادی کے چند روز بعد موضع سید پور

روانہ ہوگئے، میر سید محمد اس موضع میں آنے کے بعد چند دن
حیات رہے..... سید محمد نے ۱۰ ارمحرم الحرام ۸۰۰ھ کو سفر آخرت
اختیار کیا۔

۷۹۵ھ میں حضرت سید احمد کے فرزند ارجمند میر سید علی پیدا
ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔

سید حسام الدین راشدی نے حواشی مکلی نامہ میں ان تمام روایات سے حسب ذیل نتائج نکالے ہیں۔

۱۔ سید احمد کی منگنی ۷۸۶ھ میں اور شادی ۷۹۰ھ میں ہوئی۔ ان کے پہلے صاحبزادے ۷۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے صاحبزادے کی ولادت کے وقت ان کی والدہ کی عمر سترہ سال کی تھی۔

۲۔ قاضی نعمت اللہ کی بیٹی اور سید احمد کی بیوی ۷۷۷ھ میں پیدا ہوئیں۔

۳۔ ۷۸۶ھ میں جب بی بی فاطمہ کی منگنی حضرت سید احمد سے ہوئی، اس وقت بی بی فاطمہ کی عمر نو سال تھی۔

۴۔ ۷۹۰ھ میں شادی کے وقت بی بی فاطمہ کی عمر بارہ سال تھی۔

۵۔ ۷۹۵ھ میں جب حضرت سید احمد کے پہلے صاحبزادے حضرت سید علی پیدا ہوئے اس وقت ان کی والدہ کی عمر سترہ سال تھی۔

حضرت سید احمد کی وفات

تحفۃ الکرام میں ہے کہ حضرت سید احمد نے یکم محرم ۸۴۵ھ میں وفات پائی اور مکلی میں عباسی قاضیوں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

حواشی مکلی نامہ میں سید حسام الدین راشدی نے لکھا کہ مکلی میں یہ قبرستان دراصل عباسی قاضیوں کا تھا، لیکن جب یہاں حضرت سید احمد مدفون ہوئے تو اس وقت سے یہ قبرستان انجوی شیرازیوں کے نام سے موسوم ہوا۔

حضرت سید احمد کے مقبرے کی تعمیر

حواشی مکلی نامہ میں ہے کہ حضرت سید احمد کے پوتے حضرت سید علی ثانی نے اس وقت جب کہ ان کی عمر اکیاون سال کی تھی اپنے دادا کے مقبرے اور گنبد کو تعمیر کرایا، جس کی تاریخ "بحر کرم بجرم" سے نکلتی ہے۔
۹۶۴ھ

حضرت سید محمد کے جسد کی ٹھٹے میں منتقلی!

تحفۃ الکرام میں ہے کہ یہ مقبرہ اس وقت تک اہل اللہ کی زیارت گاہ نہ بن سکا، جب تک کہ حضرت سید محمد کے جسد کو موضع مراد دھٹی سے یہاں منتقل نہ کیا گیا۔

اولاد

حضرت سید احمد کی بی بی کے بطن سے حسب ذیل اولاد تھی۔
(۱) سید علی اول (۲) سید شریف (۳) سید جعفر (۴) سید محمد حسین معروف بہ پیر مراد شیرازی۔

آخر میں ہم اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں اپنے عزیز دوست سید حسام الدین راشدی کے شکر گذار ہیں کہ اس مضمون کا تمام مواد ان کی تصنیف حواشی مکلی نامہ (سندھی) سے اخذ کیا گیا ہے، جو مکلی کے آثار پر نئی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے، اور مکلی کے آثار پر لکھنے والوں کے لئے اس کتاب سے استفادہ کئے بغیر چارہ نہیں۔

عہدِ جدید کے مسائل اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

ڈاکٹر شرف الدین[1]

زمان و مکان کی حدبندیوں سے گزر کر دیکھیں اور قدیم و جدید کی تقسیم سے ذرا بالاتر ہو کر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان مسائل کا دوسرا نام ہے۔ روزِ ازل سے اس کی پیدائش خود ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گئی۔ اور بڑے ردوکد اور بحث و تکرار کے بعد جب وہ پیدا ہو گیا تو خود مسائل پیدا کرنے شروع کر دیئے —— کسی اور کے لئے نہیں، آپ اپنے لئے۔ وہ مسائل پیدا کرتا رہا اور خود ہی ان میں الجھتا رہا۔ فراموش کاری اس کی فطرت تھی اور ظلم و عدوان اس کی سرشت۔ اور بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو تمام فساد کی جڑ اس کی اپنی ہی جبلت تھی، اور اس کا انجام نہ جانے کیا ہوتا اگر رحمتِ باری اس کی دست گیری کو آگے نہ بڑھتی۔ ابتدا ہی سے مشیت نے یہ اہتمام کیا کہ خدا کے برگزیدہ بندے حق کا پیغام لے کر آتے اور اسے بھولا ہوا سبق یاد دلاتے۔ اس زمین پر آنے والے پہلے انسان کی سرگزشت بھی یہی تھی اور اس کے بعد آج تک ہر انسان کی سرگزشت یہی ہے۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پہلے خطا کار انسان بھی تھے اور پہلے ہادی و پیغمبر بھی۔ ان کے بعد ہدایت اور پیغام رسانی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر

[1] شعبہ اردو جامعہ سندھ۔

انبیا آتے رہے اور خدا کے پیغام کو دہراتے رہے جن کی مجموعی تعداد لاکھ سے متجاوز بتائی جاتی ہے۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيْرٌ (اور ہم نے نہیں ہلاک کیا کسی بستی کو مگر اس میں کوئی ڈرانے والا گزر چکا)۔

ہر ملک ہر قوم ہر بستی میں خدا کے فرستادے آتے رہے اور اس کا پیغام سناتے رہے۔ جب ایک نبی کی تعلیمات بھلادی گئیں یا امتدادِ زمانہ سے ان پہ اوہام و خرافات کے دبیز پردے پڑ گئے تو دوسرے نبی نے آکر اس کی تجدید کی۔ بھٹکے ہوئے کو سیدھی راہ پر لگایا۔

ان تمام انبیا کا پیغام جو حضرت آدم سے لے کر حضرت موسیٰ تک مبعوث ہوئے، بنیادی اور اصولی لحاظ سے ایک تھا۔ اگر ان میں کچھ فرق تھا تو محض ان وقتی اور مقامی امور و مسائل میں تھا جو ان کی اپنی اپنی اقوام کے ساتھ مخصوص تھے۔ بالآخر انسان ارتقار کی منازل طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا کہ پوری دنیا ایک برادری یا ایک قومی وحدت شمار ہو سکے اس لئے مشیت مقتضی ہوئی کہ پوری دنیا کے لئے ایک اور آخری پیغام بھیجا جائے جو اتنا جامع اور مکمل ہو کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے لوگ اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکیں یہ پیغام قرآن کی شکل میں نبی آخر الزمان پر نازل ہوا، جو ایک حرف کی کمی بیشی کے بغیر اپنی اصلی حالت میں آج بھی موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔

قرآن خالق کائنات کا بخشا ہوا وہ آخری دستورِ زندگی ہے جو حال اور مستقبل کے مسائل یکساں طور پر حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ عہد ماضی میں وہ قوموں اور ملکوں کے مسائل حل کر چکا ہے۔ عہد جدید کے مسائل حل کرنے کی اس میں صلاحیت ہے اور آنے والے دور کے مسائل بھی وہ اسی طرح حل کرے گا۔

نبی اکرمؐ کا پیغام انسانیت کے نام خالق کائنات کا آخری پیغام ہے۔ متعدد آیات و احادیث اس کی تصریح کرتی ہیں کہ آپؐ نبی آخر الزمان ہیں، آپ کا لایا ہوا پیغام رہتی دنیا تک بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ دوسرے انبیاء کے برعکس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہوئی کتاب کی حفاظت کا ذمہ 'رب السموات والارض' نے خود لیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ۔[1] اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ۔[2] اس پر دال ہیں۔

آپ سے پہلے جتنے انبیا آئے ان کی تعلیمات مٹتی گئیں کیونکہ مشیت الٰہی اسی کی مقتضی تھی۔ انبیاء کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ انسانیت ارتقاء کے مراحل سے تیزی کے ساتھ گذر رہی تھی۔ یہ عبوری دور تھا۔ معمورۂ ارض مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ جغرافیائی حدبندیاں ان میں حائل تھیں اس لئے مختلف خطہ ہائے زمین میں بسنے والی اقوام کے لئے الگ الگ پیغامبر بھیجے گئے۔ لیکن آپ کی بعثت مذہب کے ارتقاء کا وہ نقطۂ عروج تھا جو مذہبی تاریخ حضرت آدم سے لے کر اب تک طے کرتی آ رہی تھی۔ بالآخر دین کی عمارت کا آخری پتھر رکھ دیا گیا۔ مکمل نسخۂ ہدایت لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم آگیا تو انسانیت کو یہ مژدہ سنا دیا گیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔[3]

آسمانی ہدایت کی ضرورت انسانِ ظلوم وجہول کی فطری ضرورت ہے، وہ اس سے بے نیاز ہو کر امن وسلامتی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی اس نے امتدادِ زمانہ سے انبیاء کی تعلیمات کو بھلا دیا یا سرکشی کی بنا پر اس کو ماننے سے انکار کیا نت نئی الجھنوں میں مبتلا ہو کر اپنی تباہی اور ہلاکت کا سامان کرتا رہا اور اس وقت تک اسے سکھ چین نصیب نہ ہوا جب تک اس نے پھر ہدایت ربانی کی طرف رجوع نہیں کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیغام رسانی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو وہ سب کچھ دے دیا گیا جس کی انسان کو قیامت تک ضرورت ہو سکتی تھی،

---

[1] بیشک ہمیں نے ذکر (قرآن) اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

[2] بیشک ہمارے اوپر ہے اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھانا۔ [3] آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسند فرمایا۔

قرآن میں دستور زندگی کے وہ تمام بنیادی اصول درج کر دیئے گئے جن کی روشنی میں اجتماع انسانی اور عمران بشری کے وہ تمام مسائل حل کئے جا سکتے ہیں جو قیامت تک انسان کو پیش آئیں گے۔

دنیا انسان کے وضع کردہ مختلف نظامہائے زندگی کو آزما چکی ہے اور اس کا ہر تجربہ ناکامی پر ختم ہوا۔ انسانیت کل کی طرح آج بھی اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن سعی و جستجو کا ہر قدم اسے منزل سے دور لے جا رہا ہے۔ وہ اپنے مسائل حل کرنا چاہتی ہے لیکن گتھیوں کو سلجھانے میں ناخن تدبیر کی ہر کاوش الٹے نتائج پیدا کرتی ہے۔ عقلاء اور مدبرین جن گرہوں کی عقدہ کشائی میں عمریں صرف کر دیتے ہیں وہ کھلنے کی بجائے اور پیچیدہ ہو جاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ مسائل کا حل نہیں چاہتے۔ ان کی نیک نیتی ہر شبہے سے بالاتر ہے۔ ان کی دیانت مسلّم ہے۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ یہ مسائل حل ہوں، لیکن ان کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ انہیں ابھی تک رشتۂ کار کا وہ سرا نہیں مل سکا ہے جس کے بغیر تدبیریں اُلٹی ہو جاتی ہیں اور دوا کام نہیں کرتی۔

عہدِ جدید کی سب سے بڑی گمرہی جو اس کے جملہ مصائب کی ذمہ دار ہے یہ ہے کہ اس نے نظام کائنات کو بے خدا فرض کر لیا ہے۔ عناصرِ فطرت کی تسخیر نے انسان کو اتنا بدمست و بےخود بنا دیا ہے کہ اسے اپنے سے ماوراء کوئی بالاتر ہستی نظر نہیں آتی۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے میں اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اس کی برخود افتادگی نجانے ابھی کیا رنگ لائے گی۔ بہرحال اس کی فریب خوردہ عقل یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ پس پردہ کوئی وجود ہے جو اس کارخانۂ ہستی کو چلا رہا ہے۔ اور اگر کسی درجے میں وہ یہ بات مانتا ہے کہ ماورائے ادراک و تعقل کوئی طاقتور ہستی ہے جو عناصر کے پردے میں سرگوشیاں کر رہی ہے تو اُس کی ناقص عقل ان صفات کا ادراک کرنے سے قاصر رہتی ہے جن سے وہ ہستی فی الواقع متصف ہے اور جن کے بغیر انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی حد تک اس ہستی کا وجود اور عدم برابر ہے۔

عہدِ جدید کا انسان آج جتنے مسائل سے دوچار ہے، اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ ان

مسائل کی فہرست بہت طویل ہے۔ انسانی زندگی اتنی پرپیچ کبھی نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔ سائنسی ترقیات نے گو کہ مادی اعتبار سے زندگی کو اتنا آگے بڑھا دیا ہے کہ بسا اوقات تصور کی پرواز بھی وہاں تک پہنچنے سے عاجز نظر آتی ہے۔ مگر زندگی کا اصل سرمایہ جسے سکونِ دماغ اور اطمینانِ قلب کہتے ہیں اس سے عہدِ جدید کا انسان اتنا ہی محروم ہے جتنا کہ زمانہ ماقبل تاریخ کا انسان نام نہاد تہذیب و تمدن سے بے بہرہ تھا۔

جنگ کے عفریت چنگھاڑ رہے ہیں اور ان کی ہر چنگھاڑ کے ساتھ انسانیت کا خون خشک ہوا جاتا ہے۔ مہلک ہتھیاروں کی ایجاد نے پوری انسانیت کو آتش فشاں کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا ہوا ہے کہ یہ جوالا مکھی اب پھٹا کہ تب پھٹا، اور اس کے پھٹنے کے ساتھ ہی ساری دنیا آنِ واحد میں 'كَانَ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا' بن جائے گی۔

عہدِ جدید کا سب سے بڑا مسئلہ وہ ذہنی اضطراب اور دل کی بے چینی ہے، وہ خوف و ہراس ہے، جو پوری انسانیت کو وبا کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے، انسان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ چاند پر پہنچنے کی کوششیں کر رہا ہے، اسپٹنک ایج ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان سائنسی ایجادات کی دوڑ میں جس قدر آگے بڑھتا جا رہا ہے اسی قدر اہلِ دنیا سے اس کی حقیقی مسرتیں چھنتی جا رہی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان 'وعدۂ الست' کو بھول گیا ہے۔ وہ اپنے خالق کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔ آج کا انسان نہ خود کو پہچانتا ہے نہ خدا کو۔ اس کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ انسان ہے اور انسانیت کے کچھ تقاضے ہیں، وہ اشرف المخلوقات ہے، کچھ خصوصیات ہیں' جو اُسے حیوان سے ممتاز کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسانی بستیاں خونخوار درندوں کا مسکن بن گئی ہیں، جن میں ایک انسان دوسرے انسان پر اس طرح غرّاتا ہے جس طرح بھیڑیئے خون آشام دانت نکالے اپنے شکار پر غرّاتے ہیں۔ اس صورت حال سے نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اس پیغام کی طرف لوٹ جائے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

آج سے چودہ سو سال پہلے لے آئے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا بنیادی مقصد، دوسرے انبیاء کی طرح، اس وعدے کو یاد دلانا تھا جو روزِ ازل خدا اور بندوں کے درمیان ہوا تھا۔ گویا یہ اس رشتے کی تجدید کا پیغام تھا جو خالق و مخلوق کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسی پیغام کو اساس بناکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تعلیمات دیں جنہیں اسلام کہا جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق یہ کائنات بے خدا نہیں۔ اسلام کا خدا بلا شرکتِ غیرے دنیا کا واحد خالق و مالک ہے۔ اسلام کا خدا پاک ہے، بے عیب اور بے نیاز ہے۔ نہ وہ بیٹا ہے نہ باپ۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ یہی وہ باتیں ہیں، جن کو اصطلاح میں 'توحید' کہتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا رب العالمین ہے، روزِ جزا کا مالک ہے۔ مالکِ یوم الدین، حکمرانی اور فرمانروائی کا حق صرف اسی کو ہے۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْاَمْرُ، زمین خدا کی ہے، ملک اسی کا ہے اور حکم بھی اسی کا ہونا چاہیئے۔ اس کی زمین میں انسان کی حیثیت نائب کی ہے، وَجَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ۔ اسی لئے انسان کو یہ حق نہیں کہ اس زمین کا کاروبار اپنی مرضی کے مطابق چلائے۔

انسان از خود نہیں پیدا ہوگیا، اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس کی پیدائش کا ایک مقصد ہے۔ انسان خدا کی مخلوقات میں عظیم اور اشرف ہے اس لئے اس کی پیدائش کا مقصد بھی کوئی معمولی نہیں ہوسکتا۔ انسان کی پیدائش کا مقصد قرآن کے الفاظ میں خدا کی عبادت ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] ۝

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ میں ایک صفت عدل ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ نافرمان اور فرماں بردار بندوں کا انجام ایک نہ ہو، ہر انسان کو اس کے کیے کا بدلہ ملنا چاہیے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى، انسان کے بعض اعمال کے نتائج تو اسی

---

[1] میں نے جن اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

زندگی میں ظاہر ہو جاتے ہیں مگر بہت سے اعمال ایسے بھی رہ جاتے ہیں جن کا بدلہ یہاں نہیں ملتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظالم کو ظلم کی سزا نہیں ملتی اور مظلوم کی داد رسی نہیں ہو پاتی۔ اس لئے خدا نے ایک فیصلے کا دن مقرر کر دیا ہے جس دن ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اسی کو ہم یوم جزا کہتے ہیں، یَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی۔

توحید اور رسالت کے بعد معاد کا تصوّر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ بازپُرس اور جوابدہی کا ڈر اگر نہ ہو تو انسان جس کی سرشت میں تمرد اور سرکشی کا مادّہ موجود ہے شر و فساد برپا کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ مسؤلیت کا احساس اجتماع انسانی کی صلاح و فلاح کا سب سے بڑا ضامن ہے۔

انسان کی پیدائش کے متعلق اسلام نے جو تصوّر پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک باپ ماں کی اولاد ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ[1]۔ اس تصور نے انسانیت کو نئی قدروں سے آشنا کیا اور معاشرتی زندگی میں اس کے نتائج بہت گہرے اور دور تک پہنچے ہیں۔ انسان کی ابتدا کے متعلق عہد جدید نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس پر بحث کے ایک الگ مقالے کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس نظریے نے انسانی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہ ان ٹھوکروں میں سے ایک ہے جو عہد جدید کے، ہدایتِ آسمانی سے بے نیاز دماغ نے کھائی ہے۔ یہ محض نظری' یا علمی مسئلہ نہیں رہا۔ بلکہ اس کی بنیاد پر بعض نظام قائم ہیں۔ اس نظریے نے زندگی اور باہمی روابط کے متعلق انسان کا مطمح نظر یکسر بدل کر رکھ دیا ــــ

---

[1] اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تم کو پیدا کیا نفس واحد سے، اور اس سے پیدا کیا اس کے جوڑے کو۔ اور ان دونوں سے پھیلایا بے شمار مردوں اور عورتوں کو اور ڈرو اللہ سے جس کا آپس میں واسطہ دیتے ہو اور خبردار رہو رشتوں سے۔

ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء میں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب میں مذکور قصۂ تخلیق آدم میں وہی فرق ہے جو مشرق و مغرب میں۔ ڈاروِن کا نظریہ انسان کو ایک بے مقصد حیوان سے زیادہ نہیں بناتا۔ اس کے برعکس' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی پیدائش کا جو قصہ بتایا ہے وہ پوری انسانیت کو ایک برادری اور ایک کنبہ ٹھہراتا ہے۔ کُلُّکُمْ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔

خاتمۃُ الکلام یہ کہ انسان اور خدا، انسان اور کائنات، انسان اور انسان، ان سہ گانہ تعلقات کے صحیح یا غلط تصوّر ہی پر انسانی زندگی کے بناؤ بگاڑ کا دار و مدار ہے۔ رَسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام عبارت ہے انہی تعلقات کی صحیح نوعیت کی تعیین کا۔

خواجہ محمّد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کے اخلاق و عادات[1]

(۲)

سید رشید احمد ارشد ایم اے[2]

حضرت خواجہ باقی باللہ کے اخلاق و عادات خلق نبوی کا نمونہ تھے۔ آپ نہایت متواضع تھے اور ہمیشہ عزلت اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر فرماتے تھے مگر آپ کی گوشہ نشینی راہبوں اور تارک الدنیا جیسی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپ خلقِ خدا کی خدمت بھی کرتے تھے۔ اور اپنے مخلصوں اور دوستوں کی غم خواری اور ہمدردی بھی کرتے تھے۔ اور ان کی خیر خواہی میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے مگر دینی فرائض اور سنت نبوی کے اتباع کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے۔

خاموشی خاموشی اور کم گوئی آپ کی مخصوص عادت تھی۔ آپ سارے دن گردن جھکائے عالم سکوت میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ البتہ جب کوئی شخص آپ سے بات کرتا تھا تو بقدر ضرورت اسے مختصر جواب دیا کرتے تھے۔ مگر جب کوئی تصوف کا پیچیدہ مسئلہ زیر بحث آتا تھا تو آپ اسے نہایت

---

[1] سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو الرحیم شمارہ نومبر ۱۹۶۷ء۔ [2] لیکچرر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی۔

وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے تھے ۔ تاکہ مسائل اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں ، اور وہ کسی قسم کی غلط فہمی یا گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے ۔

عجز و انکساری آپ کی طبیعت میں انتہائی درجہ کا عجز و انکسار تھا ۔ آپ سادات و مشائخ اور دینی علمار کی بے حد تعظیم فرماتے تھے ۔ اگر کسی عالم کو پیدل چلتے ہوئے دیکھتے اور آپ گھوڑے پر سوار ہوتے تو آپ فوراً گھوڑے سے اُتر کر اس عالم کو سلام کرنے اور مصافحہ کرنے میں پیش قدمی فرماتے تھے ۔ آپ عام مسلمانوں کی حاجت روائی میں کوتاہی نہیں کرتے تھے ۔ اور امرار و حکام کو ان کا کام کرنے کے لئے سفارشی خطوط لکھتے تھے ۔

مرجع خلائق ہونے کے باوجود آپ نے کبھی اپنی ذات کو عام انسانوں سے برتر خیال نہیں کیا ۔ اور نہ اپنے روحانی کمالات کا کبھی اظہار کیا ۔ بلکہ آپ حتی الامکان اپنے روحانی مرتبے کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور جب کوئی مرید ہونے کے لئے آتا تو آپ از راہِ انکساری اپنے آپ کو اس کام کا اہل ظاہر نہ کرتے تھے مگر جب وہ نہایت اصرار کرتا اور اپنے ارادے پر ثابت قدم رہتا تو اس وقت آپ اسے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے تھے ۔

آپ کی عاجزی ، انکساری اور خوش اخلاقی کے بہت سے واقعات مذکور ہیں ۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک خراسانی نوجوان عرصۂ دراز تک حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر معتکف رہا اور ان سے کسی مرشد کامل کا پتہ بتانے کی درخواست کرتا رہا آخر اسے بذریعۂ کشف ہدایت کی گئی کہ وہ طریقۂ نقشبندیہ کے ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو جائے جو ابھی تشریف لائے ہیں چنانچہ وہ خراسانی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سارا واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا :۔

” یہ بندۂ مسکین اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتا ہے تمہیں جس بزرگ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کوئی اور ہوگا “

اس کے بعد آپ کی ہدایت کے مطابق وہ خراسانی نوجوان پھر اپنے مقام پر چلا گیا ۔

دوسری رات خواب میں پھر یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بزرگ جس کا پتہ بتایا گیا تھا وہ وہی ہیں جس سے اس نے ملاقات کی تھی۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی وہ خراسانی پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اپنا خواب بیان کرکے آپ کا مرید ہونے پر اصرار کرنے لگا۔ آپ نے اس کے بے حد اصرار پر اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔

اسی قسم کا واقعہ آپ کے خلیفۂ خاص خواجہ حسام الدین احمد کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، انہیں بھی آپ نے ازراہ تواضع وانکساری واپس کر دیا تھا، اور بعد میں انہیں مرید کیا۔[1]

رحم وشفقت رحم اور شفقت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بالخصوص غریب اور حاجت مندوں کی حاجت روائی سے آپ نے کبھی گریز نہیں کیا۔

ایک دفعہ جب آپ لاہور میں مقیم تھے وہاں خشک سالی کے آثار نمودار ہوئے۔ آپ قحط زدہ لوگوں کی بُری حالت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے خود بھی کھانا پینا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد آپ کے عقیدت مندوں نے کھانا پیش کیا تو آپ نے آنسو بہاتے ہوئے یہ فرمایا "یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہمارے پڑوس میں ایک شخص بھوک کے مارے رات تڑپ تڑپ کر گزارے اور ہم سیر ہو کر کھانا کھائیں"۔

یہ فرما کر آپ نے اپنا سارا کھانا بھوکوں میں تقسیم کر دیا۔

آپ نہ صرف انسانوں پر رحم و شفقت فرماتے تھے بلکہ حیوانات اور جانوروں پر بھی آپ بے حد شفیق تھے، اور انہیں کوئی تکلیف و اذیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک رات آپ تہجد کے لئے اُٹھے تو ایک بلی آپ کے لحاف پر سو گئی جب آپ تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر بستر پر تشریف لائے تو بلی کو لحاف پر سوتے ہوئے دیکھا، اس وقت آپ نے ازراہِ شفقت بلی کو نہیں جگایا، اور رات کو یونہی بیٹھے شدید موسم سرما کی سردی کی تکالیف صبح تک جھیلتے رہے مگر بلی کو جگانے کی تکلیف گوارا نہ فرمائی۔

---

[1] زبدۃ المقامات از مولانا کشمی صاحب۔ مطبوعہ مطبع نول کشور۔

آپ کی شفقت بُرے لوگوں پر بھی ہوتی تھی۔ اگر ایسے لوگ آپ کے پڑوسی ہوں اور آپ کو تکلیف دیتے ہوں تو اس صورت میں بھی آپ ان کی خیر خواہی فرماتے تھے۔ اور بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ مذکور ہے کہ آپ کے پڑوس میں ایک ظالم اور شریر نوجوان رہتا تھا۔ وہ ہر قسم کی شرعی برائی کا ارتکاب کرتا تھا، لیکن آپ نے اس کی کوئی شکایت حکام تک نہیں پہنچائی۔ اتفاق سے خواجہ حسام الدین نے شہر کے کوتوال سے اس کی شرارتوں کا ذکر کر دیا۔ اس نے اسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے خواجہ حسام الدین کو بلا کر اظہارِ ملامت فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا۔
"جناب والا! یہ شخص بہت فاسق و فاجر ہے اب اس کی بُرائیاں صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچ گئے ہیں"۔
یہ سُن کر آپ نے ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا:۔

"چونکہ تم اپنے آپ کو نیک اور گناہوں سے پاک سمجھتے ہو اس لئے تمہاری نظروں میں وہ فاسق اور شریر ہے، مگر ہم کسی بات میں بھی اپنے آپ کو بالاتر نہیں سمجھتے ہیں اور جب یہ بات ہو تو اسے ہم کیسے بُرا کہہ سکتے ہیں"۔

اس کے بعد آپ نے شہر کے کوتوال کے پاس اس کی سفارش کی اور اُس نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان آپ کے رحم و شفقت اور اعلیٰ اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے فوراً اپنے گناہوں سے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر کے صالح اور نیک انسان بن گیا۔

تحمل و بُردباری

صاحب زبدۃ المقامات ایک بزرگ درویش کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"ایک دن میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر موجود تھا کہ اچانک یہ اطلاع ملی کہ حضرت خواجہ محمد باقی قدس اللہ سرہٗ تشریف لانے والے ہیں۔ مزار مبارک کے خدام نے آپ کی تشریف آوری کی خبر سُن کر ایک تخت بچھا دیا اور اس پر فرش و تکیہ لگا کر آپ کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں ایک آزاد منش فقیر آیا۔ اور تخت و

فرش کو دیکھ کر مزار مبارک کے خدام سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا کہ "یہ کیا ہے اور کس لئے ہے"۔ خدام بولے "خواجہ بزرگ محمد باقی تشریف لانے والے ہیں، اُن کے لئے یہ تخت بچھایا گیا ہے"۔ یہ سُن کر وہ بدزبان فقیر نہایت غضبناک ہو گیا اور غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اور حضرت خواجہ صاحب کی شان میں گستاخی کرنے لگا۔ اتنے میں خواجہ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ آپ کو دیکھ کر وہ اور زیادہ برانگیختہ ہو گیا۔ آپ کے ساتھ درویشوں کی ایک جماعت تھی جو اس کو اس کی بدزبانی اور گستاخی کی سزا دینی چاہتی تھی۔ مگر آپ نے انہیں منع کر دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ اس کی بدزبانی کو برداشت کرتے رہے۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو آپ اس کے پاس گئے اور نہایت بردبار اور نرم لہجے میں فرمایا "آپ نے جو کچھ فرمایا وہ درست اور بجا ہے، درحقیقت میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے، مزار مبارک کے خدام نے جو کچھ کیا ہے وہ میرے علم اور اشارے کے بغیر کیا ہے مجھے اس کا علم نہیں تھا، آپ برائے خدا معاف کیجئے اور مجھ بدنصیب کے لئے اپنا مغز خالی نہ کیجئے"۔

آپ یہ الفاظ فرماتے وقت اپنی آستین سے اس کی پیشانی کا پسینہ پونچھتے جا رہے تھے اور مختلف طریقوں سے تواضع وانکساری کا اظہار فرما رہے تھے۔ آخر کار اس فقیر کا غصہ دھیما ہوا اور اس نے آپ سے چند درہم مانگے۔ آپ نے فوراً اپنی جیب سے وہ رقم نکال کر اس کے حوالے کی جنہیں لے کر وہ چلا گیا"۔

راوی کہتا ہے "میں ایک گوشہ میں کھڑا ہو کر یہ تمام باتیں سُن رہا تھا میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ حضرت خواجہ صاحب ان باتوں سے کہاں تک متاثر ہوئے ہیں مگر میں نے محسوس کیا کہ آپ کی پیشانی پر کوئی بل نہیں پڑا اور آپ اس کی بدکلامی سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے، لہٰذا مجھے یہ کامل یقین ہو گیا کہ آپ فرشتہ صفت ہیں"۔

سخاوت اور فیاضی

آپ میں سخاوت اور فیاضی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی آپ نے دولت کبھی جمع نہیں کی۔ جو کچھ ملتا تھا فقراء اور درویشوں میں صرف کر دیتے تھے۔ امراء جو رقم آپ کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ آپ اس میں کچھ رقم اپنی طرف سے اضافہ کر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے اور اپنے پاس کچھ نہیں

رکھتے تھے۔

زہد و استغناء آپ کے زہد و استغناء کا یہ حال تھا کہ بہت سے اُمراء آپ کو ہزاروں روپے نذرانہ کے طور پر پیش کرتے تھے مگر آپ انہیں قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب آپ نے سفرِ حجاز کا عزم کیا تو شاہجہاں کے وزیرِ اعظم عبدالرحیم خانخاناں نے ایک لاکھ روپیہ نقد آپ کے اور آپ کے ہمراہیوں کے سفر خرچ کے لئے بھیجا اور اس کے ساتھ ایک خط میں یہ لکھا:۔

"مجھے امید ہے کہ حضور اس ناچیز رقم کو قبول فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں گے"

جب یہ خط اور روپوں کی تھیلیاں آپ کے پاس پہنچیں تو آپ سخت برہم ہوئے اور فرمایا۔

"ہم لوگوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ عام مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کو ضائع کریں اور ان کا سیم و زر صرف کر کے حج کریں"

یہ کہہ کر آپ نے ایک لاکھ روپے کی رقمِ خطیر واپس کرادی اور اسے قبول نہیں کیا۔

سادہ مزاجی آپ کی محفل میں کبھی دنیاوی اُمور کی باتیں نہیں ہوتی تھیں آپ درویشوں اور مسکینوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھے کھانے اچھے لباس کی آپ کو مطلق خواہش نہیں ہوتی تھی۔ بالکل سادہ مزاجی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی طرح آپ کا مکان بھی بالکل معمولی ہوتا تھا۔ آپ کی محفل میں بھی کوئی شان و شوکت نہیں ہوتی تھی، اور نہ کوئی پابندی ہوتی تھی ہر ایک بلا روک ٹوک آجا سکتا تھا۔ آپ کا دربار ہر طالب ہدایت کے لئے کھلا رہتا تھا۔

جس طرح آپ قناعت و توکل کے اصولوں کے پابند تھے۔ اسی طرح آپ اپنے مریدوں کو بھی زہد و استغناء کے اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے آپ اپنے مخلص مریدوں کی مالی امداد بہت کم کرتے تھے، تاکہ ان پر مال و دولت اور دنیاوی عیش و آرام کی طمع غالب نہ ہو۔ اسی وجہ سے آپ اپنے مریدوں کو بار بار کہتے تھے "جسے ہماری

طرف سے مالی امداد پہنچے وہ یقین کرے کہ ہمیں اس سے دینی محبت بہت کم ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ جب امراء یہ چاہتے تھے کہ وہ آپ کے یا آپ کے مخلصین کے لئے مالی امداد مقرر کریں تو آپ بالعموم ان کی پیشکش کو قبول نہیں فرماتے تھے۔

البتہ نو وارد مسافروں اور عوام کے لئے مالی امداد قبول کر لیتے تھے اور بعض اوقات اس قسم کے تنگ دست افراد کے لئے وظائف بھی مقرر کرا دیتے تھے۔

اکلِ حلال

آپ اپنے مریدوں اور عوام کو اکلِ حلال کی تاکیدی ہدایت فرماتے تھے۔ اسی سلسلے میں آپ اپنے خدام اور باورچیوں کو سخت تاکید کرتے تھے کہ کھانا پکانے والا، کھانے پکانے اور تیار کرنے کے وقت باوضو رہے، بلکہ ایسا شخص اہل باطن میں سے ہو تو بہت بہتر ہے تاکہ وہ کھانا تیار کرتے وقت کوئی دنیاوی بات نہ کرے۔ آپ یہ ارشاد فرماتے تھے:۔

"جو لقمہ بے احتیاطی اور حضورِ قلب کے بغیر کھایا جائے اس سے ایک ایسا دھواں پیدا ہوتا ہے جس سے روحانی فیض کی نالیاں بند ہو جاتی ہیں اور پاکیزہ روحیں جو روحانی فیض کا ذریعہ ہیں دل کے پاس نہیں بھٹکتی ہیں"۔

ایک دفعہ ایک صاحب حال وکشف درویش خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا:۔

"میں اپنے کام میں جمود و انقباض اور باطن میں کدورت پاتا ہوں معلوم نہیں کیا بات ہے؟"

آپ نے توجہ دینے کے بعد فرمایا "تمہارے لقمے میں کچھ بے احتیاطی ہو گئی ہے"۔

درویش نے کہا "میں حلال اور غیر مشتبہ کھانا کھاتا ہوں"۔

آپ نے فرمایا "پھر غور کرو، ہمیں اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نظر نہیں آتی ہے"۔

آخر کار جب درویش نے اپنا کھانا پکانے کے بارے میں بہت تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جن لکڑیوں سے درویش کا کھانا پکتا تھا ان میں دو تین لکڑیاں ایسی بھی شامل ہو گئی تھیں جن میں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا تھا۔

ہیبت اور وقار

اگرچہ آپ عجز وانکسار سے کام لیتے تھے، اور لوگوں میں نہایت سادہ مزاجی اور بے تکلفی سے ملتے تھے، تاہم آپ کے چہرۂ مبارک سے ہیبت اور وقار کا اس حد تک اظہار ہوتا تھا کہ اجنبی اور عام لوگ آپ کو دیکھ کر خدا کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اور ہر کس وناکس آپ سے مرعوب و متاثر ہوجاتا تھا

ایک روز کا ذکر ہے کہ آپ ہندوؤں کی بستی میں سے گزرے، بستی کے باہر کچھ لوگ اپنے کھیتوں میں بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، جونہی ان کی نظر آپ کے روئے انور پر پڑی، وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے "یہ کس قدر بزرگ انسان ہے کہ اس کو دیکھنے سے ہمیں خدا یاد آتا ہے"۔

ایک معمّر بزرگ فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ میں خواجہ صاحب کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گیا، اس وقت نماز باجماعت ہورہی تھی اور خواجہ صاحب بھی پہلی صف میں کھڑے تھے، پہلی صف بالکل بھر گئی تھی البتہ خواجہ صاحب کے پہلو میں کچھ جگہ خالی تھی۔ چونکہ میں نے خواجہ صاحب کو بچّہ سا دیکھا اس لئے میں نے آپ کے قریب کھڑا ہونے میں کوئی حرج نہیں سمجھا، لہٰذا میں نے ان کے قریب جاکر نیت باندھ لی مگر تھوڑی دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ آپ کی عظمت وہیبت نے میرے دل پر حملہ کیا۔ میں نے اپنے جسم کو سکیڑنا اور الگ کرنا چاہا مگر آپ کی ہیبت کا اثر میرے دل سے کم نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ آپ کے رعب کی وجہ سے میں نماز ہی میں پیچھے ہٹتا گیا، یہاں تک کہ چبوترے کے قریب پہنچ کر، میں ہوشیار ہوا۔ پھر نماز کے بعد میں آپ کا اس قدر گرویدہ ہوگیا کہ ہر وقت آپ کی خدمت میں شب وروز رہنے لگا۔ تاآنکہ میں بھی آپ کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا"۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک

ایک دفعہ ایک متعصب ہندو مسلمانوں کے لباس میں آکر آپ کے پاس مسجد میں مقیم ہوا آپ حسبِ معمول دیگر مسافروں کی طرح اس کے پاس بھی کھانا بھجواتے تھے، جب تھوڑے دن قیام کرنے کے بعد وہ رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا:

"تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے۔ جو جلد رخصت ہو رہے ہو، اگر تمہیں یہ جگہ پسند نہ ہو تو تمہارے لئے دوسری جگہ کا انتظام کیا جائے۔ جہاں تمہارے ہندو دھرم کے مطابق تمہیں کھانے اور رہنے کی سہولتیں حاصل ہوں گی"۔

وہ ہندو مسلمانوں کے بھیس میں تھا اس لئے راز افشا ہونے پر وہ بہت شرمندہ ہوا تاہم اپنی خفت دور کرنے کے لئے وہ اس کی تردید میں کہنے لگا، "جناب والا! آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ میں ہندو ہوں، میں تو آپ کی مسجد میں نماز پڑھتا ہوں، اور مسلمانوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتا ہوں"۔

حضرت خواجہ صاحب نے کسرِ نفسی کے طور پر فرمایا: "اس بات کو جانے دو بلکہ یہ کہو کہ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی"۔

وہ ہندو آپ کی پردہ پوشی اور رحمدلی سے بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا: "جب آپ جانتے تھے کہ میں مسلمان نہیں ہوں بلکہ ہندو ہوں تو آپ نے میری خاطر مدارات کیوں فرمائی، کیا یہ بات مذہبِ اسلام کے خلاف نہیں ہے؟"

آپ نے فرمایا:

"اسلام تمام دنیا کے انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے اگر میں نے تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھا تو یہ کوئی بُری بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جانوروں کو بھی رزق دیتا ہے"۔

وہ ہندو آپ کے حُسنِ اخلاق کی یہ باتیں سُن کر بہت متاثر ہوا اور فوراً مسلمان ہو کر آپ کے مخلص عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔

بُروں کی اصلاح

آپ اپنی خوش اخلاقی اور ہمدردی کے ذریعہ بُروں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کی بُرائی کے اصل سبب کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ کی خانقاہ کے ایک حجرہ میں ایک درویش نے اپنے حجرہ کے ساتھی کے کچھ روپے چُرا لیے۔ جب وہ روپے چُرا کر حجرہ سے باہر نکلا تو یکایک اسے محسوس ہوا کہ دیواروں کے پردے درمیان سے اُٹھ گئے

اور حضرت خواجہ صاحب اپنے خلوت کدہ میں بیٹھے ہوئے اشارہ سے منع فرما رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں:

"خبردار یہ کام نہ کرنا بُری بات ہے۔ درویشوں کو ایسے کام سے بچنا چاہیئے" یہ محسوس کرکے اس نے فوراً وہ روپیہ جہاں سے لیا تھا وہیں رکھ دیا۔ پھر حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں آکر سارا حال سُنایا۔ آپ اس پر ناراض نہیں ہوئے بلکہ نہایت نرمی اور بردباری کے ساتھ آپ فرمانے لگے:

"جو ہوا سو ہوا، آئندہ اگر تمہیں خرچ کی تکلیف ہوا کرے تو اس فقیر سے کہا کرو۔ اللہ تمہاری سب ضرورتوں کو پورا کرے گا۔"

عشق الٰہی

آپ اکثر عالم ہوش میں رہتے تھے۔ تاہم بعض اوقات آپ پر عشق الٰہی کا جذبہ بہت غالب ہو جاتا تھا۔ اس وقت آپ جنگلوں اور بیابانوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ اس حالت میں آپ جس کی طرف دیکھتے وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا۔ اگر ہوش میں رہتا تو اشکباری کرتا ورنہ بے ہوش ہو جاتا اور اسے دُنیا ومافیہا کی کوئی خبر نہ رہتی۔

ایک دفعہ ایک فوجی افسر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا گھوڑا دروازہ کے باہر خادم کے سپرد کرکے اندر آگیا۔ اس وقت آپ کسی ضرورت کے سبب باہر تھے جب آپ اندر آنے لگے تو آپ کی نظر اسی خادم پر پڑ گئی، جو گھوڑا سنبھالے ہوئے تھا۔ آپ کی نظر پڑتے ہی اس پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی وہ گھوڑے کو چھوڑ کر اور کپڑوں کو پھاڑتے ہوئے چیخنے چلانے لگا۔ اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے تلاش کیا گیا مگر کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔

ایک دفعہ اسی حالت میں آپ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس وقت خطیب منبر پر چڑھا، اتفاقیہ اس کے چہرے پر آپ کی نظر پڑ گئی اسی وقت وہ کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ بے قرار ہو کر نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد اس میں خطبہ پڑھنے کی طاقت نہ رہی، دوسرے خطیب نے خطبہ پڑھا اور آپ نے نماز پڑھائی۔

معمولات آپ ہر وقت عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے اور سنت نبوی کی اتباع میں رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اس قسم کی ریاضتِ شاقہ کی وجہ سے آپ بہت کمزور اور نحیف ہو گئے تھے۔ تاہم عبادت الٰہی میں آپ ہمیشہ چاق و چوبند، مستعد اور سرگرم رہ کر بہت دیر تک مراقب رہتے تھے۔ جب آپ دیکھتے تھے کہ اعضاء پر ضعف و کسل غالب ہوگیا ہے تو آپ اٹھ کر تجدیدِ وضو کرتے اور دوگانہ ادا کرکے پھر حجرہ میں تشریف فرما کر مصروفِ مراقبہ ہوتے۔ رات کا اکثر حصہ آپ اسی طرح گزارتے تھے۔

حنفی مسلک شرعی مسائل میں آپ کا عمل افضل اور عزیمت کے کاموں پر ہوتا تھا۔ بالعموم آپ حنفی مسلک پر عمل پیرا تھے۔ مگر جب آپ نے یہ دیکھا کہ قرأت خلف الامام کے بارے میں بھی صحیح احادیث مذکور ہیں تو آپ نے عزیمت کے اصول کے مطابق امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا افضل سمجھا۔ اور ایک عرصہ تک آپ اسی پر عمل پیرا رہے۔ آخر کار آپ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک طرف کھڑے ہوئے اپنی مدح میں ایک قصیدہ پڑھ رہے ہیں جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے مسلک پر ہزاروں اولیاء عمل پیرا ہوئے یہ دیکھ کر آپ نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چھوڑ دی۔ اور پھر کبھی حنفی مسلک سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔

تصانیف حضرت خواجہ باقی باللہ کی مستقل تصانیف نہیں ہیں تاہم آپ فطری طور پر فارسی کے فصیح و بلیغ ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ ابتدائی عمر میں شیخ صادق حلوائی کی تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ فارسی آپ کی مادری زبان تھی، اسی لئے آپ کے فارسی مکتوبات وملفوظات، فارسی ادب کا ایک بہترین نمونہ ہیں۔ اور [illegible] سلاست، اختصار اور اثر پذیری میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان عبارتوں میں جابجا فارسی اشعار کی آمیزش نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ فارسی تحریر وتقریر میں آپ ہندی انداز اختیار کرنے کی مخالفت فرماتے تھے اور لوگوں کو تلقین فرماتے تھے کہ فارسی، زبان شیریں اور مکمل زبان ہے۔ اس کو ہندی الفاظ ومحاورات سے داغ دار نہ کیا جائے۔

ایک شخص نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک دفعہ یہ الفاظ کہے :

"تو مرا بہر طرزیکہ می رقصائی ، رقصم"

(آپ مجھے جس طریقے سے نچائیں ، میں ناچتا ہوں)

آپ نے فرمایا : فارسی عبارت نہیں ہے بلکہ یہ ہندی محاورے کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔ اسے وہ فارسی داں جو ہندی ضرب المثل سے واقف نہ ہوں ، سمجھ نہ سکیں گے ۔

آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) مکتوبات (۲) ملفوظات و مجالس ۔ (۳) رباعیات (۴) شرح رباعیات (۵) مثنوی (۶) مسائل حقیقت نماز (۷) بیان توحید (۸) دعائے قنوت کی تفسیر ، تفسیر معوذتین ، سورۂ اخلاص کی تفسیر ، بسم اللہ و سورۂ فاتحہ کی تفسیر (۹) رسالہ طریقت (۱۰) تفسیر سورۂ والشمس ۔

ملفوظات و مجالس

آپ کے ملفوظات کو مجالس کی شکل میں ایک نامعلوم مگر نہایت مخلص ادیب مرید نے آپ کی زندگی ہی میں مرتب کیا تھا ۔

جیسا کہ مجلس سوم میں مذکور ہے کہ جب کاتب ملفوظات نے آپ سے آپ کی مجالس کی علم و معرفت کی باتوں کو بقید تحریر لانے کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا : "لکھ کر مجھے دکھا دیا کرو" ۔ چنانچہ چند مجالس کا حال جو بغیر اجازت لکھا گیا تھا ، آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا گیا ۔ آپ نے اس تحریر کی بعض باتوں کو ناپسند کیا لہٰذا اجازت منسوخ ہو گئی ۔

اس کے بعد ۱۰۰۹ھ میں ماہ رمضان المبارک میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی تشریف لائے ، اسی موقع پر انہوں نے ان مجالس کو تحریر میں لانے کی درخواست کی آپ نے بڑے تردد اور تأمل کے بعد یہ درخواست قبول کی ۔ بشرطیکہ صرف وہ باتیں لکھی جائیں جو طریقۂ نقشبندیہ میں داخل ہیں اور مشائخ کی حکایات و خیالات کو اس میں شامل نہ کیا جائے ، تاکہ مشیخت کی دوکانداری کا انداز اس میں ظاہر نہ ہو ۔

اس کام کے لئے دوبارہ کاتب ملفوظات کا انتخاب کیا گیا ۔ لہٰذا انہوں نے خواجہ صاحب کے حکم کے مطابق مجلس مبارک کی حکایات کو نظر انداز کر دیا ۔ البتہ وہ حکایات تحریر کی گئیں جن پر آپ کے کلام کا صحیح مفہوم موقوف تھا ۔

مجالس کی تاریخیں

فارسی زبان میں مؤلف ملفوظات نے مجالس کے لکھنے کا آغاز یکم صفر سنہ ۱۰۰۹ھ سے کیا تھا۔ اور آپ کی وفات کے حال پر انہوں نے ان ملفوظات و مجالس کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ بارہ مجالس کا حال جو سنہ ۱۰۰۹ھ میں ہوئیں تحریر کیا گیا ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل تاریخیں دی گئی ہیں۔

مجلس اوّل، بروز ہفتہ یکم صفر سنہ ۱۰۰۹ھ۔ مجلس دوئم:۔ اتوار ۲ر صفر۔ مجلس سوم:۔ بروز جمعرات ششم صفر۔ مجلس چہارم ۱۱ر رمضان المبارک بروز جمعرات۔ مجلس پنجم ۲۱ر شوال بروز بدھ مجلس ششم:۔ بروز بدھ ۱۳ر ذوالقعدہ۔ مجلس ہفتم بروز ہفتہ ۲۳ر ذوالقعدہ ہوئی۔

مجلس ہشتم:۔ بروز پیر ۲۵ر ذوالقعدہ کو ہوئی۔ مجلس نہم بروز شنبہ ۳۰ر تاریخ ذوالقعدہ کو ہوئی۔ اور مجلس دہم ۱۳ر ذوالحجہ بروز جمعہ ہوئی۔

مجلس یازدہم (گیارھویں) ۱۶ر ذوالحجہ بروز دوشنبہ کو ہوئی اور مجلس دوازہم سہ شنبہ ۱۷ر ذوالحجہ کو ہوئی۔

سنہ ۱۰۰۹ھ کی مجالس

مجالس کی مذکورہ بالا تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف ملفوظات باقاعدہ ان مجالس میں حاضر نہیں ہوتے تھے بلکہ درمیان سال میں سفر پر چلے جاتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۰۰۹ھ میں وہ ماہ صفر میں تین ۳ دن شریک مجلس ہوئے۔ اور ان دنوں کے حالات لکھنے کے بعد وہ کہیں چلے گئے یا جیسا کہ مجلس سوم میں تحریر کیا ہے، حضرت خواجہ صاحب کے حکم سے انہوں نے لکھنا بند کر دیا تھا اس کے بعد جب ماہ رمضان المبارک میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ، خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی سفارش سے مجالس میں حضرت خواجہ صاحب کے ملفوظات کو قلمبند کرنے کا دوبارہ آغاز ہوا۔ تاہم انہوں نے رمضان المبارک کی صرف ایک مجلس کا حال تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد شوال میں بھی صرف ایک مجلس کا حال مذکور ہے۔ ماہ ذوالقعدہ کی چار مجالس کا حال تحریر کیا گیا ہے۔ اور ماہ ذوالحجہ کی صرف تین مجالس کا حال بیان کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۰۱۰ھ کی مجالس

سنہ ۱۰۱۰ھ میں صرف تین مجالس کا حال مذکور ہے یعنی تیرھویں

مجلس کا حال جو ۲۰ رشوال بروز یکشنبہ کو ہوئی ۔ پھر چودھویں مجلس کا حال ہے جو ۱۹ ربیع الاول بروز جمعہ کو ہوئی ۔ اور پندرھویں مجلس کا حال ہے جو ۲ رجمادی الاول بروز جمعہ کو ہوئی ۔

آخری زمانے کا حال

اس کے بعد مؤلفِ ملفوظات' جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے ، طویل سفر پہ روانہ ہوگیا اور ۱۰۱۱ھ میں وہ خواجہ صاحب کی مجالس سے غیر حاضر رہا ۔ اس کے بعد وہ یکم صفر ۱۰۱۲ھ بروز یکشنبہ آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا ہے ۔ جو اس کے حساب سے سولھویں مجلس ہے ۔ اس کے بعد ان دنوں کا حال بیان کیا گیا ہے ، جب کہ آپ کے مرض الوفات کا آغاز ہوگیا تھا ۔ سترھویں مجلس کی تاریخ ۵ رجمادی الآخر ہے ۔ اٹھارویں مجلس کی تاریخ ۱۷ رجمادی الآخر ۱۰۱۲ھ ہے ۔ انیسویں مجلس کی تاریخ ۲۳ رجمادی الآخر بروز جمعرات ہے ، ان تمام مجالس میں آپ کی تکالیفِ مرض کا حال بیان کیا گیا ہے ۔ جس کا خلاصہ ہم نے آپ کی وفات کے حال میں تحریر کیا ہے ۔

سب سے آخری مجلس کی تاریخ ۲۵ جمادی الآخر بروز شنبہ ہے ، جو آپ کی تاریخ وصال ہے ۔ ان آخری مجالس میں مؤلف موصوف نے آپ کے ایام مرض الوفات کا حال نہایت رقّت انگیز طریقے سے بیان کیا ہے ۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم کسی تذکرے کے ذریعے مؤلف موصوف کا نام نہیں معلوم کر سکے ۔ تاہم ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف موصوف فارسی زبان کے بہت بڑے ادیب اور شاعر بھی تھے ۔ انہوں نے دلِ دردمند پایا تھا ، اس طرح انہوں نے اپنی تحریر میں جابجا موزوں اور برمحل اشعار کے ذریعہ اپنی عبارات کو اور زیادہ دلچسپ اور بلند پایہ بنا دیا ہے ۔ اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف خواجہ صاحب کی صحیح تعلیمات کا بخوبی علم ہوا ۔ اور آپ کے بعض ذاتی حالات بھی معلوم ہوئے ، نیز آپ کا علمی شوق اور صوفیانہ مباحث کا تذکرہ بھی اس کے ذریعہ یا آپ کے مکتوبات سے ملتا ہے ۔

ان ملفوظات کی ترتیب و تدوین کا خواجہ ہاشم کشمی نے اپنی کتاب 'زبدۃ المقامات'

میں بھی تذکرہ کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نقلیں حضرت خواجہ صاحب کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء اور حضرت شیخ مجدد الف ثانی کے خلفاء کے پاس محفوظ رہی تھیں۔ بعد ازاں یہ کتاب نایاب و ناپید ہوگئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پیشتر اس کا نسخہ بڑی محنت و جانفشانی سے حاصل کیا گیا تھا۔ اور زیورِ طبع سے آراستہ ہؤا تھا۔ اس کے بعد جناب محمد عبدالغفار صاحب مالک افضل المطابع وافضل الاخبار دہلی نے "حیات باقیہ" کے نام سے آپ کے مختصر حالات ورسائل کے ساتھ فارسی متن مع اردو ترجمہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں افضل المطابع دہلی سے شائع کروایا۔ اس کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ حافظ محمد رحیم بخش صاحب نے کیا۔ اس کے بعد خواجہ باقی باللہ صاحب کے مکتوبات کے اردو ترجمہ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ ملک چنن الدین صاحب مالک "اللہ والے کی قومی دکان" نے لاہور سے شائع کروایا ان مکتوبات وملفوظات کا اردو ترجمہ مولوی قاضی عالم الدین صاحب خلیفہ حافظ عبدالکریم صاحب نے کیا۔

مکتوبات خواجہ صاحب کی دوسری اہم علمی یادگار آپ کے مکتوبات ہیں جو آپ نے اپنے دوستوں اور مریدوں کو تحریر کئے تھے۔ یہ مکتوبات آپ نے خود اپنے قلم سے لکھے تھے، اس لئے ان کی اہمیت زیادہ ہے۔ یہ نہ صرف فارسی ادب کا شاہکار ہیں بلکہ حقائق ومعارف کا گنجینہ بھی ہیں۔ ان کے ذریعہ آپ کی روحانی تعلیمات کے اہم نکات معلوم ہوتے ہیں۔ اور بہت سی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان مکتوبات کا فارسی متن اور اردو ترجمہ بھی دہلی ولاہور وغیرہ کے مختلف مطابع نے شائع کیا تھا۔ مگر آج کل نایاب ہیں۔

ہم آپ کے ملفوظات ومکتوبات میں سے اہم تعلیمات کا خلاصہ اخذ کرکے ایک جداگانہ باب میں بیان کریں گے۔

شرح رباعیات آپ نے رباعیات اور مثنوی کی صورت میں اپنے اشعار کا قابل قدر مجموعہ چھوڑا ہے۔ 'وحدت الوجود' کے مسئلہ پر اپنی چند رباعیات کی شرح آپ نے خود کی ہے۔ جس کا ذکر مؤلفِ ملفوظات نے اس طرح کیا ہے۔

ایک دن ایک عزیز نے عرض کیا، شرح رباعیات کے لئے جس کا نام سلسلۃ الاحرار

ہے اور جو اس زمانہ میں حضرت نے تصنیف فرمائی ہے۔ تاریخ تکمیل کہی جائے۔ آپ نے اس مجلس میں قلم دوات طلب فرماکر انیس[19] تاریخیں اس رسالے کے لئے لکھ ڈالیں کاتب حروف کو صرف دو تاریخیں یاد ہیں جو درج کتاب کی جاتی ہیں۔ باقی تاریخیں رسالہ 'سلسلۃ الاحرار' کے آخر میں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک تاریخ " تجرع خصوص حکم" اور دوسری تاریخ "نظم وجوب" ہے۔

یہ رسالہ اگرچہ آپ کی تصنیف ہے اور اس میں آپ نے نہایت تحقیق وتدقیق سے کام لیا ہے۔ تاہم ظاہری شریعت کی حمایت کی وجہ سے آپ اس تصنیف سے خوش نہ تھے۔ اور فرماتے تھے "یہ ہماری تصنیف عمدہ تصنیف نہیں ہے"! آپ فرماتے تھے "یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ طریقِ توحید کے سوا ایک اور نہایت وسیع راستہ ہے جس کے مقابلہ میں توحید کی راہ ایسی ہے جیسے شاہراہ کے مقابلہ میں تنگ گلی ہو"![1]

اس شرح رباعیات پر حضرت شیخ مجدد الف ثانی نے تعلیقات لکھی ہیں، جو اپنے انداز میں بہت خوب ہیں۔ پھر اس شرح کی توضیح کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی تعلیقات لکھی ہیں جو اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت[2] ہے۔

تعلیمات و ملفوظات

حضرت خواجہ باقی باللہ کی روحانی تعلیمات اسلامی شریعت کے عین مطابق ہیں اس وجہ سے آپ نے دین کی تکمیل اور سنتِ نبوی کے اتباع پر بہت زور دیا ہے۔ اور عام درویشوں میں اسلام کے منافی جو باتیں رائج ہوگئی ہیں، ان کی مخالفت کی ہے۔

---

[1] حیات باقیہ صفحہ ۹۷-۹۸

[2] شرح رباعیات مع تعلیقات حضرت مجدد الف ثانی' کو اردو ترجمہ کے ساتھ' ادارۂ مجددیہ ناظم آباد، کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہمارے صدیقِ مکرم جناب ثنار الحق صاحب ایم۔ اے نے کیا ہے۔

لہذا اس نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے آپ کے مکتوبات و ملفوظات سے اہم تعلیمات کا خلاصہ قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

شیخ تاج الدین کو ہدایات

شیخ تاج الدین صاحب آپ کے بے تکلف مرید تھے، وہ تصوف کے دوسرے سلسلوں کے منازل بھی طے کر چکے تھے، اس لئے آپ کی اجازت کے بغیر بعض مریدوں کی تربیت دوسرے سلسلوں کے مطابق بھی کرتے تھے۔ نیز پوشیدہ طور پر اپنے آپ کو 'اویسی مشرب' کہتے تھے۔ لہذا ان کی اصلاح اور رہنمائی کے لئے آپ مکتوب نمبر ۳ میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

فقیر کو بعض خوابوں میں ایسا معلوم ہوا کہ آپ کا باطن ایک طرح سے فقیر کا نافرمانبردار ہے شرکش ہے۔ یہ واقعات فقر کی بیماری کے بعد ظاہر ہوئے ہیں۔ اس دفعہ جب آپ تشریف لائے تو شرم آئی کہ اس قسم کی باتوں پر کیا توجہ دیں۔

پیر کی اہمیت

اللہ تعالیٰ کی عادت اور سنّت واسطہ اور برزخ کے معتبر ہونے پر ہے، اس سے آنکھ بند کرنا اور اس کو درمیان نہ دیکھنا ترقی کا مانع ہے۔ اگر اتفاقیہ واسطہ کے باطن میں کسی قسم کی کجروی پیدا ہو جائے تو درمیان سے اٹھ جاتی ہے۔

مرشد کا ادب

یہ طریقہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ اور نامقبول ہے۔ بچوں کے استاد کا ادب کہاں تک کیا جاتا ہے۔ لہذا طریقت کے استاد کا ادب، جو فیض کا سرچشمہ اور کشف و شہود کا منبع ہے اور الوہیت کا برزخ ہے، کہاں تک ضروری ہوگا۔

ایک سلسلہ کی پابندی

خواجگان (نقشبندیہ) قدس سرہم کے طریقہ کو محفوظ رکھنا اور توجہ میں ان سے فیض کا طلب کرنا اور دوسرے طریقوں سے نہ ملنا، نہایت ضروری ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ بزرگوار بڑے غیرت

والے اور نازک طبع ہوتے ہیں۔

طریقۂ محققین آپ نے محققین کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان کا طریقہ بعینہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا خلق سے اپنے آپ کو ممتاز نہ سمجھنا۔ عاجز و متواضع رہنا، اپنے آپ کو عام لوگوں کی طرح سمجھنا۔ تمام سنتوں کا اتباع کرنا اور ظاہری اسباب کو وسیلہ بنانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

شیخ کبیر محی الملۃ والدین محمد بن العربی قدس سرہ اپنی کتاب 'فتوحات مکیہ' میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور مشائخ میں حضرت بایزید بسطامی، حمدون قصار اور ابوبکر سعید خراز رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا یہی مقام ہے ——— اور ابو مسعود رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی مقام مساوات سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہی ہمارا حال ہے"۔

ان باتوں کے علاوہ، آپ اس باغ کے میووں کے پروردہ ہیں، اور اپنے خزانچیوں کے نائب ہیں۔ لہذا آپ کے لئے لازم ہے کہ آپ صرف اسی آستانے پر برقرار رہیں"۔

ترجمہ

تاویل الاحادیث

(ادارہ)

دوسری نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم ایک سوکھی ہوئی کھجور کی طرف پناہ لے گئیں، وہ سرسبز ہوگئی اور چند ساعتوں کے اندر اس نے پھل لایا اور خدا نے وہاں ایک چشمہ پانی کا پیدا کیا۔

تیسری نشانی یہ تھی کہ جب سیدہ مریم پر زنا کی تہمت لگی تو خدا نے اس کو اس سے اس کے بچے کے ایسے وقت میں بولنے سے بری کردیا جس عمر میں بچے نہیں بولتے، کیونکہ اس میں قوتِ روحیہ پوشیدہ تھی، اور جب حضرت عیسٰی علیہ السلام جوان ہوئے تو خدا کی طرف سے اس کو علم، کتاب اور حکمت عطا ہوئی۔ اس میں کسی تعلیم کو دخل نہ تھا۔ اُن پر نشانیاں ظاہر ہوئیں، لوگ جو کچھ کھاتے اور گھروں میں ذخیرہ کرکے رکھتے وہ سب ان کو بتاتے تھے، اور وہ مٹی سے پرندے کی شکل پر ایک پرندہ بنالیتے تھے پھر اس میں پھونکتے تھے تو اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا۔ حضرت مسیح کی مٹی میں پھونک کے ساتھ اس میں زندگی آجاتی تھی، پھر یہ دو چیزوں کے درمیان دائر تھا، حضرت مسیح کا زور سے پھونک مارنا اور اس کا زندہ ہونا، اس کے بعد وہ جانور گر کر مردہ ہوجاتا۔

حضرت مسیحؑ اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے، پھر نفس بدن سے وہی تعلق رکھتا تھا اور یہ حقیقی زندگی کا تعلق نہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے اس وہمی تعلق میں اللہ کی طرف سے برکت ہوتی اور اس سے اس پر زندگی کا عکس پڑتا تو مردہ، زندہ ہوجاتا، پھر جب عیسیٰ علیہ السلام جدا ہوتے تو وہ اسی وقت مرجاتا۔

عیسیٰ علیہ السّلام کے دین میں بڑی گنجایش اور آسانی تھی، کچھ ایسی چیزیں جو اُن کے لئے حرام تھیں وہ ان کے لئے حلال کردی گئی تھیں، اس لئے کہ تکلیف وہ احکام اس وقت اُترتے ہیں جب ملکیت کا بہیمیت سے تصادم ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو گویا زمین پر چلنے والے ملک تھے، اس لئے یہود نے ان پر زندیق ہونے کی تہمت باندھی اور ان کے قتل پر جمع ہوگئے۔ انہوں نے ایک تدبیر کی اور اللہ نے بھی ایک تدبیر کی اور اللہ سب سے اچھا تدبیر کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک مثالی صورت بنائی اور اس کو آسمان کی طرف اٹھادیا اور اس کی قوم یا دشمن کے کسی شخص کو ان جیسا بنا دیا تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں قتل ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے گروہ کو دشمن پر مدد دی اور وہ دشمن پر غالب آئے۔

تاویل احادیث نبیّنا محمّد صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کے وہ اصول جو ان علوم کی تاویل اور تعبیر کے مرجع ہوتے ہیں بہت سے اُمور ہیں!

ایک یہ کہ ملأ اعلیٰ (مقدس ملائکہ کی جماعت) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس طرح ایک فطری مناسبت تھی کہ آپ کا نفس ناطقہ بلند تھا اور آپ کا وہ مزاج جس کا تعلق نسمہ یا روح طبی سے ہوتا ہے کامل و معتدل تھا کہ اچھے اخلاق کا مستوجب تھا اور ان کا اجتماع اتفاق اور یک جہتی پر تھا[1]، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ملأ اعلیٰ کی طرف سے آپؐ کے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ آپ کا نسمی مزاج، نفس ناطقہ کے مقتضیٰ کا مصادم نہ تھا، ان دونوں کے تقاضا میں اتفاق تھا۔

قلب مبارک میں دوامی تائید ہوتی رہے اور یہ تائید کبھی اس طرح ظاہر ہوتی تھی کہ ملأ اعلیٰ کی جماعت آپ کو دکھائی دیتی تھی اور کبھی آپ سے باتیں کرتے تھے اور آپ کے دل میں الہام کرتے تھے اور کبھی آپ ان کو خواب میں دیکھتے تھے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک بہادر انسان ہو جو اپنی شجاعت میں کامل ہو، اس کی یہ شجاعت اسے تھوڑی سی بات پر دشمن سے مقابلہ کرنے، جنگ میں کود پڑنے اور مار دھاڑ کرنے پر دمبدم اُبھارتی رہتی ہے۔ ہر خُلق اپنے آثار سے یہی نسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ اپنی بیداری اور نیند میں ملأ اعلیٰ کی تائید کے لئے فارغ ہوتے اور منتظر رہتے تھے تو ملأ اعلیٰ کی طرف سے ان اسباب کے موافق جنہوں نے آپ کو گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اللہ کی مشیت کے مطابق وہاں سے تائید کا فیضان ہوتا رہتا۔

(آپ کے اور ملأ اعلیٰ کے درمیان) اس تعلق اور ربط کی بنا پر آنحضرت کی ہمّت ملأ اعلیٰ کی طرف مصروف تھی اور ہر وقت ان کی برکتوں نے آپ کو احاطہ کر رکھا تھا اور یہ اوقات آپ کے جہاد وغیرہ میں مشغول ہونے کے اوقات ہوں یا مسجد میں اعتکاف کے اوقات ہوں، اور اس تعلق کی بنا پر آپ کے اکثر معجزے برکت کے تھے، کھانے، پینے وغیرہ سب میں برکت ہوتی تھی۔

اس کا منشا یہ ہے کہ وہ نفس، جو ملأ اعلیٰ کی تائید کے لئے تمثال یا تصویر کی حیثیت رکھتا تھا جب اپنی کوشش ہمت سے کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو ان کی ہمتوں کی فراخ راہ کھل جاتی تھی، اور ملأ اعلیٰ کی ہمتیں، عالم موالید (حیوانات، نباتات اور جمادات) کو الہام، احالہ اور تقریب کے ساتھ مسخر کرتی رہتی ہیں۔ پس اگر وہ (ملأ اعلیٰ کے ملائکہ) آگ کے ظہور کا ارادہ کرتے ہیں اور موالید میں اس کے لئے اور کوئی سبب نہیں ہوتا یا کوئی ایسا کمزور سبب ہوتا ہے جو آگ کے پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا تو ملأ اعلیٰ کی ہمّتیں آگ کے پیدا ہونے کو واجب کر دیتی ہیں، اسی پر الہامات کو قیاس کریں۔

اسی خصلت کے باعث آپ کا سینہ شق ہوا اور اس میں حکمت اور ایمان بھرا گیا، آپ کو بیت المقدس کی سیر کرائی گئی، پھر آسمانوں تک اور اس کے بعد جہاں

اللہ نے آپؐ کو بیت المقدس کی سیر کرائی گئی، آپ نے انبیاء علیہم السلام کی ارواح دیکھیں اور ملائکہ کو ان کی اپنی صورتوں اور اشکال میں دیکھا اور انسانِ اعظم[1] کے دل پر جو حق کی تجلی پڑتی ہے آپؐ وہاں تک پہنچے اور وہاں سب سے اچھی صورت میں ظہور فرمایا۔

دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس استعداد سے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا کیا تھا، ملأ اعلیٰ سے تہذیب نفس کے علم کو حاصل کرنے کے مستحق تھے، کیوں کہ آپؐ نفس عالیہ، روح کامل اور مزاج متفق کے صاحب تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپؐ نے دیکھا کہ جملہ نیکیوں کا مدار چار اخلاق پر ہے اور جملہ برائیوں کا مدار ان چار اخلاق کے اضداد پر ہے اور اس کے ضد اور مخالف سے انسان تکلیف کو محسوس کرتا ہے، جس طرح کوئی انسان بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے تو وہ کھانے اور پینے کی طرف راغب ہوتا ہے اور ان کے نہ ملنے سے اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے، پھر آپ سے خود بخود ان اخلاق کے آثار ظہور پانے لگے، جیسے مردِ شجاع سے بہادری کے آثار خود بخود نمایاں ہوتے ہیں۔ اور جس کی فطرت میں عدالت ہو اس سے سیاستِ مُدُن اور تدبیرِ منزل جیسے آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مقصد ہے جو فرمایا، وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ (اور ہم نے ان کی طرف اچھے کام کرنے کی وحی کی)۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور میں تأمّل کیا جو اس زمانے میں نیکی اور گناہ کے کام تھے، اور آپؐ نے اس کو جان لیا کہ دونوں اقسام کا منشأ ہیئاتِ نفسانیہ ہیں اور نفس کے تزکیہ اور آلودگی میں دونوں مؤثر ہیں۔ آپؐ نے یہ بھی معلوم کیا کہ حالت مطلوبہ میں نیک کام کیوں کر زیادہ ہوتے ہیں اور حالت گریز میں گناہ کے کام کس طرح بڑھتے ہیں۔ آپؐ نے ہر عمل کے موقعہ اور ہر شے کا وزن معلوم کیا پھر یہ معلوم کیا کہ اچھے اعمال کو کیسے کیا جاتا ہے اور بُرے کاموں سے کس طرح اجتناب کیا جاتا ہے اور اس کو بھی معلوم کیا کہ

---

[1] انسانِ اعظم سے مراد نوع انسان کا امام ہے۔ اسی طرح عالم بالا میں ہر نوع مخلوق کا ایک امام ہوتا ہے جسے فلسفۂ یونان میں رب النوع کہا جاتا ہے، وہ امام، اپنے نوع کے افراد کی ایک مثالی شکل ہوتا ہے۔

اعمال کے آداب اور ان کے مکملات اور دواعی کیا ہیں۔ یہ سب علوم، نفس کے آئینے میں تامل کرنے سے بطور وجدان اور قیاس کے ظاہر ہوئے۔

تیسرا اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایسی سمجھ عطا فرمائی تھی کہ جس سے ارتفاقات (باہمی معیشت کے اصول) کو جانتے تھے جیسے آداب معیشت، تدبیر منزل، باہمی معاملات، سیاست مُدن اور امت و قوم کی سیاست۔ آپؐ نے وہ مصلحتیں جان لیں جن کا قوم خیال رکھتی ہے۔ صحیح اور سقیم کو معلوم کیا اور اس کو بھی جان لیا جو ان آرائے کلیہ کے لائق ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اُترتی ہیں اور آرائے جزئیہ کو بھی معلوم کیا جو کہ نفوس کے خطرات، سرداروں اور بادشاہ کے ظلم وغیرہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان کی مثال ایک فقیہ کی طرح ہے جو اپنے مشائخ کے مسائل میں تامل کرتا ہے، پھر ہر ایک شئے کی وجہ معلوم کر لیتا ہے اور جن امور کلیہ (قواعد) کو انہوں نے تلاش کیا تھا ان کو بھی جانتا ہے، اور صحیح کو فاسد سے تمیز کرتا ہے۔ یا جیسے عادل حکیم بادشاہ جو گزشتہ بادشاہوں کے رسوم اور عادات کو جانتا ہے اور ان مصلحتوں کا بھی اس کو علم ہے جن کی پچھلے بادشاہوں نے تلاش کی تھی اور ذرائع اور دواعی کو بھی جانتا ہے پھر ایک شئے کو اس کے وسائل کے روکنے سے روک دیتا ہے۔ اگر تم بادشاہوں کی تاریخ میں غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک بادشاہ نے بھاؤ سستا کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ گرانی کا سبب زراعت کی کمی ہے یا تاجروں کی قلت۔ اس کے بعد اس نے گرانی کے سبب دور کرنے کی کوشش کی اور اس کو مطلوب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا یا کسی حاکم نے یہ ارادہ کیا کہ کسی قوم کے شر سے وہ امن میں رہے تو ان کو حکم دیا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں اور ہتھیار نہ باندھیں اور اس قوم کے مددگار بننے سے لوگوں کو اس طرح روکنا چاہا کہ باہمی بیاہ شادی نہ کریں اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر آپس میں ملاقات نہ کریں اس کے مانند اور بھی بے شمار باتیں ہیں۔ اسی طرح سیاست کی مصلحتوں کا نکالنا اور سمجھنا ہوتا ہے۔

چوتھا اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لطف کرنے کا ارادہ کیا کہ اپنی رحمت کا ایسا چشمہ جاری کرے جس پر عرب وعجم کے سب لوگ وارد ہوں اور وہاں مہلک پیاس سے نجات پاکر سیراب ہوں۔ یہ اس لئے کہ عرب وعجم ان فاسد رسومات کے پابند تھے جو اچھے ارتفاقات کی منافی تھیں، دین کی باتوں سے پیٹھ پھیرے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں سے ان باتوں میں زیادہ جاہل تھے جن سے ان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی، یہ لوگ آخرت کی یاد سے بڑے بے خبر تھے، اللہ کے جلال اور اس کی توحید سے غافل تھے بتوں اور شیطانوں کے پجاری تھے، کمزوروں پر بڑا ظلم کرتے تھے، قطع رحمی ان میں زیادہ تھی، اس حالت میں خدا کا ان پر یہ لطف تھا کہ انہیں ان کی بری باتوں پر تنبیہ کی جائے اور انہیں حق کا راستہ دکھایا جائے اور ان کو سیدھے راستے پر چلایا جائے چاہے وہ مانیں یا انکار کریں۔ یہ لطف اس کی تدبیر کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور تدبیر، صفتِ خلق کی بقایا (اور اس کے بعد کی) چیز ہے اور خلق، ابداع کے بقایا سے ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ کلیّہ کو پیدا کیا تو اس کو بہت سے احوال کے لئے سواری بنالیا، اس لئے کبھی وہ انسان ہوتا ہے کبھی گھوڑا، کبھی پتھر وغیرہ۔ ان امور میں نفسِ کلیہ کا قوت سے فعل کی طرف نکلنا نظمِ طبیعی پر ہے اور یہ خیر سے عبارت ہے جو نفسِ کلیہ کے ابداع کے بقایا (اور لوازمات میں) سے ہے اور جس جود نے نفسِ کلیّہ کے ابداع اور پیدائش کی خواہش کی تھی یہ اس کی مقتضیٰ ہے۔ پھر جب عالم اپنی تفصیل سے وجود میں آگیا اور مخلوق کے ہر نوع اور شخص کو ایسی صورت عطا ہوئی جو اس کے مخصوص آثار کی متقاضی تھی اور اس کو اس کے آثار سے روکنا خیر نہ تھا اور نہ ہی ان حوادث کا ظاہر ہونا خیر تھا جو اچھے نظام کے منافی تھے تو ضروری ہوا کہ ارضی اسباب میں ہیجان ہو اور ایسی تحویلات (و تقریبات) وجود میں آجائیں۔ جو اشیاء کو اچھے نظام کے قریب لے آئیں اور اس سے خلق وپیدائش کی تکمیل وتتمیم ہوتی ہے۔ ان تینوں میں جود ذاتی کی مثال اس طرح ہے جس طرح کوئی سیلاب زمین پر آجائے یہاں تک کہ جب کوئی سد اور پشتہ اس سے

مزاحمت کرے تو پانی اس کے سوراخوں میں گھس جائے اور پھر وہ کسی سوراخ سے مثلث شکل کی صورت میں نکلتا ہے، کسی سے مربع اور کسی سے گول دائرہ کی شکل میں، پھر اس پانی کو ایک دوسری دیوار روک دے جو پہلی سے زیادہ مضبوط اور محکم ہو تو اس وقت نمی اور رطوبت زمین اور ہوا کے مسامات میں نفوذ کرے گی تو اس طرح پانی کا کوئی اثر پہنچ جاتا ہے۔ واللہ اعلم

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ کا مذکور ارادہ ملأ اعلیٰ میں متمثل ہوا اور اس نے ایک مثالی شخص کی صورت اختیار کی جس کو ہم نبی الانبیاء کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور یہ شعائر الٰہیہ کی اصل اور بنیاد ہے، وہاں سے زمین پر اللہ کی رحمت کے قطرے ٹپکنے لگے اور ہر دور اور ہر زمانے میں موالید کے مسامات سے لطف و عنایت کے چشمے پھوٹ نکلے اور یہ سلسلہ ان زمانوں اور ان دوروں میں جو مخصوص واقعہ ہوتا تھا ان کے موافق تھا، تو بعضے زمانہ میں اس کا ترشح اور ٹپکنا بنی آدم کے قلوب پر تھا اور ایسے انسانوں کو رسل اور انبیاء کہا جاتا ہے، پھر یہ امر تمام نہ ہوتا تھا جب تک نظام زمین میں ایسا مادہ پایا جائے جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ صورت اس میں منطبع ہو سکے جیسے آئینہ میں انسان کی صورت منطبع ہوتی ہے، تو جس آدمی کی صورت یہاں منطبع ہے وہ ارادہ ہے جو ملأ اعلیٰ میں متمثل ہے اور آئینہ انسانوں میں سے ایک شخص ہے جو حق کے لئے) جھگڑتا ہے، لڑائی کرتا ہے مال خرچ کرتا ہے اور لوگوں کی تالیف قلوب کرتا ہے، جیسے لوگوں کے بادشاہ کیا کرتے ہیں انطباع کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس (کامل انسان) کے افعال میں رُوح قدسی کی پھونک ہو۔ ارادہ متمثل بھی اسی کا نام ہے۔

اس آخری دورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات (صورت منطبعہ کے لئے) مادہ کی حیثیت رکھتی تھی، تب وہاں سے احکام الٰہیہ کا چشمہ پھوٹ نکلا اور اس کے پھوٹنے کے بعد مبہم احکام کا ضبط اور مقادیر کی تعیین بھی ہوئی اس لئے کہ لوگوں کو ایک ایسے مضبوط امر کا مکلف بنایا جائے جس کو تحریف لاحق نہ ہو سکے اور اس میں تسلسل خلل انداز نہ ہو اور وہ امر محسوس کی طرح ہو۔ جس کو قوم ہاتھوں ہاتھ لے لے اور تقرب الی اللہ

میں اسی سے تمسک کریں۔ پھر اللہ نے قرآن عظیم کو نازل فرمایا اور ان کے لئے خانہ قدیم (بیت اللہ) کا طواف مشروع فرمایا اور ان کو احکام الٰہی کا امر کیا۔ قرآن عظیم عربی زبان میں ہی معین ہوا اور بیت اللہ بھی وہی مقرر ہوا جس کا کئی صدیوں سے طواف کرتے آرہے تھے۔ اور شرائع بھی وہ جاری کیں جو اسماعیلیہ اور اسحاقیہ امتوں میں شائع تھیں، اسی کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں (وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ) اور اس نے دین کے احکام میں تم پر کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر قائم رہو۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اچھے ساتھیوں اور صحابہ کی جماعت کے اصل اور اساس میں اللہ تعالیٰ نے امانت کو اتارا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے سینوں میں (حق کی حمایت کے لئے) جہاد کا جذبہ اس طرح پھیل گیا جیسے مشک کو پھونکنے سے اس میں ہوا پھیل جاتی ہے۔ پھر وہ ایک امت ہوگئی جس کو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ظاہر کیا گیا[۲]، اور اللہ کی رحمت نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم غالب ہوا اور اسلام صحرائی اور شہری سب کے گھر میں طوعاً وکرھاً پہنچ گیا۔

پانچویں اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس قدسیہ میں یہ صلاحیت تھی کہ اس پر گزرے ہوئے یا آنے والے زمانے کے واقعات منکشف ہوں اور یہ اس لئے تھا کہ بڑے کلیہ واقعات اپنی مثالی صورت سے ملأ اعلیٰ میں صورت پاتے ہیں اور جزئی واقعات جو کہ معمولی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے ملأ اعلیٰ میں رضا یا ناراضگی کا (پہلو) کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا۔ ملأ اعلیٰ میں صرف اس وقت صورت پاتے ہیں جب ان کے موجود ہونے کا زمانہ قریب آتا ہے، باقی آنے والے واقعات کے لئے تو اسباب ہوتے ہیں جو ان کو ضروری بنا دیتے ہیں اور ان کے اسباب کے لئے بھی اسباب

---

[۱] سورۃ الحج ۷۸۔ [۲] اس میں قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۱۰ کی طرف اشارہ ہے وہ آیت اس طرح ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ

ہوتے ہیں، اسی طرح یہ سلسلہ چلا جاتا ہے۔ پھر جب یہ نظام جملہ اسباب تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جود اور رحمت اس کو ضروری قرار دیتی ہے کہ جس واقعے کے اسباب وجود میں آگئے ہیں اس کی صورت ملاء اعلیٰ کی قوتوں میں صورت پذیر ہو اور جس قدر اسباب بڑھتے جائیں گے اور وقت قریب ہوتا جائے گا تو وہ صورت قوی ہوتی جاتی ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ نظام طبیعی جو نفس کلیہ کی صورت جزئیہ کا دوسرا نام ہے، اس نظام کی معرفت کو علم اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ پھر انسانوں میں جو سب سے پاک طینت کا انسان ہوتا ہے اس کے پاس واقعہ اپنے اول ظہور میں ہی مثالی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور جو شخص اس سے کم درجے کا ہوتا ہے اس کے لئے حادثہ کا صورت پذیر ہونا بعد میں ہوتا ہے، اسی طرح قیاس کرتے چلے جاؤ!

گذرتے ہوئے واقعات کی معرفت اس طرح ہوتی ہے کہ ہم نے کشف سے یہ معلوم کیا ہے کہ حظیرۃ القدس' کی فضا میں بندوں کی صورتیں معلق رہتی ہیں۔ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس سے اس کا نفس کامل ہوتا ہے، ملاء اعلیٰ کے ملائکہ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے، اسی کی مثالی صورت میں نور اور روشنی ظاہر ہوتی ہے اور وہاں سفید نقطہ پیدا ہوتا ہے اور جب کوئی بندہ برا کام کرتا ہے تو اس سے اس کا نفس خراب ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ملاء اعلیٰ میں ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرتا ہے، اس کی صورت میں تاریکی اور سیاہی آجاتی ہے اور وہاں سیاہ نقطہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ صورت حظیرۃ القدس میں اس وقت تک رہتی ہے، جب تک اس دورے کے ختم ہونے کا وقت آجائے۔ جب یہ دورہ ختم ہوگا تو صورت بھی ختم ہوجائے گی۔ جب کوئی عارف ملاء اعلیٰ کے ساتھ مل جاتا ہے تو اللہ کی مشیت سے' ان صورتوں کے دیکھنے سے ان کے سب حالات اس پر کھل جاتے ہیں، کسی کو کم علم ہوتا ہے تو کسی کو زیادہ۔ اس کا مدار' ان کے اللہ کے ہاں درجات پر ہے۔ ہم نے جو انبیاء اور اولیاء کے متعلق کچھ کلام کیا ہے اس کو بھی اس تحقیق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

کبھی کسی بڑے واقعے کے لئے (جو کسی عظیم انعام یا عام ہلاکت کے لئے ہوتا ہے) ملاء اعلیٰ

کے مدارک میں ایک مثالی صورت ہوتی ہے، کامل انسان کو اس کی معرفت ہوتی ہے اور اسی سے (واقعے کو) معلوم کر لیتا ہے اور کبھی عارف کے کان میں ایسی کوئی بات پڑجاتی ہے، جو لوگ آپس میں کر رہے ہوتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی وہ اس سے غافل ہوتے ہیں، تو ان واقعات کی تاویل سے عارف کو یہ سمجھ آجاتی ہے کہ وہ صحیح کی موضوع سے تمیز کر سکے پھر وہ واقع کے مطابق حق کی طرف ہدایت پاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ایسا شخص کم ملے گا جو ملأ اعلیٰ کے ساتھ جا ملے اور اس کے نفس میں اس کے پیدائشی اصل مزاج کے موافق ان پڑے واقعات کا عکس نہ پڑے۔

جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس قدسی میں تمام عالم کی سیاست اور ملت کی امامت رکھی گئی تھی اور آپؐ عظیم تدبیروں میں ملأ اعلیٰ کے ساتھ قوی مشارکت رکھتے تھے۔ تو ضروری ہوا کہ آپؐ کے نفسِ مبارک میں پچھلے لوگوں کے قصوں اور مجموع واقعات کا اس قدر عکس پڑے جس کو ملت سے اشاعت یا اضاعت (ہلاکت) کے لحاظ سے کوئی مناسبت ہو، یا وہ انسان میں اس کے نظم طبیعی کا مقتضیٰ ہو یا بڑے اسباب کا مقتضےٰ ہو، قیامت کے واقعات بھی اسی طرح ہیں جیسے دجّال کا ظاہر ہونا، مہدی کا وجود، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، دَابَّۃُ الْاَرْض کا آنا، یاجوج اور ماجوج کا نکلنا۔ یہ سب واقعات تشبہ اور صورت پذیر ہونے کے لحاظ سے سب بڑے واقعات ہیں، کیوں کہ ان کا مبدا نظم طبیعی ہے۔

ان کی تفصیل یہ ہے کہ ظہورِ قیامت کا آغاز اور اس کی شرائط تین چیزیں ہیں:-

(۱) عام حوادث، جن سے انسان، حیوان اور دوسری بہت سی چیزوں، نباتات اور معدنیات کی بربادی ہوگی، جیسے زمین میں دھنس جانا، عام موت، زلزلے، مہیب آوازیں اور باہمی لڑائیاں۔ ان کے لئے سماوی اور ارضی اسباب مہیّا ہوں گے، جن سے ان واقعات کا ہونا ضروری ہو جائے گا۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ زمین سے خراب صورتیں اوپر جاتی ہیں، جن میں سے کچھ تو لوگوں کے ارادی اعمال سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن میں اُن کو

کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ پھر فضا ان خراب رنگوں کے ساتھ صورت پذیر ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا وجود ان ہی فاسد رنگوں سے ملوث ہو کر نکلے گا پھر دنیا ان نفوس کے پیدا ہونے کے لئے تیار ہو جائے گی جو اللہ کی طرف سے نوع انسانی کے لئے بنائی ہوئی حد سے باہر نکل جائیں گے اور افراط یا تفریط کو اختیار کریں گے تو بعض تجرد اور انسلاخ، (رہبانیات) کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بعض بہیمیت کو اختیار کرتے ہیں اس سے نوع انسان میں بیماری پیدا ہو گی اور پھر دوسری ہیئتیں اوپر جائیں گی اور یہ پہلی ہیئتوں سے نہایت قبیح اور بدبودار ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی ان ہیئتوں سے ملوث ہو کر نازل ہوتا ہے۔ پھر (آگے چل کر) دنیا ایسے نفوس کے پیدا ہونے کے لئے تیار ہو گی جو پہلی حالت سے زیادہ اعتدال سے خارج ہوں گے اور اسی طرح ہوتا رہے گا یہاں تک کہ قیاسات خلل پذیر ہوں گے اور کوئی نجومی اپنے (علم نجوم میں سچا نہ ہو گا اور نہ کوئی طبیعی عالم اپنی طب میں صادق ہو گا اور نیکی بالکل رک جائے گی اور زمین پر کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا پیدا نہ ہو گا۔ زمین پر بہت سے حوادث پیدا ہوں گے یا دعا اور ارواح کی طرف توجہ وغیرہ جیسے عارضی اسباب کی وجہ سے وہ رک جائیں گے اس وقت اس نظام کا ختم کرنا ضروری ہو جائے گا۔

(۳) حکمت ربانی میں ایک مخفی راز ہے جس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں ہے، جس طرح یہ نہیں کہا جاتا کہ آگ کیوں گرم وخشک ہے اور پانی کیوں ایسا نہیں ہے اور سورج کی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کیوں تیز ہے اور مغرب سے مشرق کی طرف اس کی (ذاتی) حرکت ایک سال میں پوری ہوتی ہے۔

اس کے بعد ملت اور خلافت کے واقعات کی (عالم بالا میں) تشبیح کی نوبت آئی، خاص طور پر وہ واقعات جو کہ خلفائے راشدین کے دور میں ظاہر ہوئے۔ جیسے عراق، شام اور مصر کی فتوحات، مال و دولت کی فراوانی، اور یہ کہ کسریٰ ہلاک ہوا، اور اس کے بعد کسریٰ نہیں ہے۔ اور قیصر ہلاک ہوا پھر اس کے بعد قیصر نہیں ہے۔ پھر اس ظالم بادشاہ کے واقعات جو بنی امیہ میں ہوا، ان واقعات نے قوی اثر چھوڑا۔ پھر بنی عباس کی حکومت

کے واقعات، اس کے بعد ترک سلجوقی، چنگیزی وغیرہ کے فتنے ہوئے۔

جاننا چاہئے، کہ ان حوادث اور واقعات کی صورتوں کے مختلف طبقے اور درجے ہیں، جب کسی بڑے واقعے کو چھوٹے سے نسبت دی جائے تو چھوٹا یوں نظر آئے گا گویا کچھ بھی نہیں ہے، تب حصر کے ساتھ کہا جائے گا کہ بس یہی حادثہ ہے، جب اس کو کوئی ایسا شخص دیکھے گا جس کو حقیقتِ حال کا علم نہیں ہے تو وہ اس کو خلاف واقعہ سمجھے گا اور اس میں اعتراض کرے گا جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا قول ہے کہ ہمارا ملک شام ہی ہے۔ اس میں جو انحصار معلوم ہوتا ہے اس سے ایک متحیّر کو حیرت ہوگی کہ شام کے سوا اور ملک بھی تو وسیع اور زیادہ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت کی طرف نظر فرمائی جو دوسرے درجے پر تھی پھر آپؐ نے اسی کی خبر دی، اور اس کو جب تیسرے طبقے سے نسبت دی جائے گی تو ایسا معلوم ہوگا کہ تیسرے طبقے میں کسی بھی شئے کی صورت نہیں ہے۔ اور اسی طور آپؐ نے فرمایا کہ دین غالب ہوگا جب تک بارہ خلیفہ ہوں، (اس کو سن کر) شک کرنے والا یہ شک کرے گا اور کہے گا کہ اس سے اگر خلافتِ نبوّت مراد ہے تو وہ تیس برس میں گزر گئی اور اس میں چار خلیفے ہوئے اور اگر خلافت سے مراد عدل و دیانت کا دور ہے تو یہ بارہ خلفاء کے دور میں تھا اور ان کے بعد بھی عدالت، اور دیانت حسن طریقے پر رہی ہے اور اگر بارہ خُلفاء سے مراد متفرق ہے، تو عادل لوگ ان بارہ سے زیادہ گزرے ہیں۔

حق یہ ہے کہ ملّت کو درجہ بدرجہ انحطاط اور تغیر لاحق ہوتا ہے، جو بات چار خلفائے کے دور میں تھی وہ دوسروں کے عہد میں نہ تھی، اور جو کچھ شام کی حکومت کے دور میں تھا وہ بعد میں نہ رہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طبقوں کو شمار فرمایا، اور ان کے بعد کے دَور کا زیادہ خیال نہ فرمایا، تو یہ دو طبقے بارہ خلفاء میں پورے ہوگئے جو سب کے سب قریش میں سے تھے۔ ان نو خلفائے راشدین ہیں اور حضرت معاوؓ حضرت عبداللہ بن زبیر، عبدالملک اور اس کی اولاد سے چار اور حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ پھر رونما ہوا جو کچھ ہوا۔ اسی طرح قرب قیامت کے سلسلے میں آپؐ نے فرمایا کہ میں قیامت

کے آگے بھیجا گیا ہوں۔ اس میں آپؐ نے ان وقائع اور مدت کو شمار نہ فرمایا جو اس سے پہلے ہیں۔

چھٹی اصل یہ ہے کہ نور جس کا ہم نے پہلے نبی الانبیاء نام رکھا ہے، اس لائق تھا کہ خدا پاک کی طرف سے خاص رحمت کے نزول میں حق کا جارحہ بنے، ایسی رحمت کہ گنہگاروں کے نفوس کو اچھی طرح گھیر لے، ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے اور دنیا کی جن خسیسہ ہیئتوں سے ان کے نفوس آلودہ ہو گئے ہیں یہ رحمت ان کو ہٹا دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت اللہ تعالیٰ کا جارحہ بننا، اس کا منشأ وہ لطف ہے جو آج کے دن شرائع کے نزول، پیغمبروں کے بھیجنے اور زمین میں اللہ کے شعائر مقرر کرنے کا سبب ہوا۔ لیکن یہ ایک نہایت کامل انسان کی پر جوش ہمت پر موقوف ہے، تاکہ اس کی ہمت پگھلے ہوئے سونے کے قالب کی طرح ہو یا پرندوں کے گھونسلے کی طرح یا جیسے مبہم مادہ کے لئے صورت ہوتی ہے۔ اس کی مثال نفس کلیّہ جیسی ہے کہ وہ زمین پر نہیں اترتا اور نہ موالید میں ظاہر ہوتا ہے اور نہ ہی مخصوص قالبوں میں متقین ہوتا ہے مگر انسان کے استعدادات اور صوتوں کی بارش کے ساتھ اس کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لئے نفس ناطقہ کے فیضان کے لئے والد کا نطفہ اور والدہ کا رحم شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی طرح نفس نباتی کے فیضان کے لئے ہوا کا حلول، پانی کا زمین میں ہونا اور بیج کا واقعہ ہونا ان سب کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اسی پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کریں۔

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنی سابق تقدیر میں یہ مقدر کر رکھا تھا کہ یہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، اس دن وہ خدا کی طرف (دُعا کی) بڑی رغبت کریں گے، ان کی دعا کی وجہ سے اللہ کا جود نبی الانبیاء کے ذریعے برستا رہے گا۔ یہ راز آپؐ کے نفس مبارک میں پوشیدہ ہوا، آپؐ نے اپنی ذات کی معرفت سے اس راز کو بھی جان لیا اور اس سے حشر کے واقعات کا علم بھی آپؐ کو حاصل ہو گیا اور اس سے یہ بھی

ضروری ہوگیا کہ آپؐ تمام انسانوں کے قائد اور امام بنیں اور تمام لوگ حضرت آدمؑ اور ان کے سوا سب لوگ آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہوں اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شفاعتِ کبریٰ کے فاتح ہوں۔ آپؐ کی شفاعت کے لحاظ سے لوگوں میں زیادہ سعادت مند وہ انسان ہوگا جس نے اپنے نفس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی استعداد اور ملکہ حاصل کیا ہوگا اور آپؐ پر زیادہ دُرود پڑھا ہوگا۔ آپؐ کے اس کمال سے چار علوم پھوٹ کر نکلے:

ایک علم محاسبہ ہے، محاسبہ کہتے ہیں ان اچھے اور بُرے اعمال کی اطلاع پانے کو جو نفوس کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں اور ان کا اثر نفوس میں نقش ہو چکا ہے۔ اور علم محاسبہ کی دوسری بات یہ ہے کہ ہر عمل کے عذاب یا ثواب والی خاصیت کو بھی معلوم کیا جائے۔ اس دن اس پر اطلاع اس طرح ہوگی کہ نفوس پر جو دُنیا کی غلیظ تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں، وہ سب چھٹ جائیں گی، تو یہ محاسبہ انسانوں کی وجہ سے اس دن مخصوص ہوگا، باقی اگر حق تعالیٰ کی طرف سے دیکھا جائے تو محاسبہ میں کوئی تجدد نہیں ہے، یہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

جب محاسبہ کا وقت آئے گا تو حکمتِ الٰہیہ کے ہاں یہ ضروری ہوگا کہ مثالی صورتیں ظاہر ہوں، جن میں محاسبے کی روح داخل ہو جائے، اور اس میں انسان اکبر کی طرف سے تخصیص پیدا ہوگی، جیسے انسان اصغر کی طرف سے یہ تخصیص ہوتی ہے کہ اس کے مدرکات میں بزدلی خرگوش کی صورت میں اور غضب شیر کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔

اہم مثالی صورتیں جن کو پیغمبر علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے چند چیزیں ہیں:

ایک عرضِ اعمال اور اعمال کا ان کے مناسب ذاتی اشکال میں صورت پذیر ہونا یہ صورتیں کسی طرح ان کو لازم ہوتی ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال و دولت کی زکوٰۃ نہ دینے والے کے متعلق یہ فرمایا کہ اس کی گردن میں گنجے سانپ کا طوق پڑے گا، یا اونٹ اپنے پاؤں سے اُس کو روندیں گے اور گائیں اُس کو اپنے سینگ

ماریں گے۔ غاصب اور خائن کے حق میں بھی اسی طرح آیا ہے، آپ نے فرمایا کہ غادر یعنی عہد شکنی کرنے والے کے سُرین پر جھنڈا گاڑا جائے گا۔[1] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا نور ان کے آگے آگے چلے گا۔[3] یا وہ صورتیں عرضی ہوں گی جیسے چہروں کا روشن ہونا یا سیاہ ہونا اور مؤذن کی گردن کا دراز ہونا، وغیرہ۔

مثالی صورتوں کی دوسری مثال نامۂ اعمال کا پڑھنا، دائیں ہاتھ یا بائیں ہاتھ سے یا پشت کی طرف سے نامۂ اعمال کو پکڑنا اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح کلام کرنا: کیا میں نے تجھ کو سردار مُطاع نہیں بنایا تھا۔[4]

تیسری مثال یہ ہے کہ ہر امت کو حکم ہو گا کہ اپنے معبود کے پیچھے ہو جائے پھر وہ ان کو جہنم میں گرائے گا اور مؤمن خاص تجلّی کے ذریعہ بچ جائیں گے جس کو انہوں نے اللہ اور اس کی صفات کا صاحب اعتقاد کیا تھا۔

چوتھی مثال میزان کا قائم ہونا اور اعمال کا تولنا، یہاں تک کہ وہ پرچہ جس میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہو گا وہ تولا جائے گا۔

پانچویں مثال چھپی ہوئی خصلتوں کا ظاہر ہونا، جنہوں نے دینی اعمال کی خاص صورت نہیں پائی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کا حکم فرماتا ہے اور اس کی تعمیل کی جاتی ہے تو اس سے تابعداری اور رجاء وغیرہ ظاہر ہوتی ہے۔

چھٹی مثال پُل صراط کا کھڑا کرنا اور دوزخ کے کانٹوں کا ظاہر ہونا تو کچھ

---

[1] یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے، جس کو ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

[2] اس حدیث کو امام بخاری نے بروایت حضرت ابن عمرؓ اپنی صحیح میں "باب اثم الغادر" میں ذکر کیا ہے۔

[3] سورۂ تحریم آیت ۸۔

[4] اس حدیث کے لئے دیکھئے کتاب النہایۃ تالیف حافظ ابن اثیر جزری جلد ۲ صفحہ ۶۲، ۶۳ طبع خیریہ مصر

لوگ بجلی کی طرح گزر جائیں گے یا ہوا کی طرح یا عمدہ گھوڑے کی طرح۔ اور کچھ پیدل ہوں گے جو سلامت گزر جائیں گے اور کچھ لوگ زخم کھاکر نجات پائیں گے۔ بعض ایسے ہوں گے، جن کو کانٹے اچک لیں گے اور وہ دوزخ میں گر پڑیں گے یہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے محاسبہ کی صورتیں ہیں اور نفوس کا اپنے اعمال کی حالت پر اطلاع پانا ہے۔

دوسرا علم نزول رحمت ہے بنی الانبیار کی راہ سے۔ ہم اس کی حقیقت پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ کئی صورتوں سے متمثل ہوکر ظاہر ہوتا ہے:۔

۱۔ انبیار، رسل، اولیسار، قرآن اور اعمال کی شفاعت کا ہونا اور انبیار اور ان کے ساتھی شہدار کا سرکش کافروں سے مخاصمہ کرنا اور جھگڑنا اور ان کا ان سے ہنسی کرنا اور ان کی مصیبت پر خوش ہونا۔

۲۔ حوض کا ظاہر ہونا اور یہ کہ مؤمن مخلص اس حوض کا پانی پئیں گے اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو اس حوض سے ہنکایا جائے گا، جیسے اجنبی اونٹ کو ہنکایا جاتا ہے۔

تیسرا علم، آرام اور تکلیف کا جوہری یا عرضی مناسب صورتوں سے متمثل ہونے کا علم ہے۔

جاننا چاہیئے کہ نفسِ انسانی جب تک دنیا میں ہوتا ہے تو اپنے بنی نوع کی طرح کئی طریقوں سے نفع حاصل کرتا اور آرام پاتا رہتا ہے، جیسے اچھا کھانا، اچھا پینا، مرغوب شادی، عمدہ لباس، اچھی رہائش اور دوسرے بھی کئی منافع ہیں جو ایک ایک فرد کے ساتھ مخصوص ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی اسی نوع سے ہے جو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جعفرؓ کے لئے ایک لونڈی پیدا کی ہے جو گندم گوں اور سرخ ہونٹ والی ہے۔ یہ اس لئے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو گندم گوں، سرخ ہونٹ کی طرف رغبت تھی۔ پیغمبر علیہ السلام کا اونٹ اور گھوڑے کے متعلق فرمانا بھی اسی قسم سے ہے، تب کوئی ایسی آرام وہ حالت جو ہمارے خواب

میں وہ انس، انشراح اور اطمینان کا لباس پہن کر آئے گی تو ایسی حالت مؤمن کو جنّت میں عطا کی جائے گی، اور اسی طرح کوئی تکلیف وہ حالت جس سے نفرت، وحشت اور تنگ دلی پیدا ہوتی ہے ایسی حالت کافر اور منافق کو دوزخ میں دی جائے گی یہ مجمل کلمہ تھا جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی طرح شرح فرمائی۔

چوتھا علم، لوگوں پر جنّت کے ایک ٹیلے پر اللہ تعالیٰ کی تجلّی ہے، یہ ایک ایسا عطیہ ہے جو لوگوں کو ان کے عمل کی وجہ سے عطا نہیں ہوا بلکہ اس کو انہوں نے کسب کو چھوڑ کر وہبی اور جبلی بخشش سے حاصل کیا ہے۔ یہ عطا ان پر اس لئے ہوئی ہے کہ ان کو نفسِ انسانی عطا ہوا ہے اور اچھی صورت پر ان کی پیدائش ہوئی ہے، ہاں اعمال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ موانع کو ہٹاتے ہیں اور حجابات کو اٹھا لیتے ہیں، اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تحقیق تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھتے ہو، پھر اگر تم میں سے کوئی یہ طاقت رکھتا ہے کہ صبح اور عصر کی نماز کو نہ چھوڑے (اور اس پر دوام کرے) تو یہ عمل کرو!

جاننا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی ذات میں سوچنے کو ہمارے لئے مباح نہیں فرمایا بلکہ اس سے منع فرمایا ہے کہ "خالق میں تفکّر نہ کریں" اور یہ بھی فرمایا کہ "رب تعالیٰ کی ذات میں سوچنا نہیں ہوتا" اس نہی میں اللہ کی صفات کی بحث بھی داخل ہو گئی یعنی اللہ کی صفات کے حقائق کا بیان اور صفات کے ساتھ ذات کے متصف ہونے کی کیفیت کہ سمع و بصر دونوں غیر علم ہیں یا عینِ علم ہیں۔ کلام نفسی ہے یا کوئی دوسری شئے ہے۔ اسی پر دوسرے مباحث کو بھی قیاس کریں، باقی کچھ چیزیں ضرور ایسی ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب و عجم کے نفوس ادراک کرتے ہوئے پایا اور وہ ان صفات سے رب تعالیٰ کی توصیف کرتے ہیں تعظیم و تقدیس، تنزیہ اور تشبیہ کے ساتھ۔ جیسے یہ کہنا کہ اللہ کو مخلوق پر قدرت حاصل ہے۔ وہی اس دُنیا کا نظام چلاتا ہے اور اس کی مانند (دوسری عبارتیں بھی ہیں)۔

جب آپؐ نے دیکھا کہ لوگوں کا کمال ان ہی چیزوں کی معرفت کے سوا کامل نہیں

ہوگا اور آپؒ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ ہر زمانے میں ان ہی اوصاف سے رب تعالیٰ کی توصیف کرتے آرہے ہیں اس لئے آپؒ نے بھی اللہ تعالیٰ کے واقعات اور نعمتوں کی تذکیر کی اساس ان ہی اوصاف پر رکھی اور اپنے کلام مبارک میں ان کو استعمال فرمایا جیسے وہ استعمال کرتے تھے، آپؒ نے ان کی حقیقتوں کی شرح اور کنہ کے بیان کرنے سے گریز فرمایا اور تشبیہات کے استعمال سے بھی آپ پیچھے نہ رہے جیسے ہاتھ، پیر اور ضحک (ہنسنا۔ وہ قرون جو پیغمبر علیہ السلام کے فرمود کے مطابق خیر القرون ہیں وہ بھی اسی طرز پر گزریں، بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنا نام 'اہل سنّت' رکھا، حالانکہ سنت ان سے کئی منزلیں دور ہے۔ انہوں نے بے فائدہ باتوں میں کلام کرنا شروع کر دیا اور ایسی بات کہنے لگے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کہی تھی۔ خدا اس عام مصیبت سے پناہ میں رکھے اور اللہ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

وہ معجزات جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ان کے وہ اصول جن کی طرف وہ معجزات رجوع ہوں، بلکہ جو کرامتیں جملہ کامل لوگوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کی بھی اصل کئی چیزیں ہیں !

ایک، ہمت ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کے نفوس میں ایک نقطہ ہے جس کی طرف سب نفوس کھنچ کر آتے ہیں اور وہ ان پر غالب آتا ہے اور ان کو اپنی طرف اس طرح کھینچتا ہے جس طرح مقناطیس، لوہے کے اجزاء کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پھر اگر قوی سعادت والا ہوتا ہے تو وہ اس کو واجب قرار دیتا ہے کہ اس کے نفس میں اور اس کے اردگرد میں جو لوگ ہیں ان کے نفوس میں بلکہ بہائم اور ملائکہ میں بھی ایسے خیالات ڈال دیئے جاتے ہیں جو اس کی رفاہیت (آرام) اور رفاقت کی رغبت دلائیں اور اگر وہ شقاوت اور بدبختی میں قوی ہوتا ہے تو وہ اس کو واجب کرتا ہے کہ اس کے نفس میں اور اس کے اردگرد جو انسان، ملائکہ اور بہائم ہوں، ان سب کے نفوس میں ایسے خیالات ڈال دیئے جاتے ہیں جو اس کو تکلیف میں ڈال دیں اور بلا میں پھنسائیں۔

(مسلسل)

افکار و آراء

ملیشیا سے ایک خط[1]

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی یاد

میں تقریباً بیس برس کی جدائی کے بعد آپ کو اس خیال سے یہ خط لکھنے کا موقع نکال رہا ہوں کہ ہم اپنی دوستی کی تجدید کر سکیں اور دوبارہ ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ براہِ کرم میرے اس خط کو یوں سمجھیں، گویا میں خود آپ سے خاموش ملاقات کر رہا ہوں۔

میرا خیال ہے، آپ کو اب بھی یاد ہوگا کہ جامعہ نگر اوکھلا (دہلی) میں بابو رفیق کے مکان میں منتقل ہونے سے پہلے میں کچھ عرصہ آپ کے ہاں مقیم رہا تھا۔ میں اُس وقت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا شاگرد تھا۔ یہ کوئی ایک چوتھائی صدی پہلے کی بات ہے۔ اور اُس وقت تک دوسری جنگ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی۔

۱۹۴۴ء کے آغاز میں جب پوری دنیا تاریخ کی خوں ریز ترین جنگ کی لپیٹ میں آگئی تھی میں کسی نہ کسی طرح فوج میں داخل ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اور مجھے سیلون بھیج دیا گیا۔ اسی سال کے آخر میں (شاید اگست کا مہینہ تھا) روزانہ "مدراس میل" میں میں نے پڑھا کہ ہمارے محبوب استاد مولانا عبید اللہ سندھی رحلت فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اس افسوسناک سانحہ نے میرے دماغ کو مختل کر دیا۔ کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ فوج میں اپنی مدت

---

[1] یہ خط الرحیم کے سابق مدیر پروفیسر محمد سرور کے نام ہے۔ مدیر

ملازمت پوری کر کے، جو کچھ عرصے کے لئے تھی، پھر مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر پڑھوں گا۔

جب ۱۹۴۵ء کے آخر میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی تو میں بدستور فوج میں تھا۔ اسی سلسلے میں میں کلکتہ، برما اور تھائی لینڈ میں رہا۔

۱۹۴۶ء کے شروع میں میں اپنے وطن لوٹا۔ خدائے برتر کا شکر ہے کہ جنگ سے میرے ملک کو کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا اور مجموعی طور پر زندگی اُس وقت کوئی زیادہ خراب نہ تھی۔ میری عزیز والدہ زندہ تھی، اور مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی۔

اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی مہربانی سے، جو بڑے اشتیاق سے میری واپسی کے منتظر تھے، مجھے اپنی خواہش اور آرزو کو پورا کرنے کا موقع ملا کہ میں ایک مدرسہ قائم کروں۔ میں نے اس مدرسہ کا نام "مدرسۃ الاصلاح" رکھا۔ میرا ارادہ اس "مدرسۃ الاصلاح" کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو اپنے محبوب اُستاد مولانا عبید اللہ سندھی کی "تجدید" کے مطابق متعارف کرانا اور پھیلانا تھا۔

شروع کے اہم دور میں اپنے اس کام میں مجھے مقامی علماء کی طرف سے بالخصوص اور سرکاری افسروں کی جانب سے بالعموم طرح طرح کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں مجھے مختلف قسم کے الزامات کی جواب دہی کے لئے، جو اُن لوگوں نے مجھے بدنام کرنے اور میں نے اپنے اُستادوں سے جو علم حاصل کیا تھا، اس کے معیار کو کمتر ثابت کرنے کے لئے مجھ پر لگائے تھے، متعدد بار عدالت میں جانا پڑا۔ لیکن خدا تعالیٰ کی عنایت سے ان کی تمام تخریبی کوششیں ہمارے فاضل اور محبوب استادوں کی جلائی ہوئی روشنی کو ملیشیا کی ریاست کیلنتان کے فرزندوں کے دلوں سے گُل نہ کر سکیں۔ اور وہ بدستور الٰہی صداقتوں کی تلاش میں ہیں۔

نہ صرف ریاست کیلنتان میں بلکہ اس لحاظ سے پورے جزیرہ نما ملایا میں خاص کر ۱۹۵۷ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس اہم سال سے لے کر اب تک گو میں اُس علم کو جو میں نے اپنے فاضل اُستادوں سے حاصل کیا تھا نیز حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفۂ اسلام کو ایک حد تک پھیلاتا رہا، لیکن مندرجہ ذیل اسباب

اس میں حارج ہوتے رہے۔

(ا) تعلیم یافتہ اور شعور رکھنے والے لوگوں کی کمی۔

(ب) مالی امداد کی کمی۔

میرے دوستوں اور حامیوں کے دلوں پر جن کی یہ خواہش ہے کہ یہاں کے لوگوں میں علم کا یہ شعبہ فروغ پائے اور اُن کے دلوں میں اپنا مقام پیدا کرے، ان دو سنگین باتوں کا بڑا بار رہے۔

اس سال کے ماہ اپریل میں مجھے دوبارہ ہندوستان جانے کا موقع ملا، میں نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل کرایا ہے۔ قیام ہندوستان کے دوران میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے متعدد سابق شاگردوں کے ہاں حاضری دی۔ اس ضمن میں میں دیوبند بھی گیا۔

میرا ہندوستان جانے کا مقصد، اپنے بیٹے کو داخل کرانے کے علاوہ، یہ بھی تھا کہ تعلیمی منصوبوں اور اُن کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں ضروری مشورے کروں۔ مجھے اُمید ہے کہ میں ملائی یا ملیشیائی طلبہ کو اس قابل بنانے میں کامیاب ہوسکوں گا کہ وہ مغربی تعلیم کی بنیاد پر اسلام کے فلسفہ کو سمجھ سکیں اور اس کا مطالعہ کرسکیں۔ اس طرح میں توقع کرتا ہوں کہ میرے ملک کے دانشمند اور بااصول لوگ ایک دن صحیح اسلامی برادری قائم کرسکیں گے جو ایک عرصے سے میری پُرزور خواہش، اور میرے ملک کی آرزو ہے۔

اب یہاں کے بہت سے طالب علم اعلیٰ تعلیم باہر کے ملکوں میں — جیسے مصر، مکہ معظمہ اور بغداد وغیرہ میں — حاصل کرتے ہیں۔ لیکن وہ جہاں علم 'شریعت' پڑھتے ہیں، وہاں اسلام کا فلسفہ اُن کی تعلیم میں داخل نہیں۔ اس لئے عملاً یہ ممکن نہیں کہ وہ اسلامی ملت کو منزل مراد تک پہنچا سکیں۔

میرا شروع سے یہ عقیدہ رہا ہے (اور یہی میرے دوستوں کا ہے) کہ آنے والے سالوں میں مستقبل کے رہنماؤں کے لئے جو قوم کو صحیح اسلامی طریقے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں،

حضرت شاہ ولی اللہ رح کی اسلامی فلاسفی کا جاننا اور اُسے پڑھنا ضروری ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ دنیائے اسلام میں درس وتدریس کے مراکز یوں تو بے شمار ہیں لیکن کوئی ایسا علمی مرکز نہیں ہے، جو اسلامی سیاسیات کو وسیع ترمعنیٰ میں طلبہ کے ذہن نشین کرنے میں مدد دے۔ اس سلسلے میں میں چاہوں گا کہ ہمارے ہاں سے طلبہ تاریخ، فلسفہ، معاشیات، علم الانسان اور دوسرے علوم پڑھنے کے لئے آپ کے ملک میں آئیں، اس بارے میں میری رہنمائی کیجئے۔ ان علوم سے فارغ التحصیل ہونے اور اُن میں ڈگری لینے کے بعد وہ شاہ ولی اللہ رح کی اسلامی فلاسفی پڑھیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف اسی طریقے سے میرے ملک کو ایسے مسلمان لیڈر مل سکتے ہیں جو مغربی دانشوروں اور مغرب سے تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کو متاثر کرسکیں گے۔

میں بڑا ممنون ہوں اگر آپ شاہ ولی اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھی پر انگریزی زبان میں کچھ کتابیں بھجوا سکیں، کیونکہ میرے انگریزی خواں دوست انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔

آپ کا

HAJI NIK MOHD SALLEH BIN HAJI WAN MUSA

No: 1612. JALAN MERBAU

KOTA BHARU KELANTAN

WEST MALAYSIA.

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریکِ ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمتِ ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے
اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل
بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۲۲ سال پہلے مکۂ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّٰی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰٫۰۰ روپے

تصوّف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوّف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے۔ نفس انسانی
تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

ایس۔ ایم۔ رفیق منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد سرور پبلشر نے
شاہ ولی اللہ اکیڈمی جامع صدر سے شایع کیا

جلد نمبر ۵ ماہ فروری ۱۹۶۸ شمارہ نمبر ۹

بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر، حیدر آباد

الرحیم

جلد ۵	ماہ فروری ۱۹۶۸ء مطابق ذیقعد ۱۳۸۷ھ	نمبر ۹

فہرست مضامین

شذرات

شاہ ولی اللہ صاحب کا زمانہ اٹھارویں صدی عیسوی کا ہے، آپ ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۶۳ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔ اس صدی میں دنیائے اسلام کے ہر حصّے میں زوال کے آثار واضح طور پر سامنے آگئے تھے۔ یوں تو مسلم معاشرے کا داخلی انتشار اور اس کے عناصر ترکیبی کی باہمی کشاکشی کافی عرصہ پہلے سے جاری تھی، اور اس کے قوائے حیات میں بتدریج ضعف و اضمحلال آرہا تھا، لیکن اس صدی میں یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اس زوال سے فائدہ اٹھانے والی اور اس طرح اس کی رفتار کو تیز تر کرنے والی یورپی قوموں کی طاقت تاریخ میں نمودار ہوئی اور اس کی یلغار اور معاشی لوٹ کھسوٹ اور بعد میں اس کے سیاسی تسلّط نے دنیائے اسلام کے زوال کی تکمیل کردی۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا ۱۷۶۳ء میں انتقال ہوا اور اس سے چھ سال پہلے انگریز پلاسی کی جنگ جیت کر بنگال پر قابض ہو چکے تھے۔

تاریخ ہند و پاک کے مشہور محقق پروفیسر شیخ عبدالرشید نے حال ہی میں 'اٹھارویں صدی میں برصغیر کے مسلمانوں' پر ایک مقالہ لکھا ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کا بھی ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے اور ان کے جانشینوں نے اس برصغیر میں پہلی دفعہ صورت حالات کے جائزہ لینے اور مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں لوگ فوجیوں اور سیاست دانوں سے مایوس ہو چکے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ برّصغیر کی اس نازک گھڑی میں ان میں سے کوئی بھی آگے نہ آیا، جو حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتا، مجبوراً لوگ صوفیہ کی خانقاہوں اور علماء کے مدرسوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان سے اپنا مداوا چاہا۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشین اس طبقے میں سے تھے، اور ان کی تحریک اس دور میں جو قومی جدوجہد ہوسکتی تھی اس کا ایک منظم اظہار تھی، اس کی بدولت مسلمان اس قابل ہوسکے کہ وہ اس سیلاب میں جوان کو غرقاب کر رہا تھا اپنا سر اونچا رکھ سکیں۔

پروفیسر شیخ عبدالرشید نے اپنے مضمون میں بعض اہل قلم کے ایسے اقتباسات دیئے ہیں، جن میں حضرت شاہ صاحب کی دعوت اور ان کی سرگرمیوں پر اعتراض کیا گیا ہے۔ جہاں تک شاہ صاحب کی اجتماعیات پر بحثیں ہیں، ان میں انہوں نے زیادہ تر وہی مواد دیا ہے، اور اسی طرز فکر کو اختیار کیا ہے جو ان کے زمانے میں متداول تھا، البتہ ان بحثوں کے دوران وہ کہیں کہیں اپنی خاص بات کہہ جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نئی فکر بھی رکھتے ہیں، لیکن چونکہ اس زمانے میں عام راہ سے ہٹ کر بات کرنا مشکل تھا اس لئے وہ پہلوں کی باتوں میں اپنی خاص بات کہتے ہیں، یہ شاہ صاحب کا عام انداز ہے اور یہ اچھا خاصا کامیاب رہا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی خاص باتیں جو انہوں نے مقبول عام باتوں کے ضمن میں لکھی ہیں اگر آج بھی ان کو الگ کر کے پیش کیا جائے، تو اکثر راسخ العقیدہ بزرگ ان سے بھڑک اٹھتے ہیں اور گو وہ شاہ صاحب کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے چپ رہتے ہیں لیکن ان پر کڑھتے ضرور ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے مولانا مسعود عالم مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ شاہ ولی اللہ کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیئے کیونکہ کہیں کہیں وہ کفر کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ صاحب نے اکثر پہلوں کی بات دہرائی ہے، شاہ صاحب کی کتابوں میں ان مذکورہ باتوں سے ان کے فکری رجحانات کا تعین کرنا صحیح نہیں ہے، اس کے لئے زیادہ گہرا جانے کی ضرورت ہے اور شاہ صاحب کو جن حالات و مشکلات میں تصنیفی کام کرنا پڑا، ان کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کیا شاہ صاحب کی علمی و فکری عظمت کی یہ دلیل نہیں کہ سرسید اور ان کے بعد آج بھی ہمارے ہاں جو نئے انداز سے دینی مسائل پر سوچتے ہیں، ان سب کو شاہ صاحب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

یقیناً شاہ صاحب کا اجتماعی فکر بنیادی طور پر اٹھارہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے اور ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ آج کے صنعتی دور کی ضرورتوں کے مطابق اور اس کی زبان میں بات کہیں، زیادتی ہے حضرت شاہ صاحب کی ایک عبارت کے متعلق ایک دفعہ مولانا سندھیؒ سے ایک صاحب نے شکایت کی کہ اس میں تو اونچے اور نچلے طبقوں کا ذکر ہے۔ مولانا مرحوم نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ مشین کی ایجاد سے پہلے اس طرح کی مساوات عمل کا تصور کرنا مشکل تھا۔

باقی رہا شاہ صاحب کا فکری انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنا، تو کیا اس کیلئے یہ ثبوت کم ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں یہ لکھا کہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا ایک مقصد قیصر و کسریٰ کی

جابر سلطنتوں کو ختم کرنا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے ذریعہ عرب سے باطل کا قلع قمع کیا گیا اور پھر عرب کے ذریعہ ان ہر دو جابر سلطنتوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ان جابر سلطنتوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔ ان کی غیر معتدل مرفہ الحالی اور مسرفانہ عیش پرستی کے جراثیم اور مہلک عادات و اطوار کی گندگیاں ان تمام ممالک میں سرایت کر چکی تھیں، جو ان کے زیر فرمان تھے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں اس طرح کے اور بھی انقلابی افکار موجود ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کا دور مسلمان قوم کے زوال کا دور تھا۔ اور ان کے بعد یہ زوال زیادہ بھی ہوا اور اس کی حدیں بھی وسیع ہو گئیں۔ چنانچہ بعد والوں نے شاہ صاحب کے ان انقلابی افکار کی طرف توجہ نہ دی اور ان باتوں پر زیادہ زور دیا گیا، جو سلف کے تتبع میں تھیں۔

مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف شاہ ولی اللہ صاحب کا احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دینا، جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے۔ اس پر بھی بعض حلقوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اول تو اس وقت مسلمانوں کے سامنے اپنی حفاظت کا سوال تھا۔ اس کے لئے جہاں سے بھی انہیں امداد ملتی، اسے وہ لیتے۔ دوسرے اس زمانے میں دریائے اٹک سے اس طرف ایک ملک اور دوسری طرف دوسرے ملک کا خیال ہی نہیں تھا۔ صدیوں سے افغانستان کے علاقے سلطنت ہند کے حصے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اگر واقعی احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی تو وہ اپنوں کے خلاف غیروں کو دعوت دینا نہ تھا اس لئے آج جو لوگ اس پر اس بنا پر معترض ہیں، وہ زیادتی کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کا احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کی سرکوبی کرنے کے لئے لکھنا اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک عالم، مدرّس، مصنّف اور صوفی بھی اپنی قوم کے سود و زیاں سے غافل نہیں رہ سکتا۔ شاہ صاحب کا اصل مقام ایک صاحبِ فکر کا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک فکر اور عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔
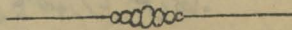
خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی تعلیمات اور ملفوظات

(۳)

سید رشید احمد ارشد ایم اے[1]

جیسا کہ مکتوب نمبر ۳ کے مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے،[2] شیخ تاج الدین آپ کے مرید تھے مگر اپنے روحانی کمالات اور مختلف روحانی واردات کی مستی میں آ کر صحیح راستے سے کسی قدر بھٹک گئے تھے اور اپنے دل میں یہ خیال کرنے لگے کہ انہیں اویسی مشرب کے مطابق، پیر و مرشد کی رہنمائی کے بغیر براہِ راست روحانی فیض حاصل ہو رہا ہے، اس لئے انہیں کسی پیر و مرشد کی ضرورت نہیں ہے۔

ان میں دوسری تبدیلی یہ آگئی تھی کہ وہ طریقۂ نقشبندیہ کے پابند نہیں رہے تھے اور اپنے مرید کی خواہش کے مطابق ہر سلسلے میں مریدوں کی بیعت کرنے لگے تھے، اس لئے آپ نے مکتوب نمبر ۵ میں ان کی غلط فہمیوں کی اس طرح اصلاح کی ہے۔

مُرشد کی ضرورت

"آپ کی شورش سے تعجب ہوا ہم نے ایک بات لکھی تھی اگر وہ واقعہ کے برخلاف ہے تو اس سے بہتر اور کیا ہے، ورنہ پھر یہ

---

[1] لیکچرر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی۔ [2] ملاحظہ ہو' الرحیم شمارہ جنوری ۶۸ء مذکورہ بالا عنوان کا آخری حصہ۔

ہماری وصیت ہے۔

اگر آپ کے دل میں یہ تصور آئے کہ اہل ارشاد کے لئے کشف والہام کا ہونا ضروری ہے، تو یہ بات بھی بے بنیاد ہے۔ اہل ارشاد، فنا اور بقا کے بعد، خدائے علیم وحکیم اور متکلم کا مظہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا کتب اہل طریقت کی ہدایات کے مطابق آپ کو ہمیشہ نیاز مند اور مستفید رہنا چاہئے۔ مرید ہمیشہ اپنے پیر ومرشد کا محتاج اور ضرورت مند رہتا ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے "فلاں شخص کو اب مرشد کی حاجت نہیں رہی ہے" تو یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ 'وصل' کے نور کے ساتھ قائم ہو جائے۔ اس وقت اگر مرشد اپنی توجہ درمیان میں سے اٹھالے، تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا"۔

ایک ہی سلسلہ کی پابندی

"آپ کو 'طریقہ عالیہ احراریہ نقشبندیہ' کے آداب بجالانے میں ثابت قدم رہنا چاہئے۔ آپ ہرگز ہرگز کسی اور سلسلہ کو اس کے ساتھ شامل نہ کریں۔ آپ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ آپ مختلف سلسلوں میں لوگوں سے بیعت لے کر انہیں مرید کریں۔

آپ کو چاہئے کہ آپ اپنی تعلیم وتلقین کو 'طریقہ نقشبندیہ' تک محدود رکھیں، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک شخص کا کھانا کھائیں اور دُعا کسی اور کے حق میں کریں۔ اگر کوئی شخص آپ سے سلسلہ نقشبندیہ کا نور وفیض حاصل کرے مگر متوجہ دوسرے سلسلے کی وجہ ہو تو اسے کیا (روحانی) لذت حاصل ہوگی؟

مرید کو اپنے پیر ومرشد کے سامنے اس طرح رہنا چاہئے جس طرح ایک مردہ، نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، لہٰذا مرید کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: "مجھے فلاں شغل اور فلاں (روحانی) سلسلہ کی تعلیم دی جائے"۔ یہ بہت بری بات ہے، ایسی خود رائی اچھی نہیں ہے[1]۔

دیگر ہدایات

آپ نے شیخ تاج الدین موصوف کو ایک مرشد کی حیثیت سے مندرجہ

[1] مکتوبات، مطبوعہ لاہور۔ صد ۹۴ و صد ۹۵

ذیل ہدایات تحریر فرمائیں۔

"آپ ہمیشہ باوضو رہیں اور وضو کے بعد تحیۃ الوضوٗ کے دو رکعت نفل ادا کریں، کھانے میں احتیاط کریں، گناہوں سے بالکل پرہیز کریں، نکتہ چینی نہ کریں، کسی مومن کو خواہ وہ آزاد ہو یا غلام حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ کسی مسلمان کے ساتھ بغض وکینہ نہ رکھیں نیز اپنے سے زیادہ عاجز اور کمزور انسان پر غیظ وغضب اور تشدد سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں اور طریقت کی بنیادیں ہیں۔ ان کے بغیر آپ کا کام مستحکم نہیں ہوسکتا ہے۔ تاہم اگر (مذکورہ بالا باتوں میں سے) کسی ایک بات میں فتور آجائے تو کام کو نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ توبہ واستغفار کرکے اس (روحانی) کام کی تکمیل کے لئے مزید جد وجہد کی جائے تاکہ (تمہارے) نیک کام، برُے کاموں کو دور کرسکیں اور اس طرح مکمل تزکیہ ہوجائے۔"[۱]

ذکر واشغال کی تلقین

مکتوب نمبر ۱ میں آپ نے اپنے ایک مخلص مرید کو اس طرح ذکر و اشغال اور عبادت کے معمولات کی تلقین فرمائی ہے۔

"جب کبھی آپ رات کو نیند سے بیدار ہوں، خواہ یہ رات کے آخری تیسرے حصّے کا وقت ہو یا آخری نصف حصّہ ہو، تو اس وقت آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر مل کر کسی ذکر میں مشغول ہوجائیں۔ خواہ وہ تسبیح (سُبحان اللہ کا وِرد) ہو، یا تہلیل (لَآاِلٰہَ اِلاَّ اللہ کا ورد) ہو، یا تکبیر (اللہُ اکبر کا ورد) ہو۔ (ان کے بجائے) آپ قرآن کریم کی کوئی بھی آیت پڑھ سکتے ہیں۔ اگر آپ (یہ آیات) اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ آخر تک پڑھیں تو بہتر ہے کیونکہ ان (آیات) کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس کے بعد (وضو کرکے) دو رکعت نفل تحیۃ الوضوٗ ادا کریں اور

---

[۱] مکتوبات، مطبوعہ لاہور ص ۹۴ و ص ۹۵

کوئی جامع دعا، مثلاً رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ پڑھیں یا کوئی اور دعائے ماثورہ پڑھیں. مگر دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ ضرور بھیجیں۔

بعدازاں بارہ رکعت، نماز تہجد چھ سلام کے ساتھ ادا کریں۔ نماز تہجد کے نفلوں کی انتہائی تعداد اتنی ہے اور کم ازکم تعداد دو رکعت یا چار رکعت ہے۔ اگر بڑھاپا یا کمزوری لاحق ہو تو یہ نفلیں بیٹھ کر بھی ادا کی جاسکتی ہیں۔

کلمہ کا ذکر

آپ نمازِ تہجد سے فارغ ہو کر کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اس قدر آہستہ ذکر کریں کہ آپ خود بھی نہ سن سکیں۔ ذکر کے وقت حق جلّ جلالہ کو حاضر ناظر خیال کریں اور ایسا معلوم ہو کہ آپ اس کو دیکھ رہے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کی گردن کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، نیز کلمہ لَامُتَصَرِّفَ اِلَّا اللّٰهُ کے مفہوم پر بھی غور کریں اور جس قدر ممکن ہو، اس سبق کی تکرار کرتے رہیں اور یہ یقین کریں کہ آپ ہر سانس پر ازسرِنو ایمان لا رہے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا ، اے ایمان والو! (پھر) ایمان لاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یوں ارشاد فرمایا ہے:

جَدِّدُوْا اِيْمَانَكُمْ بِقَوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، تم لاالٰہ الا اللہ کہہ کر اپنے ایمان کو تازہ کرو۔

آپ نماز فجر ادا کرنے کے بعد پھر اسی ذکر کی تکرار میں مشغول ہوجائیں، جب سورج ایک نیزہ پر چڑھ آئے تو چار رکعت نماز اشراق دو سلاموں کے ساتھ ادا کریں۔

اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اپنے تمام اوقات کو اسی (ذکر وعبادت) کے کام میں بسر کریں، امید ہے کہ بڑے فیوض حاصل ہوں گے۔

کلمۂ طیبہ کی اہمیت

مکتوب نمبر ۹ میں جو آپ نے ایک مخلص طالب ہدایت کے نام تحریر فرمایا ہے۔ کلمۂ طیبہ کے ذکر کی اہمیت کو یوں واضح

فرمایا گیا ہے۔

"ستر ہزار بار (کلمہ) لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا ذکر کرنا، ایک مہینہ یا اس سے کم وبیش مدّت میں بہت اچھا ہے۔ (روحانی) کام کا دارو مدار دلی تعلق اور خلوص واعتقاد پر ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عاجزی، خاکساری اور بے تعلقی کے آثار ظاہر ہوں گے اور آپ کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ (انسان اپنے) دل کی توجّہ دشمن کی طرف نہ رکھے"۔

لقمۂ حرام سے پرہیز

حضرت خواجہ باقی اللہ اپنے مریدوں کو لقمۂ حرام سے بہت پرہیز کراتے تھے چنانچہ آپ نے اپنی مجالس میں زبانی طور پر اور اپنے مکتوبات میں تحریری طور پر اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ جو شخص روحانی فیض حاصل کرنا چاہتا ہو، اسے حرام یا مشتبہ غذا کھانے سے بالکل پرہیز کرنا چاہیئے، چنانچہ آپ اپنے مکتوب نمبر ۲۵ میں اپنے ایک مرید صادق کے نام یوں تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ آپ کو اس کام میں استقامت نصیب کرے۔ لقمۂ پراگندہ سے بچنا اور نفس کی بُری صفات کو ظاہر نہ ہونے دینا۔ شوق ومحبت (الٰہی) کو بڑھاتا ہے۔ آپ انتہائی کوشش کرتے رہیں کہ لقمۂ حرام اور مشتبہ (غذا) نہ کھائی جائے۔ نیز نفس کے بُرے اوصاف یعنی غیظ وغضب، بدخلقی، ناجائز شہوت اور نفسانی خواہشیں ظاہر نہ ہونے پائیں۔

تواضع اور عاجزی

آپ ایسی مہلک چیزوں سے اس وقت تک نہیں بچ سکتے جب تک کہ آپ بارگاہِ الٰہی میں عاجزی اور تواضع کے لئے گڑگڑا کر دعا نہ کریں لہذا آپ کو ہمیشہ نیازمند اور خاکسار بن کر رہنا چاہیئے بلکہ ہر ذرّہ کے آگے عاجزی اور تواضع کرنی چاہیئے۔

ذکرِ قلبی کی حقیقت

جب ذکر کی حرکت کے موافق، دل کی حرکت ہو جائے یا خیال کے کانوں سے 'اللہ' کا کلمہ سُنا جائے تو اس سے مراد یہ ہے کہ صنوبری شکل کا گوشت کا ٹکڑا یعنی قلب، ذِکر کر رہا ہے، اسی کو ذکرِ قلبی کہتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی

اعتبار نہیں ہے۔ حقیقت میں ذکر قلبی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور اور شہود حاصل ہو جائے۔ جب یہ بات آپ کو حاصل ہو جائے گی تو اس وقت آپ کے دل سے غیر اللہ کے سب خطرے نکل جائیں گے۔ ایسی صورت میں ذکر کو چھوڑ کر آپ صرف اسی چیز کی محافظت کریں۔

اگر کچھ سستی اور فتور آئے تو پھر ذکر شروع کر دیں، یہاں تک کہ یہ روحانی دولت آپ کو ہمیشہ کے لئے حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد ذکر و حضور کو ایک ساتھ جمع کر دیں اور اللہ تعالیٰ کے لطف بے پایاں کا انتظار کرتے رہیں۔

اتباع رسول آپ نے مکتوب نمبر ۳۲ کے آخر میں ایک طالب ہدایت کو یوں نصیحت فرمائی ہے۔

"(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:)

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ، یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورۂ آل عمران پ۳)

(اے رسول) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرنا، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

لہٰذا اس ذات کا حکم بجالانا ضروری ہے جو جمال و کمال ہے۔ یہ سب کچھ حضرت سید الاولین والآخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و اطاعت پر موقوف ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے:

"میرے نزدیک شراب خوری اس (روحانی) حال سے بہتر ہے جو شریعت کے کسی رکن کے بجالانے میں حائل ہو۔"

یہ ہے حق صریح اور علم صحیح۔ زیادہ لکھنا گستاخی ہے۔"

طالب علم کو نصیحت آپ نے مکتوب نمبر ۳۴ ایک ایسے طالب علم کے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا جو آپ کا بہت ہی مخلص نیازمند تھا وہ طالب علم اس زمانے میں حرمین شریفین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) کی زیارت کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے حضرت خواجہ صاحب سے کچھ نصائح تحریر فرمانے کی درخواست کی تھی، لہٰذا

آپ نے اس کی درخواست پر اسے مندرجۂ ذیل مکتوب تحریر فرمایا۔ یہ طالب علم بعد ازاں مدینہ منورہ کی زیارت کے سفر ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ اس کے نام خواجہ صاحب کے اہم مکتوب کا خلاصہ یہ ہے:-

"ہم اس علم سے پناہ مانگتے ہیں جس کا کوئی نفع نہ ہو، لہذا ایک عاقل اور دُور اندیش شخص کا یہ فریضہ ہے کہ وہ صرف ان علوم کو حاصل کرے جن کے مطابق عمل کرنا اس کے لئے ضروری ہو۔ اس کے بعد وہ اپنی باقی زندگی کو صفائی قلب اور تزکیۂ نفس میں صرف کرے کیونکہ نفسانی وسوسوں اور دنیاوی ضرورتوں کی طرف متوجہ رہنا اور نفسانی خواہشوں اور بیہودہ تمنّاؤں میں الجھے رہنا، بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجابِ اکبر ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اس کے قریب ہے۔

ان اندھیروں اور تاریکیوں سے باطن کو صاف رکھنے اور نورانی بنانے کا (واحد) ذریعہ روشن ضمیر اہلِ دل بندہ خاص کی توجّہ اور التفات ہے، جو اہلِ دل کی بارگاہ میں مقبول ہوگیا تو سمجھو کہ وہ اللہ کا مقبول بندہ ہے اور جو ان کا مردودِ بارگاہ ہوا وہ اللہ کی بارگاہ سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم اہلِ دل حضرات کے نیاز مند بنو اور ان کے سامنے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ اپنے دردِ دل کا اظہار کرو۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں معرفتِ الٰہی کی طلب نہ ہو، تم اس کی صحبت میں نہ بیٹھو اور ان دنیادار عالموں سے، جنہوں نے علم کو جاہ و مرتبہ اور فخر و شہرت کا ذریعہ بنا رکھا ہے، ایسے دُور بھاگو جیسے شیر سے دور بھاگتے ہو۔ تم ہمیشہ تقربِ خداوندی اور عبادت کو اپنا وسیلہ بنائے رکھو اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا مانگتے رہو تاکہ وہ تمہارے دل سے اپنی ذات کے علاوہ دیگر نفسانی خواہشوں کو فنا کردے اور لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ، لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (آج یہ ملک کس کا ہے؟ اسی خدائے واحد قہّار کا ہے) کی صورت میں تمہارے سامنے ہمیشہ جلوہ گر رہے۔

فوجی معلم کے بارے میں

ایک مخلص عالم نے جو حضرت خواجہ صاحب کا معتقد تھا سرکاری فوج میں ملازمت اختیار کر رکھی تھی، فوج میں وہ سپاہیوں کو درس دیتا تھا اس ملازمت کی وجہ سے وہ اپنے روحانی مشاغل اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ چاہتا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر ہر وقت آپ کی خدمت میں رہے۔ ان کے متعلقین کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے مخلص مرید کے ذریعے یہ کوشش کی کہ خواجہ صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس عالم موصوف کو ترکِ ملازمت سے منع فرمائیں تاکہ وہ مالی مشکلات سے محفوظ رہیں' اور وہ فوج کے سپاہیوں کو' جو مذہبی درس دے رہے تھے اس کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہو۔

چنانچہ اس مخلص مرید نے خواجہ صاحب کی خدمت میں ان کے تمام حالات لکھ کر بھیجے اور اس عالم کی عیالداری اور گھریلو حالات سے آپ کو مطلع کر کے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ ترکِ ملازمت کی صورت میں وہ عالم' فقر و تنگدستی کے مصائب برداشت نہیں کر سکے گا اس کے علاوہ فوج بھی ان کے مذہبی درس کے فیض سے محروم ہو جائے گی اس لئے خواجہ صاحب سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ ان مذہبی عالم کو ترکِ ملازمت سے منع فرمائیں۔

مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں اس مخلص مرید کے جواب میں آپ نے مکتوب نمبر ۳۸ میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"عاقبت بیں داناؤں کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا چاہیئے کیونکہ وہ دنیا کے فنا ہونے اور اہل دنیا کی ناپائیداری سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ فوج کی ملازمت میں اپنے حقیقی مقصد میں فتور اور نقصان دیکھتا ہو' تو وہ کس طرح فوجی ملازمت میں رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں فرزندوں کے رزق اور روزی کا غم کرنا توکّلی کے حال کے مناسب نہیں ہے۔

بہر حال جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح ادا ہو سکے اور روحانی و قلبی پراگندگی کا اندیشہ نہ ہو تو اس جگہ کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذہبی علوم کی تعلیم دینا بھی عبادت ہے بالخصوص جب کہ متعلّمین دیندار ہوں اور استاد کی مرضی

کے مطابق احکام بجالاتے ہوں"۔

توبہ کی اہمیّت

مکتوب نمبر ۴۴ میں ایک مخلص امیر و حاکم کو توبہ کی اہمیت اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"راہِ حق کے طالبوں اور سالکوں کا طریقت میں پہلا قدم خالص توبہ ہے کیونکہ آئینۂ دل کا جوہر، گناہ اور نافرمانی کی وجہ سے سیاہ اور زنگار ہوجاتا ہے اور جوں جوں سیاہی اور زنگ بڑھتا ہے اسی قدر اندھے پن اور تردد کا ظہور زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔

اتباعِ شریعت

اصل فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب (سالک) یقینی طور پر جان لے کہ یہ (روحانی) احوال و مقامات محض شریعت حقہ کے اتباع سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ عملی طور پر شریعت کے احکام بجالائے اور خلاف شرع کاموں سے ہٹ کر شریعت کے مطابق اپنا عمل درست کرے۔ صرف ایسی صورت میں توبہ قبول ہوگی اور صرف شریعت کے ذریعے ہی نور ایمان حاصل ہوسکتا ہے لہٰذا کسی دوسرے طریقے سے اس مقصد کو حاصل کرنا بیکار محض ہے۔

توبہ کے درجات

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ توبہ کے بہت سے درجات ہیں، پہلا درجہ 'کفر' سے توبہ کرنا ہے، پھر ایمان تقلیدی سے، اور اس کے بعد گناہوں سے توبہ کرنا ہے، بعد ازاں ان (مذموم) صفات سے بھی توبہ کی جائے، جن سے یہ گناہ پیدا ہوتے ہیں جیسے کھانے کی حرص، زیادہ بولنے کی خواہش، حُبّ جاہ و مال، حسد، تکبّر، ریاکاری وغیرہ۔ یہ سب چیزیں انسان کو تباہ و برباد کرتی ہیں، پھر نفسانی وسوسوں، ناجائز اور بیہودہ خیالات سے بھی توبہ کی جائے۔ ذکر الٰہی کی غفلت سے بھی توبہ کی جائے، خواہ وہ غفلت ایک لمحہ کے لئے کیوں نہ ہو۔ چونکہ ذِکر' (جس سے مراد حضور و خود آگاہی ہے) کے درجات بے انتہا ہیں۔ اسی لئے توبہ کے درجات بھی بیشمار ہیں اور ہر ناقص کام سے توبہ کرنا واجب اور لازم ہے۔

(توبہ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان روحانیت کے) پہلے قدم پر اپنے گذشتہ گناہوں سے پشیمان ہو اور اس بات کا مصمم ارادہ کرے کہ وہ حتی المقدور ایسا (بُرا) کام ہرگز

نہیں کرے گا، (توبہ) روحانی طلب کے لئے بہت ضروری ہے۔

لطائفِ سبعہ مکتوب نمبر ۵۴ میں اپنے ایک "خلیفہ" کے نام تصوف کے معارف بیان فرمانے کے بعد لطائفِ سبعہ کے بارے میں آپ یوں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسانِ کامل میں یہ سات لطائف ہیں (۱) لطیفۂ قالب (۲) لطیفۂ نفس (۳) لطیفۂ قلب (۴) لطیفۂ روح (۵) لطیفۂ سرّ (۶) لطیفۂ خفی (۷) لطیفۂ اخفیٰ۔

ان سب لطائف میں سب سے زیادہ معتبر لطیفۂ روح ہے جو انسان کا مظہر اور تمام لطائف کا جامع ہے۔ ہر لطیفہ کے احکام و آثار کا الگ الگ حاصل ہونا چنداں معتبر نہیں ہے، اگرچہ ان کا ظہور بھی موجبِ سعادت ہے۔"

فرقۂ ناجیہ کی برتری مکتوب نمبر ۵۳ میں شیخ نظام تھانیسری کو حقائق و معارف کی وضاحت فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"مقصد یہ ہے کہ فرقۂ ناجیہ کا مسلک رائج ہو جو کتاب و سنّت کے متوسل اور عامل ہیں اور مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ (وہ طریقہ جس پر میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابی عامل ہیں) کے شرف سے مشرف ہیں، ہمیں اس گروہ کے مشائخ کی باتوں کی تحقیق منظور ہے، جن کو صوفیہ عالیہ کہتے ہیں۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی بے سمجھ غلطی میں پڑ جائے اور ان بزرگوں پر طعن کرے یا آپ ہی بد اعتقادی کے بھنور میں ڈوب کر ہلاک ہو جائے۔"

خواتین کے لئے روحانی تعلیم حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے حلقۂ ارادت میں خواتین بھی شامل تھیں، ان میں بعض ایسی تھیں، جنہیں آپ اپنی خدمت عالیہ میں بلانا مناسب نہیں سمجھتے تھے، لہذا آپ انہیں روحانی ہدایات ان کے شوہروں کے ذریعہ یا بذریعۂ تحریر دیا کرتے تھے، اس طرح یہ پردہ نشین مسلم خواتین بھی تصوّف کے حقائق و معارف سے بہت جلد واقف ہو جاتی تھیں۔

اسی قسم کی ایک صالحہ خاتون کے نام آپ نے مکتوب نمبر ۵۶ لکھا اور اس کے شوہر کو دیا کہ وہ انہیں پڑھ کر سنا دے اور ہندی زبان میں اس کا ترجمہ بیان کرے۔

ان کے شوہر نے آپ کا مکتوب مبارک پڑھ کر سنایا اور اس کا ترجمہ بھی بیان کیا اس کے بعد وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی کم استعداد بیوی جو فارسی زبان نہیں جانتی تھی، آپ کے مکتوب مبارک کے دقیق مفہوم کو سمجھ گئی ہے اور اس پر عمل پیرا ہو گئی ہے، وہ مکتوب مبارک یہ ہے:

خاتون کے نام مکتوب

"ملاحظہ ہو کہ دل کی صفائی کے لئے یا 'نفی و اثبات' کے ذکر کا مراقبہ کرو یا فقط 'اثبات' کا۔ اگر 'نفی و اثبات' کا ذکر ہے تو تحقیق کرو کہ 'نفی معلوم' اور 'اثبات مجہول' ہے یا نفی معلوم اور اثبات معلوم ہے یا نفی موہوم اور اثبات معلوم ہے۔ اگر اثبات تنہا ہو تو پھر یہ تحقیق کرو کہ یہ اثبات معلوم ہے یا اثبات مجہول ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو یہ تحقیق کرو کہ معلوم جدید ہے یا قدیم، بہر صورت اثبات تجرّد میں کوشش کی جائے تاکہ اثبات مجہول ہو جائے۔"

خواتین کے لئے جامع ہدایات

مکتوب نمبر ۴، ایک ایسی مسلم خاتون کے نام ہے جو کسی دوسرے شہر میں رہتی تھیں، لہذا نہ تو انہیں آپ کا شرف صحبت حاصل ہو سکتا تھا اور نہ ایسی اہل معرفت خواتین اس شہر میں موجود تھیں جن سے وہ روحانی ہدایت حاصل کر سکیں، اس لئے آپ نے ان کے نام مندرجہ ذیل جامع روحانی ہدایت لکھ کر بھیجیں تاکہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کا دستور العمل بن سکیں۔

"اللہ تعالیٰ اپنی توفیق کامل کو تمہاری رفیق بنائے۔ تمام سعادتوں کا سرمایہ یہی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی پیروی کرو۔ ناجائز باتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ کسی پر غم و غصّہ نہ کرو۔ کسی مسلمان کے حق میں برائی نہ سوچو۔ دنیا کے بے وفا مال و متاع پر نظر نہ ڈالو۔ اپنے آپ کو تمام مخلوقات سے بزرگ تر نہ خیال کرو اور آخرت کے سفر کو نہ بھولو۔ ان اوصاف کو حاصل کرنے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ

اپنا فضل وکرم کرے اور توفیق بخشے تو کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ورد آہستہ آہستہ کرتی رہا کرو اور ذکر کے وقت حضورِ قلب اور یکسوئی کے ساتھ اپنی توجہ، دنیا اور اہل دنیا سے ہٹائے رکھو۔ اس طرح بہت عمدہ فوائد ونتائج حاصل ہوں گے۔

تمام ظاہری اور باطنی احوال میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر سمجھو بلکہ طالبِ صادق کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ مخلوقات کی طرف سے آنکھیں بند کرکے ہمیشہ خدا کی رحمت کی نظر کا منتظر رہے۔

حلال کھانے کی اہمیت

یہ ذہن نشین رہے کہ دل کو اطمینان، یکسوئی اور حضورِ قلب، اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب بقدرِ ضرورت، صرف پاکیزہ اور حلال کھانا کھایا جائے اور بیہودہ گو اور دنیا کے طالبوں سے میل جول ترک کر دیا جائے۔ اگر تم ہزار سال ذکر کرتی رہو اور تمہارا کھانا حلال مال کا نہیں ہے تو تمہارا روحانی مقصد کبھی حاصل نہیں ہوگا"۔

سلفِ صالحین کی پیروی

مکتوب نمبر ۲۷ میں ایک مخلص عقیدت مند کے نام آپ نے یوں تحریر فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ آپ کو ان اعمال کی توفیق بخشے، جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں جو حقیقت شناس داناؤں کی کتابوں میں تحریر کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنے عقائد کو سلف صالحین کے عقائد کے مطابق رکھیں اور ائمۂ مجتہدین میں سے کسی ایک امام کے فقہی مسلک کے مطابق عمل کریں۔

یہ سعادت اس وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب آپ ان لوگوں سے محبت رکھیں جو دربارِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب ہیں، ان میں وہ دینی علماء، سادات اور مخلص فقراء کرام بھی شامل ہیں جو اپنے قول وفعل میں بدعت والحاد سے بچتے رہے ہوں۔ آپ کے لئے لازم ہے کہ آپ سچے لوگوں کے مخالفوں کی تحقیر کریں اور ان مخالفوں کے عقائد کی تردید کریں۔

اخلاقی ہدایات

آپ اس نور (ہدایت) کی روشنی میں مظلوموں کی مدد کریں، محتاجوں

کی حاجت روائی کریں، مجرموں کے قصور معاف کریں، عاجزوں اور مفلسوں کے حساب اور لین دین میں نرمی اور درگذر اختیار کریں یہ خیال رہے کہ اس سلسلے میں شریعت کا کوئی حق فوت نہ ہونے پائے۔

مذکورہ ہدایات میں سے جس قدر زیادہ باتوں پر آپ عمل کر سکیں، انہیں غنیمت اور سعادت سمجھیئے۔ تاہم اگر بعض باتوں پر عمل نہ ہو سکے تو (ان کی وجہ سے) سب باتوں کو نہ چھوڑ دیا جائے۔"

صرف مسلمان بنو

مکتوب نمبر ۷۶ میں ایک مخلص دوست کے نام آپ نے یوں تحریر فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ آپ کو فرماں برداری کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچائے (ہمارے) ایک بزرگ اپنے ایک دوست سے فرمایا کرتے تھے:

"تم نہ صوفی بنو، نہ ملاّ بنو، صرف مسلمان بنو"

(قرآن مجید میں مذکور ہے)

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ (سورۂ یوسف پ ۱۳) (اے اللہ) تو مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دے اور مجھے نیکوں میں شامل کر۔

آپ ہمارے لئے بھی اس مقصد کے حصول کے لئے دعا مانگتے رہا کریں۔ آپ ہماری اس بات کو تکلف اور بناوٹ پر مبنی نہ سمجھیں کیونکہ مسلمان بننا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لطف و عنایت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا ہے، یہاں کسب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تصوف کی حقیقت صرف مسلمان بننا ہے۔ تصوف کا مقصد یکسو دیکھنا اور یکساں زندگی بسر کرنا ہے۔"

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ۝ سلام ہو اس شخص پر جس نے ہدایت اختیار کی۔

خواجہ صاحب کے عقائد اور مسلک

ایک مکتوب میں حضرت خواجہ باقی باللہ نے ایک 'طالبِ حقیقت' کے نام اپنے مسلک اور عقائد کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

"واضح ہو کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے مگر افضل البشر تھے۔ آپ ناخواندہ اور اُمّی تھے جس ملک میں آپ نے نشو ونما پائی وہاں کے لوگ بھی ناخواندہ تھے تاہم آپ کے آباؤ اجداد نہایت عقلمند تھے اور روئے زمین کے تمام لوگوں سے بہتر تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے ہاں سے علم مفقود ہوتا گیا لہذا خداوند تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا، آپ نے اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح پہچانا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس ایک فرشتہ بھیجا تاکہ آپ لوگوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کافروں سے جہاد کی تعلیم دیں، اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآن مجید نازل فرمایا۔

لہذا بندہ مؤمن کے لئے لازم ہے کہ وہ قرآن مجید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر ایمان لائے اور ان کی تصدیق کرے اور توحید و رسالت کا زبان سے بھی اقرار کرے۔

مسلّمہ عقائد

اللہ تعالیٰ نے اسی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے:

"میں زندہ ہوں ہمیشہ سے ہوں، ہمیشہ رہوں گا۔ سب کچھ جانتا ہوں، ہر چیز پر قادر ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں۔ سب کچھ دیکھتا ہوں۔ میں ہر ایک کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ جبّار و قہّار ہوں، رحیم و کریم بھی ہوں۔ تمام جہاں کو میں نے پیدا کیا ہے اور میں ہی ہر چیز کو فنا کرتا ہوں۔ میرے کاموں میں کوئی شریک و مددگار نہیں ہے۔

احکام وحقوق

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

"میری عبادت کرو۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کرو اور کافروں کے ساتھ جنگ کرو۔ حقداروں یعنی والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق ادا کرو۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔

صفاتِ نبوی

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب انسانوں سے زیادہ خوبصورت اور افضل تھے ان کی ذات، تمام انسانوں کی ذات سے زیادہ پاکیزہ تھی آپ کا قلب سب لوگوں کے قلوب سے زیادہ روشن تھا۔ تمام اولیائے کرام آپ کے کوچہ کے گدا ہیں، تمام حکمتہ عمدہ انسانی صفات آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ آپ کا ہر قول و فعل خدا کے علم کے مطابق ہے۔

(مسلسل)

علّامہ ابن درید اور اُن کا مقصورہ

پروفیسر وائی۔ ایس۔ طاہر علی

علامہ ابن درید کا پورا نام، محمد بن الحسن بن درید[1] ہے اور ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ بصرہ شہر میں ۲۲۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی[2] اور انہوں نے وہاں علم لغت اور اشعار عرب کی تعلیم اساتذۂ وقت سے حاصل کی۔ ۲۵۷ھ میں جب زنجیوں نے بغاوت شروع کی تو وہ اپنے چچا کے ساتھ عمّان چلے گئے جہاں وہ بارہ سال تک رہے[3]۔ اور اس کے بعد پھر بصرہ لوٹ آئے۔ اب کی دفعہ انہیں فارس جانا پڑا جہاں شاہ میکال اور ان کے صاحبزادے اسماعیل اور پوتے عبداللہ گورنر تھے۔ فارس میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ تمام فرامین پر ان کی مہر ثبت ہوتی تھی اور کوئی فرمان ان کے مشورے کے بغیر جاری نہ ہوتا تھا[4]۔ ۳۰۸ھ میں اسماعیل اور عبداللہ گورنری سے معزول ہو گئے[5] اور ابن درید وہاں سے بغداد چلے آئے[6]۔ بغداد میں ابن الخواری نے خلیفہ المقتدر باللہ کے پاس ان کی

---

[1] لفظِ درید میں ترخیم اور تصغیر دونوں ہیں۔ "اَدرَد" اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دانت گر گئے ہوں۔

[2] و [3] و [4] و [5] و [6] ابن خلکان، وفیات الاعیان۔

سفارش کی۔ چنانچہ ہر ماہ انہیں پچاس دینار سرکاری خزانہ سے بطور وظیفہ تادم زیست ملتا رہا[۱]۔

ان کے اساتذہ اپنے وقت کے بڑے نامور فضلار تھے[۲] مثلاً ابو حاتم السجستانی، ابوالفضل الریاشی، ابوعثمان الاشناندانی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ۔ (یہ اصمعی کے بھتیجے تھے)، اور اسی طرح ان کے شاگرد بھی بڑے پایہ کے ادیب اور عالم ہو گزرے ہیں[۳] مثلاً ابوالفرج الاصفہانی، ابوعلی القالی، ابوقاسم الآمدی، الرمانی، المرزبانی اور ابن خالویہ۔

قدرت نے انہیں بچپن سے ایک تیز اور قوی حافظہ ودیعت کیا تھا۔ ابوعلی التنوخی کی روایت[۴] ہے کہ ایک دن ابن درید اپنے استاد الاشناندانی کے پاس حارث بن حلّزہ کا معلقہ پڑھ رہے تھے اس وقت ان کے چچا حسین بن درید آئے اور الاشناندانی کو حسب معمول کھانے کے دسترخوان پر لے گئے اور ابن درید سے یہ کہہ گئے" کہ اگر تم نے اس قصیدہ کو ازبر کر لیا تو تمہیں انعام دوں گا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو دونوں ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اسی اثنار میں ابن درید نے مذکورہ قصیدہ یاد کر لیا اور جب استاد آئے تو ابن درید نے سارا قصیدہ زبانی پڑھ سنایا اور اپنے چچا سے حسب وعدہ انعام لے لیا۔

آگے چل کر یہ حافظہ قوی تر ہو گیا اور جب کبھی کسی شاعر کے اشعار ان کے سامنے پڑھے جاتے تو وہ فوراً یاد کر لیتے تھے[۵]۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی ضخیم کتاب پہلی دفعہ فارس میں اور پھر بصرہ اور بغداد میں زبانی نقل کی[۶] اور صرف پہلی بار "باب الھمزۃ

---

۱ ابن خلکان: وفیات الاعیان

۲ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الہ آباد یونیورسٹی اسٹڈیز ابن درید اور دخیل الفاظ۔

۳ ایضاً و ابن خلکان: وفیات الاعیان ۴ زہیر الشاویش: مقدمہ شرح الخطیب التبریزی

۵ ایضاً۔ ۶ کہا جاتا ہے کہ الجمہرہ میں الفاظ میں اس لئے اختلاف پایا جاتا ہے، کہ علامہ ابن درید ایک ہی چیز کو کئی طور پر لکھ گئے ہیں۔

واللطیف" میں ان کو کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔

کتابوں سے انہیں والہانہ شیفتگی اور دلبستگی تھی اور وہ کتابوں کو "متنزہات القلوب" (یعنی دل و دماغ کے لئے تفریح کے مقامات) کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک محفل میں کئی ارباب ذوق جمع تھے۔ وہاں اتفاق سے ابن درید بھی آ گئے۔ اور دنیا کے بہترین مقامات کا ذکر چھڑ گیا۔ کسی نے کہا بہترین جگہ 'غوطۂ دمشق' ہے۔ تو کسی نے کہا 'نہر اُبلّہ' ہے اور کسی اور نے کہا سغد سمرقند ہے۔ اور وہ بھی لوگ تھے جنہوں نے باری باری سے نہروانِ بغداد۔ شعب بوّان اور نوبہار بلخ کے نام لئے۔ ابن درید بالکل خاموشی سے سنتے رہے اور جب سب کہہ چکے تو انہوں نے کہا "بھئی یہ تمام مقامات آنکھوں کو تازگی بخشنے والے ہیں۔ اب ان مقامات کو گناؤ جو دل و دماغ کے لئے سامانِ تفریح مہیا کرتے ہیں۔ سب کے سب حیران تھے اور کسی سے بھی جواب نہ بن پڑا۔ لاچار ہو کر سب نے ابن درید سے کہا کہ تم ہی بتاؤ کہ وہ کون کون سے ہیں؟ اس پر ابن درید نے قتبی کی 'عیون الاخبار'۔ ابن داؤد کی 'الزہرہ' اور ابن ابی طاہر کی 'قلق المشتاق' کے نام گنوائے اور کہا کہ یہ وہ کتابیں ہیں جن کے مطالعہ سے دل اور دماغ کو فرحت اور بالیدگی عطا ہوتی ہے اور پھر آپ نے حسبِ حال یہ اشعار پڑھ کر سنانا شروع کئے

وَمَنْ تَكُ نزهتُهُ قَيْنَةٌ ۔۔۔ وَكَأْسٌ تصبُّ وَكَأْسٌ تحثّ

فَنُزْهَتُنَا وَاسْتِرَاحَتُنَا ۔۔۔ تلاقِي العُيُونِ ودَرْسُ الكُتُبْ

(وہ اور لوگ ہوں گے، جنہیں رقص و سرود سے غرض ہوا کرتی ہے۔ ہم تو احباب کی ملاقات اور کتابوں کے مطالعہ کے طالب ہیں۔)

کہتے ہیں کہ یہ علمی وارفتگی اس حد تک تجاوز کر چکی تھی کہ وہ بہت سے علمی اور ادبی مسئلے نیند میں حل کر لیا کرتے تھے۔ خود ان کا اپنا بیان

لہ ابن خلکان: وفیات الاعیان۔

ٹہ یہ ابونصر المیکالی کی روایت ہے۔

ہے[1] کہ ایک مرتبہ میں فارس میں اپنے مکان کی چھت سے نیچے گر پڑا، اور میری ہنسلی ٹوٹ گئی۔ میں رات بھر کراہتا رہا اور مجھے نیند نہ آئی۔ بالآخر پچھلی شب آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک زرد رُو اور بلند قامت انسان دروازے کی چوکھٹ تھامے ہوئے کھڑا ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ "بہترین شعر جو تم نے شراب کی تعریف میں کہا ہے، سناؤ"۔ میں نے کہا میری کیا مجال ہے کہ ابو نواس کے بعد شراب کی تعریف میں کچھ کہہ سکوں۔ وہ بولا۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟ میرا نام 'ابوناجیہ' ہے اور میں شام کا باشندہ ہوں۔ ابونواس کی میرے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ سنو! شراب کی تعریف میں میں نے کہا ہے ؎

وحمراء قبل المزج صفراء بعدہٗ　　　بدت بین ثوبی نرجس وشقائق

حکت وجنۃ المشاق صرفاً فسلطوا　　　علیھا مزاجاً فاکتست لون عاشق

کہو یہ اشعار کیسے ہیں؟ میں نے کہا۔ ٹھیک نہیں۔ تم نے پہلے 'حمراء' کہا اور 'بدت بین ثوبی نرجس وشقائق' کہہ کر 'صفراء' لے آئے ہو۔ اس پر وہ کہنے لگا، 'ارے تمہارا بھلا ہو، نیند میں بھی تم اتنی چھان بین کرتے ہو!'۔

کہا جاتا ہے کہ علامہ ابن درید کا جنم ایک مالدار خاندان میں ہوا تھا اور ان کے والد بڑے متموّل تھے[2]۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ ان کے دروازے پر اگر کوئی آتا تو خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ بعض وقت وہ سائل کو اس قدر دیتے تھے کہ گھر میں چاندی کا ایک سکہ بھی نہ ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ سائل کو گھریلو اشیا بھی دے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے پاس ایک سائل

---

[1] ابن خلکان: وفیات الاعیان۔ قاضی ابن خلکان اس کے متعلق ایک دوسری روایت بحوالہ ابوعلی الفارسی النحوی بیان کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ دونوں شعر ابن درید ہی کے ہیں اور خواب میں انہوں نے ابلیس کو دیکھا تھا کہ وہ ان دونوں شعروں کو سن کر سر دھن رہا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا تھا کہ تم نے اس میں کچھ غلطی کی ہے اور پھر باقیماندہ مذکورہ بالا بات سنائی ہے۔ [2] الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد

آیا اور اس نے اپنی حاجتمندی کا اظہار کیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے گھر میں سوائے ایک شراب کے مٹکے کے کچھ نہ تھا۔ انہوں نے سائل کو وہی دے دیا[۱]۔ نوکر کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن ابن درید نے قرآن پاک کی یہ آیۂ شریفہ سناکر اسے خاموش کر دیا کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ، یعنی نیک نامی انہی لوگوں کو میسّر ہے جو اپنی جان سے بھی عزیز تر چیز کو خرچ کر دیتے ہیں۔ عجیب اتفاق ہوا کہ اسی دن شام ہونے سے پہلے کسی نے ان کو دس مٹکے شراب کے بھیج دیئے اس پر وہ کہہ اُٹھے ، مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا یعنی ایک نیکی کرو اور دس پاؤ۔

اس واقعہ سے یہ ثابت ہوا کہ علامہ ابن درید بھی حضرت غالب کے مانند 'یک گونہ بیخودی' کے طالب ہوا کرتے تھے، لیکن اس بارے میں ہمیں دو تین گروہ کی مختلف شہادتیں ملتی ہیں جن کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ابو منصور الازہری کہتے ہیں[۲] کہ میں نے انہیں بڑھاپے میں نشہ کی حالت میں پایا اور وہ نشہ میں ایسے ہوگئے تھے کہ برابر بول بھی نہ پاتے تھے۔

ابن کثیر کہتے ہیں[۳] کہ وہ اتنا پیتے تھے کہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔

ابوذر الہروی بحوالۂ ابن شاہین لکھتے ہیں[۴] کہ ہم ابن درید سے ملنے جایا کرتے تھے لیکن ان کے مکان پر آلات موسیقی اور مئے ناب دیکھ کر ہم کو شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ نبیذ (کھجور سے بنائی ہوئی) پیا کرتے تھے جس کے پینے کی اہل عراق کو عادت تھی[۵] اور بعض کا یہ کہنا ہے کہ اگر پی بھی تھی تو بعد میں توبہ کر لی تھی[۶]۔

---

[۱] تاریخ بغداد۔ وفیات الاعیان۔ [۲] مقدمہ تہذیب اللغۃ ، والفیتہ انا علی کبر سنہ سکران لایکاد یستمر علی الکلام من سکرہ۔ [۳] البدایۃ والنہایۃ : کان متہتکاً فی الشراب منہمکاً فیہ۔ [۴] ابن خلکان : وفیات الاعیان ، کنا ندخل علی ابن درید ونستحی منہ لما نری من العیدان المعلقۃ والشراب المصفّی وقد جاوز التسعین سنۃً۔ [۵] مبلغ الظن انہ کان یشرب النبیذ علی مذہب اہل العراق۔ [۶] ان کان قد شرب فہو قد تاب۔

اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ سب تہمت اور الزام ہے[1]
لیکن ان کے مقصورہ میں ے

یارب لیل جمعت قطریہ لی بنت ثمانین عروسًا تجتلی

اور اس کے بعد کے چھ شعر پڑھنے سے ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ علامہ ابن درید پر بھی 'یک گونہ بیخودی' مجھے دن رات چاہیئے' والا مضمون بالکل چسپاں ہوتا ہے کیونکہ وہ اس حالت میں ایسے ایسے اشعار کہا کرتے تھے جو شاہکار ثابت ہوئے۔ خود ہی کہتے ہیں ے

کان نور الروض نظم لفظہ مرتجلًا اومنشدًا اوان شدا

بہر کیف علامہ ابن درید اپنے زمانہ میں ایک اعجوبۂ روزگار کی حیثیت رکھتے تھے اور قریب ساٹھ سال تک انہوں نے علم و فضل کا قلمدان اپنے ہاتھوں میں رکھا۔ ان کے کچھ لوگ مدّاح ہیں اور کچھ حاسد۔ مدّاح کے گروہ میں مرزبانی، ابوالطیب اللغوی، مسعودی، ابن خلکان وغیرہ ہیں۔

مرزبانی کہتے ہیں کہ وہ علماء کے سرگروہ تھے۔ لغت، انساب اور اشعار عرب میں کوئی ان کا ہم پلّہ نہ تھا[2]

ابوالطیب اللغوی کہتے ہیں کہ بصری مکتب خیال سے وہ 'خاتم اللغویّین' کہلانے کے مستحق ہیں اور روایت و درایت میں بے نظیر ہیں[3]۔

مسعودی کہتے ہیں کہ علم اللغت کا ان پر خاتمہ ہے اور ان کا مقام خلیل بن احمد سے کم نہیں۔ ان کی کتابوں میں ہم کو ایسی ایسی باتیں ملی ہیں جن کا وجود متقدمین کی کتابوں میں مفقود ہے[4]۔

---

[1] لعل ہذا کلہ من التہمۃ۔ [2] کان رأس اہل العلم والمتقدم فی الحفظ للغۃ والانساب واشعار العرب
[3] ہو الذی انتہت الیہ لغۃ البصریین وکان احفظ الناس واوسعہم علمًا۔ [4] انتہی فی اللغۃ و قام مقام الخلیل بن احمد فیہا واورد اشیاء فی اللغۃ لم توجد فی کتب المتقدمین۔

ان ہی کے ہم نوا ابن خلکان ہیں جو لکھتے ہیں کہ ابن درید اپنے زمانہ میں علم لغت اور علم ادب کے مستند عالم تھے[1]

ان کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی روایت اور درایت پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے عربی زبان میں نئے نئے الفاظ تراشے ہیں جو کبھی سننے میں نہ آئے[2]

مثلاً حمزہ لکھتے ہیں کہ ایک دن ابوبکر الابہری المالکی، ابن درید کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ابن درید کے ہاتھ میں کچھ اوراق تھے، جس میں اصمعی کی روایت کی ہوئی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن کبھی ان اوراق میں سے ایک بات کہہ کر وہ ریاشی کا حوالہ دیتے تھے اور کبھی سجستانی کا اور کبھی عبدالرحمٰن کا[3]۔

یا ازہری کی ایک اور روایت ہے کہ نفطویہ، ابن درید کو کچھ نہیں سمجھتے تھے اور ان کی روایت کو غیر مستند جانتے تھے[4]

یا پھر دارقطنی کو لیجیے، وہ کہتے ہیں کہ ابن درید کے بارے میں لوگوں کے کچھ اقوال ہیں[5]۔

لیکن سیوطی کہتے ہیں[6] کہ ابن درید ان سب باتوں سے مبرّا ہیں اور اگر نفطویہ نے علامہ ابن درید کے خلاف یہ اشعار لکھے ہیں ؎

---

[1] امام عصرہ فی اللغۃ والادب [2] الازہری اپنی تہذیب اللغۃ کے مقدمہ میں کہتے ہیں: وممن الّف فی زماننا الکتب فرمی بافتعال العربیۃ وتولید الالفاظ وادخال مالیس عن کلام العرب فی کلامہا ابوبکر محمد بن درید۔ الخ [3] جلست الی جنب ابن درید وہو یحدث ومعہ جزء فیہ ماقال الاصمعی، فکان یقول فی واحدۃ: حدثنی الریاشی وفی آخر حدثنا ابوحاتم وفی آخر حدثنا ابن اخی الاصمعی عن الاصمعی کما یجی علی قلبہ۔ [4] وسئلت ابراہیم بن محمد بن عرفۃ عنہ فلم یعبأ بہ، ولم یوثقہ فی روایتہ۔

[5] وسئل عنہ الدارقطنی اثقۃ ہو ام لا؟ فقال تکلموا فیہ [6] المزہر۔

ابنُ درید بقرة وفیه عیٌّ وشره
ویدّعی من حمقه وضعَ کتابِ الجمهره
وھو کتابُ العین الاَّ انهٗ قد غیّره

تو اس سے پہلے ابن درید نے نفطویہ کے بارے میں یہ اشعار کہے تھے ؎

لو اُنزل الوحیُ علی نفطویه لکان ذلك الوحی سخطاً علیه
وشاعرٌ یدعی بنصف اسمه مستاھل للصفع فی اخدعیه
احرقه الله بنصف اسمه وصیّر الباقی صراخاً علیه

اس قسم کے اقوال کا فیصلہ "متنبی" نے خوب کیا ہے جب کہ یہ شعر کہا ؎

واذا اتتك مذمتی من ناقص فھی الشھادةُ لی بانّی کامل

اس عالم متبحر نے حسب ذیل تصنیفات اپنے پیچھے چھوڑی ہیں :-

(۱) ادب الکاتب (۲) الامالی (۳) الانواء (۴) روّاد العرب (۵) کتاب الخیل الکبیر (۶) کتاب الخیل الصغیر (۷) تقویم اللسان (۸) اللغات فی القرآن (۹) غریب القرآن (ناتمام) (۱۰) الملاحن والمقتبس (۱۱) الوشاح (۱۲) المطر (۱۳) المقصور والممدود (۱۴) السلاح (۱۵) فعلت وافعلت (۱۶) الجمھرة فی اللغة (۱۷) الاشتقاق (۱۸) المجتنی (۱۹) السرج واللجام (۲۰) المقصورة الکبیرة (۲۱) المقصورة الصغیرة[1]

جب ان کی عمر نوّے سال کی ہوئی تو ان پر فالج گرا[2]۔ اور قریب دو سال اس موذی مرض میں مبتلا رہے۔ اس دوران میں اگر وہ کسی کی آہٹ سنتے تھے تو انہیں بُرا معلوم ہوتا تھا[3]۔

---

[1] المقصورہ کئی بار چھپ چکا ہے اور الجمہرۃ فی اللغۃ کو دائرۃ المعارف حیدرآباد (دکن) نے مستشرق کرینکو سے تصحیح کرانے کے بعد چھاپ دیا ہے۔ اسی طرح اسی ادارہ نے المجتنی کو بھی شائع کیا ہے۔ کتاب الاشتقاق کو ۱۸۵۴ء میں مستشرق Wuestenfeld نے Goettingen میں شائع کیا اور ۱۸۵۹ء میں کتاب السرج واللجام کو مستشرق Wright نے لیڈن سے شائع کیا ہے۔ [2] ابن خلکان، وفیات الاعیان

[3] ایضاً

لیکن ان کے شاگرد ابوعلی القالی کہتے ہیں کہ ان دنوں بھی ان کا دماغ بالکل صحیح کام کر رہا تھا اور لغت یا لسانیات کی کوئی بات ان سے پوچھی جاتی تو وہ فوراً صحیح جواب دیتے تھے[۱]۔ بالآخر ۳۲۱ھ میں شعبان کی اٹھارہ تاریخ بدھ کے روز وہ اس دار فانی سے رحلت کر گئے[۲]۔ اسی دن ایک اور عالم متبحّر کا انتقال ہوا جو معتزلی تھے اور متکلمین میں بہت بلند پایہ تھے یعنی ابوہاشم عبدالسلام بن محمد الجبائی۔ اسی لئے لوگ کہا کرتے تھے کہ آج علم اللغت اور علم الکلام ایک ساتھ رحلت کر گئے[۳]۔

جحظة البرمکی[۴] نے ان کی موت پر جو اشعار کہے تھے وہ یہ ہیں ؎

فقدتُ بابن درید کلّ منفعةٍ — لما غدا ثالث الاحجار والترب

وکنت ابکی لفقد الجود مجتهدًا — فصرت ابکی لفقد الجود والادب

اسی طرح بغدادیوں میں سے ایک شاعر نے ان کی شان میں ایک طویل مرثیہ لکھا تھا[۵]، جس میں ۵۳ اشعار تھے اور ان میں سے حسب ذیل اشعار ہم یہاں قلمبند کرتے ہیں ؎

فقدناك فقدان المصابيح في الدجى — اذا ضل عن قصد الهداية مقصد

جیسے اندھیری رات میں کوئی چراغ بجھ جائے اسی طرح ہم بھی تم کو کھو بیٹھے۔

ومانت بموت العلم منك قلوبنا — وکنت حیاها لم تزل بك ترشد

تمہارے ساتھ تمہارا علم بھی گیا اور ہمارے دلوں کو پژمردہ کر گیا۔ اب کون تازگی بخشے گا؟

لتبکك ابکار المعانی وعونها — وغر القوافی حین تروی وتنشد

اب ندرت خیال اور پختگی مضامین بلکہ شعر و شاعری تمہارا ماتم کرتے رہیں گے۔

تسیر مسیر الانجم الزهر کلّما — خبا ضوء شعر اشرقت تتوقد

تمہارے اشعار مثل انجم تابان رہیں گے۔

---

[۱] ابن خلکان: وفیات الاعیان [۲] ایضاً۔ المسعودی: مروج الذہب۔

[۳] ابن خلکان: وفیات الاعیان [۴] جحظة کا پورا نام احمد بن جعفر ہے۔

[۵] ابوعلی القالی: کتاب ذیل الامالی والنوادر۔

لانشرت بالعلم الخلیل فخلتنا فشاهده ان ضمنامنك مشهد

تم نے اپنے علم سے خلیل بن احمد کو زندہ کردیا جس کسی محفل میں ہم تم کو دیکھتے ہیں تو خلیل بن احمد یاد آجاتے ہیں۔

وجالستنا بالاصمعی و معمر واوجدتنا مالم یکن قبل یوجد

تم اصمعی اور ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ کے ہم پلہ معلوم ہوتے ہو اور اس سے پہلے زبان میں کسی نے وہ بات پیدا نہ کی جو تم نے کی ہے۔

وخلنا ابازید لدینا ممثلا وانت بفضل العلم اعلیٰ وازید

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ابوزید الانصاری اب تک موجود ہیں حالانکہ تمہارا علم وفضل بہت زیادہ ہے۔

وشاهدتنا بالمازنی وعلمه وما غاب عنا اذحضرت المبرد

ہم کو مازنی اور مبرد بھی اسی محفل میں نظر آتے ہیں جہاں تم ہوتے تھے۔

وکنت اماما فی الروایة کلها یضاف الیك الصدق فیها ویسند

ہر روایت میں تم پیش پیش رہتے تھے اور تمہاری روایتیں صحیح اور مستند ہوا کرتی تھیں۔

هوت انجم الآداب والعلم واغتدت

ریاضهما من بعده وهو همد

علم وادب کے ستارے تمہارے بعد ماند پڑ گئے۔

مقصورہ

مقصورہ اس قصیدہ کا نام ہے جو ابن درید نے میکالیوں کی مدح میں لکھا تھا اور یہ قصیدہ نہ صرف ابن درید کی شہرت کا واحد کفیل ہے، بلکہ جب تک عربی زبان بولی جائے گی اس وقت تک اس قصیدہ کی وجہ سے شاہ ابن میکال اور ان کے بیٹے اور پوتے کا نام اسی طرح باقی رہے گا جس طرح کہ متنبیؔ کی وجہ سے سیف الدولہ اور ابن ہانی کی وجہ سے المعزلدین اللہ الفاطمی کا نام غیر فانی ہو چکا ہے۔ انہوں نے دراصل دو مقصورے لکھے ہیں، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ بڑے مقصورہ میں ۲۵۳ اشعار ہیں اور چھوٹے میں

کم از کم ۱۴۸ اشعار ہیں۔ ان کو مقصورہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اشعار کے قافیوں میں وہ تمام الفاظ ہیں جن کے آخر میں الف مقصورہ ہے مثلاً عصا، ھدیٰ، عمی، وغیرہ۔ بعضوں نے مقصورہ کے معنی مکان یا محل کے لئے ہیں جس میں مہ جبین رہتے ہیں۔ مسجد میں اس محفوظ مقام کو بھی مقصورہ کہتے ہیں جہاں کوئی بادشاہ یا والی نماز جماعت کے لئے کھڑا ہوتا تھا۔ اور ایسی محفوظ جگہ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے اپنے لئے مخصوص کی تھی[1] بہرنوع ندرتِ خیال اور جدتِ ادا کی بنا، پر اس قصیدہ کا ہر شعر ایک مہ لقا کے مانند ہے، جس کی طرف علامہ جمال الدین بن الجوزی نے اپنی تقریظ میں اشارۃً کہا ہے[2]:

ھی من المشھورات فی الانام والمقصورات لا فی الخیام۔

میکالیوں نے ابن درید کو اپنے ہاں بلاکر ایسے ایسے انعام واکرام دیئے کہ شاعر کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں جس میں تملق یا خوشامد کا کوئی پہلو نہیں معلوم ہوتا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں[3]:۔

حاشا الامیرین اللذین اوفدا … علیّ ظلا من نعیم قد ضفا
ان ابن میکال الامیر انتاشنی … من بعد ما قد کنت کالشیٔ اللقا
ومدّ ضبعیّ ابو العباس من … بعد انقباض الذرع والباع الوزیٰ

اس قصیدہ کو لکھنے کے وقت ابنِ درید کافی سن رسیدہ ہو چکے تھے۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

استحی بیضا بین افوادک ان … یقتادک البیض اقتیاد المھتدیٰ
ھیہات ما اسفع ھا نازلۃ … اطربا بعد المشیب والجلاَ
فان امت فقد تناھت لذتی … وکل شیٔ بلغ الحد انتھیٰ

---

[1] الفخری والکامل للمبرّد۔
[2] شرح مقصورہ لابن درید: المکتبۃ المحمودیۃ التجاریۃ بمصر۔
[3] ابن درید: مقصورہ۔

پورا قصیدہ پڑھنے سے ذہن میں تین باتیں ابھرتی ہیں :۔

(۱) ان کی زندگی کے کچھ حالات

(۲) عربی کے چوٹی کے شعرا کا خصوصی باتوں میں تتبع اور ان سے گوئے سبقت لے جانا۔

(۳) اسلامی رنگ

ان کی زندگی کے جو حالات اس میں پائے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں :۔ یعرب کے خاندان سے ان کا تعلق۔ عراق میں ان کی ناکامی لیکن پھر بھی عراق سے اور اہل عراق سے دلبستگی۔ فارس کا سفر اور اپنے ممدوحین کی نوازشاتِ شاہانہ۔ سفر کی صعوبتیں۔ مے نوشی اور دیگر لذائذ۔

انہوں نے اس قصیدہ میں بلا امتیاز زمانہ، عرب کے مشہور شعراء کا چند خصوصی باتوں میں تتبع کیا ہے اور پھر ان سے دو چار ہاتھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ تمام خوبیاں جو ان مشہور شعراء میں انفرادی طور پر پائی جاتی ہیں، اس قصیدہ میں مجموعی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً شنفرای اپنے 'لامیۃ العرب'[۱] میں کہتا ہے کہ میرے لئے تین چیزیں کافی ہیں[۲]:۔ (۱) توانا دل (۲) چمکتی ہوئی تلوار اور (۳) لمبی کمان۔ یا طرفہ اپنے مشہور معلقہ میں تین چیزوں کو چاہتا ہے[۳]:۔ (۱) شراب جس میں اگر پانی ملایا جائے تو جھاگ اٹھنے لگے (۲) گھوڑا جو سرپٹ بھاگے (۳) وصالِ محبوب۔ اسی طرح ابن درید کو بھی تین چیزیں پسند ہیں[۴]:۔

---

[۱] بعض ادیبوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ لامیۃ العرب کا کہنے والا شنفری نہیں ہے۔

[۲] لامیۃ العرب : ثلثۃ اشیاء فؤاد مشیّع وابیض اصلیت وصفراء عیطل

[۳] المعلّقہ : فمنھن سبقی العاذلات بشربۃ کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

وکرّی اذا نادی المضاف مجنبا کسید الغضا نبھتہ المتورد

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب ببھکنۃ تحت الخباء المعمد

[۴] مقصورہ : ازال حشو نثرۃ موضونۃ حتی اواری بین اثناء الجشی

وصاحبی صارم فی متنہ مثل مدب النمل یعلو فی الربی

(۱) شجاعت (۲) گھوڑا اور (۳) شمشیر آبدار۔ یہ تینوں وہ اس لئے نہیں چاہتے کہ جنگ بسوس، جیسی لڑائی میں استعمال کریں بلکہ وہ شجاعت کو بلند حوصلگی کے لئے چاہتے ہیں اور گھوڑا جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اور شمشیر آبدار دشمنوں کے دل و جگر کو کاٹنے کے لئے چاہتے ہیں۔

ان کا گھوڑا ڈیل ڈول میں بالکل بے عیب ہے اور تیز رفتاری میں 'امرؤ القیس' کے گھوڑے کو بھی مات کر دیتا ہے۔ دیکھئے امرؤ القیس اپنے گھوڑے کا وصف یوں بیان کرتا ہے[1] کہ اس کی دونوں جانب ہرنی جیسی ہیں۔ اس کی ٹانگیں شتر مرغ جیسی ہیں، اس کا بھاگنا بھیڑیے کی مانند ہے اور اس کی جست لومڑی کی سی ہے۔ لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اگر ایسا گھوڑا مل جائے تو شہسواری کے لئے نہیں بلکہ کسی عجائب خانہ کی زیب وزینت ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے ابن دریہ کا گھوڑا جب بھاگتا ہے تو آس پاس کی ہوائیں گُلاٹیں مارتی ہیں وہ بھاگتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک روشنی تھی جو چمکی اور غائب ہوئی یا ایک بجلی تھی جو کوندی اور ختم ہوئی[2]۔

پھر ان کے اونٹ کو لیجئے، وہ حاجیوں کو مکّہ معظمہ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کی طرف لے جاتا ہے۔ اور طرفہ اور عنترہ کے اونٹ کے مانند نہیں جو کسی مہ جبین کو لے جا رہا ہو یا کسی عاشق زار کو۔

اور بھی کئی باتیں ہیں مثلاً جب اپنے خاندان یعنی یعرب کے قبیلہ کا ذکر کرتے ہیں تو غیروں کو مثل فردوسی برا بھلا نہیں کہتے[3] اور نہ ہی عمرو بن کلثوم کی طرح جو اپنے تغلبی' قبیلے کی مدح سرائی کرتا ہے، کہتے ہیں کہ ؎

اذا بلغ الفطام لنا صبیّ تخرّ لہ الجبابر ساجدینا[4]

---

[1] المعلقۃ: لہ ایطلا ظبی وساقا نعامۃ ✤ وارخاء سرحان وتقریب تتفل ✤ [2] مقصورہ: یجری فتکبو الریح فی غاباتہ حسری تلوذ بجراثیم السحا ✤ اذا اجتھدت نظرا فی اثرہ ✤ قنت منا اومض او برق خفا ✤

[3] شاہنامہ: زشیر شتر خوردن وسوسمار ✤ عرب را بجائے رسید است کار ✤
کہ تاج کیاں را کند آرزو ✤ تفو باد بر چرخ گردوں تفو ✤ [4] المعلقۃ لعمرو بن کلثوم۔

بلکہ یوں کہتے ہیں کہ ؎

ھم الاُولیٰ ان فاخروا قال العلی بنی امرئٍ فاخرکم عفر البری

اور نہ ہی حارث بن حلزہ کی طرح لوگوں سے نالاں ہوکر کہتے ہیں کہ ؎

انّ اخواننا الاراقم یغلون علینا فی قیلھم احفاء[1]

بلکہ عراق اور اہل عراق کے لئے جن میں ان کے حاسدین بھی تھے کہتے ہیں کہ ؎

انّ العِراقَ لم افارق اھلہ عن شنآن صدّنی ولا قلیٰ

ولا اطبی عینیّ مذ فارقتھم شئ یروق العین من ھٰذا الوریٰ

عشقیہ مضامین میں بھی ان کے قلم سے پا فرسودہ باتیں نہیں نکلتیں اور مثل امرؤ القیس،
اس طرح نغمہ سرائی نہیں کرتے کہ ؎

وماذرفت عیناكِ الا لتضربی بسھمیكِ فی اعشارِ قلبٍ مقتّلِ[2]

بلکہ اسی مضمون کو ایک اچھوتا لفظی جامہ پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

لوناجت الاعصم لانحطّ لھا طوع القیاد من شماریخ الذری[3]

اوصابت القانت فِی مخلولق مستصعب المسلك وعر المرتقی

الھاہ عن تسبیحہٖ ودینہٖ تانیسھا حتّیٰ تراہ قد صبا

اور جب شجاعت کے جوہر دکھانا مقصود ہوتا ہے تو عنترہ کے مانند نہیں للکارتے کہ

واذا ظلمت فان ظلمی باسل مرّ مذاقتہ کطعم العلقم[4]

بلکہ خم ٹھوک کر کہتے ہیں ؎

مادست من لوھوت الافلاك من جوانب الجوّ علیہ ما اشتکیٰ

---

[1] المعلقة لحارث بن حلزہ۔ [2] المعلقة (ترجمہ) تیرے نگاہ تیر نے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔
[3] مقصورہ: (ترجمہ) اگر محبوبہ پہاڑی بکری سے مخاطب ہو تو وہ بھی اپنا بسیرا چھوڑ کر چلی آئے
اور کوہ ہمالیہ پہ رہنے والے تپسوی سادھوؤں کو بھی ان کی عبادت سے غافل کر دے۔
[4] المعلقة للبید۔

اور نہ ہی طرفہ کی مانند خیال کرتے ہیں کہ ؎

اُذا القوم قالوا من فتیٰ ؟ خلت انّنی عنیت فلم اکسل ولم اتبلّد[1]

بلکہ ببانگ دہل کہتے ہیں ؎

فان سمعت برحی منصوبۃ للحروب فاعلم اننی قطب الرحیٰ

وان رأیت نار حرب تلتظی فاعلم بأنی مسعر ذاک اللظیٰ

منظر نگاری میں ان کا قلم لبید کی منظر نگاری سے زیادہ حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کرتا ہے اور جب وعظ و تلقین پر اتر آتے ہیں تو زہیر بن ابی سلمیٰ سے بھی گوئے سبقت لے جاتے ہیں۔

ان تمام شاعرانہ نکات کے باوجود اس قصیدہ کا چہرہ مہرہ بالکل اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے، بزرگانِ سلف سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ ہر کام میں خدا کی حمد اور نبی پاکؐ پر درود ہونا چاہئے۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں اس میں موجود ہیں۔ حمد کے لئے ارشاد ہوتا ہے ؎

یتوی التی فضلہا رب العلیٰ لما دحی تربتہا علی البنیٰ

اور درود کے لئے کہتے ہیں ؎

صلّی علیہ اللہُ ما جنّ الدّجیٰ وماجرت فی فلک شمس الضحیٰ

پھر جابجا قرآن پاک کی آیات اور احادیثِ نبوی کو تضمین کرتے جاتے ہیں، مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:-

والحمد خیر ما اتخذت عدۃ وانفس الاذخار من بعد التقی

کیا اس کا دوسرا مصرعہ آیۂ شریفہ "فان خیر الزاد التقویٰ" کی تشریح نہیں ہے؟

اور ؎ وکل قرن ناجم فی زمن فہو شبیہ زمن فیہ بدی

کیا یہ وہ حدیث نہیں ہے جس کا مضمون ہے "الناس بزمانہم اشبہ منہم بآبائہم"؟۔

---

[1] المعلقۃ لطرفۃ۔

ان کی قسمیں بھی قرآن مجید کی قسموں سے مطابقت رکھتی ہیں اور وہ اونٹ کی قسم اس لئے کھاتے ہیں کہ سورۂ غاشیہ میں اور سورۂ حج میں اس کا ذکر موجود ہے اور اسی طرح گھوڑے کا ذکر بھی سورۂ عادیات میں اور سورۂ نحل میں موجود ہے پھر اس کی قسم کھانے سے کیوں گریز کریں۔ اگر یعرب کا ذکر کرتے ہیں جو زمانہ ماقبل اسلام کے لوگ ہیں تو وہ بھی اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں[1]۔

غرضیکہ مذکورہ تینوں باتیں اس قصیدہ میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، اس میں اور بھی بہت سی لفظی اور معنوی خوبیاں اور تاریخی اور ادبی نکات ہیں، مثلاً وہ امرؤالقیس، وضاح، زبّار کا ذکر کرتے ہیں اور ایام العرب کی یاد کو تازہ کرا دیتے ہیں۔ پھر "عند الصباح یحمد القوم السری" والی ضرب المثل لاکر خالدبن ولیدؓ کی بات کو دماغ کے پردے پر منعکس کر دیتے ہیں، اور "بلغ السیل الزبی" والی مثل بیان کرکے حضرت عثمانؓ کی زندگی کے آخری لمحات کا نقشہ ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور پھر "بنت ثمانین" والا محاورہ استعمال کرکے علم فقہ کے احکام کو نظروں کے سامنے لے آتے ہیں اور "ام الصبیّن" اور "ام ابیہ امہ" یا "بنت اخیہ" والے مرکب الفاظ لاکر ذوالرمہ کی شاعری کا انداز بیان شروع کر دیتے ہیں۔ اور "یاھؤلیّا" کہہ کر ان کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان کے زمانہ میں امیروں اور رئیسوں کے گھروں میں پائی جاتی تھیں اور جن کا ذکر ابونواس نے اپنے اشعار میں کئی جگہ کیا ہے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر ابوالطیب اللغوی نے کہا تھا کہ "اتنا علم اور اس قدر اشعار کسی کے سینہ میں نہیں پائے گئے بجز خلف الاحمر اور ابن درید"۔ مسعودی بھی اس کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ابن درید نے ہر قسم کی شاعری کی اور ان کے اشعار دل کو ہلا دیتے ہیں[2]۔ مرزبانی کہتے ہیں کہ ابن درید بڑے پُرگو شاعر تھے۔ اسی طرح ہر آنے

---

[1] مقصورہ: هم الاولیٰ جوهرهم اذا اعتزوا من جوهر منه النبی المصطفیٰ

[2] المسعودی: مروج الذہب۔

والے دور میں لوگوں نے ان کو یہ کہہ کر خراج تحسین دی کہ "ھو اشعر العلماء واعلم الشعراء[۱] ۔ یعنی علماء میں سب سے بڑے شاعر اور شاعروں میں سب سے بڑے عالم"۔

باوجود ان تمام کمالات کے اہل زمانہ میں سے چند افراد نے ان کے بلند پایہ ہونے سے انکار کیا اور کئی لوگوں نے ان کے مقصورہ کی ریس میں اپنے اپنے طور پر مقصورے لکھے[۲] ان میں سب سے زیادہ مشہور مقصورہ ابوالقاسم علی بن محمد بن ابی الفہم الانطاکی التنوخی[۳] کا ہے۔ لیکن آج ان مقصوروں کو کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ابن درید کا مقصورہ اب تک نصاب تعلیم میں کئی مدارس میں داخل ہے اور اس پر عربی زبان میں قریب پینتیس شرحیں لکھی جا چکی ہیں[۴]۔

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے ملک کے ایک مشہور ادیب حسن بن محمد الصاغانی نے بھی اس کی شرح لکھی تھی اور یادش بخیر' پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے ۱۹۴۷ء میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔ ایک اور ادیب پروفیسر سیّد محمد بدرالدین علوی نے ۱۳۶۵ھ میں ان کے اشعار یکجا کر کے دیوان کی شکل میں شائع کیا ہے۔

۱؎ السیوطی: بغیۃ الوعاۃ۔ السمعانی: کتاب الانساب۔ یاقوت الحموی: ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان

۲؎ و ۳؎ المسعودی مروج الذہب

۴؎ مقدمہ شرح مقصورہ للخطیب التبریزی۔

سندھ کے صوفیائے کرام

سید پیر مراد شیرازی
اور
اُن کا خاندان

مولانا اعجاز الحق قدوسی

سیّد علی اوّل حضرت سید احمد کے سب سے بڑے فرزند سید علی اوّل تھے، جو ۷۹۵ھ میں پیدا ہوئے، اور بیاسی سال کی عمر میں ۲۰ صفر بروز جمعہ ۸۷۷ھ کو انہوں نے وفات پائی اور یکم ربیع الاوّل کو اپنے والد کے پائینتی مدفون ہوئے۔ 'جنّت و حریر' سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے[1]۔

صاحب تحفۃ الکرام نے حضرت سید علی اول کی عظمت وجلالت کو سراہتے ہوئے لکھا کہ "وہ بہت بڑے واصل باقدر بزرگ تھے ان کے حالات وکرامات کا کوئی شمار نہیں"[2]۔

حضرت سیّد علی نے اپنے بھائی سید پیر مراد کے دستِ حق پرست پر بیعت کی،

---

[1] حواشی مکلی نامہ (سندھی)، مرتبہ سید حسام الدین راشدی ص ۴۳

[2] تحفۃ الکرام اردو ترجمہ ص ۵۷۲

اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ تحفۃ الطاہرین میں ہے کہ:

"قطب زمان حضرت سید پیر مراد نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت و وسعتِ رزق اور معرفت کے حصول کے لئے بہت دعا فرمائی اور آپ کی دعاؤں کی برکت کی وجہ سے وہ ولایت و عرفان کے درجۂ کمال کو پہنچے اور صاحبِ کشف و کرامات ہوئے۔[1]

حضرت سید علی اول کے دو صاحبزادے تھے، ایک سید جلال اور دوسرے سید جمال۔ سید جمال نے حضرت سید علی ہی کی زندگی میں وفات پائی۔[2]

سید جلال سید جلال کے متعلق صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا کہ: وہ اپنے والد ہی کی طرح صاحبِ حال و قال بزرگ تھے انہوں نے لوگوں کو راہِ سلوک و معرفت کے دکھانے میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔[3]

حواشی مکلی نامہ میں سید حسام الدین راشدی نے لکھا کہ: سید جلال اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے چچا حضرت سید پیر مراد سے رجوع ہوئے اور یہ ان کے دوسرے خلیفہ تھے، انہوں نے سال کی عمر میں ۸۷۳ھ میں خلافت حاصل کی، اور ساری عمر تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم کی درس و تدریس میں بسر کی۔

سید جلال نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں ۹۳۶ھ میں وفات پائی۔ "وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے، اور سید محمد جعفر کے مغربی جانب مدفون ہوئے۔[4]

سید علی ثانی حضرت سید پیر مراد کے بعد اس خاندان کی علمی اور روحانی عظمت کو جس نے غیر معمولی فروغ بخشا، وہ سید جلال کے فرزند رشید حضرت سید علی ثانی تھے۔

---

[1] تحفۃ الطاہرین، ص۱۶، ۱۷ [2] حواشی مکلی نامہ ص۴۳ [3] تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص۵۶
[4] حواشی مکلی نامہ سندھی، ص۱۲۲۔

سندھ کے مشہور مؤرخ سید حسام الدین راشدی نے بحوالہ معارف الانوار ترخان نامہ کے مقدمہ میں، ان کا سن ولادت ۹۸۱ھ درج کر کے لکھا ہے کہ حضرت سید علی ثانی جب پیدا ہوئے تو حضرت سید میر مراد اس زمانے میں حیات تھے، انہیں جب آپ کی ولادت کی خبر معلوم ہوئی تو نہایت مسرور ہوئے۔[1]

صاحب تحفۃ الطاہرین نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

حضرت سید علی ثانی شیرازی نے ابتدائً حقائق و معارف آگاہ درویش آچر[2] علیہ الرحمہ سے فیض حاصل کیا، پھر عرفان و تصوف کے منازل حضرت مخدوم نوح[3] ہالائی سے طے کئے اور مقام فنا فی اللہ سے گزر کر بقا باللہ کے مرتبے پر فائز ہوگئے۔[4]

عہدِ حاضر کے سندھ کی تاریخ کے مشہور محقق سید حسام الدین راشدی نے ترخان نامہ کے مقدمے میں سید علی ثانی کے متعلق لکھا ہے کہ: سید علی ثانی (متوفی ۱۰۱۸ھ) سید جلال کے بیٹے ہیں جو خیر و برکت اور رشد و ہدایت میں سید مراد کے بعد اس خاندان میں بلند مقام رکھتے تھے، بہت سے سندھ کے مشائخ ان کے فیض تربیت سے تصوف میں اپنے زمانے کے یگانۂ روزگار بنے، ان میں سے ایک سید عبدالکریم[5] بلڑی بھی ہیں جو اپنے زمانے کے صاحبِ کشف و کرامت بزرگ اور سندھ کے ایک باکمال شاعر تھے جن کی اولاد میں سندھی شاعری کے آفتاب درخشاں سید شاہ عبداللطیف[6] بھٹائی ہیں

---

[1] مقدمہ ترخان نامہ: سید حسام الدین راشدی صد ۳۸ [2] درویش آچر: یہ ایک صاحب کمال بزرگ تھے، موضع ببہ لاڑی کے قریب درویشانہ وضع میں زندگی بسر کرتے تھے (تحفۃ الکرام اردو ترجمہ ۲۰۷) [3] حضرت مخدوم نوح ہالائی بن نعمت اللہ متوفی ۲۷ ذیقعدہ ۹۹۸ھ درک: تحفۃ الطاہرین، حاشیہ (۱) صد ۱۸ [4] تحفۃ الطاہرین صد ۲۰-۱۷

[5] سید عبدالکریم بلڑی: ولادت ۹۴۴ھ وفات ۱۰۳۰ھ

[6] شاہ عبداللطیف بھٹائی ولادت ۱۱۰۱ھ وفات ۱۱۶۵ھ

جن کی شاعرانہ اور عارفانہ نغموں سے سندھ کا "چپہ چپہ" گونج اٹھا۔

ارغون بھی ان ہی بزرگ کے زمانے میں سندھ میں وارد ہوئے اور پورا ارغونی عہد حکومت ان ہی کے زمانے میں گزرا، بلکہ ترخانی فرماں رواؤں میرزا عیسیٰ خاں ترخان اول[1] اور میرزا محمد باقی[2] بھی حضرت سید علی کے معاصر تھے۔ ان کی ذات اپنے زمانے میں مرجع خاص و عام تھی، ان کے عقیدت مندوں میں نہ صرف عوام اور غریب تھے، بلکہ امراء اور صاحبانِ اقتدار، دانشور اور شاعر بھی ان کی عقیدت کو اپنے لئے وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

سندھ کے پہلے تذکرۂ صوفیا کے مصنّف سید عبدالقادر بن سیّد ہاشم نے جو حضرت سید علی کے ہم عصر بھی ہیں اپنی مشہور کتاب حدیقۃ الاولیا میں آپ کے اخلاق و محامد کو نظم میں پیش کیا ہے۔

سندھ کے مشہور شاعر حاجی رضائی ٹھٹوی نے اپنی مثنوی زیبا نگار میں آپ کی مدح سرائی کی ہے۔

اکبر کا پہلا پیرہن جب ہمایوں راجپوتانہ سے مایوس ہو کر عمرکوٹ آیا تو میرزا شاہ حسن نے ظاہرا ہمدردی کے لئے ایک وفد ہمایوں کی خدمت میں روانہ کیا، جس میں حضرت سید علی ثانی بھی تھے یہ جب وہاں تھے تو اسی زمانے میں ۵ رجب شب یکشنبہ ۹۴۹ھ میں اکبر کی ولادت ہوئی، اور ہمایوں نے تبرکاً حضرت سید علی ثانی کے پیرہن سے ایک ٹکڑا لے کر اس کا پیرہن تیار کر کے اس کو پہنایا، یہ سب سے پہلا کپڑا تھا، جو عالمِ وجود میں آنے کے بعد اکبر کے جسم پر پڑا۔

حواشی مکلی نامہ میں ہے کہ میرزا جانی بیگ نے اسی عقیدت کی بنا پر اپنی بچی بنت میرزا صالح بن میرزا عیسیٰ کی شادی حضرت سید علی ثانی کے صاحبزادے سید

---

[1] میرزا عیسیٰ ترخان اول، وفات ۹۷۳ھ

[2] میرزا محمد باقی، وفات ۸ شوال ۹۷۳ھ

جلال ثانی سے کی۔

میرزا حسن شاہ کی وفات کے بعد دو سال تک امانۃً اس کی لاش مکلی میں سپرد خاک رہی۔ دو سال کے بعد اس کی بیوی اس کی لاش کو مدینۂ منورہ لے گئی تاکہ وہ اسے اس کے باپ شاہ بیگ ارغون کے پہلو میں دفن کرے، اس موقعہ پر اس نے حضرت سید علی ثانی کو ایک عقیدت مند ہونے کی حیثیت سے اپنے ساتھ لیا۔

آگے چل کر راشدی صاحب نے ان کے علم و فضل کو سراہتے ہوئے لکھا کہ وہ نہ صرف ایک شیخ طریقت تھے بلکہ ایک جلیل القدر عالم، ادیب اور دانشور تھے، اور سندھی، فارسی اور عربی زبان پر ید طولیٰ رکھتے تھے اور سندھ کے بلند پایہ شاعر تھے، صاحب تصانیف تھے، آداب المریدین اور تذکرۃ المراد ان کی مشہور تصنیفین ہیں۔

آداب المریدین انہوں نے چونسٹھ سال کی عمر میں عربی میں لکھنی شروع کی تھی، جس میں انہوں نے حضرت سید مراد شیرازی کی تعلیمات کو عربی میں لکھا ہے، یہ کتاب حضرت نے ۹۵۴ھ میں مکمل کی۔

دوسری کتاب تذکرۃ المراد ہے، جو انہوں نے اپنے جد کے سلسلے پر فارسی میں لکھی تھی۔

قاضی محمد اچی کے بعد اپنے علم و زہد و ورع کی بنا پر حضرت سید علی ثانی شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔

سماع سے ان کو اس قدر غیر معمولی شغف تھا کہ قاضیوں، مفتیوں اور محتسبوں کے منع کرنے کے باوجود سماع نہیں چھوڑتے تھے[1]

حضرت سید علی ثانی نے ۹۸۱ھ میں میرزا محمد باقی کی حکومت کے زمانے میں وفات پائی۔ میر معصوم بکھری نے ان کی تاریخ وفات "الحاتم بجودہٖ" سے نکالی ہے۔

(باقی)

---

[1] یہ تمام تفصیل حواشی مکلی نامہ مولفہ سید حسام الدین راشدی ص ۳۰۷، اور مقدمہ ترخان نامہ مولفہ سید حسام الدین راشدی ص ۳۴، ۳۵ سے ماخوذ ہے۔

تقسیمِ علومِ دین
صاحبِ ینابیع کی نظر میں
(۲)

ابو الفتح محمد صغیر الدین ایم اے

فصل پنجم میں اس امر کا بیان ہے کہ علم تصوّف کس کو کہتے ہیں۔ اس علم کے موضوع اور غرض وغایت سے بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ علم تصوف علوم دینیہ کا خلاصہ ہے۔

علم تصوف کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ | تصوّف اور صوُوف بروزن قعود کے لغوی معنیٰ ہیں تیر کا نشانہ سے ایک طرف کو جانا اور کسی شخص کا ایک طرف کو جانا اور کسی سے بدی کا ایک طرف ہونا۔

اور اصطلاح میں قلب کو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنے اور غیر اللہ سے اعراض اور تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھنے اور نفی خطرات کو تصوّف کہتے ہیں۔

خواجہ علی رامیتنیؒ سے کسی نے پوچھا کہ طریقت کی اصل کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ خدا سے ملنا اور ماسوا سے ٹوٹنا۔ گویا تصوّف قطعِ علائق کا اور خالقِ خلائق کی طرف متوجہ ہونے کا نام ہے۔

موضوع | کسی علم کا موضوع وہ ہوتا ہے جس کے عوارضِ ذاتیہ سے اس علم میں بحث

کی جاتی ہو۔ مثلاً علم طب کہ اس کا موضوع جسم انسانی ہے کیونکہ اس علم میں جسم انسانی ہی کے احوال یعنی مرض اور صحت کے متعلق بحث کی جاتی ہے، اسی طرح علم تصوّف کا موضوع انسان کا نفس اور قلب ہے، اس علم میں قلب و نفس کے احوالِ باطنی سے اور ان باطنی امراض سے بحث کی جاتی ہے، جو امورِ اُخرویّہ کے لئے مُضر ہیں اور دینی صحّت سے مانع ہیں۔

غرض وغایت اس علم سے غرض تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس ہے، اور بہ احسن اسلوب طاعات کی کثرت اور ذکرالٰہی کی مداومت اور تمام عبادات میں اخلاق ہے اور اس علم کا فائدہ اس دنیا میں یہ ہے کہ انسان اوصافِ حمیدہ سے متصّف ہو اور پسندیدہ اخلاق کو اختیار کرے۔ اسے حقائق ومعارفِ الٰہیہ کا کشف حاصل ہو اور آخرت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اعلیٰ ترین درجہ حاصل کر کے مقرّبین ومحبّین کے زمرہ میں شامل ہو۔

اِحسان کی تعریف اور اس کے ارکان وشرائط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تشریح فرمائی ہے کہ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے کہ گویا عبادت کرنے والا اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم ازکم یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔

تصوّف میں دراصل اسی کیفیت کے حاصل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے، یعنی تصوف کا مدار ہی احسان پر ہے۔ اور احسان کے دو رکن ہیں (۱) اخلاص (۲) حضورِ قلب۔

(۱) اخلاص کے پانچ رکن ہیں (۱) ترکِ سمعت (۲) ترک ریاء (۳) ترک عجب (۴) ترک طمع (۵) طلبِ رضائے خداوندی،

یعنی شہرت کی خواہش نہ ہو، ریاء سے پاک ہو، خود پسندی میں مبتلا نہ ہو طمع سے خالی ہو اور محض رضائے خداوندی کی طلب ہو۔

(۲) دوسرا رکن حضور قلب ہے یعنی ہمیشہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال رہے۔ یہ

حضورِ قلب بعض عبادات میں تمام اجزائے عبادت میں شرط ہے، مثلاً دعا کہ حضورِ قلب کے بغیر دُعا نہ ہوگی اور جب دعا نہ ہوئی تو عبادت بھی نہ ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی "دُعا مغز عبادت ہے" لیکن دورود شریف اس سے مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ درود شریف خواہ ریاء کے ساتھ یا بغیر حضورِ قلب کے پڑھے بہرحال اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نماز میں نیّت کے وقت حضورِ قلب شرط ہے، اگر اس وقت قلب حاضر نہ ہو تو نماز نہ ہوگی۔ باقی تمام نماز میں حضورِ قلب کا ہونا کمال نماز کے لئے تو البتہ شرط ہے لیکن اصل نماز کے لئے شرط نہیں کیونکہ اس کے بغیر بھی درست ہوجائے گی۔ روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ میں صرف نیّت کے وقت حضورِ قلب شرط ہے۔ اور قولی عبادت جو دوسروں کے نفع کے لئے ہو مثلاً تعلیم اور اذان وغیرہ، تو اس میں نیّت کے وقت حضورِ قلب کا ہونا حصولِ ثواب کے لئے کافی ہے اور تلاوتِ قرآن و دیگر اذکار میں اصل ثواب کے حصول کے لئے یہ کافی ہے کہ نیت کے وقت حضورِ قلب حاصل ہو۔

شرائطِ احسان

احسان کاملوں کا شیوہ ہے اور اس کی اہمیّت سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس امّتِ مکرمہ کو اس کی تعلیم دینے کے لئے آئے۔ یہ عبادتِ کاملہ کے لئے شرط ہے اور تمام عبادات میں خواہ وہ قولی ہوں یا بدنی یا مالی ہوں، احسان کا ہونا ضروری ہے۔ توبۂ نصوح، ورع، تقویٰ، تعفّف اور زہد، احسان کے شرائط میں سے ہیں۔ ان سبھوں سے مقصود یہ ہے کہ قلب سے گناہ کی تاریکیاں دُور کی جائیں۔ اور احسان کے لوازم میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا ہو اس کی محبّت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور اس سے امّید ہو۔ اور ان چیزوں سے صبر و شکر، تمکین و ثبات، قناعت و توکل، رضا بقضاء اللہ، تحمّلِ مکارہ اور اتباعِ سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تواضع پیدا ہوتا ہے، نیز حلم پیدا ہوتا ہے جو کہ نصیحت و شفقت، خدمت و سخاوت، الفت و مدارات، موافقت و مروّت وغیرہ کی صفات پر مشتمل ہے۔ اور احسان

کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ دل غیراللہ سے خالی ہو جاتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے، یعنی دل کی تطہیر ہوتی ہے، جس کا آیت وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا کے ذریعے حکم دیا گیا ہے اور یہ تطہیر کشف کا سبب بنتی ہے۔

ہر کرا جان از ہوسہا گشت پاک زود بیند قصر ایوان سماک

چشمِ دِل از شوم کورے پاک کن تا بہ بینی قصر فیض من لدن

اور اس تطہیر سے علوم عالیہ یعنی الہامات، واقعات اور مکاشفات و مشاہدات حاصل ہوتے ہیں اور نفس و شیطان کے مکائد معلوم ہوتے ہیں، ریا کی باریکیوں کا علم حاصل ہوتا ہے اور شہواتِ خفیہ اور منازل و مقامات اور روح و عقل کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات اور ملک و ملکوت کے اسرارِ غامضہ کی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم تصوف دینی علوم کا خلاصہ ہے۔

فصلِ ششم میں حدیث اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ کی تشریح کی گئی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ تیسرا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔

وہ حدیث یہ ہے:

العلمُ علمانِ، علمٌ فی القلبِ فذاك العلمُ النافعُ، وعلم علی اللسانِ فذاك حجۃُ اللہِ عزّ وجلّ علی ابنِ آدمَ۔

یہ حدیث حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اس کو بحوالہ دارمی نقل کیا ہے۔

علم علی اللسان سے مراد وہ علم ہے جو زبان ہی پر رہے اور اس کی روشنی دِل تک نہ پہنچے، یہ علم اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ (نعوذ باللہ من قولٍ بلا عمل)

اس معنیٰ کے لحاظ سے علم سے مراد دینِ اسلام کا علم ہے۔ اور علم تو ایک ہی ہے لیکن اس کی دو قسمیں اشخاص کے اعتبار سے ہیں کہ کسی کے حق میں دینِ اسلام کا علم مُضر ہے اور اللہ تعالیٰ کا غضب ہے، اس کے حق میں جہل ہی زیادہ نافع ہوتا ہے،

یعنی علم بذاتِ خود تو محمود ہے لیکن بعض کے حق میں زہرِ ہلاہل ہے تو کسی کے حق میں آبِ حیات ہے۔ ایک کے لئے علم حشر میں دامنگیر ہوگا تو دوسرے کے حق میں شفیع بن کر آئے گا، اس بنا پر علم کی دو قسمیں ہو گئیں ورنہ اصل میں علم ایک ہی ہے۔

علم نافع یہ ہے کہ دل میں اترے اور اس کو منوّر کرے اور اعمال اس امر کے شاہد ہوتے ہیں کہ دل علم کے نور سے نورانی ہو چکا ہے اور یہی اعمال مکاشفات وحالات کا سبب بنتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے اس حدیث کی شرح میں ذکر کیا کہ شیخ محقق عارف باللہ احمد بن عطار اسکندری نے کتاب الحکم میں ذکر کیا کہ علم نافع وہ ہے کہ سینے میں اس کی کرن پھیلے اور قلب کے پردے ہٹ جائیں۔

اور اکثر کا خیال یہ ہے کہ حدیث مذکور میں 'دو علم' سے مراد علم ظاہر اور علم باطن ہے۔ چنانچہ مجمع البحار میں مادۂ علم میں اس احتمال کو ذکر کیا کہ 'دو علم' سے مراد علم ظاہر اور علم باطن ہے۔ علم ظاہر اوامر ونواہی اور آداب وتکالیفِ شرعیہ کا علم ہے، جس کی تبلیغ تمام مکلفین کے لئے مساوی ہے۔ اور اس کا حکم سب پر یکساں جاری ہے اور یہ مکلفین پر حجت ہے کیونکہ بواسطہ یا بلاواسطہ رسالت کی تبلیغ کے بعد ان لوگوں کے لئے کوئی حجت اور عذر باقی نہیں رہتا ہے۔ اور علم باطن علم طریقت ہے، اس کو علم القلوب اور علم الحقیقۃ بھی کہتے ہیں۔

بعضوں کے نزدیک اس 'دو علم' سے مراد علم دراست اور علم درایت ہے' لیکن علامہ داہریؒ کے نزدیک فہم اور حق وصواب کے زیادہ قریب وہ توجیہ ہے جو شیخ عبدالحقؒ نے شرح مشکوٰۃ میں بیان کی ہے کہ علمِ نافع جو دل سے تعلق رکھتا ہے، وہ عمل کا باعث ہوتا ہے اور مقرون بالعمل ہوتا ہے اور علم مکاشفہ علم کے مطابق کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے علمِ نافع کی دو قسمیں ہیں، ایک علم دراست جو مقرون بالعمل ہو، دوسرے علم درایت جو کہ کشفی علم ہے۔ اور وہ علمِ دراست جس کے ساتھ عمل نہ ہو، وہ بندے پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور وبال ہے۔

بعض صحابہؓ کا بعض علوم کے ساتھ مخصوص ہونا،

صحابہؓ کی ایک جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص علم سکھاکر، شرف امتیاز بخشا تھا، چنانچہ مکتوباتِ منیریہ کے بائیسویں مکتوب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہؓ میں سے ایک گروہ کو طریق حق پر چلنے کے لئے منتخب فرمالیا تھا اور خلوت میں جس وقت آپؐ ان حضرات سے گفتگو میں مشغول ہوتے تو اس وقت رؤسائے عرب اور عام صحابہؓ کو وہاں رسائی نہیں ملتی تھی۔ ان حضرات کی تعداد ستّرؓ کے قریب تھی، اور ان میں بعض تو منتہی تھے، مثلاً خلفائے اربعہؓ اور حضرت سلمانؓ وغیرہم اور بعض متوسط تھے مثلاً حضرت معاذ، ہلال، ابوذر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

متعدد روایات واحادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض صحابہؓ بعض علوم کے ساتھ مخصوص تھے۔ چنانچہ علامہ داہریؒ نے اس کے ثبوت میں متعدد روایات پیش کی ہیں۔ منجملہ ان کے مشکوٰۃ کی وہ روایت بھی بیان کی ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"حفظتُ من رسولِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم وِعائَینِ ای من العلمِ فاما احدُھما فبثثتُہٗ فیکم، واما الآخر فلو بثثتُ لقطع ھٰذا البلعُوم یعنی مجری الطعام (رواہُ البخاری)

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ظرف (علم کے) یاد کرلیے ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک کو تو میں نے ظاہر کردیا اور دوسرے کو اگر ظاہر کروں تو یہ بلعوم کاٹ ڈالی جائے۔ بلعوم سے مراد حلق ہے"

ایک علم کا آپؐ کے ساتھ مخصوص ہونا

قوت القلوب میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم کو تین حصّوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک قسم تو وہ ہے جو عام وخاص سبھوں کو پہنچا دیا۔ یہ حدود شرعیہ، اور اوامر ونواہی اور توحید ومعاد کے مسائل کا علم ہے۔ اور دوسرا حصّہ ایک مخصوص جماعت

کو سکھایا لیکن دوسروں سے اس کو مخفی رکھا - یہ اسرار و حقائق کا علم ہے - اور تیسرا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا، جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

"لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً"

یعنی اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ"

لیکن جو علم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا، اس میں ما و شما کے قیل و قال یا گفت و شنید کی گنجائش نہیں ہے۔

علم تصوف کا انبیا و اولیا سے توارث کے طور پر جاری و ساری ہونا

فصل ہفتم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علم تصوف کی دولت بنی آدم کے سلسلے میں انبیا و اولیا سے توارث کے طور پر جاری و ساری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کی تخلیق سے پیشتر بہت سے عالم پیدا کئے تھے، جن میں بعض تو قہر و جلال کے مظہر تھے مثلاً شیاطین - اور بعض لطف و جمال کے مظہر تھے مثلاً ملائکہ - لیکن ایسی مخلوق نہ تھی جو جلال و جمال دونوں کی مظہر ہو اور علمِ الٰہی میں یہ بات تھی کہ یہ استعداد آدم علیہ السلام ہی میں ہے - چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر عشقِ الٰہی کا خزانہ ان کے سینے میں رکھا، کیونکہ اس کا ایک ذرہ دو عالم سے بہتر ہے اسی طرح تمام انبیا علیہم السلام کے سینوں میں اس کے خزانے رکھے اور ان کی پیروی کی وجہ سے اولیائے کرام کو بھی ان کی استعداد کے مطابق حصّہ ملتا رہا۔

کیا فرشتوں کو عشقِ الٰہی ہے؟

فرشتوں کو حق تعالیٰ کا عشق نہیں ہے بلکہ وہ محبّت اور معرفتِ الٰہی رکھتے ہیں - اس لئے کہ عشق اس سوز و اضطراب کا نام ہے جو معشوق کی جدائی کی وجہ سے عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کو سکون حاصل نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وصل نہ ہو - اور یہ عشق علم کے بغیر ممکن نہیں اس لئے کہ کوئی شخص کسی چیز کی حقیقت سے واقف ہو کر ہی اس کے وصل کے لئے

مضطرب اور شیفتہ ہوتا ہے، اس واقفیت کا نام علم ہے اور اضطراب وشیفتگی عشق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم عشق کا مبادی اور اس کا دیباچہ و دلیل ہے اور عشق علم کے بغیر ممکن نہیں۔

فرشتے جو عشق نہیں رکھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق تحصیل غیر حاصل کے لئے اور قوت سے فعل کی طرف لانے کے لئے ہوتا ہے اور فرشتوں کے ساتھ صورت یہ ہے کہ انہیں بارگاہِ حق میں جو رتبہ حاصل ہے وہ بالفعل ابتدا سے حاصل ہے۔ جناب باری تعالیٰ میں ہر ایک کو مخصوص مرتبہ اور مقام حاصل ہے، ان کے درجات معیّن ہیں کہ ان سے تجاوز اور ترقی نہ تو ممکن ہے اور نہ ان میں سے کسی کو تجاوز کی خواہش ہے۔ بلکہ ابتدائے تخلیق ہی سے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے موجودہ درجات وحالات پر راضی ہیں اس لئے کہ ان کے حق میں کسی قسم کے سوز واضطراب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہاں، فرشتے محبت اور معرفتِ الٰہی رکھتے ہیں، کیونکہ محبت دل کے میلان اور دوستی کو کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ فرشتے شب و روز اس کی عبادت میں مشغول ہیں۔ اگر محبّت نہ ہوتی تو مکروہ سمجھتے اس لئے کہ محبّت کراہت کی ضد ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کو مکروہ نہیں سمجھتے تو یقیناً اس کو دوست رکھتے ہیں۔ اور معرفت بھی رکھتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی ذات وصفات کو بھی پہچانتے ہیں، گویا فرشتوں کی اللہ تعالیٰ سے محبّت لغوی معنیٰ کے لحاظ سے ہے، اصطلاحی معنیٰ کے لحاظ سے نہیں۔ اس لئے کہ اصطلاح میں محبّت الٰہی عشق کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھول جانا ہی حجاب ہے

بندے اور پروردگار کے درمیان کوئی چیز حاجب حاجب نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تو حجابات سے منزہ ہے اور وہ بندوں سے ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ صرف حق کو بھول جانا ہی حجاب ہے، چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت وکرامت سے بھول جاتا ہے اور تدبیرات اخرویّہ کو اس شخص سے فراموش کر دیتا ہے اس لئے نسیان کے سوا کوئی حجاب نہیں، اور جس قدر یہ حجاب سخت تر ہوگا، بندہ حق سے

اتنا ہی دور ہوگا یہ حجاب اس کی ضد سے زائل ہوگا اور ضد اس کی یاد ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ، تم مجھے یاد کرو تو میں تم کو یاد کروں گا"

اور اس ذکر و نسیان کا تعلق دل سے ہے، جس وقت دل غیر کے ساتھ مشغول ہوگا تو اس وقت وہ حق سے محجوب اور دور ہوگا۔ اور بندہ جس قدر حق تعالیٰ سے غافل ہوگا اسی قدر اس سے دور ہوگا۔ گویا دوری اور فراموشی بندے کی طرف سے ہے، حق تعالیٰ اس سے منزہ ہیں۔ دوری مکان سے تعلق رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ مکان سے اور نسیان سے منزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے یکساں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا قرب ذکر ہے اور فرعون کا بُعد نسیان ہے۔ اس لئے انسان کی انسانیت ذکر کی وجہ سے ہے، صورت کی وجہ سے نہیں ہے۔

فصل ہشتم میں علامہ داہری نے سلسلۂ سَنیۂ نقشبندیہ مجددیہ کو بیان کرتے ہوئے وہ شجرہ نقل کر دیا ہے جو ان کو ان کے مرشد کی طرف سے خلافت کے سلسلہ میں عطا ہوا تھا۔ اس کی عبارت درج ذیل ہے[ع]۔

الحمدُ للہِ علیٰ کلِّ حال • والصلوٰۃُ والسلامُ علیٰ رسولہٖ محمدٍ صاحبِ الکمال • وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ ارباب النوال • اَمّا بعدُ، فیقولُ العبدُ الراجی الیٰ اللہِ تعالیٰ الفقیر عبدُ الرسول الصدیقی الاحمدآبادی[۱] قد البستُ الخرقۃَ الفقیریۃَ الاخَ فی الدّین ابا الحسن السندی[۲]

ع چونکہ حضرت سلطان العارفین بایزید نے حضرت امام جعفر صادق کی روحانیت سے فیض حاصل کیا پھر حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی کو حضرت بایزید بسطامی سے بطریقِ اویسیت فیض پہنچا، بعد ازاں شیخ ابوعلی فارمدی، حضرت ابوالحسن خرقانی سے بطریقِ اویسیت مستفیض تھے، اس لئے اس سلسلہ کو سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ بھی کہتے ہیں۔

۱ متوفی ۱۱۳۶ھ ۲ متوفی ۱۱۸۶ھ۔

جعله الله من الصالحین الصادقین المخلصین ۔ وانا لبستها من
ید الشاه فتح الله قدس سرہٗ ۔ وهو لبسها من ید محمد المعصوم[۱] ۔
وهو لبسها من ید مجدد الالف الثانی الشیخ احمد[۲] السرهندی ۔
وهو لبسها من ید الشیخ محمد الباقی[۳] ۔ وهو لبسها من ید الشیخ[۴] الامکنگی
وهو لبسها من ید الشیخ درویش[۵] ولی ۔ وهو لبسها من ید الشیخ الزاهد[۶] ۔
وهو لبسها من ید الشیخ عبید الله الاحرار[۷] ۔ وهو لبسها من ید الشیخ
یعقوب[۸] الچرخی ۔ وهو لبسها من ید الشیخ الرحمانی والقطب الربانی بهاء
الحق والشرع والدین محمد النقشبند[۹] البخاری ۔ وهو لبسها من ید
الشیخ الامیر[۱۰] الکلال ۔ وهو لبسها من ید الشیخ محمد[۱۱] السماسی ۔ وهو
لبسها من علی[۱۲] الرامیتنی ۔ وهو لبسها من ید الشیخ محمود[۱۳] انجیر فغنوی ۔
وهو لبسها من ید الشیخ العارف ریوگری[۱۴] ۔ وهو لبسها من ید الشیخ عبد الخالق
الغجدوانی[۱۵] ۔ وهو لبسها من ید الشیخ ابی یوسف[۱۶] الهمدانی ۔ وهو لبسها من
ید الشیخ ابی علی الفارمدی[۱۷] ۔ وهو لبسها من ید الشیخ ابی الحسن[۱۸] الخرقانی ۔
وهو لبسها من ید الشیخ سلطان[۱۹] العارفین ۔ وهو لبسها من ید الامام[۲۰] جعفر
الصادق ۔ وهو لبسها من ید الشیخ القاسم[۲۱] ۔ وهو لبسها من ید الشیخ
سلمان[۲۲] الفارسی رض ۔ وهو لبسها من ید الشیخ خلیفة رسول الله صلی الله

۱؎ متوفی ۱۰۷۹ھ ۲؎ متوفی ۱۰۳۴ھ ۳؎ متوفی ۱۰۱۲ھ ۴؎ متوفی ۱۰۰۸ھ ۵؎ متوفی ۹۷۰ھ
۶؎ متوفی ۹۳۶ھ ۷؎ متوفی ۸۹۵ھ ۸؎ متوفی ۸۵۱ھ ۹؎ متوفی ۷۹۱ھ ۱۰؎ متوفی ۷۷۲ھ
۱۱؎ متوفی ۷۷۵ھ ۱۲؎ متوفی ۷۱۸ھ ۱۳؎ متوفی ۷۱۵ھ ۱۴؎ متوفی ۶۱۶ھ ۱۵؎ متوفی ۵۷۵ھ ۔
۱۶؎ متوفی ۵۳۵ھ ۱۷؎ متوفی ۵۱۱ھ ۱۸؎ متوفی ۴۲۵ھ ۱۹؎ متوفی ۲۶۱ھ ۲۰؎ متوفی ۱۴۸ھ
۲۱؎ باختلاف روایت ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ یا ۱۰۱ھ ۔
۲۲؎ متوفی ۳۳ھ ۔

علیہ وعلی آلہٖ وسلم ابی بکر الصدیق رضؓ وھو لبسھا من ید خاتم النبیین
وسید المرسلین وشفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہٖ و
صحبہٖ وسلم۔

فصلِ نہم میں شریعت، طریقت اور حقیقت کا بیان ہے اور ان کے درمیان فرق کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

شریعت اور طریقت کا فرق

لغت کے اعتبار سے شریعت اور طریقت دونوں مترادف ہیں، سبیل یعنی راہ کے معنیٰ ہیں ہیں اور روشن اور نہج کے معنیٰ میں بھی آتے ہیں۔

اور سالکین کی اصطلاح میں شریعت ظواہر افعال و اقوالِ اسلامی کو کہتے ہیں اور طریقت ان کے بواطن کو کہتے ہیں۔ شریعت کا تعلق جوارح کے ساتھ ہے اور طریقت کا دل کے ساتھ۔ مثلاً نماز کے افعال میں قیام، رکوع، سجود یا اقوال میں قرارت، تسبیح وتشہد وغیرہ شریعت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نیت اور استحضار طریقت ہے۔ زبان سے اقرار شریعت ہے اور دل سے تصدیق طریقت ہے۔ تمام بدنی و مالی عبادت شریعت ہے، اخلاصِ نیت طریقت ہے۔ ہر فعلی، قولی، مالی اور جانی عبادت بحیثیت ظاہر کے شریعت ہے اور بحیثیت باطن کے طریقت ہے۔ اور ہر وہ عبادت کہ خلق اس سے مطلع ہوجائے خواہ آنکھ کے ذریعے خواہ کان کے ذریعے مطلع ہو یہ شریعت ہے اور ہر وہ عبادت جو بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان ہو اور کسی مخلوق کو اس پر اطلاع نہ ہو خواہ وہ عبادت قلبی ہو یا غیر قلبی تو یہ طریقت ہے۔

مختصر یہ کہ شریعت تمام افعال و اقوال ظاہریہ کا نام ہے اور طریقت ان افعال و اقوال و اعمال کی روح ہے۔ لیکن طریقت و شریعت کا یہ فرق محض عقلی اور اعتباری ہے یعنی اعتبار اور تعقل میں ایک دوسرے سے جدا ہیں ورنہ حقیقت میں جدا نہیں ہیں شریعت بغیر طریقت کے اور طریقت بغیر شریعت کے کبھی وجود نہیں رکھتے ہیں۔ شریعت بغیر طریقت کے نفاق ہے اور طریقت بغیر شریعت کے زندقہ اور ضلالت ہے۔

شریعت اور طریقت کی مذکورہ بالا تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ طریقت اجزائے شریعت میں سے ایک جزء اور اس کی رُوح ہے۔ جس طرح انسان کی رُوح انسان کے اجزاء میں سے ہے، اسی طرح ایمان روحِ اسلام ہے۔

لیکن علمائے شریعت دونوں کو ایک ہی کہتے ہیں، اس لئے کہ طریقت شریعت کی راہوں میں سے ایک راہ ہے جس کو صراطِ مستقیم اور سبیل اللہ کہتے ہیں اور باقی راہیں مخفی ہیں کہ ہر راہ پر شیطان کھڑا ہے اس لئے طریقت شریعت کے اندر ہے، اس سے باہر نہیں۔ اور مشائخ طریقت ان دونوں میں فرق کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

ایمان اور احتساب کے معنیٰ

اذکار و عبادات کا اظہار شریعت ہے اور ایماناً واحتساباً تمام اعمال کا کرنا طریقت ہے۔ ایماناً عمل کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس عبادت پر اخروی درجات کا وعدہ فرمایا ہے اس وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے جس وعدہ کی خبر دی ہے وہ عین وعدہ حق ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

احتساباً کے معنیٰ یہ ہیں کہ طاعت کا اجر اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اور غیر اللہ سے آنکھ بالکل بند کر لے اور تمام طاعت حسبتہً للہ کرے۔

لغت میں احتساب کے دو معنیٰ ہیں ایک تو اللہ تعالیٰ سے خوف و عجز کے ساتھ ثواب کی اُمّید رکھنا، احادیث میں جہاں جہاں احتساباً کا لفظ آتا ہے، اس کے یہی معنیٰ ہیں۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ منکرات سے منع کرنا۔ اسی لئے حاکم شریعت کو محتسب کہتے ہیں۔

عبادت میں ایمان و احتساب اخلاص کو مستلزم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتقاد رکھنا بغیر اخلاص کے ممکن نہیں ہے اور

یہ تینوں چیزیں، یعنی ایمان، احتساب اور اخلاص، احسان کے اس اصطلاحی مفہوم میں داخل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ

"اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ــــ

اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

حقیقت

علامہ داہری نے حقیقت کے لغوی معنیٰ بیان کرتے ہوئے، اہل اصول اور اہل منطق کی اصطلاح کے مطابق اس کی تعریف وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ پھر حقیقت اور ماہیت کا فرق واضح کیا ہے پھر فرماتے ہیں کہ

"ہر جا کہ در کتبِ سلوک لفظِ حقیقت علی الاطلاق ورود یابد، مراد آنجا صفتی باشد از صفاتِ حق، وہر جا کہ حق گویند مراد ازان اللہ تعالیٰ خواہند"

یعنی سلوک کی کتابوں میں جہاں مطلقاً لفظِ حقیقت استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد صفات حق میں سے کوئی صفت ہوتی ہے اور جہاں حق بولتے ہیں، اس سے مراد اللہ تعالیٰ لیتے ہیں"

گویا سالکوں کی اصطلاح میں ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو حق کہتے ہیں اور صفاتِ حق میں سے ہر صفت کو حقیقت کہتے ہیں۔ اور صفات حق میں سے ہر صفت کی حقیقت حسبِ مقدور ادراک میں آتی ہے اگر وہ ادراک واقعہ کے مطابق ہو، خواہ علم کے ذریعے ادراک ہو یا حال کے ذریعے ہو تو اس کو معرفتِ رسمی اور معرفتِ حالی کہتے ہیں۔

شیخ ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں فرمایا کہ حق لغت میں ثابت کے معنی میں ہے جو باطل کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، اور باطل وہ ہے جو ثابت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے لفظِ حق کا استعمال حقیقۃً ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ماسوا کے لئے مجازاً ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ ہے وہ سب کا سب معرض زوال میں ہے اور مستعدّ ہلاک ہے اور جو چیز زائل ہونے والی ہو، وہ باطل، یعنی

غیرثابت ہوتی ہے اور حق حقیقۃً واجب الوجود ہی ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اصدق کلمۃ قالھا الشاعرُ، کلمۃُ لبیدٍ، اَلَا کُلُّ شیٔ مَا خلَا اللہِ بَاطِلٌ * (اخرجہُ البخاری ومسلم)

اور حق کی حقیقت صفاتِ حق ہیں، کیونکہ ذاتِ حق، من حیث ذات کے صفات سے مجرّد اور اعتبارات سے خالی ہو کر عقول واوہام کی رسائی سے باہر ہے۔ اس لئے ذاتِ حق کی حقیقت کی معرفت جو عارف کو حاصل ہوتی ہے وہ حق کی صفات ہی کے اعتبار سے ہے، یعنی ان صفات ہی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جو کہ ذات سے متعلق ہیں۔

مصنفؒ نے اس سلسلہ میں اپنی رائے یہ پیش کی ہے کہ

"بہتر آنست کہ گفتہ شود کہ حقیقتِ ذات مدرک ومعروف نمی گردد اصلا، ومعرفتِ حقیقتِ ہر صفت من وجہ، معرفت حقیقت ذات من وجہ است، پس نفی معرفت بالکنہ ونفی ادراک بالکنہ از ذات، واز صفات لازم می آید، نہ نفی معرفت وادراک من وجہ۔ ومعرفت صفات من وجہ ہمیں معرفت ذات من وجہ باشد۔"

یعنی ذات کی حقیقت کبھی بھی مدرک اور معروف نہیں ہوتی ہے اور من وجہ ہر صفت کی حقیقت کی معرفت من وجہ حقیقت ذات کی معرفت ہے، اس لئے ذات وصفات کے ادراک ومعرفت بالکنہ کی نفی لازم آتی ہے، من وجہ صفات کے ادراک ومعرفت کی نفی لازم نہیں آتی ہے، اور من وجہ صفات کی معرفت من وجہ ذات ہی کی معرفت ہے۔

حضرت میاں میر بالا پیر قادری

حافظ عباد اللہ فاروقی ایم۔اے

حضرت میاں میرؒ بالا پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا اسم گرامی میر محمد ہے، والدِ بزرگوار کا اسم گرامی قاضی سایئں دتا بن قاضی قلندر فاروقی ہے۔ آپ کا شجرۂ نسب اٹھائیسویں پشت میں حضرت فاروقِ اعظم رضؓ سے ملتا ہے۔ والدہ کا نام بی بی فاطمہ تھا، جو قاضی قادنؒ کی بیٹی تھیں۔ حضرت کی والدہ اپنے وقت کی رابعہ تھیں آپ کے چار بھائی —— قاضی بولن، قاضی عثمان، قاضی طاہر اور قاضی محمد تھے۔ دو ہمشیرگاں۔ بی بی جمال و بی بی بادی تھیں۔ بارہ سال کی عمر میں حضرت نے اپنی والدہ سے علم باطنی حاصل کرنا شروع کیا، کیونکہ ابھی آپ کی عمر سات برس تھی کہ والد فوت ہو گئے۔ ابتدائی عمر ہی میں آپ پر عالم ملکوت کے اسرار و رموز منکشف ہونے لگے۔ آپ میاں جیو بھی کہلاتے تھے۔

مولد و تاریخ ولادت

حضرت میاں میر سیوستان میں جو ٹھٹہ اور بھکر کے مابین واقع ہے، پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ داراشکوہ نے ایک جگہ "سکینۃ الاولیا" میں ۹۳۸ھ اور دوسرے مقام پر ۹۷۵ھ لکھی ہے۔ سفینۃ الاولیا میں ۹۵۷ھ لکھی ہے۔ چونکہ آپ کا ۷، ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو اٹھاسی ۸۸

برس عمر پاکر فوت ہونا صحیح ہے اس لئے ۹۵۷ھ درست سال ولادت ہے، داراشکوہ آپ کے سن وفات کے متعلق سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے:

"وبتاریخ ہفتم ماہ ربیع الاول ۱۰۴۵ ہجری بروز سہ شنبہ بہ محلّہ خافی پورہ و در حجرہ کہ مسکن ایشان بود طاہر روح مطہر ایشان از قفس تقید و وجود ہوتی خلاص یافتہ بعالم اطلاق لاہوتی کہ وطن آن بود شتافت و قطرہ بحر شد۔" (سکینۃ الاولیا)

جان، اے سبحان اور سیّد محمد لطیف کے نزدیک بھی آپ کا سن ولادت ۹۵۷ھ ہے۔

چونکہ آپ بہت ذہین اور محنتی تھے اس لئے نسبتہً ایک قلیل وقفہ مدت ہی میں عالم ہو گئے اور سندِ فضیلت حاصل کر لی۔ تکمیل علوم ظاہری کے بعد آپ مجاہدہ و ریاضت کے لئے کوہستان اور سیوستان چلے گئے۔ غوث وقت حضرت شیخ خضر کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے آپ کی تعلیم شروع کر دی۔ ایک مدّت تک آپ ان کی خدمت میں رہ کر مجاہدات و ریاضات کرتے رہے اور ان کی توجّہ سے مرتبۂ کمال پر فائز ہو گئے جب مرشدِ گرامی نے آپ کو مطلع انوار بنا دیا تو خرقۂ خلافت عطا کر کے ۲۵ برس کی عمر میں آپ کو لاہور متعیّن کر دیا۔ یہاں آکر مساجد میں قیام فرمایا۔ عہد اکبری تھا، اس وقت کے عالم مولانا سعد اللہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ ان دنوں آپ کا معمول یہ تھا کہ آپ دن کے وقت لاہور کے بزرگوں کی زیارت کو چلے جاتے، جہاں لوگوں کا گزر نہ ہوتا۔ داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں وہ مقامات درج کئے ہیں جہاں آپ وقتاً فوقتاً فروکش ہوتے تھے، مثلاً مزارات بی بیاں پاکدامن باغ و مقبرہ حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی متوفی ۹۱۰ھ وغیرہ۔ رات کو حجرے کا دروازہ بند کر کے جاگا کرتے تھے، کسی کو اپنے ساتھ نہ رکھتے، قبلہ رُخ بیٹھتے، اور اکثر یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

کسے کو غافل از حق یک زمان است ۔۔۔ در آں دم کافر است امّا نہاں است

کزیں غفلت بجاں پیوستہ بودے در اسلام بروے بستہ بودے

کئی برس تک نہیں سوئے۔ میاں محمد مراد مفتی کا کہنا ہے، چند سال تک پوری رات صرف ایک سانس لے کر گزار دیتے۔ جب عمر زیادہ ہو گئی تو چار مرتبہ سانس لیتے تھے۔ یہاں لوگوں کو آپ کے روحانی مرتبہ کا علم ہوا تو آپ سرہند چلے گئے، یہاں تنہا تھے وجع المفاصل (جوڑوں کے درد) میں مبتلا ہو گئے۔ ایام بیماری میں حاجی نعمت اللہ سرہندی نے خدمت کرنا سعادت کرنا سعادت سمجھا۔ ایک سال سرہند میں بسر کر کے آپ واپس لاہور تشریف لے آئے اور محلہ خافی پورہ میں سکونت اختیار کی اور تادمِ آخر یہیں رہے۔

جہانگیر بزرگوں کی زیارت کا بڑا شائق تھا۔ چنانچہ چودھویں سنِ جلوس کے واقعات میں جو ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء میں ہوئے اس نے تین بزرگوں کے متعلق، اپنے تاثرات درج تزکِ جہانگیری کئے ہیں۔ (الف) حضرت شیخ احمد سرہندی کے متعلق۔ (ب) شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے متعلق (ج) حضرت میاں میر عرف جیئو کی نسبت، متوخر الذکر کی نسبت جو جہانگیر نے لکھا ہے، سپردِ قلم کیا جاتا ہے:

"چوں بعرض رسید کہ در لاہور میاں شیخ محمد میر نام درویشے است، سندی الاصل بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحب حال و در گوشہ توکل و عزلت گشتہ۔ از فقر غنی واز دنیا مستغنی نشستہ است بنابریں خاطر حق طلب بے ملاقاتِ ایشان قرار نہ گیرد، و بدیدن ایشاں رغبت افزود۔ بہ لاہور رفتن متعذرم۔ رقعہ بخدمت ایشان نوشتہ، شوق باطن را ظاہر ساختم۔ وآں عزیز باوجود کبر سن وضعفِ بینہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آورد۔ و مدت ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبت متولے داشتہ شد۔ الحق ذاتِ شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود۔ من زنیاز مندی از خود برآمدہ بایشاں صحبت داشت و بسا سخنان بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم نذرے

بگزرانم چوں پایہ ہمت ایشان ازاں عالی یافتم ۔ خاطر باظہار ایں مطلب رخصت نہ داد۔ پوست آہوئے سفید بجہت جائے نماز بایشاں گزرانیدم فی الفور وداع شدہ بہ لاہور تشریف بردند۔" (تزک جہانگیری)

غرض جہانگیر بادشاہ نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ میں نے سنا کہ حضرت میاں میرؒ ایک خدارسیدہ بزرگ ہیں، اس لئے ان کی زیارت کا شوق ہوا چونکہ مجھے امورات دنیوی میں فرصت نہیں تھی، اس لئے آپ کی خدمت میں تشریف آوری کے لئے التماس کیا چنانچہ آپ اولوالامر کی اطاعت کا پاس کرتے ہوئے جہانگیر کے پاس پہنچ گئے، بادشاہ لکھتا ہے کہ میں نے آپ کی حالت استغنار کا مشاہدہ کر کے کچھ نذر کرنے کی جرأت کی، صرف ایک سفید ہرن کے چمڑے کی جانماز پیش کی جو آپ نے قبول کر لی' اور فوراً لاہور روانہ ہو گئے۔

دارا شکوہ سکینۃ الاولیا میں رقمطراز ہے کہ جہانگیر آپ کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ حضرت سے عرض کی " سلطنت کا زرومال اور جواہر میرے لئے اب اینٹ اور پتھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر آپ توجہ فرمائیں تو میں دنیاوی تعلقات کو قطع کر دوں۔ حضرت میاں میرؒ نے فرمایا آپ کی نگاہ میں پتھر اور جواہر یکساں ہیں یہ صوفی کا مقام ہے۔ آپ کا وجود خلق اللہ کی پاسبانی کے لئے ہے اور عدل جہانگیری کے باعث فقیر بھی دل جمعی سے ذکر حق میں مشغول ہیں۔ جہانگیر نے اصرار کیا تو حضرت نے تلقین کی۔ پہلے اپنی صفات کا حامل جانشین مقرر کر لیجئے پھر دنیا سے قطع تعلق کی اجازت ہو گی ــ شہنشاہ نے درخواست کی کہ کسی چیز کی خواہش کریں حضرت نے صرف رخصت کی اجازت چاہی۔ جہانگیر نے دو مرتبہ اپنے ہاتھ سے نیاز نامے لکھے اور حضرت کی خدمت میں روانہ کر کے حاضری کی آرزو کی ــ ایک رقعہ میں لکھا ــ " بہ عرض حضرت پیر دستگیر شیخ میر ــ ازین نیازمند بارگاہ الٰہی جہانگیر بعد از عرض دعا التماس یہ ہے کہ دعا کے وقت کبھی کبھی بندہ کو بھی یاد فرمایا کریں"۔

دیگر خطوط میں اپنے عجز وارادت کا اظہار اس شعر سے کرتے رہے ؎

جسم من این جا وجاں در کوئے دوست
خلق را وہم کہ جان در قالب است

جہانگیر وفات پاگئے تو شاہجہان حضرت میاں میرؒ کے آستانہ پر دو مرتبہ حاضر ہوئے۔ شاہجہان کہا کرتے تھے جب حضرت کے حجرے میں داخل ہوا تو آپ نے فرمایا۔ عادل بادشاہ کو اپنی رعیت اور سلطنت کی خبرگیری کرنی چاہئے اور اپنی تمام ہمت اپنی مملکت کے آباد کرنے پر صرف کردینی چاہئے، کیونکہ اگر رعیت آسودہ حال اور ملک آباد ہے تو سپاہ مطمئن اور خزانہ پر ہوگا۔ اورنگ زیب کے بھائی داراشکوہ اپنے والدِ گرامی کی معیت میں حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا کرتے تھے، سکینۃ الاولیا میں لکھتے ہیں:

"۲۷ رمضان ۱۰۵۰ھ سوموار آخر شب حضرت کی توجہ سے مجھ پر ایسی واردات ہوئی، جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سلطان الاذکار کی سعادت پائی۔"

داراشکوہ نے اپنی کتاب سفینۃ الاولیا، میں جو اس نے پچیس برس کے سن میں ۱۰۴۹ھ میں تصنیف کی حضرت میاں میرؒ کی زندگی کا خلاصہ درج کیا ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت ایشاں (حضرت میاں میرؒ) ساٹھ سال سے زیادہ لاہور میں اقامت گزیں رہے۔ عام وخاص کا روئے ارادت آپ کی طرف تھا۔ سلسلۂ قادریہ کے بزرگ تھے اور حضرت غوث اعظمؒ (سید عبدالقادر جیلانی) کا نام بے وضو زبان پر نہ لاتے تھے ترک وتجرید، فقر وفنا اور توکل وقناعت پر اپنے وقت کے سب بزرگوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ رات دن یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ ایک وزیر نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ جب آپ خوش وقت ہوں تو مجھے بھی خاطر میں لائیں اور دعا کریں۔ فرمایا۔ "اس وقت پر خاک پڑے جب غیر اللہ کی یاد آئے۔" آپ کا طریق سنت اور شرع کے مطابق رہا۔ کسی حالت میں بھی کوئی بات خلاف شرع نہیں کرتے تھے، آپ طریقت میں جنیدِ وقت تھے، کسی کو کم ہی مرید کرتے تھے اور جسے کرتے تھے اسے بدرجۂ کمال پہنچا دیتے تھے۔ آپ کے خلق کا یہ عالم تھا کہ مرید کا لفظ زبان پر نہیں لاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے دوستوں کو بلاؤ۔ بادشاہوں اور امیروں سے نذر قبول نہیں کرتے

تھے، آپ کے کلام پر وعظ و نصیحت کا رنگ غالب ہوتا تھا۔ اکثر برجستہ اشعار پڑھتے تھے اور ترک دنیا آپ کا معمول تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ تارک وہ ہے جو کسی چیز کی خواہش نہ رکھے۔ جس طرح بال برابر بھی پلیدی رہ جانے سے جسم ناپاک ہی رہتا ہے اسی طرح دل بھی پاک نہیں ہوتا، جب اس میں ماسوی اللہ کا خیال آئے اس پر یہ بیت پڑھتے تھے ؎

شرطِ اول در طریق عاشقی دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را وپشت پا زدن

داراشکوہ کا رفع مرض

داراشکوہ بیان کرتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ مجھ پر خاص مہربانی اور عنایت فرماتے تھے۔ میری عمر بیس برس کی تھی کہ مجھے ایسا مرض لاحق ہوا، جس کے علاج سے طبیب عاجز رہ گئے، شاہجہاں آپ کے ہاں حاضر ہوئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا یہ میرا بیٹا ہے۔ طبیب اس کے علاج سے عاجز ہیں توجہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اسے شفا بخشے، آپ نے ایک پیالہ منگایا اور دعا پڑھ کر اس پر دم کیا اور مجھ فقیر کو دیا، میں نے وہ پانی پیا تو اسی ہفتہ میں مجھے شفا ہوگئی اور بیماری جاتی رہی۔

سفینۃ الاولیا میں داراشکوہ یہ لکھ کر بیان ختم کرتا ہے کہ چونکہ میں اس سے پہلے سکینۃ الاولیا میں حضرتؒ کے اور مریدوں کے حالات مفصل لکھ چکا ہوں۔ اس لئے یہاں اتنا لکھنا ہی کافی سمجھتا ہوں۔

حضرت میاں میرؒ کا لباس فقیروں اور درویشوں کے مشابہ نہیں تھا۔ خرقہ اور مرقع نہیں پہنتے تھے۔ ارزاں کپڑے کی پگڑی اور گاڑھے کا کرتا زیب تن ہوتا تھا، جب لباس میلا ہو جاتا خود اپنے ہاتھ سے دریا پر جا کر صاف کرتے۔ فرماتے تھے لباس اس قسم کا ہونا چاہئے کہ کوئی شخص پہچان نہ سکے یہ فقیر ہے یا نہیں۔ گھر کا فرش پرانے بوریئے کا تھا۔ کسی دنیاوی چیز سے وابستگی نہیں تھی۔ اکثر کہا کرتے تھے۔ وفات کے بعد مجھے شور زمین میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور نہ ہی

قبر کی صورت بنانا کہ ؎

صورت قبر از بعد مرگ ویران خوشتر است
نسبتی مانند من با خاک یکساں خوشتر است

بعض اصحاب کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ میری ہڈیوں کو نہ بیچنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دُکان نہ بنا لینا۔ اور شیخ ابو الحسن خرقانی قدس اللہ سرہ کے اس قول کو اکثر زبان مبارک سے فرمایا کرتے تھے کہ "صوفی وہ شخص ہوتا ہے جو نہ ہو" اور اس پر اور الفاظ بڑھایا کرتے کہ اگر ہو تو بھی نہ ہو"۔

منازلِ سلوک کے متعلق فرماتے تھے۔ انسان تین چیزوں نفس[1]، دل[2] اور روح[3] کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی اصلاح خاص چیز سے ہوتی ہے، چنانچہ نفس کی اصلاح شریعت سے، دل کی طریقت سے اور رُوح کی حقیقت سے۔

داراشکوہ رقمطراز ہے کہ حضرت میاں جیو رح (حضرت میاں میر رح) سماع کے قائل تھے۔ اور ہندی راگ کو اچھی طرح سے سمجھتے اور اس سے خوش ہوا کرتے تھے۔ سماع کے وقت شرع شریف کی متابعت اور اپنے حوصلہ کی وسعت کی وجہ سے وجد ورقص نہیں فرماتے تھے۔ اور وقار و تمکنت کی وجہ سے آپ سے کوئی حرکت ظہور میں نہ آتی تھی۔ ایک مرتبہ جب آپ سے سماع اور وجد کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے یہ اشعار پڑھے ؎

بگویم سماع اے برادر کہ چیست مگر مستمع را بدانم کہ کیست!
گر از برج معنی بود طیرِ اُو، فرشتہ فرو ماند از سیر اُو
وگر مرد لہو است و بازی و لاغ فروں تر شود لہوش اندر دماغ

یعنی "اے بھائی سماع کی بات بتانے سے پہلے مجھے یہ جاننا ضرور ہے کہ اس کا سننے والا کون ہے۔ اگر وہ اہل دل ہے اور رمز آشنا۔ تو اس کی پرواز، فرشتوں سے بڑی ہوتی ہے۔ اگر وہ لہو و لعب اور کھیل کود کا دلدادہ ہے تو سماع سے اس کی حالت خراب تر ہو جائے گی"۔

داراشکوہ اس ضمن میں بیان کرتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ نغمہ سنا کرتے لیکن وجد نہیں کرتے تھے۔ ہاں ملّا شاہ بدخشانیؒ ماوراء النہر کے طریق پر فارسی میں نغمہ آرائی کیا کرتے، اور بے خودی کی حالت میں وجد بھی کرتے۔

حضرت میاں میرؒ اپنے حسن خلق کی وجہ سے مشہور اور ہر دلعزیز تھے۔ بقول داراشکوہ "اگر خلق کسی مرد کی صورت میں ہوتا تو حضرت میاں جیئو کی صورت میں ہوتا"۔

فرمایا کرتے تھے کہ — سلوک میں پہلا مرتبہ شریعت ہے۔ طالب کے لئے ضروری ہے کہ اس کے حفظ مراتب کی کوشش کرے۔ اور جب کوشش سے شریعت میں مستحکم ہو جائے تو اس کی برکت سے طریقت کی خواہش خود بخود پیدا ہو جائے گی اور جب طریقت کے حقوق کو بھی اچھی طرح ادا کر سکے گا تو اللہ تعالیٰ بشریت کے حجاب اس کے دل سے دور کر دیں گے اور حقیقت کے معنیٰ اس پر منکشف ہو جائیں گے۔

آپ کا وصال

لاہور میں قیام کے ساٹھ برس گزر گئے تو اسہال کا عارضہ ہوا پانچ روز تک علیل رہے۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ میں محلہ خوافی پورہ میں وفات پائی۔ داراشکوہ کی ایک روایت کے مطابق آپ نے ایک سو سات برس عمر پائی۔ بعض لوگ ستانوے برس کی عمر بھی بتاتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اٹھاسی برس کی عمر زیادہ قرین قیاس ہے۔

ایک روز حاکم لاہور وزیر خاں عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا واپس چلا جائے۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ عیادت کے لئے آیا ہے اجازت دے دی۔ وزیر خان نے عرض کیا کہ ایک طبیب حاذق لایا ہوں۔ جواب دیا "حکیم مطلق ہی کافی ہے"۔ وصیت کے مطابق آپ کو موجودہ مقام پیران کے یاروں کے پاس دفن کیا گیا۔

آپ کے مریدوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) حاجی نعمت اللہ سرہندی (۲) شیخ نتھا (۳) شیخ اسمٰعیل (۴) ملا خواجہ کلاں، (۵) میاں حامد (۶) حضرت میاں عبدالغفور دانشمند (۷) حاجی صالح (۸) ملا شاہ، (۹) ملا خواجہ بہاری (۱۰) شیخ احمد سنامی (۱۱) اور شیخ احمد بریلوی، جو سلسلۂ قادریہ کے

بہترین مشائخ وقت گذرے ہیں۔ چونکہ آپ کا سلسلۂ سلوک بہت مشکل تھا، اس لئے آپ نے مریدوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہ ہونے دیا۔ آپ کے برعکس حضرت شاہ ابوالمعالیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ رہی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ جن کے پاس چاروں سلسلوں کے خرقے تھے، کے مریدوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ علاوہ ہندوستان کے آپ کے مرید کثیر تعداد میں افغانستان اور ماوراالنہر کے علاقوں میں بھی پھیل چکے تھے، آپ کی تصانیف بھی تھیں، اسی طرح حضرت شاہ ابوالمعالی کی بھی بے شمار تصانیف تھیں۔ لیکن حضرت میاں میرؒ نے زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ آپ کے تعلقات بادشاہوں کے ساتھ نہایت خوشگوار رہے۔

مکتوبات حضرت میاں میرؒ بنام داراشکوہ

(۱) دولتِ دیدار نصیب،

"مجھے تمہاری عقل و شعور پر بھروسہ ہے اور میرا دل مطمئن ہے۔ اگر ذات پاک جلّ و اعلیٰ کی بارگاہ کی شان و بزرگی مدّنظر رکھو تو ممکن ہے غفلت جو عیش و سرور کو بنیاد سے کھو دینے والی ہے نزدیک نہ پھٹکے"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

(۲) دولت دیدار نصیب،

"مجھ دیوانے کو جو گفتگو کی وادی میں لائے ہو، اس واسطے مجبوراً اس وادی کی نسبت کچھ بیان کرتا ہوں۔ میں خود اس عالم سے گفتگو چھوڑنا چاہتا ہوں اور بہانہ ڈھونڈتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اہل ہمت سے قرض لے کر خرچ کرو"۔

(۳) دولت دیدار نصیب،

"وہی مددگار ہے، جس حالت میں ہو اللہ کی یاد میں رہو۔ صاحب دل کے دل میں کب کوئی خطرہ آسکتا ہے۔ اگر دل عارف کا دل ہے تو خاطر جمع ہے کہ وہ

بے خطر ہے۔ جس حالت میں ہو اپنے کام میں مضبوط رہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجازی کاموں میں بھی بااثر کرے گا۔

(۴) دولت دیدار نصیب،

شریعت کا ایک مرتبہ ایسا بھی ہے جو نہایت ہی بلند ہے اور جس سے مراد توحید ذات الٰہی اور معرفت شہود الٰہی ہے، یہ منصب اس کے خواصوں، یعنی انبیاء اور اولیاء کو نصیب ہوتا ہے۔ پہلے قدم کو شریعت کہتے ہیں جس پر اہل ظاہر کاربند ہیں اور اسی میں رہتے ہیں۔ دوسرا قدم طریقت ہے جس پر اہل سلوک کاربند ہیں، تیسرے قدم کو حقیقت کہتے ہیں یعنی اہل تحقیق کی راہ جو اس پر چل کر اس صاحب حقیقی یعنی اپنے مطالب اور مرادوں کی انتہا کو پہنچتے ہیں۔ ہم فقیروں کا مشرب اسی مطلب اعلیٰ کو پہنچنا ہے۔

(۵) دولت دیدار نصیب،

"میں پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ اپنے عزیز بھائی کی بہت قدر کرنا۔ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو تجھے یہ دولت وسعادت نصیب نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ کو پہچانو اور اپنے مرتبہ کا خیال رکھو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہشت ہے اور اس کی دوری دوزخ ہے۔ جو خدا سے دور رہا وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔"

حضرت میاں میرؒ کا مجموعۂ کلام جو غزلیات اور مثنویات اور رباعیات پر مشتمل ہے، حقائق ومعارف کا خزینہ ہے۔ اپنا تخلص "شاہ" کرتے تھے۔ ایک قصیدہ کے اشعار یہ ہیں ؎

لفظ معنیٰ گردد و معنیٰ بہ لفظ آید ترا — چشم معنیٰ بیں شود ہرگاہ بالفظ آشنا

از بہر ہر چشمہ بگزر چشم با چشمہ بدوز — بحر شو تا با تو باشد چشمہا را چشمہا

آتش ما سوخت عالم را و خاکستر نہ شد — آتش ما را نہ باشد ہیچ گہ روئے فنا

عاشقم نے عارفم نے جزو نے کل نے جسم — ہستی مطلق کہ شد ارض و سمائے ما فیہا

غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ چراغیست دریں خانۂ ویرانۂ ما روشن از آتش عشق تو شدہ خانۂ ما
آرے این راست کہ مرغیم و سی مرغیم دام ما تا چہ بود، تا چہ بود دانۂ ما

عارف ملاں اگر نہ ملامت سلامت است یعنی علامت رہِ عرفاں ملامت است
عارف رہے کہ جانب وحدت رساند ماند تو آنجا گزر نہ کرد کہ جائے اقامت است

حضرت صاحب کی رباعیاں اس انداز میں تھیں سے

از شش جہتم روئے نمودی آخر از ہر طرفے دلم ربودی آخر
بیروں و دروں جلوہ گری می دیدم بر تحقیق آمدم و تو بودی آخر

درگاہ حضرت میاں میرؒ اور گرد و پیش مزارات

شہزادہ داراشکوہ کے بیان کے مطابق حضرت میاں میرؒ کا مزار موضع عالم گنج اور دارا پور کے مضافات میں واقع ہے۔ لیکن آج کل ان دونوں بستیوں کے نام و نشاں تک نہیں ملتے۔

ملاّ عبدالحمید لاہوری بادشاہنامہ میں رقمطراز ہیں:

"قبر گرامیش در موضع غیاث پورست نزد بعالم گنج دارالسلطنت لاہور"

آج کل غیاث پور کا نام بھی مٹ چکا ہے اور اس علاقہ کو 'میانمیر' کہا جاتا ہے۔

سید محمد لطیف، سشن جج لاہور رقمطراز ہیں کہ شاہزادہ داراشکوہ نے اپنے پیر ملاّ بدخشی کا مزار بنوایا تھا اور حضرت میاں میرؒ کے مزار پر ابھی تعمیر شروع کی تھی کہ وہ اپنے بھائی اورنگ زیب کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ ملاشاہ بدخشی کے مزار پر جو قیمتی پتھر لگائے گئے تھے وہ رنجیت سنگھ اتار کر امرتسر لے گیا۔ حضرت میاں میرؒ کے مزار کا نچلا حصّہ اور جنوب کی جانب مسجد، داراشکوہ کی تعمیر کردہ ہے۔ بالائی حصّہ اورنگ زیب کا بنوایا ہوا ہے۔

غرض خانقاہ کی چار دیواری محیط ہے۔ داخلہ کے لئے جنوب کی طرف دو دروازے ہیں اور شمال کی طرف ایک۔ روضہ عین وسط میں ہے۔ چھ سنگ مرمر کی سیڑھیاں اوپر

پہنچاتی ہیں۔ اس کا چبوترہ ہر طرف ½ ۱۰ قدم ہے۔ اس سے نصف رقبہ پر روضہ ہے، جس کی دیواریں سوا پانچ پانچ قدم طویل ہیں۔ چبوترے کے شمالی اور جنوبی کونے سے سترہ سترہ قدم پر احاطے کی دیواریں ہیں۔ مسجد جنوب کی طرف دس قدم پر ہے جو شمالاً اور جنوباً ۱۶ اور شرقاً غرباً دس قدم ہے۔ وضو کے لئے ایک سبیل شمال کی طرف ہے۔ پاس ہی میٹھے پانی کا کنواں ہے۔ ہینڈ پمپ بھی لگا ہوا ہے۔ احاطہ کی غربی اور جنوبی دیوار کے ساتھ حجرے ہیں اور مشرقی جانب سجادہ نشینوں اور عقیدت مندوں کی پختہ اور خام قبریں ہیں۔ اکثر پر کتبے لگے ہیں۔ سجادہ نشین صاحب کے جھروکے دار نشستگاہ اور زائرین و زائرات کے لئے الگ حجرے لکھ کر نمایاں کئے گئے ہیں[۱]۔

روضہ کے داخلی دروازہ پر آپ کے مرید ملا فتح اللہ شاہ کی تاریخ لکھی ہے ؎

میاں میرؒ سر دفتر عارفاں	کہ خاک درش خاک اکسیر شد
سفر جانب شہر جاوید کرد	ازیں محنت آباد دلگیر شد
خرد بہر سال وفاتش نوشت	بفردوس والا میاں میرؒ شد

۱۰۴۵ھ

گرد و پیش مزارات

حضرت میاں میرؒ کے مزار کے شرقی جانب داراشکوہ نے ایک بارہ دری تعمیر کروائی تھی، جہاں اس کی ہمشیرہ نادرہ بیگم کا مزار ہے۔ اس کی وفات ۱۰۴۲ھ میں ہوئی جب کہ اس کی عمر گیارہ برس تھی۔ نادرہ گیارہ برس کی عمر تک حضرت میاں میرؒ کی خدمت پر مامور رہی وہ ہر نماز سے پہلے پانی لاکر ان کا وضو کراتی۔ ایک مرتبہ دوپہر کے بعد جب وہ حسب معمول وضو کرا رہی تھی تو حضرت نے فرمایا کہ اب تم جوان ہو گئی ہو اس لئے پردہ میں رہا کرو۔ نادرہ کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا اور وہ جان بحق ہو گئی۔ سید محمد لطیف لکھتے ہیں کہ یہ بارہ دری ایک تالاب کے درمیان واقع تھی اور ایک پل گزرگاہ کے طور پر بنا تھا جس کے ذریعہ سے لوگ

---

[۱] تاریخ جلیلہ صفحہ ۱۷۲ مصنفہ غلام دستگیر نامی۔

وہاں تک پہنچتے تھے۔ مشرق کی جانب اس کا کچھ حصّہ باقی ہے۔ شمال اور جنوب کی جانب دروازے تھے۔[۱]

شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ نادرہ بیگم شہزادہ پرویز بن جہانگیر کی بیٹی تھی اس کی والدہ کا نام جہاں بیگم تھا۔ نادرہ بیگم کی شادی داراشکوہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ نادرہ بانو کے بطن سے داراشکوہ کے ہاں "جہاں زیب بانو" بیٹی پیدا ہوئی جسے داراشکوہ کے قتل کے بعد اس کی پھوپھی جہاں آرا بیگم نے پرورش کی۔ نادرہ بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے شاہجہان نے ۱۰۴۲ھ میں کی تھی۔[۲]

راقم کو اس بارہ دری کو دیکھے ہوئے دو تین ماہ گزرے ہیں۔ یہ بارہ دری نہایت شکستہ حالت میں احاطہ درگاہ سے باہر مشرق کی طرف کھیتوں میں زبان حال سے اپنی ویرانی اور شکستہ حالی کا گلہ کر رہی ہے۔ مزار کی چھت یعنی گنبد اگرچہ موجود ہے لیکن اگر اس کی مرمّت نہ کی گئی تو عنقریب گر جائے گا۔ جو لوگ حضرت میاں میرؒ کے مزار پر آتے ہیں انہیں بارہ دری تک پہنچنے میں کافی دشواری کا سامنا ہوتا ہے، کھیتوں میں سے گزر کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ امید ہے محکمۂ اوقاف اس کی مرمّت کی طرف متوجّہ ہوگا۔ اس حالت میں بھی اس بارہ دری کی عظمت کے مٹے ہوتے نشانات عہد رفتہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں ؎

اینست ہماں ایواں کز نقش و نگارِ او
خاکِ درِ او بودے دیوارے نگارستاں

مزارات ملّا شاہ بدخشانیؒ اور خواجہ بہاریؒ

ملّا شاہ بدخشانی داراشکوہ کے مرید اور حضرت میاں میرؒ کے خلیفہ تھے۔ سنہ ۱۰۲۳ھ

---

[۱] ہسٹری آف لاہور۔ مصنفہ سید عبداللطیف صفحہ ۱۷۷ و تاریخ جلیلہ۔
[۲] شاہجہاں نامہ، جدید الطبع۔ ص ۳۹۱ مطبوعہ ۲ کلب روڈ ادارہ ثقافت، لاہور۔

میں لاہور آکر حضرت میاں میرؒ کے مرید ہوئے اور تاعمر مجرد رہ کر ۱۰۷۱ھ میں فوت ہوئے
ان کے مزار پر دارا شکوہ نے جو قیمتی پتھر لگوائے تھے وہ سب رنجیت سنگھ نے اتروا لیے۔

خواجہ بہاریؒ بھی حضرت میاں میرؒ کے مرید تھے۔ آپ کا روضہ حضرت میاں میرؒ کے احاطۂ درگاہ کے باہر مغربی جانب بلند خشتی چبوترے پر واقع ہے۔ آپ کا سن وفات غلام دستگیر نامی مرحوم کے بیان کے مطابق ۱۰۴۱ھ ہے۔ ان کے روضہ کے قیمتی پتھر بھی رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنیل نے اتار کر اپنی کوٹھی سجائی تھی۔ اس کے مغرب میں ایک قدیم مسجد ہے، جسے اس علاقہ کے مسلمانوں نے اس کے تالاب سمیت مرمت کرایا تھا۔ بادشاہ نامہ میں مذکور ہے کہ آپ صاحب کرامت بزرگ تھے۔

ان مزارات کے علاوہ مزار حاجی محمد صالح مرید حضرت میاں میرؒ روضہ حضرت میاں میرؒ کے غربی جانب واقع ہے۔

مزار محمد شریف فرزند ہمشیرہ حضرت میاں میرؒ، جمال خاتون۔ آپ حضرت کے مزار کے سجادہ نشین تھے۔ آپ کا سن وفات ۱۰۵۲ھ ہے۔

مزارِ ملا حامد گوجر، متوفی ۱۰۴۲ھ، روضۂ حضرت میاں میرؒ کے سامنے ہے اس کے ساتھ ہی حضرت کے سجادہ نشینوں کے متعدد مزارات ہیں۔

گورستانِ اقربائے محمد شریف مرحوم متصل مقبرہ خواجہ بہاریؒ۔

مزارِ بی بی جمال بادی ہمشیرہ ثانی حضرت میاں میرؒ۔ یہ مزار حضرت ملا شاہ بدخشی کے مزار کے غربی جانب ہے۔

ان کے علاوہ مزاراتِ عیسٰی شاہ ولد سید سعید شاہ، سید عنایت شاہ، سید اکبر شاہ بن عیسٰی شاہ بھی اسی جگہ واقع ہیں۔ ان کے علاوہ مزارِ مسقف حُور بانو بنت خواجہ حسن نظامی، متوفیہ ۱۳۶۸ھ بھی احاطۂ درگاہ کی آخری مشرقی جانب واقع ہے۔

تلخیص و تبصرہ

پروفیسر محمد سرور

حُجّۃُ الاسلام ۔ تصنیف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی

۱۸۷۶ء میں ضلع شاہجہان پور کے ایک قصبہ چاندا پور میں میلہ خدا شناسی کے نام سے ایک مذہبی اجتماع منعقد کیا گیا۔ اس میں مولانا محمد قاسم صاحب نے اسلام کی حقانیت پر ایک تقریر فرمائی تھی۔ ان کے مقابلے میں ایک پادری نولس تھا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات ہوتے تھے، اپنی اس تقریر میں اُن کا بھی جواب دیا تھا۔ بعد میں انہوں نے خود ہی اس تقریر کو قلم بند فرمایا۔ اور اسے حجۃ الاسلام کے نام سے شائع کیا گیا۔

اب اس کتاب کو مولانا اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند کی تسہیل و تشریح کے ساتھ بڑے اہتمام سے دارالعلوم دیوبند سے شایع کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم حکیم تھے اور وہ اسلام کو حکیمانہ انداز سے پیش فرماتے تھے ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ جو کچھ اسلام کے بارے میں کہیں، اس کی اپیل عام ہو۔ اور ہر سلیم الطبع آدمی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، اسے سُنے، اور سُن کر اس پر غور کرے۔ یہ تقریر آج سے کوئی سو سال پہلے کی گئی ہے، اور ظاہر ہے اس میں کئی ایک ایسی باتوں پر زور دیا گیا ہے، جن کو آج وہ اہمیت حاصل نہیں، جو سو سال پہلے

تھی، لیکن اس تقریر کا مبنیٰ خالص حکیمانہ ہے، اور آج بھی اسے پڑھ کر بصیرت ملتی ہے۔

سب سے پہلے مولانا محمد قاسم صاحب اس امر پر بُرھان لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق ہے، اور اُس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا، اس لئے انسان کی تخلیق حکمت پر مبنی ہے۔ اب انسان کو جو اللہ کی طاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے، تو اس میں خود انسان کا فائدہ ہے۔ "اس فرماں برداری کا نتیجہ بجز نفع بنی آدم اور کچھ نہ ہوگا۔ یعنی جیسے مریض کے حق میں اطاعتِ طبیب اور اُس کی فرماں برداری اُسی کے حق میں مفید ہے، طبیب کے حق میں مفید نہیں۔ ایسے ہی خدا کی اطاعت بندے کے حق میں اُسی کی نسبت مفید ہوگی، خدا کی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔"

جب اللہ کا ہر فعل حکمت پر مبنی ہوا، تو اس حکمت کو جاننے پہچاننے کی بھی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے اللہ نے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے عقل کی فضیلت حضرت مولانا نے یوں بیان فرمائی ہے:-

"عقل ہر چیز کی حقیقت کے پہچاننے کے لئے بنائی گئی ہے اور قدرت بشری وغیرہ کو اس لئے بنایا ہے کہ حسب ہدایت عقل کام کیا کرے۔ اور ظاہر ہے کہ سب میں اوّل لائقِ شناخت وعلم خداوندِ عالم ہے۔"

عقل سے نہ صرف انسان ہر چیز کو پہچانتا ہے۔ اور اُس سے اِس زندگی میں ہدایت چاہتا ہے، بلکہ اسی سے وہ اللہ تعالےٰ کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم کیسے حاصل کرے؟۔ اس کی وضاحت مولانا یوں کرتے ہیں:-

سب حقائق اُسی کے وجود سے اِسی طرح تاباں ہوئی ہیں، جیسے
فرض کیجیے آفتاب سے دھوپ ... دھوپ کی حقیقت اس سے

زیادہ اور کیا ہے کہ وہ ایک پرتوہ آفتاب ہے، مگر چونکہ سب میں
اوّل اپنی ذات کا علم ہوتا ہے، اور اپنی حقیقت اُس کا ایک پرتوہ
ٹھہرا، تو بے شک اپنا پہچاننا اور علم، اُس کے پہچاننے اور اُس کے
علم پر موقوف ہوگا۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب مصنف کے اس ارشاد کی یوں توضیح کرتے ہیں:۔
یوں سمجھ لیجئے کہ دھوپ جس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ آفتاب کا پرتوہ ہے، اپنی اس حقیقت کو اُسی وقت سمجھے گی۔ جب کہ پہلے یہ پہچان لے گی کہ آفتاب کیا ہے، اسی طرح انسان جس کا وجود ایک پرتوہ ہے، وجود حقیقی تعالیٰ شانہٗ کا، جب تک یہ نہیں پہچان لے گا کہ میں وجودِ حقیقی کا پرتوہ ہوں، اس وقت تک اُس کو اپنی ذات کی معرفت حاصل نہ ہوگی۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر انسان اپنے آپ میں اور اس کائنات میں عقل سے تفکر کرے گا اور چونکہ یہ سب کچھ اُسی کے وجود کا فیض ہے، جس طرح کہ دھوپ آفتاب کا فیض ہوتی ہے تو اس سے انسان کو اللہ تعالےٰ کا علم حاصل ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ایک اور جگہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا کیوں ضروری ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے خلق اور خالق کے اس تعلق کو واضح کیا ہے، لکھتے ہیں

ہر موجود میں . . . . ادراک وشعور موجود ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب میں اوّل اپنا ادراک ہوتا ہے۔ اور اپنی حقیقت کی یہ صورت کہ جیسے دھوپ مثلاً انتہا شعاع کا نام ہے اور شعاع ایک پرتوہ آفتاب کو کہتے ہیں، ایسے ہی ہر مخلوق کے لئے ایک انتہا وجود ہوتا ہے اور وہ وجود پرتوہِ وجودِ ربّ معبود ہے۔

یعنی رب معبود کے وجود کے پرتو سے ہر مخلوق کا وجود ہے۔

یہاں عدم اور وجود کی بحث آجاتی ہے۔ مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں:۔ مخلوقات کو معدوم محض کہنا تو بالبداہت غلط، ورنہ مخلوق ہی کیوں کہتے۔ پر موجود محض بھی اسی

وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ اگر یہ ہوتا تو مخلوق کیوں ہوتے، خالق ہوتے۔ کیونکہ عدم پر وجود عارض نہیں ہو سکتا۔ وجود پہ عدم عارض نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے نہ معدوم محض موجود ہو سکے، نہ موجود محض معدوم ہو سکے۔

اس بحث سے حضرت مولانا یہ ثابت کر رہے ہیں کہ "ہر حیوان کو خداوند عالم کے کے ساتھ محبت ہونی چاہئے۔ اور کیوں نہ ہو خدا کے ہونے (یعنی وجودِ خدا) کی اطلاع تو جملہ عالم کو ضرور ہے"۔ اور اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں :-

چونکہ وجود محض جو بطور مذکور سامان تحقق ممکنات ہے (یعنی ممکنات و موجودات کا سامان وہی وجود محض ہے) ذات خداوندی سے وہی نسبت رکھتا ہے، جو شعاعیں کہ نور محض ہیں، ذات آفتاب سے رکھتی ہیں۔ اس لئے اپنی حقیقت کے تصور میں خدا کے تصوّر کی حاجت ہے اور ظاہر ہے کہ اپنا تصوّر کس کو نہیں ہوتا۔ مگر جب وجہ لزوم تصور یہ ہے کہ ممکنات کا تحقق خدا کے تحقّق پر موقوف ہے تو اپنی محبت کو خدا کی محبت بھی لازم ہوگی، بلکہ اپنی محبت خدا کی محبت پر موقوف ہوگی اور ظاہر ہے کہ اپنی محبت کس کو نہیں ہوتی۔

اس سے حضرت مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں :-

اس صورت میں مقتضائے دقیقہ فہمی اور حقیقت سنجی تو یہ ہے کہ ہر شے کی نسبت یہ اعتقاد کیا جائے (کہ وہ خدا سے محبت رکھتی ہے)۔ کیونکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں ادراک و شعور ہے، مگر اتنا بھی نہیں تو اس سے کیا کم کہ حیوانات کی نسبت یہ امر واجب التسلیم ہو کہ اُن کے دل میں بھی خدا کی محبت مرکوز ہے۔

ممکنات اور واجب الوجود یا خلق اور خالق کے درمیان جو رشتہ ہے، اُسے بیان کرنے کے بعد حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت انسان کے لئے مقتضائے طبعی ہے۔ اس اطاعت سے کیا مراد ہے؟ مولانا فرماتے ہیں :-

اور سوا اس کے جو کام ایسا ہو کہ خدا کی اطاعت اُس پر اسی طرح موقوف ہو جیسے روٹی کا پکنا مثلاً آگ، لکڑی، توے، کنڈے وغیرہ پر۔ تو وہ اطاعت ہی کے

حساب میں شمار کیا جائے گا اور مثل اشیائے مذکورہ جو کھانے کے حساب میں شمار کی جاتی ہیں، اس کام کو اطاعتِ خدا کے حساب سے خارج نہ کر سکیں گے۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب اس کی تشریح یوں کرتے ہیں :- مطلب یہ کہ معاشی کاروبار و دیگر ضروریاتِ زندگی سب اطاعتِ خدا کے حساب میں داخل ہیں۔ اسی طرح محتاجوں کی دست گیری، غرباء کی خدمت، ملک و ملت کا تحفظ، اہل و عیال کے حقوق کی ادائیگی، بلکہ اپنی ذات کو حسبِ ضرورت آرام پہنچانا تاکہ وہ اپنے اصل کارِ اطاعت کے لئے قوت حاصل کرے . . .

اور سوا اس کے اور جو کام ہوگا، وہ سب اس کارخانہ سے علیحدہ سمجھا جائے گا اور اس لئے بوجہ فوتِ مقصود مذکور وہ کام آدمی کے حق میں از قسم کم نصیبی اور بدبختی شمار کیا جائے گا۔

مختصراً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے پہلے تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اور اُس نے جو انسان کو اپنی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا ہے تو اس میں خود انسان کا فائدہ ہے اور اس کا نتیجہ نفع بنی آدم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے۔ اور وہ اس سے معاملاتِ دنیا میں بھی ہدایت حاصل کرتا ہے اور اسی سے وہ خداوندِ عالم کی شناخت کرتا ہے۔ انسان کا اپنے رب سے کیا تعلق ہے؟ مولانا قاسم فرماتے ہیں کہ انسان کا وجود پرتو ہے اللہ کے وجود کا۔ اس لئے انسان کے اندر اللہ کو جاننے کی فطری صلاحیت موجود ہے (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) اور اسی طرح اللہ کی اطاعت بھی انسان کا فطری تقاضا ہے اور اگر انسان یہ اطاعت نہیں کرتا، تو یہ اس کی کم نصیبی اور بدبختی ہے۔ اس تمہید کے بعد حضرت مولانا اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"مگر اس بدبختی کا سبب کبھی غلطی ہوتی ہے، کبھی غلبۂ خواہش۔ تو میرے ذمہ بوجہ خیر خواہی لازم ہے کہ غلطی والوں کو غلطی سے آگاہ کروں۔ اور مغلوبانِ خواہش کو اپنا شریکِ مرض سمجھ کر فضائلِ آخرت سمجھاؤں۔ اور اُن سے خود اس ترغیب کا امیدوار ہوں۔"

"مگر چونکہ غلط کار لوگ بمنزلہ اُس مسافر کے ہیں جو شہر مطلوب کی سڑک کو بوجہ غلطی چھوڑ کر کسی اور راہ کو ہو لے۔ اور مغلوبانِ خواہش ایسے ہیں جیسے فرض کیجئے شہر مطلوب کی سڑک پر جاتے ہیں۔ پر بادِ مخالف قدم بدشواری اُٹھانے دیتی ہے اس لئے غلطی والوں کے حال پر زیادہ افسوس چاہیئے۔"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

اس لئے بنظر خیرخواہی یہ گزارش ہے کہ سوائے دینِ محمدی کوئی مذہب ایسا نہیں، جس میں عقائد کی غلطیاں باعثِ ترکِ رہگزارِ اصلی جس کو صراط مستقیم کہئے، نہ ہوئی ہوں۔ تعصّب مذہبی کو چھوڑ کر اگر اور صاحب (یعنی غیر مسلم صاحبان) غور فرمائیں گے تو سب کے سب اسی دین کو اپنے مطلوبِ اصلی کا راستہ سمجھیں گے۔ ہاں جن کو فکرِ آخرت ہی نہ ہوگا اور اُس جنت کی طلب ہی ان کے دل میں نہ ہوگی جو بمنزلہ شہرِ مطلوب، مقصود ہر خاص و عام ہے، تو وہ صاحب بے شک بمقابلہ خیرخواہی کمترین اور اُلٹے درپئے تردیدِ حق ہوں گے اور خود اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں کاٹ لیں گے۔

اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب دین محمدی پر گفتگو فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اس دین کے اُصول نہایت پاکیزہ ہیں۔ دو باتوں پر اس مذہب کی بنا ہے ایک توحید جو خلاصۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ دوسری رسالت جو خلاصۂ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ سو ان کے اور جو کچھ (اسلام میں) ہے، انہی دو باتوں کی تفریع و تمہید ہے۔"

توحید کی بحث حضرت مولانا بڑی تفصیل سے کرتے ہیں:۔ ایک جگہ وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "اس تقریر سے تو فقط اتنی بات ثابت ہوئی کہ وجود ہمارا خانہ زاد نہیں۔ اُس خدا کا پرتو ہے، جو اپنے وجود میں مستغنی ہے پر اب اُس کی وحدت کی بات بھی سننی چاہیئے۔

باری تعالیٰ کی وحدت کا اثبات یوں فرماتے ہیں:۔

"دیکھیے جیسے متعدد روشن دانوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، پر نور ایک ہی سا ہوتا ہے، اور پھر وہ شکلیں بذاتِ خود باہم بھی متمیز ہوتی ہیں۔ اور اس نُور سے بھی

متمیز ہوتی ہیں۔ علیٰ ھٰذا القیاس وہ نور بھی بذات خود ہر شکل سے ممتاز و متمیز ہوتا ہے۔

"اسی طرح جس چیز کو دیکھیے، اُس کی ایک جدی حقیقت ہے۔ گو وجود ایک ہی سا ہے اور پھر ہر حقیقت بذاتِ خود دوسری حقیقت سے بھی متمیز اور وجود مشترک سے بھی متمیز ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس وجود بھی بذاتِ خود ہر حقیقت سے ممتاز و متمیز ہے۔ اور اس لیے جیسے روشن دانوں کی دھوپوں میں دو دو باتیں ہیں۔ ایک نور ایک شکل، پر خود نور میں دو چیزیں نہیں۔ ایسے ہی مخلوقات میں تو دو دو چیزیں ہیں۔ ایک وجود اور ایک اُن کی حقیقت، پر اُس وجود میں دو چیزیں نہ ہوں گی، اس لئے موجود اصلی میں جس کی نسبت وجود مذکور فیض ہے، کیونکر دوئی ہو سکتی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ مخلوقات میں جو وجود ہے، وہ اُس وجود کا فیض ہے، جو کہ اصلی وجود ہے۔ اس وجودِ اصلی میں دوئی کا سوال نہیں پیدا ہوتا، اور نہ اس میں اجزاء ترکیبی ہیں۔ یہ وجود غیر محدود اور غیر متناہی ہے۔ اس لئے فیاض وجود ایک وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ہو گا۔ اور سوائے اس کے اور سب کا وجود اُس کی عطا و فیض ہو گا۔

اس کے بعد وہ عیسائیوں کے اس عقیدے کا ردّ فرماتے ہیں کہ خدا کا کوئی بیٹا ہے۔ اس ضمن میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر خدا کو باپ یا انسان کو اُس کا بیٹا کہا گیا ہے تو یہ مجازاً ہے اور چونکہ اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی، اس لئے اس کی ممانعت ضروری ہو گئی۔

اسی طرح حضرت مولانا نے عقیدۂ تثلیث کا رد کیا، ارشاد ہوتا ہے:۔"ایک شے کے "حقیقت" میں ایک ہونے اور پھر "حقیقت ہی میں تین بھی ہونے کو کس کی عقل صحیح و صادق کہہ دے گی۔ یہ ایسی عظیم الشان غلطی ہے، جس کو لڑکوں سے لے کر بوڑھوں تک سب ہی بے بتلائے سمجھ جاتے ہیں۔ تثلیث اور توحید (یعنی ایک چیز کا تین بھی ہونا اور ایک بھی ہونا) کے اجتماع محال ہونے پر تو عقل ایسی طرح شاہد ہے، جیسے آنکھ آفتاب کے نورانی ہونے پر . . . . ."

غرض حضرت مولانا کے الفاظ میں

"اس صورت میں اگر انجیل کا کوئی فقرہ اس مضمون پر دلالت بھی کرے تو اس

فقرے ہی کو غلط کہیں گے اور شہادتِ عقل کو غلط نہ کہیں گے "

اور یہ اس لئے کہ

"..... ایسے ہی انجیل بھی ہدایت کے لئے اُتاری گئی ہے، مگر بمقابلہ عقل الصفا اس کا اعتبار نہیں۔ اور (یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم اُس منزّل من اللہ انجیل پر یہ حکم لگاتے ہیں کہ اس کا اعتبار نہیں بلکہ) وجہ اُس کی یہ ہے کہ نقلِ کتاب میں غلطی ممکن ہے "

عیسائیوں کے غلط عقائد کی تردید کرنے کے بعد حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ سچے عیسائی ہم محمدی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"اے حضراتِ مسیحی! ہمارا کام فقط عرض معروض ہے۔ سمجھانے کی بات کو سمجھ لینا تمہارا کام ہے..... بُرا نہ مانو تو سچ یہ ہے کہ سچے عیسائی ہم ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اقوال و افعال کے موافق اُن کو بندہ سمجھتے ہیں۔ خدا اور خدا کا بیٹا نہیں سمجھتے۔ خدا کو ایک کہتے ہیں۔ تین نہیں کہتے "

اس کے بعد پھر اللہ کی ذات و صفات پر گفت گو ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے افعال اختیاری ہیں، اضطراری نہیں۔ اگر اضطراری مانو گے، تو وہ غیر مخلوق ہوں گے۔ اس ضمن میں تقدیر کے مسئلے پر بحث کی گئی۔ اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ:-

"انبیاء اور علماء کی اطاعت بشرطیکہ علماء بمقتضائے منصبِ نیابت حکمرانی کریں، وہ (خدا ہی کی اطاعت ہے اور ان کے احکام) عین خدا ہی کے احکام ہیں "

یہ تو اللہ پر ایمان کا مبحث تھا۔ اس کے بعد مصنف عبادات کا ذکر کرتے ہیں، اس میں سب سے پہلے نماز آتی ہے، پھر عبادت مالی یعنی زکوٰۃ کا بیان ہے۔ اس کے بعد روزوں اور حج کا ذکر ہے۔ آپ نے ان سب عبادات کی حکمتیں بتائی ہیں۔ یہ اسلام کا رکن اوّل ہے۔ اور اس کا رُکن ثانی رسالت ہے۔ رسالت کے

ضمن میں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ رسالت کی ضرورت کیوں ہے، اور یہ کہ انبیاء کا معصوم ہونا کیوں ضروری ہے۔

حضرت مولانا انبیاء کی شفاعت کا تو اثبات کرتے ہیں، لیکن نصاریٰ نے کفارہ کا جو عقیدہ گھڑلیا ہے، اس کا ابطال فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔"... اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اطاعت کوئی کرے اور ثواب کا مستحق کوئی اور ہو جائے۔ گناہ کوئی کرے اور سزا کسی کو دی جائے۔ تابعداری تو انبیاء کریں اور مرحوم اُمتی ہو جائیں اور گناہ وتقصیر تو اُمتی کریں اور ملعون انبیاء علیہم السلام ہو جائیں ...."

احادیث میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جو معجزات بیان ہوئے ہیں مصنّف علّام نے سب کا اثبات فرمایا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ معجزہ ثمرۂ نبوت ہے، نہ مدارِ نبوت۔ اصل ثبوت تو ان دو باتوں کو مقتضی ہے کہ فہم سلیم و اخلاقِ حمیدہ اس قدر ہوں۔ رہے معجزات، وہ بعد عطائے نبوت عطا کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ جس نے اظہارِ معجزات کے امتحان میں نمبر اوّل پایا، اس کو نبوت عطا کی، ورنہ ناکام رہا۔ اس لئے اہلِ عقل کو لازم ہے کہ اول فہم و اخلاق و اعمال کو میزانِ عقل میں تولیں اور پھر بولیں کہ کون نبی ہے اور کون نہیں۔

اسی ضمن میں قرآن کے معجزہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔" علاوہ بریں قرآن شریف جس کو تمام معجزات علمی و افضل و اعلیٰ کہئے، ایسا برہانِ قاطع ہے کہ کسی سے کسی بات میں اُس کا مقابلہ نہ ہوسکا۔ علوم ذات وصفات وتجلیات وبدءِ خلائق وعلمِ برزخ وعلمِ آخرت وعلمِ اخلاق وعلمِ احوال وعلمِ افعال وعلمِ تاریخ وغیرہ اس قدر ہیں کہ کسی کتاب میں اس قدر نہیں۔ کسی کو دعویٰ ہو تو لائے اور دکھائے، اس پر فصاحت وبلاغت کا یہ حال کہ آج تک کسی سے مقابلہ نہ ہوسکا۔

کتاب کا اختتام گوشت کی قلّت کی بحث پر ہوتا ہے، اس میں اہلِ ہنود کے اس اعتراض کا کہ گوشت کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا سراسر ظلم رہا ہے، جواب دیا گیا ہے۔

باوجود اس بات کے کہ کتاب حجۃ الاسلام عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مناظرہ کے طور پر لکھی گئی ہے لیکن اسلام کی حقانیت کو ایسے حکیمانہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ نفس مذہب پر اس کی حیثیت ایک مستقل بحث کی ہو گئی ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی کتابیں پڑھ کر ان کے بارے میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی یہ رائے ماننی پڑتی ہے کہ مولانا محمد قاسم حکیم الہند امام ولی اللہ کی حکمت اور انقلاب کے مجدّد تھے اور آپ نے ولی اللٰہی حکمت و معارف کو اہل ہند کے لئے زمانہ حاضر کے لباس میں پیش کیا۔

وحدت الوجود کا جو ولی اللٰہی تصوّر ہے، مولانا محمد قاسم نے کس خوبی سے اُسے اس کتاب میں پیش کیا ہے، اور اسے اساس بنا کر اپنی بحث کی عمارت اُٹھائی ہے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا کلمۃ اللہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تمام انبیاء بلکہ تمام کائنات کلماتِ خدا ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کلام حقیقی کلام معنوی ہے۔ الفاظ کو فقط بایں وجہ کلام کہہ دیتے ہیں کہ کلام معنوی پر دلالت کرتے ہیں"

ایک دوسری بات جو اس کتاب میں بڑی واضح ہے، وہ حقائق کو جاننے پہچاننے کے لئے عقل اور وہ بھی عقل مصفا کو استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

حضرت عیسٰی کی عبدیت ثابت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"۔ ۔ ۔ ۔ افسوس تو یہ ہے کہ عقل و دانش سب موجود، پر وہاں بجز آثارِ بندگی اور کوئی چیز نہیں۔ تس پر بھی اُن کو خدا کہے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے۔ یہ کس شراب کا نشہ ہے، جس نے عقل و دانش سب کو بے کار کر دیا"

اس کے بعد عقل و دانش کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :-

"کیا عقل و دانش فقط اس متاعِ قلیل دنیا ہی کے لئے خدا نے عطا فرمائی تھی۔ ہرگز نہیں۔ یہ چراغ بے دُود، راہ دین کے نشیب و فراز

کے دریافت کرنے کے لئے تھا ...“

پوری کتاب میں ایک جملہ بھی مخالفوں کے دل کو دُکھانے والا نہیں، بلکہ اپنی بحث کا آغاز کس دردمندی سے ان الفاظ میں کیا ہے:-

”میرے ذمہ بوجہ خیر خواہی ... لازم ہے کہ غلطی والوں کو غلطی سے آگاہ کروں اور مغلوبانِ خواہش کو اپنا شریکِ مرض سمجھ کر فضائل آخرت سمجھاؤں۔ اور اُن سے خود اس ترغیب کا امیدوار ہوں“

کتاب کے متن کے بیچ میں مولانا اشتیاق احمد صاحب نے جو حاشیہ لکھا ہے، وہ کتاب کے مفہوم کو واضح کرنے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے، اور اس سے مطالب کتاب کو سمجھنا قدرے آسان ہو گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس معارف القرآن نے یہ کتاب شائع کرکے ملّت کی بڑی خدمت کی ہے۔ ہمیں امید ہے، نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، اور حضرت مولانا محمد قاسم کی دوسری کتابیں بھی اسی اہتمام سے شائع ہوں گی۔

کتاب مجلّد ہے، بڑے سائز کے ۱۷۶ صفحے، کاغذ بہت عمدہ، طباعت و کتابت اعلیٰ، قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ مجلس معارف القرآن دارالعلوم دیوبند۔ یو۔پی۔ ہند۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لیے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریکِ ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمتِ ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly **"AR-RAHIM"**
Hyderabad

رحیم خان منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد سرور پبلشر نے
شاہ ولی اللہ اکیڈمی جامع صدر سے شایع کیا

جلد نمبر ۵ ماہ مارچ ۱۹۶۸ شمارہ نمبر ۲۰

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدر آباد

قیمت سالانہ:- آٹھ روپیہ

فی پرچہ:- پچھتر پیسے

الرحیم

جلد ۵ | ماہ مارچ ۱۹۶۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ | نمبر ۱۰

فہرست مضامین

شذرات

دس فروری سے تیرہ فروری تک چار دن راولپنڈی میں ادارہ تحقیقات اسلامی کی بلائی ہوئی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں پاکستان کے ممتاز علماء اور اہلِ فکر حضرات کے علاوہ کوئی اٹھارہ کے قریب مسلمان اور غیر مسلم ملکوں کے علماء و فضلاء نے شرکت کی، اس کانفرنس میں راقم السطور بھی مدعو تھا، ایک تو کانفرنس کے کھلے اجلاس تھے، جن میں اسلام میں عقل کا کردار، اسلام اور عالمی امن اور اسلامی عدل اجتماعی کے موضوعات پر مقالات پڑھے گئے، اور دوسرے مختلف کمیٹیاں تھیں، جن میں علماء کرام اور دوسرے حضرات نے عائلی قوانین اور بنک کاری و انشورنس جیسے مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔ ان کمیٹیوں میں جو گفت گو ہوئی وہ بڑی اعلیٰ علمی معیار کی تھی، اور ان کا ماحول بھی بڑا پرسکون تھا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جہاں حضرات علماء نے ان مسائل کے بارے میں اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا، اور آیندہ افادہ و استفادہ کے لئے اسے ریکارڈ کرلیا گیا، وہاں دوسرے فریق نے بھی اپنی بات کہی اور ان مسائل کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

راقم السطور کانفرنس کے کھلے اجلاسوں میں برابر شریک رہا، اور اسی طرح اس کی ایک کمیٹی کا بھی رکن تھا۔

اس عالمی اسلامی اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے دوسرے ملکوں کے آئے ہوئے مندوبین سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کو متعارف کرانے کی بھی کوشش کی۔ اکیڈمی نے حضرت شاہ ولی اللہ کی جو عربی کتابیں چھاپی ہیں ان کے نسخے عرب مندوبین کو پیش کئے گئے۔ ایک مندوب سرزمین مراکش کے تھے، مراکش میں فقہ مالکی مروج ہے، اور وہاں امام مالک کا وہی احترام و مقبولیت ہے جو وسط ایشیا اور برصغیر پاک و ہند میں امام ابوحنیفہ کا ہے، شاہ ولی اللہ کی کتاب المسوّیٰ جو امام مالک کی مؤطا کی عربی شرح ہے، اور جسے استاذ مولانا سندھی رحؒ نے ایڈٹ کرکے چھپوایا تھا، میں نے خاص طور پر مراکشی مندوب کو دی، جس سے وہ بے حد محظوظ ہوئے، اور اس ہدیۂ علمی کو بڑا پسند فرمایا۔

ان چار دنوں میں میری زیادہ تر ملاقاتیں سوویت یونین کی ریاست ازبکستان کے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف سے رہیں، جناب مفتی صاحب کا مسلک علمی کم و بیش وہی تھا، جو ہمارے قدیم و جدید حضرات علماء کا ہے۔ موصوف کو عربی زبان پر پورا عبور تھا، اور وہ اس میں بے تکلف بولتے اور تقریر کرتے تھے، فارسی تو ان کی قومی زبان تھی ہی۔ مفتی بابا خانوف سے ایک اور علمی رشتہ یہ نکلا کہ وہ مشہور روسی ترکی عالم علامہ موسیٰ جاراللہ

مرحوم سے متاثر تھے۔ مولانا سندھی ۱۹۲۴ء میں جب روس گئے تھے، تو کچھ عرصہ علامہ جار اللہ کے مہمان رہے تھے۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا سندھیؒ موجود تھے، چنانچہ ان سے علامہ موسیٰ جار اللہؒ نے قرآن کی تفسیر سنی اور اسے عربی میں قلم بند کر لیا۔ مولانا سندھیؒ کی یہ عربی تفسیر بروایت علامہ موسیٰ جار اللہؒ برصغیر میں پہنچی اور اس وقت اس کے متعدد نسخے لوگوں کے پاس ہیں اور اس کی دو جلدیں سورۂ نساء تک چھپ بھی چکی ہیں۔

جناب مفتی بابا خانوف سے علامہ موسیٰ جار اللہ کے متعلق بڑی باتیں رہیں۔ وہ، مرحوم و مغفور کا ذکر بڑی محبت و احترام سے کرتے تھے، اسی سلسلے میں مولانا سندھیؒ اور ان کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادۂ علمی کا ذکر ہوتا رہا۔ مفتی صاحب سے مل کر اور ان سے باتیں کرکے اس دور کی یاد تازہ ہو گئی جب برصغیر پاک و ہند اور ماوراء النہر جس کے مشہور شہر بخارا، تاشقند اور سمرقند وغیرہ تھے، مکاتبِ فکر اور مراکزِ علم ایک ہی سے تھے۔ وہاں کے علوم اس سرزمین میں پڑھائے جاتے تھے، اور یہاں کی کتابیں ماوراء النہر میں زیرِ درس تھیں ــــــ میں نے مفتی صاحب کی خدمت میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی مطبوعات بھی پیش کیں۔

"الرحیم" کے پچھلے سے پہلے شمارہ میں عرض کیا گیا تھا کہ پاکستان کے مختلف مسلم فرقوں میں باہمی اختلافات کے باوجود تھوڑی بہت رواداری کی فضا پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ مسئلہ محض فرقوں کے مذہبی اعتقادات کا نہیں، بلکہ اجتماعی و قومی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اور قومی مصالح کا تقاضا ہے کہ خواہ مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی اختلاف ہوں، لیکن ان میں ایسی منافرت نہ ہو کہ قومی وحدت کا رشتہ پارہ پارہ ہو جائے۔

ہمیں خوشی ہے کہ لائل پور کے دینی رسالے "المنبر" نے بھی اسی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے! اس نے "مذہب کے نام پر قتل" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا ہے جس میں شکایت کی گئی ہے کہ ایک عرصہ سے پاکستان میں مذہبی اختلافات کی بنا پر اشتعال انگیزی کا سلسلہ جاری ہے، اس کے بعد بعض قتل کے واقعات گنائے ہیں اور پھر المنبر نے لکھا ہے:۔ مذہب کی تعبیر کے وہ اختلافات جن میں دو اصول مسلّمہ ہوں " اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت کا کلّی انقطاع" ان کے بعد ہزاروں اختلافات ہوں، آپس میں رواداری اور ایک دوسرے کا احترام یہ خود مذہب ہی کا اہم ترین تقاضا ہے، یہی نہیں۔ فرض کیجئے ایک شخص توحید کو بطورِ عقیدہ ماننے کے باوجود کسی نوع کے ظاہری یا باطنی شرک کا بھی مرتکب ہو اور کوئی شخص حضورؐ پر سلسلۂ نبوت کے انقطاع کے باوجود آپؐ کے بعد کسی اور شخص کو کسی بھی معنیٰ میں نبی بھی تسلیم کرتا ہو اور

اسے امت کے معتمد علیہ عناصر نے ملت سے خارج بھی قرار دیا ہو، تب بھی کسی عام مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ قانون اپنے ہاتھ میں لے اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو پر حملہ کر دے۔

اس ضمن میں المنبر نے ان امور کی طرف حکومت کو متوجہ کیا ہے، اور لکھا ہے:۔

"پاکستان میں بعض مذہبی عناصر جو ایک دوسرے کے خلاف ایسی نفرت انگیزی کر رہے ہیں جن کا انجام اس قسم کے اقداماتِ قتل ہیں، وہ ایسے واقعات کے براہِ راست ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ اس شنیع فعل اور خلافِ مذہب طرزِ عمل سے خود باز نہیں رہتے تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں راہِ راست پر لائے۔"

ہمیں امید ہے کہ مختلف فرقوں کے رہنما اور حکومتی ادارے جن کا تعلق مساجد اور علماء سے ہے، المنبر کی اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث کے انتقالِ پُر ملال کا صدمہ پورے برصغیر میں محسوس کیا جائے گا۔ مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں گزاری، وہ واقعی شیخ الحدیث تھے، اس کے علاوہ مرحوم ملی و قومی سرگرمیوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، اور اس سلسلے میں انہوں نے ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں۔ مولانا مرحوم و مغفور نے مسلم معاشرہ کی اصلاح اور مسلمان عوام کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے واقف اور ان پر عمل پیرا کرانے کے لئے بھی عمر بھر جدوجہد کی۔ خدا کے فضل و کرم سے مرحوم کی یہ کوششیں کامیاب رہیں اور ان کے بڑے اچھے نتائج نکلے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ وہ جمعیتِ اہل الحدیث سے متعلق تھے بلکہ آخر میں اس کے امیر بھی تھے، لیکن ان میں جماعتی تعصب بالکل نہ تھا، اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں دوری کم ہو، اور ان میں باہمی تعاون عمل کی راہیں نکلیں، مرحوم بڑا متوازن ذہن رکھتے تھے، اور مسائل کو پیش کرنے میں انصاف کا رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

غرض مرحوم و مغفور کی شخصیت ہمارے اس موجودہ دور میں ایک بہت بڑی نعمت تھی اور اس سے محرومی عرصہ دراز تک محسوس ہوگی۔

خدا تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کو علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

پشتو ادب میں تفاسیر کا ذخیرہ[1]

حافظ محمد ادریس (شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی)

انگریزی عملداری سے پہلے پشاور کے علاقہ میں علمی اور تعلیمی زبان فارسی تھی، پشتو صرف گھریلو زبان کے طور پر بولی جاتی تھی اس سے زیادہ اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک پشتو زبان میں قرآن مجید کی کوئی نمایاں خدمت نہیں ہوئی۔ بیشک لوگ مذہب کے دلدادہ تھے، ان کا دینی جذبہ بلند تھا، وہ قرآن مجید کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے خواہاں تھے، مگر اس غرض کے لئے وہ عموماً فارسی کی "تفسیر حسینی" وغیرہ کو سامنے رکھتے تھے۔ مذہبی امور کے لئے پشتو کتابیں پڑھنا عورتوں کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ مرد یا تو بالکل ہی کورے رہتے یا پھر فارسی سیکھ لیتے اور اسی کی مدد سے اپنی علمی اور مذہبی تشنگی بجھاتے۔

تاہم یہ دعویٰ کرنا شاید زیادتی ہو کہ انیسویں صدی سے پہلے پشتو زبان میں قرآن مجید کی قطعاً کوئی خدمت نہیں ہوئی۔ جب پوری کی پوری قوم مسلمان تھی اور ان میں علومِ اسلامیہ کی تحصیل کا شوق عام تھا، خاص کر علومِ فقہیہ کے بڑے بڑے جیّد علماء موجود تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی طرف توجہ نہ دی

[1] یہ مقالہ جامعہ سندھ حیدرآباد کی اسلامی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔

ہو۔ لیکن پوری اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ہماری قوم بہت بڑے سیاسی بحران میں مبتلا تھی۔ ہم کبھی درانیوں سے دست و گریباں رہے کبھی قبائلی خانہ جنگیوں میں مبتلا رہے اور کبھی سکھوں کے سیلابِ بلا کو بزورِ شمشیر روکتے رہے، ان پیہم اور مسلسل جنگوں میں عموماً ہمارے سیاسی رہنما وہی حضرات ہوتے جو ہمارے مذہبی پیشوا کہلاتے۔ اس لئے جب دشمن غلبہ پاتا تو سب سے پہلے ان علمار کا سرمایہ لٹتا اور ان کے گھر مسمار ہوتے۔ اس طرح ہمارے بہت سارے علمی ذخیرے دست بردِ زمانہ کا شکار ہوگئے اور انیسویں صدی کے اواسط تک متفرق سورتوں کے تراجم یا ادعیہ ماثورہ کے علاوہ ہم کسی مکمل ترجمہ یا تفسیر کا سراغ نہیں دے سکتے۔

غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری قوم نسبتہً زیادہ قدامت پسند تھی۔ قرآن مجید کے بارے میں ان کی احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ امکان بھر اس پاک کتاب کا ترجمہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فارسی ترجمہ پر دہلی میں ہڑبونگ مچا اور لوگ ان کے قتل کے درپے ہوگئے، اسی طرح انیسویں صدی کے اوائل میں جو شخص بھی پشتو ترجمہ اور تفسیر لکھنے کی جرأت کرتا نیم ملاّ قسم کے لوگ اس کی جان کے دشمن ہو جاتے اور اسے لینے کے دینے پڑجاتے۔

انیسویں صدی کے اواسط میں ہمارے ہاں ایک منظم حکومت قائم ہوئی سیاسی بحران ختم ہوگیا اور زندگی کی نئی قدریں سامنے آنے لگیں۔ انگریزی عملداری میں ایک طرف فارسی زبان کا اثر ورسوخ کم ہوا۔ دوسری طرف جگہ جگہ مطابع کھل گئے۔ ہندوستان کی طرف آمد ورفت بڑھ گئی اور لوگوں کی ذہنیتوں میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس اپنی زبان میں کلام اللہ کا ترجمہ اور تفسیر موجود ہونا چاہئے، تاکہ وہ احکام خداوندی کو آسانی سے سمجھ سکیں اور ان پر خاطر خواہ عمل کرسکیں۔

اس سلسلہ میں پہلے پہل بعض علمار نے مختلف سورتوں کے علٰحدہ علٰحدہ ترجمے لکھے جو مقبول ہوگئے۔ بعد میں مستقل تفسیروں کا سلسلہ شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ہمارے

پاس قرآن مجید سے متعلق ایک معتد بہ اور قابلِ قدر ذخیرہ جمع ہوگیا۔

تفسیر یسیر پشتو زبان میں سب سے پہلی، سب سے مستند اور سب سے ضخیم تفسیر "تفسیر یسیر" ہے، جو حضرت مولانا مراد علی صاحب ولد حضرت مولانا الشیخ عبد الرحمٰن السیلانی ساکن کامہ، جلال آباد کی تصنیف ہے۔ مصنّف علّام بہت بڑے عالم اور مشہور صوفی تھے۔ انہوں نے اب سے پورے ایک سو سال پیشتر ۱۲۸۲ھ میں یہ تفسیر لکھنی شروع کی اور دو سال کے اندر اندر پایۂ تکمیل کو پہنچا دی۔ خود مصنف علام نے لفظ 'افراغ' (۱۲۸۲ھ) سے سالِ آغاز اور لفظ 'غرمذل' (۱۲۸۴ھ) سے سالِ اتمام کی تاریخ نکالی ہے۔

علامہ موصوف عربی، فارسی اور پشتو کے ادیب تھے۔ تینوں زبانوں میں نظم و نثر لکھنے پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ معتقدین اور متوسلین کا وسیع دائرہ رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی تفسیر بہت جلد مقبول ہوئی اور سارے ملک میں پھیل گئی۔

اس تفسیر کے سبب تالیف کے بارے میں فاضل مصنّف لکھتے ہیں:۔

قد الحّ علیّ بعضُ الاخوانِ المکرّمینَ لدیّ بین ابناء الزمان الذین لا یدعُنی مجالستُھم ثمّ لا یَسَعُنی مخالفتُھم ان ارقم لھم تفسیر القرآن المجید وترجمۃ الفرقان الحمید باللسان السلیمانی مع اختصار المبانی یسھل علی الطالبین ضبطہ ولا یصعب علی الحالبین ربطہ فشرعتُ فیہ بتوفیق الملک المنان۔ ومنہ النصر والھدایہ وعلیہ التکلان —

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

دارم امید آنکہ فہیمانِ روزگار　　　تفسیرِ من قبول نمایند ہر زماں
زیرا کہ در جہاں ہست تفاسیر بیشمار　　　لیکن نہ بازبانِ سلیمانی اندآں
افراغ (۱۲۸۲ھ) سال پنجم شوال شد شروع　　　تفسیر بہر زمرہ افغاں بایں زباں

تفسیر میں مصنف نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ آیت شریفہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرتے اور ساتھ ساتھ ترجمہ و تفسیر کرتے جاتے ہیں۔ جب آیت ختم

ہو جاتی ہے تو متعلقات کی مزید تفصیلات پیش کر دیتے ہیں۔ البتہ شان نزول آیت سے پہلے لکھتے ہیں۔ ترجمہ نیم لفظی نیم محاورہ قسم کا ہوتا ہے۔ آیت کے مقدرات، اشارات، دلالات اور اقتضاءات کا تشریحی ذکر ترجمہ ہی میں کر جاتے ہیں۔ اس طرح پڑھنے والا گو ترجمہ اور تفسیر میں امتیاز نہیں کر سکتا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ قرآن حکیم کے حکیمانہ مفہوم کو اخذ کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر علاقے کے مردوں اور عورتوں میں یکساں مقبول ہے اور اکثر پڑھے لکھے گھرانوں میں رکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

اب اس تفسیر کی طباعت پر ایک صدی بیت چکی ہے اس پرشور و ہنگامہ خیز صدی میں دوسری چیزوں کے دوش بدوش زبان نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ بعض الفاظ متروک ہو گئے ہیں۔ بعض الفاظ صرف علاقائی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور بعض نے نئے معنی اختیار کر لئے ہیں۔ اس لئے بعض لوگوں نے کتاب پر مختصر سے حواشی چڑھا کر مشکل الفاظ کے معنی حل کئے ہیں، ان میں سے ایک کا نام "تیسیر الیسیر" اور دوسرے کا نام "فوق الیسیر" ہے۔

یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "تفسیر یسیر" کی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات ہے، جن کا سمجھنا عوام کے لئے دشوار ہے۔ اس لئے جس طبقہ میں یہ کتاب متداول ہے وہ بھی اس سے کماحقہ فائدہ نہیں لے سکتا۔ ترجمہ کے علاوہ مصنف کے قلم پر ترجمہ کا طرز کچھ اس طرح چھا گیا ہے کہ وہ اپنی آزاد عبارت بھی عربی نما ترجمہ کی طرح لکھتے ہیں اور یہی اس دور میں علماء کی مخصوص زبان تھی، اور فضیلت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

تفسیر قرآن کے ضمن میں فاضل مصنف نے اسرائیلیات کی روایت میں بھی فراخدلی دکھائی ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس معاملہ میں بہت سارے حضرات نے وسیع المشربی سے کام لیا ہے اور سلجھانے کے شوق میں بات کو اور زیادہ الجھا گئے ہیں۔

مخزن التفاسیر تفسیر یسیر کے بعد جس بزرگوار نے قرآن مجید کی خدمت کے لئے قلم اٹھایا وہ مولانا محمد الیاس پشاوری کوچیانی تھے۔ کوچیان پشاور سے شمال کی طرف ورسک جانے والی سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس فاضل محقق نے دیکھا کہ تفسیر یسیر میں ترجمہ اور تفسیر دونوں خلط ملط ہو گئے ہیں اور پڑھنے والا ٹھیک طرح سے یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ کونسا لفظ کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ اس لئے انہوں نے مخزن التفاسیر کے نام سے ایک تفسیر لکھی، اس میں لفظی ترجمہ عربی عبارت کے نیچے لکھا اور تفسیری مسائل اوپر حاشیہ میں درج کیے۔ ترجمہ تحت اللفظ کیا اور عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کم کیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عربی سے شد بد رکھنے والے لوگ بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ پشتو کا کونسا لفظ عربی کے کس لفظ کے معنی دے رہا ہے۔ مگر ہمارے ہاں لفظی ترجمہ میں بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہ حضرات حروفِ عاملہ کے بھی ہو بہو وہی معنی لکھتے ہیں جو اصل عربی میں مراد ہوتے ہیں حالانکہ ہر زبان کے صلے مخصوص ہوتے ہیں اور ایک زبان کا صلہ اکثر دوسری زبان میں کام نہیں دیتا۔ ایک نوع کی زبانوں میں تو شاید یہ سلسلہ تھوڑا بہت چل بھی سکے، لیکن جب سامی زبان کا ترجمہ آریائی زبان میں کیا جائے اور اس میں حروف کے بھی اپنے مخصوص معنی رہنے دیئے جائیں تو ترجمہ "گلابی" ہو کر رہ جاتا ہے اور مطلب غت ربود ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ حضرات لفظی ترجمے میں عربی کی تبعیّت میں مضاف کو مضاف الیہ پر اور موصوف کو صفت پر مقدم رکھتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کی حلاوت بھی ختم ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کے پلّے بھی کچھ نہیں پڑتا۔ لوگ ایسے ترجمے کو صرف ثواب اور تبرّک سمجھ کر پڑھ تو لیتے ہیں مگر فہم کی لازوال دولت سے محروم رہتے ہیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مخزن التفاسیر عوام میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو اس کا جائز حق تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ مصنف نے بجائے مقامی ناشرین کے دہلی کے مطبع خادم الاسلام سے معاہدہ کیا اور ۱۳۱۳ھ میں یہ کتاب وہاں چھپ گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی ناشرین نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی — اور

کتاب کے اکثر نسخے دہلی ہی میں رہ گئے۔

اس کے علاوہ ایک افتاد یہ پڑ گئی کہ کاتب کا رسم الخط ناقص تھا، اس نے بہت جگہ حروف کا کام حرکات سے لیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حرکاتِ ثلثہ حروفِ علّت کی مخفف شکلیں ہیں۔ اس لئے جگہ جگہ تخفیف کے اس کلہاڑے کو بے دریغ چلایا جس سے کتاب کی قیمت بہت زیادہ گھٹ گئی۔

دوسری زبانوں کے خلاف پشتو میں ایک تکلیف یہ ہے کہ اس کا رسم الخط ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ مصنف ہمیشہ کاتب کے رحم و کرم پر رہتا ہے، اگر کاتب ماہر نہ ہو تو مصنف کی محنت پر پانی پھر جاتا ہے اور کتاب کا حلیہ بالکل بگڑ جاتا ہے۔ اس عذاب کو کچھ وہی لوگ بہتر جانتے ہیں جنہیں میری طرح ایک ایک کتاب لکھوانے کے لئے پانچ پانچ کاتب بدلنے پڑے ہوں۔

ترجمۂ مولانا عبدالحق مولانا الیاس کو چیانی کے تھوڑے دنوں بعد انہی کے علاقہ کے ایک مشہور فاضل مولانا عبدالحق دربھنگوی نے ایک ترجمہ شائع کیا۔ دربھنگہ بھی پشاور سے شمال کی طرف ورسک کی سڑک پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مولانا ایک فصیح و بلیغ اور قادر الکلام عالم تھے۔ الفاظ گویا ان کے سامنے دست بستہ حاضر رہتے تھے اور جملے ان کی زبان پر آ کر از خود کھل جاتے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اس ساز و سامان سے کیا کہ لفظی بھی ہو اور عام فہم بھی ہو۔ انہوں نے عربی اور فارسی کے الفاظ کا بوجھ کم کر کے خالص عوامی زبان لکھی اور ترجمے کے انداز کو نسبتاً بہتر بنایا۔ نیز یہ کتاب موٹے حروف میں چھپ گئی، اس لئے بوڑھے لوگوں میں جلد مقبول ہو گئی۔

ترجمہ کے حواشی پر مولانا نے مختلف تفاسیر سے متفرق فوائد دیئے ہیں جو زیادہ تر موضح القرآن، ابن کثیر اور تفسیر بسیر سے ماخوذ ہیں۔ کتاب کی ضخامت بڑی تقطیع پر ایک ہزار صفحات کے لگ بھگ ہے اور یہ ضخامت زیادہ تر موٹا قلم استعمال کرنے کی رہینِ منّت ہے۔

تفسیر حسنی اسی زمانہ میں ملا محمد حسین الواعظ الکاشفی الہروی کی تفسیر حسینی کا پشتو ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمہ کوٹ وارث کے مولانا عبداللہ اور ان کے ایک شاگرد عبدالعزیز عادل گڑھی نے کیا۔ پشاور کے ایک رئیس قاضی محمد حسن جان نے ان کی سرپرستی کی، اور اسی لئے تفسیر حسنی کے نام سے سنہ ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں چھپ گئی۔ ترجمہ کی زبان معمولی ہے اور تفسیر حسینی اور تفسیر حسنی میں وہ قرب نہیں پایا جو حسن اور حسین جیسے دو ناموں میں ہونا چاہئے۔

ترجمہ شیخ الہند اس دوران میں ایک پشتو تفسیر افغانستان میں لکھی گئی۔ ملک کے چند مستند اور جید علماء نے مل کر حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسنؒ کے اردو ترجمے کو پشتو سانچے میں ڈھال لیا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی کو بطور تفسیر ترجمہ کیا۔ ترجمہ میں جگہ جگہ قوسین کے ذریعے پشتو زبان کے ساتھ تھوڑی بہت مطابقت پیدا کی گئی۔

یہ تفسیر ان تمام خوبیوں پر مشتمل ہے جو ان دونوں شیوخ کے تحریر کی جان سمجھی جاتی ہیں۔ ترجمہ تحت اللفظ ہے اور اصل سے قریب ترین ترجمہ ہے۔ رہ گئی استناد، تو اس کے لئے حضرات شیخ الہند و شیخ الاسلام کے اسماء گرامی سے بہتر ضمانت کیسے دی جاسکتی ہے۔

یہ تفسیر نہایت عمدہ کاغذ پر آہنی حروف کے ذریعہ چھپی ہے۔ قرآن مجید کی عبارت نہایت موٹے حروف میں مرتب کی گئی ہے۔ ترجمہ کی عبارت متوسط حروف میں چھاپی گئی ہے اور تفسیر کی عبارت باریک ٹائپ میں دی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب پورے چار ہزار صفحات پر پھیل گئی ہے۔

اس تفسیر میں ایک پیچ پڑ گیا ہے کہ ترجمہ براہ راست عربی سے نہیں بلکہ اردو ترجمے سے ترجمہ کیا گیا ہے گویا یہ ترجمہ نہیں بلکہ ترجمۃ الترجمہ ہے۔ پھر جس ترجمے سے ترجمہ ہوا ہے وہ اپنی جگہ سہل ممتنع کی حیثیت رکھتا ہے ؎

اذا قیل اطمع الناس طرًا　　　　واذا رِیمَ اَعجزَ المعجزینا

دوسرے یہ کہ اس ترجمے میں فارسی اور عربی کے ایسے ایسے ثقیل الفاظ آگئے ہیں کہ لغت دیکھے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ اس ترجمے کو دیکھ کر مجھے مرزا غالب کا وہ دور یاد آجاتا ہے جب انہوں نے پہلے پہل فارسی سے اردو شاعری کی طرف توجہ منعطف فرمائی تھی۔ بحالاتِ موجودہ اس تفسیر کا عوامی بن جانا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے البتہ اگر اس کی زبان آسان کردی جائے، معمولی کاغذ پر چھپ جائے اور قیمت کم رکھی جائے تو غریب عوام کے کوتاہ ہاتھ اس کی بلندیوں تک پہنچ سکیں گے۔ اور ترجمہ انشاء اللہ مقبول ہو جائے گا۔

جیساکہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اب سے تیس پینتیس سال پیشتر تک ہم پر خود فراموشی کا ایک ایسا عالم طاری تھا کہ ہم پشتو میں لکھنے پڑھنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ہمارے ہاں آزادئ وطن کے لئے ایک سیاسی تحریک اٹھی اور اس کی بدولت پشتو کی باسی ہانڈی میں ابال آیا۔ قوم کی توجہ اپنی علاقائی زبان کی طرف دوبارہ پھر گئی اور ادب نے اچھی خاصی ترقی کی۔ لیکن اس دوران میں قرآن مجید کی کوئی خاص خدمت نہیں ہو سکی۔ غالباً اس لئے کہ یہ تحریک خالص سیاسی تحریک تھی اور اسے مذہبی خدمات کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ اس تحریک کی بدولت زبان نکھر گئی اور اس کے اسالیبِ بیان نمایاں طور پر بدل گئے۔

تفسیرِ ودودی پاکستان قائم ہونے کے بعد تہکال بالا کے مولانا فضلِ ودود نے قرآن مجید کے پندرہ پاروں کا ترجمہ مع تفسیرِ ودودی لکھا۔ مولانا عربی اور پشتو کے بہترین خوشنویس ہیں، انہوں نے فرصت کے لمحوں سے فائدہ اٹھاکر سترہ پاروں کا لفظی ترجمہ اس طرح لکھا کہ اسے بامحاورہ بنانے کے لئے جگہ جگہ قوسین کا استعمال کیا۔ حواشی پر خازن، معالم التنزیل، جمل اور روح البیان وغیرہ تفاسیر سے فوائد نقل کئے اور اس طرح پشتو ترجمے کی ایک ترقی یافتہ شکل سامنے آگئی بعض تجارتی وجوہات کی بنا پر مصنف اس کام سے دل برداشتہ ہو گئے اور تفسیر کی تکمیل مولانا گل رحیم الاسماری کے حصہ میں آئی جو یارحسین ضلع مردان کے ایک فاضل

خوشنویس ہیں۔ یہ ترجمہ اپنے ماسبق ترجموں سے نسبتہً بہتر اور آسان ہے۔ پہلی جلد میں ہر لفظ کا ترجمہ اس لفظ کے نیچے آگیا ہے مگر جلد دوم میں اس کا التزام نہیں ہو سکا ہے اس کا تفسیری حصّہ کسی قدر مختصر ہے اور لطف یہ کہ اس کے دونوں مصنف خوشنویس اور پیشہ ور کاتب ہیں۔

کشّاف القرآن

اگر اس موقعہ پر میں محتاط لہجے میں اپنا ذکر کروں تو شاید بے محل نہ ہو۔ مجھے ایک عرصہ سے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ قرآن مجید عربوں کے محاورہ میں اترا ہے اور اس کا وہی ترجمہ بہتر اور زیادہ مفید ہو سکتا ہے جو با محاورہ ہو۔ لیکن میرے سامنے اس قسم کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا اس لئے قلم اٹھانے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ مدت دراز کے سوچ بچار اور حکیم الامّت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ دیکھ لینے کے بعد میں نے قلم اٹھایا۔ پہلے نمونے کے طور پر صرف پہلا پارہ چھپوایا پھر چند سال کے بعد آخری پارہ شائع کیا اور جب اہل فہم و دانش نے میری حوصلہ افزائی کی تو اب سے تین سال پہلے کشاف القرآن کے نام سے پندرہ پاروں کی ایک جلد شائع ہوگئی، دوسری جلد ابھی تک زیر طبع ہے۔

اس تفسیر پر رائے دینا میرا منصب نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ پشتو زبان میں با محاورہ ترجمہ اور سلیس تحریر کی پہلی کوشش ہے۔ اس کے تفسیری حصّہ میں صرف ان مباحث کے عقدے کھولنے کی کوشش کی گئی ہے جو براہِ راست قرآن مجید سے متعلق ہیں۔ صرف ضروری شانِ نزول دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں ربطِ آیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسرائیلیات سے احتراز کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ان کے اغلوطات کی تردید کی گئی ہے، بعض مشکل الفاظ کے معنی اور بعض ترکیبوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ پشتو زبان میں قرآن مجید کی تفسیریں لکھنے والوں کے لئے کشاف القرآن سنگ میل کا کام دے گی اور وہ اپنے کو اس سے بالکل مستغنی نہیں پائیں گے۔

ان ترجموں اور تفسیروں کا تذکرہ کرنے کے دوران میں نے قصداً ان کے مذہبی

رجحانات کا ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ پٹھان من حیث القوم اہل سنّت والجماعت اور حنفی ہیں۔ وہاں جو بھی تفسیر لکھی جائے گی وہ اسی ایک نہج پر لکھی جائے گی۔ اگر کوئی شخص ہمارے مذہب کا مخالف ہے تو اسے تفسیر لکھنے ہی کی کیا ضرورت ہے؟ وہ جس دوسرے میدان میں چاہے اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑاتا ہے مگر ہمارے اس متاعِ عزیز پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ ہاتھ زمین پر تڑپتا نظر آئے گا۔

اوپر ان تفسیروں کا ذکر ہوا جو مکمل ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ چند چیزیں ایسی ہیں جو قرآن مجید کے خاص خاص حصوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

قصب السکر فی تفسیر سورۃ الکوثر

ان میں سے مجھے قصب السکر فی تفسیر سورۃ الکوثر نے زیادہ متاثر کیا۔ مصنف کو حافظ ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ الکوثر پسند آگئی۔ انہوں نے اسے پشتو نظم کا جامہ پہنا دیا۔ اور ۱۲۹۸ھ میں ریاض ہند پریس امرتسر میں چھپوایا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا نام لینے پر زبانیں کٹتی تھیں اور ان کو امام کہنا کافر کہلانے کے لئے کافی تھا۔ افسوس یہ ہے کہ مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ صاحب، نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کے نانا ملّا سید امیر صاحب کوٹھہ یا ان کے کوئی فاضل مرید تھے۔

تفسیر والضحیٰ

یہ سورۂ والضحیٰ کی منظوم تفسیر ہے۔ اس کتاب کی کہانی کچھ عجیب ہے۔ اب سے تقریباً ایک سو اسّی سال پیشتر ۱۲۰۰ھ میں تخت ہزارہ علاقہ کوندل ضلع کیمبلپور کے ایک نابینا عالم معزالدین نے چھاچھی پنجابی میں تفسیر والضحیٰ لکھی۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ کتاب پشتو کی تفسیر والضحیٰ مصنفہ غلام محمد سے ترجمہ کی اور غلام محمد نے اپنی تفسیر شیخ حمیدالدین ناگوری کی تصنیف بحرالمرجان سے اخذ کی تھی۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے، فہرست مکتبہ اسلامیہ کالج۔ پشاور عدد مسلسل ۱۵ الف)

بہر حال آج کل جو تفسیر والضحیٰ بازار میں ملتی ہے وہ یقیناً کوئی نئی تصنیف ہے۔

اگر اصل تصنیف کا نسخہ ہاتھ آجائے تو ارباب تحقیق کے لئے ایک نادر ذخیرہ ثابت ہوگا۔

تفسیر بے نظیر یہ انتیسویں اور تیسویں دو پاروں کی مختصر تفسیر ہے۔ نامعلوم الاسم مصنف حوادث زمانہ کی تاب نہ لاکر تارک الدنیا ہوگیا۔ اور سیاحت کرتے کرتے چین تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے یہ تفسیر لکھی جو ۱۳۰۲ھ میں چھپ گئی، مقدمہ نظم میں ہے۔ باقی کتاب قدیم طرز کی نثر میں ہے۔

تفسیر الظاہر آج کل کے علماء میں سے مولانا عبدالودود سرحدی نے پہلے پارہ کی تفسیر 'تفسیر الظاہر' کے نام سے چھاپی۔ وجہ تسمیہ نام سے ظاہر ہے۔ مگر دماغی امراض میں مبتلا ہونے کے سبب اس میدان میں آگے نہ بڑھ سکے۔

تفسیر اکوڑہ خٹک اکوڑہ خٹک کے مولانا سید بادشاہ گل صاحب نے بھی ایک مبسوط تفسیر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر کثرتِ مشاغل، اہتمامِ جامعہ اسلامیہ اور رجوعِ مریدین کے سبب پہلے جزو سے آگے نہ بڑھ سکے۔

تفسیر حبیبی رستم ضلع مردان کے ایک فاضل مدرس مولانا حبیب الرحمٰن نے تفسیر المنار مصنفہ شیخ محمد عبدہ المصری کا خلاصہ پشتو میں لکھنا شروع کیا اور اس کا نام تفسیر حبیبی تجویز کیا۔ اب تک اس کے چار پارے الگ الگ شائع ہوئے ہیں۔

حضرات! سطور بالا میں ہم نے جن کوششوں کا سرسری جائزہ لیا ہے، یہ سب باستثنائے ایک کے، متفرق علماء کی انفرادی محنت کے ثمرات تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے علاقہ میں علوم دینیہ کے لئے کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا، طلبہ ایک کتاب پڑھنے کے لئے اساتذہ کی تلاش میں سینکڑوں میلوں کا سفر کرتے یا پھر وطن چھوڑ کر دیوبند چلے جاتے اور علوم و فنون کی دولت لے کر واپس لوٹتے۔

تقسیم ملک کے بعد یہ سلسلہ بند ہوا تو ہم نے مدارس کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا۔ خدا کے فضل اور عوام کی ہمّت سے جگہ جگہ دارالعلوم بنے۔ اور متعدد مقامات پر تفسیر و حدیث کے چشمے ابلنے لگے۔ اس کے علاوہ ہماری حکومت نے بھی علم دین پڑھانے کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس غرض کے لئے پشاور یونیورسٹی نے اسلامیات کا ایک الگ شعبہ کھول دیا جو پاکستان بھر میں اپنی قسم کا واحد ادارہ ہے۔ ان اداروں سے جو لوگ فارغ ہو رہے ہیں وہ نیا دل و دماغ لے کر میدان میں آ رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان نجی اور سرکاری درسگاہوں کی بدولت مستقبل قریب میں علماء کی ایک ایسی صالح جماعت تیار ہو جائے گی جس کے مقدس ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ اپنے مقدس کلام کی زیادہ سے زیادہ خدمت لے گا اور ہمارے دل معارفِ قرآنی کے انوار سے معمور ہو جائیں گے۔

اسلام میں تدوینِ علوم کا آغاز

جناب محمد یوسف گورایہ

قرآن حکیم میں علوم کی تحصیل اور ان کے حفظ و ضبط کی تلقین کے بارے میں ہدایات اتنی عام ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔ علم اور قلم لازم و ملزوم کے طور پر بیان ہوئے ہیں ان دونوں کا رشتہ و تعلق بڑا گہرا دکھائی دیتا ہے۔ قرآن حکیم کو کسی جگہ سے بھی کھولا جائے تو علم، قلم، کتابت سطور، صحف اور کتب وغیرہ کا تذکرہ ہر جگہ بکثرت ملے گا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر نظر ڈالی جائے تو وہاں یہی صورت دکھائی دیتی ہے، کہیں علوم کے حصول کی ہدایات ملتی ہیں۔ کہیں ان زبانوں کے سیکھنے کے بارے میں ارشادات ملتے ہیں جن کی فوری طور پر ضرورت تھی۔ کہیں قیدیوں پر یہ شرائط عائد کی جاتی ہیں کہ اگر وہ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تو کم از کم وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیں۔ قرآن حکیم کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کے ہاں علم اور ضبطِ علم کی بڑی اہمیّت ہے، لیکن اس کے ساتھ تاریخ سے ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فوری طور پر فنی معنوں میں علم کو ضبطِ تحریر میں نہ لا سکے۔

مسلمان ابتدا میں علوم کو تحریری طور پر ضبط نہ کر سکنے کی وجہ سے کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنی تاریخ اپنے ماحول اور اپنی رسوم و عادات کے اعتبار سے علوم کو ضبط کرنے کی جس اہلیت کے وہ مالک تھے، اس لحاظ سے انہوں نے علوم کی حفاظت میں کسی قسم کی کسر اٹھا نہ رکھی، وہ اپنی قدیم روایات کے اعتبار سے تحریر کی نسبت ذہنی ضبط کے زیادہ عادی تھے، اس لئے وحی و تفصیل و تشریحِ وحی کے انضباط کے لئے بھی انہوں نے

اپنے ذہنوں پر زیادہ اعتماد کیا پھر جس انداز سے نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا وہ تحریر کی نسبت ذہنی انضباط کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ اس سلسلہ میں جو بات سب سے زیادہ غور طلب ہے، وہ یہ ہے کہ ان الہامات و تعلیمات کا مقصدِ اوّلین، مخاطبین کو عمل کی دعوت دینا تھا۔ اس لئے مخاطبین کے ذہنی ارتقا اور اخلاقی و معاشرتی درجات کے اعتبار سے تنزیل کا سلسلہ جاری رہا۔ تنزیل کا مقصد یہ نہ تھا کہ نازل شدہ حصہ کو رٹ لیا جائے بلکہ اس کی غایت یہ تھی کہ اس پر عمل ہو۔ چنانچہ یہی ہوا، جیسے جیسے قرآن حکیم کا نزول ہوتا گیا، مؤمنین اس کے مطابق عملاً اپنی زندگی ڈھالتے گئے۔ اور جب ان تعلیمات پر پوری طرح عمل ہونے لگتا اور مخاطبین ان کے معانی و مفہوم سے پوری طرح آگاہ ہو جاتے تو مزید آیتیں نازل ہوتیں۔ بسا اوقات خود مسلمانوں کو عملی طور پر مسائل درپیش ہوتے تو وہ اللہ کی طرف سے حل کا انتظار کرتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کا نجماً نجماً نازل ہونا اس وجہ سے تھا کہ ایک طرف تو مسلمان اسے ذہنی طور پر ضبط کرتے چلے جائیں اور دوسری طرف نازل شدہ تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر عمل میں لے آویں۔ ضبط کے یہ دونوں طریق جہاں تعلیمات کے مقصد کے اعتبار سے احسن ترین تھے۔ وہاں عربوں کی قدیم روایات کے عین مطابق تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی قرآن حکیم کو مدوّن کر لیا گیا لیکن علوم کی دوسری اقسام کی طرف زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کے نزدیک عہدِ نبوی، عہدِ صحابہؓ اور عہد تابعین میں اس طرح کی عدم توجہی کے یہی اسباب تھے۔

(۱) ابتدا میں مسلمانوں کو احادیث و آثار ضبط تحریر میں لانے کی ممانعت کر دی گئی تھی جیسا کہ صحیح مسلم میں اس کا ذکر موجود ہے۔ جہاں ممانعت کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ کہیں احادیث و آثار کا کوئی حصّہ قرآن حکیم کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔

(۲) عربوں کی قوتِ حافظہ بہت وسیع تھی اور ان کے اذہان میں بہت روانی تھی۔

(۳) عربوں کی اکثریت فنِ کتابت سے واقف نہ تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کے بیان کردہ یہ اسباب ہمارے نزدیک نہایت اہم اور بڑے وزنی ہیں۔ جہاں تک پہلے سبب کا تعلق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو صحیح مسلم

میں مذکور ہے۔ ہوسکتا ہے مسلمانوں نے اس پر عمل کیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک اور دلچسپ واقعہ اس سلسلہ میں ملتا ہے، وہ حضرت عمرؓ کے ساتھ متعلق ہے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو خیال آیا کہ احادیثِ نبوی کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے، اپنے اس خیال پر انہوں نے بہت غور کیا، گہرے غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس قسم کا مجموعہ بجائے سود مند ثابت ہونے کے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔ ان دونوں واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مروی حدیث اور حضرت عمرؓ کا فیصلہ ایک ہی جڑ کی دو شاخیں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مروی حدیث کا سبب تو خود حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے وہ یہ کہ احادیث و آثار کا کچھ حصّہ قرآنی تعلیمات سے خلط ملط نہ ہو جائے اور حضرت عمرؓ کے فیصلے، ترک تدوینِ حدیث کی توجیہ واضح طور پر معلوم نہ ہوسکی۔ لیکن ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے فیصلے کے پیچھے بھی وہی حکمت کام کر رہی تھی جو حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں حدیث اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کا اصل مقصد حدیث میں بیان کردہ سبب کی روشنی میں یہ تھا کہ قرآن حکیم ابدالآباد تک کے لئے عالمگیر و ہمہ گیر اصولوں کا مجموعہ ہے۔ اور حدیث ان اصولوں کی تاریخ کے ایک خاص دور میں عملی تصویر ہے۔ لیکن چونکہ عالمگیر اور ہمہ گیر اصولوں کو عملی جامہ تاریخ کے ایک خاص دور میں پہنایا گیا، جس دور کے معاشرتی، سیاسی، معاشی اور تمدنی حالات اس دور کے ساتھ مخصوص تھے اور پھر ان حالات میں تبدیلی ناگزیر تھی جس طرح اس خاص دور سے پہلے کے حالات میں تبدیلیاں ہوئیں اور اس دور کے بعد مختلف ادوار کے حالات میں تبدیلیاں ہوں گی، لہٰذا قانونِ فطرت کے اس غیر متبدل اصول کے پیشِ نظر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اپنی پوری حکمت کے ساتھ واضح ہوتا ہے اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس جناب فاروقِ اعظم کی حکمتِ بالغہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جنہوں نے عالمگیر اور لازوال اصولوں اور ان اصولوں پر ایک خاص زمانے کے مخصوص تاریخی، جغرافیائی، معاشی، سیاسی، تمدنی اور ثقافتی حالات پر مبنی عمل کے درمیان اتنی وضاحت کے ساتھ تمیز کی۔ چونکہ

وقت قانونِ فطرت کے اٹل اصولوں کے تحت زمانے میں مختلف تغیر و تبدل پیدا کرتا رہتا ہے اور ان تغیرات کے نتیجے میں انسانی حالات میں بھی دن رات تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس لئے قرآن کے بنیادی اصولوں پر عمل کی صورتیں بھی حالات زمانہ کے مطابق مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخصوص وقت کے حالات پر مبنی عمل دوسرے وقت کے مختلف حالات پر بعینہٖ منطبق نہیں ہوتا لہٰذا مختلف اوقات میں مختلف حالات کو ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اختلافِ زمانہ کے اعتبار سے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ترتیب دیا جاتا رہے گا۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، علوم کی تدوین کی طرف توجہ نہ دے سکنے کے یہ اسباب بڑے بنیادی تھے۔ لیکن تاریخ کی روشنی میں ہم ان اسباب میں چند اور اسباب کا اضافہ کر سکتے ہیں، ہمارے خیال میں تدوین علوم کی راہ میں صرف یہی اسباب حائل نہ تھے بلکہ اگر ہم تاریخ اسلام پر غور کریں تو ہجری کی پہلی پون صدی علوم کی تدوین کے لئے سازگار نہ تھی، تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی نوزائیدہ مملکت کے خلاف پورے عرب میں ایک زبردست ہنگامہ بپا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ تعلیمات اسلام کی نشر و اشاعت اور نوزائیدہ مملکت کی حفاظت و دفاع میں دن رات مصروف تھے۔ دس سالہ مدنی زندگی میں ایک بار نہیں بسا اوقات کئی کئی بار معرکہ آرائیاں کرنی پڑیں۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا فتنہ شروع ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے عہدوں میں فتوحات کا سلسلہ عظیم شروع ہوا جو مسلسل پھیلتا ہی چلا گیا۔ ابھی فتوحات کا یہ سلسلہ شروع ہی تھا کہ حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث کے عہد خلافت کے آخری حصہ میں خانہ جنگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خانہ جنگی کی ابتدا حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ / ۶۵۶ء میں ہوئی اور ۴۱ھ / ۶۶۱ء میں حضرت معاویہؓ کے خلیفہ بننے پر اس کا پہلا دور ختم ہوا۔ خانہ جنگی کا دوسرا دور حضرت معاویہؓ کی وفات سے شروع ہوا اور عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت ۷۳ھ تک جاری رہا۔

تاریخ اسلام کے اس پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس دور میں دفاعی انتظامات اور ارتداد کے خلاف معرکہ آرائیوں، فتوحات اور خانہ جنگیوں میں اتنے مصروف تھے کہ کوشش

کے باوجود بھی علوم کی تدوین کا کام سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ جنگیں اور خانہ جنگیاں مذہبی فریضہ کے طور پر انجام دی جاتی تھیں اور ہر مسلمان ان میں مذہبی فریضہ کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ جنگ ارتداد ہو یا فتوحات وخانہ جنگی ہو۔ ہر حالت میں مسلمانوں کی شرکت ضروری تھی جنگِ ردّہ کے اختتام پر حضرت ابوبکرؓ اور ان کے رفقاء کی دُور رس نگاہ نے عربوں کو دوبارہ اس کا موقع دینے کی بجائے ان کی جنگجویانہ سپرٹ کے استعمال کے لئے نئے میدان تلاش کئے اور کفر واسلام کی جنگوں کا سلسلہ جاری ہو گیا، فتوحات کا یہ سلسلہ شام، عراق، ایران، فلسطین، مصر اور قیروان تک وسیع ہوتا چلا گیا۔ فتوحات کا یہ سیلِ رواں پوری قوت کے ساتھ جاری تھا کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس کی ابتدا دارالخلافہ مدینہ سے ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مدینہ، مکّہ، کوفہ، اور بصرہ اس کی لپیٹ میں آگئے اور جنگِ جمل جیسا جانکاہ سانحہ اس کا پہلا سنگِ میل ثابت ہوا اس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا وہ جنگِ جمل سے کہیں زیادہ خونریز و جانکاہ ثابت ہوا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی باہمی آویزش جنگِ صفّین کی صورت اختیار کر گئی۔ اس میں عرب، ایران، عراق اور شام اپنی پوری قوّت کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور عرب وعجم کے تمام زہّاد صلحاء، اور علماء نے اپنے اپنے فریق کی جانب سے اس میں شرکت کی سوائے چند مستثنیات کے کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جس نے جانبین کی طرف سے اس میں باقاعدہ حصّہ نہ لیا ہو صفّین کے اس سانحۂ عظیم کے بعد نہروان کا معرکہ پیش آیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہادت حضرتِ عثمانؓ سے لے کر حضرت معاویہؓ کی خلافت تک کا زمانہ مسلسل خانہ جنگیوں کی نذر ہوا اور ان میں تمام مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس طرح حضرت معاویہؓ کی وفات کے ساتھ ہی خانہ جنگیوں کا دوسرا دور شروع ہوا جس کی ابتداء مدینہ اور پھر مکّہ کی تباہی و بربادی اور قتل وغارت گری سے ہوئی اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت پر اس کا خاتمہ ہوا جنگوں اور خانہ جنگیوں کے اس سلسلہ کی وجہ سے اسلامی وحدت کے ٹکڑے ہو گئے اور پوری اُمّت کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنے کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں میں تقسیم ہو گئی۔ یہ اگرچہ شروع میں سیاسی وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے لیکن آہستہ آہستہ اس اختلاف نے مذہبی رنگ اختیار کرنا شروع کیا اس طرح سیاسی اختلاف مذہبی اختلافات کی شکل میں رونما ہونے لگے۔

تاریخ اسلام کے ان حقائق کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ عرب اپنی قدیم روایات کی بنا پر فن کتابت کو استعمال میں لانے کے عادی نہ تھے لیکن خانہ جنگیاں اگر انہیں مہلت دیتیں تو شاید وہ اس دور میں علوم کو ضبط تحریر میں لانے کی طرف توجہ دیتے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں علوم کی تدوین کا آغاز دیر سے ہوا۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے ابتدائی دور کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس کا آغاز علوم کے مٹ جانے اور علماء کے دنیا سے اٹھ جانے کے خوف سے ہوا۔ چنانچہ الہروی یحییٰ بن سعید عن عبداللہ بن دینار کے طریق سے تدوین علوم پر بحث کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام عام طور پر احادیث کو لکھا نہیں کرتے تھے، ان کا عام طریق کار یہ تھا کہ وہ تعلیم و تعلم کا کام زبانی کیا کرتے تھے اور ضبط کے سلسلہ میں حفظ و یادداشت پر بھروسہ کرتے تھے۔ بعض مستثنیٰ طور پر صدقات اور دیگر مباحث پر مختصر طور پر لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ مسلمان عام طور پر اسی طریق پر گامزن رہے حتی کہ انہیں علوم کے فنا ہو جانے اور علماء کے کثرت سے فوت ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوا سب سے پہلے جس شخص نے اس خطرے کو محسوس کیا وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں حدیث کی تدوین کا حکم فرمایا۔

ابونعیم نے تاریخ اصبہان میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک فرمان پوری سلطنت میں اس مضمون کا بھیجا تھا کہ سب علماء حدیث رسولؐ کا جائزہ لیں اور اس کی جمع و تدوین کا اہتمام کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز پہلے شخص تھے جنہیں تدوین علوم کا احساس ہوا اور انہوں نے اس کا سرکاری طور پر اہتمام کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ اہتمام دو وجوہ کی بنا پر قابل غور ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ اہتمام سرکاری طور پر ہوا اور دوسرا یہ کہ اس کا آغاز اس خوف سے ہوا کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علما کی اکثریت دنیا سے رخصت نہ ہو جائے۔ یہ دونوں وجوہ اس اعتبار سے قابل غور ہیں کہ اس تحریک کے متوازی ایک دوسری تحریک پرائیویٹ طور مصروف عمل تھی اور اس تاریخ کی ابتدا کا سبب اس تحریک کے سبب سے مختلف تھا۔ ایک تو وہ پرائیویٹ تحریک تھی اور دوسرے اس کے آغاز کا سبب علم اور علماء کے مٹنے کا خوف نہیں

بلکہ دوسرے علوم کے مقابلہ میں اسلامی علوم کی تدوین کی ضرورت تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں اس موضوع پر لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ کبارِ تابعین کے بعد تابعین کے عہد کے آخری حصّہ میں آثار کی تدوین اور اخبار کی تبویب کا آغاز ہوا۔ اس آغاز کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ ایک تو اس دور میں علمار مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے۔ اور دوسرے خوارج، روافض کی وجہ سے بدعات خُوب کثرت سے پھیلنے لگیں۔

آغازِ تدوینِ علوم کے بارہ میں حافظ ابنِ حجر کا یہ تبصرہ نہایت جامع اور دقیع ہے جیساکہ اوپر بیان ہوا۔ خانہ جنگیوں کی وجہ سے مسلمان بڑے بڑے سیاسی گروہوں میں بٹ گئے۔ اور اِس سیاسی تقسیم کی وجہ سے ان کی مرکزی حیثیت جاتی رہی۔ اس سیاسی تقسیم سے قبل مدینہ کی مرکزی حکومت اتنی جاندار تھی کہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل تلاش کرنے کی اِس میں صلاحیت موجود تھی۔ خلیفہ اور اس کے ارکانِ مجلسِ شوریٰ امت کے بہترین دماغ تھے۔ لیکن خانہ جنگیوں کی وجہ سے جہاں مرکزیت کو زبردست نقصان پُہنچا۔ وہاں اصحابِ حل وعقد کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا۔ سیاسی اختلافات کی وجہ سے بڑے بڑے صُلحار اور زیرک مسلمان مرکز کے ساتھ وابستہ ہونے کی بجائے علیحدگی پسند کرنے لگے جس کی وجہ سے مذہب اور سیاست میں تقسیم ہونے لگی۔ پھر سیاسی اُکھاڑ پچھاڑ اور آئے دن کی جنگوں نے علمار کو مجبور کیا کہ وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو جائیں۔ مدینہ میں اگرچہ سکون تھا، تاہم اس کے علاوہ دوسرے بڑے بڑے اسلامی مرکز سیاست و جنگ وجدل کی دَستبُرد سے ہرگز محفوظ نہ تھے۔

نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاستِ مذہب کا رنگ اختیار کرنے لگی۔ چنانچہ کچھ فرقے سیاست میں ناکامی کے بعد اپنے سیاسی نظریات کو مذہبی رنگ دینے لگے۔ اور اپنے ہر مؤقف کی تائید مذہب سے تلاش کرنے لگے چونکہ اسلاف میں سے صرف ایک صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی ایسی ذات تھی۔ جو سب کے نزدیک مُسلّم تھی۔ کیونکہ اِن کے بعد والوں کو کسی نہ کسی طرف سے جانبدار قرار دے دیا گیا تھا۔ لہٰذا اپنے مؤقف کی تائید کے لئے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو ہر ایک نے استعمال کرنا شروع کیا۔ اور ہر قسم کی احادیث اُبھرنے لگیں اور ہر فریق اپنی تائید کے لئے احادیث تلاش کرنے لگا۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں من گھڑت اور مصنوعی احادیث کو بھی کثرت سے ایجاد

کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ ان حالات نے اُمت کے احساس اور بیدار مغز عُلماء کو میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دی۔ بدعات کے اِس عظیم طُوفان کے مقابلے کے لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ جہاں اُمت کے سوادِ اعظم میں تقریر و خطابت کے ذریعے دینِ اسلام کی اشاعت کی جائے۔ وہاں مسائل کو ضبطِ تحریر میں لاکر ایک تو علم کو محفوظ کر لیا جائے۔ اور دوسرے بدعات کے مقابلہ میں صحیح اور مستند علم کو لکھ کر عام کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس سلسلے میں الربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ اور کچھ دوسرے اصحاب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے ایک ایک موضوع پر رسالے لکھے۔ اور احکام مدوّن کئے۔

مختلف علاقوں کے علماء نے اپنے اپنے علاقے کے مجتمع علیہ مسائل کی جمع و تدوین شروع کی۔ مدینے میں امام مالک بن انس نے مؤطا مرتب کی۔ اس میں حجاز کی قوی احادیث کو درج کرنے کا اہتمام کیا۔ خلفاء راشدین کے فیصلوں اور دیگر صحابہ کرام کے اقوال کو جمع کیا۔ اور تابعین کے فتاوٰی کو مرتب کیا۔ یہی کام ابن جریج نے مکہ میں، اوزاعی نے شام میں، سفیان الثوری نے کوفہ میں، حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، ہشیم نے واسط میں، معمر نے یمن میں، ابن المبارک نے خراسان میں، جریر بن عبدالحمید نے رے میں انجام دیا۔ یہ سب علماء ایک ہی دور کے ہیں۔ معلوم نہیں۔ ان میں سے اس کام میں پہل کس نے کی۔ البتہ ابوطالب مکی نے اپنی کتاب قوت القلوب میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ سب کتب ۱۲۰ یا ۱۳۰ ہجری میں لکھی گئیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے ابنِ جریج نے ایک کتاب مکہ میں لکھی تھی۔ اس کے بعد معمر نے یمن میں اپنی کتاب لکھی۔ جس میں سنن کو جمع کیا گیا۔ پھر امام مالک بن انس نے مدینہ میں اپنی کتاب المؤطا مرتب کی۔ اس کے بعد ابن عیینہ کی الجامع والتفسیر اور سفیان الثوری کی جامع مرتب ہوئیں۔

الغرض دوسری صدی ہجری کے نصف تک اسلامی علوم کی تدوین کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس زمانے تک مندرجہ بالا کتب ضبطِ تحریر میں لائی جا چکی تھیں۔ اسلام میں علوم کی تدوین کا آغاز ہونے کی دیر تھی۔ پھر تو اس میں وہ ترقی ہوئی کہ ایک ایک شخص کی تصنیفات آج کل کے سینکڑوں مصنفین کی اجتماعی کوشش پر سبقت لے گئیں۔

تذکرۂ خانوادۂ ولی اللّٰہی از یادگار دلّی

محمد عبد الحلیم چشتی، ایم اے

سید احمد ولی اللّٰہیؒ خانوادۂ ولی اللّٰہی کے وہ فرد فرید ہیں، جن کی مساعی جمیلہ سے دہلی میں مطبع احمدی قائم ہوا، جس سے شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ کے عربی اور فارسی کے مختصر و نادر رسالے اور ان کے اردو ترجمے شائع ہوئے۔

سید احمدؒ نے مدرسہ عربیہ کو جو ۱۸۵۷ء سے ویران ہو گیا تھا پھر سے آباد کیا تھا۔ موصوف ہی نے شاہ ولی اللہ اور ان کے نیک نام فرزندوں کے مزارات کا احاطہ جو غدر کے بعد مسمار ہو چکا تھا دوبارہ کھچوایا تھا۔ بلاشبہ ان کی یہ خدمات تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور مستقل مقالہ کی محتاج ہیں، ہم انشاء اللہ کسی اگلی فرصت میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔

سید احمد ولی اللّٰہی نے دلّی کی مختصر و جامع تاریخ بھی اردو زبان میں لکھی ہے، جو دہلی سے یادگار دلی کے نام سے شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی ہے۔ اس کتاب میں مشاہیر اہل دلّی کے مزارات کے سلسلے میں دلی کی جن نامور شخصیتوں کا تذکرہ

گیا ہے، ان میں خانوادۂ ولی اللہی کا تذکرہ بھی آگیا ہے اور شاہ عبدالرحیم سے شاہ عبدالغنی تک سب ہی بزرگوں کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ ان کا تذکرہ اگرچہ مختصر ہے تاہم خانوادہ دلی کے ایک اہل علم کی باقیات صالحات سے ہونے کی بناء پر بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسی وجہ سے اس کو مذکورۂ بالا کتاب سے نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، جو الرحیم کے قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس پر ذیلی سرخیاں ہم نے قائم کی ہیں۔

مہندیان یہ ایک عمارت ہے جو کسی زمانہ میں عجیب وغریب ہوگی، نیچے مکانات جیسے در بنے تھے اور چار کونوں پر چار برجیاں تھیں ایک برجی بیچ میں قائم تھی۔

مہندیان کی وجہ تسمیہ کہتے ہیں کہ ایک نواب صاحب کو حضرت غوث الاعظمؒ کی جناب میں نہایت عقیدت تھی اور ہندوستان میں رسم ہے کہ ہر برس حضرت غوث الاعظمؒ کی مہندیاں بھرا کرتی ہیں یعنی کھپچیوں کی ایک برجی اونچی سی بنا کر کاغذ سے منڈھ کر اس کو روشن کرتے ہیں۔ ان نواب صاحب کے یہاں بھی مہندی کی روشنی ہوا کرتی تھی، جب وہ نواب ہوئے تو انہوں نے یہ عمارت مہندی کی صورت کی بنادی اور ہر برس اس میں روشنی کرنے لگے اور یہ مقام مہندیان مشہور ہوا اب بالکل کھنڈر پڑا ہے۔ دیکھنے سے ہرگز نہیں معلوم ہو سکتا کہ کیا عمارت تھی اور کس وضع پر بنی تھی۔

اس جگہ پر میدان میں دو آستانے نہایت متبرک ہیں،

اول مولانا شیخ عبدالعزیز شکر بار علیہ الرحمہ کا مزار ہے۔

دوسرا مکرم محترم آستانہ جس کے انوار تمام ہندوستان کو محیط ہو رہے ہیں، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی درگاہ ہے، پختہ احاطہ بنا ہے، احاطہ کے اندر مسجد ہے، مسجد کے جنوب میں چبوترہ پر چوبی کٹہرہ لگا ہے۔ کٹہرے کے اندر ان حضرات کے مزار ہیں:

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب علیہ الرحمہ والد ماجد حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید صاحب علیہ الرحمہ۔

ان کے علاوہ دیگر اہل وعیال کی قبریں ہیں صفحہ ۱۰۰ پر نقشہ سے پوری کیفیت معلوم ہوگی۔

شاہ ولی اللہ کے جدِّ اعلیٰ شمسُ الدین کی حجاز سے آمد اور رہتک میں قیام، شیخ وجیہُ الدین کی دِلّی میں سکونت

یہ سب حضرات فاروقی نسب ہیں، حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں سب سے پہلے حضرت مفتی شمس الدین صاحب فاروقی عرب سے تشریف لائے اور رہتک میں مقیم ہوئے۔ جس وقت شاہجہان بادشاہ کا زمانہ ہوا تو مفتی صاحب کی اولاد میں مولانا شیخ وجیہ الدین علیہ الرحمہ موجود تھے۔ آپ دلّی میں تشریف لائے اور اسی جگہ اقامت کی جس جگہ اب ان حضرات کے مزارات ہیں۔ اس وقت یہ مقام چھتہ خوش نہ در کے نام سے مشہور تھا اور پرانی دلّی کی آبادی اسی جگہ تھی۔ چنانچہ جابجا مکانوں اور مسجدوں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔

مدرسہ رحیمیہ کا قیام

مولانا وجیہ الدین علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمہ نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اور مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ تمام دن قرآن وحدیث کا درس دیتے رات کو طالبانِ خدا کی توجّہ دہی اور سلوک طے کرانے میں مشغول رہتے، ظاہری و باطنی دونوں علموں کی تعلیم دیتے۔ دُور دُور کے لوگ حلقۂ درس میں آتے عرب وعجم کے

طلبہ فیض اٹھاتے۔

نسبت کا اثر نسبت اس قدر قوی تھی کہ ہزاروں آدمیوں پر یکساں اثر پڑتا۔

اخلاص کی کیفیت اخلاص اور قرب کی یہ کیفیت تھی کہ سرور کائنات علیہ التحیات کی مجلس میں شامل ہوتے۔ جلوت و خلوت میں رہتے۔

ولادت آپ ۱۰۵۴ھ ہجری شاہجہان بادشاہ کے وقت میں پیدا ہوئے۔

علوم وفنون کی تحصیل شرح عقائد نسفی، خیالی وغیرہ اپنے بڑے بھائی مولانا شیخ ابوالرضا محمد سے پڑھی۔ باقی معقول، منقول کی تمام کتابیں مولانا میر زاہد ہروی ابن قاضی اسلم سے پڑھیں۔

تصوف کی تحصیل وتکمیل علم تصوف مولانا خواجہ خورد ابن حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ سے حاصل کیا علم سے فارغ ہوئے تو "اللہ اللہ" کا شوق ہوا۔ بہت سے مشائخ سے فیض صحبت حاصل کیا۔

تین بزرگوں سے خرقہ خلافت پہنا،

اول حضرت خواجہ خورد علیہ الرحمہ سے جو حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ کے فرزند اور خلیفہ تھے،

دوسرے حضرت قاری حافظ سید عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ سے جو شیخ آدم بنوری کی صحبت میں رہے تھے،

تیسرے حضرت خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی علیہ الرحمہ سے جو ملا ولی محمد صاحب خلیفہ حضرت امیر ابوالعلی صاحب اکبرآبادی کی صحبت میں رہے۔

وفات ومدفن بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں ۱۲ صفر روز چہارشنبہ ۱۱۳۱ھ ستّر برس کی عمر میں آپ کا وصال ہوا اور اسی جگہ اپنے ذکر وشغل کے حجرے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ارجمند

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ خلیفہ اور جانشین ہوئے والد بزرگوار کے قدم بقدم رہے۔

ولادت و تعلیم و تربیت

۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے، درسی کتابیں اپنے والد مرحوم سے سبقاً سبقاً پڑھیں، پھر قرآن شریف کا ترجمہ اخذ کیا۔ ۱۶ برس کی عمر تھی کہ شاہ عبدالرحیم صاحب نے انتقال کیا، آپ سجادہ نشین ہوئے اور طالبانِ ہدایت کو سیدھے رستہ لگانا شروع کیا۔ تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ جوق جوق لوگ آنے شروع ہوئے۔ سینکڑوں طالب علم مستفیض ہونے لگے۔ عجیب عجیب کتابیں تصنیف کیں۔ طبیعت میں اجتہادی قوت ازل سے ودیعت رکھی گئی تھی۔ نئے نئے نکات نکالے، زمانہ میں شہرت حاصل کی۔ مسلم الثبوت استاذ مانے گئے۔ مانے ہوئے بزرگ مشہور ہوئے — حتیٰ کہ موافق و مخالف سب آپ کے اقوال سے سند پکڑنے لگے۔

مشائخ حرمین سے روایتِ حدیث کی اجازت

۱۱۴۳ہجری میں خانہ کعبہ کی زیارت کو تشریف لے گئے، بڑے بڑے نامی علماء و مشائخ سے صحبتیں رہیں۔ حضرت شیخ ابو طاہر مدنی قدس سرہ اور دیگر مشہور مشائخ عرب سے صحاح ستہ اور دیگر حدیث کی کتابوں کی سندیں اور روایت کی اجازت حاصل کی۔

بہت سے بزرگوں سے خرقۂ خلافت پہنا اور ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ میں دلّی واپس تشریف لائے اور اپنے قدیمی مکان میں اقامت کی۔ مدرسہ رحیمیہ کو رونق دی۔ حدیث و تفسیر کا درس دینا شروع کیا گویا شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے بعد اس زمانہ میں آپ نے حدیث شریف کو فروغ بخشا، اطراف ہندوستان میں آپ کی حدیث دانی کی شہرت ہوئی، طالب علموں کے پرے کے پرے آنے شروع ہوئے پرانی دلّی دارالحدیث بن گئی۔

روشن اختر محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا اس نے چاہا کہ مولانا کے دم سے شاہجہان آباد

کو عزت ہو تو کیا کہنا ہے۔ لہٰذا مولانا کو یہاں بلایا اور ایک عالیشان مکان رہنے کے لئے عنایت فرمایا جس کا تفصیلی ذکر مدرسہ کے متعلق گزر چکا ہے۔ آپ مع اہل وعیال شہر میں آ رہے اور قدیم جگہ غیر آباد پڑی رہی۔

وفات ۱۱۷۶ھ ہجری میں تریسٹھ ۶۳ برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ اپنے والد ماجد کے قریب مدفون ہوئے۔ اس مصرعہ سے سالِ وفات معلوم ہوتا ہے' ع

او بود امام اعظم دین

آپ کے بعد آپ کے چار فرزند باقی رہے۔ سب میں بڑے 'مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ' تھے۔ علم، عمل، فہم، فراست، حافظہ، تحریر، تقریر، تقویٰ، طہارت، امانت، دیانت میں یکتا شمار کئے جاتے تھے۔

ولادت ۱۱۵۹ھ ہجری میں پیدا ہوئے، تمام کتابیں اپنے والد مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا شاہ محمد عاشق علیہ الرحمہ اور مولانا خواجہ امین اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے پڑھیں اور حدیث کی سند اور روایت کی اجازت اپنے والد مرحوم سے حاصل کی۔ بہت سے رسائل تصنیف کئے، تفسیر عزیزی لکھنی شروع کی مگر افسوس ناتمام رہی دن کو پڑھاتے، رات کو توحید دہی میں مصروف رہتے، ظاہری باطنی دونوں فیض جاری تھے اور اب بھی برابر وہی بات چلی آتی ہے۔

خلفاء اور تلامذہ مولانا سید احمد صاحب بریلوی شہید علیہ الرحمہ، مولانا سلامت اللہ صاحب کانپوری علیہ الرحمہ جیسے مقتدا آپ کے خلیفہ تھے۔ مولانا سید محبوب علی صاحب دہلوی، مولانا رشید الدین خان صاحب دہلوی، مولانا حسن علی صاحب لکھنوٴ وغیرہ جیسے مستند علماء آپ کے شاگرد تھے۔

وفات ۷، شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ ہجری میں صبح کے وقت آپ کا وصال ہوا اور اپنے والد مرحوم کے پاس مدفون ہوئے۔ مؤمن خان دہلوی نے آپ کی تاریخ لکھی ہے ؎

انتخابِ نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز | بیعدیل و بینظیر و بیمثال و بیمثل
جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے | آگیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایمان میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا | کیا کیا یہ ظلم تو نے بے کسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا | لوٹتا تھا خاک پہ ہر قدسی گردوں محل
کیا کسی دنا کس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن | ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلسِ دردآفرینِ تعزیہ میں میں بھی تھا | جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل
دست بیدادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے | فخرِ دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ سے چھوٹے' مولانا شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ' یکتائے زمانہ تھے، ہر علم میں یگانہ تھے۔

تکمیلِ علوم حدیث، تفسیر کی سند اپنے والدِ بزرگوار اور ان کے خلیفہ اعظم شاہ محمد عاشق علیہ الرحمہ سے حاصل کی تھی، فنونِ ادبیہ میں مرجع خلائق تھے، علوم عقلیہ میں مجتہدانہ طبیعت رکھتے تھے۔

درس وتدریس جس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز ضعیف ہو گئے تو تدریس کا سلسلہ آپ ہی سے قائم رہا رات دن پڑھاتے، بڑے بڑے جیّد علماء استفادہ کی غرض سے آتے اور بامراد جاتے۔

تصنیفات اکثر رسائل آپ کی تصنیف سے موجود ہیں، کچھ طبع ہو گئے ہیں، کچھ قلمی رکھی ہوئی ہیں۔ ترجمۂ اردو قرآن شریف آپ کا یادگار ہے۔ آخر عمر تک درس تدریس کے شیدائی رہے۔

وفات ۱۲۳۳ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے والد کے پائینتی مدفون ہوئے۔

تیسرے بیٹے' مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ' عالم، فاضل، متوکّل، مستغنی المزاج تھے۔ دنیا سے نفرت کرتے۔ مجامع محافل سے کنارہ کرتے۔ تحصیل علوم سے فراغت

پاکر اکبری مسجد کے ایک حجرہ میں تمام عمر بسر کردی۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ کرتے، اس لئے تصنیف و تالیف وغیرہ کی طرف بھی چنداں توجہ نہ ہوئی۔

ترجمہ و تفسیر

ترجمہ قرآن شریف اور موضح القرآن[1]۔ یہ دو نایاب چیزیں آپ کی یادگار ہیں جن پر سے بلا مبالغہ ہزار کتابیں نثار ہیں۔

ظاہر میں سیدھا سادھا تحت اللفظ ترجمہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں جواہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، بڑی بڑی صنعتیں قائم کی ہیں اس کا لطف وہی علماء جانتے ہیں جن کو علم تفسیر اور عربی اردو محاورات میں مہارت ہے۔ عام لوگ کیا سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کو شاہ عبدالعدل صاحب علیہ الرحمہ سے شرف بیعت حاصل تھا اور ان کو خواجہ محمد ناصر اور خواجہ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہما سے اور خواجہ ناصر علیہ الرحمہ کو شاہ سعد اللہ صاحب المعروف بہ شاہ گلن قدس سرہ سے۔

نیز شاہ عبدالقادر صاحب کو خواجہ میر درد علیہ الرحمہ سے فیض صحبت حاصل تھا۔ بہت سے لوگ آپ سے مرید تھے، متعدد خلیفہ ہوئے۔

ولادت و وفات

آپ ۱۱۶۷ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۰ھ ہجری ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدّ امجد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پائین مدفون ہوئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے چوتھے صاحبزادہ ' مولانا شاہ عبدالغنی صاحب علیہ الرحمہ' اتباع شریعت میں بے نظیر تھے باوجود اہل وعیال کے اہل دنیا سے نفرت تھی۔ وضع، لباس، خُلق تمام باتیں اپنے والد بزرگوار سے ملتی جلتی تھیں۔

تحصیل و تکمیلِ عُلوم

حدیث تفسیر کی تحصیل اپنے دونوں بڑے بھائی مولانا شاہ

---

[1] موضح قرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ چشتی

رفیع الدین صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ سے حاصل کی۔

وفات ۱۲۲۷ھ ہجری ، ۵۰ برس کی عمر میں وفات پائی اور مولانا شاہ عبد القادر صاحب علیہ الرحمہ کے متصل مدفون ہوئے۔

اس کٹہرے کے اندر حسب ذیل بزرگ اور مدفون ہیں :

مولانا مخصوص اللہ صاحب

مولانا محمد موسیٰ صاحب

مولانا محمد عمر صاحب خلف مولانا اسمعیل صاحب شہید

والدہ ماجدہ شاہ عبد العزیز صاحب

والدہ ماجدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

مولانا شاہ عبد القادر و مولانا شاہ رفیع الدین و مولانا شاہ عبد الغنی صاحب کی صاحبزادیاں۔

احقر کی والدہ یعنی مولوی محمد موسیٰ صاحب کی صاحبزادی ، مولوی مخصوص اللہ صاحب کی زوجہ ، کٹہرہ کے باہر احاطہ کے اندر و دیگر اہل و عیال حضرت و اخوند برہان صاحب علیہ الرحمہ شاگرد حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب ، صاحبزادے مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانوی علیہ الرحمہ ، و مولوی عنایت الرحمٰن خان صاحب رئیس دلی و منشی امو جان صاحب و دیگر معتقدین و متوسلین خاندان و قاضی محمد زبیر صاحب چشتی نظامی علیہ الرحمہ ، مولوی حافظ سید محمد صاحب مرحوم امام جامع مسجد اور کٹہرے کے غربی جانب احاطہ سے باہر مومن خان دہلوی علیہ الرحمہ کی قبر ہے جو دلی کے مشہور زبان داں ، سخن فہم ، فصیح بلیغ شاعر گزرے ہیں ۔

یہ جگہ جہاں ان حضرات کے مزارات ہیں غدر کے بعد سے بالکل خراب ہو گئی تھی ، احاطہ تک مسمار ہو گیا تھا تمام دن چرواہے مویشی چراتے تھے اور جانور قبروں پر بول و براز کرتے تھے ، جس سے تمام مسجد کا صحن اور مقابر نجس رہتے تھے ، اس کے علاوہ میونسپل کمیٹی نے اس موقعہ کو نزول میں داخل کر لیا تھا اور یہ زمین

ٹھیکہ پر دی جاتی تھی اور چاند ماری کے حدود میں آجانے سے اس زمانہ میں رستہ تک چلنا محال ہوتا ہے۔

ہر چند طبیعت کو پریشانی ہوتی تھی مگر بیکسی کے ہاتھوں گرفتار تھا۔ کس سے کہتا اور کون سنتا، مگر خدا کا شکر ہے کہ تھوڑا سا ٹکڑا قبرستان کا نزول سے نکل گیا، اور ۱۳۱۲ھ ہجری میں اس قدر کا احقر نے احاطہ بنوا دیا۔ اور بزرگوں کے مزارات جو غرقی میں آگئے تھے، ایک چبوترہ پران کا نشان قائم کر کے چوبی کٹہرہ لگا دیا اور دو آدمی خدمتگار مقرر کر دیئے تاکہ پوری حفاظت ہو جائے اور بول و براز یا اور دیگر امور جن سے مقابر کی توہین ہوتی ہو نہ ہونے پائیں۔ مگر ابھی تمام قبرستان کی زمین اور قبور نزول میں آئی ہوئی ہیں خدا کرے بہت جلد کوئی سامان ہو جائے جس سے یہ مکرم قبرستان نزول سے نکل جائے اور اہل اسلام کے برگزیدہ لوگوں کی اور ان حضرات کے اہل و عیال کی قبریں پیشاب پاخانہ وغیرہ کی نجاست سے محفوظ ہو جائیں۔

مزارات کی حفاظت اور مطبع کے اجراء سے اپنا مطلب صرف یہ ہے کہ بزرگوں کے نشانات قائم رہیں اور ان حضرات کا فیض جاری و ساری رہے۔

خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی تعلیمات اور ملفوظات

(۴)

سید رشید احمد ارشد ایم، اے

ملفوظاتِ مجالس آپ کے مکتوباتِ مبارکہ کے علاوہ آپ کے وہ ملفوظات وارشادات بھی حقائق و معارف کا گنجینہ ہیں، جنہیں آپ کے ایک مخلص عقیدت مند نے (جن کا اسم مبارک معلوم نہیں ہو سکا ہے) آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں آپ کی مجالس میں بیٹھ کر مرتب کیا تھا اور وہ یہ تحریر کردہ اقوال و ارشادات آپ کی نظر سے گزارا کرتے تھے، اس لئے یہ "ملفوظات مجالس" بھی آپ کی تعلیمات و ارشادات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ لہذا ہم ان ملفوظات کے اہم اقتباسات قارئین کرام کے استفادہ کے لئے پیش کرتے ہیں

توکل کا مفہوم مجلسِ اول میں آپ توکل کے مفہوم کی اس طرح وضاحت فرماتے ہیں:

"توکل یہ نہیں ہے کہ اسباب کو چھوڑ کر بیکار بیٹھ جائیں، کیونکہ یہ بے ادبی ہے بلکہ جائز ذرائع معاش مثلاً کتابت وغیرہ اختیار کرنے چاہئیں اور نظر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہئے کیونکہ سبب ایک دروازہ ہے جیسے حق تعالیٰ نے روزی

پہنچانے کے لئے بنایا ہے۔ اگر کوئی شخص اس لئے دروازہ کو بند کر دے کہ روزی اوپر سے مہیا ہو جائے تو یہ بہت بے ادبی کی بات ہے کیونکہ خدا نے دروازہ اسی لئے بنایا ہے کہ ہم اسے کھول کر بیٹھیں، آگے اس کا اختیار ہے کہ وہ روزی دروازہ سے (دنیاوی ذریعہ معاش) بھیجے یا اوپر سے مہیّا کرے۔

جو شخص صرف فتوح پر نظر رکھے اس کا بھی یہی حال ہے کیونکہ کمانے کی طاقت رکھتے ہوئے صرف فتوح (نذرانہ) پر نظر رکھنا کم ہمّتی اور ترک اسباب ہے۔"

عشق صوری

آگے چل کر آپ نے مجازی عشق و محبّت کے بارے میں اسی مجلس میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

"جو شخص اس جہاں میں شکل و صورت کے عشق میں پھنسا رہتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے بڑے بھاری حجاب اور پردہ میں رہتا ہے۔ اگر وہ صورت نامحرم ہو تو قیامت میں اس صورت کو بری شکل سے بدل کر، اس کے مبتلا عاشق پر مسلّط کر دیا جائے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کے حضور کی اُسے کوئی لذّت حاصل نہیں ہوگی۔

بعض بزرگوں نے عشق صوری کو طریقت میں شمار کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیں بہت تامّل ہے۔ یہ چیز 'طریقۂ عالیہ نقشبندیہ' میں بہت ہی غیر معتبر ہے۔"

محبّت کے اقسام

مجلس دوم میں جو بروز جمعرات بتاریخ ۶ ر ماہ صفر ۱۰۰۹ھ کو منعقد ہوئی، حضرت خواجہ باقی باللہ نے محبتِ ذاتی اور محبت صفاتی کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

"محبتِ صفاتی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے اس کے عالم یا بہادر ہونے کی وجہ سے محبّت رکھے۔ اس صورت میں اس کی محبّت، علم و شجاعت کے اوصاف پر موقوف ہوگی یعنی یہ اوصاف اگر اس سے دور ہو جائیں تو وہ محبّت باقی نہیں رہے گی۔

محبتِ ذاتی یہ ہے کہ کوئی شخص، دوسرے سے ذاتی طور پر محبّت رکھے یعنی

اس کی محبت کا دار و مدار محض اس کی ذات پر ہو کسی عمدہ صفت کے ہونے یا نہ ہونے پر وہ محبّت موقوف نہ ہو اور نہ عمدہ صفات کی کمی بیشی کی وجہ سے اس کی محبت میں کمی بیشی ہو۔"

بعد ازاں آپ نے فرمایا: "اہل شہود میں اس شخص کو محبّت ذاتی حاصل ہوتی ہے جس کی اپنی کوئی غرض درمیان میں نہ ہو۔ اگر کسی کو محبوب کے مشاہدہ سے لذّت و سرور حاصل ہوتا ہو تو یہ کیفیت محبتِ ذاتی کے نہیں ہے بلکہ یہ محبّتِ ذاتی کا کمال ہے۔"

طریقت کا دار و مدار

آگے چل کر آپ نے فرمایا:

"ہماری طریقت کا دار و مدار ان تین چیزوں پر ہے:

(۱) اہل سنّت والجماعت کے عقائد پر پختہ ہونا (۲) حضورِ قلب کا ہمیشہ قائم رہنا (۳) عبادت۔

لہٰذا جب اتم یہ دیکھو کہ کسی میں ان تینوں اشیاء میں سے کسی چیز کی کمی ہوگئی ہے تو سمجھ لو کہ وہ ہمارے طریقے سے باہر نکل گیا ہے۔"

روزہ میں اعتدال

چوتھی مجلس ۱۱/ ماہ رمضان المبارک ۱۰۰۹ھ میں منعقد ہوئی اس وقت شیخ جلال تھانیسری کے مریدوں میں سے ایک صوفی مرید بعد از افطار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ باہر ہی آپ کا انتظار کرتا رہا تاکہ حضرت خواجہ صاحب افطار اور طعام سے فارغ ہو جائیں۔ اس شخص کی یہ عادت تھی کہ وہ تہجّد کے بعد کھانا کھایا کرتا تھا اور ہمیشہ روزہ رکھا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب پر اس کا حال واضح ہوگیا تھا اس لئے آپ نے حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا:

"روزہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کو اختیار کرے چونکہ اللہ تعالیٰ کھانے پینے سے پاک و صاف ہے، اس لئے بندہ بھی یہ چاہتا ہے، کہ وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے خدا کی اس صفت کو اختیار کرے۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ بندہ

اپنی عاجزی کے اظہار کے لئے سحری کھالیا کرے۔ اس کے بعد عجز و ادب کے ساتھ روزہ کا آغاز کرے۔ اس طرح وہ بندگی کے دائرہ میں رہتا ہے۔

'قیام لیل' (رات بھر عبادت کرنا) بھی اللہ کی صفت کے مشابہ ہے، اس میں بھی اسی قسم کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، چونکہ حق تعالیٰ نیند اور سونے سے مبرّا اور پاک وصاف ہے اس لئے بندہ بھی اس صفت میں اس کی پیروی کرکے 'قیام لیل' کا آغاز کرتا ہے۔

لہٰذا اُسے چاہیئے کہ وہ گستاخ ہوکر ان کاموں کے اختیار کرنے میں اپنی طاقت اور قوت کا مظاہرہ نہ کرے۔ اسے چاہیئے کہ رات ہوتے ہی جلد کھانا کھالے تاکہ بندہ کی عاجزی ظاہر ہو۔"

آپ کے ان ارشادات کا اس متشدّد صوفی پر اس قدر اثر ہوا کہ اس نے فوراً کھانا طلب کیا اور اپنی عادت کے برخلاف کھانا کھایا، ورنہ وہ اس قدر ضدّی تھا اور اپنے اصولوں پر اس قدر پختہ تھا کہ والدین کے اصرار پر بھی شام کو کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ ہمیشہ تراویح اور تہجّد سے فارغ ہوکر کھانا کھاتا تھا، اور ہمیشہ روزہ رکھتا تھا۔

شیخ نورالدین کا تذکرہ مجلس پنجم میں مذکور ہے کہ اس دن حضرت خواجہ صاحب کے سامنے شیخ نورالدین صاحب کی استقامت کے بارے میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ شیخ نورالدین پنجاب کے مشہور عالم تھے، اس علاقے کے بہت سے لوگ ان کے مرید تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کے بارے میں یہ فرمایا:

"شیخ نورالدین کی عمر ایک سو بیس ۱۲۰ سال کی ہوگئی تھی اور وہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے، تاہم اس قدر بڑھاپے میں بھی وہ بکثرت نوافل پڑھتے تھے اور راتوں کو جاگتے رہتے تھے۔ اور شب بھر بہت عبادت و ریاضت کرتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے تیس ۳۰ سال تک اپنا پہلو زمین پر نہیں رکھا۔"

شریعت کی پابندی

اس پر حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا:
"مگر اس شیخ سے حقائق و معارف سننے میں نہیں آئے"؟

آپ نے جواب دیا "انسان شرعی احکام بجالانے پر مامور ہے، اسے حقائق و معارف بیان کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو صوفیانہ معارف وحقائق بیان کرنے کے لئے مکلف نہیں فرمایا۔ آپ ہمیشہ احکام شریعت کی تلقین فرماتے تھے لہٰذا یہ اعلیٰ درجہ کی سعادت ہے کہ انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کرے، اور اس پر ثابت قدم رہے اور ہمیشہ نیک اعمال بجالانے کی کوشش کرتا رہے۔"

آپ نے مزید فرمایا "معرفت کے بہت سے اقسام و مراتب ہیں اگر انسان کو حقائق و معارف کا بہت بڑا حصّہ حاصل ہو جائے تو بہتر اور خوب تر ہے ورنہ اس کا اصل کام شریعت کی پابندی ہے۔"

طریقۂ ذکر و رابطہ میں اختلاف

چھٹی مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے جامعِ ملفوظات رقمطراز ہیں: "حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا:

"کہتے ہیں کہ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ، میں رابطہ کا طریقہ حضرت صدیق اکبرؓ سے اور ذکر کا طریقہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے حاصل ہوا ہے، یہ اختلاف کیوں ہے؟"

آپ نے فرمایا "ذکر کا وہ طریقہ جسے مقررہ قاعدہ کے مطابق 'وقوفِ عددی' کہا جاتا ہے جیسے کہ حبسِ نفس اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کو اس کے ساتھ ملانا۔ یہ طریقہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے (ہم تک) دست بدست پہنچا ہے، اور صحبت کا طریقہ بھی انہی سے (اس سلسلۂ نقشبندیہ تک) پہنچا ہے کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ سفر اور حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے اور بطریقۂ صحبت فیض حاصل کیا ہے۔ اس (روحانی) کام کی اصل بنیاد صحبت ہی ہے اور رابطہ اس کا ظلّ (سایہ) ہے۔ ظاہری صحبت نہ ملنے کی صورت میں رابطہ بھی جو باطنی صحبت

ہے، کافی سمجھا جاتا ہے۔"

آپ نے مزید فرمایا "اگر کوئی شخص 'پیر صحبت' کی صحبت میں (روحانی) کمال تک پہنچ جائے تو اس کو ایسے 'پیر تعلیم' کی ضرورت نہیں رہتی جس سے وہ ذکر کی تعلیم حاصل کرے کیونکہ جب کوئی شخص منزل مقصود تک پہنچ جائے تو پھر اسے گھوڑا خریدنے (یا سواری کی) کیا ضرورت ہے؟"

کشف کے اقسام

آگے چل کر آپ نے فرمایا:

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں، ان کو کشف کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ کشف دو قسم کا ہوتا ہے۔ (۱) کشفِ دنیاوی ــ یہ (ان کے لئے) سراسر بے فائدہ اور بے کار ہے (۲) کشفِ اخروی ــ یہ کتاب و سنت میں ظاہر ہو چکا ہے اور عمل کے لئے کافی ہے لہذا کوئی کشف اس (کتاب و سنت کے) کشف کے مساوی اور برابر نہیں ہے۔"

مشائخ اور تبلیغی فریضہ

آپ نے مزید فرمایا:

"مشائخ کو مخلوق خدا کی تربیت اور ہدایت کے سلسلے میں ذیل کے تین امور میں سے کسی ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے:

(۱) الہام خداوندی (۲) پیر و مرشد کا حکم (۳) مخلوق پر جذبۂ شفقت۔

جب مشائخ مخلوق خدا کو گمراہی پر دیکھتے ہیں تو وہ ان سے گمراہی کے ضرر اور نقصانات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ دوزخ کے عذاب اور قیامت کے خوف و خطرات (سے انہیں بچانے کی کوشش کرتے ہیں)

لہذا ان کی شفقت کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ احکام شریعت کو رائج کریں، اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کریں تاکہ لوگ احکام و آدابِ شریعت پر اس کے حدود میں رہ کر عمل کریں اور شرعی احکام کی پابندی کریں۔ لوگوں کو 'واصل باللہ' کرانا شفقت کی شرط نہیں ہے بلکہ شفقت کا منشا پورا کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جو بیان کیا گیا ہے۔

لقمہ کی احتیاط

ملفوظات کے جامع تحریر فرماتے ہیں:

"بروز ہفتہ ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ کو زمین بوسی کی سعادت حاصل ہوئی، اس وقت لقمہ کی احتیاط کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، آپ نے فرمایا:

"صرف لقمۂ حلال پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ لکڑی، پانی اور برتن بھی حلال اور جائز ذرائع سے حاصل ہوں نیز کھانا پکانے والا بھی حق تعالیٰ کے ساتھ حضور قلب کی نسبت رکھتا ہو اور کھاتے وقت (کھانے والے) بھی حضور قلب اور خود آگاہی کے ساتھ کھانا تناول فرمائیں۔

کیونکہ لقمہ کی بے احتیاطی کی وجہ سے ایک ایسا دھواں اٹھتا ہے جو فیض کے راستوں کو بند کر دیتا ہے اور پاک روحیں، جو فیض کا واسطہ ہیں، قلب کے مقابل نہیں رہتیں۔"

مناسب غذا

آپ نے مزید فرمایا "کمزور دماغ والوں کو وہ کھانا کھانا چاہیئے جو ان کی طبیعت کے مناسب ہو اور مقوی دماغ ہو مثلاً اگر کمزور دماغ والا جَو کی روٹی کھانے لگے گا تو اس کے دماغ میں خشکی پیدا ہو گی جو فیض کے راستے کو بند کر دے گی۔"

آپ نے ارشاد فرمایا "(روحانیت کے طالبوں کے لئے) ایک خاص فیض ہے جو دماغ میں آتا ہے، جب دماغ میں خشکی ہو تو وہ فیض نہیں آتا، لہٰذا اس کھانے سے بچنا چاہیئے جو طبیعت کے موافق نہ ہو۔

اسی طرح زیادہ روزی کمانا اپنے اوپر لازم کر لینا بھی مناسب نہیں ہے یہ بھی کمزوریٔ دماغ کا باعث ہوتا ہے، بالخصوص اہل کشف کو اپنے دماغ کی تقویت کے سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے، کیونکہ دماغ کی خشکی سے کشف میں غلطی واقع ہو جاتی ہے۔"

اعلیٰ درجے کی دولت

آٹھویں مجلس میں دوران گفتگو آپ نے فرمایا: "اعتقاد کا

درست ہونا، احکام شریعت کی پابندی، اخلاص اور بارگاہِ الٰہی میں توجہ دائمی کا ہونا نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی دولت ہے، اس کے برابر کوئی (روحانی) ذوق اور وجد نہیں ہے اگر یہ حاصل ہو تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔"

توحید وجودی

نویں مجلس کا حال تحریر کرتے ہوئے جامع ملفوظات تحریر کرتے ہیں: "پھر کچھ دیر تک توحید وجودی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی اور اس اختلاف کا ذکر آیا جو شیخ علاؤالدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ محی الدین ابن عربی کے درمیان رونما ہوا۔ حضور (خواجہ صاحب) نے فرمایا:

" ان دونوں بزرگوں کے معتقد اہل علم نے اس نزاع و اختلاف کو 'جو حق تعالیٰ کے 'اطلاق' کے بارے میں ہے، لفظی اختلاف قرار دیا ہے اور یوں تحریر کیا ہے:

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے حق سبحانہٗ' کے وجود کو مطلق کہا ہے اور شیخ علاؤ الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اطلاق سے 'مطلق بشرط لاشیٔ' سمجھ کر شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ پر طعن و اعتراض کیا ہے اور خطا کار سمجھا ہے لیکن شیخ محی الدین ابن عربی کی مراد یہ نہیں ہے بلکہ آپ نے اس اطلاق سے 'مطلق لابشرط شیٔ' مراد لیا ہے۔ شیخ علاؤ الدولہ کا اعتقاد بھی یہی ہے، لہٰذا ان دونوں بزرگوں کا اختلاف معنوی نہیں ہے بلکہ لفظی ہے۔"

حضور (خواجہ صاحب) نے مزید فرمایا "یہ نزاع و اختلاف اس وقت تک دُور نہیں ہوگا جب تک کہ شیخ علاؤالدولہ رحمۃ اللہ علیہ اس بات کے قائل نہ ہو جائیں کہ خارجی موجودات صرف علمی وجود رکھتے ہیں اور صور علمیہ' ذات کے اعتبارات و شیونات ہیں۔"

کتابت ملفوظات

دسویں مجلس کے حالات میں جامع ملفوظات یوں تحریر فرماتے ہیں:

"جمعہ ۱۳ ذی الحجہ ۱۰۰۹ھ کو فقیر خدمت عالیہ میں حاضر ہوا، جب حضور نے اس فقیر کو دیکھا تو مسکرا کر فرمایا "باتیں سننے کے لئے آئے ہو؟" پھر حضور نے حاضرین میں سے

ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا:

"حضرت ابو عبد اللہ مروزی رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی مشائخ کی باتیں سنتے تو کسی شخص کو فرماتے " ان باتوں کو میرے لئے تحریر کرلو" چنانچہ انہوں نے بزرگوں کی باتیں سن سن کر، انہیں ایک کتاب کی صورت میں جمع کر رکھا تھا، جس کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دن وہ دریا کے کنارے وضو کر رہے تھے کہ وہ کتاب دریا میں گر پڑی۔ حضرت ابو عبد اللہ مروزی کو بڑا رنج ہوا، اس افسوس کی حالت میں ایک رات حضرت سہل عبد اللہ تستری کو خواب میں دیکھا، انہوں نے فرمایا:

"بزرگوں کی باتوں کے موافق عمل کرنا چاہیے صرف لکھنے سے کیا فائدہ ہے؟"

اسی خواب کی حالت میں تھوڑی دیر کے بعد حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جمال باکمال دکھایا اور حضرت ابو عبد اللہ مروزی سے ارشاد فرمایا:

"اس صدیق (یعنی حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ) سے کہہ دو "ان بزرگوں کی باتوں کو لکھنا ان کی محبت کی نشانی ہے اور ان کی محبت عین مقصود ہے۔"

عدالت میں جانا

جامع ملفوظات گیارہویں مجلس کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں:

"بروز دوشنبہ سولہویں ذوالحجہ ۱۰۰۹ھ کو بندہ مجلس عالی میں حاضر ہوا، ایک شخص دوسرے شخص پر دعویٰ کرنا چاہتا تھا مگر قاضی کی عدالت میں جانے سے شرم مانع تھی، اس لئے حضور (خواجہ صاحب) نے فرمایا:

"قاضی شریعت کا نائب ہے، جب کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہو جائے اور وہ شخص خود بھی شریعت کا پابند ہو تو اس کو قاضی کے پاس ضرور جانا چاہیئے۔"

خواجہ امکنگی کا واقعہ

اس کے بعد حضور نے فرمایا:

"حضرت خواجہ امکنگی (آپ کے پیر و مرشد) کے حضور میں موضع امکنہ میں دو آدمیوں میں جھگڑا ہوا، حضور اس معاملہ سے آگاہ تھے، جب انہوں نے فیصلہ کے لئے قاضی کی طرف رجوع کیا تو قاضی صاحب نے آپ سے شہادت طلب کی، چنانچہ حضور نے اس شخص کی حمایت میں شہادت دی جو جائز حقدار تھا۔ فریق مخالف نے کہا:

"جب تک حضور قسم نہ کھائیں، ہم ان کی شہادت نہیں مانتے۔"

حضور نے فرمایا:

"سچی قسم کھانا شریعت میں جائز ہے لہذا میں شرعی کام میں تاخیر نہیں کروں گا۔"

تین قسم کے بزرگ

تیرھویں مجلس کے حالات میں مرقوم ہے:

بروز اتوار ۲۰ شوال ۱۱۸۰ھ کو حضرت کی خدمت عالیہ میں فقیر حاضر ہوا۔ اہل اللہ کے بارے میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ حضور نے فرمایا:

"اہل اللہ کے تین قسم کے گروہ ہیں (۱) عابد و زاہد (۲) صوفیہ (۳) ملامتیہ۔

'عابد و زاہد' وہ گروہ ہے جو صرف ظاہری عبادت پر اکتفا کرتا ہے یعنی یہ لوگ فرائض و سنن بجالانے کے بعد نفلی عبادتیں اور دوسرے نیک کام بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ہر قسم کا نیک کام انجام دیتے ہیں اور خیرات بھی کرتے ہیں۔ تاہم وہ صوفیہ کرام کے ذوق و وجد سے بہرہ ور نہیں ہوتے ہیں۔ تاہم بعض عبادت گزاروں کو روحانی وجد و ذوق حاصل ہوجاتا ہے، اس وقت وہ عابدوں کے مرتبہ سے بلند ہوکر صوفیہ کے گروہ میں شامل ہوجاتے ہیں۔

'صوفیہ' وہ لوگ ہیں جو روحانی ذوق و وجد سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خوارق و کرامات کو مخلوق کی نظر سے پوشیدہ نہیں رکھتے ہیں تاہم ان تمام روحانی امور و کیفیات میں ان کی نگاہیں حق تعالیٰ کی طرف لگی رہتی ہیں۔ وہ مخلوق کو حق تعالیٰ کا ظہور جانتے ہیں اس گروہ کے بعض افراد میں کسی قدر رعونت اور رعنائی پائی جاتی ہے۔

'ملامتیہ' وہ لوگ ہیں جو عام لوگوں کے لباس میں پوشیدہ رہتے ہیں ان میں اور عوام میں بظاہر کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، لوگوں کی نگاہوں میں' وہ صرف فرائض اور مؤکدہ سنن پر اکتفا کرتے ہیں اور حتی المقدور خلوص کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے خوارق و کرامات کو ظاہر کرکے اپنے آپ کو (بزرگی میں) مشہور نہیں کرتے ہیں، اس معاملے میں وہ حضرت حق سبحانہٗ کی اتباع کرتے ہیں اور جس طرح خداوند تعالیٰ نے اپنے آپ کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ کر رکھا ہے اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی ذات کو مخلوق کی نگاہوں

سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں 'رعونت' بالکل نہیں ہوتی ہے، کیونکہ یہ لوگ مقام عبودیت کی انتہا تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔

شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور صحابہؓ میں سے حضرت صدیق اکبر اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما کو' اور مشائخ میں سے حضرت بایزید بسطامی، حضرت ابو سعید خراز اور حضرت ابو مسعود رحمۃ اللہ علیہم کو' نیز اپنی ذات کو اس قسم کے گروہ کا سردار شمار کیا ہے۔ تاہم (شیخ اکبر) دوسرے بزرگوں کے بارے میں خاموش رہے اور ان کی نفی بھی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کا طریقہ یہ ہے کہ مخصوص اوقات میں بذریعہ کشف جو کچھ انہیں معلوم ہوتا ہے، وہی لکھتے ہیں۔

نغمہ اور سماع

(آگے چل کر اسی مجلس میں) "نغمہ" کے بارے میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ حضور نے فرمایا:

"فقہاء اس کو مکروہ جانتے ہیں۔ بعض مشائخ نے اس کو مباح کہا ہے۔ لیکن مبتدی کو وہ اس کا مستحق نہیں جانتے ہیں۔ وہ لوگ جو نغمہ سننے کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس کا فائدہ اور حکمت یہ ہے کہ نغمہ سننے کے وقت طبیعت کو سکون حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے، ایسے موقعہ پر روح (لطیف) معانی کا ادراک اچھی طرح کرسکتی ہے۔

دراصل (سالک کا) محبوب مقصد معانی ہوتے ہیں۔ نغمہ کی حیثیت (مقدس الہامی کتاب) زبور کی مانند ہے اس لئے (حقیقت میں) ان (عارفوں) کا نفس نغمہ میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں تحریر ہے:

"نغمہ سننے کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ سننے والے پر حق تعالیٰ کی محبت غالب ہو۔"

اس موقع پر فقیر (جامع ملفوظات) نے عرض کیا: "حق تعالیٰ سے محبت کرنے والے کی علامت کیا ہے؟" آپ نے فرمایا:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل فرماں برداری اور اتباع کامل (محبت خداوندی کی علامت) ہے۔

فضائل صحابہؓ جامع ملفوظات چودھویں مجلس کے حالات میں یوں تحریر فرماتے ہیں:
"بروز جمعہ ۱۹ ربیع الاول سنہ ۱۱۸۶ھ کو حضور کی قدم بوسی نصیب ہوئی، (اس وقت) حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فضائل سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ حضور نے فرمایا:

"چاروں صحابۂ کرام (خلفائے راشدین) ترتیب وار اقطاب مطلق تھے۔ تاہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے فضائل بکثرت اس لئے (کتابوں میں) مذکور ہیں کہ بنوامیہ کی خلافت کے زمانے میں خارجی لوگ بہت زیادہ ہو گئے تھے، اس لئے بزرگان سلف کو اہل بیت کے فضائل بیان کرنے کی زیادہ ضرورت محسوس ہوئی اور اسی وجہ سے کتابوں میں ان کے فضائل زیادہ مذکور ہیں۔"

خوارق و کرامات اس کے بعد خوارق و کرامات کے بارے میں گفتگو ہونے لگی، حضور نے فرمایا:

"صحابۂ کرام کے زمانے میں خوارق (کرامات) کا اس قدر ظہور نہیں تھا جس قدر کہ بعد کے زمانے میں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص (روحانی) کمالات کی انتہا تک پہنچ جائے اس کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی (غیر معمولی) تصرف (کرامت) ظاہر نہیں ہوتا ہے تاہم پیغمبروں سے ان کے ارادے کے بغیر خوارق (غیر معمولی واقعات اور معجزات) ظاہر ہو جاتے تھے اور بعض اوقات جب کفار ان (کی نبوت) کا انکار کرتے تھے تو ان کے تصرف و خواہش کے بغیر کوئی معجزہ نمودار ہو جاتا تھا۔"

انکارِ مشائخ پھر انکار مشائخ کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو حضور نے فرمایا:
"اولیائے کرام، کبیرہ گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی وجہ سے ان کے (روحانی) احوال کے باطل ہو جانے کا فیصلہ کرنا جہالت اور کم فہمی پر مبنی ہے بلکہ اس وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ اکثر اور دائمی طور پر

کس (روحانی) مقام اور منزل پر فائز ہیں؟ اس کے بعد اگر بہ تقاضائے بشریّت، ان سے کوئی قصور سرزد ہو جائے تو انہیں معذور سمجھنا چاہیئے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ

بعض مشائخ کو لوگ ان کی زندگی میں زندیق اور بے دین کہتے رہے ہیں، جیساکہ حضرت ذوالنون مصری کو ان کے زمانے میں لوگ (زندیق اور بے دین) کہتے تھے۔ تاہم حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کو مرنے کے بعد قبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ (اپنی زندگی میں) دنیاوی کاموں سے الگ تھلگ اور مبرّا تھے۔ اگر وہ دنیادار ہوتے یعنی بادشاہ یا بادشاہ کے وزیر ہوتے تو اس انکار کی وجہ سے جو ان کی زندگی میں لوگ کیا کرتے تھے، کوئی شخص انہیں بزرگ تسلیم نہیں کرتا اور موت کے بعد بھی وہ لوگوں کے طعن و ملامت سے نہ بچ سکتے۔"

اصل ایمان

آپ نے مزید فرمایا:
"صحابہ کرامؓ کے بارے میں گفت گو کرنا، اصل دین و ایمان میں داخل نہیں ہے۔ بہت سے مؤمن ایسے بھی ہیں جو خدا و رسول کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے تاہم ان کے ایمان میں کوئی شبہ نہیں ہے۔"

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

عہدِ اوّل کے بزرگانِ دین

وقار راشدی ایم، اے

تحقیق و تفتیش سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ صوفیائے کرام، اولیائے عظام اور مشائخِ دین عرب اور دیگر ممالک سے چاٹگام کے راستے سرزمین بنگال میں تشریف لائے اور انہوں نے تبلیغِ دین واشاعتِ اسلام کے لئے زندگی وقف کردی اس نیک و عظیم مقصد کے لئے وہ کبھی چین سے نہ بیٹھے بلکہ بنگال کے مختلف علاقوں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ اور قصبہ قصبہ کی سیر و سیاحت کی، جہاں جہاں بھی گئے توحید و تصوّف کا چراغ جلاتے گئے، حقائق و معارف کے پھولوں سے روحوں کو معطّر اور دلوں کو ایمان کی خوشبوؤں سے معمور کرتے گئے۔ ان کا مقصدِ حیات، عبادتِ الٰہی، اتباعِ رسولؐ، اور مطمعِ نظر خدمتِ خلق اور ترویج انسانیت تھا۔ انہوں نے اپنے مشن کو آگے بڑھانے اور دینِ الٰہی کو فروغ دینے کی غرض سے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا بلکہ اپنی محنت و تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

اکثر بزرگانِ دین نے چاٹگام میں قیام فرمایا۔ جن حضرات نے چاٹگام کی سرزمین کو مستقل سکونت تجارت اور تعلیمات کے لئے منتخب فرمایا، ان میں بارہ اولیائے کرام زیادہ نامور ہیں۔

غالباً انہیں پرستارانِ توحید کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی میں چاٹگام کو "بارہ اولیاء کی سرزمین" بھی کہتے ہیں۔ ان بارہ اولیائے کرام میں حضرت سلطان بایزید بسطامی چاٹگامی کا رتبہ بہت بلند ہے۔ یہ بارہ اولیاء ایک ساتھ بنگال نہیں آئے تھے بلکہ دو دو تین تین کی ایک ایک جماعت آتی رہی اور چراغ توحید روشن کرتی رہی۔

اوّل اوّل جو بندگانِ خدا چاٹگام کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں میں سکونت پذیر ہوئے ان میں حضرت شاہ بدرالدین عالم زاہدی، حضرت قتل پیر اور حضرت شاہ محسن عالیہؒ تھے۔

قارئین کرام حضرت شاہ بدرالدین عالم زاہدی کا تذکرہ 'الرحیم' کے شمارے ستمبر ۶۷ء میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ آج کی نشست میں حضرت بایزید بسطامیؒ، قتل پیرؒ اور حضرت محسن عالیہ کے علاوہ اور چند بزرگوں کے حالات نذرِ ناظرین کئے جائیں گے۔

حضرت سلطان بایزید بسطامیؒ

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام میں حضرت سلطان بایزید بسطامیؒ کا نام نامی و اسم گرامی کافی معروف ہے۔ آپ چاٹگام کے ممتاز صوفی ہی نہ تھے بلکہ آپ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے ممتاز بزرگانِ دین، عارفان کامل اور مرشدانِ عامل میں ہوتا ہے۔ آپ نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں چاٹگام اور نواح چاٹگام کے علاوہ بنگال کے مختلف اضلاع کی سیر و سیاحت کی۔ جہاں جہاں بھی گئے کفر و الحاد کی ظلمتوں میں مشعل توحید روشن کی۔ آپ کے دم سے علم و عرفان کی فضا پیدا ہوئی، کتنے ہی بت پرست اور آتش پرست آپ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آج بنگال کے گوشے گوشے میں ضیائے حق اور انوار محمدی کی جو روشنی نظر آتی ہے وہ حضرت سلطان بایزید بسطامیؒ جیسے پروانۂ توحید کا کرشمہ ہے۔

آپ کا پورا نام سلطان عارفین برہان المتشین تھا۔ آپ حضرت علامہ الٰہی بایزید بسطامی کے خلیفہ تھے۔ آپ شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے جب دنیاوی جاہ و حشمت سے جی چھوٹا تو تخت و تاج سے منہ موڑا اور خوشنودئ الٰہی کی خاطر لبادۂ فقر اوڑھا۔ آپ کے متعلق عوام تو عوام مؤرخوں میں بھی بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض نے

آپ کو بوگرہ کے حضرت شاہ بلخی سے تعبیر کیا ہے اور بعض آپ کو بایزید بسطامی نام کے دوسرے صوفی سے منسوب کرتے ہیں جو کبھی بنگال نہیں آئے تھے۔

"مشرقی بنگال کی کہانیاں" (بنگلا نسخہ) کے مصنف رقمطراز ہیں کہ شاہ بلخی اور سلطان بایزید بسطامی دو نام کے ایک ہی بزرگ تھے، انہوں نے پہلے بوگرا میں قیام کیا اور بعد میں چاٹگام کو مسکن بنایا۔ مذکورہ کتاب میں ایک شعر درج ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ؎

نصیر آباد میں سلطان نامی جو درویش آسودہ ہیں وہ دیس
دیس سے ہو کر آئے ہیں، مرد مومن اور سچّے مسلمان ہیں۔

لیکن تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ مہستان بوگرا کے سادھو حضرت شاہ بلخی کا نصیر آباد کے صوفی حضرت سلطان بایزید بسطامی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دونوں بزرگ دو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اول الذکر بوگرہ میں مدفون ہیں اور آخر الذکر بسطام میں آسودہ ہیں۔ مستند تذکروں میں حضرت سلطان بایزید بسطامی طیفور بن عیسیٰ بن آدم بن سروشان نام کے ایک اور بزرگ کے حالات ملتے ہیں لیکن بنگال سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

حضرت سلطان بایزید بسطامی کو حضرت ابو علیؒ سے شرفِ تلمذ تھا جو سیندھور کے رہنے والے تھے، آپ نے انہیں کے زیر عاطفت تصوّف و عرفان کا درس لیا اور علومِ باطنی سے فیض یاب ہوئے جب اسرار و رموز سے واقف اور امورِ دینی سے آشنا ہوگئے تو آپ کے استاذِ معظم حضرت ابو علیؒ نے ہدایت فرمائی:

"بنگال جاکر خدمتِ خلق اور عبادتِ خالق میں اپنی زندگی گزار دو"

آپ نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل اور مشیتِ ایزدی کی تکمیل کی غرض سے قصدِ بنگالا فرمایا۔ آپ بنگال میں اس زمانے میں تشریف لائے جب وہاں کفر و شرک کا دور دورہ تھا۔

بنگال میں ورودِ مسعود سے متعلق مختلف کہانیاں ہیں لیکن تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ نویں صدی عیسوی کے اخیر میں چاٹگام کے ایک قصبہ نصیر آباد میں تشریف

لائے، نصیر آباد کی ایک پہاڑی پر قیام فرمایا اور یہیں آپ کی خانقاہ تھی۔ یہ مقام شہر چاٹگام سے پانچ میل دور شمالی جانب واقع ہے۔ گھنے جنگلوں اور وحشتناک فضاؤں میں گھرا تھا۔ یہاں وحشی جانوروں اور خطرناک درندوں کا بسیرا تھا۔ خبیثوں اور جنوں کا مسکن تھا۔ لیکن قوّتِ ایمان رکھنے والے مؤمن ہر خطرناک قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں، چنانچہ بلاخوف وخطر آپ اسی ویران وسنسان پہاڑی پر ریاضت وعبادت میں مصروف رہتے۔ رات کے وقت ایک دیپ (مٹی کا چراغ) جلا لیتے۔ چراغ ٹمٹماتا رہتا اور آپ یادِ الٰہی میں مست رہتے۔ کیا آندھی کیا طوفان، ہر حال اور ہر موسم میں یہ چراغ جلتا رہتا۔ یہ چراغ آج تک نصیر آباد کی پہاڑی پر آپ کے حجرے میں آپ کی مستقل مزاجی، عزم راسخ اور خدا پرستی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ وہ چراغ ہے جس سے دین وایمان کے کتنے ہی چراغ جلتے رہے اور کفر وشرک کی تاریکی دور ہوتی رہی۔ قلوبِ انسانی انوارِ محمدیؐ اور تجلیاتِ خداوندی سے منوّر ہو گئے۔ بزرگانِ دین کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ بُت کدوں میں اسلام کا جھنڈا لہرایا اور توحید ورسالت کا چراغ جلایا ؂

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہَوا تیز ہے زمانے کی

حضرت بایزید بسطامی کو شروع سے علمِ باطنی اور فنِ تصوّف سے شغف تھا۔ آپ نے ہمیشہ خدمتِ خلق پر زور دیا اور تعلیماتِ دینوی کو عام کیا۔ تصوف کے متعلق آپ کی رائے گرامی ہے:

"تصوّف ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔"

مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان خودی میں ڈوب نہ جائے خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ بقولِ اقبال ع

اپنی خودی میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

آپ بڑے صاف دل اور صاحب گو بزرگ تھے۔ اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کو ہدایت فرماتے:

"سچائی کو اپنا شعار بناؤ۔ سچائی کے راستے میں اگر
ضرورت ہو تو جان کی بازی سے بھی دریغ نہ کرو۔"

نصیر آباد کی جس پہاڑی پر حضرت سلطان بایزید بسطامی کا آستانہ تھا اس کے دامن میں ایک تالاب ہے وضو کے لئے اس میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، اس تالاب میں بڑی بڑی مچھلیاں اچھلتی کودتی اور بڑے بڑے کچھوے چلتے پھرتے اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کچھوؤں کو مقامی زبان میں "پجاری و مجاری" یعنی مجاور کہتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ کچھوے حضرت بایزید بسطامی کے مزار کے مستقل پاسبان و نگہبان ہیں۔ ان کچھوؤں کے بارے میں عجیب عجیب قصّے کہانیاں مشہور ہیں۔

ایک روایت (جو غیر مستند ہے) یہ ہے کہ یہ کچھوے دراصل جنّ تھے۔ حضرت بایزید بسطامی کو عبادت کے وقت ستایا کرتے تھے۔ ایک بار آپ اللہ سے دست بہ دُعا ہوئے:

"بارالہا! یہ جنّ تیری عبادت کے دوران مخل ہوتے ہیں ان سے نجات دلا۔" چنانچہ اللہ کے حکم سے یہ جنّ کچھوے بن گئے، حقیقت کیا ہے، اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ واللہ اعلم بالصّواب

اوپر جس تالاب کا ذکر کیا گیا ہے اس سے متصل ایک مسجد ہے، کہتے ہیں کہ یہ مسجد دورِ مغلیہ کی یادگار ہے اس مسجد کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی قائم ہے۔

پہاڑی پر جو مزار نظر آتا ہے، وہ حضرت سلطان بایزید بسطامیؒ کا بتایا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مزار نہیں بلکہ اس جگہ کو مزار کی سی شکل دے دی گئی ہے، اصل میں آپ یہاں چلّہ کیا کرتے تھے۔

آپ کا سن ولادت ۱۲۸ھ اور سن وفات ۲۶۱ھ ہے۔ آپ کی وفات کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، کسی نے سن وفات ۸۷۴ء مطابق ۱۵ شعبان المعظم ۲۶۱ھ لکھا ہے، کسی نے ۸۴۸ء تحریر کیا ہے لیکن ۸۷۴ء کے بارے میں اکثر سوانح نگاروں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔

تواریخ وتذکروں سے حضرت بایزید بسطامی بنگال میں آمد وسکونت ثابت ہے، یہ وہی بزرگ ہیں جو ایران سے آئے تھے اور آپ کا وصال بھی ایران ہی میں ہوا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ آپ کی وفات بنگال میں ہوئی لیکن اس بات کی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کی زیارت گاہ وقف اسٹیٹ کے ماتحت ہے مذکورہ بالا مسجد اور تالاب کے سارے انتظامات اسی ادارے کے سپرد ہیں۔ زائرین صرف بنگال ہی نہیں بلکہ پاک وہند کے گوشے گوشے سے آتے اور آپ کی زیارتِ مقدس سے روحانی مسرّتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

حضرت قتل پیرؒ

حضرت قتل پیرؒ کا اصل نام معلوم نہ ہو سکا۔ آپ اسی نام سے معروف ہیں۔ آپ کے نام کی تاویل بھی عجیب بتائی جاتی ہے، کہتے ہیں کہ موصوف قتل[۱] نامی مچھلی کی پیٹھ پر بیٹھ کر چاٹگام پہنچے تھے، لیکن راقم کے خیال میں یہ ایک غیر مستند روایت ہے اور درایت کی رو سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ یہ واقعہ کچھ عقلِ سلیم کے خلاف بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ حضرت شاہ بدر عالم زاہدیؒ کے ہمراہ بنگال آئے اور چاٹگام کی اس پہاڑی پر اقامت پذیر ہوئے جہاں حضرت بدر کو مگ قبیلہ کے وحشی وناشائستہ افراد سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ اور معرکۂ خیر وشر میں حضرت قتل پیر بھی حضرت شاہ بدر کے برابر شریک تھے۔ حضرت قتل پیر نہایت نڈر، بہادر، جنگجو اور سراپا اخلاص وایثار تھے۔ انہوں نے بے شمار مگ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس طرح "قتل پیر" کے نام سے مشہور ہوئے۔ چاٹگام میونسپلٹی کے شمالی جانب آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

حضرت شاہ محسن عالیہ

حضرت شاہ محسن عالیہ کا مزار پُرانوار پہلے تھانہ جھیاری نام کے دیہات میں تھا بعد میں آپ کی لاش کو

---

[۱] یہ ایک قسم کی مچھلی ہے، جسے بنگال میں "قتلا مچھلی" کہتے ہیں۔

وہاں سے نکال کر ایک دوسرے گاؤں بٹ تالا میں دفن کیا گیا۔

یہ واقعہ بنگال میں سینہ بسینہ چلا آتا ہے کہ حضرت پیر بدر شاہؒ، حضرت قتل پیر اور حضرت شاہ محسن عالیہ پہلے پہل پانی پت سے ہوتے ہوئے گوڑ میں پہنچے۔ گوڑ میں آپ زیادہ عرصہ نہ رہے بلکہ وہاں سے ڈھاکا آئے۔ ڈھاکے میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ندی کے راستے چاٹگام پہنچے۔

حضرت شاہ محسن عالیہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ مزمل بی بی کے نام سے آپ کی رفیقۂ زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ آپ کے ایک برادر زادہ کا نام شاہ سکندر تھا۔ آپ نے ان کی شادی ایک لڑکی سے کرادی تھی، لیکن یہ جوڑا تھوڑے ہی دنوں میں لاپتہ ہوگیا جب ان کا کوئی سراغ نہ ملا تو حضرت شاہ محسن عالیہ اپنے بھتیجے اور دلہن کی تلاش میں کشاں کشاں پہلے پانی پت پھر بنگال پہنچے۔ خدا کا کرنا کہ بنگال میں آپ کے کھوئے ہوئے عزیز مل گئے۔ ان لوگوں نے آپ کی خدمت میں گزارش کی کہ وطن واپس چلیں لیکن آپ رضامند نہ ہوئے، آپ نے فرمایا:

"اللہ کے لئے نکل آیا ہوں، اب یہی میرا وطن ہے، یہی میرا مسکن ہے"۔

پھر آپ آخری وقت تک وطن واپس نہیں گئے۔ سکندر شاہ اور ان کی شریکِ زندگی بھی وہیں رہ گئے اور اپنے بزرگ چچا کی خدمت میں زندگی صرف کردی۔ ان کی اولاد میں صرف شاہ قطب الدین کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت شاہ ملّا مسکینؒ

مذکورہ بالا اولیائے کرام کے علاوہ حضرت شاہ ملّا مسکینؒ نامی ایک اور درویش قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی سکونت ومدفن چاٹگام ہے۔ حضرت شاہ ملّا مسکینؒ، حضرت پیر شاہ بدر عالم زاہدیؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی گزرے ہیں۔ چاٹگام میونسپلٹی سے متصل چندی پور نامی ٹیلے پر آپ کا مزارِ مبارک زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ آپ کے مزار مبارک کے آس پاس اور چند بزرگانِ دین کے مزارات ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں حضرت شاہ نور، حضرت شاہ اشرف، حضرت شاہ کاکوئی، حضرت بندہ رضا۔ اور حضرت شاہ مبارک علی۔

بزرگانِ دین کا فیض صرف چاٹگام نہیں بلکہ مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں بھی جاری و ساری رہا ہے۔ چاٹگام کے علاوہ ڈھاکا، سلہٹ، نواکھالی، سندیپ وغیرہ بھی توحید و تصوف، اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور علم و عرفان کے مرکز رہے ہیں۔

ذیل میں چند ایسے شیدائیانِ اسلام کا تذکرہ پیش کیا جاتا ہے جن کی خدمتِ دین کے پیشِ نظر ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

حضرت شاہ حلیم الدین قریشی

انہیں بندگانِ خدا میں ایک بزرگ حضرت شاہ حلیم الدین قریشی تھے۔ آپ حضرت شاہ جلال کے مریدوں میں تھے۔ نارنول بھارت کے رہنے والے تھے۔ تلاشِ حق میں حضرت شاہ جلال کے ہمراہ سلہٹ تشریف لائے تھے۔ آپ کا مزارِ مبارک مولو ندی کے کنارے واقع تھا۔ لیکن طوفان اور بارش کی وجہ سے مولو ندی کا وہ ساحلی حصّہ پانی کی نذر ہوگیا اور اسی طرح آپ کا مزار مبارک غرق آب ہوگیا۔

شاہ حلیم الدین قریشی کلھوڑہ ریلوے اسٹیشن سے کئی میل دور کھائی ندی کے کنارے اقامت پذیر تھے۔

حضرت محمد زکریا قریشی، حضرت داؤد بخش خطیب، حضرت شیخ علی یمنی بھی حضرت شاہ جلالؒ کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ حضرت زکریا کا مزار کینیا ندی کے جنوبی جانب ہے، یہ مزار 'عربی مزار' کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت شیخ علی یمنی کا مزار حضرت شاہ جلال کی درگاہ کے احاطہ میں مشرقی جنوبی حصّہ میں واقع ہے۔

حضرت داؤد بخش داؤد زئی پرگنہ میں مکین تھے اور وہیں ان کا مدفن ہے، آپ نے کئی ایک ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

حضرت جھنڈا جھلمک کا مزار سلہٹ کے قصبہ محلّہ رائے پور میں، حاجی غازی کا مزار قصبہ سلہٹ محلّہ عیدگاہ کے شمال میں ہیں۔

حضرت شیخ پیر علی کا مزار اشرف علی مرحوم دار کے مکان کے مغربی جانب ہے۔

حضرت شاہ فرید روشن چراغ کا مزار حضرت جلال کی مرقد کی طرف ڈیوڑھی کے مغربی راستے کی طرف واقع ہے۔

حضرت پیر برہان الدین کا نام نامی اسم گرامی اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے حضرت جلال کو سلہٹ آنے کی دعوت دی تھی، ان کی آخری آرامگاہ کوش کھائیڈ کے صاحب بازار میں واقع ہے۔

ان حضرات کے علاوہ سرزمین سلہٹ میں جو اللہ والے مدفون ہیں ان میں حضرت نوراللہ عرف شاہ نور کی ابدی آرامگاہ کائیاں پتی کے جنوبی گوشہ محلہ یادر قصبہ سلہٹ میں واقع ہے۔

ایک اور بزرگ ہیں جو پیر مانک یا مانک پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ سلہٹ میں ایک علاقہ آپ کے نام سے منسوب ہے جو مانک پیر کا محلہ کہلاتا ہے۔

ان کے علاوہ جو بزرگانِ دین ناقابلِ فراموش ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ سید ابوبکر حاجی یوسف۔ حاجی دریا کا مزار حضرت جلال کی عبادت گاہ کے شمالی جانب اور حاجی یوسف کے مقبرے کے برابر واقع ہے۔ حاجی خلیل کا مزار حاجی دریا کے مزار کے مغربی جانب ہے۔

گوڑ کی تاریخ کی اوراق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں بارہ[۱۲] صوفیائے کرام اور مشائخ اسلام دین کی اشاعت کے سلسلے میں پاک بنگالا کے دکھن پورب کے علاقے میں تشریف لائے ان میں حضرت بختیار میور نے سندیپ کے علاقے کو اپنے قیام کے لئے پسند فرمایا اور وہیں اقامت پذیر ہوئے۔ آج سندیپ میں جو پرستارانِ اسلام اور مسلمان نظر آتے ہیں وہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سندیپ میں ایک گاؤں روحانی کے نام سے موسوم ہے اس زمین کے آغوش میں حضرت بختیار میسور آرام فرما رہے ہیں۔ آپ کی درگاہ کی حالت آج بھی اچھی ہے۔ سندیپ کے لوگ اپنے بانیٔ اسلام کے مقبرے پر نذرانۂ عقیدت پیش کرتے اور روحانی مسرتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

ضلع نواکھالی کے مشرقی جنوبی حصہ میں "ہری پور" نام کا ایک گاؤں ہے اس گاؤں

کے میاں باڑی نامی محلّے میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں و برکتیں جس بزرگ مکرم کی بدولت نازل ہوئیں وہ حضرت احسن عرف حسن شاہ ہیں، آپ کا آستانہ پہلے کاؤبند حسین پھوئیاں ندی کے پار تھا اور وہیں آپ ریاضت میں مصروف رہتے لیکن وہاں لوگ انہیں عبادت کے وقت بہت تنگ کرتے اور ہمیشہ عبادت میں مخل ہوتے، اس لئے آپ نے اپنا آستانہ تبدیل کرلیا اور ہری پور میں رہنے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب تختِ دہلی پر سلطان رکن الدین فیروز شاہ رونق افروز تھا۔

شہر نواکھالی کے مغربی جانب مولانا یعقوب نوری کا مزار مبارک ہے اور شہر کے وسط میں جو مزار ہے وہاں مولانا عبداللہ صاحب آسودہ ہیں۔ مولانا عبداللہ صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ آپ نے سعداللہ پور کے پیر حضرت مولانا امام الدین سے بیعت کی تھی اور آپ کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ صاحب ہی مسندِ خلافت پر جاگزیں ہوئے۔

پروفیسر وائی۔ ایس۔ طاہر علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) یاظبیۃً اشبہ شیٔ بالمہا ترعی الخزامی بین اشجار النقا[1]

اے ہرنی تو جنگلی گائے سے قدرے مشابہت رکھتی ہے جو ریتیلے ٹیلوں پر خوشبودار گھاس چر رہی ہو۔

(۲) إمّا ترای راسی حاکی لونہٗ طرّۃ صبح تحت اذیال الدجیٰ

اگر تو میرے سر کو دیکھے جس کا رنگ شفق کے مانند ہے جو تاریکی کے دامن میں ہے۔

(۳) واشتعل المبیضُّ فی مسودہٖ مثل اشتعال النار فی جزل الغضا

اور میرے سر کی سیاہی میں سفیدی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح کہ جھاؤ کی لکڑیوں میں آگ لگے اور شعلے بھڑکیں۔

(۴) فکان کاللیل البہیم حلّ فی ارجائہا ضوءُ صباحٍ فانجلی

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ شعر ابن درید کا نہیں بلکہ ابن الانباری کا ہے۔ لیکن بغیۃ الوعاۃ میں سیوطی نے لکھا ہے کہ کمال ابن الانباری نے اس شعر اور اس کے بعد والے شعر کو اپنے مقصورہ میں شامل کرلیا ہے۔

میرے سر کی سیاہی شب تاریک کے مانند ہے اس کے کناروں پر صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی اور شب دیجور ختم ہو گئی۔

۵) وَغَاضَ مَاءَ شَرَّتی دھرٌ رمی خواطِرَ القلبِ بتبریحِ الجوی

اب میری جوانی کا آب و تاب ختم ہونے لگا۔ اور زمانہ نے دِل کو سخت مصائب کا ہدف بنا لیا

۶) واض روض اللّھو یبسًا ذاوِیًا من بعد ماقد کان مجاج الثّری

میری جوانی کا سرسبز و شاداب باغ اب کمہلانے لگا۔

۷) وَضَرَّمَ النأی المُشِتُّ جذوۃً مَا تاتلی تسفع اثناءَ الحشا

آتش فراق نے دِل و جگر کو کباب بنا دیا ہے۔

۸) وَاتّخذ التسھید عینیّ مألفًا لمّا جفا اجفانھا طیف الکری

جب سے پلکوں نے نیند کا خیال چھوڑا ہے میری آنکھیں لذّتِ خواب سے محروم ہو گئیں۔

۹) فکلُّ مالاقیتہ مغتفرٌ فِی جنب ما اسارہ شحطُ النّوی

ہجر کے آلام کے مقابلے میں دوسری مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

۱۰) لولابس الصخر الاصمّ بعضُ ما یلقاہ قلبی فضّ اصلاد الصَّفا

جو کچھ دل ناتواں پر گزرا، اس کا عشر عشیر بھی چٹانوں پر گزرتا تو پرخچے اڑا دیتا۔

۱۱) اذا ذوی الغصن الرطیب فاعلمن ان قصاراہ نفادٌ وتوی

جب ہری بھری ٹہنی خشک ہونے لگے تو سمجھ لو کہ اس کا انجام ہلاکی ہے۔

۱۲) شجیت لابل اجرضتنی غصۃ عنودھا اقتل لی من الشجا

میں غمناک ہوا بلکہ موت کے خیال نے میرا گلا گھونٹ رکھا ہے اس کا مقابلہ کرنا میرے لئے زیادہ خطرناک ہے بہ نسبت غم و اندوہ کے۔

۱۳) ان یحیم عن عینی البکاء تجلّدی فالقلب موقوف علی سبیل البکا

اگر صبر کرنے کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو نظر نہیں آتے تو دل میرا خون خون ہے۔

۱۴) لوکانت الاحلام ناجتنی بما القاہ یقظان لاصمانی الرّدی

اگر خواب میں مجھے وہ چیزیں دکھاتی دیتیں جو میں بیداری میں دیکھ رہا ہوں تو میں وہیں

خواب میں جان دے دیتا۔

(۱۵) منزلة ما خلتها یرضی بها لنفسه ذوأرب ولا حجا

یہ ایسا مرحلہ ہے جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی عقلمند اور دانا آدمی اپنے لئے پسند نہیں کرے گا۔

(۱۶) شیم سحاب خلب بارقه وموقف بین ارتجاء ومُنی

یہ ایسا ہی ہے کہ ایک بادل دیکھا جائے جس میں بجلیاں کوندتی ہوں اور لیت ولعل میں وقت گزارا جائے۔

(۱۷) فی کل یوم منزل مستوبل یشتف ماء مهجتی او یجتوی

ہر روز ایک وبال اور مصیبت درپیش ہے جو میرا خونِ جگر پیتی ہے۔

(۱۸) ما خلت ان الدهر یثنینی علی ضرّاء لا یرضی بها ضبّ الکدی

مجھے یہ وہم وگمان ہی نہ تھا کہ زمانہ مجھے ایسی سنگلاخ زمین کی طرف لے جائے گا جسے گوہ (جانور) بھی ناپسند کرے گی۔

(۱۹) ارمّق العیش علی برض فان رمت ارتشافا رمت صعب المنتشی

میں تھوڑی سی چیز پر اپنا گزارہ کرلیتا ہوں۔ اگر میں ساری کی ساری نگل جانے کا خیال کروں تو یہ بوالہوسی ہوگی۔

(۲۰) اُراجع لی الدهر حولاً کاملاً إلی الذی عوّد ام لا یُرتجی

کیا گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ سکتا ہے اور وہ باتیں میسّر ہوسکتی ہیں جن کے ہم خُوگر ہوچکے ہیں یا نہیں؟

(۲۱) یا دهر ان لم تک عتبی فاتئد فان ارواد ک والعتبی سوا

اے زمانہ! اگر تو باوجود میری بدحالی کے مجھ سے رضامند نہیں ہے تو ذرا نرمی سے کام لے۔ کیوں کہ تجھ سے مہلت مانگنا مترادف ہے تیری گھُڑکیاں سُننے کے۔

(۲۲) رفّه علیّ طالما انصبتنی واستبق بعض ماء غصن ملتحی

اے زمانہ! مجھ پر اتنی دیر نرمی کر جتنی دیر کہ تو نے مجھ کو ستایا ہے اور چھیلی ہوئی ٹہنی کا

کچھ پانی تو باقی رکھ۔

(۲۳) لا تحسبن یا دھر انی ضارع لنکبة تعرقنی عرق المدی

اے زمانہ! کبھی بھولے سے یہ خیال نہ کرنا کہ میں ان مصیبتوں میں سینہ سپر ہونا نہیں چاہتا جو چھریوں کی طرح میری ہڈیوں کے اوپر سے گوشت اُتارتی ہیں۔

(۲۴) مارست من لو ھوت الافلاک من جوانب الجو علیه ما شکی

اے زمانہ! تجھے ایسے انسان سے پالا پڑا ہے جس پر اگر آسمان بھی بایں ہمہ وسعت اُس پر ٹوٹ پڑے تو اُف نہ کرے گا۔

(۲۵) لکنّھا نفثة مصدور اذا جاش لغام من نواحیھا غما

لیکن یہ پیمانہ کا چھلکنا تو ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک پھیپھڑے کا مریض تھوکے جب کہ سینہ میں چاروں طرف بلغم کا زور ہو۔

(۲۶) رضیت قسرا وعلی القسر رضی من کان ذا سخط علی صرف القضا

مجبوری کا نام صبر ہے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ گردشِ تقدیر سے کون نالاں رہے؟

(۲۷) انّ الجدیدین اذا ما استولیا علی جدید أدنیاہ للبلی

لیل ونہار کا دستور ہے کہ وہ ہر نئی چیز کو اپنے اثر ورسوخ سے بوسیدہ کر دیتے ہیں۔

(۲۸) ما کنت ادری والزمان مولع بشتّ ملموم وتنکیث قوی

کیا خبر تھی کہ زمانہ جمعیت کو بکھیرنے پر اور قوّتوں کو زائل کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔

(۲۹) انّ القضاء قاذفی فی ھوّة لا تستبلّ نفس من فیھا ھوی

اور کیا خبر تھی کہ قسمت مجھے ایسے گڑھے میں دھکیل دے گی کہ جس سے کوئی صحیح وسالم نہیں نکل سکتا۔

(۳۰) فإن عثرت بعدھا ان واءلت نفسی من ھاتا فقولا لالعا

اگر اِن مصائب سے مجھے نجات حاصل ہو اور پھر دوبارہ مجھے ٹھوکر لگے تو بے شک تمہیں یہ کہنے کا حق ہے کہ "تیرا بھلا نہ ہو"!

(۳۱) ان تکن مدتھا موصولة بالحتف سلّطت الاسی علی الاسی

اور اگر جیتے جی مصیبت ہی کا سامنا ہے تو پھر مجبوری ہے۔اور سوائے صبر کوئی چارہ نہیں۔

(۳۲) ان امرأ القیس جری إلی مدی فاعتاقه حمامه دون المدی

بے شک امرؤ القیس[1] اپنے حصولِ مقصد کے لئے آگے بڑھا مگر موت اُس کی آرزوؤں کے آڑے حائل ہو گئی۔

(۳۳) وخامرت نفس ابی الجبر الجوی حتی حواه الحتف فیمن قد حوی

ابو الجبر[2] نے پیٹ کی مصیبت مول لی۔اور موت نے اُسے اوروں کے مانند آن گھیرا۔

(۳۴) وابن الاشج القیل ساق نفسه الی الردی حذار اشمات العِدی

ابن الاشج[3] نے دشمنوں کی انگشت نمائی سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو موت کے گھات اُتار دیا۔

(۳۵) واخترم الوضّاح من دون التی امّلها سیف الحمام المنتضی

موت کی برہنہ شمشیر نے وضاح[4] کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

(۳۶) فقد سما قبلی یزید طالبًا شأو العلی فما وهی ولا ونی

مجھ سے پہلے یزید بن مہلب[5] نے بھی بلندی حاصل کرنا چاہی اور کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

(۳۷) فاعترضت دون الذی رام وقد جدّ به الجدّ اللهیم الاربی

مصائب اور آلام اُس کے ارادوں کے آڑے آگئیں اور اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی۔

---

[1] مشہور جاہلیت کا ایک شاعر ہے جس کے بارے میں حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا "اشعرهم وقائدهم الی النار"۔

[2] یہ ایک بادشاہ جس نے ایران سے مدد لی اور ایرانی سپاہیوں نے اُسے زہر پلا کر موت کے گھات اُتار دیا۔

[3] حجاج بن یوسف نے اسے سجستان کا گورنر بنایا تھا۔لیکن اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور جب حجاج کے لشکر کا مقابلہ نہ کر سکا تو ترکوں سے مدد مانگی اور بالآخر اسے حجاج کے لشکر نے گرفتار کر لیا۔جب اُسے حجاج کے پاس لے جارہے تھے اس نے مکان پر سے جست لگائی اور ہلاک ہو گیا۔

[4] یہ جذیمہ بن مالک الازدی ہے جسے لوگ خوف کے مارے الابرش یا الوضّاح کہا کرتے تھے۔اس نے زبّاء کے باپ کو مارا تھا اور زبّاء نے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینے کے لئے اُس سے شادی کی۔

[5] یزید بن مہلّب نے بنو امیّہ کے خلاف بغاوت کھڑی کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

(۳۸) هل انا بدعٌ من عرائین علا　　جار علیهم صرف دهرٍ واعتدی

کیا میں ان شرفا میں پہلا شخص ہوں کہ جس کو زمانے نے تختۂ مشق بنایا ہو۔

(۳۹) فان انالتنی المقادیر الذی　　اکیده لو آل فی رأب الثأی

اگر مقدر نے مجھے اپنا مطلوب حاصل کرنے دیا تو میں رفوگری میں کوتاہی نہ کروں گا۔

(۴۰) وقد سما عمرٌو الی اوتاره　　فاحتط منها کل عالی المستمی

عمرو بن ربیعہ[1] بھی انتقام لینے کے لئے نکلا اور بلند حویلیوں میں رہنے والوں کو چیلنج دے کر نیچے اُتارا۔

(۴۱) فاستنزل الزبّاء قسرًا وهی من　　عقاب لوح الجوّ أعلی منتمی

اُس زبّاء رانی کو زبردستی کے ساتھ اُتارا جو فضائے آسمانی میں اُڑنے والے شاہین سے بھی زیادہ تیز نگاہ والی تھی۔

(۴۲) وسیف استعلت به همّته　　حتی رمی أبعد شأو المرتمی

سیف بن ذی یزن[2] بادشاہ نے بھی ہمّت سے ایک بڑے کام کا بیڑا اٹھایا۔

(۴۳) فجرّب الاحبوش سمًّا ناقعا　　واحتلّ من غمدان محراب الدّمی

اور اس نے حبشیوں کو زہر کے کڑوے گھونٹ پلائے اور غمدان کی عبادت گاہوں میں گھس پڑا۔

(۴۴) ثم ابن هند باشرت نیرانه　　یوم اوارات تمیما بالصلا

پھر ابن ہند[3] کی مثال لیجئے کہ اُس کی آگ نے جنگ اوارات میں بنو تمیم کو جھلس دیا۔

---

[1] عمرو بن ربیعہ وضاح کا بھانجا تھا اور اس نے اپنے ماموں کا انتقام زبّاء سے لیا۔

[2] سیف بن ذی یزن یمن کا بادشاہ تھا۔ اُس کو حبشیوں نے اپنے ملک سے نکال دیا تھا۔ وہ کتنے ہی سال بھٹکتا رہا۔ آخر کار ایران کے بادشاہ کی مدد سے اُس نے حبشیوں کو شکست دی اور اپنا کھویا ہوا ملک پھر حاصل کر لیا۔

[3] عمرو بن ہند ایک طاقتور بادشاہ تھا۔ اس کے رضاعی بھائی کو کسی تمیمی نے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

(۴۵) ما اعتنّ لی یاس یناجی ھمتی　　الّا تحدّاہ رجاءٌ فاکتمی

کبھی بھی میری اولوالعزمی کے آگے ناامیدی سرگوشی کرتے ہوئے نہیں پائی گئی۔ میرے حوصلوں نے اُس کا مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناامیدی دُم دبا کر بھاگ گئی۔

(۴۶) ألیّة بالیعملات یرتمی　　بھا النجاء بین اجواز الفلا

میں اُن اونٹنیوں کی قسم کھاتا ہوں جو قوی ہیں اور جن کے ذریعہ سے ویران بیابانوں کی مسافت طے کی جاتی ہے۔

(۴۷) خوص کاشباح الحنایا ضمر　　یرعفن بالامشاج من جذب البُری

قسم ہے اُن دُبلی پتلی اونٹنیوں کی جن کی صورتیں کمان کے مانند ہو گئی ہیں اور جن کی ناک سے نکیل کھینچنے کی وجہ سے خون بہہ رہا ہے۔

(۴۸) یرسبن فی بحر الدجی وبالضحی　　یطفون فی الآل اذا الآل طفا

وہ تاریکی کے سمندر میں غوطہ لگاتی رہتی ہیں اور دن چڑھے سراب میں اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں جب کہ سراب (مرگ ترشنا) زوروں پر ہوتا ہے۔

(۴۹) اخفافھنّ من حفاومن وجی　　مرثومةٌ تخضب مبیضّ الحصا

اُن کے پاؤں تیز روی اور درد کی وجہ سے خون خون ہو گئے ہیں اور ریگستان کے سفید سنگریزے اُس خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

(۵۰) یحملن کل شاحب محقوقف　　من طول تداٰب الغدوّ والسّری

وہ اونٹنیاں ایسے سوار لے جا رہی ہیں جو شب و روز کے مسلسل سفر کی وجہ سے خمیدہ کمر اور تھکے ہوئے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) قتل کیا تھا۔ عمرو بن ہند نے قسم کھائی کہ وہ اس کے انتقام میں سَو تمیمیوں کو مارے گا۔ چنانچہ بمقام اوارات اپنا لشکر لے کر آیا اور تمیمیوں کا مقابلہ کیا۔ جب تمیمیوں کو شکست فاش ہوئی تو اُس نے اُن کے ۹۹ سرداروں کو آگ میں جھونک دیا اور بعد میں ایک اور سردار آ نکلا۔ اُسے بھی پکڑ کر نذرِ آتش کیا اور اس طرح اپنی قسم پوری کی۔

(۵۱) برّ بری طول الطوی جثمانه فهو کقدح النبع محنیّ القرا

وہ سوار نیک ہیں۔ اُن کے جسم بھوک کی وجہ سے لاغر ہوگئے ہیں اور اُن کی پشت ایسی کبڑی ہیں جیسے نبع درخت کے خم کھائی ہوئی لکڑی۔

(۵۲) ینوی الّتی فضّلها ربّ العلا لمّا دحی تربتها علی البنی

ان کا ارادہ اُس جگہ جانا ہے کہ جس کو خُدا نے اس وقت عزّ و شرف بخشا تھا جب کہ اُس نے مٹی کو بنیاد پر پھیلائی۔

(۵۳) حتّی اذا قابلها استعبر لا یملك دمع العین من حیث جری

جب وہ کعبہ شریف کے آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اُن کی آنکھوں سے آنسو اس طرح جاری ہوتے ہیں کہ تھمنا نہیں جانتے۔

(۵۴) ثمّت طاف وانثنی مستلما ثمّت جاء المروتین فسعی

پھر طواف شروع کرتے ہیں اور حجر اسود کو بوسہ دے دے کر پھیرے پھرتے ہیں بعد ازاں مروتین یعنی صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سعی (دوڑنا) کرتے ہیں۔

(۵۵) واوجب الحج وثنّی عمرة من بعد ما عجّ ولبّی ودعا

وہ باآواز بلند لبّیك اللّٰھمّ لبیك کہتے جاتے ہیں دُعائیں مانگتے ہیں اور حج کے ارکان لازمی طور پر ادا کرتے ہیں۔ پھر دوبارہ عمرہ کرتے ہیں۔

(۵۶) ثمّت راح فی الملبین الی حیث تحجّی المأزمان ومنی

پھر تلبیہ کرنے والوں کے ساتھ اُس جگہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں جہاں ۲ دو پہاڑیاں ہیں اور منٰی واقع ہے۔

(۵۷) ثمّ اتی التعریف یقرو مخبتا موافقا بین اُلال فالنقا

پھر عرفات کی طرف جاتے ہیں جہاں اُلال اور نقا کے درمیان والے حصّہ میں بعجز و تمکین داخل ہوتے ہیں۔

(۵۸) واستأنف السبع وسبعًا بعدها والسعی ما بین العقاب والصوی

اور سات کنکریاں مارنا شروع کرتے ہیں اور اسی طرح بعد میں سات کنکریاں مارتے

رہتے ہیں اور عقاب اور کے درمیان دوڑتے رہتے ہیں۔

(۵۹) وَراح للتودیع فیمن راح قد أحرز أجرًا وقلی ھجر اللغا

پھر کعبہ شریف کو وداع کرنے کے لئے اور لوگوں کے ساتھ جاتے ہیں۔ ثواب حاصل کرتے ہیں اور بدکلامی سے گریز کرتے ہیں۔

(۶۰) بذاك ام بالخیل تعدو المرطی ناشزۃ اکتادھا قبّ الکلی

قسم ہے ان اونٹنیوں کی یا اُن گھوڑوں کی جو دُلکی چال چلتے ہیں اور جن کے کُولھے اونچے ہیں اور جن کی کمر پتلی ہے۔

(۶۱) شُعثا تعادی کسراحین الغضا میل الحمالیق یبارین الشبا

جن کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور جو جنگل کے بھیڑیوں کے مانند دوڑتے پھرتے ہیں۔ جن کی آنکھیں ترچھی ہیں اور تیروں کی اُنی کے مانند نکیلی ہیں۔

(۶۲) یحملن کلّ شمّریّ باسل شھم الجنان خائض غمر الوغی

جو بہادر، سینہ سپر، قوی دل اور نبرد آزما سوار لے جاتے ہیں۔

(۶۳) یغشی صلا الحرب بحدّیہ اذا کان لظی الحرب کریہ المصطلی

جو دودھاری تلوار لے کر آتشِ جنگ میں اُس وقت کُود پڑتے ہیں جب اُس کے بھیانک شعلے بھڑک رہے ہوں۔

(۶۴) لو مثل الحتف لہ قرنا لما صدّتہ عنہ ھیبۃ ولا انثنی

اگر موت کا بھی سامنا کرنا پڑے تو انہیں کسی قسم کا خوف دامنگیر نہیں ہوتا۔

(۶۵) ولو حمی المقدار عنہ مھجۃ لرامھا او یستبیح ما حمی

اگر تقدیر کسی کو بچانے کی کوشش کرے تو یہ شہسوار اُس کا تعاقب کرتے ہیں اور اُسے ہلاک کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔

(۶۶) تغدو المنایا طائعات امرہ ترضی الذی یرضیٰ وتأبی ما أبی

موت ان کی مُطیع ہے اور وہی کرتی ہے جو یہ چاہتے ہیں یا نہیں کرتی ہے جو اُنھیں نہیں کرنا ہے۔

(۶۷) بل قسما بالشم من یعرب هل لمقسم من بعد هذا منتهی
میں نہ صرف اُن اونٹنیوں اور گھوڑوں کی قسم کھاتا ہوں بلکہ یعرب خاندان کے سرداروں کی قسم کھاتا ہوں ۔ اب قسم کھانے کی حد ہو چکی ۔

(۶۸) هم الاولی ان فاخروا قال العلی بفی امرئ فاخرکم عفر البری
جب وہ فخر کرنے لگتے ہیں تو بزرگی خود بول اٹھتی ہے "جو تمہارا مقابلہ کرے وہ خاک بدہن ہے ۔"

(۶۹) هم الاولی اجروا ینابیع الندی هامیة لمن عری أو اعتفی
اُن کی جود و سخا کے پرنالے اُن لوگوں کے لئے بہنے لگے جو اُن سے مانگتے ہیں ۔

(۷۰) هم الذین دوخوا من انتخی وقوموا من صعر و من صغا
اُنہوں نے سرکشوں کے سر کچل دئے اور مغرور و متکبر کے کس بل نکال دئے ۔

(۷۱) هم الذین جرعوا من ماحلوا أفاوق الضیم ممرات الحسا
اُنہوں نے اپنے مقابل کو کڑوے گھونٹ پلا پلا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا ۔

(۷۲) أزال حشو نثرة موضونة حتی اواری بین اثناء الجثی
کہ میں زرہ پہنے رہوں گا تاوقتیکہ میں قبر میں لٹا دیا جاؤں ۔

(۷۳) وصاحبی صارم فی متنه مثل مدب النمل یعلو فی الربی
اور میرے دو ساتھی میرے ہم رکاب رہیں گے ۔ ایک ساتھی تو شمشیرِ آبدار ہے کہ جس کا آب و تاب ایسا جھلکتا ہے جیسے کہ چیونٹی کسی ٹیلے پر چڑھ رہی ہو ۔

(۷۴) ابیض کالملح اذا انتضیته لم یلق شیئاً حده الا فری
اگر وہ میان سے باہر نکلے تو سفید براق معلوم ہوتی ہے اور ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے ۔

(۷۵) کان بین عیره و غربه مفتاداً تأکلت فیه الجذی
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی پٹی اور دھار کے بیچ میں ایک بھٹی ہے جس میں انگارے دہک رہے ہیں ۔

(۷۶) یری المنون حین تقفو اثره فی ظلم الاکباد سبلا لاتری

اگر تو اُس کے پیچھے جگر کی اُن تاریکیوں میں جائے جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو وہاں وہ تلوار موت کو راستہ دکھاتی ہے۔

(۷۷) اذا ھوی فی جثۃ غادرھا		من بعد ما کانت خسًا وھی زکا

جب وہ کسی جسم پر چلتی ہے تو اُس کے دو ٹکڑے کر دیتی ہے حالانکہ وہ ایک تھا۔

(۷۸) ومشرف الأقطار خاظٍ نحضہ		حابی القصیر جرشع عرد النّسی

اور دوسرا ساتھی ایک گھوڑا ہے جس کا قد بلند ہے جو گٹھیلا ہے جس کی نیچے والی پسلی اونچی ہے۔

(۷۹) قریب ما بین القطاۃ والمطا		بعید ما بین القذال والصّلا

جس کی کمر اور پیٹھ کے درمیان کم فاصلہ ہے اور جس کی گدّی اور سرین کے درمیان زیادہ فاصلہ ہے۔

(۸۰) سامی التلیل فی دسیع مُفعَمٍ		رحبُ اللّبان فی امینات العجی

جس کی گردن بڑے کندھوں پر اونچی رہتی ہے اور جس کا سینہ چوڑا ہے اور مضبوط پٹھوں میں ہے۔

(۸۱) رکّبن فی حواشبٍ مُکتنِزۃٍ		الیٰ نسور مثل ملفوظ النّوی

جو سُم والی ہڈّی اور گوشت سے جُڑے ہوئے ہیں اور وہ گوشت اتنا ہی سخت ہے جیسے کہ ایک نکالی ہوئی گٹھلی۔

(۸۲) یرضَخُ بالبید الحصی فإن رقی		الی الربی اوری بھا نار الحبا

وُہ ریگستان میں کنکریاں توڑتا چلا جاتا ہے اور اگر پہاڑیوں پر جاتا ہے تو اپنے سُم سے چنگاریاں پیدا کرتا ہے جو جُگنو کے مانند چمکتی ہیں۔

(مسلسل)

ترجمہ

تاویل الاحادیث

(ادارہ)

میں نے یہ بہت دیکھا ہے کہ ایک شخص کی ہلاکت کے لئے قضا منعقد ہوئی۔ تو یہ قضا اسباب کی طرف اس طرح چلی جیسے گھاس والی زمین میں پانی بہتا ہے یا سورج کا نور پھٹے ہوئے پردے سے، وہاں موجب اور مانع کے وزن کی رعایت کی جاتی ہے، پھر اگر گھاس یا کوڑا پانی کے چلنے کو روکتا ہے اور پردہ نورِ آفتاب کے نفوذ کو منع کرتا ہے تو دونوں کا چلنا حسبِ امکان ہوتا ہے، اسی طرح قضا بھی حتی الامکان قریب تر جگہ کی طرف چلتی ہے، پھر اگر وہاں نشیبی زمین ہوگی اور ایک شخص کا اس میں گرنا نظام (اسباب) سے بعید نہ ہوگا تو قضا اس کی طرف چلے گی پھر اس شخص کے دل میں اس جگہ کے قریب چلنے کا امکان پیدا ہوگا اور وہاں پہنچ کر اس کا پیر پھسل جائے گا تو اسی میں اس کی موت واقع ہوگی۔ اور اگر وہاں اس کا کوئی دشمن ہوگا اور اس کی خصومت دور نہیں تو قضا اس کی طرف چلی تو دشمن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے لڑے یا اس شخص کو غصہ ہوا اور غصے میں دشمن کو گالیاں دیں تو اس کا نتیجہ اس کی ہلاکت کا نکلا۔ اور اگر وہاں کوئی چارپایہ ہے تو قضا اس کی طرف چلی اس چارپایہ

نے اس کو لات ماری یا اسے اپنے منہ کے جبڑوں سے کاٹ کر کھایا اور اسی میں اس شخص کی موت واقع ہوئی۔ اور اگر اس دن ملائکہ کا الہام قریب تھا تو قضا ان کی طرف چلی تاکہ ملائکہ اس کام کو پورا کریں جو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ہر شئے کے لئے ان اسباب میں سے اسباب ہوتے ہیں جو اس شئے کو واجب اور ضروری بنا دیتے ہیں۔

بخت اکثری اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ ہم نے بارہا یہ مشاہدہ کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نفس میں روشن ستارے کی طرح ایک چمکدار نقطہ ہوتا ہے، جس سے کئی شعاعی خطوط نکلتے ہیں جو لوگوں، ملائکہ اور بہائم کے نفوس میں نفوذ کرتے ہیں۔ جب ادھر سے تاثیر اور ادھر سے اثر قبول کرنا ہوتا ہے تو یہ اس کے ساتھ احسان کرنے کے ارادے کو ضروری قرار دیتا ہے اور اس کی محبت سے دل بھر جاتا ہے۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کے نفس میں نقطہ تو ہوتا ہے لیکن اس میں کافی تابانی اور چمک نہیں ہوتی پھر وہ اسماء الٰہیّہ کی طرف توجّہ کرتا ہے اور اس کے مانند دوسرے کام کرتا ہے تو اس کے نفس کا نقطہ بہت ہی چمک جاتا ہے۔ اسی جہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اول سے لے کر جس وقت پیدا ہوئے اور جب اپنی دایہ کے پاس دودھ پیتے تھے تو آپؐ کے لئے جہاں ہوں، رحمت، رفق اور لطف ظاہر ہوتے تھے اور آپؐ کے دوست ہمیشہ فتح پاتے تھے اور آپؐ کے دشمن خوار ہوتے تھے اور جو چیز آپؐ کو تکلیف دہ ہوتی تھی، اس کو آپؐ سے ہٹایا جاتا تھا۔ اس میں آپؐ بڑھتے گئے، یہاں تک کہ اس مرتبے کو پہنچے، جہاں پہنچے۔

دوم یہ کہ آپؐ اچھی صورت اور معتدل مزاج میں ایسے وقت پیدا ہوئے کہ اس میں ستاروں کی قوتوں کا سعید اجتماع ہوا تھا جو آپؐ کے لئے بڑی بزرگی، غلبہ اور عرب و عجم کے لئے آپؐ کی امامت کا متقاضی تھا کہ لوگوں کو ان کی اطاعت

کے لئے کھینچ کے لایا جائے اور آپؐ کی طرف جو ملّت منسوب ہو وہ قیامت تک باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شئے میں یعنی انواع، اشخاص اور ہیئات میں کوئی اثر اور خاصیّت ودیعت رکھی ہے، اچھے نظام کی کسی بھی چیز کو اس کے اثر اور خاصیت (کے اظہار) سے نہیں روکا جاتا۔ آپؐ کی اس فضیلت اور خاصیّت نے اس کو ضروری قرار دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے جمیل (خوبصورت) ہوں اور خلق میں سب سے کامل اور سب سے زیادہ بہادر ہوں۔ اور سخاوت، حلم، عدالت اور فصاحت میں سب انسانوں سے بڑھ کر ہوں۔ اور آپؐ ایسی قوم سے پیدا ہوئے جو عرب میں اشرف اور برگزیدہ لوگ تھے۔

جن لوگوں کو حظیرۃ القدس کے فیصلوں کی معرفت کے سلسلے میں تھوڑا بھی لگاؤ تھا جیسے کاہن لوگ، جنّ، نجومی اور اس قسم کے دوسرے لوگ یہ سب شروع سے اپنے علم اور فن سے یہ جانتے تھے کہ (آخری دور میں ایک بزرگ پیغمبر ہوگا) جس کے حق میں یہ سب چیزیں اور فضائل مقدر ہو چکے ہیں۔ آپ سے پہلے جو انبیاء اور ان کے تابعدار راہب اور عرب کے عبادت گذار تھے، وہ تو آپؐ کی آمد اور آپ کے فضائل سے پورے طور باخبر تھے۔

یہ دونوں خصلتیں ایسی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عادل بادشاہوں میں سے جو اچھے اخلاق اور بخت سعید کے صاحب تھے وہ بھی اپنی استعداد کے موافق شرکت رکھتے ہیں۔

پھر کوئی ایسا شخص کم ہوگا جو حکومت کا مؤسّس ہو اور اس کے اوپر جیسے غیر معمولی کارنامے نہ ہوں اور اسی طرح اخلاق میں جو کامل انسان ہوتا ہے اور اس کی پیدائش کے وقت ستاروں کی اچھی قوتوں کا اجتماع ہوتا ہے تو اس شخص سے بھی اس قسم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مفہّم من اللہ تھے، گذرے ہوئے اور آنے

والے واقعات کی خبروں کو، جس قدر اللہ کی مشیت ہوتی آپؐ غیب سے حاصل کر لیتے تھے۔ کیونکہ آپؐ کے اندر کی تختی ان آلائشوں سے صاف تھی جو زنگ باطن کے موجب ہوں اور جس واقعے کی صورت حظیرۃ القدس میں ثابت ہوئی ہے اس کے انطباع کو روکیں، اس کا راز ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ پھر کبھی آپؐ کے لئے کوئی چیز خواب میں متمثل ہوتی تھی جس کی حقیقت حال پر تعبیر کے ذریعے آپؐ کو اطلاع ہو جاتی تھی اور بلا واسطہ بھی آپؐ جانتے تھے، کبھی تھوڑی دیر کے لئے آپ کی بیداری میں کوئی چیز متمثل ہو کر آتی تھی اور پھر جلدی مٹ جاتی تھی۔ یہ (اصل میں) رنگ اور شکل وغیرہ کی طرح تھی، کبھی کوئی ملک انسانی صورت لے کر آپؐ کے پاس آتا تھا اور آپؐ سے ایسی باتوں سے مخاطب ہوتا تھا، جن کو آپؐ یاد کر لیتے تھے۔

علم کی اس قسم کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے واقعات کی تاویل کا علم عطا کیا ہے اس کو دو باتوں میں تامل کرنا ضروری ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھ رہا ہے اس کی دوسرے واقعات اور حوادث سے امتیاز کرنا ضروری ہے کہ یہ حادثہ اس کے لئے کیوں منکشف ہوا اور دوسرے نہ ہوئے۔ یہ تمیز کئی طریقوں پر ہوتی ہے ایک یہ کہ نفس کو اس کی طرف ظاہر میں اشتیاق پایا جاتا ہے جیسے کسی شخص کو ایسی چیز پلائی جائے جس کی وہ توقع رکھتا ہو یا اس کے اندر (اس کے لئے) چھپا ہوا شوق ہو، جیسے کوئی محتاج آدمی غنا کی طرف مشتاق ہوتا ہے لیکن وہ اپنے کسب اور حیلوں سے غنا کو نہیں پہنچ سکتا، اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس ساعت میں اس کے ذہن میں ان باتوں کا کوئی معمولی تصور بھی ہو۔ تمیز کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ میں اس حادثے کی صورت کا انطباع قوی طور پر ہوا ہے، پھر کوئی ایسا انسان جس کو ملأ اعلیٰ تک رسائی ہوگی تو اس کے ذہن میں اس حادثے کی کسی جھلک کا ہونا ناگزیر ہے اور یہ صورت بڑے واقعات میں ہوتی ہے جیسے کسی حکومت کا پیدا ہونا اور دوسری حکومت کی ہلاکت، عام قحط اور وبا وغیرہ کا ہونا۔ جب یہ صورت ہوتی ہے تو قوم کے خواب اور مکاشفات اس سے موافق ہوتے ہیں،

تیسری وجہ حق تبارک وتعالیٰ کی تدبیر ہے ، اور تدبیر یہ چاہتی ہے کہ اچھا نظام اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کی استعداد رکھنے والے کے دل میں اس کا علم رکھا جائے اس لئے فرعون ہی نے خواب میں قحط دیکھا کہ اس کو اپنے کام میں بصیرت پیدا ہو[1] - کسی کے قلب میں علم کے اس بہاؤ اور فیضان کے لئے دو رکنوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ نفس اس کے لئے مستعد ہو اور دوم اللہ کا جود اور اس کی رحمت کا فیضان ہو - ان دونوں رکنوں کا اجتماع مختلف وجوہ سے ہوتا ہے -

ایک یہ کہ اس میں جود ، استعداد پر غالب ہوتا ہے اور یہ اُن علوم میں ہوتا ہے جن کے ساتھ جمہور کی اصلاح وابستہ ہوتی ہے یا ایک قوم یا کسی شخص کی صلاح کا مدار اس پر ہوتا ہے -

دوم یہ کہ اس میں استعداد ، جود سے زیادہ ہوتا ہے ، اور یہ ان علوم میں ہوتا ہے جن کا لوگوں کی اصلاح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا - پہلا علوم انبیاء علیہم السلام کا منشاٗ ہوتا ہے اور وہ مطلق صادق ہوتا ہے ، اس سے لوگوں کو مکلف بنانا صحیح ہوتا ہے اور دوسرا اولیاء کے علوم کا منشاٗ ہوتا ہے اور وہ ایک حال کے لحاظ سے سچا ہوتا ہے اور دوسرے حال کے نہیں اور کسی نفس میں صادق ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا -

(مسلسل)

---

[1] یہ فرعون ، حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کا فرعون معلوم ہوتا ہے جس کو سات گائیوں کی صورت میں خواب میں قحط دکھایا گیا تھا ، اس کا قصہ سورۂ یوسف میں آیا ہے -

قرآن محکم
مصنف مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی - ناشر مجلس معارف القرآن دارالعلوم دیوبند -

قرآن حکیم کے بارے میں اہلِ علم کے ایک حلقہ میں عرصہ دراز تک یہ تصور رہا کہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات ہیں، جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے، لیکن اُن کا حکم اب باقی نہیں رہا - اور عملاً وہ منسوخ ہیں - چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی سے پہلے نسخِ آیات کے حامی پانچ سو آیتوں کو منسوخ مانتے تھے، علامہ سیوطی نے صرف اُنیس آیات کو منسوخ مانا، اور باقی کو غیر منسوخ ثابت کیا - اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب آئے انہوں نے اُن انیس میں سے صرف پانچ کو منسوخ قرار دیا - زیرِ نظر رسالہ کے مصنف مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب نے سرے سے نسخ کے اس تصور کا کہ بعض آیاتِ قرآنی کی تلاوت تو ہوتی ہو، لیکن اُن پہ عمل منسوخ ہوگیا ہو - انکار کیاہے، اور اسے دلائل سے ثابت کیا ہے - اور ساتھ ہی جن پانچ آیات کو شاہ ولی اللہ نے منسوخ قرار دیاہے اُن کی توجیہہ کرکے بتایاہے کہ وہ منسوخ نہیں ہیں -

فاضل مصنف نے سب سے پہلے اُن آیاتِ قرآنی سے بحث کی ہے - جن سے نسخ کا جواز نکالا گیاہے - موصوف نے ثابت کیاہے کہ ان آیات سے نسخ کا استخراج غلط فہمی پر

مبنی ہے ۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ متقدمین کی نسخ سے کیا مراد تھی، اور متاخرین نے اُسے بعد میں کیا معنیٰ پہنا دیئے ۔ مولانا رحمانی نے ائمہ سلف کے حوالے دے کر اس امر کا اثبات کیا ہے کہ "جو نسخ قرآن مجید کے منافی ہے، اور قرآن مجید کی آیتوں میں جس نسخ کا انکار کیا جاتا ہے، وہ نسخ بمعنی خاص یعنی ازالہ للحکم بحیث لایجوز امتثالہ ہے، نہ کہ نسخ بمعنی عام اور بمعنی لغوی ۔ کیونکہ نہ تو یہ قرآن کے منافی ہے نہ اس کا کسی کو انکار ہے ۔ بلکہ اس معنیٰ میں تو علماء کرام حدیث کو بھی قرآن مجید کا ناسخ قرار دیتے ہیں . . ."

علمائے متقدمین کے نزدیک نسخ بمعنی عام اور بمعنی لغوی کے تحت تقیید، تخصیص تاویل، استثناء، بیان متبادر غیر متبادر، قیدِ اتفاقی، تخصیصِ عامی وغیرذٰلک سب آجاتے ہیں ۔ درآں حالیکہ علماء متاخرین نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ۔ اس اختلافِ اصطلاح کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ۔ اور مخالفوں کو قرآن مجید پر اعتراض کرنے کا موقع ملا ۔

زیرِ نظر رسالہ کے مقدمہ میں جسے مولانا ظفیر الدین صاحب نے لکھا ہے، اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ سندھی کا بھی ذکر کیا ہے ۔ مولانا سندھی نے قرآن مجید کی اُن پانچ آیات کو جنہیں شاہ ولی اللہؒ نے منسوخ قرار دیا تھا ۔ غیر منسوخ بتایا تھا اور ان میں سے ایک آیت کی تطبیق بھی کی تھی ۔ مولانا سندھی نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب دراصل قرآن کی کسی آیت کو منسوخ نہیں مانتے ۔ اور اُس وقت انہوں نے یہ بات صراحتاً اس لئے نہ لکھی کہ اُن کا یہ قول معتزلہ سے مشابہ ہو جاتا ۔ اور لوگ اس پر اعتراض کرتے ۔ چنانچہ وہ پانچ آیات جنہیں شاہ صاحب نے منسوخ مانا ہے ۔ اُن کی توجیہہ زیادہ مشکل نہیں ۔

غرض مولانا عبدالصمد رحمانی نے یہ رسالہ لکھ کر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس کام کی تکمیل کر دی اور پوری طرح ثابت کر دیا کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ان معنوں میں منسوخ نہیں، جن معنوں میں متاخرین نے انہیں منسوخ مانا ۔

۱۲۰ صفحے کا یہ رسالہ اس بحث پر ہر لحاظ سے محیط ہے ۔ اور اسے پڑھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ "قرآن مجید کی ہر آیت اپنی جگہ پر محکم ہے اور قرآن مجید میں کوئی ایسا حکم موجود نہیں

ہے، جس پر عمل کسی زمانے میں ہمارے لئے ضروری قرار دیا گیا ہو اور اس کا ہمیشہ کے لئے اس طرح ازالہ کیا گیا ہو کہ اس پر کسی حالت میں عمل پیرا ہونا جائز نہ ہو۔ اور اب وہ آیت قرآن مجید میں محض تبرکاً تلاوت میں ہو۔"

رسالہ "قرآن محکم" مجلد ہے۔ قیمت ۲ روپے

تفسیر المعوذتین

قرآن مجید کی آخری دو سورتوں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی تفسیر پر یہ عربی رسالہ مشتمل ہے اصل تفسیر فارسی میں تھی جس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم مؤسس دار العلوم دیوبند کا ایک مختصر سا رسالہ "اسرار قرآنی" کے نام سے ہے جس میں اُن کے متعدد مکتوب ہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب استعاذہ اور المعوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) کے بارے میں ہے۔ اس فارسی مکتوب کا ترجمہ مولانا کیرانوی فاضل دار العلوم دیوبند نے عربی میں کیا ہے اور مجلس معارف القرآن دار العلوم دیوبند نے اسے شائع کیا ہے۔

تفسیر کا اصل متن ۲۴ صفحات میں آگیا ہے۔ شروع میں "کلمۃ التعریف" کے نام سے مولانا محمد طیب صاحب مدیر دار العلوم دیوبند کا مقدمہ ہے، جس میں موصوف نے مولانا محمد قاسم کے مختصر حالاتِ زندگی دیئے ہیں۔ اور "فلسفۂ قاسمیہ" کا تعارف کرایا ہے۔ مولانا طیب صاحب لکھتے ہیں:۔

"فلسفۂ قاسمیہ تین حصّوں میں منقسم ہے۔ ایک حصّہ مسائل اساسی سے متعلق ہے، جس پر کہ عقیدہ اسلامی کی بنیاد ہے۔ دوسرے حصّے کا موضوع مسائلِ کلیہ سے ہے، جن کا ایک لحاظ سے عقیدہ اسلامی سے تعلق ہے، اور ایک لحاظ سے انسانی اعمال سے بھی، اُن کے عمومی و اصولی معنوں میں۔ اور فلسفۂ قاسمیہ کے تیسرے حصّے کا مدلول فروعی و اجتہادی مسائل ہیں۔ یعنی مولانا محمد قاسم نے علوم کے ان سب شعبوں پر بحثیں کی ہیں۔ اور اس اعتبار

سے مولانا طیب صاحب کے الفاظ میں "فلسفۂ قاسمیہ ذوقی وجدانی، نقلی، عقلی، استدلالی، استنباطی اور علوم کی سب فروع پر حاوی ہے"۔

مولانا طیب کے نزدیک مولانا محمد قاسم کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس دور میں جب تجربہ و مشاہدہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور مسائل دینی کو بھی طبیعی اور فلسفی انداز میں پیش کرنے کا عام رجحان ہے۔ مولانا محمد قاسم نے قرآنی حقائق کو زندہ دلائل (الشواهد الحیة) کے ذریعہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں مولانا طیب نے مولانا سندھی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی فقیہ اسلام تھے اور مولانا محمد قاسم حکیم الاسلام۔

مقدمہ میں مولانا طیب نے بتایا ہے کہ مجلس معارف القرآن مولانا محمد قاسم رح کی تمام تصنیفات شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، نیز وہ اُن میں سے اہم کتابوں کا عربی اور انگریزی میں بھی ترجمہ چھاپے گی۔ چنانچہ المعوذتین کی تفسیر اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

ہم دارالعلوم دیوبند کے اس عزم کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اب تک مجلس معارف القرآن کی طرف سے اس ضمن میں جو کچھ شائع ہوا ہے، اُسے قابلِ قدر اور مفید سمجھتے ہیں۔ اور دُعا کرتے ہیں کہ اس مجلس کے عزائم میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے اور اُسے توفیق دے کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھے۔

دارالعلوم دیوبند نے حدیث، فقہ اور دوسرے علوم نقلیہ اور ایک حد تک علوم عقلیہ کی نشر و اشاعت میں جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور دارالعلوم کا یہ احسان تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی اور جیسا کہ مولانا محمد طیب نے لکھا ہے، یہ دور تجارب، مشاہدات اور اکتشافاتِ طبیعی کا ہے۔ اور اس میں پیدا ہونے والے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکیمانہ اسلوب کی ضرورت ہے۔ جو ہمیں حضرت مولانا محمد قاسم کی کتابوں میں ملتا ہے۔

آج ضرورت ہے کہ ہر دیوبندی طالب علم کم سے کم حکمتِ قاسمی یا دوسرے لفظوں میں فلسفۂ قاسمیہ سے بہرہ ور ہو۔ اور اس راستے سے وہ ولی اللّٰہی حکمت تک پہنچے۔ اور ان دونوں سے لیس ہو کر وہ آج کی دنیا، اُس کے مسائل اور اُس کے علوم

سے تعلق پیدا کرے۔ اس دور میں اسلام کی حفاظت اور اُسے دوسروں تک پہنچانے کی صرف یہی ایک کامیاب اور مفید راہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دارالعلوم دیوبند کے وجود کی افادیت کی صرف یہی ایک صورت ممکن ہے، تو یہ بالکل حقیقت واقعی ہوگی۔

جہاں تک معوذتین کی تفسیر کا تعلق ہے، مولانا محمد قاسم نے اس پر حکیمانہ طریقے سے بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان دو سورتوں میں چند چیزوں سے جو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، تو اس سے کیا مراد ہے۔

زیرِ نظر رسالہ کا عربی اسلوب بڑا رواں ہے، اور اس میں تکلف اور گنجلک نہیں رسالہ غیر مجلد ہے۔ صفحات ۵۲ ہیں۔ اور قیمت ایک روپیہ ہے۔

دینی دعوت کے قرآنی اُصول

از مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

بقولِ فاضل مصنف گو یہ کتاب آج سے پچیس برس پہلے مرتب ہوئی تھی، لیکن اب کافی ردّ و بدل اور معتدبہ اضافوں کے ساتھ اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ اسی لئے ہندوستان میں آج مسلمانوں کو جن حالات سے سامنا کرنا پڑتا رہا ہے، تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں انہیں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے آج کے عہدِ مقہوریت کے لئے مکہ کی زندگی اُسوہ رسول ہے اور اس کا تقاضا ماریں کھا کر صبر و تحمل سے کام لینا ہے، تو غلط بھی ہے اور طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔ ۔ ۔"

اس کے بجائے مولانا موصوف کے الفاظ میں "یہ مکہ کی زندگی اُسی وقت بن سکتی ہے کہ جب یہ مار کھانا اور پیٹا جانا کوئی مضبوط اور پائیدار نصب العین لئے ہوئے ہو۔ ۔ ۔ ۔ اس نصب العین کے تحت قوم اگر زندہ رہتی ہے تو اس سے زیادہ عزت کی زندگی دوسری نہیں ہو سکتی۔" اس "مکی زندگی" میں اسلام کی دعوت دوسروں کو کس طرح دی جائے یہ کتاب اس سوال کا جواب ہے، جو مشتمل ہے قرآن مجید کی آیت "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ

رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ○ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ○ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ○ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ○ کی تشریح پر۔

مصنف فرماتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی دعوت سب قوموں تک پہنچائیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم جو دعوتی پروگرام بنائیں، اُس میں عمومیت اور عالمگیریت ہو، ورنہ یہ دعوت امرِ عبث ٹھہرے گی۔

اس دعوت کا کیا طریقہ کار ہو؟ کتاب میں اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "تمام داعیانِ دین کا فرض ہے کہ وہ رعایتِ طبع کے ماتحت مخاطبوں کی ذہنیتوں کا اندازہ کر کے تبلیغ کا آغاز کریں، ورنہ بلا رعایتِ طبائع اُن کی دعوت و تبلیغ مؤثر نہیں ہو گی"۔ اور پھر زبان بھی ایسی استعمال کی جائے جو مخالفین کی ذہنیت کے مناسب ہو۔

مبلغ چونکہ معلم اور مربی دونوں ہوتا ہے۔ اور تربیت کے معنیٰ کسی چیز کو رفتہ رفتہ اس کی حدِ کمال تک پہنچانے کے ہیں، اس لئے تربیت کے سلسلے میں مبلغ کو تدریج و تیسیر سے کام لینا چاہیئے۔ یعنی طالبانِ حق کو رفتہ رفتہ مطلوبہ نقطہ تک پہنچایا جائے۔

اس سلسلے میں مولانا نے رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی سے ایک مثال دی ہے، وھو ھذا:-

حضورؐ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو جب یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجا تو ..... فرمایا۔ تمہیں وہاں نصاریٰ کی قوم ملے گی انہیں دین کی دعوت اس طرح دینا کہ اوّل ان کے سامنے کلمۂ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پیش کرنا۔ جب وہ اسے قبول کر لیں تو

پھر کہنا کہ نماز کا بھی ایک فریضہ تم پر عائد ہوتا ہے۔ جب وہ اُسے قبول کرلیں تو پھر کہنا کہ تمہارے مالوں میں تم پر زکوٰۃ کا بھی ایک فریضہ آتا ہے۔ جب وہ اُسے بھی تسلیم کرلیں تو پھر روزہ کی تلقین کرنا وعلیٰ ھٰذا القیاس"

اسی ضمن میں مولانا طیب صاحب نے شروع اسلام میں شراب کو تدریجی طور پر حرام قرار دینے کی مثال دی ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے:-

"اگر کوئی بُرائی قدیم سے کسی قوم میں رچی ہوئی ہو، تو اس کے استیصال کی صورت ہی یہ ہے کہ اس بُرائی کے چند اہم اجزا الگ الگ نکال کر تدریجی ممانعت کی جائے ..."

زیرِ نظر کتاب میں فاضل مُصنّف نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول اور طریقے بتائے ہیں، اُن کی صحت و افادیت اپنی جگہ بالکل مسلّم ہے لیکن موصوف کے نظر سے وہ طریقہ جس سے عام طور پر عیسائی مشنری کام لیتے ہیں، اوجھل رہا ہے۔ اور وہ ہے لوگوں کی خدمت کر کے اُن کے دلوں میں اپنے مذہب کی بات اُتارنا، یعنی اپنے عمل سے لوگوں کو یہ یقین دلانا کہ ہمارا مذہب حسنۃ فی الآخرۃ کے ساتھ حسنۃ فی الدنیا کا بھی حامل ہے۔

اگر تاریخِ اسلامی کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ قرونِ اُولیٰ میں عراق، شام، مصر اور شمالی افریقہ میں اور بعد میں برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے بسرعت پھیلنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس نے پس ماندہ اور مظلوم طبقوں کو ایک بہتر دنیاوی درجہ دیا تھا۔ اسی لئے بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان دیار میں اسلام دبے ہوئے اور غریب عوام کے لئے پیغامِ نجات تھا۔

افسوس ہے مولانا طیب صاحب نے اس کتاب میں اس مسئلے کو چھوا تک بھی نہیں۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت بڑے سائز کے ۱۳۲ صفحات۔ قیمت دو روپے پچیس پیسے۔

(م ۔ س)

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمتِ ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly **"AR-RAHIM"**
Hyderabad

شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ وتحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے
اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُن کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل
بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

(عربی)

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفٰے قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ
ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔
اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو '۲' روپے

(فارسی)

سطعات

انسان کی نفسی تکمیل وترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے
اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدس
سے اتصال پیدا کرتا ہے، "سطعات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

رحیم خان منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد سرور پبلشر نے
شاہ ولی اللہ اکیڈمی جامع صدر سے شایع کیا

جلد نمبر ۵ ماہ اپریل ۱۹۶۸ شمارہ نمبر ۱۱

بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدرآباد

قیمت سالانہ :- آٹھ روپیہ   فی پرچہ :- پچھتر پیسے

الرحیم حیدرآباد

نمبر ۱۱	ماہ اپریل سنہ ۱۹۶۸ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۳۸۸ھ	جلد ۵

فہرست مضامین

شذرات

حضرت شاہ ولی اللہ کی علمی شخصیت کے فیوض کا سلسلہ ان کی زندگی ہی میں دور دور تک پہنچ گیا تھا ان کی وفات کے بعد ایک تو ان کے صاحبزادوں بالخصوص شاہ عبدالعزیز اور ان کے مسترشدین اور انکے شاگردوں اور دوسرے ان کی تالیفات کے ذریعہ یہ فیض جاری رہا اور برصغیر کے اطراف و اکناف میں ولی اللہی پیغام پہنچا اور انکی دعوت دینی سے اہل علم حلقے روشناس ہوئے۔ لیکن اس زمانے میں ہوا یہ، اور یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اس زمانے کے معاشرتی حالات و کوائف، علمی و فکری رجحانات اور مذہبی روایات و معتقدات کا زبردست اور ہمہ گیر دباؤ تھا۔ کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی دعوت کے عملی انقلاب کا پہلو صرف تحریک جہاد تک محدود رہا۔ سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور انکی شہادت کے بعد برصغیر کے اندر اور دریائے اٹک کے اس پار مجاہدین کی مسلسل جدوجہد اور ان کی بے شمار قربانیاں شاہ ولی اللہ کی اس دعوت کے سلسلے کی کڑیاں ہیں اس تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد ولی اللہی دعوت کا فکری و عملی پہلو ائمہ کی تقلید اور عدم تقلید کی بحثوں میں منحصر ہو کر رہ گیا۔ مسلک دیوبندی اور مسلک اہل حدیث کی گزشتہ ستر اسی سال کی تاریخ اس کی ایک مثال ہے بدقسمتی سے بعض دائرہ میں اب تک یہ کش مکش جاری ہے۔ اور ہر فریق شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتب فکر کو اساس بنا کر اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بے شک شاہ صاحب کی دعوت میں یہ پہلو بھی تھے، لیکن ان کی دعوت کے اس مقصد کے علاوہ اور پہلو بھی تھے جن کی طرف اس زمانے میں کما حقہ توجہ نہ دی گئی۔ اور یہ پہلو تشنۂ عمل ہی رہے شاہ صاحب کی دعوت کا ایک پہلو ان کا پوری انسانیت کو حکیمانہ انداز سے خطاب کرنا اور اسلام کو دین انسانیت کے رنگ میں پیش کرنا تھا۔ اسکے لئے انہوں نے تصوف و حکمت کو اپنی فکر کی اساس بنایا۔ اور عقیدہ وحدت الوجود کی ایسی تعبیر کی کہ اسلام، کل انسانیت بلکہ ساری کائنات میں ارتباط اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ ہمارے نزدیک شاہ صاحب کی دعوت کا مرکزی اور بنیادی نقطہ یہی ہے۔ اسی کی وجہ سے جہاں وہ ایک طرف شریعت و طریقت، فقہ

حنفی اور دوسری فقہوں، فقہ و حدیث اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں مطابقت پیدا کرتے ہیں وہاں وہ سب ادیان و مذاہب میں مشترکہ نقاط کی نشان دہی فرماتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اصل دین ایک ہے اور اسکی مختلف تعبیریں مختلف زمانوں اور مختلف ظروف و حالات کا حتمی نتیجہ ہیں۔

مولانا محمد قاسم کی کتابوں میں شاہ صاحب کی اس انسانیت گیر حکمت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن بدقسمتی سے اس نے ایک علمی و فکری تحریک کی شکل اختیار نہ کی اور مولانا قاسم کے بعد اس سلسلے کو اور آگے بڑھانے والا نہ ملا۔

شاہ ولی اللہ کی دعوت کا ایک پہلو اور تھا جسکو انکے نام لیواؤں نے بالکل نظرانداز کر دیا۔ یہاں تک کہ اس پہلو کی طرف شاہ صاحب کی کتابیں پڑھنے والوں کا دھیان تک نہیں جاتا تھا۔ اور وہ پہلو تھا شاہ صاحب کی دعوت کا اقتصادی و اجتماعی یعنی سماجی شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں جگہ بہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ جب معاشرہ کا اقتصادی توازن درہم برہم ہو جائے اور ایک مختصر طبقہ تو حد سے زیادہ امیر ہو، اور اکثریت زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو تو اس معاشرے کے نہ اخلاق ٹھیک رہتے ہیں نہ اسکے افراد کا خدا سے تعلق قائم رہ سکتا ہے، اس معاشرے کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ اور قضاء وقدر اسکے لئے کوئی نہ کوئی سامان کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قیصر و کسریٰ کا تختہ الٹ دیا جائے۔ کیونکہ ان کی حکومتوں نے اس وقت کی دنیا کے ایک بڑے حصے کو معاشی استحصال اور ظلم و استبداد کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ ان کا ختم کرنا ضروری تھا کہ انسانیت کو ان مصائب سے نجات ملے۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب نے اپنے عہد کی خرابیوں کا ذکر بھی کیا۔ اور بتایا کہ آج بھی وہی حالت ہے جو قیصر و کسریٰ کے وقت میں تھی۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کوئی چوبیس برس کی جلاوطنی کے بعد جب ۱۹۳۹ء میں وطن لوٹے تو انہوں نے ولی اللہی دعوت کے مذکورہ پہلوؤں پر خاص طور سے اہل ملک کی توجہ مبذول کرائی۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں عوامی اجتماعوں میں اپنی تقریروں میں درس و تدریس اور گفتگوؤں میں ان امور پر زور دیا اور بتایا کہ آج مسلمانوں کو جن مسائل سے سابقہ پڑ رہا ہے خاص کر اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل سے نیز ان کے مختلف فرقوں میں جو نزاعات ہیں انہیں ختم کرنا اور انسانی تاریخ میں اور موجودہ دنیا میں اسلام کے مقام کا تعین۔ ان سب مسائل کو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کو پورے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں اکیڈمی نے اپنے مجلہ ماہنامہ الرحیم کے ذریعہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیفات شائع کر کے ولی اللہی دعوت سے اہل ملک کو متعارف کرانے کی پوری کوشش کی ہے اور آج یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ علمی حلقوں میں یہ شعور پیدا ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنے موجودہ مسائل کو حل کرنے اور مستقبل کے لئے اپنی راہِ عمل کی نشان دہی کے لئے تعلیمات ولی اللہی سے روشنی اور ہدایت مل سکتی ہے۔ اس مدت میں حضرت شاہ صاحب پر بہت لکھا گیا ہے اور ان کے افکار و خیالات کے مطالعہ کا شوق برابر بڑھ رہا ہے دعوت ولی اللہی کے وہ پہلو جن کی طرف پہلے کم توجہ کی جاتی تھی، اب اہل علم ان کو خاص طور پر زیر بحث لا رہے ہیں ابھی گزشتہ ماہ لاہور میں سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر کارنیلس کی زیر صدارت شاہ صاحب پر ایک مذاکرہ ہوا، جس میں صاحب موصوف کے علاوہ موجودہ چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر ایس اے رحمن نے تقریریں کیں۔

شاہ صاحب کی تعلیمات کے مطالعہ کا اہل علم میں جو عام رجحان پیدا ہو گیا ہے اور جملہ مسائل کے حل کیلئے ان کی طرف رجوع کرنے کی جو ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اسی کے پیش نظر اکیڈمی نے ولی اللہی پیغام کی عام نشر و اشاعت کیلئے ایک مثبت لائحہ عمل بنایا ہے اس سلسلے میں مذاکرہ کا انتظام کیا جا رہا ہے، جس میں خاص طور پر عربی و دینی مدارس کے حضرات کو مدعو کیا جائیگا۔ اس مذاکرہ میں حضرت شاہ صاحب پر مقالات پڑھے جائیں گے جن میں یہ بتایا جائے گا کہ آج ہم کس طرح انکے افکار کو مشعل راہ بنا کر موجودہ مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں

شاہ صاحب کی دعوت محض نظری نہیں تھی ان کے نظریات عمل و اقدام کے لئے زمین ہموار کرنے والے تھے انکے دور میں موجودہ نظریات مثبت عمل میں منتج نہ ہو سکے، آج کے حالات شاہ صاحب کے نظریات و افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑے سازگار ہیں اکیڈمی کے زیر اہتمام ہونے والے مذاکرے میں خاص طور سے شاہ صاحب کی دعوت کے عملی پہلوؤں پر زور دیا جائیگا۔

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی زیر غور ہے کہ شاہ صاحب کی تعلیمات کا ایک مختصر سا نصاب تعلیم بنایا جائے اور ان سے دلچسپی رکھنے والوں کو دعوت دی جائے کہ وہ اکیڈمی میں آئیں اور اس نصاب کو پڑھیں اس سے شاہ صاحب کی دعوت کے علمی و عملی پہلو بآسانی ذہن نشین ہو سکیں گے اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں ایک ایسی اجتماعی تحریک بار آور ہو سکے گی جو اسلام کے اصولوں پر عدل اجتماعی کو وجود میں لا سکے گی اور مسلمانوں کو صحیح دینی روح سے بہرہ ور کرے۔

سندھ کے صوفیائے کرام

سید پیر مراد شیرازی اور ان کا خاندان

اعجاز الحق قدوسی

میر سید محمد صاحب ترخان نامہ ۹۹۴ھ (۱۵۸۵ء) میں مرزا جانی بیگ حاکم سندھ نے مرزا محمد صالح اول متوفی (۹۷۰ھ) (۱۵۶۲ء) کی لڑکی کی شادی حضرت جلال ثانی سے کر دی تھی، یہ وہی لڑکی تھی کہ جب مرزا محمد باقی متوفی ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) نے دست تعدی وظلم دراز کیا تو اس نے اس لڑکی کو بھی قید میں ڈال دیا تھا۔ جب مرزا جانی نے سندھ کی زمام حکومت سنبھالی تو اس نے محترم خاتون کو قید سے رہا کیا۔ "معیار سالکان طریقت" کی روایت کے مطابق سید جلال ثانی کے اس خاتون کے بطن سے ایک صاحبزادے سید محمد نامی تھے صاحب تحفۃ الکرام نے ان صاحبزادے کے متعلق لکھا کہ۔

یہ بزرگ مشہور زمانہ تھے، ترخان نامہ ان ہی کی تالیف ہے[۲] افسوس ہے کہ سید محمد کا حال کسی کتاب میں نہیں ملتا، یہاں تک کہ انہوں نے ترخان نامہ میں بھی اپنی زندگی کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ترخان نامہ سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہو چکا ہے۔

سید میر محمد کے دو صاحبزادے تھے، ایک سید میر بزرگ اور دوسرے سید عبداللہ۔ میر بزرگ کے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام میر زین العابدین تھا لیکن وہ سید لطف اللہ کے نام سے مشہور تھے۔

---

[۱] حواشی مکلی نامہ، ص ۴۴ - ۴۵ مقدمہ ترخان نامہ، مولفہ سید حسام الدین راشدی ص ۴۱

[۲] ترخان نامہ مرزا عیسیٰ کی وفات کے بعد ۱۰۶۵ھ میں تالیف ہوا۔

یہ اپنے زمانہ کے فارسی کے مشہور شاعر تھے اور انہوں نے ایک کتاب بھی حرزالبشر کے نام سے تالیف کی تھی، علم و فضل میں ممتاز تھے، شاعری میں قانع تخلص کرتے تھے، انہوں نے (۱۱۳۲ھ ۱۷۱۹ء) میں وفات پائی، میر علی شیر قانع نے ان کی تاریخ وفات "رضوا عنہ" سے نکالی۔ مقالات الشعراء میں میر علی شیر قانع نے ان کا ایک شعر درج کیا ہے، جسے ہم تبرکاً یہاں نقل کرتے ہیں۔

دوات چینی چشم غزالاں کم سیاہی شد
مگر مجنوں بہ لیلی باز انشا کرد مکتوبی [۱]

میر زین العابدین کے دو صاحبزادے تھے، ایک سید غلام علی، اور دوسرے سید عبدالوالی میر محمد کے دوسرے صاحب زادے سید عبداللہ کے ایک صاحبزادے تھے، جن کا نام سید عبداللہ تھا، سید عبداللہ کے ایک صاحب زادے سید لعل میر تھے۔ جو ۱۱۸۱ھ - ۱۷۶۷ء) میں جب کہ میر علی شیر قانع ٹھٹوی تحفۃ الکرام لکھ رہے تھے۔ حیات تھے [۲]

سید شریف

۲۔ سید احمد کے بڑے صاحب زادے حضرت سید علی اول اور ان کی اولاد کے تذکرے کے بعد، ہم پھر سید احمد کے دوسرے صاحب زادوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حضرت سید احمد کے دوسرے صاحب زادے سید شریف تھے، جو اس وقت پیدا ہوئے جب کہ حضرت سید احمد کی عمر ستاسی سال کی تھی، ان کی ولادت ۸۰۰ھ میں ہوئی اور ۸۸۷ھ - ۱۴۸۲ء) میں انہوں نے وفات پائی، سید شریف کی تاریخ وفات "انہ کان مخلصا" سے نکلتی ہے۔ سید شریف کا مزار حضرت سید علی اول کے متصل مغربی جانب مکلی کے قبرستان میں واقع ہے۔ سید شریف کے دو صاحب زادے تاج محمد اور سید لطف اللہ تھے [۳]

سید محمد جعفر

حضرت سید محمد کے تیسرے صاحب زادے سید محمد جعفر تھے۔ جو گجرات کے مشہور شہر نہروالہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ تحفۃ الکرام میں ہیں کہ اس سرزمین کے مشہور

---

[۱] مقالات الشعراء، ص ۵۲۸ - ۵۲۹

[۲] مقدمہ ترخان نامہ مؤلفہ سید حسام الدین راشدی، ص ۴۲ بحوالہ تحفۃ الکرام جلد ۳ - ص ۱۸۸

[۳] حواشی مکلی نامہ، ص ۵۴

صوفیا میں شمار ہوتے تھے۔ اسی شہر میں انہوں نے شادی کی جن سے ان کے ایک صاحب زادے سید احمد نامی تولد ہوئے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو ان کے والد نے انہیں اپنی جگہ مسند رشد و ہدایت پر بٹھایا۔ اور خود سندھ واپس آ گئے۔ انہوں نے ٹھٹے ہی میں وفات پائی۔ ان کے صاحبزادے نے گجرات میں رشد و ہدایت کو عام کیا۔ اور ان کی اولاد بھی ان کے نقش قدم پر چلی۔

مراۃ احمدی میں ہے کہ سید محمد جعفر اپنے صاحبزادے سید احمد کو جب کہ ان کی عمر بارہ سال کی تھی اپنا جانشین کر کے سندھ چلے آئے۔)

راشدی صاحب نے لکھا کہ اس خاندان کے آخری چشم و چراغ سید نورالدین بحمداللہ گجرات میں موجود ہیں جن سے ان کی خط و کتابت ہے تقریباً چھ سو قلمی کتابیں ان بزرگ کو اپنے آباء سے وراثت میں ملی ہیں جس میں اس خاندان کی جو گجرات میں ہے حسب ذیل کتابیں تصنیف ہیں۔

۱۔ مینۃ العارفین۔ مصنفہ سید احمد بن رفیع الدین بن سید جلال محمد بن سید احمد جعفر شیرازی۔ تصنیف ۱۰۲۰ھ۔

۲۔ فتوحات احمدیہ:۔ تالیف سید احمد رفیعی' در مقالات احمد (۲۵ ورق)

(۳) شجرۂ مبارک و منشور خلافت:۔ تصنیف سید جلال بن سید رفیع الدین بن سید جلال محمد بن سید احمد جعفر (یہ نسخہ خود مصنف کے قلم کا ہے)

(۴) رسالہ عربی:۔ تالیف سید احمد بن رفیع بن سید جلال محمد بن سید احمد جعفر شیرازی

(۵) حالات خاندان۔ فارسی میں

(۶) مابۂ عائل (؟) بخط سید جلال شیرازی

(۷) تذکرۃ المراد۔ نقل ۱۲۴۴ھ

(۸) نظم سراجی:۔ بخط قاضی محمد نورالدین حسین مع ترجمہ فارسی

(۹) شجرۂ کامل:۔ اس خاندان کے شروع سے سید محمد نورالدین حسین تک

۳۔ سیّد محمد حسین معروف بہ پیر مراد شیرازی

سندھ میں عرفان و تصوف کے آفتاب سید محمد حسین مشہور بہ پیر مراد شیرازی بن سید احمد کی ولادت باسعادت ۸۳۱ھ میں ہوئی۔ یہ اپنے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے ان کی ولادت

کی خوشخبری سندھ کے مشہور بزرگ سید عیسیٰ لنگوٹی نے دی تھی۔ یہ جام فتح خاں بن جام اسکندر کی حکومت کا زمانہ تھا۔ آپ کی والدہ بی بی فاطمہ نے ۱۷ رمضان (۸۳۶ھ ۱۴۳۲ء) کو وفات پائی۔ اسوقت آپ کی عمر تقریباً چھ سال تھی۔ آپ کے والد محترم سید احمد نے یکم محرم ۸۴۵ھ (۱۴۴۱ء) میں وصال فرمایا، اور ٹھٹے میں قاضیوں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر چودہ سال کی تھی۔

حضرت پیر مراد شیرازی کا شمار سندھ کے قدیم اکابر صوفیائے کرام میں ہوتا ہے انہوں نے سندھ میں عرفان وہدایت کا چراغ ٹھٹے میں روشن کیا جسکی ضیاباریوں نے سارے سندھ کو منور کر دیا۔

حضرت پیر مراد کی عظمت وجلالت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے، جب ٹھٹے تشریف لائے، اور آپ سے ملاقات کی تو فرمایا۔

"تو مراد شائخانی واز تو مرادہا حاصل شوند"

اسی وقت سے آپ کا لقب پیر مراد پڑگیا۔

حضرت پیر مراد نے پچیس سال کی عمر میں ۸۸۶ھ - ۱۴۸۱ء) میں عباسی قاضیوں کے خاندان میں شادی کی انچاس سال کی عمر تک حسب ذیل اولادیں ہوئیں۔

۱۔ سید منصور آپ ۸۸۰ھ - ۱۴۷۵ء) میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲ رجب بروز جمعہ ۹۶۸ھ ۱۵۶۰ء) میں وفات پائی۔ عند علیک مقتدر" سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ آپ نے ۲۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور اپنے والد کے مزار کے مغربی جانب مدفون ہوئے

۲۔ سید نعمت اللہ آپ کے دوسرے صاحبزادے ہیں، جو ۸۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۰۶ھ ۱۵۰۰ء) میں ۲۳ سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی۔ اور اپنے والد کے مزار کے مغربی جانب مدفون ہوئے۔

۳۔ سید حماد آپ کے تیسرے صاحبزادے ہیں جن کا سنہ ولادت ۸۸۴ھ اور سنہ وفات ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء ہے وفات کے وقت انکی عمر ۳۲ سال کی تھی۔ یہ اپنے بھائی سید نعمت اللہ کے مزار کے مغربی جانب مدفون ہوئے۔

۴۔ بی بی فاطمہ آپ کے ایک صاحب زادی بی بی فاطمہ نامی تھیں جو ۸۸۵ھ ۱۴۸۰ء) میں پیدا ہوئیں۔

حضرت پیر سید مراد کی وفات

حضرت پیر سید مراد باسٹھ سال کی عمر میں ۸۹۳ھ کو واصل الی اللہ ہوئے۔ وفات سے پہلے درد سر اور بخار میں مبتلا ہوئے، آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے بعضوں نے یکم ربیع الاول بعضوں نے ۲۔ ربیع الاول اور بعضوں نے ۸۔ ربیع الاول لکھی ہے۔ لیکن صحیح روایت صاحب معارف الانوار کی ہے انہوں نے آپ کی تاریخ وفات ۱۲۔ ربیع الاول بروز دوشنبہ ۸۹۳ھ (۱۴۸۷ء) تحریر کی ہے۔ جو ساجداً او خالصتہ للہ سے نکلتی ہے۔

نماز جنازہ

صحیح روایت کے مطابق آپ کے جنازے کی نماز جام نظام الدین نندا نے پڑھائی۔ جو نہایت دیندار، عدل پرور اور نیک بادشاہ تھا۔ بعض روائتوں کے مطابق آپ کے جنازے کی نماز آپ کے صاحبزادے سید منصور نے پڑہائی۔ لیکن یہ روایت درایتاً صحیح نہیں اس لئے کہ سید منصور اپنے والد کی وفات کے وقت تیرہ سال کے تھے۔

خلفاء

حضرت پیر سید مراد کے حسب ذیل خلفا تھے۔

۱۔ حضرت سید علی اوّل

۲۔ حضرت سید جلال بن سید علی اول

۳۔ شیخ البوۂ

تحفتہ الکرام میں ہے کہ شیخ البرکا اصل نام مارکھ تھا۔ جو جام نظام الدین کے داماد تھے جب حضرت پیر مراد بت خانے کو توڑ کر مسجد صفا کی بنیاد رکھنے لگے تو یہ آپ کو منع کرنے کے لئے آئے تھے لیکن اسی وقت آپ کے مرید ہوگئے، چونکہ انہوں نے حضرت پیر سید مراد کے مرید ہونے پر مکمل طور پر دنیا کو ترک کر دیا تھا۔ اس لئے حضرت سید پیر مراد نے آپ کو البر کا خطاب دیا۔ جس کے معنی ہیں بے طمع۔

شیخ البولھا نے اپنے مرشد کی حیات ہی میں وفات پائی، حضرت پیر مراد اکثر ان کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے ۲؎

۱؎ یہ تمام تفصیل حواشی مکلی نامہ مولفہ سید حسام الدین راشدی ص ۵۴۔۵۲ سے ماخوذ ہے۔

۲؎ تحفتہ الکرام اردو ترجمہ ص ۵۴۷۔

۴ شیخ حاجی محمد حسین صفائی شیخ حاجی حسین کی والدہ حضرت سید پیر مراد کے گھر میں کام کرتی تھیں سندھ کے فرمانروا شاہ حسن ارغون نے دو مرتبہ آپ سے ملاقات کی درخواست کی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔ آپ نے اپنے شیخ کی سوانح عربی میں تالیف کی اور ۹۳۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی تاریخ وفات خیراً والبقا سے نکلتی ہے[۱] وفات کے بعد اپنے پیر کے مزار کے متصل مدفون ہوئے۔ صاحب تحفۃ الطاہرین نے ان کی بہت سی کرامتوں کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ ان کا مزار حضرت پیر مراد کے پائینتی واقع ہے۔[۲]

(۵) شیخ احمد ناہیو ان بزرگ نے اپنے مرشد کی حیات میں ہی وفات پائی۔ ان کا مزار شیخ بوبو کے مزار کے متصل واقع ہے[۳]

۶ شیخ مالھو یہ اصل میں جام نظام الدین نندا کے ملازم تھے، حضرت سید پیر مراد سے بیعت ہوئے اور بقیہ عمر اپنی شیخ کی خدمت میں بسر کر دی، وفات کے بعد شیخ بوبو کے مزار کے مغربی جانب مدفون ہوئے[۴]

۷ شیخ نتھڑ یہ اصل میں ہندو تھے، جب پیر سید مراد مسجد صفہ تعمیر کرا رہے تھے تو یہ آپ کے ہاتھ پر مشرف با اسلام ہو کر بیعت ہوئے۔ اور اپنی ساری زندگی اپنے مرشد کے قدموں سے وابستہ رہے، وفات کے بعد شیخ مالھو کے مزار کے مغربی جانب مدفون ہوئے۔

۸ شیخ عیسیٰ لنگوٹی برہانپوری یہ بزرگ اصل میں برہانپور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے برہانپور سے آکر ساموئی میں سکونت اختیار کی، قلندرانہ انداز میں ایک لنگوٹی باندھے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ان میں اور شیخ حماد جمالی میں

---

۱ تحفۃ الکرام اردو ترجمہ ص ۷۴۵۔

۲ حواشی مکلی نامہ ص ۵۲

۳ تحفۃ الطاہرین ص ۲۱-۲۲

۴ حواشی مکلی نامہ ص ۵۲

۵ " " ص ۵۳

اکثر مسائل پر محققانہ گفتگو رہا کرتی تھی۔ ان ہی بزرگ نے حضرت سید پیر مراد کی ولادت خوش خبری دی تھی اور پھر آپ کی ولادت کے بعد حضرت پیر مراد کے گھر تشریف لائے اور اپنی مریدی کا اقرار کر کے چلے گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس اقرار بیعت کے تین دن بعد حضرت شیخ عیسیٰ لنگوٹی نے ۹۳۱ھ میں وفات پائی، آپ کی تاریخ وفات من ا طیع اللہ بقلب سلیم" سے نکلتی ہے آپ کا مزار مبارک حضرت پیر سید مراد اور حضرت سید علی کے قبرستان کے عقب میں آج بھی زیارت گاہِ خاص و عام ہے[۱]

---

[۱] ترجمہ حواشی مکلی نامہ ص ۵۳ و تحفۃ الکرام اردو ترجمہ ص ۵۶۴ و تحفۃ الطاہرین ص ۲۲ حاشیہ نمبر ا

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

وقار راشدی ایم۔اے

مشرقی پاکستان میں جن واصل اللہ بزرگوں نے اسلامی تعلیمات اور دینی رجحانات کو عام کرنے کی غرض سے اپنی زندگی وقف کردی ان میں شیخ المشائخ حضرت شاہ جلال یمنی سلہٹی المجردؒ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت جلالؒ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے بے شمار انسانوں کو کفر و الحاد، لادینی و اصنام پرستی کی ظلمتوں سے نکالا۔ اور ان کے دلوں کو حق و صداقت کی ضو سے ضیاپاش کیا خصوصاً سلہٹ اور نواح سلہٹ میں پرچم اسلام بلند کرنے کا سہرا حضرت جلال جیسے صاحب جلالت و عظمت بزرگ کے سر ہے سلہٹ میں مبلغ اسلام کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند ہے آپ نے اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں بے پناہ کام کیا اپنے ساتھیوں مریدوں عقیدتمندوں اور ارادتمندوں کو رشد و ہدایت کی مشعلیں دکھائیں جن کی روشنی میں خدا کے نیک و برگزیدہ بندوں نے آیندہ نسل کے گمراہ عناصر کو دین حق کی طرف مائل کیا اور راہِ سلوک و معرفت میں رہنمائی کی۔

حضرت جلال کے حالات و کرامات کا تذکرہ مارچ ۱۹۶۸ء کے الرحیم کے گزشتہ شمارے میں کیا جا چکا ہے۔ حضرت جلال کے ہمراہ تین سو ساٹھ صوفیائے کرام یمن اور دیگر ممالک سے تشریف لائے تھے یہ قافلہ سب سے پہلے کفرستان یعنی سابق آسام کے اس حصے میں خیمہ زن ہوئے جسے سلہٹ کہا جاتا ہے حضرت جلال کی حسب ہدایت یہ اولیائے کرام متعدد جماعتوں میں تقسیم ہوکر مختلف علاقوں کا دورہ کرنے جہاں جہاں بھی جاتے وہاں وہاں اسلام کا جھنڈا بلند کردیتے ایسے ہی بزرگان دین میں وہ مشائخ دین بھی ہیں جن کا ذکر زیر نظر مضمون میں مقصود ہے۔

حضرت شیخ غریب افغانیؒ حضرت شاہ جلالؒ سلہٹی کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے جیسا کہ

آپ کے اسم مبارک سے ظاہر ہے آپ کا تعلق افغانستان سے تھا۔ اس لئے اپنے نام کے ساتھ افغانی تحریر فرماتے اور افغانی ہی مشہور ہوئے آپ ایک باعمل عالم اور پکے دیندار تھے علم ظاہری اور علم باطنی دونوں پر مکمل عبور حاصل کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت شاہ جلال عازم بنگال ہوئے تو سفر کرنے وقت دہلی میں قیام فرمایا وہاں شیخ غریب افغانی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ حضرت شیخ افغانی کو صاحب علم اور واقف دین دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔ حضرت شیخ افغانی حضرت جلال کی ذات بابرکات سے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ دلی کی خوشحال اور راحت افزا زندگی کو خیرباد کہا۔ پہلے چاٹگام اور بعد میں سلہٹ میں مقیم ہوئے حضرت جلال جہاں بھی تشریف لے گئے وہاں حضرت شیخ غریب افغانی آپ کے ساتھ رہے۔ دین حق کی اشاعت اپنے پیرومرشد کی خدمت واطاعت کو اپنا فرض اور مقصود حیات تصور کرتے تھے۔

حضرت شیخ غریب افغانی کا آستانہ تھانہ بالاگنج صدر سلہٹ کے جنوب مشرق جانب تھا۔ حضرت موصوف خوش خلقی اور خلوص ومروت میں یگانۂ روزگار تھے۔ آپ کے اخلاق واخلاص کا چرچا سلہٹ کے گوشے گوشے میں تھا۔ آپ کے اخلاق حسنہ سے مسلمان تو مسلمان ہندو بھی اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ آپ ان صوفیائے کرام میں سے تھے جنہوں نے زیادہ تر بت پرستوں کی بستیوں میں رشد وہدایت کی شمع روشن کی اور اصنام پرستوں کے دلوں کو آفتاب توحید وشمع رسالت سے منور کیا۔ ایک ہندو آپ کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ اس نے نہ صرف خود اسلام قبول کیا بلکہ سارے افراد خاندان کو کلمہ طیبہ پڑھایا۔ اسکے دل میں خدا اور رسول کی عظمت کا کچھ ایسا سکہ بیٹھا کہ اس نے عبادت الٰہی اور خدمت دین کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ آپ کے بلند کردار اور اسوۂ حسنہ کو دیکھکر اس نے اپنی صاحبزادی کی شادی کا پیغام بھیجا اور آپ نے قبول فرمالیا اور فرمایا۔"

"نومسلم افراد کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں شادی بیاہ کا رشتہ استوار کیا جائے اس طرح باہمی ربط وارتباط اور میل جول سے محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہی صفات انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے ہے عبارت ہیں اس سلوک سے اخلاق ومذہب کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا جائے گا۔"

حضرت شیخ غریب افغانی "گبروشاہ" کے نام سے مشہور تھے۔

جس مقام میں آپ کا آستانہ تھا وہ مقام "گبروٹیک" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا کچھ لوگ اس مقام کو "پانچ پیر کا مقام" بھی کہتے تھے۔

حضرت شاہ سید رکن الدین، بھی حضرت سید جلالؒ کے ایک ممتاز مرید تھے آپ نے تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں بنگال کے کئی مقامات کی سیر کی آپ کی خدمات پہلے چاٹگام پھر تریپورہ میں ناقابل فراموش ہیں ان حصوں میں آپ کی معرفت وروحانیت کا فیض عام ہوا۔ آپ ایک جماعت کی شکل میں گلی گلی کوچے کوچے میں چکر لگانے اور دین حق کی دعوت دیتے آپ کی جماعت تین صوفیائے کرام پر مشتمل تھی۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ شاہ سید تاج الدین

۲۔ شاہ سید بہاء الدین

۳۔ شاہ سید شمس الدین

حضرت شاہ جلال کے مریدوں میں حضرت سید رکن الدین نام کے ایک اور درویش کامل کا سراغ ملتا ہے آپ کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں آپ نے سلہٹ کے گردونواح میں خدمت خلق اور عبادت الٰہی کی ایک ایسی مثال قائم کی کہ آنے والی نسل نے نہ صرف آپ کی پیروی کی بلکہ کئی خادمان دین بھی پیدا ہوئے۔ آپ کے انتقال پر ملال کے بعد فیض وعمل کا چشمہ آپ کے عقیدتمندوں کی کوششوں سے جاری رہا۔ آپ کی ابدی آرام گاہ آج بھی سلہٹ میں زیارت گاہِ عالم ہے۔

حضرت شیخ کرم محمد شاہ واقف اسرار ورموز تھے۔ آپ نے حضرت شاہ جلال سے بیعت کی۔ مرشد کی خدمت کو اپنے لئے باعث افتخار ومسرت اور وجۂ نجات تصور کرتے تھے۔ حضرت استاد کی صحبت میں رات رات بھر بیٹھے رہتے تھے۔ اور آپ کی اجازت کے بغیر ٹس سے مس نہ ہوتے تھے یہ بات ابتدا کی ہے جب آپ شریعت وحقیقت کے رموز سے آگاہ ہوئے تو آپ کے مرشد نے حکم دیا کہ سورما ندی کے کنارے جو قصبہ اور گاؤں ہیں وہاں رشد وہدایت کا چراغ جلائیں۔ چنانچہ آپ نے سورما ندی کے کنارے قیام فرمایا۔

آس پاس گھوم پھر کر درس قرآن اور وعظ ونصیحت سے لوگوں کو اللہ ورسول کی راہ میں بلاتے۔ ترپتی ندی کے کنارے آپ کی خانقاہ تھی لوگ دور دور سے آپ کی خدمت میں پہنچتے اور آپ کی

ایمان افروز و روح پرور باتوں سے مستفیض ہوتے اس طرح آپ رشد و ہدایت کی ضو فشانی کے قلوب انسانی کو ضو فگن کرتے۔ آپ کی خانقاہ گویا مرکز علم و معرفت بن گیا۔ جس مقام پر آپ کی خانقاہ تھی آپ کے وصال کے بعد لوگوں نے اس کا نام "شیخ گھاٹ" رکھا۔ آپ کا مزار مبارک اسی جگہ پر ہے اور آپ کی عظمت کی نشان دہی کر رہا ہے۔

حضرت شاہ پتاؒ کے متعلق سلہٹ اور نواح سلہٹ بلکہ بنگال کے بعض حصوں میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں۔ آپ حضرت جلال کے ہم عصر اور ہم پلہ بزرگ تھے۔ بعض مورخوں نے آپ کو حضرت جلالؒ کے مرید اور بعض سوانح نگاروں نے حضرت جلالؒ کے بزرگ ہم عصر بتایا ہے یہ امر بہر حال تحقیق طلب ہے۔ آپ کے فیضان اور کرامات و کمالات کے باعث بنگال کے بعض علاقوں کا ماحول خالص اسلامی ماحول کی شکل میں ڈھل گیا۔ آپ شہر سلہٹ کے جنوب مشرقی جانب بھدروشوتر نامی مقام پر اقامت پذیر تھے۔ آج اس مقام کی صورت بدل چکی ہے لیکن ان کی روحانیت اور رشد و ہدایت کی نشانیاں باقی ہیں۔ آپ کے زمانے میں اس مقام کے جنوبی حصے میں کئی بستیاں آباد تھیں اور کئی دکانیں موجود تھیں۔

حضرت شاہ جلال کے ہمراہ جو تین سو ساٹھ اولیائے کرام یمن سے سرزمین بنگال تشریف لائے تھے ان میں ایک حضرت شاہ کالا مجردؒ بھی تھے۔ حضرت جلال نے ان حضرات کو بنگال کے مختلف گوشوں میں اللہ کے احکامات اور رسول کے پیغامات پہنچانے کے لئے بھیجا۔ حضرت شاہ کالا مجردؒ نے اپنی دینی خدمات کے لئے سلہٹ کے جنوبی بھان گاج کاناپاتی کا انتخاب کیا۔ آپ کا مسکن وہیں تھا جہاں آپ کی خانقاہ تھی۔ اسی جگہ آپ ہوئے آپ کے مزار مبارک کے آس پاس اور کئی مشائخ دین کے مزارات ہیں۔ حضرت شاہ کالاؒ عمر بھر کنوارے رہے اسی لئے آپ "مجرد مونا" بھی کہلاتے تھے۔ جب بھی آپ سے کسی نے شادی کے لئے کہا یہی فرمایا۔

"میں نے دین کے ساتھ شادی کرلی ہے اب کسی اور سے نکاح کی ضرورت نہیں ایک آدمی ایک ہی راستہ اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ گھر گرہستی میں سارا وقت صرف کردے یا اپنے لیل نہار عبادت و ریاضت سے وابستہ کرلے۔ جس نے رشتۂ محبوبی کا دامن مضبوطی سے تھام لیا اسے رشتۂ دنیاوی میں کوئی مزا نہیں آسکتا۔"

حضرت شیتالانگ شاہ المعروف بہ منشی سلیمؒ محلہ کریم گنج کے گھاٹ پرگنہ کے ایک مقام پانچ سٹاکر ہیں مکیں تھے۔ حضرت شیتالانگ شاہ کے مرید بنگال کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپ کے تصوف و معرفت کے قصے بنگال میں عام طور پر سنے سنائے جاتے ہیں۔ مرشدی گیت جن میں ایسے نغمے بھی شامل ہیں جو تصوف و معرفت کے موضوع پر ہوتے ہیں اور جن میں صوفیائے کرام کے کمال کشف و کرامت اور علم و عرفان کا ذکر ہوتا ہے۔

ایسے گیتوں میں آج بھی حضرت شیتالانگ شاہ کا نام سنا جاتا ہے۔

حضرت شاہ رحیم الدین انصاری حضرت شاہ جلال کے حلقۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے آپ کا آستانہ پوب بھاگ جلال پور پرگنہ میں مرجع روحانیت و رحمت تھا۔ آپ نے ساری زندگی اسی مقام پر گزاردی۔ آپ کے متعلق سوانح نگار خاموش ہیں۔

حضرت شاہ جلال کے مریدان کرام میں اور تین حضرات کے تذکرے ملتے ہیں ان حضرات کے اسمائے مبارک یہ ہیں۔

حضرت اللہ دی شاہؒ۔ حضرت کمال الدینؒ اور حضرت علاء الدینؒ۔ جب یہ تین سو ساٹھ صوفیائے کرام کا قافلہ بنگال میں خیمہ زن ہوا۔ یہ تینوں حضرات اپنے مرشد کامل حضرت جلالؒ کی ہدایت پر تبلیغی کاموں کے لئے سلہٹ سے پانچ میل دور مغرب کی طرف سورما ندی کے کنارے اقامت پذیر ہوئے اس زمانے میں وہ مقام بالکل ویران و سنسان تھا۔ آپ حضرات کی کوششوں سے وہاں بستیاں آباد ہوئیں۔ زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی خانقاہیں اور مسجدیں تعمیر ہوئیں ہر چہار طرف اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اللہ اکبر کی صدا سے فضا گونج اٹھی۔ یہ علاقہ معیارچ کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت مولانا شرافت علی کی درگاہِ مقدس گانگ گلؒ نامی گاؤں پالمتوریا پرگنہ واقع ہے۔ آپ نے پاٹی شار چودھری پاڑی ڈھاکا کے ممتاز صوفی حضرت سید امجد علی سے بیعت کی تھی۔ موصوف کی وفات حسرت کے بعد خرقہ خلافت بھی آپ ہی کو سونپا گیا۔

آپ کے ایک اور ساتھی کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ وہ ہیں حضرت بھونگا شاہ آپ کی زندگی بھی خدمت خلق اور خدمت دین کے لئے مخصوص تھی آپ کے بلند کردار اور بے مثال

اخلاق نے بے شمار لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ آپ کی ذات مرجع خاص و عام تھی۔ خصوصاً غریبوں اور مسکینوں سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ عبانگاہ اسٹیشن سے ایک میل دور شمال مغرب جانب حضرت بھونگا شاہ کی آخری آرام گاہ زیارت گاہِ عالم ہے۔

مرثیہ وفات علامہ دوراں مولٰنا عبدالکریم صاحب کور سلیمانی

از تخیل مولوی محمد بنوی فاضل دیوبند

ابر رحمت بحر حکمت نور حق خلق عظیم
انس خلوت نیک فطرت مالک طبع سلیم
طالب اسرار دین و عالم علم یقیں
عارف اصل حقیقت شائق صحبت قدیم
زبدۂ اھل کرامت بندۂ مقبول حق
ذکر گویاں فضل جویاں بر صراط مستقیم
باد نصرت ہردم از کور سلیماں می وزید
خاطر آسودہ شدی از مرض خاطر ہر سقیم
رفت زیں دنیا تو گوئی مرگ دنیا شد پدید
موت عالم در حقیقت رفتن عالم حکیم
چشم گریاں اشک ریزاں از فراق آنجناب
سال رحلت او بگویم نور رخ عبدالکریم

۱۳۶۳ھ

حاتم قادری

شمالی سندھ کا ایک فراموش شدہ شاعر

پروفیسر لطف اللہ بدوی

محمد حاتم قادری مرتب بیاض حاتم، سندھ کے ان نامور شعراء میں سے ہیں جنہوں نے انیسویں صدی عیسوی میں اپنی نغمہ نوازی سے بلند رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ اسکی زندگی کے کوائف آج تفصیل کے ساتھ دستیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن بیاض حاتم سے ان کے حالات کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ بیاض حاتم کا جو قلمی نسخہ میرے سامنے ہے اس کے خاتمہ پر مندرجہ ذیل تحریر موجود ہے۔

تمت الکتاب بعون ملک الوہاب بید اضعف الناس، امیدوار فضل وکرم، ایزد غفار، حقیر پر تقصیر عاصی والخاطی فقیر خان محمد پیرزادہ سکنہ شہر گڈ بجی واقعہ تاریخ غرہ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ روز پنجشنبہ بوقت چاشت تحریر یافت۔

ندارم ہیچ گونہ نیک توراہ بجز لاتقنطوا من رحمۃ اللہ

اس بیاض کے ابتدائی صفحوں پر ناقل نے اپنے اشعار کا اچھا خاصہ اندازہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبع موزوں رکھتا تھا۔ اور فارسی شاعری میں اچھی دستگاہ کا مالک تھا۔ اسکی تصنیف سے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اسکی زور طبیعت کا اندازہ ہو سکے۔

قدم بر سر خاکم بزیارت بگذار تا ز خواب عدم آغوش کشا برخیزم

بدین آرزو ما را یاد روئیت کہ بوسہ بر گل بستان تواں داد

رسیدہ اند بسر چشمی رضا جمعے کہ آب تلخ بجائے گلاب می نوشند

آخری شعر میں شاعر نے، جو تسلیم اور رضا کی تعلیم دی ہے وہ اتنی سادہ اور موثر ہے جسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس مختصر انتخاب سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ خان محمد گو ایک پرگو شاعر تھا۔ شاید اس کا دیوان بھی ہو۔ لیکن مرور ایام نے اسکی جگر کاوی کا اثر معدوم کر دیا۔ زمانہ کی بے مروتی اور بے رخی کا اس سے زیادہ کارنامہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

مصنف بیاض حاتم کی ولادت کا سال اگرچہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن از روئے قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلہوڑوں کے دور حکومت کی پیداوار تھا۔ اور اسکے آخری پر آشوب حصہ کو اس نے دیکھا ہوگا۔ اس ہی کی تصنیف سے ایک قصیدہ میر سہراب خاں ٹالپور کی تعریف میں موجود ہے جس سے یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ میر موصوف کا ہمعصر تھا۔ تاریخ کی یہ حقیقت ہے کہ جب میر فتح علی خاں ٹالپور نے سال ۱۷۸۰ء میں ہالانی کی جنگ میں کلہوڑوں کے آخری تاجدار میاں عبدالنبی کو شکست دے کر اس خاندان کے اقتدار کی بساط الٹ دی اور سندھ کی حکومت پر قبضہ حاصل کر لیا۔ تو میاں عبدالنبی کے فرار کے بعد مستقبل کی دوراندیشی کو مدنظر رکھ کر اس نے بڑی فیاضی اور رواروی سے مفتوحہ ملک کو تین حصوں میں منقسم کر کے اپنے عزیزوں میں بانٹ دیئے اس تقسیم کی رو سے شمالی سندھ کا علاقہ میر سہراب خاں کے حصہ میں آیا۔ میر صاحب نے اپنے حصہ پر قابض ہو کر کوٹ ڈیجی کو سہراب پور کا نام دے کر اپنی قلمرو کا صدر مقام بنایا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حاتم اس زمانہ میں میر سہراب خاں کے ہاں پہنچ گیا تھا اور ملازمت میں منسلک ہو گیا تھا۔

چونکہ حاتم شمالی سندھ کا رہنے والا تھا اس لئے اس نے خیرپور کی دربار کو اپنا ملجا اور ماوی بنایا۔ ورنہ حیدرآباد میں جو اس وقت ٹالپوروں کی مجموعی طاقت کا مستقر تھا۔ اور جہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے ادبا اور شعراء آکر جمع ہو گئے تھے حاتم کو بھی اچھا خاصہ مقام حاصل ہو جاتا لیکن وہ کوٹ ڈیجی کی دربار میں رہ پڑا۔ اور بقیہ زندگی اپنے فیاض آقا کی خدمت میں گزار دی حاتم کے اصلی وطن کی کوئی اطلاع نہیں لیکن قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ وہ رانی پور یا اس کی اردگرد کا رہنے والا تھا۔ لیکن کوٹ ڈیجی میں اس کے اٹھ آنے کے بعد ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے کوٹ ڈیجی ہی کو مستقبل میں اپنا وطن بنایا اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

خان محمد کی دوسری تحریر سے جو بیاض حاتم میں موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بیاض

حاتم کو مرتب کی وفات کے بعد ہی نقل کیا ہوگا۔ اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ وہ سال ۱۲۷۹ء میں زندہ نہ تھے حاتم کے اکثر قصائد میر سہراب خان کے علاوہ میر موصوف کے فرزند میر مبارک خان کی تعریف میں نظر آتے ہیں۔ گویا شہزادہ صحیح معنی میں شاعر کا سرپرست اور ممدوح تھا۔ میر مبارک نے سال ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔ بیاض حاتم میں میر مبارک کی جاں گداز اور بے وقت موت پر نہ کوئی مرثیہ نظر آتا ہے نہ نظم اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم ۱۲۵۴ھ میں بھی زندہ تھا، ورنہ اپنے ممدوح کی موت پر ضرور مرثیہ لکھتا۔ حالانکہ بیاض حاتم میں مراثی کا باب اپنی جگہ پر موجود ہے اور اس باب میں میر سہراب کی موت کی وہ مشہور تاریخ موجود ہے جسکو خان بہادر خداداد خاں نے اپنی تصنیف خیرپور نامہ، میں نقل کیا ہے۔

زبام فلک شد فرود آفتاب سخی و ولی میر سہراب بود

۱۲۴۶ھ

اس موازنہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ شاعر میر سہراب خاں کی وفات سے اور میر مبارک کی وفات سے قبل رہ گرائے عالم بقا ہوا تھا واللہ اعلم بالصواب بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حاتم کی زندگی میر صاحبان کی آغوش شفقت میں بڑے آرام سے گزری۔ آپ قادری طریقہ میں بیعت تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ رانی پور کے خانوادہ قادریہ میں بیعت ہوں اس وقت حضرت احمد شاہ اول گیلانی زندہ تھے، جو بغداد سے ہجرت کر کے رانی پور میں آکر مقیم ہوئے تھے۔ آپکے فیوض کا شہرہ اس وقت دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ اس قریبی فیض کے چشمہ سے حساس شاعر ضرور متاثر ہوا ہوگا۔

بیاض حاتمی۔ اس وقت تک سندھ میں فارسی شاعری کے تین بیاض مشہور ہیں۔ (۱) محک کمال۔ مرتب محسن ٹھٹوی (۲) محک خسروی۔ مرتب محمد بقا۔ (۳) بیاض علوی۔ مرتب جناب عبداللہ حد فرزند حضرت فقیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ اب ان میں بیاض حاتمی بھی شامل کیا جاتا ہے۔

بیاض حاتمی، میں مرتب نے اور شعراء کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کو بھی شامل کیا ہے۔ محک کمال کی طرح ہر انتخاب کے بعد اپنے کلام کو پیش کیا ہے۔ ممکن ہے کہ حاتم کا دیوان بھی ہو لیکن اب اس کا نشان نہیں ملتا۔

چونکہ بیاض حاتمی میں اس کا کلام شعر کے ہر صنف میں موجود ہے۔ اس لئے دیوان کی غیر موجودگی میں بھی اس کے کلام پر اچھا خاصہ تبصرہ ہوسکتا ہے۔ اس بیاض میں جہاں سندھ کے سخنوروں کا فارسی کلام موجود ہے وہاں ایران کے مشہور اساتذہ حافظ، جامی، صائب اور بیدل دہلوی کے کلام کا بھی انتخاب موجود ہے۔

بیاض کی ابتدا مداحؔ ٹھٹوی اور ثابتؔ علی شاہ کے قصیدوں سے ہوتی ہے۔ جو حمد میں اپنی جگہ پر غیر فانی ہیں میں ان دونوں قصیدوں سے انتخاب پیش کر رہا ہوں۔

قصیدہ فی التوحید

مداح

اے قطرہ زنی بادیہ ات گریہ مینا — اے جرعہ کش میکدہ ات نشۂ صہبا

دل سوختہ از خرمن برق غمت کوہ — دیوانۂ دامانِ بیابان تو صحرا

ثمرۂ غم دیدار رخت دیدۂ گرداب — از زلفِ مسلسل ہمہ را سلسلہ برپا

دیوانۂ خود ساختہ ای غالیہ مویاں — خشک از سخن کہنہ کمالات لب دریا

گر از دہن غنچہ ثنایت نکند گل — از دے نشود رائحہ عطر ہویدا

کے لالہ فروزد رخ خود را بربا چین — گر داغ نگیرد ز سجود تو بہ سیما

عکس جمال توچہ معشوق وچہ عاشق — آئینہ روئی توچہ یوسف وچہ زلیخا

یک ذرۂ خورشید جلالت دل مجنوں — یک شعشہ از ماہِ جمالت رخ لیلےٰ

مداح ز توحید تو تا چند نوید

یا من ہو بالحمد علی الکل تعالےٰ

قصیدہ دیگر فی التوحید

ثابت علی شاہ

اے جلوۂ دیدار تو در صورت معنیٰ — حیرت زدۂ حسن تو آئینہ دلہا

یک فروز دیوان جمالت مہ خورشید — یک بیت کتاب کرمت دنیا و عقبیٰ

لہ مولوی مداح ٹھٹہ کے مشہور اور باکمال شاعر محمد حسن کا فرزند تھا۔ باپ کی طرح شعر و سخن میں بڑا کمال حاصل کیا۔ میاں سرفراز کلہوڑہ فرمانروائے سندھ آپ کے شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کا کلام بڑا شیریں اور متین ہے۔

لہ ثابت علی شاہ ملتانی، کرم علی خاں ٹالپور کا ہمعصر اور درباری شاعر تھا۔

در وصف تو شد تختۂ سرمشق تحیر | بر لوح و قلم خشک شدہ الف آسا
آتش زدہ تا تاب جلالت بدل کوہ | از چشم رواں ساختہ صد چشمہ و صحرا
تا پیش محیط کرمت قطرۂ ہیچ است | مستغرق گرداب تحیر شدہ دریا
از نور تو منظور نظر نیست بکونین | آں راکہ بود دیدۂ بدیدار تو بینا
از نور جمال تو کہ مظہر ذات است | یک جلوہ فگن بر دل ایں والہ و شیدا
در بزم شہود از مئی وحدت قدحم بخش | تا وارہم از ہستی بیہودہ و بے جا

ثابت ز خیالات تو مستغرق حیرت
لاشک فی العین ولا غیرک فیہا

یہ مشہور روایت ہے کہ ثابت علی نوجوانی میں اپنے وطن مالوف ملتان سے ہجرت کرکے ٹھٹہ میں آئے تو غلام علی مداح کے درس میں شامل ہوگئے تھے۔ یہاں اسکی واقفیت شہزادہ سرفراز خاں عباسی سے ہوئی تھی۔ دونوں نے شعر و شاعری کی تربیت مداح سے حاصل کی مندرجہ بالا قصیدوں میں بڑی حد تک مماثلت نظر آرہی ہے، اس کا سبب استاد کی زور طبیعت کا شاگرد پر اثر ہے۔

نعت کے عنوان کے تحت، جامع بیاض نے مختلف شعراء کی رباعیوں کو یک جا کیا ہے ان میں سے ایک رباعی سندھ کے نامور تاجدار شاہ حسن ارغون کے نام سے موجود ہے جس کا تخلص سپاہی تھا۔ مرزا شاہ حسن حاکم ہونے کے ساتھ بڑا عالم اور شاعر بھی تھا۔ صاحب تحفۃ الکرام آپ کے ذوق سخن گوئی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں[۱]۔

گاہ گاہے شعر می گفت و سپاہی تخلص می نمود

ارباب ذوق کے مطالعہ کے لئے یہ رباعی یہاں نقل کی جاتی ہے۔

رباعی سپاہی

خورشید محمد کہ خود نور خدا ست | بر نور کہ ہست پیش ایں نور فنا ست
گر سایہ نداشت نور پاکش چہ عجب | بے سایۂ نور بعالم پیدا ست

۱۔ میر علی شیر قانع۔ تحفۃ الکرام۔ حصہ سوم۔ ص ۶۵ (مطبع ناصری)

اس قبیل میں اوحدی کرمانی کی رباعی دیکھنے کی چیز ہے۔

پیغمبر ما کہ حق مایۂ اوست معراج نشاں کمترین پایۂ اوست
کہ سایہ نداشت نور پاکش امروز فردا کہ ہست ہر کہ در سایۂ اوست

بیاض حاتمی، میں جو چیز، دوسری بیاضوں سے اسے امتیاز دیتی ہے، وہ ہے مضامین کی ترتیب حاتم نے اپنے بیاض کی ترتیب ابوتمام طائی کی مشہور تصنیف حماسہ کی طرح قائم رکھی ہے جدا جدا مضامین کے تحت اس نے علیحدہ علیحدہ شعراء کے کلام سے انتخاب جمع کیا ہے۔ مثلاً محبوب کی نزاکت، توصیف ممدوح، شعر کی تعریف، زمستان، تابستان، بہار، انگشتری، ہولی وغیرہ، اس سے مرتب کی کاوش تحقیق اور ذوق مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں یہ تو مشکل ہے کہ بیاض حاتمی کا سیر حاصل انتخاب پیش کر سکوں، لیکن چند منتخب مضامین کو پیش کر سکوں گا۔

احمد یار خاں یکتا، ٹھٹہ کے مغلیہ نوابوں میں سے تھا۔ وہ خوشاب (پنجاب) کے برلاس قوم کے ایک سردار اللہ یار خاں کا فرزند تھا۔ سردار موصوف جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں چالیس سال تک غزنی کا فوجدار رہا۔ احمد یار خاں سال ۱۱۱۶ھ میں سندھ کا نواب مقرر ہو کر آیا۔ آپ کی حکومت کے زمانہ میں یعنی سال ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر وفات پائی۔ اور شہزادہ معظم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ یکتا تین سال تک ٹھٹہ میں مقیم رہا۔ صاحب تحفۃ الکرام کی روایت کے مطابق ہل عالی جان اور قلعۂ ارک کا مشرقی دروازہ، اسکے یادگار تھے!

یکتا کو شعر و شاعری کا خاص ذوق تھا۔ روایت ہے کہ لاہور میں اس کا ایک ہمعصر شاعر محمد عاقل رہتا تھا۔ جس کا تخلص بھی یکتا ہی تھا۔ محمد عاقل نے احمد یار خاں کو کہلا بھیجا کہ تخلص سے اس کے فائدہ میں دستبردار ہو جائے۔ لیکن احمد یار خاں نے اسکو ایک طرحی غزل میں مقابلہ کی دعوت دی کہ جس کی غزل بہتر ثابت ہوئی اس کو اس تخلص کا حق حاصل ہوگا۔

دونوں نے غزلیں لکھیں اور اساتذۂ فن کے سامنے پڑھی گئیں۔ احمد یار خاں کی غزل بھاری ثابت ہوئی۔ اور اساتذۂ فن کے فیصلہ کے مطابق یکتا تخلص کا مستحق احمد یار خاں کو ہی سمجھا گیا۔ کسی شاعر نے یہ شعر اس موقعہ پر کہا تھا۔

بریں معنی گواہیم آفریں ما کہ احمد یار خاں یکتاست یکتا

یکتا کا کلام چند اشعار کی صورت میں مآثر الکرام، میں موجود ہیں، لیکن باقی گمنامی کے پردے میں مدفون ہے لیکن ہم بیاض حاتم کے مرہون احسان ہیں کہ اسکے مصنف نے یکتا کی دو طویل نظمیں سرما اور گرما کے متعلق اس میں نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ یکتا کا منتشر کلام بھی بیاض حاتمی میں موجود ہے۔ تاریخی نکتہ نگاہ سے یہ نظمیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ میں یہاں ان دونوں نظموں سے انتخاب پیش کر رہا ہوں۔

نواب احمد یار خاں یکتا

کیفیت سرما

بسکہ افسردہ شد از شدتِ سرما عالم — ہر موج ہوا ریخت صد برگ از پئے ہم

شعلہ می لرزد، گر دید کبود اندامش — بسکہ از لطمۂ سرسر شدہ پامال ستم

بستہ آتش بدل اخگر سوزندہ چناں — کہ چوں یاقوت تواں کرد نگیں در خاتم

زرد بے نور شد از شدت وی شعلہ شمع — چوں مریضے کہ بکاہش شدہ ہم خواب عدم

از فلک تا بزمیں جرم ہوا بستہ چناں — کہ اگر نالہ کشد از دل غمدیدہ الم

نیم کام لشہ تابندہ و نا رفتہ از راہ — اشک پر کردہ پریچہرہ چکد چوں شبنم

نفس سرو سحاب است کہ از باد بہار — منجمد گشت فرو ریخت بروئے عالم

در چنیں فصل انیس اند بہم آہو و شیر — حملہ از شیر فرو رفت از آہو رم

ہیچکس را خبر نیست ز احوال کسے — یک جہاں شہر خموشاں شدہ بزم عالم

تا کجا شرح و ہم قصہ تشویش ثنا — نیست در فکر بجز درد و غم، رنج و الم

رفتن از خویش بہر جلوہ نشاید یکتا

گرمی و سردی، آتشکدۂ باغ ارم

کیفیت گرما

از بسکہ سوخت شکوۂ گرما دل و دماغ — گشتہ دہاں چراغ زباں شعلۂ چراغ

ہر کس بہ عزم سیر چمن سر بروں کشد — از صحن خانہ تا بجہنم برد سراغ

نخل و شگوفہ گشت ہمہ ارغوان و سرخ — گوئی زیادہ عرق شعلہ زد ایاغ

ہر شاخ در گرفتہ آتش فتیلہ	ہر برگ نخل سوختہ چوں لالہ داغ داغ
صحرا از ریگ تفتہ شرار آتش است	سطح ہوا ز دود سیہ گلہای داغ
طوطی ز بسکہ سوخت دریں فصل بے بہار	بگذاشت نغمہ خود آموخت کاغ کاغ
از آتشِ ہوا پرِ پروانہ در گرفت	خود باغ سوختنی شد بے منتِ چراغ

خوناب دل چو شعلہ آتش دو دیدنی

تا از گداز مغز شود دیدہ تر دماغ

یکتا کی اس منظر نگاری کو، اگر یکتا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ہولی ہندوؤں کی ایک مشہور تقریب ہے، جو آغاز بہار میں منعقد کی جاتی ہے۔ قدیم ایرانیوں میں جس طرح سال کا آغاز نوروز کے جشن سے ہوتا ہے اسی طرح ہندوؤں میں بھی سال کا آغاز ہولی کی تقریب سے ہوتا ہے حاتم نے اس عنوان کے تحت محسن اور مداح کے اشعار کو جمع کیا ہے اور دستور کے مطابق آخر میں اپنے شعر کو تحریر کیا ہے۔

محسن ٹھٹوی

چہ عشرت گر رسد در موسم ہولی ہم آغوشے	بسنتی جامہ پوشے بادہ نوشے جعد بر دوشے
ز ہوشم برد رعنا دلربائے شوخ ہم شنگے	ز خط چار ابرو با کمندے تیغ بر دوشے
عبیر آلود زلف عنبر بینش	سیہ مارے ز گرد آشفتہ حالی
نگارمست ہولی بانہ رنگی	کہ ریزد خون دلہا بے ملالی
بہ پچکاری مگر رنگ رخم برد	کہ از دے میبرد ہر رنگ آلی
ز ہولی بازیش اے کاش محسن	نصیب من شدی مشت گلالی

مداح فرزند محسن

دلم خوں کرد شوخ نازنینے تیغ بر دوشی	گلابی چہرہ بندی شہوار نگت پوشی

حاتم

شہید سرخروئی بزم سربازی تواں شد	کہ طوق گردن تسلیم سازم رنگ ہولی را

مشک کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل اشعار کو جمع کیا ہے۔

رباعی از احمد یار یکتا

ازگلِ طبقے بہادہ کہ ایں روئے من است　　از مشک خطے کشید کہ ایں موئے من است

صد نافہ بباد وداد کہ ایں بوئے من است　　آتش بجہاں در زدہ کہ ایں خوئے من است

ھوتک خاں میر منشی زماں شاہ درانی

سخن شخص معرفِ شخص　　مشک بعاد خبر دہد ہمہ حال

حاتم

گرنہ مشک ست از چہ معنی شد سر زلفین یار

مشک بیز و مشک بوئی و مشک رنگ و مشکبار

بیاض حاتم میں ٹھٹھہ کے ایک اور مغلیہ نواب مرزا رستم بن سلطان حسین (جو ایران کے بادشاہ اسمعیل صفوی کی اولاد میں سے تھا۔ کا کلام بھی موجود ہے نواب موصوف جہانگیر کے دورِ حکومت میں ٹھٹھہ میں آیا۔ بعد میں جہانگیر کی ناراضگی کے باعث اس عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ مرزا رستم کا اس دور کے بہترین شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ صاحب تحفۃ الکرام آپ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

شعر برجستہ می گفت وفدا تخلص می کرد

بیاض حاتم میں آپ کا کلام افراط تفریط سے موجود ہے ایک غزل یہاں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے تاکہ اس کے استادانہ کلام کا اندازہ ہو سکے۔

غزل

دل گشت پارہ پارہ و ہر پارہ کباب　　شد اشک قطرہ قطرہ ہر قطرہ شراب

زاں پارہ پارہ پارۂ یاقوت منفعل　　زاں قطرہ قطرہ قطرۂ دردانہ گشت آب

لعلِ تو چشمہ چشمہ ہر چشمہ کوثر است　　زلفِ تو حلقہ حلقہ و ہر حلقہ سحاب

زاں چشمہ چشمہ چشمۂ حیوان شرمسار　　زاں حلقہ حلقہ حلقۂ صوفی بود خراب

دل گشت رخنہ رخنہ و ہر رخنہ خارغم　　شد آہ شعلہ شعلہ پر سوز چوں شہاب

زیں رخنہ رخنہ رخنہ بنہد فدا فتاد

زاں شعلہ شعلہ شعلۂ نگر در دلِ کباب

ان شعرائے کرام کے علاوہ، جن کا ذکر مجمل طور پر آچکا ہے، بیاض حاتم میں نواب ولی محمد خاں لغاری، وفا لکھوی اور کشن چند بیکس کا کلام بھی کافی انداز میں موجود ہے۔ نواب ولی محمد خاں لغاری حیدرآباد کے ٹالپر حاکموں کا وزیر اور معتمد مشیر تھا۔ آپ سندھ کے شعراء میں بلند رتبہ رکھتے تھے آپ کے کلام میں ایک مثنوی ہیر درانجھہ، اور دیوان بطور یادگار شمار ہوتے ہیں آپ کے کلام سے مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

آں شوخ کے شود بمن ہیسر ہمکنار	یک سو غرور حسن دگر سو جوانیش
آں ماہِ امشب است ہم آغوش باوئی	غیرا دتتار جاں، چہ کند میہمانیش
ناگہاں از خانۂ خماری نوشاں گزشت	درکنارم بے خبر افتاد غلطیدن گرفت

سید وفا لکھی (تعلقہ سکھر) کے رہنے والے تھے۔ اور شاہ فقیراللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ارادتمندوں میں سے تھے۔ اور شعر وشاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، ماہ رمضان کے عنوان کے تحت بیاض حاتمی میں آپ کی نظم موجود ہے۔

یار ما سیر ودیدہ زود برفت	دیر نہ نشست نازنیں میہماں
الوداع اے زمانۂ طاعت	مجلسِ ذکر و محفل قرآں
بلبلے زار زار می نالید	در بہار از فراق وقت خزاں
گفتمش غم مخور کہ باز آید	روزِ نوروز، لالہ و ریحاں
گفت ترسم بقا وفا نکند	ور نہ ہر سال گل وہ بستاں

کشن چند بیکس، میر سہراب خاں کے دور حکومت میں میر منشی کے عہدہ پر فائز تھا۔ فارسی شاعری میں اچھا پایہ رکھتا تھا شاعری کی توصیف میں اسکی ایک نظم بیاض حاتم میں محفوظ ہے۔

زبان تیز تر چوں شاعری نیست	فنونِ شعر غیر از ساحری نیست
دل شاعر بروج آسمان است	بہ شہبازان قدسی آشیان است
سرش چوں برسر زانو کند جا	دلش چوں برسر فکرت نہد پا
ازاں زانو وزاں سر تو چہ پرسی	کہ میدار دنشاں از لوح وکرسی
بساط آسماں را می کند طے	بسوئے عالمے بالا برد پے

ملک در گوشش جانشش راز گوید | چو باز آید بہر جا باز گوید
بقول مصطفیٰ شاعر برآرد | ہر آں گوہر کہ گنجِ عرش دارد
سخن وحی است ما عرشے برانیم | سخن سحر است ما سحر آفرانیم

چہ بیکس سحر اعجاز مسیحاست
حیات ما ز گفتار فصیحاست

بیکس کے تغزل کا یہ رنگ ہے۔

باشوخ صنوبر قد رعنا چہ کنم
با غمزۂ ناز کش من آیا چہ کنم
غوغا باشد با دیدن رخ آخر
از خوف ستم با غم غوغا چہ کنم

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیاض حاتم، انیسویں صدی عیسوی کی ایک قابل قدر تصنیف ہے جس میں اس دور کے چند فراموش شعرا اپنے خدوخال سے سامنے نظر آجاتے ہیں۔

گاہ گاہے باز خواں ایں داستان پارینہ را

ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ارشاد فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ نے قیاس کو اپنی جیب سے نکالا کہ وہ ظاہر حدیث پر قیاس کو از خود ترجیح دینے لگے ہوں بلکہ وہ تو اس چیز کو جو خلاف اصول کلیہ ہو یعنی قرآن شریف اور احادیث مشہورہ کے خلاف ہو اسکو اختیار نہیں کرتے۔ اور اصل کو برہم نہیں ہونے دیتے، خلاف اصول کلیہ کی تاویل کرتے ہیں پھر فرمایا کہ دنیا کے معاملات میں بھی اسی طرح کیا کرتے ہیں کہ جو کچھ فرمان میں اور آئین سلطنت میں لکھا ہوتا ہے۔ اس پر عمل درآمد ہوتا ہے) فرمان و آئین کے خلاف گو بادشاہ کی روایت ہی کیوں نہ بیان کی جائے۔ اسکی تاویل کرتے ہیں پھر فرمایا کہ اپنے اپنے قواعد کے لحاظ سے چاروں مذہب خوب ہیں۔ بلحاظ قواعد کلیہ مذہب حنفی اور بلحاظ قواعدِ حدیث و تنقیح حدیث مذہب شافعی ہے۔

سید احمد شہید رائے بریلوی سے جو کہ حضرت والا کے اکابر خلفاء میں ہیں، عندالتذکرہ فرمایا کہ دنیا بکھیڑے کی جگہ ہے۔ (جو کام ہو) اللہ کے لئے ہو یہی بہتر ہے۔

ایک شخص نے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد کا مفہوم دریافت کیا تو فرمایا۔ کہ علماء قرب علمی اور صوفیہ قرب وجودی مراد لیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے محفل مبارک میں عرض کیا کہ اس زمانے میں حضرت والا جیسا بزرگ (شاید) تمام دنیا میں نہ ہوگا اولیاء اللہ کو امراض لاحق ہوتے ہیں حضرت والا کو بھی متعدد امراض لاحق ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی تعریف میں یہ بات بھی لکھی گئی ہے کہ وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کے حالات کتب ولایت میں مندرج ہیں۔ فضل الٰہی سے حضرت والا کا نام بھی روم، شام، بلخ، بخارا، سمرقند، دمشق مکہ و مدینہ، مصر و عراق بغداد اور علاقۂ فرنگ میں

مشہور ہے اور وہاں کی کتابوں میں آپ کا ذکر خیر ہے۔ حضرت والا نے یہ سن کر تواضع اور انکسار کا اظہار کیا۔ اسی اثنا میں فیض یاب ہونے کی بات بیان فرمائی اور یوں فرمایا کہ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں بائیس بزرگ دہلی میں تھے جو ہر خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور صاحب ارشاد تھے۔ اور ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کہ ایک وقت میں اتنے مشائخ ہر سلسلے کے موجود ہوں)

منجملہ ان بزرگوں کے ایک شاہ دوست محمد قادریؒ بھی تھے۔ ایک دن ان سے کسی نے دریافت کیا آپ کا سلسلہ کون سا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اگرچہ میں (ایک سلسلے میں) ایک بزرگ کا مرید ہوں اور ان سے سلوک کو طے کیا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں نے خدا کو ایک خرمہرہ کے ذریعہ پایا ہے اور اس کا واقعہ اس طرح ہے کہ میں بادشاہ کا ملازم تھا۔ اس کے ایک کام کو انجام دینے کے لئے گرمی کے زمانہ میں نکلا۔ پیاس لگی۔ صراحی دار سے پانی مانگا اسکے پاس بھی پانی نہ تھا۔ سقہ بھی کوئی نظر نہ پڑا۔ قریب بہ ہلاکت تھا۔ ناگاہ اجمیری گیٹ کے قریب ایک سقے سے ملاقات ہوئی ایک کٹورہ پانی ایک خرمہرہ کے عوض دستیاب ہوا۔ میں پانی پینا ہی چاہتا تھا کہ ایک سائل نے بڑی لجاجت اپنی تشنگی کا اظہار کر کے وہ کٹورہ مجھ سے طلب کیا، اگرچہ نفس نہیں چاہتا تھا مگر اس پر قابو پا کر وہ کٹورہ سائل کو دے دیا، جب اس پیاسے نے پانی پینا شروع کیا اسی وقت مجھے ایک خنکی ایک سرور کی کیفیت اور تجلی الٰہی کی جھلک اپنے اندر محسوس ہوئی۔ بعد کو میں نے جو ترک دنیا کا شیوہ اختیار کیا اسکی اصل بنیاد یہی پیاسے کو پانی پلانا ہے۔ مابعد کی سب باتیں اسی کے طفیلی ہوئیں۔

ایک صاحب جو حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر آئے تھے حضرت والا کی خدمت میں آب زمزم لائے حضرت والا برائے تعظیم چارپائی سے نیچے اتر کر کھڑے ہوئے اور بعد دعا قدرے آب زمزم نوش فرمایا۔ اور ایک مرید کو دیا انہوں نے دیگر حاضرین مجلس کو بھی وہ تبرک دیا۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ آب زمزم قدرے کھاری ہوتا ہے اور یہ میٹھا پانی تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دوسرا پانی زیادہ ملا لیا ہوگا۔ ارشاد فرمایا کہ ہم تو معتقد غائبانہ ہیں ہمارے حق میں ہر وہ پانی جو زمزم کے نام سے ہو اور اس سے تھوڑا بہت تعلق رکھتا ہو) زمزم ہی ہے یعنی اس کا ثواب ہم پائیں گے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ آب زمزم جس نیت سے پیا جائے گا حصول مطلب کی امید ہے۔ اور جو شخص آب زمزم شکم سیر ہو کر پئے گا آتش دوزخ اس پر اثر نہ کرے گی۔

ارشاد فرمایا و دماہ ہوئے روضۂ سلطان المشائخ پر حاضر ہوا تھا عجیب کیفیت نمودار ہوئی۔ وہاں کوئی شخص مزامیر سے گا رہا تھا میں اسکی طرف متوجہ نہیں ہوا اور مجھے کوئی ظلمت بھی اس وقت محسوس نہیں ہوئی پھر کسی نے مزار پر سجدۂ تعظیمی کیا۔ اسکی ظلمت مجھے محسوس ہوئی۔

ایک صاحب سے جنہوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے دعا کی درخواست کی تھی۔ فرمایا کہ میں دعا کرتا ہوں۔ اختیار بدست مختار ہے۔

شیخ علی حزیں کا جو کہ مذہباً شیعہ تھے ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ جس وقت وہ دہلی آئے اور ایک حویلی کرائے پر لی تو اس حویلی کے دروازے پر ایک فقیر رہتا تھا۔ وہ بدستور فقراء صبح کے وقت اپنے سلسلے کے بزرگوں کے نام پڑھتا تھا۔ (شیخ علی حزیں کے کانوں میں بھی آواز پہونچتی تھی) ایک دن صاحب خانہ نے شیخ علی حزیں سے حویلی کے متعلق دریافت کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ یہاں ہر قسم کا آرام ہے مگر دروازے پر "تذکرۃ الاولیار" جو بیٹھے ہوئے ہیں ان کو ہٹاؤ۔

فرمایا کہ میں ۲۵ ر رمضان کی رات میں بوقت سحر پیدا ہوا تھا چونکہ والدین کے بہت سے بچے مجھ سے پہلے انتقال کر چکے تھے اس لئے میرے پیدا ہونے پر مجھ سے ان کی بہت سی آرزوئیں وابستہ تھیں اس وقت بہت سے بزرگ اور اولیار حضرت والد ماجدؒ کے خلفاؒ میں سے مثل شاہ محمد عاشق پھلتیؒ وغیرہ کے مسجد میں معتکف تھے مجھ کو غسل دے کر محراب مسجد میں لاکر ڈال دیا تھا۔ گویا کہ نذر خدا کر دیا تھا۔

ہاتھی کی چالاکی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے زمانے ہی میں اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک فیلبان تھا جو ایک درزی سے دوستی رکھتا تھا ایک دن درزی سرخ کپڑا سی رہا تھا۔ ہاتھی کو سرخ کپڑے سے طبعاً محبت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنی سونڈھ کو بار بار اس کپڑے کی طرف لے جاتا تھا۔ درزی سوئی اس کی سونڈھ میں چبھو دیتا تھا۔ اس کے بعد ہاتھی جب دریا پر سے لوٹ کر اس درزی کی دکان پر سے گذرا تو انتقاماً وہ پانی جو سونڈھ میں بھر کر لایا تھا اس طرف پھینکا جس سے دکان کے تمام کپڑے تر بتر ہو گئے۔ درزی نے اقرار کیا کہ جرم میرا ہی تھا کہ میں نے اسکی سونڈھ میں سوئی چبھوئی تھی۔ پھر فرمایا کہ میرے ہی زمانے میں بادشاہ کا ایک فیلبان مر گیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ کوئی دوسرا فیلبان اسکی جگہ مقرر کرے اس لئے کہ فیلبان سابق کا لڑکا کم عمر

تھا اور ہاتھی بہت بڑا اور جنگی تھا۔ مگر ہاتھی نے کسی دوسرے فیلبان کو قابو نہیں دیا۔ مستی و شوخی آغاز کی اور آب و دانہ نہیں استعمال کیا۔ تمام فیلبان حیران ہوئے اور انہوں نے یہ سب ماجرا بادشاہ سے بیان کر دیا۔ بادشاہ بھی حیران تھا کہ کیا کرے۔ ناگاہ ایک سمجھدار شخص بات کی تہ تک پہنچ گیا اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ فیلبان سابق کے بچے کو لایا جائے اس بچے کو لایا گیا پھر تو وہ ہاتھی قابو میں آگیا

اہل دہلی کے بیجا خرچ اور اسراف کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ نواب قمر الدین خاں کی عورتیں پانی سے غسل کرنے کے بعد عرق گلاب سے غسل کرتی تھیں، اور دوسرے نوابوں کے گھروں میں سو سو روپے کے فقط پھول اور پان (غالباً یومیہ) عورتوں کے خرچے میں آتے تھے۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ باوجود اشتداد امراض، حضرت والا کے ہوش و حواس بالکل بجا اور صحیح ہیں۔ یہ قوت ملکیہ ہے طاقت بشری نہیں ہے۔

ارشاد فرمایا کہ مشہور بات ہے اور تجربے میں بھی آئی ہوئی ہے کہ خادمِ علمِ حدیث کے ہوش و حواس خراب نہیں ہوتے۔ اگرچہ اس کی عمر سو سے بھی متجاوز ہو جائے۔ بندے کا تو بچپن ہی سے علم حدیث کا شغل ہے۔

ایک شخص نے اثنا گفتگو میں عرض کیا کہ حضرت والا قطب زمانہ ہیں، ارشاد فرمایا استغفر اللہ۔ پھر فرمایا کہ اسی وجہ سے تو زمانہ خراب ہے کہ مجھ جیسے قطب اس زمانہ میں ہیں۔

ترجمہ قصیدہ مقصورہ

(۳)

پروفیسر وائی ایس طاہر علی

(۸۳) یدیر یا علیطین فی ململمۃ   الی لموحین بألحاظ اللأی

جو دو کانوں کو کھوپڑی میں اپنی نیل گائے جیسی آنکھوں تک گھماتا رہتا ہے۔

(۸۴) مداخل الخلق رحیب شجرہ   مخلولق الصہوۃ ممسود وای

جس کا اندام مضبوط ہے۔ منہ فراخ ہے۔ پیٹھ صاف ہے۔ سرین موٹی ہے۔

(۸۵) لا صکک یشینہ ولا فنجا   ولا دخیس واھن ولا شظا

جس کے گھٹنوں میں کوئی عیب نہیں ہے اور نہ پاؤں میں کوئی عیب ہے۔ جس کے سموں پر اور ڈی پر گوشت چڑھا ہوا نہیں ہے۔

(۸۶) یجری فتکبو الریح فی غایاتہ   حسری تلوذ بجراثیم السحا

جب وہ دوڑتا ہے تو آس پاس کی ہوا گلاٹیں مارتی ہوئی سحا کی جھاڑیوں کی غبار اڑاتی ہیں

(۸۷) لو اعتسفت الارض فوق متنہ   یجوبہا ما خفت ان یشکو الوجی

اگر تیرا ارادہ اس پر سوار ہو کر ساری روئے زمین کے سفر کرنے کا ہو تو یقیناً تو کامیاب رہے گا۔ اور اس سے کسی قسم کی شکایت نہیں سنے گا۔

(۸۸) تظنہ وھو یری محتجبا   عن العیون إن وأی او ان ردی

چاہے وہ ہلکی چال چلے یا سرپٹ بھاگے دیکھتے دیکھتے وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

(۸۹) اذا اجتھدت نظرا فی إثرہ   قلت سنا أومض او برق خفا

اسکے بھاگنے میں نظر کام نہیں کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی روشنی تھی جو چمک اٹھی یا کوئی بجلی تھی جو کوند گئی

(۹۰) کانما الجوزاء فی ارساغنہ والنجم فی جبھتہ إذا بدا

یا اس کی ٹانگوں میں برج جوزا نمودار ہوا اور اس کی پیشانی پر ثریا چمکا

(۹۱) ھما عتادی الکافیان فقد من اعددتہ فینا عنی من نأی

جن پر میرا تکیہ تھا اگر وہ ہوا دینے لگتے ہیں تو مجھے پرواہ نہیں۔ یہ دونوں ساتھی میرے لئے بس ہیں۔

(۹۲) فان سمعت برحی منصوبۃ للحرب فاعلم اننی قطب الرحی

اگر کبھی جنگ چھڑنے کی خبر ملے تو سمجھ لینا کہ ہم مرد میدان ہیں۔

(۹۳) وان رایت نار حرب تلتظی فاعلم بانی مسعر ذاک اللظی

اور جنگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئیں تو سمجھ لینا کہ ہم نے پہل کی ہے۔

(۹۴) خیر النفوس السائلات جھرۃ علی ظبات المرھفات والقنا

ان جانوں کا کیا کہنا جو نیزہ و شمشیر کے سایہ میں پلی ہیں اور ان ہی کے نذر ہو جاتی ہیں

(۹۵) ان العراق لم اْفارق اھلہ عن شنآن صدنی ولا قلی

میں نے عراق کو اور اہل عراق کو دشمنی کی وجہ سے یا خفگی کی بنا پر نہیں چھوڑا

(۹۶) ولا اطبی عینی مذ فارقتھم شیئ یروق العین من ھذا الوری

اور جب سے میں نے ان کو چھوڑا ہے دنیا کی کوئی چیز میری نظروں میں نہیں سمائی۔

(۹۷) ھم الشناخیب المنیفات الذری والناس ادحال سواھم وھوی

اہل عراق کی مثال بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں کی سی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے لوگ تنگ گڑھوں کے مانند ہیں۔

(۹۸) ھم البحور زاخر آذیھا والناس ضحضاح ثعاب واضی

وہ موجیں مارتا ہوا سمندر ہیں اور ان کے اغیار چھوٹے چھوٹے تالاب اور حوض ہیں۔

(۹۹) ان کنت ابصرت لھم من بعدھم مثلاً فاغضیت علی وخز السفا

ان جیسا اگر میں نے کسی کو پایا ہو تو میری آنکھوں میں کانٹا کھٹکے

(۱۰۰) حاشا الأمیرین اللذین أوفدا علیّ ظلاً من نعیم قد ضفا

سوائے ان دو امیروں کے جنہوں نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر نعمتوں سے مالامال کر دیا۔

(۱۰۱) هما اللذان اثبتالي أمـلاً قد وقف الباس بہ علی شفا

جب ناامیدی چھائی ہوئی تھی تب ان دونوں نے میری دلی تمناؤں کو پوری کیں

(۱۰۲) تلافیا العیش الذی رنقہ صرف الزمان فاستساغ وصفا

ان دونوں نے میری زندگی کو سنوارا جو گردش روزگار سے مکدر ہو چکی تھی۔

(۱۰۳) واجریا ماء الحیا لی رغدا فاهتز غصنی بعد ما کان ذوی

میری مثال ایک سوکھی ڈالی کی تھی جسے ان دونوں نے اپنی نوازشوں سے سینچا اور وہ ہری بھری ہونے لگی

(۱۰۴) هما اللذان سموا بناظری من بعد اغضائی علی لذع القذی

ان ہی کے طفیل میں میری آنکھیں اونچی ہونے لگیں حالانکہ اس سے پہلے میری آنکھیں جلن کی وجہ سے نہ کھلتی تھیں۔

(۱۰۵) هما اللذان عمرا لی جانبا من الرجاء کان قدما قد عفا

انہوں نے میری امید کی دنیا بسائی جو پہلے ویران ہو چکی تھی۔

(۱۰۶) وقلدانی منۃ لو قرنت بشکر اهل الارض عنی ما وفی

انہوں نے مجھ پر وہ احسانات کئے ہیں کہ اگر ساری دنیا مل کر ان کا شکریہ ادا کرے تب بھی نہ ہو سکے

(۱۰۷) والعشر من معشارها وکان کا لحسوة فی آذیّ بحر قد طمی

ان کے احسانات کے سوویں حصہ کا حق بھی ادا نہ ہوگا بلکہ وہ بحر زخار میں ایک بوند پانی کے برابر ہوگا۔

(۱۰۸) ان ابن میکال الامیر انتاشنی من بعد ما قد کنت کالشئ اللقی

بے شک ابن میکال نے میرا ہاتھ پکڑا حالانکہ میں ناکارہ ہو چکا تھا۔

(۱۰۹) ومدّ ضبعی ابو العباس من بعد انقباض الذرع والباع الوزی

اور ابو العباس نے میری کوتاہ دستی اور کم مائیگی کے باوجود میرے بازو کو تھاما۔

(۱۱۰) ذاک الذی ما زال یسمو للعلی بفعلہ حتی علا فوق العُلیٰ

اللہ کرے ابو العباس اپنے کارناموں سے جاہ و منزلت حاصل کرے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھے

(۱۱۱) لو کان یرقی احدٌ بجودہ ومجدہ الی السماء لارتقی

اگر جود و سخا کی بنار پر کسی کو بھی شہرۂ آفاق ہونا نصیب ہو سکتا ہے تو اسے ہے۔

(۱۱۲) ما إن اتی بجوفند الا معتف علی اداری علمہ الا ارتوی

کوئی پیاسا پیاس کی گرمی لے کر اسکے سخاوت کے، سمندر پہ پہنچے تو ضرور سیراب ہو کر لوٹے گا۔

(۱۱۳) نفسي الفداء لامیری ومن تحت السماء لامیريّ الفدا

ان دونوں پر میں اپنے جان و مال سے قربان جاؤں۔

(۱۱۴) لا زال شکري لهما مواصلا لفظي او يعتاقني صرف المنى

میں ان کا شکریہ ادا کرتا رہوں گا جب تک میرے جسم میں جان ہے۔

(۱۱۵) إن الأُلى فارقت من غیر قلی ما زاغ قلبي عنهم وما هفا

بے شک میں نے اہل عراق کو بغیر کسی نفرت یا عداوت کے چھوڑا ہے۔ میرا دل اب بھی ان سے لگا ہوا ہے۔ اور میں انہیں نہیں بھولا ہوں۔

(۱۱۶) لکنّ لی عزماً اذا امتطیته لمبهما لخطب فآه فانفآی

لیکن میرا پختہ ارادہ ہے کہ جب کبھی میں کسی مشکل کام کرنے کی ٹھان لیتا ہوں تو وہ مشکل خود بخود آسان ہوتی جاتی ہے۔

(۱۱۷) ولو اشاء ضمّ قطریه الصّبا علیّ في ظلّيّ نعیم وغنی

اگر میں چاہتا تو آغاز عمر سے انجام عمر تک ناز و نعم میں زندگی گذارتا۔

(۱۱۸) ولاعتنی غادة" وهنانة تضنيي وفی ترشافها برا الضنی

اور نازک اندام حسینہ کا گھائل رہتا جس کے لبوں میں شفا ہے۔

(۱۱۹) تفری بسیف لحظها ان نظرت نظرۃ غضبی منک اثناء الحشا

اور جو طیش میں آکر اگر تیری طرف دیکھے تو اسکی نگہ کا تیر تیرے جگر کے آر پار نکل آئے۔

(۱۲۰) فی خدها روض من الورد علی النسرین بالألحاظ منها یجتنی

اور جس کے رخسار دیکھنے میں ایسے دلکش معلوم ہوتے ہیں جیسے کہ نسرین و نسترن کی کیاری میں ایک گلاب کا پھول کھلا ہوا ہو۔

(۱۲۱) لوناجت الاعصم لا نخط لہا طوع القیاد من شماریخ الذری

جو پہاڑی بکری (جسکی آنکھیں سرمگیں ہوتی ہیں اور جسکے پاؤں پر سفیدی ہوتی ہے) سے کچھ کہنا چاہے تو پہاڑی بکری بھی خوشی سے اپنے بسیرے کو چھوڑ کر چلی آئے۔

(۱۲۲) او صابت القانت فی مخلولق مستصعب المسلک وعر المرتقی

اور اگر کوہ ہمالہ کی چوٹیوں پر سادھ لگانے والے سادھوؤں کو اپنا شکار بنانا چاہے۔

(۱۲۳) ألہاہ عن تسبیحہ ودینہ تأنیسہا حتی تراہ قد صبا

تو وہ بھی اپنی تپسیا کو بھول جائے اور مریض عشق ہو جائے۔

(۱۲۴) کانما الصہباء مقطوب بہا ماء حنی وردِ اذا اللیل عسا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوقت شب ان رخساروں میں ایک معطر شراب بھری پڑی ہے

(۱۲۵) یمتاحہ راشف برد ریقہا بین بیاض الظلم منہا واللمی

وہ شراب اسکے لعاب دہن میں میسر ہے جو در دنداں اور لب لعل سے سربمہر ہے۔

(۱۲۶) سقی العقیق فالحزیز فالملا إلی النحیت فالقریات الدُّنا

یہ وہ شراب ہے جو عقیق، حزیز، ملا۔ نحیت اور دوسری چھوٹی چھوٹی بستیوں کی آبیاری کرتی ہے۔

(۱۲۷) فالمربد الأعلی الذی تلقی بہ مصارع الأُسد بالحاظ المہا

اس شراب نے مربد اعلیٰ کو بھی نہ چھوڑا جہاں بڑے بڑے سورما چشم آہو سے گھائل ہو کر چت ہو گئے ہیں۔

(۱۲۸) محلّ کل مقوم سمت بہ مآثر الاباء فی فروع العُلیٰ

جہاں ایسے ایسے سورما ہو چکے ہیں جن کے کارنامے ابًا عن جدٍ شہرۂ آفاق ہیں

(۱۲۹) من الأُلی جوہرہم اذا اعتزوا من جوہرمنہ النبي المصطفیٰ

ان سورماؤں کا خاندان اگر دیکھا جائے تو آنحضرت صلعم سے جا ملتا ہے۔

(۱۳۰) صلّی علیہ اللہ ما جنّ الدجی وما جرت فی فلک شمس الضحیٰ

جب تک کہ دن کے بعد رات آتی رہے اور جب تک آفتاب افق پر تاباں رہے۔ اللہ جل شانہٗ آنحضرت

محمد المصطفیٰ پر درود بھیجتا رہے۔

(۱۳۱) جون اعارته الجنوب جانبا   منها وواصت صوبه یدُ الصّبا

اور جب تک جنوبی ہوا بادل کو چلاتی رہے اور بادِ صبا اس کو برساتی رہے

(۱۳۲) فأی یمانیًّا فلمّا انتشرت   احضانه وامتد کراه غطا

جو سمت یمن سے اٹھے اور اپنے دامن کو پھیلا کر اندھیرا کر دے

(۱۳۳) فجلّل الافق فکلّ جانب   منها کأن من قطره المزن حبا

اور چاروں طرف گھنگور گھٹا ہیں چھا جائیں اور ایسا معلوم ہو کہ چاروں طرف پانی ٹپک رہا ہے

(۱۳۴) وطبق الارض فکلّ بقعة   منها تقول الغیث فی ها تاوی

اور زمین کو ایسا گھیر لے کہ یہ معلوم ہو کہ ہر خطّہ میں بارش ہو رہی ہے۔

(۱۳۵) اذا خبت بروقه عذّت لها   ریح الصّبا تشب منها ماخبا

جب بجلیوں کا کوندنا بند ہو جائے تو پھر بادِ صبا دوسرے بادلوں کو لاکر بجلیاں گرانا شروع کر دے۔

(۱۳۶) وان ونت رعوده حدا بها   راعی الجنوب فحدت کما حدا

اور اگر گرج چمک کم ہو جائے تو جنوبی ہوا اپنا کام شروع کر دے۔ اور وہی آواز پیدا کرے جو ہونی چاہیے۔

(۱۳۷) کانّ فی احضانه وبرکه   برکًا تداعی بین سجر ووحی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بادلوں میں اونٹوں اور اونٹنیوں کا ایک ریوڑ ہے جو باری باری سے بلبلا رہے ہیں۔

(۱۳۸) لم تر کالمزن سوامًا بهّلا   تحسبها مرعیة وهی سدًی

کیا تم نے اونٹنیوں کو ابرِ باراں کی طرح بے بہا چراگاہ میں چرتی ہوئی دیکھی ہیں جو بظاہر رکھوالے کے ساتھ معلوم ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(۱۳۹) تقول للاجراز لمّا استوسقت   بسوقه ثقی بریّ وحیا

جب وہ ابرِ باراں پتھریلی زمین پر برستا ہے تو لوگ چلا اٹھتے ہیں کہ اگر برسے تو یوں برسے۔

(۱۴۰) فناوسع الاحداب سیبا مجسبا　　وطبق البطنان بالماء الرّوی

وہ اونچے پہاڑی علاقوں پر بھی خوب برستا ہے اور وادیوں کو جل تھل کر دیتا ہے۔

(۱۴۱) کانّما البیداء غب صوبہ　　بحرٌ طما تیارہ ثم سجا

بارش کے ختم ہونے پر میدان ایک اتھاہ سمندر معلوم ہوتا ہے جو طوفان آنے کے بعد خاموش ہے

(۱۴۲) ذاک الجد الازال محضوصا بہ　　قوم ھم للأرض غیث وجدا

اس فیض عام سے وہی لوگ محظوظ رہ سکتے ہیں جو روئے زمین پر دوسروں کیلئے باعث رحمت ہیں

(۱۴۳) لستُ اذا ما بھظتنی غمرۃ　　ممن یقول بلغ السیل الزبی

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو واویلا مچادیں اور کہیں کہ اب پانی سر سے اوپر ہو چکا۔

(۱۴۴) وإن ثوت تحت ضلوعی زفرۃ　　تملأ ما بین الرجاء الی الرجا

(۱۴۵) نہنہتھا مکظومۃ حتی یُری　　مخضوضعا منھا الذی کان طغا

اگر میرے سارے جسم میں افسوس کی آہیں بھری ہوئی ہوں تو میں انہیں ضبط کرتا رہوں گا تاوقتیکہ آتشِ آہ سرد پڑ جائے۔

(۱۴۶) ولا اقول إن عرتنی نکبۃ　　قول القنوط انقد فی البطن السّلا

اور اگر مجھے کبھی کسی کی ستم ظریفی سہنی پڑے تو مایوس ہو کر یہ نہ کہوں گا کہ بازی ہار گئے۔

(۱۴۷) قد مارست منی الخطوب مارسا　　یساور الھول إذا الھول علا

مصائب نے مجھ جیسے شخص کو تختۂ مشق بنایا جو بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہے۔

(۱۴۸) لی التواء ان معادیّ التوی　　ولی استواء ان موالیّ استوی

اگر کوئی ہم سے ٹیڑھا ہے تو ہم بھی ٹیڑھے ہیں اور اگر کوئی ہم سے سیدھا ہے تو ہم بھی سیدھے ہیں۔

(۱۴۹) طعمی شریٌ للعدوّ وتارۃً　　والرّاح والاری لمن وُدّی ابتغی

دشمن کے لئے ہم دھتورے کے مانند کڑوے ہیں اور احباب کے لئے مَے وانگبیں ہیں

(۱۵۰) لدن اذا لوینت سھل معطفی　　الوی اذا خوشنت مرھوب الشّذا

اگر میرے ساتھ تلطف اور مدارات سے کام لیا جائے تو میں نرم ہوں اور اگر میرے ساتھ سختی اور ترشی برتی جائے تو میں بھی دو دھاری تلوار ہوں۔

(۱۵۱) یعتصم الحلم بجنبی حبوتی اذا ریاح الطیش طارت بالحبی

جب غیظ و غضب کا طوفان امنڈ پڑتا ہے تو حلم اور متانت مجھے دونوں طرف سے تھام لیتے ہیں

(۱۵۲) لا یطبینی طمع مدنس اذا استمال طمع او اطبی

جب کبھی حرص و طمع نے مجھے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تو میں اس سے دور رہا۔

(۱۵۳) قد علت بی رتبا تجاریب اشفین بی منها علی سبل النهی

(۱۵۴) مجھے کئی قسم کے تجربے حاصل ہوئے جن کی وجہ سے میں نے بڑے رتبے حاصل کئے اور مجھے انہوں نے دانائی اور فرزانگی بخشی۔

(۱۵۵) ان امرؤ خیف لا فراطالاذی لم یخش منی نزق ولا اذی

اگر کسی اور سے ایذا رسانی کا خوف ہو تو ہو مجھ سے کسی اذیت اور کم ظرفی کا احتمال نہیں ہو سکتا

(۱۵۶) من غیر ما وهن ولکنی امرؤ أصون عرضا لم یدنسه الطخا

اس لئے نہیں کہ میں کمزور ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ مجھ میں کوئی ایسی معیوب بات پیدا نہ ہو جو آبرو ریزی کا باعث ہو

(۱۵۷) وصون عرض المرء ان یبذل ما ضن به مما حواه وانتضی

ہر شخص اپنی آبرو کی حفاظت اسی سے کرتا ہے جس پر وہ قادر ہے

(۱۵۸) والحمد خیر ما اتخذت عدة وأنفس الاذخار من بعد التقی

نیک نامی کو اپنا ساز و سامان بنانا چاہیئے کیونکہ خوف خدا کے بعد نیکنامی بہترین چیز ہے

(۱۵۹) وکل قرن ناجم فی زمن فهو شبیه زمن فیه بدا

اگر کسی زمانہ میں کوئی گروہ ترقی کرتا ہے تو اس گروہ پر اپنے زمانہ کا رنگ چڑھا ہوا ہے

(۱۶۰) والناس کالنبت فمنهم رائق غض نضیر عوده مر الجنی

انسان کی مثال ایک ایسے پودے کی ہے جو دیکھنے میں خوشنما اور ترو تازہ نظر آتا ہے مگر اسکی ٹہنیوں میں کڑوا پھول ہوتا ہے۔

(۱۶۱) ومنه ما تقتحم العین فان　　ذقت جناه انساغ عذبا فی اللھا

اور بعض وقت وہ انسان ایسے پودے کے مانند ہوتا ہے جو آنکھوں میں نہیں سماتا لیکن اس کا پھل اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ زبان چاٹتے ہی رہو۔

(۱۶۲) یقوم الشارخ من زیغانه　　فیستوی ما انعاج منه وانحنی

ایک نوعمر کی تربیت آسان ہے کیونکہ اس کا بانکپن نکالا جا سکتا ہے۔

(۱۶۳) والشیخ ان قومة من زیغه　　لم یقم التثقیف منه ما التوی

لیکن عمر رسیدہ انسان کی تربیت کرنا اور اس کی کجی نکالنا غیر ممکن ہے۔

(۱۶۴) کذلک الغصن یسیر عطفه　　لدنا شدید غمزه اذا عسا

اسی طرح نرم ڈالی جدھر چاہو موڑ لو لیکن سخت اور سوکھی ہوئی ڈالی کا موڑنا توڑنے کے مترادف ہے

(۱۶۵) من ظلم الناس تحاموا ظلمه　　وعز عنهم جانباه واحتمی

جس کسی نے ظلم و تشدد سے کام لیا لوگ اس سے بچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس سے مرعوب رہتے ہیں

(۱۶۶) وهم لمن لان لهم جانبه　　اظلم من حیات انبات السفا

لیکن اگر کوئی شخص لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے تو وہ اسے سانپوں کے مانند ڈسنا شروع کر دیتے ہیں

(۱۶۷) عبید ذی المال وان لم یطعوا　　من غمره فی جرعة تشفی الصدی

لوگ خواہ مخواہ دولتمندوں کی خوشامد کرتے ہیں گرچہ دولتمندوں سے انہیں شمہ برابر فائدہ نہیں پہنچتا۔

(۱۶۸) وهم لمن املق اعداء وان　　شارکهم فیما افاد وحوی

اور لوگ خواہ مخواہ غریبوں سے نفرت کرتے ہیں گرچہ غریب لوگ ان کے کاموں میں برابر کے شریک ہیں

(۱۶۹) عاجمت ایامی وما الغر کمن　　تأزر الدهر علیه وارتدی

میں نے زمانے کو خوب پرکھا ہے۔ جس نے زمانہ کو اپنا اوڑھنا، بچھونا بنایا ہو کیسے غافل ہو سکتا ہے

(۱۷۰) لا یرفع اللب بلا جد ولا　　یحطك الجهل اذا الجد علا

علم و عقل بغیر اقبال کچھ کام نہیں آتے اور اگر اقبال بلند ہے تو جہالت کوئی عیب نہیں ہے۔

(۱۷۱) من لم یعظه الدهر لم ینفعه ما　　راح به الواعظ یوما او غدا

جس نے زمانہ کی سردی اور گرمی سے کچھ نہ سیکھا تو وہ واعظ کی لاکھ باتیں صبح شام سنے بے کار ہے۔

(۱۷۲) من لم تفده عبراً ایامه — کان العمی اولی به من الهدی

جس کو گردش لیل و نہار سے کچھ سبق نہ ملا ہو اسے گمراہی مبارک رہے۔

(۱۷۳) من قاس مالم یرہ بمایری — اراہ مایدنو الیہ ما نائی

جو منطق و استدلال سے کام لیتا ہے وہ بعید کو بھی قریب پاتا ہے۔

(۱۷۴) من ملک الحرص القیاد لم یزل — یکرع فی ماء من الذل صری

جس نے اپنی باگ حرص و طمع کے ہاتھوں میں دے دی وہ ہمیشہ ذلت و خواری سہے گا۔

(۱۷۵) من عارض الاطماع بالیاس رنت — الیہ عین العز من حیث رنا

اور جس نے حرص و طمع کا مقابلہ کیا اور اس کو نامراد رکھا وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

(۱۷۶) من عطف النفس علی مکروھا — کان الغنی قرینہ حیث انتوی

اور جس نے نفس امارہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اسے ہر جگہ پر گنجینۂ زر حاصل ہوا۔

(۱۷۷) من لم یقف عند انتھاء قدرہ — تقاصرت عنہ فسیحات الخطا

جو اپنی قدر و منزلت نہ پہچانے اسے تیز گام ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا

(۱۷۸) من ضیع الحزم جنی لنفسہ — ندامۃ الذع من سفع الذکا

جس نے حزم و احتیاط کا دامن چھوڑا اسے ساری عمر کف افسوس ملنا پڑا

(۱۷۹) من ناط بالعجب عری اخلاقہ — نیطت عری المقت الی تلک العری

جس نے خود پسندی کو اپنا کردار بنایا اس نے خود کو دوسروں کی نظریں مبغوض بنایا۔

(۱۸۰) من طال فوق منتھی بسطتہ — اعجزہ نیل الدنا بلہ القصا

جو اپنی حیثیت سے آگے بڑھا اسے آسان چیزیں بھی میسر نہ ہوئیں چہ جائیکہ شکل چیزیں میسر ہوں۔

(۱۸۱) من رام ما یعجز عنہ طوقہ — مِلعب یوماً آض مجزول المطا

جس نے اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھایا اسے سوائے اپنی کمر توڑنے کے کچھ نہ ملا

(۱۸۲) والناس اُلف منھم کواحد وواحدٌ کالالف ان امرٌ عنی

اگر کوئی مشکل درپیش ہو تو ہزار آدمی کچھ نہیں کر پاتے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی ہزاروں آدمیوں پر بھاری ثابت ہوتا ہے۔

(۱۸۳) وللغنی من مالہ ما قدمت یداہ قبل موتہ لاما اقتنی

انسان کی کمائی ہوئی دولت کچھ کام نہیں آتی۔ وہی کام آتا ہے جس کو وہ اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے خرچ کرتا ہے۔

(۱۸۴) وانما المرء حدیث بعدہ فکن حدیثا حسنا لمن وعیٰ

اور انسانی زندگی ایک افسانہ ہے لہٰذا اپنے بعد میں آنیوالوں کےلئے اچھا افسانہ بنو

(۱۸۵) انی حلبت الدھر شطریہ فقد امرّلی حینا واحیانا حلا

میں نے زمانے کے دونوں پہلوؤں کو آزمایا ہے کبھی تو وہ ترش معلوم ہوا اور کبھی شیریں۔

(۱۸۶) وفرّعن تجربۃ نابی فقل فی بازلٍ رامَ الخطوبَ وامتطی

تجربات میرے شاہد ہیں اور مصائب و آلام کا سامنا کرتے ہوئے میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب تجھے حق ہے جو کچھ کہنا ہو کہہ۔

(۱۸۷) والناس للموت خلاً یلسبھم وقلّ ما یبقی علی اللسّ الخلا

انسان موت کی خوراک ہے۔ موت اسے کھائے بغیر نہیں رہے گی پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ موت کے چنگل سے بچے۔

(۱۸۸) عجبت من مستقین ان الردی اذا اتاہ لایداوی بالرقی

(۱۸۹) وھو من الغفلۃ فی اھویۃ کخابط بین ظلام وعشا

مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے کہ اسے یقین ہے کہ موت کسی جادو منتر سے نہیں ٹالی جاسکتی پھر بھی وہ غافل رہتا ہے اور اس شخص کے مانند ہاتھ پاؤں مارتا ہے جو ایک تاریک کنوئیں میں ہو۔

(۱۹۰) نحن ولا کفران للہ کما قد قیل للشارب أخلی فارتعی

ہم. نعوذ باللہ اس چوپائے کے مانند ہیں جو چراگاہ میں چرتا رہتا ہے۔

(۱۹۱) اذا احس نباۃ ریع وان تطأمنت عنہ تمادی ولہا

اور اگر کوئی آواز سن پاتا ہے تو خوف زدہ ہو جاتا ہے اور جوں ہی وہ آواز ختم ہوتی ہے پھر چرنے لگ جاتا ہے اور سب کچھ بھول جاتا ہے۔

(۱۹۲) کثلۃ ریعت للیث فانزوت حتی اذا غاب اطمأنت أن مضی

مثل اس ریوڑ کے جو شیر سے خوف زدہ ہو کر ایک طرف ہو جاتا ہے لیکن جیسے شیر آنکھوں سے دور ہوا اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ آفت ٹل گئی۔

(۱۹۳) نہال للامر الذی یروعنا ونرتعی فی غفلۃ اذا انقضی

ہم پر بھی کبھی خوف طاری ہوتا ہے اور جب خوف نہیں رہتا تو ہم کھانے پینے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

(۱۹۴) ان الشقاء بالشقی مولع لا یملک الرد لہ اذا اتی

بلاشک بدبخت انسان بدبختی میں الجھا رہتا ہے اور اسے کسی صورت میں نجات نہیں ملتی۔

(۱۹۵) واللوم للحر مقیم رادع والعبد لا یردعہ الا العصا

شریف آدمی کے لئے ایک ڈانٹ ہی کافی ہے۔ لیکن لاتوں کے دیو باتوں سے نہیں مانتے۔

(۱۹۶) وآفۃ العقل الھوی فمن علا علی ھواہ عقلہ فقد نجا

خواہشات نفسانی عقل کی دشمن ہیں۔ جس کسی نے عقل سے خواہشات کو مغلوب کر لیا تو اسکا کیا کہنا

(۱۹۷) کم من اخ مسخوطۃ اخلاقہ اصفیتہ الود لخلق مرتضی

کئی لوگ ہیں جنکے اطوار ناپسندیدہ ہیں لیکن میں ان کا کسی خاص بات کی وجہ سے شیدا ہو گیا۔

(۱۹۸) اذا بلوت السیف محمودا فلا تذممہ یوما أن تراہ قد نبا

قاعدہ ہے کہ اگر آزمائی ہوئی تلوار کا وار خالی بھی جائے تو برا نہیں کہتے۔

(۱۹۹) والطرف یجتاز المدی وربما　　عن لمعداه عثار فکبا

اچھے گھوڑے اکثر بازی لے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھار انہیں ٹھوکر لگتی ہے اور وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔

(۲۰۰) من لک بالمھذب الندب الذی　　لا یجد العیب الیہ مختطی

ایک نستعلیق اور اوصاف حمیدہ والا انسان کہاں مل سکتا ہے جو بالکل بے عیب ہو۔

(۲۰۱) اذا تصفحت امور الناس لم　　تلف امرءًا حاز الکمال فاکتفی

جتنا چاہو ڈھونڈو۔ تمہیں ایسا شخص ملنا ناممکن ہے جو باکمال ہو اور اس میں کوئی نقص نہ ہو۔

(۲۰۲) عوّل علی الصبر الجمیل انہ　　امنع مالاذ بہ اولوا الحجا

سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ عقلمندوں کیلئے صبر ہی بہترین آسرا ہے

(۲۰۳) وعطفت النفس علی سبیل الاسی　　اذا استفز القلب تبریح الجوی

جب کبھی پراگندگی خاطر سے انسان دوچار ہو تو اسے چاہیئے کہ صبر کا دامن تھامے

(۲۰۴) والدھر یکبو بالفتی وتارۃ　　ینھضہ من عثرۃ اذا کبا

ہوتا آیا ہے کہ بھلے چنگے انسان چلتے چلتے گر پڑتے ہیں اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گرا پڑا انسان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(۲۰۵) لا تعجبن من ھالک کیف ھوی　　بل فاعجبن من سالم کیف نجا

کسی خانماں برباد کی بربادی پر تعجب نہ کرو بلکہ تعجب اس بات پر کرو کہ کوئی کیسے دامن بچا کر نکل گیا۔

(۲۰۶) إن نجوم المجد أمست أفّلا　　وظلّہ القالص اضحی قد ازوی

وہ بزرگ کہاں ہیں جو مثل انجم تاباں تھے اب تو ہم ان کے سایہ کو بھی ترستے ہیں

(۲۰۷) الا بقایا من اناس بھم　　الی سبیل المکرمات یقتدی

اب بھی چند ہستیاں موجود ہیں جنہیں دیکھ کر امنگیں بڑھتی ہیں اور ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

(۲۰۸) اذا الاحادیث انتقصت اقبارهم کانت کنشر المرحنی غاداه الندی
جب کبھی ان کا ذکر کسی محفل میں ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک
(۲۰۹) پھول کی کیاری ہے جس پر صبح کے وقت اوس پڑی ہے۔
لا یسمع السامع فی مجلسهم هجواً اذا جالسهم ولا خنا
ان کی محفل میں بیہودہ باتیں اور فحش کلامی کا گذر ہی نہیں۔
(۲۱۰) ما انعم العیشة لو أن الفتی یقبل منه الموت اسناء الرشا
زندگی کتنی پر لطف ہو اگر موت رشوت لیکر ایک بھلے چنگے انسان کو چھوڑ دے
(۲۱۱) أو لو تحلی بالشباب عمره لم یستلبه الشیب هاتیک الحلی
یا اسے شباب جاودانی نصیب ہو جو بڑھاپے کی شکل ہی نہ دیکھنے پائے
(۲۱۲) هیهات مهما یستعر مسترجع وفی خطوب الدهر للناس اسی
افسوس ادھار لی ہوئی چیز لوٹانی پڑتی ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو نیرنگی
روزگار دیتا ہے۔
(۲۱۳) وفتیة سامرهم طیف الکری فسامروا النوم وهم عبد الطلی
کئی لوگ ہیں جو خیالی منصوبے بناتے ہیں اور خواب خرگوش میں
(۲۱۴) گردن ٹیڑھی کئے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔
واللیل ملق بالموامی بر که والعیس ینبش أفاحیص القطا
زمانہ انہیں ایسے وحشت ناک بیابان میں لے جا کر پھینک
دیتا ہے اور کاروان زندگی اپنا کام کرتا رہتا ہے (اونٹ
بھٹ تیتر کے گھونسلوں کو بدحال بنا دیتے ہیں)
(۲۱۵) بحیث لا تهدی لسمع نبأة الا نئیم البوم او صوت الصدی
جہاں اس کے کانوں میں سوائے نر یا مادہ الو کی آواز کے کوئی دوسری آواز نہیں آتی
(۲۱۶) شایعتهم علی السوی حتی إذا مالت اداة الرحل بالجبس الدوی
میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور دیکھتا رہا کہ بعض احمق نیند

ہیں ایک طرف جھکے ہوئے ہیں اور ان کے کجاوے آڑے ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔

(۲۱۷) قلت لصحبان الھوینا غبھا   وھن مجذ واتھمد واغب السری

تب مجھے کہنا پڑا کہ آرام کی نیند فطری طور پر کمزوری پیدا کرتی ہے۔
جلدی چلو صبح ہوتے ہی اسکے فوائد معلوم ہو جاینگے۔

(۲۱۸) وموحش الاقطار طامر ماؤہ   مدعثر الاعضاد مھزوم الجبا

ہم کو کئی کنوئیں ملے جن کی دیوار کے پتھر گر پڑے تھے اور جس کا چھوٹا حوض
شکستہ اور ریختہ ہو رہا تھا ان کنووں کے پانی کی سطح اونچی ہو گئی تھی۔

(۲۱۹) کانما الریش علی ارجائہ   زرق نصال ارھفت لیمتھی

اور پرندوں کے بال دیواس پر پڑے ہوئے تھے اور ایسے معلوم ہوتے
تھے کہ گویا تیز دھاری والے تیر ہیں جو کسی لوہار نے پانی میں ڈال رکھے ہیں۔

(۲۲۰) وردتہ والذئب یعوی حولہ   مکستم السمع من طول الطوی

ہم ان کنووں پر آئے اور ہم نے دیکھا کہ ان کے پاس بھیڑیے چلا رہے
ہیں اور بھوک کے مارے کچھ نہیں سن پاتے۔

(۲۲۱) ومنتج ام ابیہ امہ   لم یتخون جسمہ مس الضوی

(۲۲۲) أفرشتہ بنت اخیہ فانثنت   عن ولد یوری بہ ویشتوی

اور کئی ٹہنیوں کو جن کی ماں اور دادی (یعنی زمین جس میں آگ رہی تھی)
ایک ہی تھی اور جو باوجود لاغری کام دے سکتی تھی۔ ہم نے اس کی بھتیجی
یعنی دوسری شاخ سے نکلی ہوئی ٹہنی) کے ساتھ لٹایا۔ چنانچہ ایک بچہ پیدا
ہوا (یعنی ایک ٹہنی کو دوسری ٹہنی سے ٹکرا کر چنگاری پیدا کی) اور آگ جلا کر گوشت بھونا

(۲۲۳) ومرقب مخلولق أرجاؤہ   متصعب المسلک وعر المرتقی

(۲۲۴) والشخص فی الآل یری لناظر   یرمقہ حیناً وحیناً لا یری

(۲۲۵) اوفیت والشمس تمج ریقھا   والظل من تحت الحذاء محتذی

اور ہم ایسی بلند جگہ سے جہاں جانا یا چڑھنا مشکل تھا ایسے وقت میں گذرے

جب کہ سراب میں کوئی چیز دِکھائی نہیں دیتی تھی اور سورج
بھی نہایت آب و تاب سے سمت الراس پر چمک رہا تھا۔

(۲۲۶) وطارق یو لسم الذئب إذا | نضور الذئب عشاءً والضوی
(۲۲۷) اوی الی ناری وھی مألف | یدعو العفاۃ ضوءھا الی القری

کئی مسافروں نے جن کا کوئی ہمدم نہیں سوائے ان بھیڑیوں کے جو
رات ہوتے ہی چلانا شروع کرتے ہیں آگ کو دیکھ کر میرے پاس
آئے۔ بے شک آگ کی روشنی ہی محتاج لوگوں کو صلائے
عام دیتی ہے کہ آؤ اور کھانا کھاؤ۔

(۲۲۸) للہ ما لیف خیال نائر | تزفہ للقلب احلام الکری
(۲۲۹) یجوب أجواز الفلا محتقرا | ھول دجی اللیل اذا اللیل انبری
(۲۳۰) سائلہ ان انسح عن انباءہ | أنی تسدی اللیل ام انی اھتدی

عجیب عجیب خیالات ہیں جو خواب بن کر انسان کے دل میں پیدا
ہوتے ہیں اور گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں لق و دق میدانوں
میں سفر کرنا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اگر یہ خیالات اپنی زبان
حال سے بتا سکیں تو ان سے پوچھو کہ رات کیسے گذری اور کہاں گذری

اوکان یدری قبلھا ما فارس | وما اھیبھا القفار والقری

اور یہ بھی پوچھو کہ کیا انہیں معلوم تھا کہ فارس کا علاقہ کہاں
ہے اور اس میں کیسے کیسے بے آب و گیاہ میدان ہیں اور کیسی
کیسی بستیاں ہیں۔

ترجمہ

تاویل الاحادیث

(ادارہ)

علما، جو انبیاء کے ورثاء ہیں) وہ اس سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نفس سے کسی مخصوص واقعہ کی مناسبت ہوتی ہے، پھر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اصل فطرت کی جزئی حوادث سے مناسبت ہوتی ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنکی اصل فطرت بڑے امور سے مناسبت رکھتی ہے۔

دوسری چیز (جس میں تاویل احادیث کے عالم کو سوچنا ضروری ہوتا ہے) یہ ہے کہ نفس کی دنیوی موانع سے خلاصی چند مخفی اسباب کی بناء پر ہوتی ہے، بعض مشغولی تو اصل نفس کے آرام کا باعث بنتی ہے اور نفس (ایسی حالت میں) صرف آرام میں مشغول رہتا ہے۔ اور کبھی (کسی چیز) میں رغبت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس میں غور و فکر کرنے کی طرف پہنچاتی ہے اور کبھی مزاحمت ہوتی ہے تو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔

ان امور میں یہ بھی ہے کہ آپؑ کے نفس اور اس کے جمیع متعلقات کو عظیم برکت عطا ہوئی تھی۔ برکت کی حقیقت یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ کی رحمتوں، دعاؤں اور رضا سے ایک وسیع سبب بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ سبب اسکے نفس کے ساتھ مل جاتا ہے اس سے طبعی اسباب میں بسط پیدا ہوتا ہے، پھر عادت میں نفسانی حالت کبھی ایسی ہوتی ہے کہ جس سے انسان کو بھوک کا احساس نہیں ہوتا۔ اور بدن کے اجزاء حرارت غریزی کی وجہ سے نہیں گھلتے۔ جیسے طبیعت کا کسی بیماری کو دفعہ کرنے میں مشغول ہونا۔ یا شرمندگی، خوف، حمیت وغیرہ کا احساس، اس حالت کی لیاقت خود

نفس اور بدن سے ہی پھوٹتی ہے۔ پھر جب برکت نازل ہوتی ہے اور اس استعداد سے مل جاتی ہے تو ایک بڑی مدت تک عقل کی مقتضا سے زیادہ قوت سے بدن میں اسکو روک دیتی ہے۔ اور برکت والا انسان جب اس اثر کے ظہور کا ارادہ کرتا ہے تو صمد اور قدوس جیسے اسمار حسنہ کے ذکر سے تمسک کرتا ہے۔ تاکہ اپنے نفس کو اس نفسانی حالت کی طرف متوجہ کرے یا برکت کو اس صورت میں تشخیص کر دے۔

بعض نفسانی حالات عادتاً ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے حملہ کرنا، نیند اور بے خوابی جیسی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے دل کا انبساط، حمیت، رغبت، خوف وغیرہ کا پیدا ہونا اس حالت کے لئے ایک استعداد کا ہونا ضروری ہے۔

جب یہ برکت نازل ہوتی ہے تو اگر اس استعداد سے آکر مل جاتی ہے تو اسکے حملے اور بے خوابی کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے ساتھ اور دوست کے افعال اور ہیات کو دیکھتا ہے تو ان سے اس کو ایسے پوشیدہ امور کی معلومات حاصل ہو جاتی ہے جو اسکے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہوتی اور نہ اسی کو خود کسی دوسری حالت میں ایسی معلومات حاصل ہو سکتی ہے اور اس حالت کے لئے ایک استعداد ہوتا ہے، جب اس استعداد سے برکت کی ملاقات ہوتی ہے تو خلاف عادت، فراست کو واجب اور ضروری قرار دیتی ہے۔ ہر نفس میں اپنے رب تبارک وتعالیٰ اور اسکے شعائر میں اعتقاد رکھنے کی ایک صورت ہوتی ہے، اسی طرح اس کے قلب کو جس چیز کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے تو اس کی بھی کوئی شکل اور صورت ہوتی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی پوری ہمت کے ساتھ اس اعتقاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اعتقاد کسی نہ کسی شکل اور صورت میں نمودار ہوتا ہے اور یہ اکثر تو خواب میں ہوتا ہے اور کمتر بیداری میں بھی ہوتا ہے پھر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس استعداد کے وقت اسکے ساتھ برکت مل جاتی ہے تب وہ ایسی تجلیات اور مبشرات کو ضروری قرار دیتی ہے جس کے ارد گرد عام لوگوں کی پہنچ نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ خبر کے لحاظ سے متواتر معجزوں میں سے ایک معجزہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی طعام یا پانی پر دعا فرماتے تھے تو اس میں بہت برکت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی یا تو یہ صورت ہوتی تھی کہ صرف شئے کا نفع بڑھ جاتا پھر وہ شئے نا ئد نفع کی جگہ لے لیتی یا وہ خود شئے بھی بڑھ جائے۔

اور اس کا مادہ ملأ اعلیٰ کی ہمتوں کے انوار کا مطیع ہو جاتا اور پھر وہ پانی اور طعام کی شکل اختیار کر لیتا۔ عادت میں اس کی نظائر موجود ہیں ان دونوں خصلتوں میں مفہمین اور اولیا بھی آپ ؐ کے ساتھ شریک ہیں اس لئے اولیاء کے مناقب کی کتابیں اس قسم کی کرامات سے تجھے پُر دکھائی دیں گی۔

مثلاً کشف، دل کی بات بتانا۔ ہاتف، دعا کا مستجاب ہونا وغیرہ۔

دوسرا معجزہ یہ ہے کہ قلیل الوقوع اسباب کی بناء پر کم واقع ہونے والے واقعات ظاہر ہوتے ہیں ان کو خوارق (عادت کے خلاف امور) کہا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کو خرق یا عادت کے خلاف کہا جاتا ہے۔ وہ فی الحقیقت امور عادیہ سے ہوتی ہے، لیکن جب کہ اس کے اسباب کم واقع ہوتے ہیں اس لئے اس کا ظہور بھی کم ہی ہوتا ہے اور عام لوگوں کو ایسی چیزوں کی توقع نہیں ہوتی اس لئے ان کو خوارق (عادت کے خلاف امور) کہا جاتا ہے، امر خارق کے لئے اکثر طور پر نظیر ہوتی ہے جو لوگوں کے ہاں مالوف ہوتی ہے یا امر خارق سے بھی خارق عادت میں اتم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی طرف عام لوگ التفات نہیں کرتے۔ جب ان کے ہاں کوئی امر خارق بڑی اہمیت اختیار کرتا ہے اور اس سے لوگ متعجب ہوتے ہیں اور لوگوں کی زبان پر اس کا عام ذکر ہوتا ہے اور اس کو تواریخ میں درج کرتے ہیں۔ جیسے معمولی مدت میں پانی کا سنگ مرمر بن جانا تو اس کی طرف (عامۃ الوقوع ہونے کے سبب) التفات نہیں کرتے، لیکن ایک جسم سے کوئی دوسرا جسم بن جائے۔ جس کی ان کو توقع نہ تھی اور نہ وہ ان کو معلوم تھا تو اس کو بڑا کارنامہ خیال کرتے ہیں۔

کبھی کوئی چیز ایک جنس میں خلاف عادت شمار کی جاتی ہے تو دوسری جنس میں اس کو ایسا نہیں سمجھا جاتا، جیسے گہری فراست، بڑی مسافت کو کم مدت میں طے کرنا مختلف صورتیں اختیار کرنا اور دوسرے کے نفس میں تاثیر کرنا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ جنوں میں مالوف ہیں اور ان کی طرف سے کچھ بھی تعجب کی باتیں نہیں ہیں، لیکن ان میں سے اگر کوئی ایک چیز بھی انسان سے صادر ہوتی ہے تو اس کو بہت بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس قسم کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالےٰ اپنے انبیاء میں سے کسی نبی کے لئے کسی وجہ سے ان کو معجزہ کرتا ہے۔ جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ نبیؑ اس واقعہ کے ظہور سے پہلے ہی اس کی خبر دے دیتا ہے یا وہ حادثہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت مجازات

وغیرہ کے موافق ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالےٰ نے عاد اور ثمود کی قوم کو ان کے ان گناہوں کی وجہ سے ہلاک و برباد کیا۔ جو وہ موجب ہلاک تھے۔ پھر اسکو اللہ تعالےٰ نے ہود اور صالح علیہما السلام کے لئے معجزہ کردیا۔ ایک ایسے عالم نے (جسکو حدیث احکمت طبیعی کی معرفت ہے) فرمایا ہے کہ چاند کا شق ہونا نکہ معجزہ کی قسم سے ہے، کیوں کہ یہ بھی قلیل الوقوع حادثہ تھا، اسکو اللہ تعالےٰ نے قرب قیامت کی علامت قرار دیا ہے اور شق القمر کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس لحاظ سے معجزہ بنایا کہ لوگوں نے آپ سے ایک علامت (معجزہ) کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالےٰ نے یہ خبر دی کہ ہم ان کو جلد نشانی دکھائیں گے جب چاند دو ٹکڑے ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دکھایا (اس میں) یہ ضروری نہیں ہے کہ اسکے دو ٹکڑے ہونا حقیقی چاند میں ہوا ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ دھویں کی طرح یا ستارہ گرنے یا کسوف اور خسوف سے لوگوں کو جو (اور فضا) میں دکھائی دیتا ہے، پھر ان کے لئے عربی لغت میں وہ الفاظ استعمال کئے گئے جو فی الواقع ان چیزوں کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور قرآن لغت عربی میں نازل ہوا ہے۔ اس کی نظیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ذکر کیا ہے اور ان کی اقتدا تیرے لئے کافی ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو قحط سالی نے گھیر لیا اور جب وہ دیکھتے تھے تو بھوک کے مارے، ان کو آسمان میں دھواں دیکھنے میں آتا تھا۔ اسکے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

(ترجمہ) یاد کر، جب آسمان سے دھواں نمودار ہوگا۔[1]

ابن ماجشون نے (جو کہ ائمہ ہدایت میں سے ایک امام ہیں) فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ایک صورت سے دوسری صورت میں خداپاک کی تحویل نہ ہوگی، لیکن لوگ ظاہر میں اسکو مختلف صورتوں میں مشاہدہ کریں گے۔ ابن ماجشون نے یہ بھی کہا ہے کہ میرے رائے میں اس حادثے کا سبب پانی کے صاف ملے ہوئے اجزا کا ایک سطح کی طرح جمع ہونا ہے جسکے عقب میں جبل یا گاڑھا بادل ہو اور یہ آئینے کی طرح بن جاتا ہے جس میں چاند کا عکس پڑے تو لوگ اس کو جوّ میں دو چاند دیکھیں گے، کبھی وہ منطبع ہوتا ہے جو آسمان میں نہیں ہوتا اور کبھی اصلی چاند چھپ جاتا ہے اور جوّ میں دو ٹکڑے نمودار ہوتے ہیں اور اسکی مثال چاند گرہن سورج گرہن اور ستارے

---

[1] بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ذکر کیا ہے کہ یہ اس لئے ہوا کہ جب قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تو آپؐ نے ان کے حق میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کی قحط سالی کی طرح بددعا فرمائی، پھر ان کو قحط اور تکلیف نے گھیر لیا اور وہ طعام نہ ملنے کی وجہ سے ہڈیاں کھانے لگے، پھر اگر کوئی شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کے مارے اس کو دھواں دیکھنے میں آتا تھا۔ اس کے حق میں یہ آیت "فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین" نازل ہوئی۔

کے گمرسنے کی ہے، بے شک نص میں آیاہے کہ یہ سب آیات ہیں۔

میں (شاہ صاحب) کہتا ہوں کہ میں نے مذکورہ قول کو بطور امکان اور احتمال کے ذکر کیاہے ورنہ تو اللہ کی قدرت بڑی وسیع ہے۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس مسئلے اور اس کے مشابہ متشابہات میں جیسے خدا کے لئے ہاتھ کا ہونا پیر کا ہونا اور قیامت کی دوسری چیزوں میں راہِ راست یہ ہے کہ ان کے ظاہر کو دیکھا جائے اور ان کے وجود کی کیفیت میں مشغول نہ ہوں، بہرحال یہ اعتقاد رکھے جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ارادہ فرمایا ہے وہ حق ہے، مقصد کے تعین یا عدم تعین میں کوئی بھی رائے ظاہر نہ کرے تم اس طرح دیکھو گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہؓ اور ان کے پیروکار تابعین یہ سب اس بحث میں نہیں پڑتے تھے، جب معتزلہ نے فلسفیوں کے علوم کو چرایا تو وہ ان مباحث میں مشغول ہوگئے اور اہل سنت نے پھر اسکو معتزلہ سے لیا۔ تو یہ بات ان میں بھی آگئی۔ ہم نے اپنے بعض کلام میں فلسفیوں سے معتزلہ کی چوری اور پھر اہل سنت کی معتزلہ سے چوری کی ایسی وضاحت کی ہے کہ اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہوسکتی، تمہیں اس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

دنیا میں جو عجیب واقعات ہوتے ہیں ان کے جملہ اصول پر ہم کو تجھے آگاہ کرنا چاہیئے۔ جاننا چاہیئے کہ ہمارے نزدیک تمام عالم ایک شخص کی طرح ہے، اس کا ایک بدن ہے اور ایک نفس ہے۔ جو اس سے متعلق ہے اور اس کے بدن کے لئے نفس کی تدبیر کا انتظام بھی ایک ہی طرح کا ہے۔ موالید اربعہ، معدن، نبات، حیوان اور انسان میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں ان سب کی مثال آئینہ میں عکس کی مثال ہے۔ عناصر میں ستاروں کے قوتوں کے اتصالات کی صورت کا عکس پڑتا ہے، کسی دوسری چیز کا عکس نہیں پڑتا۔ اور جس طرح آئینے کی صورت منطبعہ یا عکس میں صورت اور ذی صورت دونوں کا حکم جمع ہوتا ہے تو اسی طرح حوادث میں بھی ستاروں کے اتصالات اور عناصر دونوں کا حکم جمع ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب انسان کسی بھی آئینے میں دیکھتا ہے تو اس سے آئینے کے اندر انسان کی صورت کا ہی عکس آتا ہے۔ اس میں گھوڑے وغیرہ کا عکس نہیں آتا۔ اور اس سے انسان کے سر ہاتھوں، پاؤں، آنکھوں، کانوں اور ناک وغیرہ کی شکل آتی ہے، دُم، سونڈ کندھوں کے بال

سینگ اور کھروں کی صورت نہیں آتی، اور جب کوئی شے آئینے کے سامنے ہوتی ہے۔ تو آئینے کے موافق ہی اس میں عکس پڑتا ہے۔ اگر آئینے کا عرض اسکے طول سے زائد ہے یا طول اس کے عرض سے زائد ہے یا آئینہ مثلث ہے یا سرخ رنگ کا ہے یا سبز رنگ کا ہے تو اس میں عکس بھی ویسا ہی پڑتا ہے تب رائی (دیکھنے والے) اور آئینہ کے لئے ایک کلی حکم ہے۔ اور دونوں ایک خاص چیز پر صادق آتے ہیں۔ حوادث کو بھی اسی طرح تصور کیا جائے۔ لہٰذا اسکی حقیقت کو وہ انسان واضح کر سکے گا جو کہ ارضی طبائع اور اسکے خواص کے علم کا احاطہ رکھتا ہو۔ پھر حوادث میں اس کا محافظ ہو تو وہ وہاں ایسا قبض اور بسط پائے گا جن کے ساتھ زیرین اسباب کی موافقت نہ ہوگی تو وہ لامحالہ فلکی اسباب کے ثابت کرنے کی طرف محتاج ہوگا۔ اور ایسے شخص کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ستاروں اور ان کے ایسے کامل حکم کا بھی احاطہ کرتا ہو کہ اگر موانع نہ ہوں تو یہ حکم محقق ہو جائے۔ پھر وہاں بھی اسے قبض و بسط کو پائے گا کہ وہ موالید کے خواص کے اثبات کے لئے مجبور کر دینگے؛ اور جب تم نے ہماری مذکور بات کا یقین کر لیا تو اب وقت ہے کہ ہم دوسرے سبب کا بھی ذکر کریں۔

جاننا چاہیئے کہ ان دو سببوں کے علاوہ ایک تیسرا سبب بھی ہے جو کلی جسم کے لئے نفس کلیہ کی تدبیر کے انتظام سے پیدا ہوتا ہے، اس کی مثال انسان کی ہے اس کے لئے احکام ہوتے ہیں جو نوع سے پھوٹتے ہیں، یہ احکام اس کے جمیع افراد میں موجود ہوتے ہیں، تب ہر فرد انسانی کا راست قدم صاف چمڑی، ناخن عریض ضاحک اور ناطق ہونا ضروری ہے۔ اور اسکے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے جنین، پھر بچہ، پھر لڑکا ہو۔ اسکے بعد غلام، جوان ادھیڑ عمر والا۔ پھر بوڑھا۔ اور آخر میں بڑھا فرتوت ہو۔ پس جب طفل ہوتا ہے تو اس کا مزاج تر، اور عقل کمزور ہوتی ہے۔ اور جب جوان ہوتا ہے تو اس کا مزاج خشک اور عقل قوی ہوتی ہے۔ پھر جب بوڑھا ہوگا تو اس کی اکثر قوتوں میں ضعف آجاتا ہے۔ اور اس پر رطوبت کا غلبہ ہوتا ہے مرد، عورت سے زیادہ غیرت مند زیادہ بہادر اور زیادہ عقلمند وغیرہ ہوتا ہے۔

یہ سب احکام صورت نوعیہ سے پھوٹتے ہیں کیونکہ صورت نوعیہ ہی ان سب میں حکم کلی کی تقاضا کرتی ہے جس میں حکم کا ظہور ہوتا ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا یا اسکی طرف اشارہ کیا یہ سب اس حکم کی تفصیل ہے۔ اس لئے ہر نوع کے لئے مختلف حکم ہوتا ہے۔ اور کسی بھی نوع

کا فرد اس حکم سے پیچھے نہیں ہوتا۔

ہاں صرف ایک صورت میں یہ ہوسکتا ہے جہاں مادے کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح صورت اولیٰ یعنی نفس کلیہ کے لئے بھی بدن، اعضا اور قوتوں میں حکم جاری ہوتا ہے جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا اس کا ایک حکم یہ ہے کہ جب نوع انسان موجود ہو اور اس کا مادہ جو کہ صفات کے لحاظ سے مختلف ہے۔ صورت کو قبول کرے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ (اس نوع کے) افراد کے احکام مختلف ہوں۔

ان میں سے کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ انسانیت کے بٹنے سے نکل کر ملکیت اور تجرد بحت کی طرف نہیں جاتے۔ اور نہ ہی طبعی کدورتوں میں ڈوبے رہنے سے دور ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ انسانیت سے بہیمیت محض آلودگی اور ملکی نظافت سے دور رہنے کی طرف نہیں نکلتے۔

یہ ضروری ہے کہ ان دونوں اقسام کے رنگ حظیرۃ القدس میں منطبع ہوں جہاں نفس کلیہ سے اس کے بدن کی طرف تدبیر اترتی ہے اور ضروری ہے کہ ان الوان کا حظیرۃ القدس میں منطبع ہونا وہاں اترنے والے فیض کو ایسے رنگ کے ساتھ متلون کر دے کہ وہ رنگ حکم صریح معتدل سے کسی قدر مخالفت رکھتا ہو۔ اسی طرح اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے میں یہ امر دائر رہتا ہے یہاں تک کہ اس نوع کے ختم ہونے کا فیصلہ اترے، بلکہ جملہ حیوانات اور نباتات ختم ہو جائیں پھر قضا ایسے فلکی اتصال اور ارضی ہیئت کا انتظار کرتی ہے جو یہ دونوں اس (فنا) کا تقاضا کریں۔ جب یہ ہوگا تو قیامت کا ہونا بھی ضروری ہوگا۔ یہ حکم ہے نفس کلی اور ترتیب کا جس کو وہ مقتضی ہے اسی طرح جب اکثر انسان شیطنت اور بہیمیت کو اختیار کرتے ہیں اور ان کے شر کو کوئی روکنے والا اور جابر نہیں ہوتا۔ تو ایک رسول کے بھیجنے اور کتاب کو نازل کرنے کے لئے حظیرۃ القدس میں فیصلہ ہوتا ہے۔ پھر قضا اللہ کی طرف سے فہم رکھنے والے ذکی انسان کے وجود کا انتظار کرتی ہے۔ یہ شخص ایسا ہوتا ہے جس کے نفس میں ستاروں کی قوتیں اس طرح جمع ہوتی ہیں کہ اس سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ملت بنتی ہے، لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے اور ان کے قلوب کی تائید ہوتی ہے۔ اور علوم کا ظہور ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو قضا اسکے سینے سے جوش کھاتی ہے اور غیب اور شہادت کے درمیان متوسط موطن میں شریعت اور ہدایت کا تمثل ہوتا ہے، (یہ عالم مثال کی) مثالی صورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی اگرچہ مثال اور شریعت کے لئے مادہ ہوتی ہے لیکن بجنسہ وہ نہیں ہوتی، وہ صورت علمیہ کے ساتھ

مشابہت رکھتی ہے، کیونکہ جب تو انسان کا تصور کرے گا تو تیرے ذہن میں انسان کی صورت آئیگی اور یہ صورت خود انسان نہیں ہے لیکن یہ اس کا مظہر اور منصۂ شہود ہوگی اور اسی سے لی ہوئی ہوگی پس اگر تم صورت کو اس خیال سے دیکھو گے کہ یہ عرضی شئے ہے اور ذہن کے ساتھ قائم ہے تو وہ انسان کی حقیقت سے بالکل دور جائے گی۔ اور اگر تم صورت کو دیکھ کر اس سے اس کے ماوراء انسان کی حقیقت تک پہنچ جاؤ گے تو اس وقت تمہاری توجہ صرف حقیقت انسانی کی طرف ہوگی اور صورت آئینے کے مانند ہو جائے گی جس کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جاتا، اسی طرح شریعت (مقدرہ) بھی ایک طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں داخل ہے تو دوسرے لحاظ سے اس سے خارج ہے اور اس سے متعلق ہے، ہم اس کو تدلی کی قسم قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ حقیقت نبی الانبیاء کا نام پاکر نزول کرتی ہے تو یہ دوسرا اعتبار سے ہے تمہیں اس میں تدبر کرنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ کہ نفس کلیہ کے جسد میں یہ نظم ملحوظ رہتی ہے جس طرح کے افراد میں نوع کی تدبیر ملحوظ رہتی ہے، تب حوادث کا وقوع مذکور تدبیر کی وجہ سے ہی ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

باقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ حالات جن کا تعلق آپ کی عادات، خصائل اور اسفار سے ہے یہ سب اس میں آجاتے ہیں کہ آپؐ احسن تقویم والے مبارک اور حظیرۃ القدس کی طرف سے موئد تھے اس لئے ان چیزوں میں اپنے بنی نوع سے ممتاز تھے اس رسالے میں جن علوم کے لانے کا ہم نے ارادہ کیا تھا یہ اس کا خاتمہ ہے۔

والحمد للہ رب العالمین حسبی اللہ ونعم الوکیل وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

پیر بابا سید علی غواص ترمذی

سیف الحنان پشاوری

مغربی پاکستان کے سابق صوبہ سرحد میں جن حضرات نے غیر معمولی بزرگی اور شہرت حاصل کی ان میں حضرت پیر بابا اور ان کے شاگرد خاص حضرت اخوند درویزہ بابا کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔

پیدائش

پیر بابا کی ۹۰۸ھ میں قندز چاردرہ خواجہ غلطان کے مقام پر ولادت ہوئی یہ مقام موجودہ افغانستان کے سمت شمالی کی ولایات مزار اور میمنہ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ پیر بابا کا محل پیدائش خواجہ غلطان نامی قصبہ ہے جو کہ چاردرہ حلقے کے علاقہ قندز میں واقع ہے یہ سارا علاقہ تاریخ کی پچھلی کتابوں میں ترمذ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس کی نسبت موصوف ترمذی کہلاتے ہیں۔

سلسلۂ نسب

حضرت اخوند درویزہ بابا کی کتاب تذکرۃ الابرار والاشرار کے حوالہ سے پیر بابا کا سلسلۂ النسب یہ ہے۔ سید علی بن قنبر علی بن سید احمد نور بن سید یوسف نور بن سید محمد نور بخش ترمذی، بن سید احمد ہیثم، بن سید براق بن سید احمد شاق بن سید شاہ ابوتراب بن سید حامد بن سید محمود بن سید اسحاق بن سید عثمان بن سید جعفر بن سید عمر بن سید محمد بن سید حسام بن شاہ ناصر خسرو بن سید امیر علی بن سید عبدالرحیم بن سید محمود مکی بن سید محمد مہدی بن حسن عسکری بن سید علی نقی بن سید محمد تقی بن سید امام موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین علی اصغر رحمہم اللہ اجمعین بن امام حسین شہید کربلا بن بی بی فاطمۃ الزہراؓ (منکوحۂ مطہرہ علی المرتضیٰؓ) بنت سرور کائنات فخر موجودات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

بچپن۔ سلسلۂ عالیہ کبرویہ میں خلیفہ مجاز ہونا۔

اپنی کتاب تذکرۃ الابرار والاشرار میں اخوند درویزہ بابا موصوف سے نقل فرماتے ہیں کہ میرے مشفق والد بزرگوار کا اسم گرامی قنبر علی ہے۔ جو کہ شاہان وقت سے زیادہ تعلق رکھتے تھے۔ اپنے آباؤاجداد کا پچھلا زھد وریاضت کا طریقہ چھوڑ چکے تھے۔ اور دنیاوی جاہ ومنصب حاصل کر چکے تھے۔ درباری لوگوں میں امیر نظر بہادر کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن میرے دادا بزرگوار حضرت سید نور احمد رحمہ اللہ صاحب علم وفضل تھے اپنا قیمتی وقت زہد وریاضت اور درس وتدریس میں صرف کرتے تھے۔ اپنے پیشرو آباء واجداد کے سجادہ نشین سلسلۂ عالیہ کبرویہ کے پیر طریقت تھے۔

قندز کے باشندے دنیا اور دنیاداری سے متنفر تھے۔ والدین دیوانہ اور سفلہ سمجھ کر مجھے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح توجہ کے مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ مگر میرے دادا بزرگوار مجھ پر خاص نظر کرم فرماتے تھے وہ فرماتے تھے میں جانتا ہوں کہ یہ بچہ آگے چل کر کتنا بزرگ انسان بننے والا ہے۔ ! دوسرے متعلقین ان کے مستقبل سے بالکل بے خبر ہیں۔ چنانچہ میری تعلیم وتربیت کا ذمہ انہوں نے خود لے لیا تھا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے مجھے دی اور میں نے شرح جامی تک کتابیں ان سے پڑھیں۔ فرماتے ہیں کہ سلسلہ عالیہ کبرویہ ہمارے خاندان میں شیخ جمال الدین کبریٰؒ سے ابھی تک نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے۔ جب میرے دادا بزرگوار کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے بلاکر فرمایا کہ اے راحت جان قرآن کریم کی تلاوت کر میں نے سورۃ ملک پڑھی فرمایا کہ پھر پڑھو میں نے پھر سے یہی سورت پڑھی۔ فرمایا کہ پھر پڑھو۔ پھر میں نے یہی سورت پڑھی۔ پھر فرمایا کہ زیادہ میرے قریب ہو جب میں زیادہ ان کے قریب ہوا تو فرمایا کہ اپنے آباء واجداد کے اذن سے سلسلہ کبرویہ کی تمام حاصل کی ہوئی نعمتیں اور برکات میں نے آپ کو بخشدیں۔

چنانچہ میں سلسلہ عالیہ کبرویہ میں اپنے دادا کی طرف سے خلیفہ ماذون مقرر ہوا۔

سلوک کی طرف رجحان

اپنے دادا بزرگوار کی وفات کے بعد میں بالکل بے یار ومددگار رہ گیا۔ نہ اہل دنیا سے میرا رابطہ ہوسکتا تھا۔ اور نہ ان سے جدا ہوسکتا تھا۔ نہ میں دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہوسکتا تھا۔ اور نہ یکسوئی حاصل کر کے وظائف کے لطائف سے بہرہ اندوز ہوسکتا تھا۔ وقت اور زمانہ اسی حالت میں

گذرتا رہا یہاں تک کہ سلطان ہمایوں میرے والد ماجد کو بطور تبرک ہندوستان لے گئے۔ اور میں بھی ان کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوا۔

پیر بابا ہند میں

متعلقہ کتب کے مطالعہ سے یہ تعین نہ ہو سکا کہ سلطان ہمایوں کب اور کس بار موصوفؒ کے والد والد ماجد کو ہندوستان لے گئے ہیں۔ بہرکیف جب وہ ہندوستان چلے گئے، تو وہاں کے حالات خود ہی یوں بیان فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی خواہش پر شاہی دربار میں جانے کے موقعہ پر میں درباری لباس زیب تن کیا کرتا تھا۔ لیکن وہاں سے واپسی پر میں فوراً اسے اتار لیتا تھا۔ اور علماء و صلحاء کی تلاش میں نکل کر ان کی خدمت میں جا پہنچتا۔

فرماتے ہیں کہ رب جلیل کو منظور تھا کہ مجھے دنیا اور اہل دنیا سے لاتعلق رکھے اسی وجہ سے میں تمام درباری امور سے متنفر تھا۔ اور اسکے ساتھ تعلق رکھنا میرے لئے سخت دشوار تھا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ قافلہ شاہی پانی پت میں پہنچا تو میں نے وہاں شیخ شرف الدین پانی پتیؒ کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ ان کی خاص توجہ سے میرے دل میں عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ اور میرا جسم کانپنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیاوی تعلقات سے میں مزید متنفر ہوا۔

والد ماجد سے علیحدگی

اس کے بعد والد ماجد سے علیحدگی اور حضرت کی گوشہ نشینی سے متعلق دو روایتیں ہیں ایک روایت حضرت کے صاحبزادے میاں غلام مصطفےٰ کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرتؒ شیخ شرف الدین پانی پتیؒ کے مزار اقدس سے کسی دوسرے راستے کے ذریعہ خفیہ نکل گئے اور چپکے سے جنگلوں میں چلے گئے کچھ دیر کے بعد خدام و نوکر جب مزار اقدس پر پتہ کرنے کے لئے چلے گئے تو حضرت کو وہاں نہ پایا۔ اور تلاش بسیار کے بعد بھی انہیں دستیاب نہ ہوئے۔

جب حضرت کے والد ماجد کو یہ خبر پہنچ گئی تو وہ سمجھ گئے کہ کہیں طلب معرفت میں نکل گئے ہوں گے اور "رضا بر قضا" کا مظاہرہ کرکے خاموش رہ گئے۔ میاں مصطفےٰؒ فرماتے ہیں کہ کچھ مدت کے بعد حضرتؒ اور ان کے والد ماجد کے درمیان گجرات کے مقام پر ملاقات ہوئی۔ یہ سب سے پہلے اور سب سے آخری ملاقات ثابت ہوگئی۔ جب سے پانی پت میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے تھے۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ مزار اقدس میں مذکورہ کیفیت طاری ہونے کے بعد انہوں نے اس خیال کی بنیاد پر کہ اگر میں والد ماجد سے اجازت طلب کروں شاید وہ اجازت نہ دیں) اپنا گھوڑا اور تمام ساز و سامان اپنے خدام کے حوالہ کر کے کسی گوشہ میں بیٹھ گئے اور تنہائی میں خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے کچھ عرصہ کے بعد والد ماجد کو پتہ چلا تو حضرت کو اپنے ساتھ لے گئے۔ والد بزرگوار کے ساتھ وہاں بحث و تمحیص اور گفتگوئے باہمی و تبادلہ رائے کے بعد یہ طے پایا کہ وہ طلب علم و معرفت خداوندی کے لئے علیحدہ ہو سکتے ہیں۔

شیخ سیلونہؒ کی خدمت میں

بہر حال جب حضرتؒ مانک پور میں پہنچ گئے تو وہاں ایک مشہور عالم دین اور مشہور پیر طریقت "شیخ سیلونہؒ" کے درس میں شامل ہوئے۔ جہاں انہوں نے علم نحو کی مشہور کتاب کافیہ دوبارہ پڑھی اور علم فقہ کی مشہور درسی کتاب ھدایہ تک کی کتابیں بھی شیخؒ سے پڑھیں۔ شیخ نے جب حضرتؒ کی روحانی صلاحیت شغف اور تشنگی کو دیکھا تو انہوں نے اپنے پیر بھائی حضرت شیخ سالار رومیؒ کے نام پر رقعہ دیکر فرمایا کہ ہم دونوں شیخ بہاؤالدین صامتؒ کے مرید ہیں۔ لیکن چونکہ مجھے بیعت کرانے کی اجازت نہیں اس لئے آپ وہاں جا کر ان سے روحانی درس حاصل کریں شیخ سیلونہؒ نے شیخ سالار رومیؒ کے نام خط میں جناب پیر بابا کے حسب و نسب دیگر علمی اور روحانی صلاحیتوں کا ذکر کر کے انہیں اجمیر شریف کی طرف رخصت کیا۔

شیخ سالار رومی کے حلقہ بیعت میں

حضرت شیخ سالار رومیؒ طریقۂ چشتیہ کے پیر طریقت تھے۔ اور اجمیر شریف میں سجادہ نشین تھے۔ پیر باباؒ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت کی اور کچھ عرصہ انہماک کے ساتھ ان کی خدمت میں مشغول رہے۔

جب انہوں نے حضرت کو اپنی خدمت میں سچا اور مخلص پایا۔ تو بے حد شفقت فرما کر انہیں چاروں طریقوں کی بیعت کرائی۔ اس تفصیل کے مطابق حضرت پیر باباؒ نے پانچ طریقوں کی بیعت کی سلسلہ کبرویہ کی بیعت اپنے دادا بزرگوار سے اور چشتیہ، شطاریہ، سہروردیہ، ناجیہ، حلاجیہ کی بیعت حضرت شیخ سالار رومیؒ سے کی۔

طرز تعلیم

حضرت کا اپنا بیان ہے کہ اپنے مرشد کی طرف سے مجھے تصوف کا جو سبق ملتا۔ اس پر ہفتہ بھر کے غور و خوض اور خلوت میں انتہائی ریاضت کے بعد اس کا جو بھی اثر محسوس کر لیتا اپنے مرشد کے سامنے اسے بیان کر لیتا۔ مرشد ہر دفعہ مجھے مبارک باد دیتے رہے۔ اور یوں میرے تمام اسباق کی تکمیل کرائی گئی۔

سلوک کے بارے میں مرشد کی اہم نصیحت

فرماتے ہیں۔ مرشد نے فرمایا کہ سلوک کے راستے میں سالک کو بعض امتحانات الہیہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ان تمام ابتلاؤں میں کامیاب ہو کر سلوک کرتا رہا تو کامل ورنہ غیر کامل ہوگا۔ سب سے پہلا امتحان اس راستہ میں یہ ہے کہ تمام عالم میں اسے شہرت بخشی جائے اور عوام و خواص کی تمامتر توجہات اس کی طرف مبذول کرائی جائیں۔ دوسرا امتحان کشف و کرامات کا ہے اگر سالک کشف و کرامات کے چکر میں پڑ گیا تو وہ ولی (دوست خدا) کہلانے کا مستحق نہیں۔ اگر اس نے کشف و کرامت پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے دوست (باری تعالیٰ) کی مرضی اور اس کا وصال اس کا منتہائے مقصد رہا تو وہی سچے دوست کہلانے کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دوست رکھے گا اور تمام عالم میں اسے عزت بخش کر اسے برگزیدہ کرے گا۔

حضرت رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ سلوک کے راستے میں سب سے پہلا مانع یہ پیش آیا کہ حاجی سیف اللہ گگیانی اور ملک گدائی خان گگیانی جیسے بڑے رئیس (جنہیں بادشاہ ہمایوں پشاور سے ہندوستان لے گئے تھے) اور دیگر عوام و خواص میرے مرید ہوئے اور لوگوں کی کثیر تعداد طریقت کی جستجو میں میرے گرد جمگھٹا لگانے لگے۔ تو اس وقت میں نے مرشدؒ سے چھٹکارا دلانے کی درخواست کی تھی اور میں خود بھی اس حالت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور یہ چاہتا تھا کہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر دلجمعی کے ساتھ ریاضت کرتا رہوں۔ اور پھر کشف و کرامات پر بھی میں نے کوئی توجہ نہ دی اور یوں میں نے سلوک کی تکمیل کر کے سلوک کی اصلی حقیقت کو سمجھ سکا ہوں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

مرشد کی ہدایت

خلافت دینے کے بعد حضرت سالارِ رومیؒ نے تخصیص کئے بغیر کسی پہاڑی علاقے میں جانے کی ہدایت کی اسی ہدایت کے مطابق میں نے کشمیر جانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے تحت سفر کرتا ہوا

جب میں پنڈدادو المعروف بہ پنڈدادن خاں (جو دریائے جہلم سے مغرب کی طرف چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہنچا تو میں نے ایک مدت تک لوگوں کے اصرار پر وہاں مقیم رہ کر وہاں کے باشندوں کو وعظ و نصیحت امر بالمعروف نہی عن المنکر کرتا رہا۔ اور معرفت و طریقت کے طریقے لوگوں کو بتاتا رہا۔

والد ماجد سے ملاقات

جب ہمایوں شیرشاہ سوری سے شکست کھاکر اپنے وطن جارہا تھا تو لاہور کے قریب جناب قنبر علی صاحب والد پیر بابا ان سے علیحدہ ہوکر اپنے وطن واپس جارہے تھے تو باختلاف روایت گجرات یا مضافات گجرات (پنڈ دادن خاں) کے مقام پر حضرت کی ملاقات اپنے والد ماجد سے ہوئی جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ یہ پہلی ملاقات ہے یا دوسری۔ بہرکیف حضرت فرماتے ہیں کہ ملاقات کے دوران والد صاحب نے جب اپنے ساتھ مجھے لیجانے پر بے حد اصرار کیا تو میں نے معذرت کی۔ والد ماجد نے سر آنکھوں پر بوسہ دیا اور انتہائی شفقانہ انداز میں فرمایا کہ مجھ سے تو آباء و اجداد کے زہد و ریاضت کے طریقے چھوڑنے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ میں نے اپنے آباء و اجداد کا یہ نیک طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور اس راستہ میں میری کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھ سے رخصت ہوتے وقت والد ماجد نے سونے اور چاندی سے بھری ہوئی دو تھیلیاں مجھے دیں میں نے شرف ان کی دلداری کے لئے اسے قبول تو کیا لیکن میری دلچسپی اس میں نہ تھی۔ حتیٰ کہ یہ دونوں تھیلیاں شیرشاہ سوری کے سپاہیوں نے مجھ سے چھین لیں اور میں فارغ البال ہوگیا۔

اجمیر کو واپسی اور خرقۂ خلافت کا ملنا

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر بابا ۹۵۰ - ۵۱ھ میں شرف باریابی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے مرشد شیخ سالار رومیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے گجرات یا مضافات گجرات اجمیر تشریف لے گئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب میں سالار رومیؒ کے دولت خانے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرشدی شیخ سالار رومیؒ رحلت فرما چکے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب نے مجھے ایک خرقہ عنایت کیا جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ اور یہ ان کے والد صاحب کی طرف سے مجھے بطور خلافت دیا گیا۔ چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ

میرے والد بزرگوار نے آپ کے بارے میں وصیت فرمائی ہے کہ وہ کسی پہاڑی علاقے میں چلے جائیں۔ یا اپنے وطن قندز چلے جائیں جب کہ اس کا تعلق بھی پہاڑی علاقے سے ہے۔ صاحب زادے صاحب کا یہ فرمان سنکر میں سخت حیران ہوا کہ خدایا میں تو مرشد سے یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ مجھ سے بوجھ ہلکا کیا جائے۔ اسکی بجائے بوجھ مزید بھاری ہوگیا۔

پشاور میں

بہرکیف مرشد کی وصیت کی تکمیل کی خاطر میں وہاں سے اپنے وطن قندز جانے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ جاتے ہوئے پشاور شہر میں میرے دو واقف حال خاص رئیس عقیدتمندوں حاجی سیف اللہ گگیانی اور ملک گرائی خاں گگیانی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے الحاح کے ساتھ ان کے علاقے میں چند دن قیام کرنے کے لئے مجھ سے درخواست کی جو پشاور شہر کے قریب پڑتا تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہماری اولاد، متعلقین بچے اور دیگر عوام آپ کی صحبت اور وعظ و نصیحت سے مستفیض ہونگے اور وہ غلط کاموں فضول رسم و رواج اور بدعات سے باز آئیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرماتے ہیں میں نے انکی دعوت اور معروضات قبول کیں اور ان کے ساتھ ہی ان کے علاقہ دوآبہ میں چلا گیا۔ وہاں کے باشندوں نے کثیر تعداد میں مجھ سے بیعت کی۔ اور طریقت میں داخل ہوگئے۔ بہت سارے لوگ آتے وعظ و نصیحت سنتے۔ برے کاموں سے دستبردار ہوئے۔

وطن قندز جانے کا ارادہ ترک کرنا

حضرت فرماتے ہیں کہ دوآبہ میں ایک سال اسی طرح گزرنے کے بعد میں نے اپنے وطن قندز جانے کا ارادہ کیا تو گگیانی قوم کے مخلصوں اور عقیدتمندوں نے مجھے ٹھہرانے کے لئے منصوبے بنانے شروع کئے۔ ان میں سے ایک منصوبہ یہ تھا کہ یہاں قریب یوسف زئی کے علاقہ میں دو ملحد اور زندیق ظاہر ہوئے ہیں۔ انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اور لوگوں کو غلط راستہ پہ ڈال رہے ہیں۔ ایک کا نام پیر طیب ہے جو غلزئی پٹھان ہے اور دوسرے کا نام پیر ولی ہے جو بٹر پیچ قوم سے تعلق رکھتا ہے وہ رقص و سرود گانا بجانا حلال سمجھتے ہیں عورتوں مردوں چھوٹوں اور بڑوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں۔ اور ان کو واہی تباہی اور خلاف شرع باتیں سناتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیر ولی بٹر پیچ تو خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ (العیاذ باللہ) ہمارا خیال ہے کہ آپ اپنے وطن جانے کی بجائے

یوسف زئی کے علاقے کی طرف توجہ فرمائیں۔ ان ملحدوں کی سرکوبی کریں اور لوگوں کو کفر و گمراہی سے نجات دلائیں۔ یہ باتیں سنکر اپنا مذہبی فرض پورا کرنے کی خاطر میں علاقہ یوسف زئی کی طرف روانہ ہوا

یوسف زئی کے علاقہ میں

حضرت پیر بابا فرماتے ہیں کہ جب میں یوسف زئی کے علاقہ میں پہنچا تو میں نے وہاں کے باشندوں کی خصلتیں اور عادتیں دیکھ لیں۔

۱۔ سادہ قسم کے لوگ ہیں۔ مکر و فریب، دھوکہ دغا اور ہیرا پھیری کو جانتے ہی نہیں۔

۲۔ ان کے چھوٹے بڑوں سے دینداری اور دیانتداری میں بہت پکے ہیں۔

۳۔ ان کی عورتیں ان کے مردوں سے دین اسلام کی زیادہ مضبوطی کے ساتھ پابند ہیں۔

۴۔ ان کے بچے بچپن ہی میں دین اور اسکے سیکھنے کا شغف رکھتے ہیں۔

۵۔ ان کے خادم۔ نوکر غلام اور ماتحت لوگ اپنے آقاؤں اور مالکوں سے زیادہ دیندار ہیں۔ لیکن اسکے باوجود گمراہی میں گھرے ہوئے اس لئے ہیں کہ مذہبی درس گاہیں ان کے علاقہ میں نہیں اور اس کے ساتھ تقوٰی دار اور خدا پرست علماء ان کے درمیان موجود نہیں۔ یہ اس وقت کی باتیں ہیں الحمدللہ اس وقت پٹھانوں کے علاقے میں ان گنت مذہبی درس گاہ ہیں اور عوام کی حالت بھی نسبتاً بہتر ہے۔

سدوم میں

پیر بابا فرماتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا۔ جب میں پہلے یوسف زئی کے علاقے میں آیا تو سدوم کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ تو اطراف و جوانب سے لوگ جوق در جوق میرے گرد جمع ہونے لگے اور وعظ و نصیحت سننے لگے۔ میں ان کے سامنے اہل ہوا اور اہل بدعت کی

نوٹ۔ (روحانی رابطہ) یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پیر بابا جب سدوم میں پہنچ گئے تو رستم نامی قصبہ سے شمال مشرق کی طرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر الی نامی گاؤں (جو آج کل الی کنڈی کے نام سے مشہور ہے) میں مقیم ہوئے اس موقع پر ان کے مشہور شاگرد اخوند درویزہ بابا بھی انکے ساتھ تھے۔ الی کی جانب جنوب اور رستم کے بالکل سامنے جہاں پیر بابا قیام پذیر ہوئے تھے وہ مقام اب بھی موجود ہے۔

برائیوں کو ظاہر کر کے ان سے دور رہنے اور شریعت پر عمل کرنے کی ان کو تلقین کرتا تھا۔ چونکہ یہ لوگ طالب دین اور حق کے متلاشی تھے۔ میری تقریروں نے ان کے دلوں پر اثر کیا۔ اور وہ اہل ہوا و بدعت سے محتر زاور متنفر ہو گئے۔ یہاں تک کہ آیت وقل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً کے مطابق یوسف زئی کے لوگ باطل پیروں کے نام سے چھوٹ کر بدعات وگمراہی محو ہو گئی۔ اور اسلام کا حق دین غالب آگیا۔

ملحدوں کے منصوبے اور ان سے مقابلہ

اس کے بعد پیر بابا نے ان دو ملحدوں کے ساتھ بحث ومقابلے کے تمام واقعات تفصیل اور بسط کے ذکر فرمائے ہیں۔

ازدواج

پیر بابا فرماتے ہیں کہ یوسف زئی میں قیام کے دوران وہاں ملک دولت یوسف زئی قبیلۂ ملی زئی شاخ بارک شاہ زئی نے اپنی پاک دامن بہن بی بی مریم کو میرے نکاح میں دینے کی پیش کش کر دی میں نے شادی سے بچنے کی اس لئے بڑی کوشش تھی کہ عیالداری ریاضت اور معرفت کے راستہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہو سکتی ہے مگر ایک تو سنت کی تابعداری کا خیال تھا اور دوسرا یہ کہ میں ملک صاحب کو ناراض کر کے اس کی قابل قدر پیش کش کو ٹھکراؤں اور اس سے بے مروتی کرنے کا ثبوت نہ دوں۔ تیسرا یہ کہ مجھے اپنے مرشد حضرت سالار رومی کی وہ بات یاد آگئی جنہوں نے مجھے کسی پہاڑی علاقہ میں قیام کرنے کی ہدایت اور وصیت فرمائی تھی۔ چونکہ یہ بھی پہاڑی علاقہ تھا اس لئے اشارہ سمجھ کر میں نے یہاں قیام کرنے کے ارادہ سے ملک دولت کا پیغام قبول کیا اور شادی کر لی۔

حضرت فرماتے ہیں کہ پٹھانوں کا عام دستور ہے کہ جب کوئی عالم۔ نیک یا بزرگ آدمی جوان کی قوم اور ان کے قبیلے سے نہ ہو ان میں آجاتا ہے تو اس قبیلے یا قوم کا سردار اپنی بہن یا لڑکی مہر مقرر کئے بغیر اس کے سلک ازدواج میں دے دیتا ہے تاکہ اس طرح سے وہ ان کے شہر یا علاقہ میں رہ کر باشندے اس سے استفادہ کرتے رہیں۔ پٹھانوں کے اس دستور کے مطابق میری شادی بھی کرائی گئی اور میری اولاد بھی وہاں پیدا ہو گئی۔

والدین کی خدمت میں حاضری

کچھ عرصہ بعد والدین کی زیارت کرنے کا شوق پیدا ہوا قندز پہنچا۔ والد صاحب رحلت فرما چکے تھے۔ اور والدہ صاحبہ حیات تھی۔ ان کی خواہش پر اپنے گذشتہ تمام احوال بیان کرکے اس میں شادی کا بھی ذکر کیا اور بچوں کی پیدائش کا بھی۔ والدہ صاحبہ نے سنتے ہی از راہِ شفقت و محبت فرمایا کہ پھر آپ کا رہنا یہاں مناسب نہیں اور زادِ راہ تیار کرکے جب مجھے رخصت کرنے لگیں تو فرمایا اگر ہوسکے تو بال بچوں کو بھی یہاں لے آنا ورنہ پھر وہاں ہی سکونت کرتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا حق میرے ذمے رہ جائے۔ میں نے آپ کے لئے اپنا حق بخش دیا ہے۔

اس کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت کے مطابق میں مستقل طور پر علاقہ یوسف زئی میں مقیم ہوگیا اور وہاں میں نے ان قبائل کو راہِ حق اور دین قیّم پر مضبوط کرا دیا۔ میری نصیحت ان پر اثر کرتی تھی۔ اور دین اسلام کے راہِ حق پر وہ گامزن تھے۔

پاچا کلے بنیر میں قیام

اس کے بعد پیر بابا پاچا کلے بونیر ریاست سوات مغربی پاکستان میں رہنے لگے اور یہیں وہ پیر بابا کے نام سے مشہور ہوگئے۔ یہاں ان کے عقیدتمندوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ اور انہوں نے لنگر بھی جاری کیا۔

وفات

سنہ ۹۹۱ھ مطابق سنہ ۱۵۸۳ء میں اسی جگہ بابا نے وفات پائی اور یہیں آپ کا مزار اقدس آج بھی مرجع خلائق (خاص و عام) ہے موسم بہار میں تو زائرین کے انبوہ اور جوش و خروش دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب دور دراز خصوصاً علاقہ بنوں (صوبہ سرحد) سے بسیں اور ٹرک کثیر تعداد میں مخصوص روایتی جوش خروش کے ساتھ پہنچتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دور دراز سے جتھے کے جتھے سائیکل سوار اور لاتعداد لوگ پیدل بھی آکر زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں۔

یہ مزار مبارک درہ کڑاکڑ سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ایک ندی کے کنارے واقع ہے جو بونیر اور سوات میں حد فاصل کا کام دیتی ہے۔ مزار مبارک کے شمال کی طرف ایک اور درہ ہے جس سے گذر کر زائرین باسانی سوات کے دارالخلافہ سیدو شریف میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس مزار کا محل وقوع بہت خوبصورت ہے۔

اس کی پشت پر ایلیم اور دوسرا کی پہاڑی چوٹیاں اس کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی ہیں۔

اولاد

حضرت پیر باباؒ کے دو صاحبزادے سید حبیب اللہ اور سید مصطفےٰ اور تین صاحبزادیاں سیدہ رحیمہ، سیدہ کریمہ، اور سیدہ زینبہ بیان کی جاتی ہیں۔

صاحبزادہ سید حبیب اللہؒ تو والد ماجد کی حیات میں وفات پا چکے تھے۔ جن کا مزار حضرت کے مزار کے ساتھ متصل ہے۔ اور سید مصطفےٰ افغانستان کے مشرقی علاقہ کونڑ میں رہائش اختیار کر کے وہاں ہی وفات پا چکے تھے۔ ان کا مزار علاقہ کونڑ کے موضع دونائی پشت میں ہے۔ میاں مصطفےٰ کے تین صاحبزادے میاں عبدالوہابؒ المعروف بہ میاں عبدل کا مزار علاقہ بونیر کے تختہ بند مقام پر ہے۔ میاں محمد قاسم جن کا روضہ سوات کے موضع پیر کلی میں ہے۔ میاں محمد حسنؒ جن کا روضہ سوات کے موضع کوکڑی میں ہے۔

پیر باباؒ کی اولاد کا سلسلہ ان تین پوتوں سے چلا ہے ان میں بڑے بڑے علماء صلحاء اور بزرگان دین گزرے ہیں۔ سید جمال الدین افغانیؒ بھی اسی خاندان کے نامور انسان تھے سید مبارک شاہ اور سید اکبر شاہ بھی ان کی اولاد میں ایسی دو مشہور ہستیاں گزری ہیں جو کہ ریاست سوات کے بادشاہ وقت ہوا کرتے تھے۔ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے جاں نثار ساتھی تھے۔

خلفاء

حضرت کے چند مشہور خلفاء میں سے غیر معمولی شہرت کے مالک اخوند درویزہ بابا ہیں جنہوں نے حضرتؒ کے دوآبہ میں قیام کے دوران ان سے سنہ ۹۵۲ء میں بیعت کی تھی اور آخر تک اپنے مرشد کے ساتھ رہے ان کا مزار اقدس پشاور شہر کے بہت بڑے مقبرے میں شہر سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر موسیٰ زئی ہزار خانی روڈ کے کنارے پر واقع ہے۔

۲۔ ملا صالح الکوزئی جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ قندھار میں قاضی تھے ان کا مزار علاقہ بونیر میں ہے۔ دیوانہ بابا سے مشہور ہیں۔

۳۔ ملا یوسف بن الیاس گدائی زئی جن کا مزار مبارک وادی ملندی کے شاہراہ پر واقع ہے اخون یوسف

سے مشہور ہیں۔

۴۔ میاں عبدالکریمؒ ولد اخوند درویزہ باباؒ المعروف بہ میاں کریم داد۔ بحر المعانی، محقق افغان اور میاں شہید ہیں۔ مزار مبارک موضع کانجو ریاست سوات میں ہے۔ شہید بابا سے مشہور ہیں۔

اخلاق وعادات

پیر بابا بے پایاں سخاوت کے مالک تھے۔ کسی سائل کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے مسافروں کو زاد راہ اور سفر خرچ دیتے۔ بیماروں کی عیادت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مالی امداد بھی فرماتے۔ ان کا لنگر ہر وقت جاری رہتا جہاں غربار ومساکین کے لئے اذن عام ہوتا اور ان میں کپڑے بھی تقسیم کئے جاتے عفو ودرگذر کے بہترین مظاہرہ کرنے والے انسان تھے۔ عوام کو بیعت شریعت اور خواص طلبہ وعلمار) کو بیعتِ طریقت کرتے اور کشف وکرامت کے مالک تھے۔

تذکرہ شاہ محمد اسحاق از مقالات طریقت

مرتبہ محمد عبدالحلیم چشتی، ایم۔اے۔

الرحیم کے ماہ محرم الحرام ۱۳۸۶ھ کے شمارہ میں احقر نے مقالات طریقت مولفہ عبدالرحیم ضیاؔ نے شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدینؒ کے حالات ہدیۂ ناظرین کئے تھے۔ اور اسی شمارہ میں اس کتاب کا تفصیلی تعارف بھی کرایا تھا۔ اب اسی کتاب سے شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حالات ہدیۂ ناظرین ہیں افادیت کے پیش نظر ہم نے ذیلی سرخیاں کا اضافہ کردیا ہے۔

نام و نسب

زبدۂ محدثین و شیخ آفاق مولانا محمد اسحٰق علیہ الرحمہ، قامع بنیان شرک و طغیان، حاوی موجبات علم و ایقان سالک مسالک ہدایت و ارشاد مجلی آئینہ صافی اعتقاد، رموز فہم سرائر تفسیر قرآنی، دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی، جامع کمالات صوری و معنوی، نکتہ سنج کلام الٰہی و حدیث نبوی مرتقی مدارج درجات عالی، پیشوائے ادانی و اعالی، ملک سیرت فرشتہ صورت جامع اسرار معرفت و حقیقت مواظب اوامر شریعت و طریقت، فخر علمائے دین، مسند محدثین موصوف بصفت تقیدو اطلاق مولانا و بالفضل اولانا ابوسلیمان مولانا مولوی شاہ محمد اسحاق ابن شیخ محمد افضل ابن شیخ احمد ابن شاہ اسماعیل ابن شیخ منصور ابن احمد ابن محمود، بموجب نسب نامہ حضرت پیر و مرشد مندرجہ مقالہ اول رحمہ اللہ علیہم اجمعین۔

آپ نواسے اور خلیفہ راستین و مسند نشین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے ہیں۔

نظم

قطب آفاق حضرت اسحاق
ہادی خلق و مظہر خلاق

مجمع خلق احمدی ذاتش — پیش ازیں نیست مدحت اخلاق

بود ...... ادعریاں — انسپئے قطع راس شرک دنفاق

درخموشی ہزار لطف کلام — در تکلم کرشمۂ اشراق

در کمالات ظاہر و باطن — اے ضیاء بود ذات پاکش طاق

ولادت۔ ولادت آپ کی ہشتم ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ گیارہ سو ستانوے ہجری میں ہے۔

علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل

جناب مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کا خیہ مولانا عبدالحئی علیہ الرحمہ سے پڑھتے تھے کہ ان کو اپنے وطن کے سفر کا اتفاق ہوا۔ تو حضرت میاں صاحب اعنی مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے مولانا عبدالقادر صاحب اپنے برادر خورد کو آپ کے سبق کے واسطے فرمایا اس روز سے آپ ان کی خدمت میں ہر روز اخیر عمر تک حاضر رہے اور تمام صحاح ستہ اور کتب فقہ اور تمام علوم معقول ومنقول آپ سے حاصل کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی عادت تھی کہ ہر روز بلاناغہ بعد صبح قریب طلوع آفتاب ایک رکوع قرآن شریف کا کوئی ایک تفسیر کے ساتھ مثلاً ایک روز جلالین اور ایک روز بیضاوی اور ایک روز رحمانی اور ایک روز زاہدی اور دوسری تفسیریں اس مقام سے سنتے تھے۔ اس کا قاری سوائے مولانا اسحاق صاحب کے دوسرا نہ ہوتا تھا۔ یہ طریقہ حضرت کے روز وفات تک جاری رہا۔

اور بعد نماز ظہر کے جس وقت حضرت صحن مدرسہ میں چہل قدمی فرماتے مقامات ہمدانی[1] کا سبق ہوتا تھا۔ دوسرے بزرگ وار جیسے مولانا عبدالحئی اور مولوی رشیدالدین[2] خاں صاحب رحمہ اللہ علیہما اور ان کے سوا بڑے بڑے علماء وفضلا سامع رہتے تھے۔ انتہی،

۱؎ یہ کتاب عربی فن انشاء میں نہایت عمدہ ہے۔

۲؎ مولوی رشیدالدین خاں صاحب بڑے فاضل یکتا اور صاحب تصانیف تھے۔ خصوصاً تردید مذہب اہل تشیع میں آپ کی بہت تحریریں ہے اور اس خاندان والاشان کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

حاصل کلام آپ نے بیس برس کامل فن حدیث شریف اور یہ علم منیف حضرت کے حضور طلبہ جدید الفکر کو پڑھایا۔

اتباع سنت

کوئی کام آپ سے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرزد نہ ہوتا تھا۔ رات دن حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیروی پر دل تھا فنافی الرسول کا مرتبہ حاصل تھا، چونکہ حق جل و علا نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں۔ آپ کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ حضرت سید الثقلین صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی صحبت کا فیض جنہوں نے پایا ہوگا ان کی یہی صورت و سیرت ہوگی۔

زہے امت خاتم المرسلین

خلافت وجانشینی

بعد وفات حضرت شاہ صاحب موصوف کے آپ کا فرق مبارک دستار خلافت سے مزین ہوا اور تمام معتقدین صافی اعتقاد نے آپ کی طرف رجوع کیا۔ آپ کے کمالات ظاہر و باطن حد بیان سے خارج ہیں۔

حضرت شاہ صاحب مغفور فرمایا کرتے تھے کہ اگر معصومیت کا اطلاق سوائے پیغمبروں کے دوسرے پر جائز ہوتا تو اس وقت میں اسحاق پر ہوتا۔

مولانا مولوی سید ہاشم صاحب کہتے ہیں یہ بھی بات مشہور ہے جو حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میری تقریر اسماعیل نے لی اور تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے

حج وزیارت

کیا کمال اور کیا عنایت رب ذوالجلال ہے ناز اور فخر کرنا چاہیئے ایسی خداجوئی پر کہ سب کچھ چھوڑ کر سفر حجاز اختیار کیا اور وہاں مع قبائل وعشائر حاضر ہو کر فرض حج ادا کیا۔ اور زیارت شریف سے مشرف ہو کر پھر وطن کو تشریف لا کر مواعظ و نصائح سے خلق کو راہِ ہدایت دکھلاتے رہے۔

مولوی بہاء الدین صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ آپ بادشاہ کے مکان کو بھی سال میں ایک بار ماہ محرم کی نویں تاریخ رونق افزا ہوتے تھے۔ شہادت کا وعظ یعنی چند مضامین

سرالشہادتین کے بیان کرکے تھوڑ ڈیڑھ پہر دن چڑھے وہاں سے واپس آتے تھے ایک روز پیشتر بہادرشاہ یا کوئی وزیر یا شاہزادہ دعوت کے واسطے حاضر ہوتا تھا اور بروز معینہ سواریاں آئین مع حضار و خدام تشریف فرما ہوتے۔ مجلس عام رہتی جو چاہتا چلا جاتا۔

مائۃ مسائل اور مسائل اربعین کا سن تالیف

اور سنہ ۱۲۴۵ھ میں حسب گزارش شاہ زادگان دہلی یعنی مرزا غلام حیدر وغیرہ مائۃ مسائل اور سنہ ۱۱۵۵ھ میں بموجب التماس محمد خان زمان خان زمیندار موضع بھیکن پور مسائل اربعین تحریر کی سبحان اللہ کیا کہوں یہ دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ جاہل دیکھے تو عالم ہو جائے۔ اور عالم دیکھے تو کمال بڑھ جائے۔ اگر عمل کی توفیق ہو تو خاصان خدا سے ہو جائے۔

بیت اللہ کی طرف ہجرت

بعد ایک مدت کے ازبسکہ شعائر اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعت میں قوت آتی جاتی تھی نیت ہجرت کو مصمم کر کے تمام قبایل کو ہمراہ لیکر راہی مکہ معظمہ ہوئے اور باوصفیکہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بسماجت تمام مانع آئے چونکہ شوق ما ہو الحق غالب تھا۔ آپ ممتنع نہ ہوئے اور مکہ معظمہ کو جاکر توطن اختیار کیا اور بسبب کثرت کرم کے آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا خصوصاً ان لوگوں کی مراعات کے سبب جو ہندوستان سے ادائے حج کو وارد مکہ معظمہ ہوتے تھے وہاں کے لوگوں نے عفت کے وجود مطہر کو از جملہ مغتنمات سمجھا اور آپ کا وہاں ہونا موجب برکت جانا بار ثانی دہلی سے جدا ہو کر اس دیار مقدس میں چھ برس کامل تشریف رکھی۔

وفات

آخر کو اسی جا پچیسویں ماہ رجب شب شنبہ قریب طلوع صبح صادق سنہ ۱۲۶۲ھ میں اس عالم سے انتقال کیا۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے یہ قطعہ آپ کی تاریخ وفات میں لکھا ہے۔

قطعہ

شیخ اسحاق رہبر آفاق	آنکہ ذاتش بدو جہاں لحاق است
دل بسال وصال او سر در	گفت اسحاق شیخ آفاق است

۱۲۶۲ھ

لہ یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ سرالشہادتین ملا باقر مجلسی کی ایک کتاب کا حصہ ہے۔ (مدیر)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے روضۂ بلند پایہ کے سایہ میں آسودہ ہیں۔

مکہ معظمہ میں درس وتدریس

مکہ معظمہ میں بھی کچھ تدریس کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ میر حسن علی عرف شاہ جی صاحب کہتے ہیں۔

آپ اپنے مکان میں دن کو سبق پڑھایا کرتے تھے۔ اور بعد مغرب کوئی طالب آوے تو تربیت درویشی میں مصروف رہتے اور آپ کے اشراق باطن کا حال تھا کہ سبق میں اکثر اشخاص مختلف المزاج کچھ اپنے دلوں میں سوالات سوچ کر آتے تو سب لوگ اپنے اپنے سوال وجواب کی تقریر حضرتؒ کی زبان مبارک سے تفسیر و حدیث کے سبق پڑھانے میں سن لیتے۔

عادات واطوار

مولوی سید ہاشم صاحب کہتے ہیں، دہلی میں جب آپ راستے سے چلتے تھے تو نہایت فروتنی سے چلتے تھے اور نظر نیچی رہتی تھی ادھر سے ادھر نہ دیکھتے تھے۔ گویا نظر بر قدم کے مصداق تھے مگر ہیبت حق یہ ہوتی تھی کہ جو کوئی کس وناکس آپ کو دیکھتا تھا تو بغیر دست بوسی کے آگے نہ بڑھتا تھا اور دکاندار سب اپنی اپنی دکانوں سے نیچے آتے اور مصافحہ سے مشرف ہو کر جاتے تھے۔ انتہیٰ

تلامذہ

مکہ معظمہ میں بھی آپ کے شاگرد موجود ہیں چنانچہ مولوی محمد صاحب وغیرہ اور مدینہ منورہ میں جناب مولانا مولوی عبدالغنی صاحب دہلوی مدنی سلمہا اللہ تعالیٰ

اور ہندوستان میں تو بکثرت ہر یک بلاد وامصار میں مرید وشاگرد بھرے ہوئے ہیں ان میں سے یہ چند شخص مستثنیٰ اور مشہور ہیں۔

لوذعی۔ یلمعی جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سلمہ اللہ تعالےٰ۔

منتخب فضلائے زماں جناب مولوی حافظ قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی سلمہ اللہ تعالیٰ

فاضل یگانہ مولوی حافظ شیخ محمد صاحب ساکن تھانہ[1] سلمہ اللہ تعالیٰ۔

گوہر بحار علوم صوری و معنوی جناب مولوی عالم علی صاحب ساکن نگینہ مشہور بہ مرادآبادی حال نزیل رام پور سلمہ اللہ تعالیٰ آپ خلیفۂ طریقت بھی ہیں۔ سلسلہ علوم ظاہر و باطن کا آپ سے جاری ہے۔

نواب معلی القاب مولوی حاجی مہاجر متبع سنن سید الاوائل والاواخر بحر مواج علوم و عرفان نواب محمد قطب الدین خاں دہلوی رحمتہ اللہ علیہ والغفران۔

آپ شاگرد رشید اور خلیفۂ طریقت اور سجادہ نشین حضرت کے تھے اور انتقال آپ کا مدینہ منورہ میں ماہ رجب ۱۲۸۹ھ میں ہوا ہے۔

---

[1] تھانہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں اس کو تھانہ بھون بھی کہتے ہیں ۱۲

حضرت شاہ ولی اللہ کے ذہن میں وقتاً فوقتاً جو اچھوتے خیالات آتے اور مختلف حالات، وکوائف پرانکے جو نادر تاثرات ہوتے وہ انہیں قلم بند فرماتے جاتے تفہیمات ان کے ان ہی خیالات اور تاثرات کا مجموعہ ہے ابھی اس کا دوسرا جز تحقیق و حواشی سے مصری ٹائپ میں شائع ہوا ہے۔

قیمت　دس روپے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد

تنقید و تبصرہ

انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ اوراد فتحیہ تصنیف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ کتاب مع اسکے اردو ترجمہ کے اہل سنت والجماعت نے جسے عرف عام میں بریلوی کہتے ہیں، چھاپی ہے سرورق پر حضرت شاہ ولی اللہ کے جو القاب مرقوم ہیں وہ ملاحظہ ہوں۔ حضرت دست گاہ حقائق انتباہ مجمع کمالات ظاہری و باطنی منبع مکارم حسنات صوری و معنوی زبدۃ المفسرین و قدوۃ المحدثین پیشوائے سالکین فانی فی اللہ باقی باللہ جناب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی جامعیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو گی کہ آج اسی دور میں بھی جہاں عقلیت کے علم بردار ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، مسلک دیوبندی کے متبع انکے پیرو ہونے کے مدعی ہیں۔ اہل حدیث اپنے حق میں ان سے استناد لیتے ہیں، وہاں اہل سنت والجماعت المعروف بہ بریلوی بھی ان کی کتابیں شائع کرتے ہیں اور انہیں ان جلیل القدر القاب سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کتاب فیوض الحرمین میں اپنی اس جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کے بعد میرے لئے اللہ تعالےٰ کی تدلی اعظم ظاہر ہوئی تو میں نے اسے بے کنار اور غیر متناہی پایا۔ اور اس وقت میں نے اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا۔ میں

نے دیکھا کہ میں گویا ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے۔ اور میں اس غیر متناہی کو اپنے اندر نگل گیا ہوں اور میں نے اس غیر متناہی میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔"

حضرت شاہ صاحب اس رسالے کے تعارف یوں کراتے ہیں۔ یہ رسالہ ان سلاسل مشہورہ کی تعریف میں لکھا گیا جن سے یہ فقیر علم ظاہر و باطن میں متمسک اور ان سے وابستہ ہے۔

مقدمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان سلسلوں کا ارتباط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس ضمن میں بعض امور میں اوائل امت اور اواخر امت میں اختلاف بھی ہے پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اول زمانے میں جو صوفیہ ہوئے ان کا زور صحبت تعلیم و تربیت پر تھا۔ اور ان کے ہاں خرقہ اور بیعت کا رواج نہ تھا۔

اس کے بعد تصوف کے از قسم خرقہ بیعت وغیرہ جو آداب ہیں، ان کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں اس فقیر کو ارتباط بیعت صحبت و خرقہ و فیض توجہ و تلقین عالم باطن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے بعد ازاں اس کی تفصیل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔ حاشا للہ کہ اس واقعہ میں کچھ کلمہ و کلام درمیان نہ تھا۔ بس افاضۂ روحانی تھا اشارت و فضل کے ساتھ۔

اس کے بعد سلسلہ وار مشہور خانوادہائے طریقت کی سند لکھی ہے اور ان سب سے اپنا اتصال بتایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس فقیر کے سلسلۂ صحبت تہذیب باطن کے طریق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مستفیض متصل یقینی الوقوع ہے کہ ہر ایک رجال سلسلہ نے اپنے شیخ کے ساتھ صحبت رکھی ہے اور آداب طریقہ حاصل کئے ہیں بے شبہ ہر چند تعین ہونا ان آداب و اشغال کا یقینی نہیں ہے پس فقیر ایک مدت حضرت والد بزرگوار کی صحبت میں رہا ہے اور بیعت کی ہے۔ اور آداب طریقت سے بہت کچھ سیکھا ہے اور طریقوں کے اشغال اخذ کئے ہیں اور خرقہ صوفیہ ان کے ہاتھ سے پہنا ہے اور خلوت میں اس ضعیف پر بہت توجہ فرمائی ہے۔ اور اصل نسبت حضور کی ان کی توجہ سے حاصل کی ہے۔

غرض شاہ ولی اللہ جہاں ایک مانے ہوئے محدث، مجتہد فی الفقہ اور متکلم و حکیم ہیں وہاں وہ صوفی بھی ہیں اور انہوں نے تصوف کے آداب و اشغال کی ساری منزلیں طے فرمائی تھیں۔

سلسلۂ تصوف میں اکثر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں سے اخذ فیض کیا اور فلاں نے فلاں سے کیا۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے دو بزرگوں کا ایک وقت میں ہونا ثابت نہیں ہوتا

شاہ صاحب اس کا ذکر تو کرتے ہیں اور اس ضمن میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان دو بزرگوں کے ملنے کے کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا وہاں یہ ممکن ہے کہ باطنی طور پر اخذ فیض کیا ہو۔ مثلاً تصوف کے سلسلے میں حضرت حسن بصری کا حضرت علیؓ سے اخذ فیض کرنا بتاتے ہیں۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔

شاہ صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

حاصل کیا خواجہ ابوالحسن خرقانی نے شیخ ابویزید بسطامی سے باطن کے طور پر ظاہر کے طور پر نہیں کیونکہ وفات شیخ ابویزید بسطامی کی خواجہ ابوالحسن کی ولادت سے بہت مدت پہلے ہوئی اور شیخ ابویزید نے سیدنا امام جعفر صادق سے باطن کے طریق سے ظاہر کے طریق سے نہیں۔ اس واسطے کے ولادت شیخ ابویزید کی بہت بعد ہوئی ہے وفات امام جعفر صادق کے۔

امام جعفر صادق کے اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق سے اخذ فیض کرنا بتایا جاتا ہے اور قاسم کا سلمان فارسی سے اور سلمان فارسی کا حضرت ابوبکر صدیق سے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ قاسم کا سلمان فارسی سے اخذ فیض کرنا ممکن نہیں مگر یہ کہ باطن کے ذریعہ ہو۔ اسی طرح حضرت علی سے حسن بصری کا اخذ فیض کرنا ممکن نہیں اہل حدیث کے نزدیک، لیکن اہل سلوک اسے مانتے ہیں۔

غرض شاہ صاحب نے ظاہر کے بجائے باطن کے ذریعہ اخذ فیض کرنے کی توجیہ کر کے تاریخ کی اس مشکل کو حل کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں شیخ ابوالحسن خرقانی نے حاصل کیا ابویزید بسطامی کی روح سے جیسے حضرت اویس قدس اللہ سرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے حاصل کیا۔ اور یہ جو دونوں بزرگوں کی خدمت وصحبت مشہور ہے وہ صحیح نہیں۔

شاہ صاحب صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ محدث و مورخ بھی ہیں اس لئے وہ صوفیہ کی ساری روایات تسلیم نہیں کرتے لیکن وہ ان کا انکار بھی نہیں کرتے۔ البتہ ان کی بڑی عمدہ توجیہہ کر دیتے ہیں۔

آپ نے تمام مشہور خانوادوں اور ان کے آداب سلوک اور اوراد و وظائف کو بیان کیا ہے۔ اور جن واسطوں سے خود شاہ صاحب تک ان خانوادوں کا سلسلہ پہنچا ہے، ان کا ذکر ہے۔ مثلاً اپنے نقشبندی

سلسلے کا دہ یوں بیان کرتے ہیں۔ فقیر اپنے والد (شاہ عبدالرحیم) کی صحبت میں رہا۔ انہوں نے صحبت رکھی۔ شیخ احمد بنوری سے، انہوں نے شیخ احمد سرہندی سے۔ انہوں نے خواجہ محمد باقی سے اور یہ سلسلہ خواجہ نقشبند سے چلتا ہوا جنید بغدادی تک جاتا ہے۔ اور ان سے حضرت علی تک اور وہ صحبت میں رہے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ جو طریقہ آج کے دن محفوظ ہے، اس کا منشاء (آغاز کار) جنید بغدادی ہیں اور خرقہ بھی وہی محفوظ ہے۔ جو جنید بغدادی کے واسطے سے ہے

زیر نظر رسالہ میں یوں تو زیادہ تر تصوف کے خانوادوں اور ان کے اشغال ہی کا بیان ہے لیکن بیچ بیچ میں شاہ صاحب نے بعض اور بھی بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں۔ طریقہ سہروردی کے اشغال کا بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

پھر مشغول ہو تلاوت قرآن شریف میں فکر کے ساتھ نصیحت ماننے کے ساتھ اور ترتیل کے ساتھ اور حفاظت و کتاب کے ساتھ (بالتامل والاتعاظ والترتیل والاحتفاظ) اس طور پر کہ گویا اللہ تعالےٰ کے آگے پڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کلام فرما رہا ہے۔ حضوریٔ قلب سے توجہ سے بڑے ادب سے خشوع و خضوع سے تلاوت کرے اور حزب اور ورد حزب کی مقدار پڑھنے اور زیادہ نہ پڑھنے اور اس میں نصیحت و عبرت ملحوظ رکھے۔ بہت سے ایسے قاری ہوتے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے۔ کیونکہ وہ حروف کی صحت کا خیال رکھتے ہیں اور نہ انہیں جہاں ٹھہرنا ہوتا ہے وہاں ٹھہرتے ہیں۔ اور نہ قرآن کے مواعظ سے نصیحت حاصل کرتے ہیں نہ اس کی امثال اور نہ جبر و توبیخ میں غور و فکر کرتے ہیں۔

آخر میں ایک اور دلچسپ بحث ملاحظہ ہو اور یہ ہے تسبیح کی سند جو زیر نظر رسالے کے آخری حصے میں درج ہے۔ لکھتے ہیں :-

مجھے یہ سند دی سید عمر ابن بنت شیخ عبداللہ بصری مکی نے اور انہوں نے کہا کہ دی میرے جد شیخ عبداللہ نے اور ان کو دی ان کے شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی نے اور اس طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔

ابوالحسن صوفی کہتے ہیں کہ میں نے ابوالحسن مالکی کو سنا اور ان کے ہاتھ میں تسبیح

تھی کہ میں نے جنید کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد سری سقطی کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے معروف کرخی کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی اور اس طرح یہ سلسلہ حسن بصری اور ان سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے اور آخر میں یہ ہے۔ حسن بصری کے قول سے واضح ہوا کہ تسبیح موجود اور مستعمل تھی صحابہ کے عہد میں۔

رسالہ معمولی کاغذ پر چھاپہ گیا ہے۔ مترجم کا نام درج نہیں۔ ترجمہ کی زبان پرانے طرز کی ہے۔ رسالے کے متن میں کتابت کی کافی غلطیاں ہیں اور ترجمہ بھی ناقص ہے۔

ضخامت ۱۸۴ صفحات

ملنے کا پتہ کتب خانہ علویہ رضویہ مسجد نوری حنفیہ۔ ڈجکوٹ روڈ۔ لائل پور

دین آباء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مصنفہ سید حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ

ناشر۔ مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدر آباد۔ پاک

صفحات ۲۱۶ - قیمت ۲ روپیہ ۵۰ پیسے

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آباء کے دین اور نجات کے متعلق جمہور علماء کا جو مسلک ہے تو ظاہر ہے، لیکن ان متقدمین یا متاخرین علماء میں سے کچھ محققین ایسے بھی گذرے ہیں جو ایک طرف جمہور علماء کے دلائل کی قوت اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء کی اعلیٰ شخصیت کو دیکھ کر اس مسئلے میں سکوت کی راہ اختیار کرنے کو ترجیح دی ہے۔

سندھ کے عظیم محدث اور فقیہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی سندھی نے اپنی مشہور عالم تالیف۔ فرائض الاسلام میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

متاخرین علماء میں خدا بھلا کرے علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کا جنہوں نے اس مسئلے کے مختلف زاویوں کو لے کر اس پر چھ رسالے لکھ ڈالے۔ جن کے یہ نام ہیں۔

۱۔ مسالک الحنفاء فی والدی المصطفیٰ۔ ۲۔ الدرج المنیفتہ فی الآباء الشریفتہ،

۳۔ المقامۃ السندسیۃ فی النسبۃ المصطفویۃ۔

۴۔ التعظیم والمنۃ فی ان ابوی رسول اللہ فی الجنۃ

۵۔ نشر العلمین المنیفین فی احیاء الابوین الشریفین

۶۔ السبل الجلیۃ فی الآباء العلیۃ۔

یہ چھ رسالے علامہ سیوطی کے دوسرے تین رسالوں کے ساتھ الرسائل التسع کے نام سے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن سے تین بار چھپ چکے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی کا علمی تبحر اور فن حدیث پر نظر اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن وہ کسی ایک مسلک کو لے کر آگے نہیں بڑھے اور ایک رسالہ آنحضرت کے والدین کے احیاء اور ایمان لانے پر بھی لکھ ڈالا۔

زیر نظر کتاب "آباء النبی" میں فاضل مؤلف نے اصل میں علامہ سیوطی کے ان رسائل کو ہی اپنی تحقیق کا اساس قرار دیا ہے اور اس کو اردو کا لباس پہنایا ہے۔ لیکن مؤلف علام ایک ہی مسلک کو لے کر چلے ہیں کہ آنحضرت کے تمام آباء، واجداد وامہات وجدات کفر و شرک کے شائبہ سے مبرا تھے اور فاضل مؤلف نے بعض رواۃ حدیث پر جو تنقید فرمائی ہے اس سے فن رجال میں ان کی غائر نظر معلوم ہے اور کتاب کے صفحہ تین اور چار پر حافظ ابن کثیر کی تفسیر ج ۲ ص ۱۸ سے کعب الاحبار کے متعلق جو ایک حوالہ نقل کیا ہے۔ اس سے عام تفسیری روایات پر بڑی زد پڑتی ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ انہ (کعب) لما اسلم فی الدولۃ العمریۃ جعل یحدث عمر رضی اللہ عنہ کتبہ فربما استمع لہ عمر رضی اللہ عنہ فترخص الناس فی استماع ما عندہ ونقلوا ما عندہ غثہا وسمینہا۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ ولیس لہذہ الامۃ حاجۃ الی حرف واحد مما عندہ۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

المسوّى من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّی میں المؤطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں — قیمت: ۲۰ روپے

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

(عربی)

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو (۲) روپے

رحیم خان منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد سرور پبلشر نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی جامع مسجد صدر حیدرآباد سے شایع کیا

جلد نمبر ۵ ماہ مئی ۱۹۶۸ شمارہ نمبر ۲

بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

ماہنامہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر، حیدرآباد

قیمت سالانہ:۔ آٹھ رُوپے

فی پرچہ:۔ پچھتر ۷۵ پیسے

الرحیم حیدرآباد

جلد ۵ ماہ مئی ۱۹۶۸ء مطابق صفر المظفر ۱۳۸۸ھ نمبر ۱۲

فہرست مضامین

○

شذرات

گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کے ادبار و زوال کا ایک بہت بڑا سبب ان کے باہمی اعتقادی و سیاسی اختلافات تھے۔ اعتقادی اختلافات موجب بنے سیاسی اختلافات کے یا سیاسی اختلافات کے نتیجے میں اعتقادی اختلافات پیدا ہوئے؟ یہ مسئلہ اہل علم کے ہاں برابر موضوع بحث رہا ہے۔ بہر حال اس سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ ہر دو اختلافات سب سے بڑا سبب تھے مسلمانوں کے عروج و اقبال سے قعرِ مذلت میں گرنے کے۔

غیر مسلم قوموں کی براہ راست غلامی یا بالواسطہ اثر اور دباؤ سے گلو خلاصی کے بعد آج ہر مسلمان ملک کو بے شمار اور دوسرے مسائل کے ایک اہم مسئلہ یہ بھی در پیش ہے کہ کس طرح وہ اپنے ہاں داخلی ہم آہنگی و اتحاد، جذباتی و فکری بھی اور سیاسی و اجتماعی بھی، بروئے کار لائے اور دوسرے یہ کہ اس وقت بین الاقوامی سیاسیات میں دنیا کا رجحان جو بڑی بڑی سیاسی وحدتوں کی طرف ہے اس میں یہ مسلمان ملک اپنی جگہ کہاں بنائیں۔

اکثر مسلمان ملکوں نے اپنی داخلی ہم آہنگی و وحدت کے لئے اپنی وطنیت اور لسانیت کو اساس بنایا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسلامیت کا درجہ اس کے بعد آتا ہے ترکوں اور ایرانیوں میں تو یہ قومی رجحان عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے اب بیشتر عرب ممالک بھی اسی راہ پر گامزن ہیں ان کے ہاں امۃ عربیۃ اور الوحدۃ العربیۃ، کا تصور مقدم ہے۔ امۃ اسلامیۃ اور الوحدۃ الاسلامیۃ پر۔ اور اس طرح ان ملکوں کے اندر جو اعتقادی اختلافات تھے، انہیں قومی وحدت کے تحت عملاً غیر موثر بنانے کی کوشش کی جارہی ہیں۔

اب پاکستان کا مسئلہ ان سب مسلمان ملکوں سے جدا ہے ان کی طرح کی جغرافیائی نسلی، لسانی اور تاریخی قومیت کی ہمارے ہاں زیادہ گنجائش نہیں۔ ہمیں تو اپنی داخلی ہم آہنگی و وحدت کا جذبہ اسلام سے حاصل کرنا ہے اور اسلام ہی اسکی اساس اور اس کا سب سے بڑا محرک ہو سکتا ہے۔ جب یہ صورت حال ہے اور اسلام کو اپنی قومی وحدت کا نقطہ آغاز اور محرک اولیں بنائے چارہ نہیں۔ تو کیا ان حالات میں یہ ضروری نہیں کہ اس ملک میں جو مختلف اسلامی فرقے موجود ہیں، اور وہ کافی فعال و موثر بھی ہیں۔ ان کے باہمی اعتقادی اختلافات کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی منافرت کم ہو۔ ہمارے نزدیک یہ دینی ضرورت تو ہے ہی اسکے ساتھ ساتھ ہماری یہ قومی ضرورت بھی ہے۔

انہی دنوں ہمیں ایک مشہور عالم دین شیخ ابوزہرہ کی کتاب "المذاہب الاسلامیہ" جس میں مسلمانوں کے اعتقادی و سیاسی فرقوں سے بحث کی گئی ہے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ موصوف نے شروع ہی میں لکھا ہے کہ اعتقادات کی بناء پر مسلمانوں میں جو فرقے بنے ان کے درمیان اعتقادی بناء پر کوئی جوہری فرق نہیں پایا جاتا یہ فرق اصل عقائد کے بجائے فروعات میں ہے۔ اور شیخ موصوف کے نزدیک عقیدۂ توحید ہی عقائد اسلامی کا مغز و خلاصہ ہے۔ اور اس میں سب اہل قبلہ متحد الخیال ہیں۔

اب اگر اس اصول پہ تمام فرقوں کا اتفاق ہو جائے۔ یا وہ اسے تسلیم کرنے پہ آہستہ آہستہ آمادہ ہوتے جائیں، تو اس وقت ان کے اختلافات میں جو شدت ہے اور اس سے جو مخاصمت پیدا ہو رہی ہے، وہ بہت حد تک کم ہو جائے گی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جب یہ اعتقادی اختلافات اصل دین میں نہ تھے، بلکہ فروعات میں تھے تو پھر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں تاریخ کے گزشتہ ادوار میں اس قدر نفرت کیوں پھیلی بعض اوقات ان کے درمیان خونریز جنگیں کیوں ہوئیں اور انہوں نے ایک دوسرے کو کافر و ملحد و زندیق ثابت کرنے کی کوششیں کیوں

کیوں کیں؟ اس کی ایک بہت بڑی وجہ ان تاریخی ادوار کے سیاسی حالات تھے جنہوں نے ان فطری اعتقادی اختلافات کو یہ شکل دی، اور ایک ملت بدقسمتی سے، بظاہر مختلف ملتوں میں بٹ گئی اور ان میں آپس میں منافرت کے بیج پڑے جو بعد میں بڑھتے بڑھتے شجر عظیم بن گئے۔ مثال کے طور پر معبد جہنی اور غیلان جہنی فرقہ قدریہ کا بانی کہا جاتا ہے وہ دونوں اموی حکمرانوں کے مظالم کے خلاف تھے چنانچہ مارے گئے۔ اسی طرح فرقہ جبریہ کا بانی جہم بن صفوان بھی دراصل بنو امیہ کی مخالفت کی وجہ سے قتل ہوا۔

اعتقادی اختلافات نے سیاسی اختلافات کو جنم دیا۔ یا سیاسی اختلافات باعث بنے اعتقادی اختلافات کے بہر حال ان میں سے کوئی بات بھی ہو۔ اعتقادات کے اختلاف نے بعد میں یہ جو صورت اختیار کی کہ مسلمان مذہب کی بنا پر آپس میں متحارب گروہوں میں بٹ گئے۔ اور ایک نے دوسرے کو کافر و زندیق قرار دے کر اس کے خلاف انتقامی اقدام کرنا ضروری سمجھا۔ یہ سب سیاسی اغراض یا سیاسی ضرورتوں کے تحت ہوا۔

اب جب نہ وہ سیاسی حالات رہے اور نہ وہ لوگ رہے جن میں یہ کشمکشیں تھیں تو تاریخ کے ان افسوس ناک واقعات کی بنا پر آج اعتقادی اختلافات کو مسلمانوں میں وجہ تفریق و منافرت بنانا کہاں تک درست ہے۔

مختلف فرقوں کے باہمی اختلاف اور رنجشیں دین کے اصل جوہر میں نہیں بلکہ فروعات میں ہے۔ اور یہ کہ ان فرقوں کی آپس کی کدورتیں تاریخی حالات اور سیاسی ضرورتوں کا نتیجہ تھی اگر ہمارے ہاں اس چیز کا شعور عام ہو جائے اور ہر فرقے کے منصف مزاج اہل علم اور اصحاب قلم اس پر زور دیں تو پاکستان کی داخلی ہم آہنگی و وحدت کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسے حل کرنے کی سخت اور فوری ضرورت ہے۔

سابق صوبہ سرحد کا قانون شفعہ

اسلامی قانون شفعہ کی روشنی میں[1]

مولانا محمد عبدالقدوس شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی

شریعت اسلامیہ کا قانون فقہ تیرہ سو سال تک اسلامی دنیا میں نافذ رہا اور عدل وانصاف کے بارے میں متمدن دنیا کی نصف سے زائد آبادی کی ضرورتیں اس قانون کی بدولت پوری ہوتی رہیں جب تک مسلمانوں کو سیاسی غلبہ اور استحکام حاصل رہا اس قانون کی برتری مسلم تھی اور بعض علمار کی تحقیق کے مطابق قرون وسطیٰ کے یورپین علمائے قانون، قانون روما کی تجدید واحیار میں قانون فقہ سے استفادہ کرتے رہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے سیاسی استحکام میں تزلزل آیا۔ اور ان کی حیثیت بین الاقوامی سیاست میں فرد مساوی کی نہ رہی سیاسی کمزوری کے آتے ہی مسلمانوں کی ہر متاع کی قیمت گر گئی۔ اور ان کے نظام قانون اور عدالت پر بھی حرف گیری شروع ہوئی۔ خود مسلمان بھی غیروں کی حرف گیری کا اثر لینے لگے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا اثر یہاں تک یہ ہوا کہ اس وقت مسلم ممالک

---

[1] یہ مقالہ آل پاکستان اسلامک اسٹڈیز کانفرنس حیدرآباد میں پڑھا گیا۔

میں جو قوانین رائج ہیں ان میں اسلامی شریعت کا حصہ بہت کم ہے۔ فقہ کا بین الاقوامی قانون۔ قانون جرائم، قانون تجارت، قانون معاہدات اور قانون مالیات اسلامی دنیا کے تقریباً ہر گوشے میں معطل ہیں۔ صرف قانون احوال شخصیہ اور قانون مدنی کے بعض حصے اکثر اسلامی ممالک میں رائج ہیں مگر تجدد اور تحفظ کے دو عناصر میں جو کشمکش اس وقت جاری ہے اس کے غیر واضح رجحان کے پیش نظر کوئی نتیجہ اخذ کرنا قبل از وقت ہے۔

انگریزی اقتدار سے پہلے برعظیم ہند و پاکستان میں اسلامی شریعت کا قانون فقہ نافذ تھا۔ انگریزی اقتدار مسلط ہوا تو قانون فقہ کا نظام رفتہ رفتہ بدلتا رہا۔ اور انگریزی قانون اور مقامی رواج اس کی جگہ لیتے رہے یہاں تک کہ آخر میں صرف مسلم شخصی قانون محمڈن لا کے نام سے باقی رہ گیا جس میں عرف و عادت اور عدالتہائے عالیہ کے ججوں کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ترمیمیں ہوتی رہیں

مملکت پاکستان کے قیام کے وقت ہمارے اسلامی قانونی ورثے میں سے صرف مسلم شخصی قانون ہی یہاں کے نظام عدالت میں باقی رہا تھا۔ باقی تمام قوانین کم از کم ان معنوں میں ضرور غیر اسلامی تھے۔ کہ ان قوانین کو وضع کرتے وقت واضعین کے سامنے یہ سوال بالکل نہ تھا کہ یہ قوانین اسلامی اصول قانون کے مطابق رہیں۔

پاکستان کے قیام کا مقصد اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی ثقافت کی حفاظت تھی اگرچہ اس نئی مملکت کے قیام میں متعدد مختلف الخیال عناصر نے حصّہ لیا ہے۔ اسلامی سوسائٹی کے بارے میں ان عناصر میں سے ہر ایک کا تصور جداگانہ ہے۔

تاہم اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بڑا طبقہ وہی ہے جو فقہ اسلامی کے روایتی اثاثہ کو زینتِ طاق بنانے کی بجائے اس پر نظر ثانی کرنے اور مناسب ترمیموں کے ساتھ اسے پھر سے رائج کرنے کے حق میں ہے۔ اور اس کی نظر میں اسلامی ثقافت

کے تحفظ کے لئے شریعت اسلام کے عملی نفاذ کی تدبیر دیگر تمام منصوبوں پر مقدم ہے۔ اور حک واصلاح کے ذریعہ اسلامی فقہ کی تجدید اور اس کے نفاذ پر ہی ہمارے معاشرہ کا استحکام منحصر ہے۔

پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے اس حقیقت کا صحیح اندازہ لگایا تھا جو موصوف نے مجلس وکلار کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے ایک تقریر میں ارشاد فرمایا کہ

"ہمارے جیسے ملک میں جہاں مملکت کا ایک سرکاری مذہب مسلم ہے۔ ہمیں اس مقبول عام مطالبہ کی اہمیت کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ ملک کے تمام قوانین کا اس سرکاری مذہب کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اس مطالبہ کے الفاظ اور اس کی تعبیر چاہے کچھ ہی ہو اور اس کی نمائندگی چاہے جس گوشے سے بھی کی جائے یہ بات بہرحال واضح ہے کہ یہ مطالبہ اس قوم کی طرف سے ہے جو یہ چاہتی ہے کہ اسکی قومی ہستی کی جڑوں کی آبیاری کرکے اس کی زندگی کو توانائی بخشی جائے۔ اس مطالبہ کے جواب میں یہ کہنا کافی نہیں کہ قوم کے پاس پہلے ہی سے ایسا سرمایہ قوانین موجود ہے جس کے مطابق وہ سالہا سال سے اطمینان کی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔"

اس تقریر میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ

"ہمارے قوانین کو متمدن ممالک کے رائج الوقت قوانین کے ساتھ تطبیق دینا کافی نہیں کیونکہ مغربی نظام عدالت اور ان قوانین میں نمایاں فرق ہے۔ جو مشرق وسطیٰ کی تہذیب اور وہاں کے مذاہب پر مبنی ہیں۔ پاکستانی قوم کا تمدن مشرق وسطیٰ کی ثقافت سے وابستہ ہے اور جب تک

یہاں کے قوانین میں ان ثقافتوں کی روح کو سمویا نہ جائے گا اس
وقت تک عوام کی طرف سے یہ ہر دلعزیز مطالبہ باقی رہے گا۔"

آنریبل چیف جسٹس کے ان ارشادات سے یہ واضح ہوتا ہے اور یہی حقیقت بھی ہے کہ قانون کی بنیادیں کسی قوم کی ثقافت کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں پھر اسی قانون کی یکسانی اور ہمہ گیری قوم میں وحدت کے اثرات پیدا کرتی ہے۔ اور دوسری اقوام سے کسی قوم کے قانون کا امتیاز قوم کے ثقافتی امتیاز کو جلا بخشتا ہے۔

اسلامی ثقافت کے جن عناصر نے گذشتہ چند صدیوں میں عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں اتحاد اور امتیاز کی خصوصیات پیدا کی تھیں ان عناصر میں سے ایک اہم عنصر فقہ یا اسلامی قانون شریعت بھی تھا۔ جو اسلامی ممالک کے مسلم اور غیر مسلم باشندوں کی زندگی پر اپنا اثر برابر ڈالتا رہا۔ اور جبکی بدولت اسلامی ثقافت کے یکساں خدوخال مشرق وسطیٰ کے علاوہ برعظیم ہند و پاکستان میں بھی بہت شدت کے ساتھ پھیلتے رہے فقہ اسلامی کے ان اثرات کو اس اتفاقی حادثہ نے اور بھی ہمہ گیری بخشی کہ پچھلی صدیوں جہاں ایک طرف سلاطین آلِ عثمان کے زیرنگیں تمام مشرق وسطیٰ کے ممالک پر حنفی فقہ کا تسلط رہا وہاں اس طرف ہندوستان میں بھی حنفی فقہ کو ہی سرکاری قانون کی حیثیت حاصل رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے مذہب سے واقف فرماں روا وٴں کی بدولت اس فقہ کو فروغ بھی حاصل ہوتا رہا۔ اور اس میں اضافے بھی ہوتے رہے۔

(۲)

اسلامی فقہ کے بارے میں عرصے تک مستشرقین اس خیال کا اظہار کرتے رہے۔ کہ اس کے اصول قانون روما سے ماخوذ ہیں۔ اور کئی مسلمان اہل قلم کو اس غلط فہمی کے رفع کرنے کے لئے قلم اٹھانا پڑا۔ جن میں مولٰنا شبلی نعمانی کا نام سر فہرست ہے۔

ان کے علاوہ عطیہ مصطفی مشرفہ، صبحی محمصانی، حسن احمد الخطیب

وغیرہ کئی مصری اہل قلم نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اور اس حقیقت میں اب مستشرقین کو بھی بہت کم شبہ رہا ہے۔ کہ فقہ اسلامی کسی دوسرے قانون سے ماخوذ نہیں بلکہ اسکی بنیاد براہِ راست قرآن و حدیث وغیرہ قانون اسلامی کے مسلمہ مآخذ پر قائم ہے۔ فقہ اسلامی کو رومن لا سے ممتاز حیثیت حاصل ہونے کی ایک محکم اور مضبوط دلیل فقہ کا قانون شفعہ ہے۔ قانون شفعہ اسلامی فقہ کے ان ممتاز قوانین میں سے ایک ہے جن کی نظیر دوسرے ممالک و اقوام کے قوانین میں بہت کم ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی دور کے ہندوستان میں جب مسلم شخصی قانون کے علاوہ دوسرے تمام قوانین کا سانچہ یا تو انگریزی قوانین کے مطابق ڈھالا گیا یا عرف و عادت پر ان کی بنیاد رکھی گئی تو قانون شفعہ کو مسلم شخصی قانون کے ہمسایہ ہی میں جگہ دی گئی حالانکہ شفعہ کا تعلق دراصل قانون معاملات سے ہے۔

مسلم شخصی قانون (قانونِ احوالِ شخصیہ) سے خارج ہونے کی بنا پر ہی یہ قانون کئی علاقوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو خاندانوں کے لئے بھی معمول رہا۔ اور ان کے عرف و عادت میں شامل ہونے کی وجہ سے آج بھی بہت سے ہندو خاندانوں کے مقدمات اسی قانون کی رو سے پیدا ہونے اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ یہ قانون مسلم شخصی قانون میں واضح طور پر شمار نہیں۔ اس لئے جہاں جہاں اسے چھوڑنے کا جواز پیدا ہو سکا۔ انگریزی عہد کے مقننین اس قانون کے نفاذ پر پابندیاں لگاتے رہے مثلاً مدراس کے ہائی کورٹ نے اس قانون کے بارے میں یہ فیصلہ دیا کہ قانون شفعہ بائع اور مشتری کی شخصی آزادی پر ہر نا جائز پابندی ہے۔ اس لئے اس قانون کی بنا پر کسی کو جائداد حاصل کرنے کی اجازت دینا قانون انصاف و مساوات کے منافی ہے۔ دوسری طرف پنجاب کے بارے میں اس وقت کے قانونی ماہرین کی رائے یہ رہی کہ یہاں شفعہ کا جو رواج پایا جاتا ہے وہ قانون شریعت سے ماخوذ نہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ رواج اس علاقے میں کسی اور بنیاد پر قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اس قانونی رائے کی بنا پر پنجاب کے لئے یہاں کے رواج ہر کسی حد تک مبنی قانونِ شفعہ

مرتب کیا گیا۔ جو دوسرے علاقوں میں رائج حنفی قانون شفعہ سے کئی امور میں مختلف ہے اس قانون میں بنیادی تصور زراعت پیشہ خاندانوں میں ملکیت اراضی کا تحفظ ہے اور چونکہ ملکیت اراضی کے دوسرے قوانین پنجاب اور سابق صوبہ سرحد میں یکساں تھے اس لئے پنجاب ہی کا قانون شفعہ صوبہ سرحد میں بھی رائج کر دیا گیا۔ سن ۱۹۵۰ء میں صوبہ سرحد کے قانون ساز اسمبلی نے صوبہ سرحد کے لئے جداگانہ قانونِ شفعہ منظور کیا۔ جس کی رو سے شفعہ کے مستحق تقریباً وہی اشخاص قرار دیئے گئے جو حنفی قانون شفعہ کی رو سے مستحق قرار پاتے ہیں۔

(۳)

چونکہ صوبہ سرحد کے قانون شفعہ کا ڈھانچہ بنیادی طور پنجاب کے قانون شفعہ کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ اس لئے صوبہ سرحد کا قانون شفعہ بھی ملک کے دوسرے حصوں میں رائج حنفی قانون شفعہ سے کئی امور میں مختلف ہے یہاں ان باہم مختلف نقاط میں سے چند پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) استحقاقِ شفعہ

حنفی قانون شفعہ کی رو سے مندرجہ ذیل اشخاص شفعہ کے مستحق ہیں[1]

ا۔ شریک جائداد شخص یا اشخاص

ب۔ شریک منافع ولواحقِ جائداد (خلیط)

ج۔ جار یعنی وہ شخص جس کی غیر منقولہ جائداد فروخت شدہ جائداد کے ساتھ متصل ہو۔

---

[1] انگریزی دور کے ہندوستان میں رائج اصول قانون کی رو سے قانون شفعہ عرف و عادت کے ان قوانین میں شمار ہوتا ہے جن کا نفاذ قانون عدل و مساوات کی رو سے مناسب ہے۔ اور جن کے نفاذ یا عدم نفاذ کے بارے میں حکومت کے واضح احکام موجود نہیں۔

سابق صوبہ سرحد کے قانون شفعہ نے یہ تین طبقے اسی طرح برقرار رکھے اور چوتھا طبقہ ان زمینداروں کا بڑھا دیا گیا جن کے موروثی مزارعین اپنے حقوق فروخت کر دیں۔[۲]

(۲) بیع کی تعریف

قانون شفعہ میں بیع کی کوئی مستقل تعریف بتائی نہیں گئی۔ مگر چونکہ قانونِ معاہدہ میں بیع کی جو تعریف کی گئی ہے۔ وہ اس قانون میں بھی معتبر ہے قانون معاہدہ کی رو سے تبادلہ بیع کی تعریف میں شامل نہیں۔ اس لئے زمین کے تبادلہ کی صورت میں کسی فریق پر بھی شفعہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برعکس حنفی قانونِ فقہ کی رو سے تبادلہ بھی بیع میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو مشتری قرار دے کر اس کے خلاف شفعہ کا دعویٰ دائر کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ مستثنیات

صوبہ سرحد کے قانون میں مندرجہ ذیل صورتیں شفعہ سے مستثنیٰ قرار دی گئی ہیں۔

---

[۱] پنجاب کے قانون شفعہ میں شہری جائداد کے لئے حنفی فقہ کا اصول تسلیم کیا گیا ہے صرف حقوق ومنافع کی تفصیلات حنفی فقہ سے زیادہ دی گئی ہیں زرعی زمین کے لئے پنجاب کے قانون شفعہ نے اولاً نسبی رشتہ دار کو اور ثانیاً مالک یا موروثی مزارعین کو حق شفعہ دیا ہے کہ زمین زراعت پیشہ خاندانوں سے باہر نہ جاسکے۔

(پنجاب شفعہ ایکٹ دفعہ ۱۴-۱۵)

اس قانون کی ایک جزوی نظیر اسلامی قانون شفعہ میں فقہ مالکی میں ملتی ہے۔ جس کی رو سے موروثی جائداد میں بائع کا بھائی چچازاد مشتری کے خلاف شفعہ کا حقدار ہے

[۲] حنفی قانون شفعہ میں اس کی گنجائش اس لئے نہیں کہ شفعہ صرف جائداد اراضی کے لئے کیا جاسکتا ہے۔ اور حقوق زراعت جائداد اراضی کی تعریف میں شامل نہیں ہوسکتے۔

ا۔ وہ بیع جو کسی عدالت کی طرف سے ڈگری کی تعمیل کے لئے کی گئی ہو۔

ب۔ گورنمنٹ کی طرف سے فروخت شدہ زمینیں۔

ج۔ وہ زمینیں جو کسی کمپنی کے لئے حکومت بذریعہ حکمنامہ حاصل کرے۔

د۔ ایسی زمینیں جسے حکومت وقتاً فوقتاً مستثنیٰ قرار دے۔

ہ۔ دکان برائے کھیٹرا۔ کلب

و۔ دھرم سالہ، مسجد، گرجا وغیرہ خیراتی ادارے

ز۔ دو کنال یا اس کم رقبہ کی ایسی زمین جو کسی دیہات کے باشندے نے اپنے رہائشی مکان کے لئے خریدی ہو۔ اگر اس کا رہائشی مکان یا کنال یا اس سے زائد رقبہ کا موجود نہ ہو۔

حنفی قانونِ شفعہ کی رو سے ب اور و کی استثنا صحیح ہے اس لئے کہ ان زمینوں کا حقیقی مالک کوئی نہیں جسے بائع قرار دیا جائے۔ مگر دوسری استثناؤں کے لئے صراحتہً کوئی گنجائش نہیں۔

۴۔ متعدد شفیعوں میں درجہ استحقاق کا تعین

حنفی قانون کی رو سے ایک طبقہ کے کئی شفیع اکٹھے ہو جائیں۔ تو جائداد حاصل کرنے میں وہ برابر کے حصہ دار ہیں۔ (ہدایہ۔ کتاب الشفعہ۔ محمڈن لا دفعہ ۲۳۱) صوبہ سرحد کے قانونِ شفعہ کی رو سے اگر کئی شریک جائداد شفعہ طلب کریں تو جائداد ان میں ملکیت جائداد کے تناسب سے تقسیم ہوگی (صوبہ سرحد کا قانون شفعہ دفعہ ۱۳)

۵۔ ایکٹ کی رو سے اگر کوئی جائداد کسی ایسے شخص کو فروخت کی جائے جسے خود استحقاقِ شفعہ حاصل ہو تو اس کے مساوی یا اس سے کم درجہ کا استحقاق

---

[1] الف و ب کی استثناء کا مقصد یہ ہے کہ شفعہ ان کی صحیح قیمت کا اندازہ لگانے میں حاصل نہ ہو۔ اور بہ وقت فروخت ان کی زائد سے زائد قیمت مقرر ہو سکے۔

رکھنے والا شفیع شفعہ کا حقدار نہ ہوگا۔ شفیع اس وقت بھی استحقاقِ شفعہ سے محروم قرار پائے گا۔ جب شفیع اس کے مقدمہ دائر کرنے سے پہلے ہی خریدار نے یہ جائداد ایسے دوسرے شخص کے نام منتقل کر دی ہو جو شفیع کے برابر یا اس سے برتر استحقاق شفعہ رکھتا ہو۔ (ایکٹ دفعہ ۱۷)

حنفی فقہ کی رو سے جو شفیع استحقاق میں برابر ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا مشتری ہونا دوسرے مساوی مستحقین کے حق شفعہ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

۶۔ غیر منقولہ جائداد کی تشریح میں بھی اختلاف ہے۔

مثلاً ایکٹ کے ماتحت عدالتی فیصلوں کی رو سے زمینوں کے بغیر خالی عمارات اور کارخانوں کی مشینری بھی غیر منقولہ جائداد میں شمار ہوتی ہے۔ نذیر احمد کا قانون شفعہ پنجاب بہ ذیل دفعہ ۳) مگر حنفی فقہ کی رو سے حق شفعہ کے لئے صرف اراضی غیر منقولہ جائداد ہیں۔

۷۔ قبل از بیع اطلاع

ایکٹ کی رو سے بائع کو چاہیئے کہ تاریخ فروخت سے تین مہینے پہلے شفعہ کے مستحقین کو باقاعدہ عدالتی نوٹس کے ذریعہ جائداد کی تفصیل قیمت اور ارادہ فروخت سے مطلع کر دے اور پورے تین مہینے تک انتظار کرنے کے باوجود اگر شفیع کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے اور بائع اسی تفصیل کے مطابق جائداد فروخت کر دے تو شفیع کا حق شفعہ باقی نہ رہے گا۔ (دفعہ ۱۹)

حنفی فقہ کی رو سے شفیع کا صراحتاً انکار بھی اس کے حق شفعہ کو باطل نہیں کر سکتا۔ حق شفعہ کا ثبوت بیع کے بعد ہوتا ہے اور قبل از ثبوت کسی کا حق ختم کرنا بے معنی ہے۔

۸۔ قانونِ میعاد

ایکٹ کی رو سے شفعہ کے لئے بیع کی تکمیل کی تاریخ سے ایک سال تک کے اندر اندر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔

حنفی فقہ کی رو سے بیع پر مطلع ہو جانے کے فوراً بعد شفیع کے ذمہ یہ ظاہر کرنا لازم ہے کہ وہ مشتری کے خلاف شفعہ کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس بارے میں شفیع پر بہت سخت پابندی لگادی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اسے ایک طویل خط ایسا ملے جس کی ابتدا میں جائداد کی فروخت کی اطلاع تھی اور اس نے شفعہ کے بارے میں اپنا ارادہ ظاہر کئے بغیر خط کو اختتام تک پہنچایا اور پھر شفعہ کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کا حق شفعہ باقی نہیں۔ اس فوری اظہار کو طلبِ مواثبہ[1] کہتے ہیں۔

شفعہ کا ارادہ ظاہر کرکے اسے بائع مشتری یا جائداد کے پاس گواہ پہنچاکر ان کے سامنے یہ بتانا ہے۔ کہ میں اس جائداد پر شفعہ کے ذریعہ قبضہ کرنے کا مدعی ہوں (اسے طلب اشہاد کہتے ہیں)

طلب اشہاد کے بعد مقدمہ دائر کرنے کی نوبت آتی ہے۔ جسے طلب خصومت کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اس تیسری منزل کے لئے کوئی میعاد مقرر نہیں کی۔ مگر مجلۃ الاحکام العدلیہ نے اس بارے میں امام محمد کی اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ تیسری طلب طلبِ خصومت کے لئے بھی ایک مہینہ کے اندر اندر قاضی کی عدالت تک پہنچنا ضروری ہے[2]۔

۹ - قانونی حیلے۔

---

[1] حنفی فقہ کی مستند رائے اس بارے میں یہ ہے کہ مجلس کے اختتام تک ارادہ کے اظہار میں تاخیر قابل عفو ہے۔ اور سلطنتِ عثمانیہ کے مجلۃ الاحکام العدلیہ کے مرتبین نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ یہاں کلکتہ ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ ایک مقدمہ میں شفیع اطلاع سنتے ہی گھر گیا۔ تجوری کھولی (اور غالباً شفعہ کی رقم ادا کرنے کے لئے) اور اس میں سے روپیہ نکالکر شفعہ کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر عدالت نے اس بناء پر اس کا حق شفعہ نہ مانا کہ اتنی تاخیر غیر ضروری تھی۔

[2] مجلۃ الاحکام العدلیہ دفعہ ۱۰۳۴

شفعہ کے ذریعہ جائداد حاصل کرنے اور شفعہ سے بچنے کے لئے شفیع اور مشتری دونوں کی طرف سے طرح طرح کے حیلے کئے جاتے ہیں یہ حیلے دو قسم کے ہو سکتے ہیں ایک وہ جہاں فریقین دھوکا کریں آپس میں عقد ایک طرح طے کریں اور قانون کی زد سے بچنے کے لئے قانونی کارروائی میں اصل عقد کے خلاف ظاہر کریں اس قسم کے حیلے غلط ہیں حنفی قانون میں اس کی اجازت نہیں اور اگر اصلی حالات کا انکشاف قانونی طور پر ہو جائے گا تو فیصلہ اسی کے مطابق ہوگا۔

دوسری قسم کے حیلے وہ ہیں جو شفعہ کی زد سے بچنے کے لئے باقاعدہ اختیار کئے جاتے ہیں۔

مثلاً پڑوسی کے شفعہ سے بچنے کی خاطر اس کے پاس ایک گز چوڑی زمین اپنی ملکیت میں باقی رکھنا اور بقیہ زمین مشتری کے ہاتھ فروخت کر دینا یا اسی طرح کا ایک تراشہ پہلے اسے ہبہ کر دینا اور بعد میں بقیہ زمین بیچ دینا۔ اس قسم کا حیلہ حنفیہ کے ہاں قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور شفیع شفعہ کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ سابق صوبہ سرحد شفعہ ایکٹ میں چند دفعات اس قسم کے قانونی حیلوں کی روک تھام کے لئے رکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شفیع اپنے سے کم درجہ کے استحقاق رکھنے والے شفیع کو اپنے ساتھ ملا کر مقدمہ دائر کرے تو اس کا حق ترجیح ختم ہو جاتا ہے۔[1] (کیونکہ یہ طریقہ عموماً اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ حق فائز والے کو دوسرے شریک سے مالی معاونت حاصل ہو سکے۔) اگر شفیع کسی اجنبی کو اپنے ساتھ شفعہ میں شریک کرے تو دونوں کا حق شفعہ ساقط ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر خریدار خود شفعہ کا حق رکھتا ہو مگر وہ اپنے ساتھ کسی اجنبی[2] کو شریک کر کے خرید کر لے تو اس کا حق ترجیح بھی ساقط ہوتا ہے۔[3]

---

[1] دفعہ ۱۸ [2] عموماً ایسی صورتوں میں اصلی خریدار اجنبی ہی ہوتا ہے اور شفیع کو استحقاق شفعہ کے ختم کرنے کی خاطر شریک کیا جاتا ہے۔ [3] دفعہ ۱۹

اگر عدالت کو یہ یقین ہو جائے کہ جو قیمت مقرر کی گئی ہے وہ درحقیقت ادا نہیں کی گئی۔ یا قیمت قرضہ کی صورت میں بہت زیادہ بتائی گئی ہے تو عدالت خود بازار کے مطابق قیمت متعین کر سکتی ہے اور اگر مشتری کو وہ قیمت منظور نہ ہو تو اصل بیع فسخ کی جائے گی۔

اگر عدالت کو یہ یقین ہو جائے کہ جائداد کا انتقال دراصل بذریعہ بیع مقصود تھا مگر شفعہ سے بچنے کے لئے ایسا معمولی رد و بدل کیا گیا جس کے ذریعہ یہ عقد بیع کی تعریف سے خارج متصور ہو تو عدالت اس عقد کو بیع قرار دے کر شفیع کو شفعہ کا استحقاق دے سکتی ہے۔

ایسے تمام حیلوں کی حیثیت (بہ استثنائے صراحۃً غلط بیانی کے) حنفی قانون شفعہ میں قانونی بن جاتی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔

مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

حضرت مخدوم جلال الدین

اور انکے چند ہم عصر

وقار راشدی ایم اے

حضرت مخدوم جلال الدین المعروف بہ شاہ روپوش کا شمار بنگال کی ممتاز دینی شخصیتوں اور عارفان کامل میں ہوتا ہے۔ آپ نے دین کی نہایت گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ یمن کے ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۷۵ء میں بمقام یمن ہوئی۔ آپ نے نیشاپور میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک یمن کے ایک مدرسہ میں مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہیں دنوں فقہ حدیث اور علوم دینی کا وسیع مطالعہ کیا اور حقائق و معارف کا گہرا جائزہ لیا۔ وحدت الٰہی اور وحدت رسالت کی حقیقتوں سے آشنا ہوئے تلاش حق اور جستجوئے معرفت میں اس درجہ محو ہوئے کہ آپ پر مجذوبیت کا عالم طاری ہوگیا۔ اللہ کی محبت و اطاعت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ایسے دیوانے ہوئے کہ دنیاوی لذتوں سے بیگانے ہوئے۔ اپنی زندگی اپنی ایک ایک سانس اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی اور خدمت دین کے لئے مخصوص کردی۔ اپنے محبوب وطن یمن کو خیرباد کہا۔ عراق اور دیگر ممالک کی خاک

چھانتے ہوئے کشاں کشاں بنگال پہنچے - یہ سرزمین اتنی پسند آئی کہ اس کو اپنے مقصد کے لیے منزل قرار دی اور یہیں قیام فرمایا۔

حضرت مخدوم جلال الدین روپوش نے بنگال میں ضلع راجشاہی کو دینی مشن کا مرکز قرار دیا۔ آپ اس زمانے میں سرزمین بنگال میں وارد ہوئے تھے جب حکومت کی باگ ڈور علم دوست اور صوفی نواز بادشاہ شاہ سلطان حسین کے ہاتھوں میں تھی۔ شاہ سلطان حسین، حضرت مخدوم جلال الدین روپوش سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور برابر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے انہوں نے خدمت دین کے خاطر حضرت مخدوم جلال الدینؒ کو ہر طرح کی آسائش وسہولت فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ فقیروں کو آرام وآسائش سے کیا مطلب۔ انہیں کسی بادشاہ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف اس بادشاہ کے محتاج ہیں جو تمام شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے میں نے اپنا ملک اپنا وطن اس لئے ترک کیا کہ قدرت کے مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھوں ملک ملک کی اس لئے سیر کی کہ کائنات کی نیرنگیوں میں اپنے خالق کا پرتو دیکھ سکوں۔ آسمان پر یہ چمکتے تاروں کا ہجوم آفتاب عالم تاب کی ساری دنیا پر ضیا پاشی ماہتاب کی چاندنی کی ٹھنڈک زمین پر رنگ برنگے پھول بڑی بڑی چٹانیں چٹانوں میں ابلتے ہوئے چشمے چشموں سے بہتے ہوئے صاف شفاف پانی سمندر کی لہریں اور دریاؤں کی موجیں طرح طرح کے چھوٹے بڑے سایہ دار پھل دار درخت غرض آسمان سے زمین تک اور زمین سے آسمان تک کا ایک ایک ذرہ اپنے خالق کی جلوہ ریزی کر رہا ہے ان جلوؤں میں کھو کر کچھ پانے کی کوشش کرنا ہی فقیروں کا مشرب اور اہل تصوف کا مسلک ہے تخلیقات کائنات کے مشاہدے کے لئے مصائب ومشکلات کا سامنا ضروری ہے۔ جب آدمی آلام ومصائب کی منزل پر پہنچتا ہے تو اسے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو شخص ان

میں کامیاب و کامراں ہو جاتا ہے وہی بندۂ خدا کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اے شاہِ وقت بہتر یہی ہے کہ میرے راستہ میں نہ آ۔ اور میرا حق مجھ سے نہ چھین!

شاہ سلطان حسین حضرت شاہ مخدوم جلال الدین کی ان معرفت آمیز و معارف خیز باتوں سے بہت متاثر ہوئے اس کے بعد سے آپ کو کبھی کچھ نہ کہا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آخر وقت تک ارادت واحترام میں کمی نہ آئی۔

حضرت شاہ مخدوم جلال الدین ان اللہ والوں میں سے تھے۔ گئے جنہوں نے اللہ کی راہ پر بڑی بڑی قربانیوں سے دریغ نہ کیا ہر قسم کے جذبات کو دینی خدمات پر نثار کر دیا۔ ایسے حالات میں تبلیغ اسلام کا بیڑا اٹھایا۔ جب ہندو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ بعض علاقوں میں تو اللہ کے نام لینے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں چراغ توحید روشن کرنا آپ ہی کا کام تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلطان حسین شاہ نے بھی آپ کا ہاتھ بٹایا۔ اس اعتبار سے سلطان حسین شاہ کا نام تاریخ اسلام میں زندہ جاوید رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی ذاتی کوششوں اور انتھک محنتوں سے اپنے بلند مقصد میں کامیاب ہوئے آپ نے بے شمار بت پرستوں کو خدا پرستی کی تلقین کی خصوصاً ضلع راجشاہی کے ان علاقوں میں جہاں بت پرستی کے علاوہ آفتاب، چاند، پہاڑ دریا کی پرستش عام تھی۔ ہندو رسم و رواج نے انسانی ذہنوں کو حقیقت و معرفت سے دور کر رکھا تھا وہاں آپ نے اپنے اخلاق کریمہ اور اوصاف حمیدہ سے ایسی ایمان افروز فضا پیدا کر دی۔ ایک ایسے اسلامی معاشرے کی تشکیل کی کہ ساری ظلمت روشنی میں بدل گئی ایک نیا صحت مند ماحول، نئی روح پرور فضا اور نئے اسلامی ضوابط نے جنم لیا۔

آپ مجموعہ کمالات اور جامع الصفات بزرگ تھے آپ کے کمالات کی شہرت دور دور تک تھی۔ چنانچہ باگھ کے پیر صاحب کے ساتھ آپ کے بڑے مراسم تھے۔ سلطان ابوالمظفر نصرت شاہ آپ کے عرفان و کمال کا دل سے معترف تھا۔ وہ آپ کو اپنی عنایتوں اور نوازشوں سے نہال کر دینا چاہتا تھا لیکن آپ نے کبھی کوئی عطیہ قبول نہیں کیا۔ البتہ آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد آپ کی اولاد کو زمین کا ایک وسیع حصہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ حضرت شاہ مخدوم نے بڑی طویل عمر پائی۔ آپ نے ۱۵۹۲ء میں ایک سو سترہ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

حضرت شاہ مخدوم جلال الدین روپوش کے کمالات و کرامات کا چرچا آج بھی بنگال کے اکثر علاقوں میں ہوتا ہے۔ پدما ندی کے مشرقی جانب ایک قدیم طرز کی مسجد زمانۂ ماضی کی تاریخ کی غماز ہے۔ یہ مسجد حضرت شاہ مخدوم کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ مسجد دراصل گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے ایران و ہند کے معماروں کے مشترکہ فن تعمیر کی ایک دلفریب شاہکار ہے۔ اس مسجد سے متصل حضرت شاہ مخدوم کا مقبرہ شریف ہے۔ ۱۶۲۹ء میں کچھ عقیدتمندوں نے اس مقبرے کی چہار دیواری کھچوادی پھر ۱۸۰۴ء میں اللہ کے بعض نیک بندوں نے اس مقبرے کی حفاظت اور استحکام کی خاطر اس پر چھت ڈلوادی اور اسے ایک درگاہ کی شکل دے دی آپ کی درگاہ کے احاطے میں آپ کی قبر مبارک کے آس پاس دو اور مقبرے ہیں یہ دونوں قبریں آپ کے خاندان کے دو افراد کی ہیں۔ ان کے نام معلوم نہ ہوسکے۔ ویسے لوگ مختلف نام بتاتے ہیں لیکن اصل نام کا پتہ کسی کو بھی نہیں۔

اہل تصوف و معرفت کی برکات صرف مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں تک نہ رہیں بلکہ ڈھاکہ، چاٹگام، سلہٹ کی طرح نواکھالی اور سندیپ وغیرہ میں ان کا چشمۂ فیض جاری رہا۔ اس کی زندہ شہادت

ان علاقوں میں مشائخ دین کے مزارات سے ملتی ہیں۔

عبدالرحیم خاں لوہاری ناتھیر پیٹوا نامی مقام سے تین میل دور پدواگاؤں میں مولانا فضل اللہ دیہات رائے پور میں اول اول سندیپ میں پھر بعد میں بامنی نامی گاؤں میں اقامت پذیر تھے۔ صوفی علیم الدین (خلیفہ مولانا امام الدین) شہر نواکھالی کے نواح گلا کھالی، بادشاہ میاں باجڑی اسٹیشن سے تین میل مغرب کی طرف دلی پور ٹونگی پاڑہ مولانا نورالدین بھایوا گاؤں میں حبیب الرحمٰن، شہر سے آٹھ میل دور موتی نگر کے دیہات میں، شاہ محمد یوسف، چوموہن اسٹیشن سے تین میل دور کوتوپور نامی دیہات میں، باپ میاں اسٹیشن سے چودہ میل دور جنوب مشرقی جانب پوشورہاٹ بازار میں کاظم محمد چودھری شمشو اسٹیشن سے شمالی جانب تین میل کے فاصلے پر محمد حنیف والی اللہ فینی سے سات میل دور پانوا گاؤں میں، صوفی بہاؤالدین لکھن پور اتھانہ سے چار میل دور مغرب شمال کی طرف پالم چور میں، شاہ ہارون دلا بازار سے متصل گنگا پور میں، حبیب اللہ مجدد، حضرت مریم ثانی حشمت اللہ مجدد اور حاجی نسیم الدین نقشبندی ضلع نواکھالی میں آسودہ ہیں۔ ان حضرات کرام نے اپنے اپنے طور پر دین کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

انہوں نے ظلمت کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آج اسی جہاد کی بدولت ضلع نواکھالی کے گوشے گوشے میں دین و ایمان کی کرنیں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضرت پیر چنگ شاہ، حضرت صوفی پیر اعظم شاہ بغدادی کے ہم عصر تھے کہتے ہیں کہ جب آپ ذکر و فکر میں محو ہوتے آپ پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا اور آپ عالم مستی میں سرود بجانے لگتے۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ جب کہ محفل ذکر و فکر گرم تھی حضرت چنگ شاہ نے حسب معمول جذب میں سرود بجانے لگے پیر اعظم شاہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو

نہ دیکھا نہ سنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیر اعظم کو چنگ شاہ کو طبلہ بجانا ناگوار گزرا حضرت پیر چنگ کے مزار کا نشان نہیں ملتا۔

ان کے علاوہ شام پور واتھورا میں شاہ ذکی الدین اتر یا تیا میں حضرت چاند شاہ اور ٹونگ پاڑہ میں شاہ عنایت کمر بستہ کے دینی کارناموں اور روحانی فیضان کا چرچا ہے ان علاقوں میں ان بزرگوں کے مزارات کے نشانات ملتے ہیں۔

حضرت شاہ علی بغدادیؒ کا شمار ڈھاکا کے مشائخ کبار میں ہوتا ہے۔ آپ کی ذات بابرکات سے ڈھاکہ اور ڈھاکہ کے گرد و نواح میں شمع ہدایت روشن ہوئی آپ بغداد سے تشریف لائے تھے۔ شہر ڈھاکہ سے سات میل دور میرپور کے علاقے میں ایک قدیم مسجد میں چلا گیا تھا۔ آپ نے مسجد کے دروازے بند کر لئے تھے کہ دوران اعتکاف کوئی مخل عبادت نہ ہو آپ اس عالم محویت میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اسی مسجد کے احاطے میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

حضرت شاہ اسمعیل غازی اشاعت اسلام کی غرض سے مکہ معظمہ سے لکھنوتی تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں لکھنوتی (بنگالا) سلطان محمد شاہ کا پایۂ تخت تھا۔ فن سپہ گری میں ماہر دیکھ کر سلطان موصوف نے آپ کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ آپ ہی کی مدد سے کامروپ کے راجہ کو شکست ہوئی جس کے صلے میں آپ کو کامروپ کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن آپ نے اس عہدے کو قبول نہ کیا اور منصب فقر کو ترجیح دی۔ پھر گھوڑا گھاٹ کے صوبہ دار نے سلطان کے ایسے کان بھرے کہ اس نے آپ کو شہید کروا دیا۔ آپ کی نعش مبارک کو ضلع رنگ پور میں چار مختلف جگہوں میں دفن کیا گیا۔

حضرت بدیع الدین شاہ مدارؒ بنگال میں سلسلہ مداریہ کے علم بردار

اور حضرت شیخ ابو اسحٰقؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے تبلیغ و اشاعت کا مشن لیکر پاک و ہند کے مختلف مقامات کی سیر کی۔ آپ کا قدم مبارک جہاں جہاں پہنچا کفر کی تاریکی دور ہوتی گئی اور ایمان کی روشنی پھیلتی گئی۔ مشرقی پاکستان کے بعض مقامات چاٹگام، فرید پور، مداری پور کے اضلاع میں آپ کے دم سے اسلام کے نام لیوا کا بول بالا ہوا۔

حضرت قطب الدین اولیاء راج نگر تھانہ سے متصل ساگر ندی کے مغربی جانب رہا کرتے تھے۔ آپ کے آستانے میں ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا آپ کے متعلق ایک واقعہ بنگال میں زبان زد عام ہے کہ ایک مرتبہ ایک پالکی میں سوار ساگر ندی کے کنارے سے گزر رہے تھے راجہ سوبا دنارائن اس علاقہ کا مالک تھا۔ جب اسے آپ کی آمد کا علم ہوا تو وہ اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا اور حکم دیا کہ پالکی روک لو اور جو شخص پالکی کے اندر بیٹھا ہے اسے قتل کر دیا جائے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ راجہ سوبا دنارائن آپ کے قتل کے درپے ہے تو آپ نے کہاروں کو اشارہ کیا کہ پالکی چھوڑ کر الگ کھڑے ہو جائیں۔ کہار پالکی کو نیچے رکھ کر علاحدہ ہو گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے راجہ پر ایک ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ راجہ راہی ملک عدم ہوا۔ یہ حیرت انگیز منظر دیکھکر راجہ کے سپاہی ششدر رہ گئے یہ لوگ حضرت قطب الدین اولیاء کی چشم دید کرامت کے نہ صرف حیرت زدہ ہوئے بلکہ ان کے دلوں پر خوف طاری ہوگیا۔ وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکے اور فوراً وہاں سے فرار ہو گئے۔ راجہ کے خاندان کے کئی افراد نے جب یہ غیر معمولی واقعہ سنا تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور حضرت موصوف کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر التماس کی کہ انہیں حلقہ اسلام میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔

آپ نے فرمایا۔

"اسلام اللہ کا دین اور رسولؐ کا دین ہے اس دین کی دعوت پر ہر ایک کے لئے عام ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس دعوت دین کو قبول کر لیتے ہیں اور جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔
بد نصیب ہیں وہ انسان جو اس دین حق کی نعمتوں اور لذتوں سے محروم ہوتے ہیں اور اپنے لئے جہنم کو منتخب کر لیتے ہیں۔"

پھر آپ نے انہیں دائرۂ اسلام میں شریک کر لیا۔
اسلام قبول کرنے والوں میں راجہ ماباد نرائن کے چار بیٹے بھی تھے جن کے اسلامی نام یہ رکھے گئے تھے۔

۱۔ حاجی خاں
۲۔ عیسیٰ خاں
۳۔ جمال خاں
۴۔ کمال خاں

کرشمۂ قدرت اور بندۂ خدا کی کرامت دیکھئے کہ یہ وہ چار افراد ہیں جنہوں نے حضرت قطب الدین اولیاء کا سر تن سے جدا کرنا چاہا تھا۔ لیکن ان کے دل میں خدا کا خوف ایسا طاری ہوا کہ اللہ کے آگے سر بسجود ہو گئے۔
بے دین پیدا ہوئے تھے لیکن دیندار مرے۔ آخری وقت تک یہ لوگ سچے مسلمانوں کی طرح صوم و صلوٰۃ اور نماز روزوں کے پابند رہے۔ سچ ہے
یہ رتبہ جس کو ملا سو مل گیا

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات

مرتبہ :- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

○

اس مضمون کے شروع میں صرف بیاض رشیدی کے اہم مندرجات کو ترجمے کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر خیال آیا کہ اس سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کا مختصر تذکرہ ہو جائے۔ تذکرہ کے بعد ملفوظات عزیزیہ کا سلسلہ چلا وہ اگرچہ مطبوعہ ہیں لیکن نسخہ مخطوطہ سے مقابلہ کرنے اور اس کے تراجم دیکھنے کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ اس کی تلخیص بھی اس طرح کر دی جائے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مجلسی ارشادات کے صحیح مطلب و مفہوم سمجھنے میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو، اور اس کے خاص اور اہم نمونے دیکھ کر مجلس مبارک کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے، صاحب ملفوظات سے رابطہ قائم ہو اور جس مقصد کے ماتحت بزرگوں کے اقوال جمع کئے جاتے تھے وہ مقصد بھی حاصل ہو۔

ملفوظات کی تلخیص سے فارغ ہونے کے بعد اب بیاض رشیدی کا نمبر آیا ہے

بیاض رشیدی کا مطالعہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں میں نے دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے ۵۵، ۵۶ ۱۳ھ میں کیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بریلی کے

زمانہ قیام میں جب کہ الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکل رہا تھا دوبارہ اس کے مطالعہ کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ میں نے اس بیاض کے کچھ حصہ کو نقل کر لیا تھا۔ اور اس میں جو مکتوبات علمی تحریرات اور سوالات کے جوابات ہیں ان کی ایک فہرست بنائی تھی۔ درمیان میں توفیق نہ ہوئی کہ اس بیاض پر کوئی مقالہ لکھتا اب تقریباً تیس سال کا زمانہ گزرنے پر یہ کام کر رہا ہوں۔ خود اصل بیاض ہی میں بعض مقامات کرم خوردہ تھے اور بعض بمشکل پڑھے جاتے تھے۔ پاؤ صدی کے اندر میری نقل کردہ عبارات میں بھی کہیں کہیں تغیر آگیا اور کاغذ کی دریدگی نے بھی دو ایک جگہ اہم معلومات کو نظروں سے غائب کر دیا ہے یہ بیاض جواب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے کثیر التعداد قلمی نسخوں کے ذخیرے میں مل نہیں رہی ہے۔ (خدا کرے مل جائے)

مشہور مناظر و محقق مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کے آثار قلمیہ میں سے ہے۔ اس پر جمعیتہ الانصار کی مہر بھی ثبت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلدادۂ خاندان ولی اللہی حضرت مولانا سندھیؒ کو کہیں سے دستیاب ہوئی ہوگی انہوں نے جمعیتہ الانصار کے دفتر سے دارالعلوم کے کتب خانے میں داخل کیا ہوگا۔ مکرمی مولانا سلطان الحق صاحب قاسمی ناظم کتب خانہ اور محترمی سید محبوب رضوی کی مہربانی اور رہنمائی سے میں نے اس بیاض کا مطالعہ کیا تھا۔

بیاض کے شروع میں دو ورق پر ایک اہم سوال کا جواب ہے۔ یہ دراصل شاہ صاحب کی ایک علمی تقریر ہے۔ جس کو مولانا رشید الدین دہلویؒ نے ضبط کیا ہے۔

اس کے بعد چالیس ورق پر مکتوبات ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد (۸۰) ہے تفصیل حسب ذیل ہے۔

مکتوبات حضرت شیخ جمال الدین ابوالطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی — ۲

مکتوبات حضرت شاہ ابوالرضا محمد عمری ہندیؒ — ۲

مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ — ۹

مکتوبات شاہ اہل اللہ فاروقی دہلویؒ بنام شاہ عبدالعزیزؒ - ۵

مکتوبات و مراسلات شاہ عبدالعزیزؒ - ۵۴

مکتوبات شیخ احمد الجبار و با با عثمان ابن فاروق الکشمیری بنام شاہ عبدالعزیز - ۷

ایک مکتوب کے متعلق پتہ نہ چل سکا کہ کس کا ہے ؟ مجموعہ اسی ہوا۔

ان میں حضرت شاہ ابوالرضا محمد کے دونوں مکتوب حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادی کے پردادا ملا عصمت اللہ المرادآبادیؒ (قاضی مرادآباد) کے نام ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مکتوبات ان حضرات کے نام ہیں۔

۱۔ الفاضل العلامہ المخدوم معین[1] الملتہ والدین السندھیؒ - ۱

۲۔ شارح معارف ولی اللہی شیخ محمد عاشق پھلتیؒ - ۱

۳۔ شیخ عبد[2] القادر جونپوری - ۱

۴۔ قدوۃ المحدثین شیخ ابوالطاہر کردی المدنی استاذ حضرت شاہ ولی اللہ - ۳

---

[1] علامہ محمد معین ابن محمد امین سندھی علم حدیث و کلام اور علم ادب میں بڑے پایہ کے عالم تھے حضرت شاہ ولی اللہ سے نسبت تلمذ حاصل تھی۔ شیخ ابوالقاسم نقشبندیؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیم حاصل کی۔ شاعر بھی تھے۔ کئی کتابوں کے مؤلف و مصنف تھے ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی (نزہتہ الخواطر جلد ۶)

[2] مولانا عبدالقادر ابن خیر الدین العمادی الجونپوری۔ شیخ حقانی امیٹھویؒ سے غالباً ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پڑھا۔ شیخ وجیہ الحق پھلواریؒ سے سلوک طے کیا نیز شیخ باسط علی الہ آبادی سے بھی فیض حاصل کیا۔ قریہ سوگھر پور میں ۱۲۰۲ھ میں انتقال فرمایا۔

(نزہتہ الخواطر جلد ۷)

۵۔ استاذ حرمین شیخ وفداللہ المالکی المکی استاذ حضرت شاہ ولی اللہ۔ ۱

۶۔ شیخ ابراہیم ابن شیخ ابو طاہر مدنیؒ۔ استاذ کے صاحبزادے۔ ۱

ایک مکتوب ولی اللہی کے متعلق بیاض سے یہ معلوم نہ ہوا کہ کس کے نام ہے۔

قدوۃ المحدثین حضرت شیخ ابو طاہر مدنی نے جو دو مکتوب حضرت شاہ ولی اللہ کے نام ان کے حجاز کے زمانہ قیام میں مکہ معظمہ روانہ کئے ہیں ان میں سے ایک مکتوب کی تاریخ تحریر ۱۶ ر شوال ۱۱۴۴ھ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کے مکتوبات جن حضرات کے نام ہیں انکے ناموں کی فہرست یہ ہے۔

شاہ اہل اللہ دہلوی، شاہ نوراللہ پھلتی (خسر شاہ عبدالعزیز) باباعثمان ابن فاروق الکشمیری، محمد جواد پھلتی، صاحب الحقائق والمعارف شیخ محمد عاشق پھلتی، جامع الفضائل مولانا حضوراللہ الکشمیری، صدرالافاضل مولانا محمد مغربی مفتی دہلی۔ فریدالدین بن عبدالسلام الکشمیری، رشیدالملۃ مولانا رشیدالدین دہلویؒ سید طہٰ بغدادی۔

ان کے نام کے بعد بیاض میں یہ عبارت ہے۔ من وُلْدِ غوث الثقلین ورد فی الدھلی سنہ ۱۲۱۴ھ یعنی یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی اولاد سے ہیں ۱۲۱۴ھ میں دہلی تشریف لائے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مکتوبات ان حضرات میں سے بعض کے نام کئی کئی ہیں، بہت سے مکتوبات کے شروع میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔

مکتوب الشیخ عبدالعزیز	الیٰ لبعض خُلّانہ
″ ″ ″	الیٰ لبعض الافاضل
″ ″ ″	الیٰ لبعض الاکابر
″ ″ ″	الیٰ لبعض اصحابہ
″ ″ ″	الیٰ لبعض اصحابہ من فضلاء الافاغنۃ

مکتوب الشیخ عبدالعزیز الیٰ بعض احبابہ
" " " الیٰ بعض اصدقائہ
" " " الیٰ بعض الشعراء

ان چوتن تحریرات میں وہ تین تحریریں بھی شامل ہیں جن میں ایک کا عنوان فصل، دوسری کا عنوان ہے من رشحات اقلام قدوۃ الاولیاء الشیخ عبدالعزیز مد ظلہ - تیسری کے شروع میں ہے - من عبارات الشیخ الاجل عبدالعزیز مد ظلہ فی تعریف الدھلی۔
تقریباً ۲۷ صفحات پر حصہ نظم ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے عربی کلام پر مشتمل ہے - شاہ صاحب کا کلام بڑا کیف آور اور وجد انگیز ہے افسوس کہ میں کل اشعار نقل نہ کر سکا۔ چند اشعار نقل کئے ہیں جو اپنے موقع پر پیش کئے جائیں گے۔
چار ورق پر سوالات وجوابات ہیں جو استفتاء اور فتویٰ کی شکل میں ہیں۔
۳۲ صفحات پر تحقیقات و تدقیقات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا سلسلہ ہے۔
تفصیل حسب ذیل ہے -

۱- ایک سوال کا جواب جو بعض اعزاء نے کول (علی گڑھ) سے بھیجا تھا۔
۲- قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے سوال کا جواب (مدت سلطنت بنی امیہ کے بارے میں۔
۳- جواب سوال قاضی صاحب مذکورؒ (ہندوستان کی زمین کس قسم کی ہے؟)
۴- سجدہ سہو کے بارے میں ایک تحقیق۔
۵- جوابِ سوال حاجی رفیع الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ (وضع میزان در محشر سے متعلق)
۶- سید صاحب عالی مراتب کے مرسلہ ایک استفتاء کا جواب (سید صاحب کا نام درج نہیں ہے۔
۷- ایک مسئلہ (محرم کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ محرم کا معاملہ کیا جائے

یا نہیں ؟)

۸۔ ایک سوال کا جواب جو قطع ید سے متعلق ہے اور جس میں روایت عالمگیری کے تعارض کو رفع کیا گیا ہے۔

۹۔ مولانا رشید الدین دہلوی کے ایک سوال کا جواب۔

(سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صاحبین کا تو اقتدار کرتے ہیں اور تقلید امام شافعیؒ نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے ؟)

۱۰۔ ایک صفحہ پر توریت کی ایک عبارت اور اس کی تشریح و توضیح اس کے شروع میں شاہ صاحب کی یہ عبارت ہے۔

قد نزل علینا رجلٌ کان اسمہٗ ملا فیض اللہ بن ..... وکان من فضلاء کابل ۔ عالمٌ بالتوراۃ ۔ فسالتہٗ عن بعض قواعد العبرانیۃ فاجابنی فحفظتھا فاذا ھی اوفق بلسان العرب۔

یعنی ہمارے پاس ایک عالم مہمان کی حیثیت سے آئے جو توریت سے اور عبرانی زبان سے واقف تھے ان کا نام ملا فیض اللہ تھا۔ وہ فضلاء کابل سے تھے میں نے ان سے کچھ قواعد عبرانی زبان کے معلوم کئے انہوں نے مجھے بتائے میں نے ان کو یاد کر لیا۔ عبرانی زبان عربی زبان سے بہت قریب ہے)

(۱۱) بعض علماء رام پور کے سوال کا جواب ۔ یہ سوال بوساطت حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادی آیا تھا۔

۱۲۔ ایک کتاب کے بعض مقامات کا رد (تقریباً چار ورق پر)

۱۳) جواب سوال قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (عبارت صواعق سے متعلق)

۱۴۔ غلام حیدر[1] خاں کاکوروی کے سوالات کے جوابات

---

[1] اعتماد الدولہ غلام حیدر خاں ابن رفعت الدولہ بخشی رفعت اللہ خاں بہادر نصرت جنگ عباسی کاکوروی مولانا محمد فاخر الہ آبادیؒ سے علم حاصل کیا سرکار اودھ میں بڑے منصب پر فائز تھے ۱۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۂ مشاہیر کاکوری)

۱۵- مولانا عبدالحئی بڈھانویؒ کے ایک سوال کا جواب

۱۶- خواجہ حسن مودودی لکھنویؒ[1] کا استفسار اور اس کا مفصل جواب اس سوال و جواب پر بیاض ختم ہو گئی ہے۔

اس بیاض میں ایک تحریر حضرت شاہ ولی اللہ کی ہے اس کے آخر میں ہے من افادات الشیخ الاجل ولی اللہ قدس سرہٗ نقلتھا من خطہ الشریف۔ یعنی یہ شیخ اعظم حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افادات میں سے ہے جکو میں نے ان کی دستخطی تحریر سے نقل کیا ہے۔

بیاض کے دو صفحوں میں تفسیری و تجویدی مضامین و تحقیقات ہیں۔ ایک مراسلہ قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ (مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون) کے نام ہے جس میں قرآت سے متعلق ایک تحقیقی جواب تحریر فرمایا ہے اسکے آخر میں ہے ھٰذا ما قال بفمہ و کتب بقلمہ الفقیر الی اللہ عبدالعزیز الدھلوی العمری عفی اللہ عنہ۔

اس کے بعد مولانا رشید الدین دہلوی کی یہ عبارت ہے۔

ھٰذہٖ مراسلۃٌ کتبھا الشیخ الاجل الاجبل الشیخ عبدالعزیز الیٰ قاضی محمد اعلیٰ

اس بیاض کا جتنا حصہ میں نے نقل کیا ہے اس میں انتخاب و تلخیص کرتے ہوئے اصل فارسی یا عربی عبارت کو درج کر کے اس کا ترجمہ پیش کروں گا۔ یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بیاض کی جتنی تحریریں ہیں وہ نادر و غیر مطبوعہ ہیں سوائے چند کے جو فتاویٰ عبدالعزیز، حیات ولی اور آثار الصنادید میں

---

[1] شیخ حسن بن ابراہیم الحسینی المودودی اللکھنوی طریقۂ قادریہ کے مجاز اور کئی کتابوں کے مصنف تھے ۱۲۲۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

موجود ہیں اگر ایسے ایک دو مضمون نظم و نثر آئیں گے تو یا تو مطبوعہ کی غلطی کا اظہار کرنے کے لئے یا اسکی افادیت اور اہمیت کو پیش نظر رکھ کر ناظرین کو اس کے مفہوم سے واقف کرنے کے لئے۔

اب میں بیاض کے مندرجہ مکاتیب شاہ عبدالعزیزؒ میں سے ان مکاتیب کو سامنے لارہا ہوں جو شاہ اہل اللہ (عم شاہ عبدالعزیزؒ) و شاہ نوراللہ (خسر شاہ عبدالعزیزؒ) کے نام ہیں۔ ان کے بعد شاہ اہل اللہ کے مکتوبات بنام شاہ عبدالعزیزؒ کا اندراج ہوگا۔ ان خطوط سے تاریخ کے بہت سے گوشے واضح ہوں گے۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ اپنے چچا شاہ اہل اللہؒ کے نام

(بزبان عربی منظوم)

الی المجلس المحفوف بالمکارم والمعالی اعنی بہ سیدنا وسندنا ومعتمدنا مکان الروح فی جسدنا وذخیرۃ یومنا ولغدنا سیدنا العم سلمہ اللہ تعالیٰ ظلالہٗ عن الافول داحلہ محال القبول۔ آمین

سیدنا وسندنا عم محترم حضرت شاہ اہل اللہ مدظلہٗ کی خدمت میں۔

بعد رفع السلام والاکرام فیقول الفقیر ذوالاثام

بعد سلام مسنون یہ گنہگار فقیر عرض کرتا ہے۔

ان ھذا الفقیر محفوظٌ عن شرور الزمان والاسقام بیسئل اللہ بعد کل صلواۃ

کہ میں بحمد اللہ زمانے کے شرور سے محفوظ ہوں۔

ہر نماز کے بعد میں اللہ تعالےٰ

ان یعافیہ فانتفی الانعام
ویعافی جمیع من فقد من ذکورٍ
ونسوۃٍ وغلامٍ خصوصاً جناب
حضرتکم من جمیع البلاء والآلام
ثم ان البلاد فاسدۃ من
ایادی الخشوم والظلام غیرہ[1]
خاف علیك ما صنعت
قومٌ سکۃٍ بجانب التوشام
خفضوا کل قریۃٍ ومضوا
یفتحون الحصون والآطام
نھبوا عدۃ من الاموال
اوتقوا عدۃً من الاتیام

سے عافیت کا سوال کرتا ہوں۔
نیز یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ
تمام رفقاء و متعلقین کو عافیت سے
رکھے۔ اس کے بعد عرض ہے کہ
ہماری طرف کے علاقے ظلم وستم کے
ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں آپ
پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ایک قوم
نے توشام کی جانب کیا کچھ کیا ہے۔
اس نے آبادیوں کو پست کر دیا اور
قلعہ فتح کر لئے، کتنا کچھ مال لوٹ
لیا اور کتنے ہی نفوس قید کر لئے۔

---

[1] حیات ولی ص ۳۳۵، ۳۳۶ پر یہ منظوم مکتوب پورا درج ہے مگر اس میں کاتب کے قلم سے اور غالباً کچھ مؤلف کے تصرفات سے اغلاط ہیں چنانچہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو یوں لکھا ہے۔ ع قوم سکہ کائیت التوشام۔ بجانب کا کائیت بنا دیا گیا۔ توشام مغربی پنجاب کا ایک شہر ہے ملاحظہ ہو معیار الاوقات مولفہ پروفیسر عبدالواسع مرحوم شعر کے غلط چھپنے اور توشام کے معنی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ حضرت مولانا گیلانی کو بھی اس شعر کا مطلب سمجھنے میں اسی بناء پر دقت پیش آئی مولانا گیلانی نے اپنی ذہانت کی مدد سے اس کا مطلب بیان کرنے کے بعد یہ نوٹ دیا ہے۔
جہاں تک تصحیح عقلاً ممکن تھی کی گئی۔ اس لفظ کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ الخ۔
(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۰۱) حضرت گیلانیؒ کی زندگی میں یہ تصحیح سامنے آجاتی تو وہ کس قدر مسرور ہوتے

مکتوبِ شاہ عبد العزیزؒ ——— بنام شاہ اہل اللہ (کچھ حصہ)

.... و بعد فانی احمد اللہ علی ماکسانی من سرابیل الصحۃ وقمص العافیۃ والمعمنی اقوات الامن وارزق الرفاھیۃ وانھا نعمۃ عظیمۃ ومنحۃ جسیمۃ کما قیل۔

وما العیش الا فی الخمول مع الغنی وعافیۃٍ یغدو بھا ویروح بیدان قرۃ العین عائشۃ سلمہا اللہ تعالیٰ کانت ذات علۃٍ فتفضل اللہ تعالیٰ بازالۃ اکثرھا وھو المرجو لازالۃِ غبرِھا۔ الخ

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اس احسان پر کہ اس نے مجھے صحت و عافیت کا لباس پہنایا اور امن و رفاہیت سے نوازا۔ دراصل یہ ایک بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے نصیب ہے ایک شاعر کہتا ہے۔

اصل زندگی تو یہ ہے کہ گوشۂ گمنامی ہو اور غنیٰ و عافیت صبح و شام نصیب ہو۔ نورِ چشمی عائشہ سلمہا اللہ تعالیٰ بیمار تھی اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ بیماری کا بڑا حصہ زائل ہو گیا اور جو کچھ بیماری کا اثر باقی رہ گیا ہے اللہ ہی سے امید ہے کہ وہ اس کو بھی زائل فرما دے گا۔

مکتوبِ شاہ عبد العزیزؒ بنام شاہ نور اللہ

بعد السلام

فقد ورد علینا مکتوبکم المکرم

(سات سطروں کے بعد)

بعد سلام.....

ان الاکابر قد استقرت آراءھم.... متوکلاً علی اللہ الی البدھانہ بعد ان کانت طائفۃ منھم لا یطیع للاقامۃ ھناك لانھا تدعی البغضاو الشحنا فی اھالی تلك الاطراف والاملاك وطائفۃ رجح تلك المواضع علی کل مکان سواھا وتغمض عن مفاسدھا ومنافع غیرھا واما الفقیر فالبلدان عندہ ھماما ھما الخ

بڑوں کی رائیں متوکلاً علی اللہ بڈھانہ رہنے کی ہو رہی ہیں۔ البتہ ان کا ایک طبقہ وہاں کی اقامت کو اس لئے پسند کرتا کہ کہیں وہاں کی سکونت وہاں کے رہنے والوں کے بغض وحسد کا باعث نہ بن جائے۔ ایک گروہ ہر حال میں انہیں مقامات (بڈھانہ وغیرہ) کو ترجیح دیتا ہے۔ فقیر کے نزدیک دو شہر ہیں اور وہ ذہن میں ہیں۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ بنام شاہ نور اللہ صدیقی پھلتیؒ

.... من الفقیر عبدالعزیز بعد رفع السلام والغرام۔

ان ھذا الفقیر مع جمیع توابعہ ولواحقہ داخل فی حوزۃ العافیۃ نائم فی مھد المرفاھیۃ بید ان قرۃ العین فلان سلمہ اللہ الصمد قدمت علی یدیہ الحمرۃ والجرب ف عرضت لہ بذلك الحمیٰ

فقیر عبدالعزیز بعد سلام واظہار اشتیاق عرض پرداز ہے کہ میں تمام متعلقین ولاحقین کے ساتھ امن وعافیت سے ہوں۔ البتہ برخوردار.... سلمہ اللہ الصمد کے دونوں ہاتھوں پر سرخی اور کھجلی ہوگئی ہے اور اسی کے باعث انکو بخار ہوگیا۔ نورچشمی.... سلمہا اللہ تعالیٰ کو بہت سے امراض نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا ان میں سے

وما يتبعها من الاذى والتعب
واما فترة العين فلا تنت
سلمها الله تعالى فقد كانت
احاطت بها الامراض من كلِّ
جانب منها الاسهال وسوءُ
القنية والنفخ عند تناول
الغذاء وسوءُ الهضم فازال
الله بفضله اكثرها وهو المرجو
لازالة غيرها۔ فالملتمس من
مجلسكم السامي لازال ساميا ان
يدعو الله لشفائهما۔ ومن
اجلّ نعم الله في هذه الايام
ماردّ الله كيد الكفرة في نحورهم
وحفظنا من شرورهم
ذلك ان جماعة من السكهه
قصدوا اوطانهم بعد ما قضوا
من بلاد جاءت اوطارهم فوردوا
في اثناء السبيل على هذا البلدِ
الذي ليس له سوى الله حافظ
ولا كفيل فارادوا امنه ما يريدون
من غيره من البلادِ فخال الله

چند یہ ہیں۔ اسہال، سوء القنیہ،
کھانا کھانے کے بعد نفخ، بدہضمی۔
اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے ان میں
سے بہت سے امراض کو زائل کر دیا۔
جو باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی امید
قوی ہے کہ وہی رفع فرمائے گا۔
آپ سے یہ التماس ہے کہ آپ ان
دونوں کی شفا کے لئے دعا فرمائیں۔
ان دنوں اللہ تعالےٰ کے بڑے
انعامات میں سے ایک انعام یہ ہے
کہ اس نے دشمنان دین کے حیلوں
کو انہیں کی طرف پلٹ دیا اور ہم کو
ان کے شرور سے محفوظ رکھا۔
ایک جماعت سکھ نے جالوں کے
علاقے پر کامیاب چھاپہ مارنے کے
بعد جب اپنے وطنوں کا قصد کیا تو
اثنائے راہ میں ہمارے اس شہر
سے ہو کر گذرے جس کا حافظ و والی
سوائے اللہ تعالےٰ کے کوئی نہیں۔ اس
شہر میں پہنچ کر انہوں نے حسب عادت
غارتگری کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے

۱؎ فسادِ خون کی وہ نوعیت جو مرض استسقاء کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اصطلاح طب میں سوء القنیہ کہلاتی ہے

تعالیٰ بینھم وبین مایشتھونہ من النھب والفساد ونھضن افضل خان وغیرہ من رؤسار البلد لمقابلتھم ودفعھم فلم یتعرضوھم ومضوا بسبیلھم وکفی اللہ المومنین القتال وکان اللہ قویاً عزیزا۔ ولکن مرورھم فی تلک الاطراف وعبورھم علی بلاد المسلمین الضعاف یشوشنا ویدفعہ ماشاھدناہ من لطیف صُنع اللہ وعسیٰ ان لایکون لھم سلطان علیھم ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کے کوئی نہیں۔ اس شہر میں پہنچ کر انہوں نے حسب عادت غارتگری کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔

افضل خاں وغیرہ رؤسار شہر انکے مقابلے کے لئے کھڑے ہوگئے پھر توان کو مجال مقاومت نہ ہوئی۔ اور اپنا راستہ اختیار کیا۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین سے قتال کی نوبت نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب ہے اگرچہ دشمنان دین کا ان اطراف سے گزرنا۔ اور ضعیف مسلمانوں کے شہروں سے عبور کرنا اور تشویش پیدا کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی اس طرح کی نصرت دیکھ کر تشویش ختم ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توقع بھی ہے کہ ان لوگوں کو اہل اسلام پر غلبہ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ترجمہ قصیدہ مقصورہ

پروفیسر ای ایس طاہر علی

۲۳۱ وسائلي بمن عجي عن وطنٍ ما ضاق بي جنابه ولا نبا

مجھ سے پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ تم نے وطن (عراق) کیوں چھوڑا جب کہ تم وہاں خوشحال تھے

۲۳۲ قلت القضاء مالکٌ امر الفتی من حیث لا یدری ومن حیث دری

سن لو یہ میرا جواب ہے کہ قضاو قدر انسان کو ایسی ایسی جگہ لے جاتی ہے جن سے وہ واقف ہو یا نہ ہو۔

۲۳۳ لا تسألني واسأل المقدار هل یعصم منه وزرٌ ومزدری

مجھ سے کیا پوچھتے ہو! میرے مقدر سے پوچھو۔ مقدر کے آڑے کوئی قلعہ یا بلند پہاڑ نہیں آسکتا

۲۳۴ لا بدّ ان یلقی امرؤ ما خطّه ذو العرش مما هو لاقٍ ووحی

بلاشک وشبہ اولادِ آدم کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو عرش کے مالک کو منظور ہے

۲۳۵ لا عزو ان لحّ زمانٌ جائرٌ فاعترق العظم المخ وانتقی

ان کو (اولادِ آدم کو) زمانے کے جور وستم کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے گرچہ زمانہ ہڈیوں کا گوشت اور گودا نکال لے (یعنی مصیبت پر مصیبت ڈھائے۔

۲۳۶ فقد تری القاحل مخضرّاً وقد تلقی أخا الإقتار یوماً قد نما

خزاں کے بعد بہار آتی رہتی ہے اور تنگ دستی کے بعد فراخی آتی ہے۔

۲۳۷) یا ھوٗ لیاھل نشد تنت لنا　　　ناقبتة المبرقع عن عینی طلا

اب شاعر ان عورتوں سے مخاطب ہوتا ہے جو مشاطگی میں مشہور ہیں کیا تم لوگوں نے کبھی ہمارے لئے مہوشوں کو تلاش کیا ہے جو برقع پوش ہوں اور جن کی مخمور نگاہیں غمازی کر رہی ہوں۔

۲۳۸ ما أنصفت ام الصبین التی　　　اصبت اخا الحلم ولما یصبطی

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی وہ ایک با تمکنت انسان کو اپنے پھندے میں لے لے جس نے کبھی میدان عشق میں قدم نہ رکھا ہو۔

۲۳۹ استحی بیضا بیت أفوادک أن　　　یقتادک البیض اقتیاد المھتدی

بڑی شرم کی بات ہے کہ پیری میں تم عشق مجازی کے پابزنجیر ہو۔

۲۴۰ ھیھات ما اسفع ھا تاز لتہ　　　أطربا بعد المشیب والجلا

افسوس صد افسوس ایسی غلطی پر۔ پیری میں سر کے بال جھڑنے لگے اب خمار جوانی کیسا؟

۲۴۱ یارب لیل جمعت قطر یہ لی　　　بنت ثمانین عروسا تجتلی

مجھے وہ راتیں یاد ہیں جب ساری رات ہم نے ساقی تھا اور مے تھی۔

۲۴۲ لم یملک الماء علیھا امرھا　　　ولم ید فسھا الضرام المحتضی

نہ وہ دو آتشہ تھی اور نہ سہ آتشہ۔ بلکہ مئے ناب تھی جس میں پانی کا نام تک نہ تھا۔

۲۴۳ حینا ھی الداء دا حیا نابھا　　　من دا ئھا اذا یجیح یشتفی

بعض اوقات وہ بری لگتی تھی لیکن بعض اوقات وہ کیف و نشاط کا عالم پیدا کر دیتی تھی۔

۲۴۴ فند صا مھا الخمار لما اختارھا　　　ضنا بھا علی سواہ واختبیٰ

کلال (مے فروش) نے اس خالص شراب کو دوسری شرابوں پر ترجیح دی اور سنبھال کر رکھا۔

۲۴۵ فھی تری من طول عھد ان بدت　　　فی کأسھا لا عین الناس کلا

وہ بہت پرانی شراب ہے جب وہ پیالے میں بھری جاتی ہے تو گاڑھی سیاہ معلوم ہوتی ہے

۲۴۶ کأنّ قرن الشمس فی ذرّ رها بفعلها فی الصحن والکاس اقتدی

جب اس شراب کو بڑے یا چھوٹے پیالے میں بھرتے ہیں تو ساری فضا ایسی مہکتی ہے جیسے کہ سورج کی روشنی طلوع ہونے کے وقت عالم میں پھیلتی ہے۔

۲۴۷ نازعتها اروع لا اسطو علی ندیمه شرّته اذا انتشی

ایسی لذیذ شراب پر میں جھپٹا۔ اس کی تیزی پینے والے کے حواس کو نشہ کی حالت میں بھی برقرار رکھتی ہے۔

۲۴۸ کانّ نور الس وهن نظم لفظه مرتجلاً او منشداً او ان شدا

اگر کوئی ایسی حالت میں فی البدیہ شعر کہے یا ترنم سے پڑھے تو جو الفاظ اس کے دہن سے نکلیں ایسے معلوم ہوں کہ پھول ہیں جو کیاریوں میں بکھرے ہوئے ہیں

۲۴۹ من کلّ ما نال الفتی قد نلته والمرء یبقی بعده حسن الثنا

مجھ پر بھی وہی بیتی جو اوروں پر بیت چکی ہے انسان اپنے پیچھے سوائے اچھی یا بری بات کے کیا چھوڑ جاتا ہے

۲۵۰ فان امت فقد تناهت لذتی وکل شیئ بلغ الحدّ انتهی

اب اگر موت آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم نے خوب عیش کی آخر کوئی انتہا بھی ہے۔

۲۵۱ وان أعش صاحبت دهری عالما بما انطوی من صرفه وما انتشی

اور اگر کچھ زندگانی باقی ہے تو ضرور جیئں گے۔ ہم زمانے کے داؤ پیچ سے خوب آگاہ ہو چکے ہیں۔

۲۵۲ حاشا لما اسارہ فی السجیٰ والحلم ان اتبع روّاد الخنا

ہم میں اتنی عقل اور متانت ضرور باقی ہے۔ ہم ان شاء اللہ بروں کی صحبت سے گریز کریں گے۔

۲۵۳ أو ان اری لنکبة مختضعا أو لا بتهاج فرحا ومزدهی

اور ہم مردانگی سے مشکلات کا مقابلہ کریں گے۔ اور کسی بات پر خوشی کے مارے آپے سے باہر نہ ہوں گے۔

صوفیائے سرحد

حضرت اخوند درویزہ بابا

سیف الحنان پشاوری

مغربی پاکستان کے سرحدی علاقے میں اخوند درویزہ بابا بڑے مشہور عالم اور صوفی گزرے ہیں ان کی تبلیغی اور تعلیمی کوششوں سے یہ علاقہ رشد وہدایت۔ اور اسلامی تعلیمات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اس علاقے میں قدیم صوفیار کے طریقے پر اصلاح و تربیت اور تربیت اور تبلیغ واشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ عین اس وقت جب کہ اس علاقے کے مسلمان بدعت وگمراہی اور وہم پرستی میں مبتلا تھے انہوں نے اپنی زبان وقلم سے اس کے خلاف جہاد کیا۔ جس میں ان کو اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔

خاندان

اخوند درویزہ بابا بن گدائی بن سعدی بن احمد بن منہ (المعروف بہ درغان) بن جیون بن جنتی۔ اس نسب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بابا پٹھان نہ تھے مگر کافی عرصہ پٹھانوں کے علاقہ میں سکونت کرنے اور اسی علاقہ میں ان کا مزار موجود ہونے کی وجہ سے وہ پشاوری (پٹھان) کہلاتے ہیں۔ خود ان کے بیان کے

مطابق ان کے بزرگوں میں سب سے پہلا شخص لمغان کی جانب سے ننگرہار آیا ان
کا پردادا جیون بن حنبتی تھا۔ وہ اپنا آبائی نسب تاجک ترکوں اور اپنا مادری نسب
سلاطین بلخ کے ذریعہ سکندر ذوالقرنین سے ملاتے ہیں۔ اپنی کتاب تذکرۃ الابرار
والاسرار صفحہ ۱۰۶ میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

سماع است از قدمائے خویش رحمہم اللہ تعالےٰ کہ در ایام
ماضی جیون بن حنبتی نام شخص از جانب لمغان بحدود
ننگرہار درآمدہ مع اہل و عیال و توابع و اموال در درہ ہمند
کہ آن دہ ایست از درہ ہائے ننگرہار در رودے است
از رودہائے آں دیار نزول نمودہ سکونت فرمودہ متوطن
گشت اما از انساب او از قدما بر آنند کہ بمردم ترک باز می
گردد و میگویند قرابتے مادری ما بسلاطین بلخ باز میگردد۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ پچھلے زمانے میں جیون بن حنبتی نام کا ایک
شخص لمغان کی طرف سے حدود ننگرہار میں آیا اور درہ مہمند میں جو ننگرہار کا
ایک درہ ہے اور اس علاقے کی ندیوں میں سے ایک ندی ہے اپنے اہل و عیال
و متعلقین کے ساتھ اتر کر وہاں بود و باش اختیار کی اور اسے اپنا وطن بنایا۔
ان کے نسب کے بارے میں ہمارے بزرگ اسکے قائل ہیں کہ ترکوں تک وہ جا پہنچتا
ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارا مادری نسب بلخ کے بادشاہوں تک پہنچتا ہے۔

باباؒ کے جد اعلیٰ جیون کی نقل مکانی

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے جیون صاحب لمغان (موجودہ افغانستان) میں
رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ پہلے مہمندوں کا ہوا کرتا تھا۔ یا
جیون صاحب لمغان سے نقل مکانی کرکے جب ننگرہار (موجودہ افغانستان)
کے مہمند درہ میں رہتے تھے تو بعض حضرات کو مقام کے نام کی وجہ سے غلط فہمی

ہو کر یہ علاقہ مہمندوں کا سمجھنے لگے۔

بہرکیف جب وہ اسی علاقہ میں رہتے تھے تو باباؒ اپنی کتاب تذکرۃ الابرار والاسرار میں اس کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں کہ ان کے جداعلیٰ جیون بن جنتی سفید ریش اور گھنی ڈاڑھی والے بزرگ تھے۔ دولت مند اور سخی بھی تھے انہوں نے ننگرہار کے مہمند درہ میں سکونت اختیار کی تو ایک عظیم الشان جشن منعقد کر کے تمام لوگوں کو مدعو کیا جب وہ لوگ کھانا کھا کر اٹھے تو ازراہِ تمسخر جیون صاحب کی ڈاڑھی کو طعام آلود ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ جیون صاحب ان کی اس حرکت سے سخت ناراض ہوئے اور ان کی شکایت سلاطین بلخ سے کی جنہوں نے بعض لوگوں سے ان کی گوشمالی کرا کے جیون صاحب کا بدلے لیا۔ اور یہ علاقہ بھی اپنی تحویل میں لے لیا جو کہ آج تک اولاد جیون صاحب کے پاس ہے۔

باباؒ کے اجداد اعلیٰ درغانؒ اور سعدیؒ کی نقل مکانی

اس میں اختلاف ہے کہ درغان (رمتہ) نے نقل مکانی کی تھی یا نہیں کی۔ البتہ اس پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ سعدی صاحب جو کہ "شیخ سعدی" سے مشہور ہیں اور ان کے والد احمد صاحب نے نقل مکانی کر کے شنواریوں کے علاقہ پائین میں رہتے تھے۔

۸۱۲ھ میں قبائل یوسف زئی کے لوگ کابل سے براستہ ننگرہار پشاور میں آرہے تھے تاکہ سوات پر اپنا قبضہ جما سکیں تو شیخ سعدی صاحب بھی ان کے ساتھ آگئے تھے۔ جب مشہور پٹھان قانون داں شیخ ملی نے سوات کی زمین کی تقسیم شروع کی تو شیخ سعدی کو قبیلہ مندیزئی کے ساتھ شامل کر کے زمین اسے بھی الاٹ کر دی۔

جس کے مطابق وہ دریائے خیالی اور سر دریاب کے درمیان تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں پڑتی تھی اور اس نسبت سے آج بھی اس علاقہ میں مندیزئی نام کا ایک گاؤں مشہور ہے

شیخ سعدی کی شہادت

شیخ سعدی بڑے عابد اور مشہور سخی تھے اس بنا پر انہوں نے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی لیکن جب مغلوں نے یوسف زئی کے خلاف یورش کی اور امیر قووانی نے سواروں کے دستے کے ساتھ اس تمام علاقے کو تاخت و تاراج کیا تو اس کے بعض سواروں نے شیخ سعدی کو یوسف زئی قبیلہ کا فرد سمجھ کر اسے شہید کر دیا

اخوند گدائی کی گرفتاری اور اسکی رہائی

حضرت شیخ سعدی کے صاحبزادے اخوند گدائی جو اخوند درویزہ بابا کے والد ماجد ہیں یہاں مندیزئی ہی میں پیدا ہوئے تھے اپنے والد ماجد کے سانحہ شہادت کے موقعہ پر مغل سپاہ نے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ حاکم وقت کے دریافت کرنے پر جب شیخ سعدی کی شہادت کا اسے علم ہوا تو بیحد افسوس کیا اور اپنے سپاہ کو ڈانٹ ڈپٹ کر اخوند گدائی اور ان کے تمام خاندان قید و بند سے چھڑا لیا۔

اس واقعہ کے بعد انہوں نے مندیزئی کے علاقے میں رہائش چھوڑ کر علاقہ چغرزئی کے قبیلہ اسماعیل خیل میں سکونت اختیار کی جہاں انہیں مع دس دیگر ساتھیوں کے زمین بھی دی گئی۔

اخوند درویزہ بابا کی ولادت

بابا کی ولادت کے متعلق کوئی یقین نہیں کیا جا سکتا مولوی رحمان علی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب تذکرہ علمائے ہند میں ان کا سنہ ولادت ۹۴۰ھ مطابق (۱۵۳۳ء) لکھا ہے اور اندازے سے بھی یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بابا نے ۱۰۲۱ھ میں "تذکرۃ الابرار والاسرار" نام کی کتاب تحریر فرمائی جسکے صفحہ ۱۱۹ پر تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت میری عمر اسی سال ہے۔

تاریخ اور تذکروں کے مطالعہ سے بابا کے مقام پیدائش کا بھی صحیح پتہ نہیں چلتا آیا وہ مندیزئی میں پیدا ہوئے یا چغرزئی میں البتہ غالب رائے یہ ہے کہ ان کی پیدائش مندیزئی کی ہے اور بچپن میں یقیناً چغرزئی میں تھے۔

اسم گرامی

بابا نے اپنے اسم گرامی کے متعلق کہیں بھی ذکر نہیں فرمایا۔ لہذا انہیں عام طور پر اخوند درویزہ بابا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

"یوسف زئی پٹھان" کے مؤلف اللہ بخش صاحب یوسفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ اخوند اور درویزہ دونوں القاب ہیں اخوند علامہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور درویزہ اس لئے مشہور ہوا کہ انہوں نے طالب علموں کے سامان خوراک کے لئے دریوزہ "وظیفہ" کا طریقہ ایجاد کیا چنانچہ آج بھی پشاور اور مردان بلکہ پٹھانوں کے تمام علاقہ میں "وظیفہ لاڈا ایماندار" کا آوازہ دیکر طلبہ "وظیفہ" سامان خوراک اپنے لئے اکٹھا کر لیتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار ان کا نام عبدالکریم لکھتا ہے جبکہ یہی نام بابا کے بیٹے کا نام تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں ہمنام ہوں یا مقالہ نگار والد اور بیٹے کے نام میں تمیز نہ کر سکا ہو۔

عبدالحلیم اثر افغانی اپنی تالیف روحانی اور روحانی ترڑون" پشتو کے صفحہ ۱۶-۱۵-۱۵ پر رقمطراز ہیں کہ۔

بابا کا اصلی نام عبداللہ ہے اور عام تذکروں میں ان کا نام "اللہ داد" آتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی اسماء کو فارسی میں منتقل کیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت پیش کرتے ہوئے مولف موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ

اخوند درویزہؒ کے خاندان میں ان کے ایک صاحبزادے کا نام عبدالکریم ہے

"کریم داد" دوسرے صاحبزادے کا نام "پیر محمد" سے پیر داد اور ان کے ایک پوتے کا نام "عبدالرحیم" سے رحیم داد کو منتقل کیا گیا۔ بایزید انصاری کے خاندان میں عبدالکریم سے کریمداد" عبدالواحد سے "احدداد"۔ عبدالقادر سے "قادرداد" پیر محمد سے پیرداد، عبدالخالق سے "خالق داد" اور عبدالہادی سے ہادی داد بنایا گیا

بچپن

باباؒ نے اپنی کتاب "تذکرۃ الابرار والاسرار" کے ص ۱۰۵ تا ص ۱۲۵ بڑی تفصیل اور بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ بچپن میں سنت رسول کی تابعداری، بدعات سے نفرت اور زہد و ریاضت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بچپن میں میری یہ حالت تھی کہ ہر وقت خوف خداوندی کی وجہ سے میں روتا رہتا تھا۔ والدہ ماجدہ میرے زیادہ رونے سے تنگ آجاتی تو کبھی کبھی مجھے مارتی تھیں جب میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو ہر وقت باوضو رہنا دن کو روزہ رکھنا رات کو عبادت کرنا میرا معمول بن گیا۔ اور امر شریعت بجالانے اور اس کی منہیات سے بچنے کی وجہ سے میرے قلب کو صفائی حاصل ہوئی اور میں نے بہت کچھ پالیا۔ افغانوں کی اصطلاح میں میں کامل بزرگ بن گیا۔ مجھے کشف حاصل ہوا اور غیب کے حالات لوگوں کو بیان کرتا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس قسم کی حرکات طریقت کی راہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ جب میں علم دین کا حامل ہوا تو اس کے ذریعہ حقانی اور شیطانی واردات کے درمیان فرق کرسکا حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے کا سلیقہ آیا۔ یہاں تک کہ ناشائستہ واردات شائستہ میں تبدیل ہوگئیں اور اہل سنت والجماعت کے صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق اللہ نے مجھے بخشی۔

بابا صاحب ملا جمال الدین کی خدمت میں حاضر ہوکر پڑھنا شروع کیا اور ان کا کہنا ہے کہ علم نے میری طبیعت کو طریقہ سنت میں ڈھال دیا اور اس لئے

جاہل افغانوں کی محبت میں عداوت میں تبدیل ہوگئی۔ کیونکہ وہ ہوائے نفس کے تابع تھے اور میری ہر حق بات پر انگلی اٹھاتے۔ البتہ اہل سنت میری باتوں کو سن کر اس کی تحسین کرتے اور میرے ساتھ محبت روا رکھتے اس حالت میں میں نے دنیا و مافیہا سے پرہیز کیا۔ جسکی بدولت میرا دل آئینے کی طرح صاف شفاف ہوگیا۔ اہل دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور جاہ طلبی سے حد درجہ احتراز کیا۔

سید علی ترمذی سے بیعت شریعت اور تجدید توبہ

فرماتے ہیں مجھے یاد ہے کہ میرے استاد ملا سنجر از راہِ شفقت مرشدی شیخ علی ترمذی کے مکان پر ایک دفعہ مجھے لے گئے میں نے ملاقات کے دوران ان سے اپنے کشف و کرامات و دیگر مخصوص حالات کا ذکر کیا۔ حضرت سید علیؒ نے تبسم ہوکر فرمایا کہ تم تو افغانوں کی اصطلاح میں پیر بن گئے ہو لیکن تمہارے یہ احساسات اس لئے سخت مضر ہیں کہ شیخ فانی کے بغیر اس قسم کا اقدام گمراہی کا موجب ہوتا ہے۔ مبتدی کو چاہیئے کہ کہ زہد و ریاضت کی ابتدار میں یہ وطیرہ اختیار کرے کہ تمام حرکات و سکنات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہو ورنہ وہ دنیا و آخرت میں مردود ہوگا۔ اسکی تمام ریاضت اور مجاہدات بلاشبہ گمراہی ہوگی۔

غرضکہ مرشدی سید علیؒ نے مزید پند و موعظت سے نواز کر اسکی روشنی میں مجھے تجدید توبہ کی توفیق ہوئی انہوں نے مجھ کو بیعت شریعت کرکے بعض امور کے بجالانے کا خاص طور پر ارشاد فرمایا مثلاً ایام بیض کے روزے۔ صلواۃ اوابین اور باجماعت نماز (فرائض) ادا کرنے کی تاکید فرمائی۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ میں پہلے سے ان امور کا سختی سے پابند تھا لیکن اپنا فرض منصبی ادا کرنے کی خاطر انہوں نے مجھے اس قسم کی ہدایات دیں۔

کچھ عرصہ بعد میرے استاد مدقق اور خواجہ محقق حاجی الحرمین ملا زنگی پابینی نے سید علی ترمذیؒ سے مجھ کو بیعت طریقت کرنے کی گذارش کی کیونکہ وہ مجھے اس کا اہل سمجھتے تھے۔ خدا کا فضل میرے شامل حال تھا حضرت شیخ نے بھی میرے استاد کی بات سنکر میری اہلیت کا اقرار کیا اور مجھ کو بیعت طریقت میں شامل فرمایا۔ اس دن نماز ظہر ادا کرنے کے بعد مرشد نے مجھ سے فرمایا کہ کون سے وقت میں ذکر و تلقین تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر سکے گا؟

میں نے سوچ کر عرض کیا کہ عشار کے بعد کا وقت میرے لئے موزوں ثابت ہوگا۔" حضرت شیخ کا یہ خاص طریقہ تھا کہ وہ عوام کو بیعت شریعت کرتے اور صرف علماء اتقیار کو بیعت طریقت کرتے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے کہ ذکر امانت الٰہی ہے۔ یہ امانت اس کے اہل ہی کو دینا چاہیئے اس کے اہل علماء اتقیاء ہیں نہ کہ عوام و جہال جو اس کے شرائط و لوازم کو پورا کرنے سے عاجز ہیں اور اس کی گرمی کو برداشت نہیں کر سکتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ضلالت و گمراہی۔ الحاد و بدعت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

اور درجہ بدرجہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ کبرویہ۔ شطاریہ میں مجھ کو بیعت کیا حضرت شیخ نے میری روحانی ترقیات سے خوش ہو کر فرمایا کہ علم تصوف کا یہ مرحلہ انتہائی جدوجہد اور احتیاط کا ہے یہ وہ وقت ہے جس میں عارف اپنے آپ کو شریعت صمدانی پر قائم رکھے تاکہ وہ اپنے اور مومنین و مومنات کے ایمان کو ضعف و زوال سے محفوظ رکھ سکے اور مسلمانوں کو تشبیہ و تعطیل سے معصوم کر سکے۔ جب کہ اس زمانے کے اکثر اہل ہوا شرائط پوری کئے بغیر علم تصوف کے اشارات و عبارات سے عاجز رہتے ہیں وہ معرفت الٰہی کی بیچونی اور بیچونگی میں غلطی کھا کر کفر کی حد پر پہنچ جاتے ہیں اور اس قسم کی حالت میں بعض خدا کو کسی صورت میں متصور کرتے ہیں اور بعض کسی مکان پر اسے تصور کر لیتے ہیں اور بعض انفاس و ارواح کو خدا سمجھتے ہیں اور بعضے تمام کائنات کو محض وجود باری تعالیٰ اور اسمار کی ذات سمجھتے

اخوند درویزہ بابا کا مشن

حضرت اخوند درویزہ باباؒ کے متعلق یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے قلم اور زبان سے افغانوں سے بدعات اور غیر شرعی رسومات دور کرنے علم دین کو عام کرنے اور شریعت و طریقت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بڑی کوشش کی اس سلسلے میں انہوں نے بڑے بارسوخ نقلی پیروں سے خطرناک حالات میں مشہور مناظرے کئے ان کے زیادہ تر مناظرے "پیر تاریک" سے ہوئے۔

اخبار الاولیاء میں ہے کہ شیخ علی ترمذیؒ جو سلسلہ چشتیہ صابریہ کے پیر طریقت تھے اور اس کے رواج کے مطابق "سماع" کرتے تھے حضرت اخوند درویزہؒ نے اسے خلاف شریعت سمجھ کر اپنے مرشد کو ٹوکا جنہوں نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بعض اسرار منکشف ہونے کی خاطر سماع کبھی کبھی کیا کرتا تھا لیکن آئندہ کے لئے ایسا نہیں کروں گا چنانچہ انہوں نے پھر کبھی "سماع" نہیں کیا۔

وفات

حضرت اخوند درویزہؒ نے اخیر عمر میں علاقہ یوسف زئی کو چھوڑ کر پشاور میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ ان کی وفات ۱۰۴۸ھ بمطابق ۱۶۳۸ء ہوئی۔ یہ شاہجہاں کا عہد حکومت تھا۔ ان کا مزار مبارک پشاور شہر سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر موسیٰ زئی ہزار خانی روڈ کے کنارے پر واقع مرجع خلائق ہے۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے قطعہ ہذا میں ان کی تاریخ وفات تحریر کی ہے۔

چو آں درویزا درویش معظم	زدنیا رفت در فردوس بالا
نجواں درویزا معشوق مکرم	رائی رضا جو ارتحالش

۱۰۴۸ھ

"رائی رضا" سے بھی تاریخ وفات نکالی گئی ہے۔

تالیفات

خود علم سے محبت رکھ کر دوسروں میں اسے مقبول کرانے کے لئے انہوں نے فارسی و پشتو میں کئی تالیفات علم کو وسعت دینے کی خاطر انہوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ حضور اکرمؐ مدینۃ العلم ہونے کے باوجود "رب زدنی علماً" کی دعا فرمایا کرتے تھے ان کی ایک کتاب (۱) ارشاد الطالبین (فارسی) ہے۔ اس کے صفحات تقریباً ساڑھے پانچسو ہیں چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مختلف پریسوں میں بار بار چھاپی گئی ہے۔ علماء خراسان کی محبوب ترین کتاب ہے۔

(۲) "ارشاد المریدین" جو کہ سنہ ۱۲۸۴ھ میں پشاور شہر کے مطبع مصطفائی میں اور سنہ ۱۲۷۲ھ میں دہلی میں چھپ چکی ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے۔ مسائل تصوف پر مشتمل ہے جس میں ایک مقدمہ۔ سات نکتے اور خاتمہ ہے۔ (۳) "مخزن اسلام" جو پیر روشان" کی مشہور کتاب "خیر البیان" کے جواب میں اس کی طرح چار زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ بحوالہ "تذکرہ صوفیائے سرحد" مطبع "فیض عام" دہلی سے شائع ہو چکی ہے اس کی ضخامت ۱۶۰ صفحات پر ہے۔ یہ کتاب عقائد و عبادات پر مشتمل آٹھ ابواب میں منقسم ہے۔

(۴) "تذکرۃ الابرار والاسرار" یہ اخوندؒ کی معرکتہ الآراء تالیف ہے۔ انواع مضامین پر مشتمل ہے۔ تین تذکروں میں منقسم ہے اس کے ۲۳۲ صفحات ہیں سنہ ۱۱۲۱ء تالیف کی گئی اور سنہ ۱۳۰۹ء میں مطبع ہند پریس سے شائع ہوئی۔ (۵ و ۶) حضرت اخوند درویزہؒ کی دو اور کتابیں "تلقین المریدین" و "تذکرۃ الاولیاء" بھی موجود ہیں۔ رود کوثر صفحہ ۳۶۸ مؤلفہ شیخ محمد اکرام۔

(۷ - ۸ - ۹) اس کے علاوہ اور بھی ان کی کئی تالیفات "شرح قصیدہ آمالی" فارسی۔ شرح اسماء حسنیٰ فارسی۔ برہان الانبیاء والاولیاء۔ موجود ہیں۔

پشتو زبان کے شاعر

مذکورہ تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ پشتو زبان کے مشہور قادرالکلام شاعر تھے علم و حکمت سے بھرے ہوئے انکے اشعار پٹھانوں میں بہت مقبول ہیں۔ اس طور سے انہوں نے پشتو پر عظیم احسان کیا ہے۔

اولاد

۱۔ میاں کریم داد شہیدؒ جن کا اصل نام عبدالکریم ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم میں اپنے والد ماجد سے مستفیض ہوئے تھے۔ پیر باباؒ کے خلیفہ تھے۔ مؤلف۔ محقق۔ ادیب۔ عالم اور شاعر تھے صاحب کشف و کرامت ولی اللہ تھے۔ ان کا مزار مبارک ریاست سوات کے موضع کانجو میں ہے۔ "شہید بابا" سے معروف ہیں۔

۲۔ میاں عبداللہ المعروف بہ میاں اللہ دادؒ۔ بڑے عالم و فاضل تھے۔ اپنے والد بزرگوار کے خلیفہ ہیں روحانیت میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں مزار مبارک ریاست سوات کے موضع سلامپور میں میاں جیو بابا سے مشہور ہے۔

۳۔ میاں عبدالخالقؒ المعروف بہ میاں خالقدادؒ عالم فاضل اور مولف تھے مزار مبارک ریاست سوات کے موضع "نوے کلے" میں ہے۔

۴۔ میاں پایندہ محمدؒ عالم اور فاضل تھے علم فقہ کی کئی کتابوں پر حاشیے لکھے اپنے والد بزرگوار کے خلیفہ تھے مزار مبارک ریاست دیر کے علاقہ "اندلیزی" میں ہے۔

حضرت خواجہ خورد عبد اللہؒ

از رشید احمد ارشد ایم اے

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ عبداللہ خواجہ خورد کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ حضرت خواجہ صاحب کی دوسری زوجۂ محترمہ کے بطن سے تھے اور اپنے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ سے صرف چار ماہ چھوٹے تھے شکل وشباہت اور سیرت میں آپ اپنے والد محترم کی ہو بہو تصویر تھے والد بزرگوار کے وصال کے بعد آپکی ابتدائی تعلیم وتربیت بھی خواجہ حسام الدین صاحب نے کی جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں سے تھے اور اپنے مرشد کے وصال کے بعد درگاہ شریف میں مقیم رہے تاکہ درگاہ اور حضرت مرشد کے خاندان کی خدمت کرتے رہیں۔ جب حضرت عبداللہ یعنی خواجہ خورد سن شعور کو پہنچے تو انہیں بھی ان کے بڑے بھائی کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی کی خدمت میں سرہند شریف بھیجا گیا۔ وہاں انہوں نے باطنی اور روحانی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم کلام اور تصوف کی اعلیٰ کتب بھی حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سے پڑھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ علم کلام اور فلسفہ اور تصوف کے بہت بڑے عالم ہوگئے۔ اس کے ساتھ آپ نے دیگر علوم شرعیہ اور فارسی وعربی ادب میں بھی بہت مہارت حاصل کی۔

آپ نہایت خوش گو شاعر بھی تھے اور فارسی میں سخن گوئی کا نہایت اعلیٰ

مذاق رکھتے تھے آپ فارسی زبان کے انشاپرداز بھی تھے۔ اور تصوف کے مسائل پر آپ نے کئی رسائل تحریر کئے تھے۔

آپ کی انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے کے لئے مؤلف زبدۃ المقامات نے آپ کے دو مکاتیب اپنی کتاب میں درج کئے ہیں[۱] حضرت مجدد الف ثانی بھی آپ کی قابلیت اور صلاحیت کی بہت تعریف کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کے استاد

حضرت خواجہ خورد (خواجہ عبداللہ) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم کے استاد محترم تھے اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے آپ کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں اس لئے ان سب حالات کا خلاصہ انفاس العارفین کے ذریعے ہم قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کا خواب

حضرت شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں۔ میں نے شیخ عبدالعزیز قدس سرہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرماتے ہیں۔

اے فرزند! مرید کی بیعت کا ہاتھ تم اس وقت تک کسی کے ہاتھ میں نہ دو جب تک تمہیں خواجہ صاحب قبول نہ فرمائیں۔

اس خواب کا تذکرہ میں نے حضرت خواجہ خورد سے کیا۔ اور اس کی تعبیر چاہی اور یہ عرض کیا۔ "میرے شناساؤں میں اس شہر میں کوئی شخص (آپ کے سوا) خواجہ

نوٹ۔ رشید احمد ارشد کا حاشیہ ہے۔

[۱] زبدۃ المقامات ص ۶۸

کے لقب سے مشہور نہیں ہے۔" حضرت خواجہ خورد نے فرمایا۔
تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تمہیں خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت میسر ہوگی دگرنہ فقیر کا رتبہ اس سے کمتر ہے کہ شیخ عبدالعزیز (ب مجھے) خواجہ کے لفظ سے یاد فرمائیں۔

دیگر حالات

آگے چل کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار کی زبانی حضرت خواجہ خورد کے بارے میں بعض نہایت اہم اور دلچسپ حالات تحریر فرمائے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں[1]۔

میں نے چھوٹے چھوٹے رسائل شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے برادر بزرگ مخدومی ابوالرضا محمد سے پڑھے۔ دوسری کتابیں مرزا زاہد ہروی سے پڑھیں ایک دن شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پڑھتے وقت ایک اعتراض میرے ذہن میں آیا جس کا جواب مخدومی بھائی صاحب نے دیا۔ اس گفتگو نے آخر کار مناظرہ کی شکل اختیار کر لی تا آنکہ اس مناظرہ کی بدولت باہمی رنجش پیدا ہوگئی اور کتاب کی تعلیم موقوف ہوگئی۔

اس واقعہ کے چند دنوں بعد ہم دونوں حضرت خواجہ خورد کی خدمت میں گئے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ تمہارا حاشیہ خیالی کا سبق کہاں تک پہنچا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ میں نے اس کا سبق موقوف کر دیا ہے۔"

آپ نے فرمایا "اس کی کیا وجہ ہے؟"

خاکسار نے عرض کیا۔ مجھے نماز، روزہ کے بقدر ضرورت احکام معلوم ہوگئے ہیں اس سے زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔؟

خواجہ صاحب نے مزید استفسار فرمایا اور صحیح بات بتانے پر اصرار فرمایا تو انہیں

---

[1] انفاس العارفین ص ۱۵

واقعہ بتا دیا گیا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

تم دونوں ہمارے پاس پڑھنے کے لئے آیا کرو۔ آپ نے چونکہ یہ تاکیدی حکم دیا تھا اس لئے میں صبح سویرے کتاب بیکر آپ کے پاس پڑھنے کے لئے گیا۔ اور انہوں نے سبق پڑھانا شروع کیا۔ آپ نے میرے (متنازعہ فیہ) اعتراض کو بہت پسند فرمایا۔ اور اسے زوردار اعتراض تسلیم کیا۔

اس کے بعد تین دن تک آپ سبق پڑھاتے رہے۔ چوتھے دن آپ نے فرمایا تمہارے نانا شیخ رفیع الدین نے مجھے صرف تین سبق پڑھائے ہیں۔ میں بھی تمہیں تین اسباق کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھاؤں گا۔ اس کے بعد حضرت خواجہ خورد نے اپنی تعلیم کا حال بتایا اور فرمایا[1]

شیخ رفیع الدین کے ارشادات

جب شیخ رفیع الدین صاحب مجھے (تین دن تک) تعلیم دے چکے تو فرمانے لگے اگر تمہارا مقصد اس فن (تصوف) کی تحقیق کرنا ہے تو مجھے اجازت دیں کہ میں تمہارے دولت خانہ پر ہر روز آؤں کیونکہ میں اب اس بات کی اجازت نہیں دونگا کہ تم خود میرے پاس آؤ کیونکہ یہ خلاف ادب ہے۔ (خواجہ خوردان کے پیر و مرشد کے صاحبزادے تھے۔

میں نے عرض کیا اگر آپ مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو ایسی صورت میں یہ عاجز آپ کو تکلیف دینے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟"

اس پر شیخ رفیع الدین صاحب فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد فیروز شاہ (کوٹلہ) لے آئے۔ وہاں انہوں نے ایک جگہ مقرر کر کے فرمایا۔

یہاں بیٹھ کر آپ تصوف کی ہر مشکل کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگر یہاں بھی کوئی

---

[1] انفاس العارفین از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ص ۱۶

بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

خواجہ خورد فرماتے ہیں (شیخ صاحب کی اس ہدایت کے بعد) جب کبھی بھی مجھے مطالعہ کتب میں کوئی دقت پیش آتی تھی تو میں وہاں جا کر مطالعہ کرتا تھا۔ تو وہ دقت اور اشکال فوراً حل ہو جاتا تھا۔ تاہم اگر میں (اس مخصوص) مقام سے ایک بالشت بھی آگے بڑھتا تو اس مقام کی حیثیت دوسرے عام مقامات کی طرح ہو جاتی تھی۔
شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں۔ جب حضرت خواجہ خورد نے اپنی گفتگو ختم کی تو میں نے عرض کیا تین سبق پر اکتفا کرنا شیخ صاحب کی کرامت تھی اگر آپ بھی کوئی روحانی تصرف فرمائیں تو بہتر ہوگا۔

آپ نے فرمایا۔ اگر تمہیں کسی علم میں کوئی دقت پیش آئے جسے تم حل نہ کر سکو تو مجھ سے کہو کہ فلاں نے اس طرح ہمارا راستہ روک لیا ہے۔
آپ کے اس ارشاد کے بعد مجھے مطالعہ کتب میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔
اس کے بعد میں نے اعلیٰ علوم کی تکمیل میر زاہد دہلوی سے کی تھی تاہم اس زمانے میں بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں تحصیل حاصل (پڑھی ہوئی چیز کو دوبارہ پڑھنا) کر رہا ہوں۔ کیونکہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ میں کتاب کے شروع کا حصہ پڑھ رہا ہوں۔ (تھوڑی دیر میں) آخری حصہ کا درس دینے لگ گیا ہوں۔[1]

مخصوص عادت

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں خواجہ خورد کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے انگوٹھے انگلیوں پر کچھ لکھا کرتے تھے، خواہ درس دے رہے ہوں یا باتیں کر رہے ہوں ایک دن میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔
یہ ایسا عمل ہے جو میں ہمیشہ کرتا چلا آیا ہوں اس کے بارے میں تمہارے علاوہ

---

[1] انفاس العارفین ص ۱۵-۱۶

اور کسی نے اب تک نہیں دریافت کیا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں اپنے ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں اسی طرح لکھنے میں مشغول رہتا تھا۔ اب بھی قدیم علوت کے مطابق یہ عمل جاری ہے۔

استاد زادہ کی تعظیم

ایک دن حضرت خواجہ خورد اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جب میں (شاہ عبدالرحیم) ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے میری بہت زیادہ تعظیم و تکریم فرمائی یہاں تک کہ آپ خود تخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور خود مجھے تخت کے اوپر مسند پر بٹھایا۔ میں نے ہر چند معذرت کی مگر آپ نے قبول نہیں فرمائی۔ اس رویہ پر تمام حاضرین حیران ہوئے۔ آخر کار ان کے صاحبزادے خواجہ رحمت اللہ نے اٹھ کر عرض کیا اس مجلس میں ان سے زیادہ معمر اور معزز افراد موجود ہیں۔ آخر صرف ان کے ساتھ اس قدر مخصوص تواضع کرنے میں کیا نکتہ پوشیدہ ہے۔؟

آپ نے فرمایا۔ ہم نے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ تم لوگ ہمارے طرز عمل کو ملاحظہ کرو اور آئندہ ان کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا کرو۔ اس (سلوک) کی وجہ یہ ہے کہ جب میں ان کے نانا شیخ رفیع الدین کے ہاں جایا کرتا تھا تو وہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے تھے حالانکہ وہ میرے استاد تھے اور میں نے ان سے بہت فیض حاصل کیا تھا۔ اسی طرح جب شیخ رفیع الدین ہمارے خواجہ بزرگ یعنی خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو خواجہ بزرگ بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا (تعظیم و تکریم کا) طریقہ اختیار فرماتے تھے۔

شیخ رفیع الدین صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ تھے تاہم ان کی اس (تعظیم و تکریم) کی وجہ یہ تھی کہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ ابتدائی سلوک (روحانیت) کی زندگی میں شیخ قطب العالم کے پاس رہے تھے اور کچھ کتابیں بھی ان سے پڑھی تھیں بلکہ ان سے کچھ روحانی فیض بھی حاصل کیا تھا۔ لہٰذا ہمیں بھی ان کے ساتھ اسی

قسم کا سلوک کرنا چاہیئے۔

کھانے میں برکت

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں۔ ایک دن ہم دونوں بھائی خواجہ (خورد) صاحب کی خدمت میں موجود تھے۔ اس وقت انہیں اس قدر بھوک لگی کہ وہ درس نہیں دے سکے لہذا انہوں نے اہل خانہ سے دریافت کیا۔

کیا گھر میں کھانے کے لئے کچھ موجود ہے؟

انہوں نے کہا ہاں۔ ایک بچے کے لئے انہوں نے کچھ تھوڑا سا کھانا پکایا ہے۔"

اس پر آپ نے فرمایا۔ اس میں سے کچھ کھانا لایا جائے۔

لہذا ایک چھوٹی سی رکابی میں کچھ کھانا لایا گیا۔ آپ نے ہاتھ دھو کر حاضرین سے فرمایا۔

" آیئے کھانا کھایئے۔ یہ کھانا تمام لوگوں کے لئے کافی ہوگا۔"

اس پر تمام لوگ تعجب کرنے لگے۔ تاہم جب آپ نے ہم دونوں بھائیوں کو دوبارہ اشارہ کیا تو ہم آگے بڑھ گئے۔ اس طرح ہم تینوں نے نہ صرف پیٹ بھر کر کھانا کھایا بلکہ اس رکابی میں کچھ کھانا بچ بھی گیا جو اس بچے کیلئے واپس بھیج دیا گیا۔[1]

یکساں سلوک

ایک دن بہمن باز خاں (جو امرائے شاہی میں سے تھے) حضرت خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے گھر میں کوئی فرش بچھا ہوا نہیں تھا۔ سب لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بہمن باز خاں بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ اہل مجلس میں سے ایک شخص نے اٹھ کر حضرت خواجہ صاحب کے کان میں کہا۔ یہ بہمن باز خاں

---

[1] انفاس العارفین ص۱۷ از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

خاں ہے۔ اس کی تعظیم کرنی چاہیئے۔

خواجہ صاحب نے بہ آواز بلند فرمایا" اگر وہ دوست ہے تو اس کی تعظیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ غیر ہے تو تعظیم کے لائق نہیں ہے"۔

بہن بانہ خاں یہ بات سنکر بہت محظوظ ہوا۔

شاگردوں پر شفقت

حضرت شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں۔ میرا حضرت خواجہ خورد کے ایک خادم سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں وہاں نہ جاؤں۔ (چنانچہ میں وہاں نہیں گیا۔) دو تین کے بعد خواجہ صاحب بنفس نفیس میرے گھر تشریف لائے اور گھر کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر ایک بوڑھے آدمی سے میرے بارے میں دریافت فرمانے لگے اس نے کہا "وہ سو رہے ہیں" آپ نے فرمایا۔

جب وہ بیدار ہو جائیں تو انہیں یہ پیغام دینا کہ خواجہ خورد تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور اب وہ جٹو مسجد میں سو رہے ہیں۔ تم وہاں پہنچ جاؤ۔"

جب میں بیدار ہوا تو اس آدمی نے مجھے آپ کا پیغام پہنچایا۔ میں فوراً اس مسجد میں پہنچا۔ (تو وہاں میں نے دیکھا کہ) آپ اپنا عمامہ اپنے سر کے نیچے رکھ کر بے تکلف آرام فرما رہے ہیں۔ جب ظہر کی اذان ہوئی تو آپ بیدار ہوئے۔ آپ نے مجھے دیکھکر میری مزاج پرسی کی اور لطف و عنایت کے کلمات ادا فرماتے رہے۔[1]

مزید حالات

خواجہ خورد حضرت شیخ احمد سرہندی سے طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق روحانی

---

[1] انفاس العارفین ص۱۸

فیض حاصل کرنے کے بعد دہلی واپس آگئے تھے اور یہاں بھی خواجہ حسام الدین اور شیخ الہ داد سے روحانی ہدایت اور فیض حاصل کرتے رہے۔

جب آپ تمام روحانی منازل طے کر چکے اور تصوف و سلوک میں کامل ہو گئے تو اس کے بعد بھی آپ نے کبھی اپنے آپ کو پیر و مرشد یا روحانی پیشوا کی حیثیت سے مشہور نہیں کیا بلکہ گوشۂ گمنامی ہی میں رہے۔ اس کے باوجود بہت سے افراد نے آپ سے روحانی فیض حاصل کیا ان میں سے ایک نامور عالم شیخ محمد صالح بھی تھے جو مسجد فیروز شاہ میں درس دیتے تھے انہوں نے خواجہ خورد سے سلسلۂ نقشبندیہ میں روحانی فیض حاصل کیا تھا۔ تاہم خواجہ خورد نے بہ تاکید تمام انہیں اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے مریدی کے تعلق کو عوام کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ بلکہ صحبت بھی خلوت میں رکھا کریں۔ جب وہ اپنے وطن مالوف پنجاب کی طرف جانے لگے تو اس وقت انہوں نے یہ عرض کیا۔

لوگ یہ دریافت کریں گے۔ تم نے یہ روحانی طریقہ کہاں سے حاصل کیا؛ اس وقت میں کیا جواب دوں؟

آپ نے فرمایا۔ اگر کوئی ضرورت لاحق ہو جائے تو اس وقت میرا نام ظاہر کرو۔ ورنہ اس کا اظہار نہ کرو۔

عرس

خواجہ خورد خواجہ محمد باقی باللہ کا عرس بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے (شاہ عبدالرحیم) بارہا یہ دیکھا کہ اس وقت ایک شخص آکر یہ کہتا تھا۔ "چاول میرے ذمے ہے"۔ دوسرا کہتا تھا گوشت میرے ذمے ہے۔ تیسرا یہ کہتا تھا خلیل قوال کو میں لاؤں گا۔ اس طرح دوسرے افراد دوسری ذمہ داریاں قبول کرتے تھے[1]

---

[1] انفاس العارفین ص ۱۸-۱۹

نصیحت

شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں۔

"خواجہ خورد نے مجھے یہ نصیحت فرمائی تھی"

غیر ضروری کتب و حکایات کے مطالعہ و درس سے اپنے آپ کو الگ رکھو کیونکہ جب تک یہ مشاغل رہیں گے۔ اس وقت تک اس روحانی سلسلہ کے عجیب و غریب آثار نظر نہیں آئینگے۔

آخری وصیت

خواجہ خورد نے اپنے آخری زمانے میں مجھ سے یہ فرمایا تھا۔

مجھے خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں اس مقام پر دفن کرنا جہاں جوتیاں اتاری جاتی ہے تم مجھے فرزندی کے تعلق سے مقبرہ کے اندر نہ دفن کرنا۔ کیونکہ میں صرف اسی جگہ کے لائق ہوں۔

میں نے کہا۔ یہ کام اس وقت دوسروں کے سپرد ہوگا اس وقت میرا کیا اختیار ہوگا آپ نے فرمایا "تم انہیں اطلاع دے دینا"

چنانچہ آپ کی وفات کے بعد میں نے ان کے وارثوں سے کہا کہ خواجہ صاحب کی وصیت یہ ہے مگر انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی[1]

حضرت خواجہ خورد کے شاگرد نہ صرف شاہ عبدالرحیم تھے بلکہ ان کے بڑے بھائی یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے عم محترم (تایا) شیخ ابوالرضا محمد نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور دونوں بھائیوں پر آپ کی توجہ و عنایات بے پایاں تھیں۔ اسی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں اپنے والد محترم کی زبانی آپ کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

---

[1] انفاس العارفین صلا

حضرت خواجہ کی اولاد

حضرت خواجہ خورد عبداللہ کے صاحبزادے خواجہ الٰہی تھے۔ پرانے کاغذات اور شجرۂ نسب میں ان کا نام یہی لکھا ہوا ہے تاہم خواجہ خورد کے مذکورہ حالات میں جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں تحریر فرمائے ہیں ان کا اسم گرامی ص ۱۶ مطبوعہ مطبع مجتبائی میں رحمت الٰہی تحریر فرمایا ہے۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے ان کے حالات کسی تذکرہ سے نہیں معلوم ہو سکے۔

اس خاندان کے شجرۂ نسب سے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے مکتوبات شریف کے اردو ترجمہ مطبوعہ مشہور عالم پریس لاہور کے آغاز میں منسلک ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ خورد کی نسل صرف آپ کی پوتی امت الباقی بیگم سے باقی رہی۔ کیوں کہ خواجہ رحمت الٰہی کا کوئی فرزند نرینہ نہ تھا۔ صرف یہی صاحبزادی تھیں۔

امت الباقی بیگم

قدیم دستاویزوں سے پتہ چلتاہے کہ محترمہ امت الباقی بیگم نے طویل عمر پائی تھی۔ اور وہ اپنی طویل عمر اور بزرگی کی وجہ سے حضرت خواجہ باقی باللہ کی اولاد اور ان کے خاندان میں بہایت عزت واحترام رکھتی تھیں اور خاندانی جھگڑوں اور جائداد کی تقسیم میں انھیں ثالث بنایا جاتا تھا۔

اہم ثبوت

اس کا ثبوت ہمیں لاہور ہائی کورٹ کے اس مقدمہ کی اپیل کی ضخیم کتاب سے ملا ہے جو پیر جی منظفر علی مرحوم سابق سجادہ نشین درگاہ خواجہ باقی باللہ دہلی نے ۱۹۳۱ء میں درگاہ شریف کے وقف ہونے کے مقدمہ کے سلسلے میں دائر کی تھی۔ اس میں تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ کی مقدمہ بازی کی تمام نقول مندرج ہیں [۲]

۲۔ اس اہم اور نادر دستاویز کی ضخیم کتاب کے مطالعہ کا موقعہ ہمیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مذکورہ بالا مقدمہ کی اس ضخیم کتاب میں جو تحریری دستاویز پیش کی گئی ہے اس کی تاریخ ۲۷ شعبان ۱۲۲۵ھ ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے جب حضرت خواجہ باقی باللہ کی اولاد میں درگاہ شریف کی جائداد کی تقسیم کے بارے میں اختلاف پیدا تو خواجہ الٰہی کی (جو خواجہ خورد کے صاحبزادے تھے) دختر ارجمند محترمہ امت الباقی بیگم نے جو اس زمانے میں سب سے بزرگ تھیں تمام ارکان خاندان کی رضامندی کے ساتھ درگاہ کی جائداد کو اس کے جائز وارثوں میں صحیح طریقہ سے تقسیم کیا تھا۔ یہ قدیم دستاویز عدالت کے ریکارڈ میں پیش کی گئی تھی۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ محترمہ امت الباقی بیگم جو حضرت خواجہ خورد کی پوتی تھیں ۔ ۲۷ شعبان ۱۲۲۵ھ تک بقیدِ حیات تھیں اور ان کا حکم تمام خاندان کے ارکان کے لئے نافذ ہوتا تھا۔

دیگر اولاد

حضرت خواجہ باقی باللہ کے خاندان کے شجرۂ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ محترمہ امت الباقی بیگم کے دو فرزند تھے ان میں سے ایک کا اسم گرامی میر سید محمد تھا اور دوسرے فرزند کا اسم گرامی شاہ نظام الدین عرف شاہ جی تھا۔ جو بہت بزرگ شخصیت کے مالک تھے۔

میر سید محمد صاحب کے ایک صاحبزادے میر سید علی گوالیار (ریاست) میں رہتے تھے اور غالباً ان کی اولاد گوالیار کی ریاست میں مقیم ہو گئی تھی۔ دوسرے صاحبزادے خواجہ احمد کے فرزند ارجمند جناب فقیر بدرالدین صاحب بھرتپور کی

(بقیہ حاشیہ) موجودہ سجادہ نشین درگاہ خواجہ باقی باللہ محترم سید اصغر صاحب کے ذریعہ ملا جو پیر جی سید صفدر علی ولد پیر جی منظفر علی کے فرزند اکبر ہیں۔

باکمال شخصیت تھے اور فقیر صاحب بھرتپور کے لقب سے مشہور تھے۔

مذکورہ بالا حضرات کے حالات ہمیں تاریخی تذکروں سے نہیں معلوم ہوسکے صرف شجرۂ نسب میں ان کے اسمائے گرامی مذکور ہیں۔ البتہ مذکورہ بالا ہائی کورٹ کی کتاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ نظام الدین غالباً امرائے شاہی میں سے تھے۔ مقدمہ مذکورہ کی دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے فرزند نواب کہلاتے تھے۔ کیونکہ انکے دونوں صاحبزادے نواب محمد میر خاں اور نواب سید میر خاں کے لقب کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔

شاہ نظام الدین صاحب کی ایک دختر تھیں جن کا نکاح خواجہ کلاں کی اولاد میں سے خواجہ میر عبداللہ سے ہوا۔ وہ خواجہ محمد امیر کی والدہ اور حافظ سید محمد نصیر سجادہ نشین درگاہ خواجہ باقی باللہ دہلی کی دادی تھیں۔ اس طرح خواجہ کلاں اور خواجہ خورد کی اولاد ایک سلسلہ سے منسلک ہو گئیں۔

نواب محمد میر خاں کے صاحبزادے سید محی الدین صاحب عرف نواب بڈھن صاحب بھی اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ تھے۔

خواجہ خورد کی تصانیف

خواجہ خورد نے تصوف کے بعض اہم مباحث پر فارسی میں چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر فرمائے ہیں ان میں سے بعض رسائل شائع ہو چکے ہیں نیز ان کے بعض عربی خطوط کا نمونہ زبدۃ المقامات میں پیش کیا گیا ہے تاہم ان کی اکثر تصانیف کا حصہ یا تو ضائع ہو گیا ہے یا بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ چنانچہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں "ذخیرۂ دہلی" میں ان کے متعدد رسائل محفوظ ہیں جن میں ان کے مکتوبات اور بیان احوال و ملفوظات خواجہ خورد خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ نیز بڑے صاحبزادے خواجہ کلاں کی کتاب مبلغ الرجال بھی وہاں محفوظ ہے۔

ترجمہ خیر کثیر[1]

افادات امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی

(۱۱۷۰ھ)

پہلا خزانہ

کیا تیرے کان میں یہ آواز نہ پہنچی جسے اہل نظر حکماء نے اپنی اعلیٰ کوششوں سے موسس کیا ہے کہ وجود ایک انتزاعی شے ہے جسے تو اپنے قلب سے ادراک کرتا ہے اسکی حقیقت یہی ادراک ہے۔[2] اس کے بعد اس انتزاعی امر کے مقابلہ میں ایک امر ہے جو واقع میں ثابت ہے اصطلاح میں اسکو "مخلیت ماہیت" اور تقرر ذات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے[3]

(کیا تیرے کان تک یہ آواز نہ پہنچی) کہ موجود کی تقسیم دو قسموں میں منحصر ہے

---

[1] اصل کتاب خیر کثیر، حقائق اشیاء پر شاہ صاحبؒ کی بے نظیر تالیف ہے، جو پہلی بار مجلس علمی ڈابھیل سورت سے شائع ہوئی تھی۔ یہ اس کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ہے جو کہ تیس سال قبل ولی اللہی حکمت کے شارح مولنا عبیداللہ سندھیؒ نے مکہ مکرمہ میں املا کرایا تھا۔ اسی کو معمولی رد و بدل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور قوسین میں جو عبارت آتی ہے وہ ہماری طرف سے وضاحت کے لئے بڑھائی گئی ہے۔

[2] یعنی امر انتزاعی کی حقیقت صرف اس قدر ہوتی ہے جو ذہن میں حاصل ہو۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک "موجود من نفسہ" (یعنی بذات خود موجود) اس میں وجود کے حمل کا مصداق اور اس کے انتزاع کا منشاء۔ اس موجود کی ذات ہی ہوتی ہے جو سب حیثیتوں اور اعتبارات سے خالی ہوتی ہے تو لازمی طور پر یہ موجود کا تحقق اور ماہیت کا عین ہوگا، اور دوسرا "موجود من غیرہ" (جو بذات خود موجود نہیں) اس قسم میں وجود کے حمل کی مصداق اور اس کے انتزاع کی منشاء صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو ایک ایسی چیز کی طرف نسبت کی جائے جو بذات خود متحقق نہ ہو، پس ضروری ہے کہ (موجود کی یہ دوسری قسم) فاقد الذات (اپنی ذات نہ رکھنے والی چیز) ہو اور اس کا اپنا وجود وہی سمجھا جائے جو اس کی علت کا وجود ہے۔

(اور کیا یہ آواز تیرے کان تک نہیں پہنچی) کہ ممکنات میں ماہیت اور فعلیت کا یہ فرق ہے کہ جب ایک چیز کو دوسری سب چیزوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جاتا ہے تو یہ اس کی ماہیت کا لحاظ کیا گیا اور جب اس کو اس طرح دیکھا جائے کہ جاعل کی طرف اس کی فی نفسہ (اور واقعی) نسبت کی حیثیت سامنے رہے تو یہ اس کی فعلیت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ (اور کیا تیرے کان تک یہ آواز نہیں پہنچی) کہ جعل بسیط[ھ] کا اثر ایک چیز کی اپنی ذات ہے، اگر وہ جعل نہ ہوتی تو یہ چیز باطل الذات اور خالص منفی ہوتی اور یہ بات بھی معلوم رہے کہ جاعل کو اپنے مجعول کی طرف ایک خصوصیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ جاعل اس مجعول کے سوا، اور کسی چیز کو مستلزم نہیں ہوتا اور مجعول کو بھی اپنے جاعل کے ساتھ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے سوا اور کسی سے صادر نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری ہے کہ جاعل میں ایک ایسی جہت ہو کہ مجعول کی حقیقت بنے اور اس کی کنہ

(بقیہ حاشیہ) یہ شے دراصل انتزاعی چیز کے لئے منشاء انتزاع ہوتی ہے جس طرح آسمان ایک فوقانی اور خارجی چیز ہے۔ اسی سے فوقیت کو انتزاع کیا جاتا ہے تو آسمان کو فوقیت کے لئے منشاء انتزاع اور فوقیت کو امر انتزاعی کہا جائے گا۔

[لہ] اور پہلے مرتبے کو "ماہیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [ھ] (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہلائے۔ وہ جاعل کی تمام جہت سارے مجعول کے برابر ہوگی۔ اور وہ مجعول اس جہت کی ایک مثال اور وہ جاعل اپنے درجہ میں، اپنی ذات میں تام ہے۔ اس کی تمام ہونے کی جہت نے مجعول کو پیدا کیا۔

جب کہ ممکن کی طبیعت میں اس کی اصل فعلیت کے لئے جاعل کی طرف نسبت ضروری ہے، اور جب کہ ہر مجعول کی طبیعت میں ضروری ہے کہ اس کی ایک جہت راسخہ جاعل میں موجود ہو تو عالم تحقق اور اقلیم فعلیت میں کسی چیز کا تحقق اور فعلیت ہونا ناممکن ہے جب تک کہ اس کی ایک جہت واجب جل مجدہ میں نہ ہو۔

اب اللہ سبحانہ تعالےٰ کی بزرگی بیان کرنے کا یہ راستہ معین ہوا کہ کہا جائے کہ وہ غیر متناہی چیزوں پر محیط ہے اور یہ احاطہ بھی غیر متناہی ہے۔ اس کی بزرگی بیان کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ کہا جائے کہ وہ ایک امر محقق ہے کہ تمام کائنات کا استناد اسکی طرف برہانی دلائل سے ضروری ثابت ہو چکا ہے، اس کے بعد جب عقل نے اس کے برخلاف فرض کیا تھا۔

(یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کے مجد کا پورا پورا اظہار نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت کا ادنیٰ بیان ہے)۔ وہ عین تقرر ہے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے آگے مفہومات میں سے کوئی مفہوم یا فعلیات میں سے کوئی فعلیت ہے، اس لئے کہ جس چیز کی بھی ایک جہت واجب میں مندرج نہیں ہے تو وہ خالص ممتنع ذاتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ) جاننا چاہیئے کہ جعل کے ایک معنی ہیں پیدا کرنا، اسکے صرف ایک مفعول آتا ہے جسے مجعول کہا جاتا ہے، جیسے جعل اللہ الانسان یعنی اللہ نے انسان کو پیدا کیا اس کا اثر بالذات ایک چیز کی ذات ہوتی ہے اسی کو جعل بسیط کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کا اثر ایک بسیط چیز ہے۔ اشراقی حکماء جعل بسیط کے قائل ہیں جعل دوسرے معنیٰ "تصییر" ایک حال سے دوسرے حال پر کرنا ہے اس کیلئے دو مفعول ہوتے ہیں۔ جیسے جعل اللہ الانسان موجوداً، اس کو جعل مؤلف کہا جاتا ہے کیوں کہ اسکے اثر میں ترکیب ہوتی ہے۔ مشائی حکماء جعل مولف کے قائل ہیں۔

وہ کلی اور جزدی ہونے سے پاک ہے وہ کلی اس لئے نہیں ہے کہ اس میں منفعت کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں ہے[۱] وہ تو ایس (وجود) بحت اور تمام محض ہے، لیس (عدم) اور نقص ایک ایسی چیز ہے جس کو عقل پیدا کرتی ہے جب وہ ایسی چیزوں کا لحاظ کرتی ہے جکے لئے کسی طرح کا وجود نہیں ہے۔ یعنی ایک چیز عقل اور علم میں آتی ہے مگر اس میں جاعل کی طرف استناد ثابت نہیں ہوا۔ (اس لئے وہ چیز وقوع اور وجود سے خالی ہوگی)

اور یہ کہ وہ جزئی نہیں ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ اس سے کوئی چیز عام نہیں ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کے ساتھ مل کر کسی دوسری چیز کے نیچے داخل ہوسکے[۲] وہ تو واحد حق جل جلالہ ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ جو چیز ہر جہت سے ایک ہو اس سے واحد (ایک چیز) کے سوا اور کچھ صادر نہ ہوگا اور نہ واحد کے سوا کوئی چیز اس کو لازم ہو سکتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو؟ واحد کا اس کے سوا کوئی معنی ہی نہیں ہے کہ واحد بسیط سے صادر ہوتا ہے، اس میں اس کے واحد ہونے کا لحاظ ضروری ہے، اسے خوب یاد رکھو اور خوب سوچتے رہو!

اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفے سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ایک چیز کے لئے جس قدر عوارض ہوتے ہیں ان کی علت اس چیز پر ختم ہوتی ہے جو اس چیز کے لئے اقتضا ذاتی سے لازم ہو اور جس قدر لوازم ہیں ان کا سلسلہ ایک لازم پر ختم ہوتا ہے، یہ لازم واحد اس چیز کے تقاضے سے جس قدر چیزیں لازم ہوسکتی ہیں ان سب کا مجموعہ ہے اور اس چیز کی جو جہت واجبیں ہوگی اس کی ایک مثال ہے

---

[۱] کلی اپنے ذہنی تشخص اور تحصل میں فصل اور شخص کی محتاج ہوتی ہے، تو اب واجب الوجود کو کلی کیسے کہہ سکتے ہیں، جب کہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ کلی ذہن کے مخترعات میں سے ہے، تو پھر واجب الوجود کیسے کلی ہوگا۔

[۲] جزئی تو وہ ہوتی ہے جکے تکثر کو عقل جائز نہیں رکھتی

(اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی) کہ تقرر ماہیت کا پہلا تمثل ہے اور ماہیت کا اس پر تقدم، تقدم بالذات مانا جاتا ہے، اور تقرر سے جتنی چیزیں بعد میں لازم ہوتی ہیں وہ اس کی شرط کے مطابق اس تقرر کی تمثلات ہیں اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ماہیت امکانیہ اور حقیقت واجبہ اس بات میں تو دونوں مشترک ہیں کہ ہرایک کا لازم اول ایک ہوتا ہے اور تمام عارضی چیزیں اور لوازم اس ایک لازم پر ختم ہوتے ہیں اس اشتراک کے باوجود ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ممکن انفعالی چیز ہے اس کے تقرر سے جو درجہ بالذات متقدم ہے اس میں اس کے کمالات کے فرائض اور نوافل اس لئے نہیں تمثل ہوتے کہ وہ (فی نفسہ بذات خود) ناقص ہے وہ فاقدالذات ہے۔ اپنی ذات میں بھی وہ (واجب کا) منتظر ہے، اور یہ انتظار اس کے لئے موت سے زیادہ سخت ہے اور واجب فعلی چیز ہے، اس کے درجہ سابقہ میں اس کے کمالات کے فرائض اور نوافل متمثل نہیں ہوتے، تو اس سے اس کی بلندی اس کی سبقت، اس کی بزرگی اور اس کی عزت مانع ہے اور یہ بھی سبب ہے کہ وہ ہر چیز سے پہلے ہے اور ہر چیز اس کے تابع ہے اور ہر فعلیت کے لئے وہ امام ہے۔

(اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفہ سے واضح نہیں ہو چکا) کہ کلیت اور جزئیت عقل کے عمل اور ادراک کی صنعت کی نئی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں (جس چیز کو کلی کہا جاتا ہے) وہ چیز اپنی ذات کے درجہ پران دونوں وصفوں سے بری ہوتی ہے اس لئے کہ کسی امر کی حقیقت اور اس کا اندرونی راز تو وہ جہت کہلاسکتی ہے کہ جو مجعول کے لئے اصل ہے اور جاعل میں موجود ہے، اور یہ جاعل کی پوری تاثیر سے پوری جہت پیدا ہوتی ہے، مجعول اس جہت سے نہ تو عام ہوسکتا ہے اور نہ خاص اور اس جہت کے حساب سے جس جگہ یہ چیز واقع ہوئی نہ تو کوئی دوسری چیز واقع ہوسکتی ہے اور نہ کوئی مفہوم اس کے سوا سمجھ میں آسکتا ہے (اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) کہ جنس اور فصل اور تعین یہ سب چیزیں عقل میں تمیز

حاصل کرتی ہیں، یہ عقلی تصور اس درجہ سے بالکل منقطع ہوتا ہے۔ جو اس چیز کے لئے عنداللہ حاصل ہے۔

(کیا تجھے ان کے فلسفہ سے یہ چیز واضح نہیں ہوئی) کہ وجود "خیر محض" ہے اور ہر معقول فعلیت خالصہ ہے اور شریعت اور عدمیت (برائی اور ہونا) اس ملاحظہ سے ظاہر ہوتی ہیں جس میں استناد الی الجاعل (جاعل کی طرف نسبت) کے حقوق بھلا دیئے جاتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ شریت اور عدمیت کے لئے کوئی دعوۃ الحق نہیں۔

(اور کیا تجھے ان کے فلسفہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی) کہ تفارق بالعدد سفلی حادثات کا حصہ ہے۔ مقدس کائنات میں ایک دوسرے سے تفریق کا مبداء عدد نہیں ہوتا، بلکہ خود ماہیت ہوتی ہے۔

(یہ بات بھی یاد رکھنے چاہیئے) کہ نشأت دنیا میں جو چیز متمثل ہوتی ہے ضروری ہے کہ نشأت علیا[۲] میں اس کا ایک امام ہو کمال کے اصول اور فروغ میں اس متمثل کا اقتدا اس امام کے ساتھ ہو یہاں تک کہ افلاک کے لئے بھی ان کے ائمہ مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

اشراقی حکماء کے دل نور اور نار (آگ) کی عبادت میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ان کی جہالت ہے اور حق سے ایک قسم کا تجاوز ہے۔

(یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) کہ کسی چیز کے ساتھ اس کے لوازم اور ذاتیات کا منضم ہونا نہیں پوچھا جا سکتا، یہ ایسا مہمل سوال ہے جو جواب کا مستحق

---

[۱] خیر کثیر عربی کے مطبوعہ نسخے میں "یجوز" کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ "جائز" ہو گا۔ استاذ علامہ کے پاس قلمی نسخہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں "یجب" آیا ہو اور یہ ترجمہ اسی کا ہو۔ اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

[۲] نشأت علیا سے مراد عالم مثال ہے اسی کو میں نے مترجم علامہ سے خیر کثیر عربی کے درس میں سنا تھا۔ (قاسمی)

نہیں ہے، پس یہ نہیں کہا جائے گا کہ (لم کان الانسان ناطقا او متعجبا) انسان کیوں ناطق یا متعجب ہے یا (لم کانت النار حارۃ) آگ کیوں گرم ہے؟ اس لئے کہ مجعول کی جو جہت جاعل میں ہے وہی ان دونوں کو ایک سلک میں پرو دیتی ہے اور عدم کے پردے سے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے گلے ملی ہوئی ظاہر ہوتی ہیں، اور لازم یا تو اجمال ماہیت کی ایک تفصیل اور شرح ہوتی ہے اور یا ان دونوں کو جاعل نے کسی امر مشترک کی وجہ سے ایک سلک میں پرو دیا ہے۔

(یہ چیز بھی یاد رکھنا ضروری ہے) کہ جوہر اور عرض کے افتراق کا موقعہ مثل کا بیان ہے۔ (باقی یہ دونوں طبیعتیں اپنی جہت کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں یہ ان کی جہت جاعل میں ہوتی ہے۔ کیا تجھے مشائی حکیموں کی وہ چال یاد نہیں جو فلک کے لئے حرکت دوریہ کو لازم بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک یہ مسائل وہی ہیں جو ایک حکیم ربانی اہل عقل اور حزب البرہان کے مسائل میں سے انتخاب کرتا ہے اور پسند کرتا ہے تجھے ان میں سوچنا چاہیئے اور ان سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

اب ہم ایک ایسے مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ حکمت کی اصل ہے اور تحقیق کا بیج ہے کیا تو نہیں جانتا کہ اسم اسے کہتے ہیں جو ایک چیز کا عنوان ہو اور مسمیٰ سے اسم صرف شرحی ہیئت اور تفصیلی خصوصیت سے جدا ہوتا ہے۔

اب تجھے جاننا چاہیئے کہ صادر اول اسمار الہیہ میں سے ایک اسم ہے اور اس کے دو درجہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ واجب اور صادر اول میں تفریق کی وجہ سب حکمار کے نزدیک وہ ماہیت کا مختلف ہونا ہے، اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ کیا صادر اول (واجب کے لئے) ایک عنوان نہیں ہے جو اس کے دیکھنے والے کی نظر کو حقیقت واجبیہ تک پہنچا دیتا ہے اور اس چیز سے انسلاخ صادر اول کی امکانی طبیعت کے مخالف ہے۔ خصوصاً مقدس امکانیات میں یہ انسلاخ اور بھی ناممکن ہے کیا صادر اول کی ایک جہت واجب جل مجدہ میں مندرج نہیں، اور کیا وہ صادر اوّل اس جہت کی شرح اور تمثال نہیں۔ اس ضروری ہے کہ اسے اسم کہا جائے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ واجب کی وحدت صرفہ میں ممکنات کی تمام جہات مندرج ہیں، یہ ممکنات موجود ہوں یا مفروض ہوں، اور اسی طرح صادر اول (یعنی اس کی جہت واجب میں مندرج ہے) کیا تو نہیں جانتا کہ صادر اول سارے کا سارا اسی جہت کی تمام قوت کا نتیجہ ہے اور جب کوئی چیز اس طرح ہو کہ وہ ساری چیز کی جہت کے سارے اثر کا نتیجہ ہو) تو ہم اس کو اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے ماسوا، ہر ایک چیز کا وجود اللہ میں منسلک ہے کیونکہ اللہ ہر فعلیت کو ہر حیثیت سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اور امتیاز ان خصوصیات سے پیدا ہوتا ہے جو ایک دفعہ کے لزوم کے بعد دوسری دفعہ اور اس کے بعد مقرر لازم ہوتی رہتی ہیں۔

(اور یہ قاعدہ ہے) کہ ہر ایسی چیز جو دوسری میں مستہلک ہو جب وہ مطلق ہوتی ہے تو اس کا حمل اصل پر صحیح ہوتا ہے اور وہ اس کا عنوان بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ امتیاز خصوصیت کے سوا ہوتا نہیں، اور یہ چیز جس میں مستہلک ہے نہ تو مطلق ہونے کی وجہ سے اس کے مخالف ہے اور نہ اپنے تحقق میں اسکے مخالف ہے، تو اس وقت یہ فقط اس جہت کی تفصیل اور شرح ہے۔ اور یہ باقی لوازم سے اس طرح ممتاز ہے کہ صادر اوّل کے سارے لوازم اس کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کی تمامیت، لوازم کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ صادر اوّل کے بڑے لازم یا چھوٹے کو نہیں چھوڑتا مگر اس کا احاطہ کر لیتا ہے، موطن تحقق میں لزوم کے مرتبے پر فقط صادر اول لازم بنتا ہے چاہے اسے بخصوصہ کہہ دیا اسے بعمومہ کہہ دو اس لئے کہ حقیقت میں تو وہاں نہ خصوص ہے اور نہ عموم ہے۔ جس طرح بعض لوگوں نے تو ہم پیدا کر رکھا ہے کہ وہ مقدم اس لئے ہے کہ اس کو سب خیرات لازم ہیں، پھر یہ کہ وہ ایک جزئی ہے، تمام جزئیات کی امام اپنی ماہیت کی جہت سے تو یہ توہم ایک بیہودہ بات ہے اس کے حق میں باطل ہے، اس کی طبیعت کے لئے ممتنع ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے نہ تو کوئی کنہ ہے اور نہ حقیقت سوا اس جہت کے جو واجب میں مندرج ہے اور اس جہت سے اس کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے سوا اس کے کہ یہ اس کی ہیئت تفصیلیہ ہے اور اس کی خصوصیت شرحیہ ہے۔ (پس یہ واجب کا ایک اسم ہو سکتا ہے) تب حق واضح ہو گیا

اور باطل زائل ہو گیا۔ تحقیق باطل زائل ہونے والا ہے۔

اور یقینی طور جان لو کہ یہ حکم پھیلتا جلائے گا اجناس ثانی اور ثالث میں اور اسے کھینچے جاؤ۔ عرض میں بغیر انتہا کے جیسے کہ واجب جل مجدہ کی ذات میں کوئی انتہا نہیں اس کے محاذات میں ان اسماء صادرات کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر اسم سے جو تیرا ہے اور تو نے اپنے اوپر وہ نام رکھا ہے یا اس کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اس کو اپنے پاس علم غیب میں اختیار کیا ہے۔
اور طول میں اسے کھینچتے چلے جاؤ یہاں تک کہ تمثلات موجودہ اربعہ ختم ہو جائیں اور ان کے آپس میں مل کر ایک ہو جانے سے ارادہ پیدا ہو جائے۔ یہاں سے عالم حادث پیدا ہوگا جو احکام الاسماء کے خلط سے جو ارادے کے ماتحت ظاہر ہوا مقہور رہے گا۔ یہاں کوئی ایک چیز ساری کی ساری کسی دوسری ایک چیز کی پوری قوت سے ظاہر نہیں ہوتی، نہ یہاں تقدیس ہے نہ عنوانیت ہے، تو ضرور ہے کہ ایک چیز جسے غیر کہا جائے جسے محدث اور معلول کہا جائے پیدا ہوگی۔
پھر جہاں عالم ختم ہوتا ہے تو اس طرف تمثلات مجردہ ثابت ہوتے ہیں اور ایفات مقدسہ ظاہر ہوتی ہیں وہ ذات کی طرف کامل طور پر پہنچا دیتی ہیں، ان میں پوری عنوانیت موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا الی اللہ المصیر، اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ (وانا الیہ راجعون) ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹیں گے۔ (الا الی اللہ ترجع الامور) آگاہ ہو جاؤ اللہ کی طرف ہی سب چیزیں لوٹتی ہیں۔ بس یہ کہ اللہ کے اسماء ہیں۔ "العودیۃ" لوٹنے والے، جو شخص توفیق پاتا ہے کہ اس سلسلہ دوری کو اس کے تمام احکام کے ساتھ سمجھ لے تو وہ خیر کے تمام شعبوں کے لئے موفق ہوا۔
حزب حکمت کے نزدیک ایک جامعہ کلمہ یہ ہے کہ ان العالم کلہ غیر اللہ سبحانہ یعنی سارا جہان اللہ سبحانہ کا غیر ہے۔ مگر یہ اس معنی میں نہیں جس طرح عام لوگ تصور کرتے ہیں کہ عالم کے لئے مستقل فعلیت مانتے ہیں اور اپنے سر پر

اس کا علیحدہ تحقق سمجھتے ہیں، حزب الحکمت کے نزدیک ایسا ہرگز نہیں، بلکہ وہ واجب کی ایک جہت کی تمثال ہے۔ اور اس کے کمال کی ایک شرح غیریت کا مناط عالم کا فی نفسہ ختم ہو جانا اور اپنی ذات میں متعین ہونا ہے یہ دونوں چیزیں عالم کے انتہا کی وسعت اور واجب کے اطلاق کی تعری اور اس کے احاطہ کی شدت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر واجب اسکو شامل نہ ہوتا تو یہ عالم غیر متناہی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ ہوتا اور اس کا اپنی ذات میں "تدلس اور اس کی طبیعت میں تلوث جو واجب کے کمال قدوسیت اور تمام سبوحیت سے پیدا ہوا۔ اور اگر واجب اس کو اپنے اندر نہ لے لیتا تو اس کے قدس کی وجہ سے کچھ بھی نہ رہتا۔

انعدام عنوانیت (عنوان نہ ہونا) اور انعدام افضار (نہ پہنچانا) اس لئے ہے کہ ان دونوں کا صدور ظہور کی تیزی سے ہو، اگر وہ اپنے اندر اس کو نہ لپیٹ لیتا تو ظہور کی وجہ سے یہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ عنوانیت اور افضار کی نفس کے لئے یہ مثال اچھی ہے کہ جیسے۔ الحیوان المطلق لابشرط شئی "کو الحیوان الکلی بشرط لا اور الحیوان الجزی بشرط شئی سے ہے۔ تو حیوان مطلق ان دونوں کو اس لئے شامل ہوا کہ اس میں اطلاق بہت زیادہ ہے اور　　ان کی تناہی نے ان دونوں کو روک دیا۔ اور ان کے تدلس نے عنوانیت سے روکا اور اس سے روکا کہ ان دونوں کی تمام طاقت حیوان مطلق کی تمام طاقت کا نتیجہ ہو۔ اس کے بعد ہم تجھے حکم بناتے ہیں کہ کیا ممکن ہے کہ صادر اول اپنی اس طبیعت کے ساتھ واجب کا غیر ہو سکے جس کو عقل کا نام دیا جائے اس سے اس کو دوری ہے، پھر دوری ہے۔

ظلمانی کائنات کا ثبوت موطن قدس ظہور اور تمثل کے طور پر تجھے پریشان خاطر نہ بنائے اس لئے کہ ہر ظلمانی چیز کے لئے ایک خاص قدسی روح ہے[1]

---

[1] یہ کدورت اور تدلس محل خاص اور دفع کی وجہ سے آیا ہے۔ جیسے عضلات میں ہوتا ہے۔　　(قاسمی)

یہ قدسی روح اس کے حبل ورید (جان کی رگ) سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور وہ ظلمانی مخلوق اپنی ذاتی حیثیت میں اس قدس سے اتنی دور ہے جیسے کہ دو مشرقین میں بعد ہو، تو جو مثال ہم نے بیان کی ہے اس کو سامنے رکھو اور جان لو کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کسی چیز کو نہیں جانتا اور کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا مگر اس حیثیت سے کہ وہ خیر محض ہے اور وجود صرف ہے۔ حضرت اسمار کا ایک عکس ہے، یہ مسئلہ عمیق مسائل میں سے ہے اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کی جبلت میں اس کی استعداد ہو۔

اس مسئلے میں تھوڑا مضمون ہم تجھے لکھوا دیتے ہیں جیساکہ تمام مشاجرات میں ہم نے مختصر تصنیفات کی ہیں۔

اس جملہ "الزوج اربعۃ" کے چار اعتبار ہیں۔ اول یہ ہے کہ تو کہے۔ الزوج منقسم بمتساویین (یعنی جفت کی دو برابر حصوں کی طرف تقسیم ہوتی ہے) اور زوج کے لفظ سے تیری مراد اربعۃ (چار) ہو تو تم نے اس زوج کے لفظ کو اربعۃ کا عنوان بنا لیا ہے، اسی لحاظ میں زوج اربعۃ کی ایک تجلی ہے اور اس کا ایک اسم ہے چونکہ یہ دونوں چیزیں ایک ہیں اسی وحدت کی شدت کے سبب سے یہ کہنا بھی ممکن نہیں رہا کہ ہو ہو[1] (یہ وہی ہے) اور یہ اعتبار سب اعتباروں سے حق کے قریب ہے اور نفس الامر کی زیادہ حکایت کرتا ہے، الٰہیات میں حکمار ربانیین کا یہی مذہب ہے، ان کے نزدیک علیم علم سے پہلے ہے اور سمیع سمع سے پہلے ہے حق سے زیادہ ملتی ہوئی بات ان کے نزدیک یہ ہے کہ کہا جائے العلیم والسمیع والحکیم۔ ان کے نزدیک جو دونوں کلاموں میں احق تھا، قرآن اس کے مطابق وارد ہے۔ صحیح حکایت یہ ہے کہ کہا جائے الاسم عین المسمیٰ

---

[1] یہاں حمل اس لئے نہیں ہوتا کہ اس میں دو چیزیں اور دو اعتبار چاہئیں اور یہاں تو وحدت محض ہے۔ پھر حمل کیسے ہوگا! (قاسمی)

(اسم) مسمیٰ کا عین ہے۔ ایک اعتبار سے اور دوسرے اعتبار سے کہا جائے کہ الاسم لا عین المسمی ولا غیرہ (یعنی اسم مسمیٰ کا نہ تو عین ہے اور نہ غیر ہے) دوسرا اعتبار یہ ہے کہ تو کہے۔ الاربعۃ زوج۔ اس وقت تو نے زوج کے لفظ کا ایک مفہوم بنایا ہے جو اربع پر صادق آتا ہے اور تیرے قول کا مطلب اس وقت یہ ہے کہ اربعۃ اور زوج اگرچہ دو مفہوم ہیں مگر وہ دونوں لحاظ ہیں متحد ہو گئے تو اس حکم کے لگانے میں اس کو ایک علم سمجھتا ہے۔ کوئی معین چیز نہیں ہے اور یہ اعتبار پہلے سے کم درجہ کا ہے۔[۱]

الٰہیات میں متکلمین کا یہی مذہب ہے ان کے نزدیک علم، علیم سے پہلے ہے۔ اور حکمت حکیم سے پہلے ہے۔ ان کے نزدیک احق الکلامین یہ ہے کہ کہا جائے کہ علم کی صفت اس کے لئے ہے اور حکمت کی صفت اس کے لئے ہے۔ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ العلیم، الحکیم ہے۔ وہ علیم اور حکیم کو ایک علمی چیز جانتے ہیں کوئی معین شے نہیں۔

تیسرا اعتبار یہ ہے کہ جب تو "زوج" کی خصوصیت میں "اربعۃ" کا مظہر ملاحظہ کرتا ہے اور وہ وحدت جو اس سے پہلے تھی اس کا پیدا ہونا ملاحظہ نظر اور سرعت نفوذ سے تھا۔ اس کو بے کار بنا دیتا ہے اور تو اس کے اس طرف پردے لٹکا دیتا ہے ذہن کے اعتبارات میں اربع اس وحدت کا عنوان تھا یہ ہے صوفیہ کا مذہب اچھی تعبیر ان کے نزدیک یہ ہے کہ زوج ایک تعین ہے اربعہ کا اور مظہر ہے اس کا اور یہ اعتبار پہلے دو اعتباروں کے درمیان ایک برزخ ہے۔

چوتھا اعتبار یہ ہے کہ جب تو کہے "اربعہ" اور اس کے معنی ذہن میں محفوظ کرے پھر تو کہے زوج اور ذہن کی دوسری طرف اس کے معنی محفوظ کر لے، پھر دیکھے کہ ان دونوں میں نسبت کیا ہے، پس سمجھے کہ اول ثانی کی علت ہے۔

---

[۱] کیونکہ اس میں وحدت کا اعتبار اثنینیت کے اعتبار سے بعد کی چیز ہے (قاسمی)

اور ثانی اس کا معلول ہے، اگر اول نہ ہوتا تو موطن وجود میں ثانی بھی نہ ہوتا اور یہی ہے مذہب فلاسفہ کا، ان کے نزدیک ایک علم اس کا معلول ہے اور اس کی طرف محتاج ہے۔ ان کے نزدیک احق التعبیرات یہ ہے کہ علم نہ ہوتا اگر واجب نہ ہوتا اس کے سبب سے اور اس کے تقاضے سے علم وجود میں آیا۔ پس جب تجھے کہا جائے کہ اسے سمجھ وار النسان عالم متنبہ ہے۔ عقل فعال کی طرف تو انہوں نے جو کچھ حکم دیا ہے، اس کی تصدیق کرلے اور جس چیز کو انہوں نے اپنے قضیے کے موضوع میں عنوان بنایا ہے اس میں اس کو خالی سمجھ لے[1]

ان کے کلام کی حقیقت جب اس کو بدعت کے لباسوں سے مجرد کیا جائے یہ ہے کہ واحد، فیاض، خلاق، جواد، عالم کا افاضہ کیا اور اس کو عدم سے نکالا، اور اس کی مثال وہ ہے جب کہ کہتے ہیں کہ وحی، عقل فعال کی تعلیم ہے جس سے ان کے کلام کی اصلاح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ وحی رب متکلم، جواد کے افاضہ سے ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یقین سے جان لو کہ یہ عقول کا مسئلہ عقول کی ایک بدعت ہے۔ اور ایجاد کے منصب میں سوا اللہ سبحانہ کے اور اسکے اسماء کے اور کوئی چیز نہیں، یہ پختہ برہان انشاءاللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوگی۔ جس کو سمجھ ہے اور وہ خیال لگا کر سمجھنا چاہتا ہے۔

یہ تجھے ضروری طور پہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم اسماء سے مفہومات انتزاعیہ مراد نہیں لیتے بلکہ وجودات مقدسہ، حقائق، شخصیات منزہہ اور تجلیات واجبیہ مراد لیتے ہیں۔

---

[1] انہوں نے تجلی کو چھوڑ کر عقل کا لحاظ کیا۔

یہ بھی یاد رکھو کہ وہ عدم جسے بعض اہل کشف اور بعض اہل نظر نے موجودات مقدسہ کے لیے ثابت کیا ہے بذات کوئی حقیقت نہیں ہے[1]

اس لئے کہ جب اسمار اپنی حقیقت کے مطابق ثابت کئے جائیں تو وہاں کوئی عدم نہیں ہے مگر حکایت عقلیہ کے حساب سے جو غیر واقعہ ہے جس کا تحقق عقل کے درجہ وہم میں ممکن ہے اور جب تو ان کو صفت یا معقول مانتا ہے تو اس سے عدم اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اس نظر کے وقت واجب سے اس کا انقطاع ہوتا ہے۔

اس مسئلے میں حکمار کو اللہ جزاء خیر دے جب کہ انہوں نے (اپنے وجدان سے) یہ اصطلاح مقرر کی کہ اعیان مقدسہ کا صدور تو انصاف سے یا موسومیت سے نام رکھا جاتا ہے اور اعیان ملوثہ (حقائق ناپاک) کا وجود خلق سے نام دیا جاتا ہے اور اس کو حدوث سے موصوف بناتے ہیں، اس لئے کہ ارادہ کے ماتحت مقہور ہیں اور اسمار کے احکام وہاں مخلوط ہو جاتے ہیں اس طرح کہ کل، کل کے ساتھ موجود نہیں ہوتا۔

اگر دو جماعتوں کا ایک چیز کو سمجھنے میں اختلاف ہو اور سمجھنے کے طریقے ایک ہوں اس کے بعد براہین قائم کئے جائیں تو ممکن ہے کہ صلح ہو جائے، اور جب سمجھنے کے طریقے بھی مختلف ہوں تو صلح ہونا بہت مشکل ہے۔ ہاں! مگر اللہ چاہے کہ انہیں تنبیہ ہو۔ سبحانک اللھم و بحمدک لا احصی ثنار علیک کما اثنیت علی نفسک۔

دوسرا خزانہ۔ حکمت کی اساس اور اصل الاصول چند چیزیں ہیں۔

---

[1] یہ تحقیق امام ربانی مجدد الف ثانی پر رد ہے۔ امام ربانیؒ نے عدم کو ثابت کیا ہے اور تشخص اکبر کا وجود عدم سے تسلیم کیا ہے۔ میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ امام ربانی نے مذکورہ بات عوام کے فہم کے مطابق کہی ہے، یہ کوئی علمی حقیقت نہیں ہے۔ قاسمی

اللہ سبحانہ کی ذات کو اس کی ذات سے پہچاننا۔ ۲۔ اللہ سبحانہ کے اسمار کو ان کی خصوصیات اور احکام کے ساتھ پہچاننا۔ ۳۔ جو مخلوق پیدا کی گئی ہے اور اسماء الٰہیہ ظاہر ہوئے ہیں ان کو خاص طریقہ سے پہچاننا۔ ۴۔ وہ اسمار الٰہیہ جو اپنا کام کر کے اللہ کی طرف عود کرتے ہیں۔ ان کے احکام کو پہچاننا اور اللہ کی طرف ان کے پہنچنے کی معرفت کو حاصل کرنا۔

یہ ایک دوری سلسلہ ہے[۱] جس شخص کو اس سلسلہ کا حکیمانہ ذوق حاصل ہوا تو اسے بہت ہی خیر و برکت عطا ہوئی۔ جس قدر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں توفیق عطا کی تو ہم اس سلسلہ کی تفصیل بیان کرینگے۔

اللہ سبحانہ کی ذات کی معرفت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا درجہ اس سے بہت بلند ہے کہ انسانی ادراک اس کو احاطہ کرلے، ذات کی طرف وصول ایک ذاتی تجلی سے ہوتا ہے۔ جسے کسی طرح پر ادراک نہیں کیا۔ جاسکتا وہ ایک حیرت ہوتی ہے۔

اسی طرح ذات الٰہی اس سے بلند ہے کہ اس کو کسی قسم کے تعین کے ساتھ موصوف کیا جائے، یہ تعین تو اطلاق محض اور وحدت صرفہ ہے ہم جس وقت کہتے ہیں کہ وہ اطلاق محض ہے تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ایک کلی ہے اس لئے کہ اس کے کلی ہونے کو ہم بالکل باطل کہہ چکے ہیں۔ بلکہ اس سے یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ وہ اس طرح موجود ہے کہ اس میں کلی اعتبارات درج ہو جاتے ہیں اور تمام جہات اس میں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ جو ہم نے کہا کہ اس میں تمام اعتبارات درج ہو جاتے ہیں تو اس سے ایسا اندراج مراد ہے جس کا کوئی

---

[۱] یعنی ذات الٰہی سے اسمار کا صدور ہوتا ہے پھر ان کا مخلوقات میں ظہور ہوتا ہے۔ پھر اللہ کی طرف لوٹتے ہیں ان کے اثر سے متاثر ہو کر پھر نئے اسمار کا صدور ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ غیر متناہی دور جاری رہتا ہے۔

کلمہ اور حرف واپس نہیں آسکتا اور وہ ذات، فعلیت کے افق کو بھرنے والی ہے اور تحقق کے موطن میں سمانے والی ہے۔

اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ وہ وحدت صرفہ ہے تو اس سے ہماری مراد وہ وحدت نہیں ہے جو کثرت کا مقابلہ کرتی ہو۔ اس لئے کہ کثرت تو تجلیات متاخرہ کی پیدائش ہے تو اسی طرح یہ وحدت بھی وہی حکم رکھتی ہے۔

یہ ضابطہ کلیہ ہے اس پر تمام حکمار اجماع کر چکے ہیں کہ دو متقابلین میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ انکی خصوصیات کی طرف نسبت کیا جائے گا نہ کہ نفس رحمانی یا وجود منبسط کی طرف، بلکہ ہم نے تو یہ اصطلاح مقرر کرلی ہے کہ ہر وہ چیز جو وحدت اور کثرت دونوں سے منزہ ہو تو وہ واحد اواحد حقیقی ہے۔ وہ ہر واحد کی اصل ہے۔ اور وہ نفس رحمانی من حیث ہی ہی ہے) اس سے اسمار اللہ کی دونوں ضدیں منفی سمجھنی چاہئیں، اس معنی سے کہ وہ دو امر ہیں اپنی خصوصیتوں میں اور وہ نفس رحمانی ان دونوں کو قبول کرتے ہیں جب کہ ان سے موصوف ہوتا ہے[1] اور حقائق امکانیہ اس حیثیت سے کہ وہ حقائق امکانیہ ہیں ذات الٰہی ان سے بلند ہے ان حقائق کا وجود عالم ارادہ کی پیدائش ہو اور اسکے تحت میں واقع ہے اور یہ من حیث ہو ہو۔ ذات اور صفات سے مسلوب ہیں یہ سلب بسیط ہے اسی طرح نہیں کہ یہ حقائق یا اشیاء ایسی چیزیں جن کا اس منزہ مرتبہ سے بلند کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ادراک عقل کی کارروائی کا نتیجہ ہے۔

(مسلسل)

---

[1] یعنی مرتبہ ذات میں تو دونوں سے خالی ہے اور مرتبہ اتصاف میں دونوں سے موصوف ہوجاتا ہے تو اس قسم کے تضاد اسمار جب کہ نفس رحمانی کی ذات بھی ان سے بلند ہے تو ذات الٰہی کا اس قسم کی وحدت اور کثرت دونوں سے منزہ ہونا اجلی بدیہیات سے ہوگا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

المسوی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ــــــــــ الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفی پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں — قیمت ۲۰۔۰۰ روپے

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے۔ نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

(عربی)

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفہ تصوّف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت ۲ دو روپے

شبیر احمد قریشی منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد سرور پبلشر نے
شاہ ولی اللہ اکیڈمی جامع مسجد صدر حیدرآباد سے شایع کیا